

مکمل مجموعہ تقاریر

خطیب آل محمدؐ

(مولانا سید اظہر حسن زیدی رحمۃ اللہ علیہ)

مرتبہ

خضر عباس سید مرحوم

فاشر

شاہد برادرز لاہور پاکستان

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	عنوان
7	تذکرہ امام حسن مجتبیٰ
18	مودتہ فی القربی
48	آنکھ
55	جہاد اکبر
64	معصوم کا فیصلہ
81	حجت
95	اصطفیٰ
113	اسلام لرزہ بر اندام ہو گیا
144	اسن
179	حق طاقت ہے
207	علی اصغر ایک سپاہی
217	فاطمہ کا چاند
227	شام غریباں
230	فی سبیل اللہ
251	انک لعلی خلق عظیم
257	انسانیت
275	موت و حیات
287	موت و حیات

صفحہ نمبر	عنوان
297	باب الحواجج امام موسیٰ کاظم
304	آل ابی طالب
327	انسان اور انسانیت
339	شام غریباں
358	اضافہ شکر یہ
380	حسینیت
385	حضرت قائم آل محمد علیہ السلام
389	عشق خدا
402	شجاعت اور ملوکیت
414	اللہ سے ڈرو
427	اللہ گواہ ہے
442	معرفت امام
458	شام شہیداں
462	شہادت عظمیٰ
476	اصحاب حسین
485	سکینہ بنت الحسین
503	قلم
513	مرج البحرین
534	فرز رب الکعبۃ

صفحہ نمبر	عنوان
560	فہذا علی مولاً
584	لا الہ الا اللہ
598	احسن القصص
609	حسین اور اسلام
617	سید الساجدین
619	نجات
635	ختم نبوت
660	سیدہ کا عقد
678	اضافہ شکر یہ
691	قانون عدل
720	قانون عدل
743	محسن اعظم
752	ادائے حق
780	انا ناصریا رسول اللہ
807	شجرہ طیبہ
823	تصور آل محمد
831	اسیر بغداد
836	وفات سیدہ
848	پروردہ آغوش رسالت

تقریظ

قائد ملت جعفریہ پاکستان سرکار مفتی جعفر حسین قبلہ اعلیٰ السیاقامہ

میری ایک عرصہ سے تمنا تھی کہ خطیب آل محمد مولانا السید اظہر حسین صاحب زیدی دام بدہ کے بیانات کا مجموعہ کتابی صورت میں شائع، تاکہ ارباب منبر اس فلک خطابت کے نیز درخشاں سے روشنی حاصل کر سکیں۔ مجھے یہ دیکھ کر انتہائی مسرت ہوئی کہ جناب سید خضر عباس صاحب راحت معالیہ نے مولانا موصوف کی چند تقریروں کو ترتیب دے کر میری ادرا علمی و ادبی ذوق رکھنے والوں کی دیرینہ خواہش کو پورا کیا۔

مولانا کے بیانات صرف کسی خاص طبقہ ہی میں مقبول نہیں ہیں بلکہ ہر گروہ اور ہر جماعت میں انہیں یکساں مقبولیت حاصل ہے۔ پاک میں شائد ہی کوئی شہریا

تصہ ایسا ہوگا۔ جہاں مولانا کی آواز نہ گونجی ہو۔ اور اہل اسلام اور دوسرے مذاہب کے افراد ان کے طرز خطابت و سخن بیاں سے محفوظ نہ ہوئے ہوں۔ خطیب کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہوتی ہے۔ قدرت کی طرف سے ان اوصاف کا انہیں وافر حصہ ملا ہے۔ متوازن لہجہ بیان میں ٹھہراؤ، متوازن آواز، ادب کی شکستگی، زبان کی پاکیزگی، ان کی خطابت کا خاص جوہر ہے۔

مجھے توقع ہے کہ ان کے بیانات کا یہ تحریری مجموعہ: ان کے بیانات کی طرح مقبولیت عامہ کی سند حاصل کرے گا اور ناظرین اس سے اسی طرح لطف اندوز ہونگے جس طرح ان کے بیانات سے محفوظ ہوتے ہیں۔ میری دلی دعا ہے کہ یہ نذرانہ عقیدت بارگاہ حذر رسید الشہداء میں شرف مقبولیت حاصل کرے۔

(دعا گو) مفتی جعفر حسین عفی عنہ

دقت تے تیری یار بند تیرے مجھ کو بخشا

پھر انہیں نکل رہے ہیں کانٹے طمیری زبان کے

ولادتِ امامِ حسنِ مجتبیٰ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

”خداوندِ عالم کی حمد و ثنا کے بعد حضراتِ محمد و آلِ محمدؑ پر درود و سلام“
حضراتِ گرامی! آج کی محفل کا موضوع بحث ہے۔ تذکرہ حضورِ امامِ حسنِ مجتبیٰ
علیہ السلام اور میں آپ سے عرض کروں۔ کہ جنابِ حسن علیہ السلام کا تذکرہ اتنا مختصر
نہیں ہے کہ اسے تھوڑے سے لفظوں میں ادا کر دیا جاتے۔ چنانچہ یہ مسئلہ بعض وجوہ سے
اُلجھ گیا ہے اس لئے اسے سلجھانے کے بیان کرنے کے لئے کافی مہتدیوں اور مقدمات کی
ضرورت پڑتی ہے۔ بیگانوں سے تو کوئی شکوہ نہیں بلکہ اپنوں نے بھی اس پر اتنی توجہ نہیں
دی جو دینی چاہتے تھی۔

میرے سامعین! حضورِ امامِ حسنِ مجتبیٰ کی وہ شخصیت ہے جو ایک لمحہ کے لئے
بھی امامِ حسینؑ کے ماتحت نہیں رہی۔ امامِ حسینؑ تقریباً عرصہ دس سال تک امامِ حسنؑ کی
امامت کے ماتحت رہے ہیں۔ اگر کوئی اس وقت حسینؑ سے پوچھتا کہ تمہارا امام کون
ہے؟ تو آپ فرماتے کہ تمہارا امام حسنؑ ہیں۔ چنانچہ امامِ حسینؑ پورے دس سال زیرِ امامت
حضورِ امامِ حسنِ مجتبیٰ رہے اور حسینؑ کا نیا نام تجویز ہی نہ ہو سکا۔ آخر یہی کہنا پڑا۔ اس کا نام
بھی حسنؑ ہی رکھ دیا یعنی حسنؑ کی اگر تفسیر کر دو۔ بڑا بہتر حسنؑ اور چھوٹا بہتر حسینؑ۔ گویا حسینؑ
کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ وہ حسنؑ کے چھوٹے بھائی ہیں اور حسنؑ کی سب سے بڑی کمزوری
یہ ہے کہ وہ حسینؑ کے بڑے بھائی ہیں۔ مگر ہم لوگوں نے سچھ ایسی غفلت

برتی ہے کہ مجالس میں اس عظیم شخصیت کے تذکرے اتنے نہیں ہوتے جتنے ہونے چاہئیں۔

محترم سامعین!

دنیا کا یہ دستور ہے کہ عوام کسی جماعت یا فرد کا منشور نہیں پڑھتے۔ بلکہ عوام کی توجہ کامرزدہ فرد ہوتا ہے جو (Election) میں کھڑا ہو شخصیت سامنے آتی ہے۔ لوگ اُس کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں پھر یہ عالم ہوتا ہے۔ کہ دو مختلف پارٹیاں اپنے اپنے منشور کی اہمیت بیان نہیں کرتیں۔ بلکہ اپنی اپنی شخصیت کی برتری کے لئے دلیلیں پیش کرتی ہیں۔ ————— حضرات! منشور

سے بے توجہی اور شخصیت کے گرد اکٹھا ہونا اُس بات کی دلیل ہے کہ انسان کے ضمیر میں یہ سما یا ہوا ہے۔ کہ صرف کتاب کافی نہیں ہے۔ شخصیت کا بھی کافی دخل ہے۔ ————— بہر حال اسلام نامی ایک نظام ہے۔ جس کے تحت ہم زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس زندگی کو مرعوب کرنے کیسے ہم آئین بناتے ہیں۔ لفظ 'آئین' فارسی زبان سے ہے۔ اور لفظ 'دستور' ترکی سے ہے۔ ————— عربی زبان میں اگر کوئی لفظ 'آئین' کے معانی ادا کر سکتا ہے تو وہ صرف ایک لفظ ہے 'دین'۔ دین کے معنی میں 'آئین' دین کے معنی میں 'دستور' اللہ نے یہ اقرار کیا ہے «إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ» «اگر کوئی آئین، کوئی دستور ہے اللہ کے پاس تو وہ اسلام ہے» ہم اس آئین کے پابند ہیں۔ یہ اسلام نامی ایک آئین ہے۔ اور ہر آئین شخصیتوں کے پیچھے جلتا ہے۔ ————— اسلام نے جس پہلی شخصیت دنیا کے سامنے پیش کی۔ وہ سخی آقائے حضور سالتائب۔ اور آئین میں یہ دفعہ آج بھی موجود ہے اس آئین پر عمل کرنے کے لئے بطور نمونہ ہیں رسول " رسول نے اس آئین کو جاننے کے لئے

ہمیں طریقہ بتایا کہ ”کتاب اللہ و سنتی“ ایک کتاب اللہ ہے، ایک سنت ہے۔
 کتاب اللہ تو مسلمان نے دیکھ لی مگر سنت کا وجود کہاں سے تلاش کریں —
 بس سنت رسول سمجھانے کے لئے، محمدؐ کو کہنا پڑا، ”کتاب اللہ و سنتی“ —
 ”اگر کسی نے میرا طرز طریقہ، میری سنت کا اندازہ دیکھنا ہو تو میرے گھر
 والوں سے پوچھو“ چونکہ ”اہل البیت آعلیٰم و جانی البیت“ گھر والے زیادہ جانتے
 ہیں کسی گھر والے کی بات — یا گھر والے بہتر جانتے ہیں کبھی گھر والے کی بات کو —
 اب سنت رسول سمجھنے کے لئے دو چیزیں ضروری

ہیں، ایک رسول کے وہ مقدس و محترم و واجب الاحترام قابل جاں نثار اصحاب! جو رسول کے پیش و گرد موجود تھے وہ جانتے ہیں کہ رسول کی سنت کیا ہے!
 (اب بحیثیت مسلمان! کسی اصحابی رسول کی شان میں گستاخی کرنا تو درکار، اگر ذہن
 میں یہ تصور بھی آجاتے۔ تو یہ گناہ عظیم ہے۔ ہم تو قربان ہیں ان اصحاب پر جو
 صراط مستقیم پر چل کر رسول کے ساتھ ہوئے، جو رسول پر فدا ہونے کو تیار تھے۔
 مخصوص دل کے ساتھ رسول کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ وہ ایک نور تھے جنہوں نے
 نور ایمان کے ساتھ چہرہ رسول کو دیکھا — ہمارا ہر فرد ان پر قربان ہونے
 کو تیار ہے۔ سبحان اللہ! ان سے بہتر شخصیت تو کوئی نہیں ہو سکتی ہی نہیں جن کو
 رسول کا پاس تھا اور پاس کے ساتھ رسول کے پاس بیٹھے تھے — ان سے بہتر
 کوئی ہو سکتا ہی نہیں) — یا تو وہ بہتر جانتے ہیں یا اہل بیت رسول — بس یہیں سے
 دو کتب فکر اسلام میں پیدا ہوئے — ایک ہے گھر والوں کا کتب فکر ایک ان
 عزیزوں کا کتب فکر جو اصحاب کہلاتے ہیں — مسلمانوں نے دونوں کا نام منتخب
 کر لیا۔ گھر والوں کا بھی اور اصحاب کا بھی۔ گھر والوں کو انہوں نے ”آل“ کہا ہے
 ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ ہر کلمہ پڑھنے والا آل ہے — جب نمازیں درود پڑھی تو مرند ہی

کہا اللہم علی اللہ محمد وآل محمد۔ مسلمانوں نے نماز پڑھی۔ نماز سے بڑھ کے کوئی عبادت ہے
 ہی نہیں اور نماز اس وقت تک کجا کی ہوئی ہی نہیں جب تک اس نے آل پر درود نہ
 بھیجا ہو۔ اگر کوئی نماز میں آل محمد پر درود نہ بھیجے تو تمام مسکین کا یہ متفقہ منیصلہ
 ہے کہ اس کی نماز نہیں ہوتی، بس یہ مسلمانوں نے فرق رکھا ہے (آل میں اور اصحاب
 میں)۔ بہر حال مسلمانوں کو آل پر درود ضرور پڑھنا ہے۔ آل کے بغیر
 گزری نہیں ہے۔ آج کجا عقیدے، فرقے کے مسلمانوں سے پوچھو، وہ آل رسول کو
 مانتے ہو تو ان کے نام یاد؟

اللہ نے کہا، جگڑا کیوں کرتے ہو۔ میں آج ہی رسول کو ہٹا لیتا ہوں۔ دیکھا ہوں
 ۔ کون مانتا ہے۔ کون نہیں مانتا۔ چنانچہ چھوڑ دے دیتے ایک فرقے کو اور آٹھ
 دے دیتے ایک فرقے کو۔ انہوں نے اپنے والے کو بلا میں، نجف میں، مشہد میں، کافین
 میں بسا دیتے اور انہوں نے بھی اپنے والے جنت البقیع میں بسا دیتے۔ آج دنیا دیکھ رہی
 ہے کہ ماننے والے کمن ہیں۔ نہ ماننے والے کمن ہیں)

بہر حال آل کو مانتے ہیں۔ آل کے بغیر دنیا و آخرت میں گزارا ہو سکتی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بی بی خدیجہ بنت خویلد سے حضرت علیؑ کی ولادت ہوئی۔ آپ نے فرمایا: "میں نے اپنے والد کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے والد کو دیکھ رہے ہیں۔" (صحیح بخاری، ج 1، ص 100)

ابو جہل بکھڑا رہا ہے کہ علیؑ بھی آل رسول ہیں یا نہیں۔ چنانچہ بہت سے حضرات یہ
 درود پڑھنے لگے یہ اللہم علی محمد وعلی آل محمد۔ علیؑ کو آل میں نہیں رکھتے
 برابر کا بھائی سمجھتے ہیں۔ اور آل کو اولاد سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ علیؑ
 اولاد ہیں۔ علیؑ کے ذریعے سے آل شروع ہوئی ہے۔ علیؑ آل میں ہیں۔ گو حسن کے
 آل میں ہونے کا تو کسی کو شک و شبہ ہے ہی نہیں۔ وہ یقیناً لازماً حقیقتاً آل
 رسول میں بلکہ

یوں کہتے کہ 15 رمضان 18ھ کو اولاد فرمائی کہ رسولؐ کو دنیا میں تشریف

لائے۔ اللہ نے ان دشمنوں

کے حضور کا آج جواب دیا ہے جو رسول کو "ابتر کہا کرتے تھے آج محمد کی گود میں یہ بچہ دیکھ کر ان کے مُنہ بند ہو گئے اور آل رسول کے بارے میں تمام مسلمانوں کا یہ سفقہ فیصد ہے کہ یہ آیہ تطہیر میں داخل ہیں۔ میرے سامعین! قرآن میں یہ آیت ہے کہ رسول ان سے کہدو کہ "ایم تم جیسا بشر ہوں" "قل انما انال بشر مثلکم" بشر کے معنی میں "انسان" جب رسول نے کہا تھا "ایم تم جیسا بشر ہوں تو کیا عربوں سے کہا تھا کہ میں تم جیسا بشر ہوں، ابوہریرہ سے کہا تھا کہ میں تم جیسا بشر ہوں۔ پھر کس سے کہو یا گیا کہ میں تم جیسا بشر ہوں، کیا مسلمانوں سے کہو یا ہر گاہ، اصحاب موجود تھے ان سے کہا تھا کہ میں تم جیسا بشر ہوں۔ ایک طرف اللہ رسول سے یہ کہو یا ہے۔ کہ کہدو "ایم تم جیسا بشر ہوں" اور ایک طرف رسول کی طرف لایا ہوا ہے! جن کے بارے میں رسول پوچھ رہے ہیں "یہ ہر یہ لاتے ہو یا صدقہ"؟ انہوں نے عرض کی، جناب صدقہ! اگر وہ ہر یہ کہتے تو کھالتے اور جب انہوں نے کہا صدقہ "تو رسول نے اصحاب کو فرمایا، آپ خوش فرماتیں" اصحاب نے عرض کی "قبل آپ کے لئے لاتے ہیں" رسول نے فرمایا "نہیں۔ میں تم جیسا نہیں ہوں" (ایسی پچاس مثالیں ہیں جو میں سن سکتا ہوں کہ جہاں رسول کہتے رہے کہ "تم اور مجھ میں اور ہوں" میں تم جیسا نہیں ہوں) پھر رسول نے کس سے کہا تھا کہ "میں تم جیسا ہوں"۔ کوئی بشر تو ایسے تھے۔ نامانے۔ جن سے رسول کہہ رہا تھا کہ "ایم تم جیسا ہوں"۔ پیاسے سامعین! یہ ایک رندانہ ٹکٹہ ہے کہ رسول چادر کے نیچے چاروں کو بچتا ہونے لگے۔ اور جب آیہ تطہیر نازل ہوئی۔ ان چاروں نے ٹکڑیہ ادا کیا۔ "ہاں رسول! اللہ! ہم بہت شکر گزار ہیں کہ آپ کے سدرتے میں ہمیں یہ سعادت نصیب ہوئی" تو رسول نے ان چاروں کو پیسار کر کے فرمایا، کوئی بات نہیں۔ میں تم جیسا ہوں" اور اسی فقرہ میں تم جیسا ہوں، کو آل محمد نے اس طرح نبیایا کہ ہمارا اول ہی محمد ہے

ہمارا آخڑ بھی ٹھہرے۔ اسی بات کو شعر آفاق کے معنیف علامہ عبد الخلیم نے ادا
کیا ہے کہ اگر ٹھہر گیا کوئی بے قرہ آل محمد ہیں۔ حسن حسین میں جمال محمد آیتہ کمال محمد
جب مسلمانوں کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ ان جیسے ہیں اور وہ ان جیسا ہے تو آپ کو

ایک تاریخی واقعہ سناروں —

ایک دفعہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کو کسی ٹمک سے خراج آیا۔ تو جابر بن عبد اللہ
الفساری صحابی نے اٹھ کر کہا: "رسول اللہ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔" جب اس
علاقے سے خراج آتے گا۔ تو میں تجھے دروں اہتوں سے بھر کے دو دفعہ خراج میں سے
پیسے ڈونگا۔

جابر نے کہا: اب رسول کا بندہ پورا کرو۔

حضرت ابو بکر نے کہا: ہاں۔ میں وعدہ پر راکر رہا ہوں مگر علی کو بلاؤ۔ اور
جناب علی المرتضیٰ تشریف لاتے تو بارشاہ وقت نے آپ سے فرمایا: یا علی! اپنے ہاتھ
سے بھر کے دے دو۔ چونکہ میں نے اپنے کان سے یہ بات سنی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا
ہے کہ علی کا ہاتھ رسول کا ہاتھ ہے۔ اور

میرے محرم سامعین! جو صحابی منبر پر بیٹھ کر علی کے ہاتھ کو رسول کا ہاتھ کہہ رہا
ہو، انہی تو یہ ماننے کو تیار ہی نہیں کہ اس نے علی سے کہا ہو کہ وہ میری بیعت کرے۔ اسے
بیعت کی کیا مزدت تھی۔ علی کا ہاتھ تو رسول کا ہاتھ ہے۔ اس نے تو کہا ہی نہیں کہ علی
سے کہ تم میری بیعت کرو۔ ہم نے یہ الزام خواہ مخواہ لگا دیا ہے۔

اور اگر وہ کتاب بھی تو اس کا وہی جواب تھا جو کہ بلا میں حدیث نے دیا تھا۔ خاندان رسالت
سے بیعت کا صرف ایک ہی دفعہ مطالبہ ہوا ہے۔ نہ اس سے پہلے نہ بعد میں ہوا۔
بہر نوع یہ شان آل رسول ہے۔ اب میں آپ کو حسن محبت کی مختصر سی بات سنائے گا۔

اس کے بعد میرا جازت چاہوں گا۔

مسلمانوں نے یہ نظام بنایا (جس طرح بھی بنایا اس بحث میں کیا پڑوں) جس میں انہوں نے آل رسول کو بقل ان کے، چوتھے درجہ بہ بہت بڑی عظمت عطا فرمائی آج تمام مسلمانوں کے فرقوں میں وہ حکومت! جو راشدہ کہلاتی ہے۔ اس کے چوتھے منبر پر سربراہ مملکت! امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب تشریف لاتے اور علی کو چوتھے منبر پر بٹھا کر مسلمان مجبور ہیں کہ وہ آل محمد کی عزت بھی کریں، تعظیم بھی کریں۔ اگر کوئی تجویز ایسی ہو سکتی کہ ان کو چوتھے منبر سے ہٹا دیا جائے تو آپ یقین فرمائیں کہ مسلمان کا نام ہی گیس زبان پہ نہ آئے۔ یہ چوتھے درجہ پر آنے کی وجہ سے مسلمانوں کی زبان پر آل محمد کا نام۔ دیکھیں! وجود آل محمد کے چوتھے درجہ پر آنے پر بھی مسلمانوں نے مخالفت شروع کر دی تاکہ کسی طرح سے آل محمد کا نام ہی ہٹا دیا جائے

پہنچنے ان کو ہٹانے کے لیے مسلمانوں نے پہلے تو لڑائی کی ادھر وہ چوتھے منبر پر آ کے بیٹھا اور اُس کے ساتھ لڑائی ہوئی

اس کے بعد ابھی اُس لڑائی کا قصہ

ختم ہی ہوا تھا تو میرے عزیزین کی عظیم لڑائی شروع ہو گئی اور یہ سب۔ اسی لئے تھا کہ کسی طرح سے آل محمد کو جو یہ جو تھا مرتبہ مل گیا ہے اُس سے انہیں ہٹا دیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب تمہارے آل محمد نہ کٹ سکے تو پھر قرآن اٹھا کے لے آئے تاکہ آل محمد کو ہٹا دیا جائے۔ اور میری بڑی جنگ بظاہر اس نوبت پہ پہنچ گئی کہ حاکمین مقرر کرنے پر جسے حاکمین میں سے جو آل محمد کی طرف سے حاکم تھا اُس کا نام تھا ابو موسیٰ اشعری۔ یہ ابو موسیٰ اشعری اُس خاندان کا فرد تھا جن کے متعلق جناب امیر نے فرمایا تھا کہ تم کبھی یہ توقع نہ کرنا کہ وہ صحیح فیصلہ سنائیں گے "جناب امیر نے اصرار کیا تھا میں نہیں چاہتا کہ میری طرف سے ابو موسیٰ اشعری نامزد ہوں۔ تم ایک شہر کو نامزدہ بناؤ، کسی اور کو بناؤ" مگر معاویہ ماننا ہی نہیں تھا۔

آخر حاکمین کا فیصلہ کیا تھا؟ اور دوسرے مرد عاص، ایک چالاک و عیار، اور ادھر سے البرہوی
 ہشتری۔ حاکمین نے فیصلہ یہ کر دیا کہ ہم چوتھے منبر سے علیؑ کو معزول کرتے ہیں اور امیر شام
 (معاویہ) کو چوتھا خلیفہ مقرر کرتے ہیں۔ — اس فیصلہ کے بعد اب کیا ترتیب ہو گئی، حکومت
 کی۔ — اول۔ — دوئم۔ سوئم کے بعد اب چوتھا خلیفہ ہو گیا۔ — ”امیر شام“ — یہی مسلمانوں کا
 منشا تھا کہ ہو جاتے۔ — ابھی یہ فیصلہ ہوا ہی تھا کہ انہوں نے علیؑ کو قتل کر دیا تاکہ نہ علیؑ
 رہے نہ کوئی خطرہ باقی رہے۔ اب تا علیؑ کی شہادت کے بعد جو علیؑ کا بیٹا میدان میں
 ہے اُس کی کیا پوزیشن ہے۔؟ (امت دالی بات نہ کرنا وہ تو ہمارے عقیدے کی بات
 ہے) علیؑ کا بیٹا کیا اب ایک بادشاہ کا بیٹا ہے؟ ”نہیں“ علیؑ کا بیٹا اب ایک معزول شد
 بادشاہ کا بیٹا ہے۔ اُس کی بظاہر کوئی پوزیشن نہیں دُنیا دی حیثیت سے اور امیر شام اُس
 فیصلے کے مطابق ایک مستر حاکم ہے۔ اور حرم ایک عام آدمی ہے۔

اب بتائیں ایک نام آدمی حکومت کے مقابلے میں ایک گروہ اکٹھا کرے تو وہ
 کیا کہلاتے گا۔ — باعنی: اور باعنی کہ حکومت حکم دیتی ہے ”بتقیار ڈالو، جمانی
 طاقت کو دراز قتل ہو جائے گا“ جیسا سچہ باعنی جو ہے، وہ طاقت کرنا ہے یا قتل ہونا
 ہے۔ گو

یہاں کیا جوڑا ہے۔ کہ حکومت اس شخص سے جو ایک باعنی کی حد تک پہنچ گیا ہے
 درخواست کر رہی ہے۔ کہ ”میں تجھ سے صلح چاہتی ہوں“ — صلح باعنی سے نہیں
 ہوتی۔ رعایا سے نہیں ہوتی، بلکہ حکومت اپنی برابر طاقت سے صلح کرتی ہے۔ اور برابر
 کے معنی یہ ہیں کہ اُس کے باپ کی وہ حیثیت تسلیم ہے تو سچی وہ برابر کی طاقت ہے۔
 گویا حسن مجتبیٰؑ کی شخصیت نے اس معاہدے میں صرف ایک لفظ ”صلح“ لکھوا کر اپنے باپ
 کی حیثیت مسلمانوں سے منوادی۔

اب بلیف کتاب کا رانا مرٹھا جو حسن کے ذمے تھا۔ کتنی بڑی بات۔ یعنی بوسن کے ذمے تھی۔ حسن نے لفظ صلح لکھوا کر اپنے باپ کی حیثیت آج تک اور قیامت تک مسلمہ کو دہی کہ ”میرا باپ۔ چوتھے منبر پر شہنشاہ ہے۔“ نبی اس کا وارث ہوں لے۔ امیر شام میرے ساتھ صلح کر رہا ہے۔۔۔ (ہماری بحث کا موضوع شخصیت ام حسن ہے ورنہ امام کی حیثیت سے تو نہ آجائے ہم حسن کو کیا مانتے ہیں)

بہر فرج۔ عزت مآب حسن نے اپنی ادا کردہ صلح سے عوام کی شخصیت آج دنیا میں مسلمہ کو دہی۔۔۔ گر اس صلح کا امام لوگوں نے اپنی کم ظرفی کی وجہ سے بیعت ”رکویا بیعت چیز اور ہے۔ صلح چیز اور ہے۔ بیعت تو اس خاندان سے دنیائے صرف ایک نہ ہی مانگی تھی۔ نہ اس کے بعد کسی نے مانگی اور نہ اس سے پہلے کسی نے مانگی۔ اور اس کا اس خاندان نے وہ دہان نہیں جواب دیا کہ پھر کسی کو حیرت نہ ہوئی اس خاندان سے بیعت مانگنے کی۔ بہر فرج حسن کی بدولت، آل محمد کی شخصیت چوتھے منبر پر مسلم رہ گئی۔ اور چھو امام حسن یعنی کا کارنا مرٹھا کہ جنگ ختم ہو گئی۔ تو اس میں یا مومن ہیں آگئیں۔ لوگوں کو امن سے بیٹھ کر سوچنے کا موقع مل گیا اور اس سوچ و غور کا نتیجہ نکلا کہ بہتر زبان انسان تیار ہو گئے جو کہ بلا میں ساتھ تھے۔ صرف حسن کی صلح کرے کی بدولت وہ بہتر تیار ہو گئے۔ ورنہ یاد رکھو میرے سامعین! کہ بلا سے پہلے اذکر بلا کے بعد راہ حق میں ایک باں ہو کر جان نیسے والے بہتر آدم سے لے کر بلا تک اور کہ بلا سے قیامت تک نہ کبھی پیدا جوتے نہ ہونگے مومن کو چاہیں حواری ملے تھے سب ناکام ہو گئے۔ محمد کے ساتھ لاکھوں نئے گراؤند میں بہت ہلاکے دیکھو یا۔ علی کے ساتھ تو سے نزار فرج حق صلح میں جب معاہدہ حاکمین ہوا۔ آپ کو پتہ ہے کہ تین چار آدمی رہ گئے تھے۔ حسن کے ساتھ تیس ہزار آدمی تھے جن میں سے صرف ارون مکی رہ گیا تھا جب آپ صلح کر رہے تھے۔ مگر

”بہتر آدمی نہ کہ بلا سے پہلے کسی کو ملے تھے نہ کہ بلا سے بعد کسی کو ملے۔ امام عباس

بھی اسی انتظار میں ہے کہ چالیس بل باقی تو آجاؤں گویا سب بڑی جماعت جان نثاروں کی اللہ کے نام پر صرف حسن کی صلح تھے پیدا کی۔ جتنے اصحابی تھے کہ بلا میں شہید ہوئے تھے، جیسا کہ ملاحظہ فرمائیں وہ عزیز و عزیزہ یہ سب وہ تھے جو دس سال کے عرصہ میں حسن کے دست بنے تھے وہ حسن کے چھوٹے بھائی پہ آکے قربان ہو گئے۔ اور تیس چالیس ہزار آدمی وہ بنا دیئے جو قیدوں میں بند تھے۔ جب قید سے جرنے تو انہوں نے واقعہ کو بلا کا انتقام خاندان بڑا مہیہ سے لیا۔ یہ سب حسن کی وہی ہوتی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ یہ سب حسن جتنے کی پیدائی ہوئی صلح امن کے کارنامے کی بدولت ہے اب اس کو چاہے کتنا بیان کرے۔ دنیا کی سیاست کے اعتبار سے دنیا کے حالات کے اعتبار سے حسن کی طرح عمری کبھی ختم ہو سکتی ہی نہیں۔ ایسی عظیم اور ایسی عجیب اور ایسی بے مثل حقیقت حسن کے نام سے آج اس دنیا میں اسکی ولادت ہوئی، وہ تشریف لاتے۔ گویا خدا کی سب سے بڑی نعمت اس کے بندوں کو ملی۔ خاندان رسالت میں دوسرے بہادر پیدا ہوتے، اصلی وارث پیدا ہوا۔

اللہ کا ہم شکر ادا کرتے ہیں۔ رسول کو ہم مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ علی و فاطمہ کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ ہم اللہ سے، رسول سے، علی سے استیفاء سے ادا کر آپ جاہل) اپنے زمانے کے امام سے درخواست کرتے ہیں کہ جب شہنشاہوں کے گھر خوشی ہو، بیٹا پیدا ہو تو دو قسم کے انعامات رعایا میں تقسیم کئے جاتے ہیں

1۔ قیدیوں کو آزاد کیا جاتا ہے۔ جو نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں، انہیں انعام دیتے ہیں چنانچہ ہم میں سے جو گناہوں کی قید میں قیدی تھے، ہم سے صدقے میں اللہ انہیں آزاد کرے اتنے بڑے نذرانہ کی ولادت کی خوشی میں خداوند عالم ہمیں گناہوں کی قید سے آزاد کرے۔ دوسرا انعام ہمیں کیا ہے۔ یہ ہم نہیں مانگتے۔ اس لئے کہ ہم اگر بڑی سے بڑی شے بھی مانگیں گے تو وہ اپنی حیثیت کی بڑی ہونگی۔ یہ بات ان پر چھوڑ دو۔ وہ اگر چھوٹی سے چھوٹی شے بھی دیں گے تو ان کی حیثیت کی ہونگی۔ اللہ جانے آئی عمر کیا عطا فرمائیں گے۔؟

اے آل محمد! ہمیں جو انعام بھی عطا فرما، چاہیں اپنی شان کو دیکھ کر اور ہمارے
ظرف کو دیکھ کر وہ ہمیں آپ عطا فرمادیں۔ ہم آپ کو کچھ نہیں کہتے۔ آپ ہمیں جنت
دے دیں۔ فلاں دے دیں۔ یہ جنت تو آپ کے گھوڑے کی شبیہ ولا دتی ہے۔
جنت کی شے ہے جنت تو آپ کی شان میں دو شعر کہہ دینے سے مل جاتی ہے۔ اسی معمولی
چیز آپ سے کیا مانگیں۔ حضور اپنی شان کے مطابق عطا فرماتیں۔ اتنا ہم آپ سے
عرض کرتے ہیں کہ۔

نعمت اطمینان جو خدا کا بڑا عطیہ ہے ایسا ہمارے لئے ہو جاتے کہ اس
پڑا ثوب، انقلاب زمانے میں جب کہ بحران میں ہم پھنسے ہوئے ہیں اور عزت و ناموس
خطرے میں ہے شریفوں کی شرافت خطرے میں ہے ایسی فضا پیدا کر دے جو
آپ کے نام لیرا، آپ کے فلام، عزت و اطمینان سے زندگی گزار سکیں۔ یہ نعمت اطمینان خدا
کی سب سے بڑی نعمت ہے جو آپ کے صدقے میں ہمیں مل جاتے۔ یہ ہماری اہمیت ہے ذریعہ
اپنی مصلحت کو خدا بہتر مانتا ہے۔ اور ہمارے وارث، ہمارے والی، ہمارے امام، ہمارے
شہنشاہ، ہمارے ربیر، ہمارے آقا، ہمارے مرشد، ہمارے صاحب العمر و الزمان کا
ظہور فرما۔ ہمارا حوصلہ، ہمارے ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ہماری ہمتیں پست ہوتی جا رہی ہیں۔ دنیا
نے ہمیں بڑی طرح تنگ کر دیا ہے۔ ہم گھبرا کے کہتے ہیں کہ ہمارا والی و وارث آجائے۔
یہی محمد و آل محمد۔ رَبَّنَا ثَقِیلُ مَنَا اِنَّكَ اَنْتَ السَّیِّعُ الْعَلِیْمُ۔

مودة فی القربی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خداوند عز و جل جلالہ کی حمد و ثنا کے بعد حضرات عمر و آل عمر پر درود و سلام

حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ آج جو اس وقت ہمارا جلسہ ہے، یہ بسلا تشریف آوری حضور امام رضا ہے۔ آج دنیا میں ہمارے آٹھویں امام علیہ السلام تشریف لارہے ہیں اور ہم ان کی ادنیٰ رعایا اپنے شہنشاہ کی آمد کی خوشی میں اس سارے خاندانِ عصمت و طہارت کو بریڈ مبارکباد پیش کرنے کے لئے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ وقت کی مناسبت سے موضوع تو یہی ہے کہ یہی ذکر ہو، مگر وہ مضمون بڑا لمبا ہے اگر ساری بات نہ کہی جائے تو پھر سامعین کو کوئی لطف نہیں آئے گا۔

ہذا آج کی محفل میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ یہاں کچھ ایسے حضرات بھی تشریف فرما ہیں جو علمِ لغت کے ماہر اور واقف ہیں اسلئے ان حضرات کی خدمت میں ایک ایسے مہتمم کی حیثیت سے ذہن بھول گیا ہو وہ سبق دہرانا چاہتا ہوں۔ اس کا تعلق نہ عقیدت سے ہے نہ اس کا تعلق فقہ سے ہے اور نہ ہی اس کا تعلق حصولِ فقہ سے ہے۔ صرف اور صرف علمِ لغت کا منہ ہے جو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ اس لئے بھی کہہ رہا ہوں کہ یہاں یہ حضرات ٹیپ کرنے والے بھی بیٹھیں میری تقریر محفوظ بھی ہو جائے گی اور یاد بھی رہے گی۔ اس سے پہلے بھی میں یہ بات کہہ چکا ہوں۔ یہ ایسی بات نہیں ہے جو

نہی میں کہہ رہا ہوں۔ اس حیثیت سے نہی ہے کہ یہ بات علماء نے کبھی نہیں کہی۔ صرف جاہل آدمی نے کہی ہے اور وہ میں ہوں۔

اللہ نے کام مجید میں جبریل علیہ السلام کو پہنچا ہے۔ یہ فرمایا ہے —
 "قَدْ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمُوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى" یہ آیت ہے کلام مجید میں —
 اب اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہاں ہے تو چونکہ میں حافظ نہیں ہوں لہذا بتا نہیں سکتا۔ یقیناً ضرور ہے کہ ہے۔ یہ آیت اللہ کے لئے اتنا جاننا ضروری ہے کہ وہ ہے یہ جاننا ضروری نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ چاہے وہ قرآنِ صامت کی آیت ہو یا قرآنِ ناطق کی آیت ہو۔ اس لئے اتنا جاننا ضروری ہے کہ وہ ہے — اور آیت ایسی ہے کہ اس کے لئے حافظ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہر عقیدت مند مومن کے حافظے میں یہ آیت محفوظ ہے اسی آیت پر ہمارے اعتقادِ اصولی و فروعی کا دارومدار ہے۔ ہم اس آیت کو اپنے اعتقادات کی روح مانتے ہیں۔ اگر اسے بیچ سے نکال دو تو ہمارے تمام اعمال و افعال چاہے کتنے ہی فقیہ کے مطابق ہوں، وہ بے روح ہو جائیں گے۔ یہ آیت روح ہے ہمارے ایمان کی۔

اس آیت کے شروع میں اللہ نے لفظ "مُل" فرمایا ہے — قُلْ لَّوْ اَسْئَلُكُمْ
 — کلام مجید میں چند آیتیں ایسی ہیں جو "مُل" سے شروع ہوتی ہیں۔ حالانکہ ہر آیت اسی لئے نازل ہوتی تھی کہ رسول پر وہ آیت لے اور رسول وہ عوام سے نہیں سے۔ اصحاب سے، مسلمانوں سے کہہ دیں۔ جب ہر آیت اسی لئے آتی تھی کہ وہ کہی جائے تو بعض آیتوں کے شروع میں "مُل" کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی — کیا ان آیتوں کو رسول سنانا نہیں چاہتے تھے؟ کیا انہیں چھپا لینا چاہتے تھے۔ جو اللہ کو کہنا پڑا "مُل" — یہ کہہ دے —

رسول کے لئے یہ تاکید کی حکم آنا "مُل" کا۔ اس کے کیا معنی ہیں —

تفسیر کو چھوڑ کر مختصر لفظوں میں یہ نگلیہ یاد رکھیں کہ جن آیتوں کا انکار کفر محض بن جائے ان کے شروع میں اللہ تَعَالٰی کہہ دیتا ہے۔ "قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ" — اور اگر کسی نفل، والی آیت میں انکار کفر نہ بنتا ہو تو وہ فسوخ ہو جاتی ہے۔ بہر نوع یہ ایک اصول ہے قرآن کا — اس آیت میں بھی اللہ نے "تَعَالٰی" کہا ہے۔ اہل لغت حضرات جانتے ہیں کہ "تَعَالٰی" کے معنی ہیں "کہہ" — یہ تو ہماری زبان ہے۔ ہم اپنی ہی زبان میں اگر ذرا لفظ بدل دیں تو اس "کہہ" سے زیادہ لطف آ جائے گا۔ یہاں "تَعَالٰی" کے معنی "کہہ" ذکر کریں۔ بلکہ "تَعَالٰی" کے معنی یہ کریں کہ رسولؐ یہ کہہ رہے تھے بحکم خدا "تاہا کہہ" کہ "اُس بات کے قائل ہو جاؤ۔" یہاں "تَعَالٰی" کے معنی ہیں اس کے تم قائل ہو جاؤ۔ "مان لرا اس بات کہہ۔" نہیں ماننا پڑے گی یہ بات — "اُس کے ماننے بغیر گزارا نہیں ہے" اور جس بات کو منوایا جاتا ہے۔ اس کا طریق ادا یہ ہوتا ہے کہ اُسے نفی و اثبات میں ملا کے کہا جاتا ہے۔ پہلے نفی پھر اثبات — جس طرح —

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ — ویسے بھی کہہ سکتے تھے کہ اللہ وحدہ لا شریک ہے — مگر یہ لا اور اِلَّا نے اس کے منوانے کو مستحکم کر دیا۔ تو جہاں آپ دیکھیں لا اور اِلَّا، وہاں ماننا ہی پڑے گا۔

اسی طرح اس آیت میں اللہ نے کہا۔ "قُلْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ عَلَيْهِ اجْرُ الْاَلْمُودَةِ فِي الْعُسْبِيِّ" جس طرح خدا کے کلمہ میں لا اور اِلَّا ہے اسی طرح یہاں بھی لا اور اِلَّا ہے۔ جس طرح اُسے ماننا پڑے گا۔ اسی طرح اے بھی۔ ماننا پڑے گا۔ اس کا انکار اسی طرح بُرا ہے جس طرح لا وَاِلَّا اللَّهُ کا انکار ہے۔

اب یہ نوجوان بچے سامنے بیٹھے ہوئے کہہ رہے ہیں "لا اور اِلَّا"

تو آپ نے بتا دیئے۔ تیسرا لا اور اِلَّا ہمیں بھی یاد ہے —

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ — لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ عَلَيْهِ اجْرُ الْاَلْمُودَةِ فِي الْقُرْبِيِّ

اور سنا قیسا کہ اور اللہ اور بھی ہے۔ — وہ ہے "لا فحی
 اللہ علیٰ لا سیف اللہ ذوالفقار"۔ — یہ وہ کلمہ ہے
 جو اللہ پڑھتا ہے۔ سنا ہے عینی آواز آئی تھی "لا فحی اللہ علیٰ لا
 سیف اللہ ذوالفقار"۔ — اس کلمہ میں اتنی طاقت
 ہے "لا فحی اللہ علیٰ" میں اتنی قوت ہے کہ اگر ساری دنیا کے روی
 اکٹھے ہو کر کسی فرد یا جماعت کو بے دین و کافر کہیں۔ اگر وہ لا
 فحی کا سہارا لے تو کامیاب ہو جاتا ہے۔ اتنی طاقت اب بھی
 ہے "لا فحی" میں۔ یہ بات ماننا پڑے گی ہر ایک کو کہ "لا فحی" نفع دلاتا
 ہے۔ — بہ نزع یہ بھی ایک کلمہ ہے۔)

میرے محترم سامعین!

یہ جو آیہ مودۃ ہے۔ جسے اللہ نے یوں شروع کیا ہے۔ — "تل" "تائل ہو جاؤ۔
 کس بات پر۔ — "لا اسئلکم" — علم لغت کے ماہرین اگر عربی ادب کی لطافت
 پر ذرا غور کریں تو اتنا پیارا انداز ہے یہ "لا اسئلکم" اس سے زیادہ حسین اور پیارا انداز
 سمجھ میں آتا ہی نہیں۔ یہ کلمہ لائق تہنیتی فرماں نہیں ہے۔ کسی بڑے کا حکم نہیں ہے۔ کسی
 برابر والے کا کہنا نہیں ہے۔ بلکہ ایک محبوب کی فرمائش ہے۔ اتنا پیار ہے اس میں
 کہ اسے ادا کرنا شرافت کے خلاف ہے۔ انسانیت کے خلاف ہے۔ — اس
 اداسے بات ہو رہی ہے۔ "لا اسئلکم" میں تو نہیں مانگتا۔ — کتنے پیارے انداز میں بات
 کہی ہے "میں تو نہیں مانگتا۔ — میں تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ — تم مجھ سے مانگو۔ — تم مانگو
 جو چاہو۔ — میں تو نہیں مانگتا۔ — میں تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ — "لا اسئلکم" —
 مجھے پتہ ہے کہ "اسئل" اچھی چیز نہیں ہے۔ — بال جیسی عورت ہے۔ — مانگ سے
 فرق آجائے گا۔ — لہذا میں تم سے کچھ مانگتا ہی نہیں۔ — میں تم سے کیا مانگوں۔

میں تمہیں عطا کرنے آیا ہوں۔ مانگتے نہیں آیا۔ "وہ اسلمکم" میں تو نہیں مانگتا۔
 ابن سے نہیں مانگتا۔ اللہ گواہ ہے۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ مجھے مانگتا
 تھا؟ نہیں۔ میں نے کبھی مانگا ہی نہیں۔ تم سے میں کیا مانگوں گا۔
 میں نے تو اللہ سے بھی کبھی نہیں مانگا۔ جس سے ساری دنیا مانگتی ہے۔
 میں نے تو اس سے بھی نہیں مانگا۔ وہ بھی بار بار مجھے کہتا ہے "ربی زدنی علما"
 درجہ نہیں تو علم ہی مانگ لے۔ میں کہتا ہوں۔ "نہیں"۔ میں تجھ سے بھی
 نہیں مانگتا۔ میں تو اللہ سے بھی نہیں مانگتا۔

"قبلہ"

اللہ سے کیوں نہیں مانگتے۔؟

مجھے پتہ ہے۔ اگر میں مانگوں گا تو چاہے کتنی ہی بڑی شے مانگ لوں۔ وہ
 بڑی میری حیثیت کی ہوگی۔ بعد میں کیوں مانگوں۔ اگر اس میں ذرا
 سی ادائے محبوبیت شامل کر لو تو۔ اللہ کا دل چاہتا تھا کہ محمدؐ مجھ سے کچھ مانگے۔
 ہر حسب کا جی چاہتا ہے کہ محبوب کوئی فرمائش کرے۔ کچھ مانگے تو سہی۔ کچھ
 کہے تو سہی۔ اللہ سب کچھ دینے کو تیار تھا مگر اتنا غیور محبوب کہ کچھ نہیں
 مانگتا۔ ممکن ہے اللہ نے یہ خیال کیا ہو۔ (ان لفظوں پر قیاس نہ کرنا۔ اللہ
 کے واسطے کوئی لفظ ہے ہی نہیں دنیا میں۔ یہ تو ہم اپنا مطلب ادا کرنے کے لئے
 ان لفظوں کو سہارا لیتے ہیں)۔ ممکن ہے اللہ نے خیال کیا ہو کہ جمع میں مانگتا ہوا
 شرعاً ہے۔ تو ایک رات چلکے سے گھر بلایا اور کہا۔

"اب تو صرف اور میں ہوں۔ اور تو کوئی نہیں۔ پردے کی بائٹ
 ہے۔ اب مانگ لے"۔ پھر اللہ نے سوچا۔ چلو سنتی
 ہی نہنٹائی سہی۔ میں اللہ!۔ یہ بندہ!۔ یہ غیرت

تو اب بھی ہے نا آخر — اللہ اور بندے کی بات ہے —
 تو اللہ نے اللہ بن کر بات نہیں کی وہاں پردے میں — بلکہ اس طرح
 بول رہا تھا — یہ معلوم ہوتا تھا جسے بھائی بول رہا ہو — ”اب
 مانگو — مانگ کیا مانگتا ہے“

مگر اس غیرت دار بندے نے وہاں بھی کچھ نہ مانگا — جس نے اللہ
 سے کچھ نہ مانگا۔ وہ ہم جیسے ذلیل بندوں سے کہہ رہا ہے — ”میں تم سے کچھ نہیں
 مانگتا —“ ”اسلام“ میں نہیں مانگتا — میں نہیں کہہ رہا — اللہ نے کہا ہے
 ”تعل“ اب جو تم سے کوئی شے مانگی جا رہی ہے وہ میں نہیں مانگتا — وہ مانگ رہا ہے
 وہ مانگتا ہے تم سے — میں نہیں مانگتا — اُس نے کہا ہے تعل — میں نہیں
 مانگتا —

”سورۃ! پھر فرماؤ نہ کچھ — کیا مانگتا ہے وہ — کیا چاہتا ہے وہ —“
 جتنے مریجے والے تھے وہ آگے اپنی جائیدادیں لے کر — پیسے والے پیسے لے کر
 — دولت والے دولت لے کر — رسولؐ نے فرمایا — ”نہیں — میں
 تمہارے مریجے نہیں مانگتا — میں تمہارے پیسے نہیں مانگتا — میں تمہاری دولت
 نہیں مانگتا — تمہارا کوئی سناؤ نہیں مانگتا —“
 پھر قبیلہ کیا مانگتے ہو؟

”میں تم سے“ اجر“ مانگتا ہوں — میں تم سے اجرت بہانتا ہوں“
 حضرات علمائے کرام!

و خدا تمہارے علم و فضل میں برکت عطا فرمائے — آپ کے علم میں خدا ایسی
 طاقت دے کہ آپ میں فرسٹ اسٹیج پیدا ہو جائے — کبھی کبھی غریب شہر جاہل
 کی گفتگو بھی اسٹیج کے نکتہ سے غور فرمایا کریں — مر جاؤں گا تو یاد رکھو کہ کوئی دیوانہ

بناتے ہیں — وہ ہم سے اپنی اُجرت مانگتے ہیں۔ کہ ہمیں اپنی کمائی کا رسواں حصہ بھیج دیا کرو۔ کیوں کہ تم نے ہمیں نبی بنایا ہے — اور جنہیں اللہ نبی بنائے وہ ضائع کہتے ہیں "ان اجراء علی اللہ" — "ہمیں تم سے کیا واسطہ ہے۔ جس نے ہمیں رسول بنایا ہے، وہ ہمیں اجر دے گا — اور تم کہتے ہو کہ اُس نے رسالت کی اُجرت مانگی تھی — یہ بہت بڑی جہالت ہے — رسول، ہم سے اپنی رسالت کی اُجرت مانگ سکتا ہی نہیں — اور رسالت میں اُس نے سکھایا کیا ہے — نماز پڑھو۔ روزہ رکھو۔ حج کرو — یہی باتیں ہیں نا جو ہمیں سکھائی گئی تھیں —"

کیوں علمائے کرام! کیوں فقہائے عظام!

نماز سکھانے کی اُجرت لینا جائز ہے؟ — ناجائز ہے — ہمارے لئے تو کہہ دیا — ناجائز — اور خود یہی چیزیں سکھانے کہتا ہے کہ "مجھے اُجرت دو" — یہ کیسے ہو سکتا ہے — ان چیزوں کی کوئی اُجرت نہیں دیتا۔ رسالت کی کوئی اُجرت نہیں — مگر مانگی اُجرت ہے — پھر اُجرت کس بات کی؟ — قرآن میں لفظ "اُجر" موجود ہے — مانگی ہے اُجرت ہی — کیا آدمی کے ذہن میں یہ بات نہیں آ سکتی — کہ رسالت کی اُجرت اگر نہیں ہے تو پھر رسول کس بات کی اُجرت مانگتا ہے — پوری توجہ ہے نا صاحبان!

یہ وہ چیزیں ہیں جو تفسیروں میں ہیں نہ کتابوں میں ہیں اور نہ ہی علماء کی زبان پر ہیں — یہ صرف مجھ جاہل آدمی کے ذہن میں آگئی تھی بات جو میری آج آپ کی خدمت عالی میں بیان کر رہا ہوں — ہو سکتا ہے ساری غلطیوں میں یہ ضد تو نہیں کرتا کہ میری ہر بات صحیح ہے — مگر ابھی تک کسی نے غلط کیا نہیں — چنانچہ ایک دفعہ ایسا

نفسہ بنا میں نے کراچی میں اسی مضمون کو دس دن میں متواتر دس مجلسوں میں بیان کیا۔
— مولوی صاحبان کہیں — ”واہ — ہماری اب تک کی ساری تفسیریں

نقط کرتا ہے۔“ — میں نے کہا۔ — ”میں تفسیری بات نہیں کر رہا۔ — لغت کی بات
ہے۔ — تفسیر میں میرا کوئی دخل نہیں۔ — تفسیر تو اس کی میں وہی مانوں گا۔

جواب فرمائیے گے۔ — یہ صرف علم ادب کی حیثیت سے معافی دیاں اور صرف دستخط
کی حیثیت سے علم لغت میں گفتگو ہو رہی ہے۔ — چنانچہ ایک سٹھ جہانی میں کراچی میں۔
وہ مبری ساری گفتگو لکھ کر ”جامعہ ازہرہ“ لکھے گئے۔

ایک شخص لغت کے اعتبار سے اس آیت کے منعلق یہ کہتا ہے۔ — فرمائیے
یہ صحیح ہے یا غلط ہے؟ وہاں سے جواب آیا۔ — لغت کے اعتبار سے صرف
یہی صحیح ہے۔ —

پھر لوگوں کو کچھ حوصلہ دیا۔ — ”زیدی بھی کچھ جانتا ہے۔ — ورنہ میں تو کچھ
جانتا ہی نہیں تھا۔ — آپ نے میری ہزاروں تقریریں سنی ہوں گی۔ — عربی میں نہیں
پڑھتا۔ — انہیں میں نہیں پڑھتا۔ — حدیثیں میں نہیں پڑھتا۔ —

سیدھی سادھی لغت کی بات ہے۔ — کہ رسولؐ نے ہم سے انگی اجرت ہے۔
بات یہ ہے حضور! رسولؐ کے فرض ہیں۔ — ہے کہ وہ خدا کے احکام ہم تک پہنچائے

— اور ادائے فرض میں اجرت نہیں ہونی۔ — جس طرح
میلے آیا ہوں لاہور سے۔ — تاکہ مجلس پڑھوں۔ — گھر سے چلا اسی نیت سے

ہوں۔ — بلایا اسی لئے گیا ہوں۔ — اگر کوئی صاحب مجھے یہ کہہ دے ”زیدی صاحب جلیل
تو آپ نے پڑھنی ہی ہے۔ — ذرا میرا خط بھی لکھ دیں۔“ — تو یہ خط لکھنا میرے فرائض

میں نہیں ہے۔ — فرض سے زائد کام مجھ سے لےنا چاہیں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ چیز میرے
فرائض میں نہیں ہے۔ — لہذا حکم الہی کا پہنچانا یہ رسولؐ کے فرائض میں ہے۔ —

بخشش کی راہیں دکھانا یہ رسولؐ کے فرائض میں ہے۔ — نجات کے راستے بتانا یہ رسولؐ

کے فرائض میں ہے — — — ’مخلفا کے جنت میں لے جانا یہ رسولؐ کے فرائض میں نہیں ہے — — — یہ تمہارے اوپر بوجھ ہے — — — جنت کے سارے راستے بتا دینا رسولؐ کے فرائض میں ہے اور تمہیں جنت میں لے جانا۔ یہ رسولؐ کے فرائض میں نہیں ہے۔ اب اگر تم کبھی رسولؐ کے سر جو جاؤ قبلہ!

”جنت میں لے بھی جاؤ — — — تو رسولؐ کہے گا۔ ”یہ میرے فرائض میں نہیں ہے۔“ ہم نے پھر عرض کی ”قبلہ — — — آپ شفیع ہیں — — — آپ ہماری شفاعت فرمائیں — — —“ تو رسولؐ نے فرمایا — — —

”بھائی! میرے فرائض میں تمہاری شفاعت نہیں ہے۔ — — — جہاں تک میرے فرائض کا تعلق ہے۔ — — — وہ ہے۔“

یہ چار کلام ہیں — — — شفاعت اس میں کہاں ہے — — — ان چار کاموں کی اجرت نہیں مانگ سکتا۔ یہ میرے فرائض میں ہے، شفاعت کا زمانہ ہم تم میرے ذمے لگا رہے ہو۔ میں نہیں کرتا شفاعت تمہاری — — — جاؤ — — — اب ہم تمام رسولؐ سے کہتے ہیں یا رسول اللہ! ہماری شفاعت کرو۔ رسولؐ فرماتے ہیں — — — شفاعت کا نام میرے فرائض میں نہیں ہے۔ — — — میرے صاحب سے جاؤ سارے جہنم میں یہ کیا کروں۔ میں نے تمہیں نجات کا راستہ بتا دیا ہے۔ شفاعت میرے ذمے نہیں ہے۔ — — — آخر جب ہم نے مجھ کو کہا — — — تو رسولؐ نے کہا — — — ”دیکھو۔ میں جوں سر ہماری ملازم — — — مجھے اللہ نے بنایا ہے رسولؐ — — — اور یہ میرے فرائض میں ہے کہ ایک ذمہ دار انسان اپنی گرفتاری سے اجازت لئے بیزنس SIDE BUSINESS نہیں کر سکتا — — — اگر تم مجھ سے یہ (SIDE BUSINESS) شفاعت کا کروانا چاہتے ہو تو اس کی اجازت میں اللہ سے لوں گا۔“ کیوں اللہ! اجازت ہے۔ — — — میں شفاعت کروں اس کی — — —

تو اللہ نے بڑے غصہ میں جواب دیا " من فاقذی لیشفع عندک اللہ باذنیہ کہن
 ہوتا ہے شفاعت کرنے والا " — رسول! چپ ہو گئے — مگر عوام سر میں آپ
 رحمت ہیں — آپ آخری نبی ہیں — ایک دفعہ پھر کہہ دو نا اللہ سے — اور رسول
 نے پھر کہا — اللہ نے اس میں تحقیق کر دی — کوئی شفاعت نہیں کر سکتا — مگر
 وہ رسول جس سے اللہ راضی ہو — رسول! بھی راضی ہو گئے۔ چلو اللہ محمد سے راضی
 تو ہے۔ — میں شفاعت کر سکتا ہوں —

پلیک اتم مجھ سے شفاعت چاہتے ہو — خدا نے مجھے تمہاری شفاعت کا حق
 دے دیا ہے۔ — اگرچہ یہ میرے فرائض میں نہیں ہے۔ — یہ فرائض سے زائد کام ہے
 جو تم مجھ سے لینا چاہتے ہو۔ — اللہ نے کہا محمد! سُنتے بھی ہو۔ یہ
 کام مفت نہ کرنا۔ یہ کام تیرے فرائض میں نہیں ہے۔ — تو اس کی ان سے اجرت
 لے۔ — جو اجرت دے دے۔ اس کی شفاعت کر۔ اور جو اجرت نہ دے۔ وہ
 جائے جہنم میں۔ — رہ گیا یہ تلاوت آیات کرنا۔ نازیں سکھانا۔ روزے سکھانا۔
 پاس بٹھانا۔ — پیا کرنا۔ محبت کرنا۔ اپنے ساتھ رکھنا۔ — یہ تیرے فرائض میں ہے
 یہ سب آپ سے ماخذ کر۔ راجحت بہیم ہیں سکھانا۔ جو اس کی اجرت دے اس کو
 شفاعت کر۔ جو نہ دے پائے جہنم میں۔ — SIDE BUSINESS ہے تیرا۔ اس کی
 اجرت نہ لے۔ — چنانچہ اس نے کید دیا۔ — لا اسٹاکھ میں تم سے نہیں لگتا
 — علیہ۔ اس بات پر دہ علیہ کی زمین لاکوئی۔ — یہ تو ہونا چاہیے نا۔
 رسالت تو کبھی نہیں۔ — اس بات پر جو تم مجھ سے مانگ رہے ہو۔ یہ مرجع نوافق
 ضمیر ہے) — جو تم مجھ سے مانگ رہے ہو شفاعت۔ اس بات پر میں تم سے
 اور کوئی اجرت نہیں چاہتا۔ — تب شفاعت کروں گا۔ جب تم اجرت دو گے۔
 تو جو ہے نا صاحبان

شفاعت کے متعلق بھی دو لفظ کہہ دوں — شفاعت کے معانی ہم غلطی سے سمجھ بیٹھے، سفارش — حالانکہ سفارش اور چیز ہے۔ شفاعت اور چیز ہے۔ جس حکومت میں سفارش سے کام ہوتا ہو۔ وہ نااہل حکومت ہے۔ جس طرح ایک نالائق آدمی کی سفارش ہوتی — وہ افسوس کیا — ایک تابل بے چارہ رہ گیا۔ یہ حکومت کوئی اچھی حکومت ہے دنیا میں؟ تو اگر اللہ کے یہاں بھی سفارش چلنے لگی — گویا حکومت کیا ہوتی۔ بچہ سسکی شنایا ہی ہوتی

رسولؐ نے کہا۔ میں سفارش کسی کی نہیں کروں گا — میں تو شفاعت کروں گا — اب شفاعت کے کیا معانی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ حالانکہ ایک مولوی تھا — مگر اتفاق سے میں ایک زمیندار کے گھر پیدا ہوا تھا — تقوڑی بہت زمینداری بھی جانتا تھا — شفاعت کے معانی سمجھ میں آگئے —

ایک زمین تھی آپ کی — ساتھ بنا لگتا تھا کسی اور کی زمین کا — اُس نے بیچ دی — آپ نے کہا میں تو اس پر شفعہ کرتا ہوں — کیوں کہ میرا بنا لگتا ہے — یہ بے شفاعت) — جہاں آپ کی حد لگتی ہو جہاں آپ کا بنا لگتا ہو۔ اُسے دوسرے تک نہ جانے دیں — اسے شفاعت کہتے ہیں — اب دنیا میں کوئی آدمی ایسا نہیں ہے جو ساری نیکیاں ہی نیکیاں کرے — ایسا بھی کوئی نہیں جو ساری بریاں ہی بریاں کرے — ہزاروں بُرائیاں کیں۔ ایک آدمی کی جی — ہزاروں نیکیاں کیں۔ ایک آدمی بڑی بھی — تو جتنی برائیاں کی ہیں۔ اتنا اس میں حصہ۔ بے شیطان — اور جتنی اچھائیاں کی ہیں۔ اتنا اس میں حصہ دار ہے رسولؐ — چونکہ رسولؐ کا بنا لگتا ہے شیطان کے بتے کے، حصہ — قیامت کے دن شیطان کہے گا — میرا حق ہے — تو رسولؐ حق شفعہ کرے گا — اسے شفاعت کہتے ہیں — اسے کہتے ہیں۔ المیزانِ حق قیامت میں میزانِ قائم ہوگی — میزان کے معانی ہیں۔ "تو لوجائے گا کہ کس کا پڑ بھاری ہے۔"

شیطان وار بھاری ہے یا محمد والا بھاری ہے — اب اُس ترازو میں ہم تھے
 اتفاق سے شیطان نامراد کا پلا بھاری بھاری چل آیا — اعمال جو ہمارے ایسے ہی تھے — اس
 موقع پر رسولؐ نے ہمیں کہا ہے کہ

اگر تم میری شفاعت چاہتے ہو تو

دیکھنا مجھے شرمندہ نہ کرنا دہاں۔ میرا مقدر تم جانا دہاں۔ ہر آنہ دینا۔ گناہوں کا۔ پلا کم رکھنا
 — اور اگر اس کے باوجود بھی کم رہ گیا —
 تو پھر نکر نہ کرو۔ پروا نہ کرو۔

میں نے ایسے بندے کھڑے کر دیئے ہیں کہ جن کے اعمال کی اتنی انتہا ہے کہ ان کو جمع
 تو کسی نے کیا ہی نہیں۔ نہ ان کا حساب ہوگا۔ وہ بے حساب بندے ہیں۔ جمع وہاں
 ہوتا نہیں۔ اگر ان کی ضرب کو تقسیم کر دیا جائے تو ثقلین کے لئے کافی ہے۔

بہر نوع۔ رسولؐ نے فرمادیا کہ تمہاری شفاعت میں کروں گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ
 تمہیں اُجرت دینا پڑے گی۔ بغیر اُجرت کے شفاعت ممکن ہی نہیں ہے —
 اب لوگ حیران ہیں۔ اللہ جانے — لاکھ روپیہ مانگے گا۔ پچاس روپیہ مانگے گا۔
 — دن کیا، گئے گا۔؟ ہم غریب کیا کریں گے؟۔

رسولؐ نے کہا — غریبوں۔ نکر نہ کرو۔ میرے یہاں امیر و غریب کی کوئی تمیز
 نہیں ہے۔ میں ایسی چیز مانگوں گا جس میں نہ امارت کی ضرورت ہے۔ نہ غریب کی ضرورت
 ہے۔ نہ وقت کی ضرورت ہے نہ قیمت کی ضرورت ہے — جو ہر شخص، ہر وقت ادا
 کر سکتا ہو۔ ایسی اُجرت مانگوں گا۔ اور وہ یہ مانگتا ہوں کہ "مودۃ فی القربی" اگر شفاعت
 کی اُجرت چاہتے ہو تو بس ایک ہے۔ اور وہ ہے "مودۃ فی القربی" —
 اب حضرات! علمائے کرام! مفضل! یہاں میری مدد فرمائیں کہ "مودۃ فی القربی" کا اُردو
 میں ترجمہ کیا ہے؟ — رسولؐ نے ہم سے اُجرت کیا مانگی۔ "مودۃ فی القربی" اس

کا اردو میں کیا ترجمہ ہے —

میرے سامعین! آج تک اردو زبان نے وہ الفاظ بنائے ہی نہیں جو مورت فی القریٰ کا ترجمہ کر سکیں۔ جتنے بھی ترجمے ہوتے ہیں، وہ لفظ نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً ایم ادھر اور سے بیر پھیر کر کے کہہ دیتے ہیں۔ ورنہ کوئی اردو زبان میں لفظ ہی نہیں جو مورت فی القریٰ کا ترجمہ کرے — اور جو ترجمہ کیا جاتا ہے وہ ہے — میں تم سے اُبرت چاہتا ہوں قریٰ کی محبت کی — مورت کے معانی محبت کیا جانا ہے — لے اہل ذوق! تمہارے — سننے کی بات ہے —

نوجوان طبقہ! عجز سے سننا۔ میرے جیسے بڑھتو! تم بھی سننا — کیا اُبرت مانگی رسولؐ نے بقول تمہارے ترجمہ کے — "محبت" — ایسے سے کہو۔ محبت کوئی — مانگنے کی شے ہے — محبت کا کہیں مقابلہ ہو سکتا ہے — محبت طلب کی جا سکتی ہے — اگر میں کہوں

"بیر عمل کے سیدو! بڑھے، نوجوانو، بچو! میں تم سے بیعت لہ کرنا ہوں کہ مجھ سے محبت کرو" — سب کہیں گے۔ بڑھے کا دماغ خراب ہو گیا ہے — جہلا محبت ہی کہیں مانگے سے ہوتی ہے — جہلا محبت ہی کہیں طلب سے ہوتی ہے —

— اب سب کہیں گے "ہم کیوں کریں آپ سے محبت" — میں کہوں گا "میں بہت سونبا ہوں" اس لئے مجھ سے محبت کرو — بچتے در نہیں گے۔ تم نے کبھی آئینہ میں شکل بھی دکھی ہے۔ اپنے آپ کو سونبا تار ہے ہو — مگر دلیل کیا ہے۔ میرے پاس مگر میری ماں کہتی ہے۔ میں بہت ہی سونبا ہوں — اب تم ہنسو گے یا نہیں؟ — تم کہو گے — اماں تو ٹھیک کہتی ہیں۔ پر اماں کی ہر بات سچی ماننے کے قابل نہیں ہوتی — چاہے "اماں" ہی کیوں نہ ہو — اماں تو اپنوں کی طرف سے ہی میں بات کر دیتی ہے، —

بہر ذرا محبت مانگی نہیں جاتی — محبت کی نہیں جاتی۔ محبت ہو جاتی ہے — اور جو شے ہو جائے۔ اُس کا مطالبہ نہیں ہوتا۔ نہ ہی اُس پر جزا و سزا ہوتی ہے — مطالبہ اُس شے کا ہوتا ہے جو کی جائے۔ اُس کا نہیں ہوتا۔ جو ہو جائے — لہذا مودت کے معانی محبت نہیں ہے — محبت اور پیار ہے — مودت اور چیز ہے۔ مودت کی جاتی ہے۔ محبت ہو جاتی ہے — اور

علم و معانی و بیان — ہر زبان کا یہ فیصلہ کر چکا ہے دعویٰ کا ہو۔ فارسی کا ہو — اردو کا ہو یا انگریزی کا ہو۔ ایک ہی زبان کے دو لفظ کبھی ہم معانی نہیں ہو سکتے — مودت بھی عربی کا لفظ ہے۔ محبت بھی عربی کا لفظ ہے — کبھی ایسا ہو سکتا ہی نہیں کہ مودت کے وہی معانی ہوں جو محبت کے ہیں۔ محبت کے وہی معنی ہوں جو مودت کے ہیں — اگر دونوں ہم معنی ہوتے تو دوسرا لفظ بنانے کی ضرورت ہی نہ ہوتی — کوئی فرق ہے معانی میں جو دوسرا لفظ بنانا پڑا۔

میرے محترم سامعین!

اب پوچھو۔ مودت کیا ہے۔ محبت کیا ہے؟

”محبت“ تو وہی ہے جو ہو جاتی ہے۔ اور مودت کی جاتی ہے اگر ہم ذرا لفظوں کو بڑھا کر ان کے معانی بیان کریں تو یہ کہوں گا کہ — محبت وہ ہے جس پر برائے قربان ہو جائے — وہاں محبت ہوتی ہے۔ اور جس پر محبت قربان ہو جائے۔ وہ مودت ہے — لہذا محبت ہو جاتی ہے۔ مودت کی جاتی ہے۔ — رسولؐ نے ہم سے ”محبت“ نہیں مانگی — ہم سے مودت مانگی ہے۔ ”مودتہ فی القربانی“

اب میں مثال سے اسے سمجھانا چاہتا ہوں کہ اسے اصطلاح میں ”تاویل بالمعنی“ کہتے

ہیں ”ترجمہ چونکہ نہیں آتا مجھے مودت کا۔ اس لئے مثال سے سمجھاتا ہوں“

سب سے اعلیٰ قسم محبت کی۔ سب سے بڑھیا
 قسم محبت کی۔ سب سے بہترین قسم محبت کی۔ وہ ہے جہاں کو ہوتی ہے اپنے بچے
 سے محبت۔۔۔ توجہ فرمائی صاحبان! — اسی لئے ہندی میں، بھاشا زبان میں جرنیک
 حسین ترین زبان ہے۔ اس میں ماں کی محبت کے لئے لفظ ماما رکھا ہے۔ اور کسی محبت
 کو یہ نہیں کہا گیا۔ ماں کی ماما۔ باقی کسی محبت کو یہ نہیں کہا گیا۔ ماما۔ — اگر
 محبت کی سب سے اونچی قسم کوئی ہے دنیا میں تو وہ ہے ماں کی محبت۔ اور اس کی
 مثال وہی ہے جہاں ہزاروں دفعہ سنا چکا ہوں۔ اب پھر سنا دوں۔

مولانا میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ ان سے میں نے سنی ہے یہ بات کہ جب مدرسے
 میں پڑھتے تھے (دکھ تو اس بات کا ہے کہ میں کبھی پڑھا ہی نہیں کسی مدرسے میں۔ ایسا
 ماما۔ گا اُمتی بنا ہوں کہ پڑھا ہی نہیں۔ بہتیرا کہا استادوں نے۔ کتاب پڑھ لو۔ میں نے کہا
 کتاب کافی ہے۔ کتاب کا وجود ہی کافی ہے۔ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے) —
 مولانا کہتے ہیں کہ انہوں نے پڑھا تھا پرائمری کی کتابوں میں کہ ایک بچہ تھا۔ اور دو
 عورتوں میں جھگڑا ہو گیا۔ ایک بے میرا بچہ ہے۔ دوسری بے میرا بچہ ہے۔ دونوں
 لڑتی لڑتی پنہیں حاکم وقت کے پاس۔ حاکم کوئی بڑا ہی سمجدار قابل تھا۔ اس نے کہا کہ اس
 کا فیصلہ یوں کرو۔ اس بچے کو کاٹ کے دو حصے کر کے۔ ان میں آدھا آدھا بانٹ دو۔
 جب یہ فیصلہ ہوا جو جھوٹی ماں تھی۔ وہ توجہ رہی۔ اور جو بچی تھی اُس نے کہا
 ٹھہرو۔ اس بچے کو کچھ نہ کہنا۔ یہ اسی کو دے دو۔ میں دعوتے واپس لیتی
 ہوں۔ — — — یہاں سے پتہ چلا اصلی ماں کا — اور پھر مولانا نے جو بات
 مجھے سکھائی۔ وہ یہ ہے کہ اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ —

جب چیز ہو ایک۔ اور دعویدار ہوں دو۔ ایک ہو جھوٹا۔ ایک ہو سچی۔
 اگر اس شے کے گردنے کا اندیشہ ہو تو سچا گھر بیٹھ جاتا ہے۔

— گویا ماں کی محبت۔ سب سے بڑی محبت ہے

— اگر مودت کے معنی "محبت ہوتے تو زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے تھے۔

"ماں والی محبت" مانگی ہوگی — مگر ماں والی محبت بھی نہیں مانگی — بلکہ مودت مانگی ہے۔ "مودت" وہ ہے جس میں "محبت، قربان ہو جائے۔

اب بتاؤ ماں کی محبت یہ برداشت کر سکتی ہے کہ وہ زندہ رہے اور بیٹا مر

جائے؛ — مجبوری اور بات ہے کہ ماں زندہ ہے اور بیٹا مر جاتا ہے —

مگر کوئی ماں چاہتی ہے ایسا؟ کسی ماں کی خواہش ہے کہ بیٹا مر جائے۔ — کوئی ماں خواہش کرے گی کہ میرا بیٹا بیمار ہو جائے۔ کسی ماں کی تمنا ہے کہ میرا بیٹا زخمی ہو جائے

— ہے؛ نہیں — مگر جب مودت آجائے تو مائیں — رات بھر منت

مانتی ہیں۔ — نکل کو پہلے میرے بیٹے کی لاش آئے — "پہلے میرے بیٹے کی میت

آئے" — جہاں سے تمنا کروادے "موت کی" — "مودت ہے" — یہاں

محبت قربان ہو جاتی ہے۔ مودت پر —

لہذا رسولؐ نے تم سے مودت مانگی ہے "قربانی کی" — دافوس اس بات کا ہے

کہ اردو زبان میں لفظ نہیں ملتے۔ مودت، کا ترجمہ کرنے کے لئے۔ اس لئے

لفظوں کی بیرونی پھیر سے کوشش کی ہے کہ مودت کا مطلب آپ کی سمجھ میں آجائے،

بہر نوع جس پر ہر شے قربان ہو جائے۔ وہ محبت ہے۔ اور جس پر محبت

قربان ہو جائے۔ وہ مودت ہے۔ لہذا رسولؐ مودت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور

مودتِ حیرت ہے شفاعت کی — اور رسولؐ سے شفاعت چاہتے ہو۔ تو مودت

کردو — اب سوال پیدا ہوتا ہے —

مودت کس سے کریں۔ کون ہے اس قابل جس سے مودت کریں۔ اس کے

لئے قرآن نے کہہ دیا "فی القربیٰ"

تمام دنیا کے اہل لغت سے خطاب ہے قبلہ !
 مودت فی القربیٰ کا ترجمہ کیا بنا۔؟ — "مودت کرو" کس سے "قربیٰ" سے ت
 — یہ سے "کون سے لفظ کے معانی سے بنا ہے — لفظ سے کس لفظ کے
 معانی سے بنا ہے —؟ عربی میں " سے " کے لئے لفظ ہے "من" —

— اور آپ نے ترجمہ کیا ہے " سے " —

اگر ہوتا " مودت من القربیٰ " — تو آپ کا ترجمہ صحیح ہوتا — "قرین سے مودت
 کرو" — مگر یہاں ہے " مودت فی القربیٰ " — "فی" کے معانی " سے " آپ
 نے کیسے کر دیا — "فی" کس لغت میں " سے " کے معانی ہے؟ — یہیں سے
 یہ عاورد بنا ہے کہ — "اس بات میں کوئی 'فی' ہے" — یعنی کوئی نکتہ ہے —
 کوئی خاص بات ہے — جب ہی تو یہاں فی کہا گیا ہے — تو یہاں "من"
 نہیں کہا — فی کہا ہے — اور "فی" کے معانی ہیں "میں" — تو یہاں "میں"
 جی مناسب نہیں بیٹھا — اب مجھے "فی" کے معانی جی سمجھانے کے لئے وہی
 "تاریخ المعنی" کر کے ذرا لمبی سی گفتگو کرنا پڑی —

ع ن زبان میں "فی" سمجھانے کے لئے ایک عاورد ہے۔ السمك في الماء
 یعنی مچھلی پانی میں — اگر مچھلی پانی میں نہ ہو تو وہ مچھلی نہیں رہتی — اگر ہم اُسے
 پکڑ کر گھر سے آئیں تو وہ مچھلی نہیں رہتی — مچھلی تو جب بھی مچھلی ہے۔ مگر —
 السمك في الماء کیا مطلب ہے —؟ یہاں "فی" آپ کی سمجھ میں آجائے گا —
 مچھلی پیدا کہاں ہوتی ہے —؟ پانی میں — پتی بڑھتی کہاں ہے —؟ پانی میں —
 اس کی غذا خوراک کہاں ہے —؟ پانی میں — اس کا مرکز حیات کہاں ہے —؟
 پانی میں — اس کا سونپیدی تعلق کس چیز سے ہے —؟ پانی میں — اُس کا کتبہ
 تباہ — رشتہ ناط — سب کہاں ہے؟ پانی میں — پانی سے اُسے جدا کر دو۔ تو وہ

تڑپے گی — مابھی بے آب۔ آپ نے سنا ہی ہوگا — اور پانی کی یاد میں تڑپے
 تڑپ کر جان دے دیتی ہے — پھر آپ نے اس کی کھال کھینچ لی — اُس کے
 ٹھوڑے کر دیئے — اُس میں نمک سرچ ملا کر اُسے بھون ڈالا — اور بھون کے
 کھایا — آپ نے تو ختم کر دیا نا پھلی کو۔ کھا کے آبیٹھے مجلس میں — غٹوڑی
 دیر ہوئی تھی — پیاس لگی — پانی پیا — پھر پیاس لگی — پھر پانی پیا — اور جیب پلو بھا
 آج بہت پانی پی رہے ہو — تو کہا صاحب پھلی کھائی ہے — یہ ہے رشتہ
 پانی سے پھلی کا — اگر پیٹ میں ایک ریزہ بھی اس کا باقی رہے گا — پانی۔ پانی
 کہے گا — اس رشتے کو لفظ "فی" سے ادا کیا جاتا ہے — تم مودت کرو
 "فی" والی — یعنی دنیا ٹھوڑے کر دے — بھون ڈالے۔ جلا دے۔ بھلے
 — اگر ایک ریزہ بھی باقی ہے۔ تو "قریبی" ہی کو پکارتے رہنا۔ دوسرے
 کا نام نہیں — یہ مطلب لفظ "فی" سے ادا کیا ہے — "من" میں یہ لفظ
 کہاں تھی جو "فی" میں لطف ہے —
 بہر نوع۔ قریب سے مودت کروانی۔ والی۔ جس طرح پھلی کو ہے پانی سے

محبت —

میرے سامعین! اب میں اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتا ہوں۔ کہ سوال نے
 ہم سے یہ کہا ہے کہ میرے قریب سے مودت کرو۔ اور قریب کے بچے ہیں۔
 ق۔ ر۔ ب۔ ی اور الف۔ "ی" والا۔ جسے موسیٰ کا لفظ — عیسیٰ کا لفظ
 — وہی ہے مگر قریب کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے "قرابت داروں" — یہ ہمارے
 ذہن کو الجھانے کی ایک چال ہے — عربی میں دعوہ یزہ کو دقریب کہتے ہیں۔
 اور اگر بہت سے عزیز ہوں تو انہیں "قربا" کہتے ہیں۔ جس طرح عالم کی جمع علماء۔

حکیم کی جمع حکماء۔ طالب علم کی جمع طلباء اور قریب کی جمع قرباء۔ مگر یہاں سے "قرنی" دقرباء نہیں بلکہ "قرنی" ہے۔ اگر لغت "بوسیدھا اور "ر" پہ ہوتا ضمیر۔ تو ہوتا "قرباء"۔ پھر ہوتے قربات دار۔۔ مگر یہاں تو ہے "سما" ساکت اور "السن" ہے "ی" والا۔۔۔ یہ ہے "قرنی"۔

اب ان لغت والوں سے پوچھو۔ ان ۶ بنی دانوں سے پوچھو۔۔۔ بتاؤ۔ "قرنی" کیا شے ہے۔ "قرنی" کیا چیز ہے؟۔۔۔ "قرنی" کے معنی علم لغت میں صرف اور صرف یہ ہیں "انعل ولفنیل مؤنت واند"۔ اب یہ ترجمہ ہو گیا۔۔۔ "قرنی" والی "مؤنت" کرواؤ اس ایک دخاتون سے جو ساری کائنات میں مجھے سب سے زیادہ قریب ہے۔ بس یہ لفظی ترجمہ ہے اس کا۔۔۔ اس کے علاوہ اگر کوئی شخص اس کا ترجمہ پیش کر دے تو میں ساری عربی چھوڑ دوں۔۔۔ بتاؤ دنیا کے عربی دانوں سے پوچھ لو۔ سوائے اس کے کوئی اور ترجمہ ہو سکتا ہی نہیں۔ "اس خاتون سے جو دنیا میں مجھے سب سے زیادہ قریب ہے"۔۔۔ قرنی کا مطلب ایک خاتون۔۔۔۔۔

اب اگر میں کہوں "بیوی" مثنیٰ۔ تو وہاں اتفاق سے نو تخبیں۔ ایک نہیں بنتی۔۔۔ اور اگر کہوں۔۔۔ ان تہی۔۔۔ وہ اس آیت کے نمبر۔۔۔ بعد اعلان رسالت سے پہلے فوت ہو چکی تھیں۔۔۔ اب ایک خاتون تلاش کر دو۔ جو نزول آیت کے وقت جو، اور ایک ہو۔۔۔ ایاد رکھو ایک کے بغیر کام نہیں چلے گا۔۔۔ چاروں طرف نہ دیکھو۔۔۔ قرنی، جو۔ ایک ہو۔۔۔ ہم کہتے ہیں "اللہ میاں"۔ یہ ایک معنی بن گیا۔ تو ہمیں اس معنی کو اس کے بتا کر "قرنی" بھی بن جائے۔ اور ایک بھی رہے۔۔۔

اللہ نے کہا - ”میں اسے ابھی حل کرتا ہوں۔“

”مسد!“

زرا سی تکلیف کرو۔ یہ عقدہ حل کرو۔“

”کیسے؟“

”گھر میں جاؤ۔“

”کس کے گھر میں؟“

”اپنے گھر میں۔“ ازواج کے گھر مت جانا۔ ازواج کے گھر ازواج کے

گھر نہیں ہیں۔ وہ ہے ”بیوت النبی۔“

ازواج جن گھروں میں رہتی تھیں وہ نبی کے گھر تھے۔ ان کے گھر نہیں تھے۔

رواں جو یہ کہا گیا ہے ”وَقَدَرْنَا فِيْ بَيْوتِنَا“ ————— اس کا

مطلب یہ ہے کہ جن گھروں میں تمہیں نبی نے بٹھا دیا ہے اس سے باہر مت

جاؤ۔ وہ نبی کے گھر آئی ہیں۔ یہ کہنا کہ نبی فلاں بیوی کے گھر میں رخصت

ہے۔ رسول اپنے گھر میں دفن ہے۔

آخر اللہ نے رسول سے کہا

”محمد! جاؤ اس بیت میں۔ جو جس بیت میں بیٹھا جائے۔ تو بیت میں اتنی

اہمیت آجائے کہ وہ اہمیت ہوں۔ اور یہ بیت ہو۔“

برقع رسول اس بیت میں آئے۔ ”قرنی، سجھانے کے لئے۔“ جب ”قرنی“

سجھانے بیٹھے۔ تو پہلے سے خدا اور رسول کا یہ فیصلہ تھا کہ آج ”قرنی“ کا معتمد

حل ہوگا۔ آج ”قرنی“ سجھایا جائے گا۔ اللہ نے کہا

”رسول! ایک دم کرو۔ گھر کافی لمبا چوڑا ہے۔ ایک جھوٹا سا کپڑے کا

گھر اور بناؤ۔“ چنانچہ یہاں پادرک ڈیرہ بنا دیا۔ اب اس میں اکٹھے ہونے

شروع ہوئے۔ قریب۔ قریب۔

رسولؐ نے کہا۔

”حسن تم آؤ، تم میرے قریب ہو۔

حسین تم آؤ، تم میرے قریب ہو،

علی تم آؤ، تم میرے قریب ہو۔

اور سیدہ تم بھی آ جاؤ۔ تم میرے قریب ہو۔“

سیدہ کے آتے ہی یہ فقرہ آتا ہے۔ ”اللَّهُمَّ اِنِّ هَؤُلَاءِ اَهْلَبِيَّتِي“

اب پورے ہو گئے۔ جب یہ چاروں بیٹھ گئے آکے قریب تو۔

ان چاروں کو رسولؐ کے پاس دیکھ کر اعلیٰ حضرت نے مجلس پر دھنا شروع کر دی۔

اللہ نے اعلان کیا مجلس کا۔

”يَا مَلَائِكَتِي وَ سَكَّانِ سَمَوَاتِي“ خدا کی مجلس کا اعلان ہو رہا ہے۔ ”آؤ۔

لے فرشتو!۔ آؤ۔ لے آسمانی مخلوق! آج تمہیں مجلس سناٹی جائے گی۔ چنانچہ

فرشتے بھی آگئے۔ آسمانی مخلوق بھی آگئی۔ اللہ نے بادل کے سا بان رگے دیے

قوس قزح کی تقابلیں لگا دیں۔ شفق کے پردے لٹکا دیئے۔ سرین دھنپنی کے

گلدستے سجھا دیئے۔ سنبلیہ کی بلیں پھیلا دیں۔ اعلیٰ حضرت کرسی وحدت پر تشریف

فرما ہوئے۔ ملائکہ اور سکانِ سَمَوَاتِ سامعین بن کے بیٹھ گئے۔ ہر ایک

اپنے اپنے قدم سے تشریف فرما ہے۔ اعلیٰ حضرت نے پہلے گلا صاف کیا۔

”ہم آج مجلس پڑھیں گے۔“ ہم آج تقریر کریں گے۔ نہ مولویوں والا قتال تھا۔

نہ گلے سے آواز نکل رہی تھی۔ بالکل شاعرانہ شان سے۔

سنو! لے مخلوق ہماری۔

عَزَّ وَجَلَّ يَا مَلَائِكَتِي وَ سَكَّانِ سَمَوَاتِي رَفِي مَا خَلَقْتُ سَمَاءَ

مَبْنِيَّتَهُ وَلَا اَرْضًا مَسْدُ حَيَّةٍ وَلَا قَمْرًا مُبِينًا وَلَا سَمًّا مُضِيَّتَهُ وَلَا

فَلَمَّا بَدَدْنَا رَمْلًا وَمَا جَعَلْنَا يُخْرِجُنِي وَلَا فَاكًا تَنْسِيحًا إِلَّا فِي مَحَبَّةٍ هُوَ لَا يُدْرِي
الْحَمْدَةَ الَّذِينَ هُمْ تَحْتَ الْكِبَاءِ۔

پوری شاعری میں ہمیں پڑھی — مجمع بالکل محو ہو گیا — مست ہو گیا — اور اعلیٰ
حضرت جہوم جہوم کے پڑھ رہے تھے — جب ٹیپ کا بند پڑھا۔

”میں نے دنیا کی برائیاں ان کے لئے بنا لی ہیں جو اس چادر میں بیٹھے ہیں۔“

اس کے لئے لفظ بولا ہے۔ ”هُوَ لَا يُدْرِي“

(یہ بھی اہل لغت سے خطاب ہے) — بس هُوَ لَا يُدْرِي کا لفظ کہنا تھا کہ فرشتے

چونکے — اور چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے — کیوں فرشتو!

”تم کیوں چونک پڑے“ — تو فرشتوں نے کہا۔

”اس سے پہلے بھی سُن چکے ہیں۔ آج پھر سُن رہے ہیں۔ اس

لفظ سے ہمارا پہلے بھی واسطہ پڑ چکا ہے۔ آج پھر ہم نے سُنا ہے۔“

کب پڑھا تھا؟

”جب آدم پیدا ہوئے تھے۔ یہی کہا تھا اللہ نے“ هُوَ لَا يُدْرِي ان كُنْتُمْ طَائِفِينَ

”ان کے نام بتاؤ۔ جن کے ہم بتا نہیں سکے تھے۔“

اللہ نے آج پھر کہا ہے: هُوَ لَا يُدْرِي

جبریل کھڑے ہوئے اور عرض کی۔

”جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔ اگر اجازت ہو تو لوہے کیوں سے اللہ نے

کہا جا بجا بتا ہے۔“ جبریل نے عرض کی۔

”میرے اللہ اس دن تو تم نام بتا نہیں سکے تھے۔ کج تر بتاؤ۔ یہ ہیں کون؟“

جبریل نیز احسان سے — تو نے نام پوچھ کے، قرآنی کا تعارف کر دیا

— ہیں اُن قریٰ سمجھا دیا گیا۔

اب اعلیٰ حضرت نے چادر کی طرف دیکھا — مسکرایا۔

• ان کے نام پوچھتا ہے — بھلا تو بوجھ۔ یہ کون ہیں؟ —

۸

”میرے پالنے والے! جب چادر سے باہر آئیں جب پتہ چلتا ہے — یہ کون ہے — وہ کون ہے — اور جب پردے میں پہنچ جائیں — تو چونکہ نور واحد میں اندازہ نہیں ہوتا — اب اعلیٰ حضرت نے نام بتائے — پہلے کثر سے ومنو کروایا سامعین کو — پھر ایمان کی تسبیحیں پڑھوائیں۔ اللہ اکبر۔ الحمد للہ اور سبحان اللہ کی تسبیح پڑھوائی — جب قلب و دل سامعین کے پاک ہو گئے — تو اعلیٰ حضرت نے پہلے خورد خورد پڑھا — پھر سامعین و مذاکرہ سے درورد پڑھوایا۔ جب درورد بھی پڑھا گیا۔ اب اعلیٰ حضرت نام لیتے ہیں۔ سر جھکا کے۔ پورے ادب و احترام سے

اللہ نام لیتا ہے — اللہ تعالیٰ کروایا ہے ”قریٰ کا —

تعارف خان قریٰ کا — ز محمد کا برید — ز علی کا نام لیا — ز حسین کا نام لیا۔

ز حسین کا نام لیا — لیا تو کس کا نام لیا — حَمِّ حَاحِلَمَةَ وَأَبُوهَا

وَبَنَاتِهَا وَمَبْنُوهَا — چادر کے نیچے خورد خورد مٹی ہیں — اُن کے ساتھ اُن کے والد

بیٹے ہیں — اور — اُن کے شہر نامدار بیٹھے ہیں۔ اور ان کے بیٹے بیٹھے ہیں۔

کیوں قبلہ انھوں نے جمع ہے یا تفتیشی؟ — ”خو“ جمع ہے — بیٹے تو

درختے — یہ جمع کیوں آگیا — اس سے معلوم ہوا — جمع کا لفظ کم سے کم گیارہ

پر بولا گیا — اس میں گیارہ بیٹے شامل ہیں — ”خو“ میں — بس نام لیتے

ہی دنیا سمجھ گئی۔ یہ ”اب“ عربی — اب اعلیٰ حضرت کے جوہر کے

ایک پروردگار —

محمدؐ کہہ دو!

لَا اسئلكم عليه اجراً الى المدة في القربى :

بس یہ ہے میری قربیٰ — جس کا نام اللہ کے ساتھ ہے —
 (اللہ نے ایمان سے کمال کر دیا۔ اگر کہہ دیتا۔ محمدؐ بیٹھے ہیں۔ اُن کے ساتھ
 اُن کی بیٹی ہیں — تو اللہ جانے۔ دنیا کتنی بیٹیاں اُن کے ساتھ اور بھادیتی
 — محمدؐ کے ساتھ اُن کے داماد ہیں — اللہ جانے۔ دنیا اور کتنے داماد بھادیتی
 محمدؐ کے ساتھ اُن کے بیٹے ہیں — اللہ جانے۔ دنیا اور کتنے بیٹے بھادیتی)
 فاطمہ کا نام لے کر یہ نس کی کہ —

محمدؐ کے عزیزوں کے ساتھ میرا کوئی واسطہ نہیں —

محمدؐ کی رشتہ داریوں سے میرا کوئی تعلق نہیں —

یہ آیہ تطہیر آ رہی ہے۔ صرف فاطمہؑ کے خرافت داروں کے لئے — اور جب

یہ آیت آگئی — قربیٰ کا تعین ہو گیا — تو پھر —

”قال علیؑ — علی نے پوچھا —

”یا رسول اللہؐ — ہم جہاں بیٹھے ہیں۔ اس کی کیا فضیلت ہے —

رسولؐ نے اُس کی فضیلت بیان کی

جب یہ واقعہ ہوا۔ جو خدا رحمت نازل کرے گا — فرشتے آئیں گے۔

دعائیں قبول ہوں گی۔ — علیؑ نے کہا

”یا رسول اللہؐ! آپ کی بروقت ہمیں بڑی سعادت حاصل ہوئی

چونکہ علیؑ نے رسولؐ کا شکریہ ادا کیا — رسولؐ کو پیار آ گیا — پیار سے علیؑ

کا منہ چوما — فاطمہؑ کو سینے سے لگایا — حسینؑ کو گود میں بٹھایا — اور فرمایا —

”بچو۔ بیٹو۔ عزیزو!

میرا شکر یہ نرا ادا کرو۔

کیوں؟

”میری وجہ سے تمہیں فضیلت نہیں حاصل ہوئی؟“

پھر کیا ہے؟

”اَنَا بَشَرٌ مَثَلَكُمْ“ میں بھی تمہارے جیسا بشر ہوں۔

یہ آیت صرف اسی موقع کے لئے ہے۔ اور کسی سے رسول نے کہا ہی نہیں کہ۔

”میں تم جیسا بشر ہوں۔ اَنَا بَشَرٌ مَثَلَكُمْ۔ یہ نوح ”قربی“ کا تعین ہو گیا۔ جس سے موت، شفاعت، بنے گی۔

اب بتاؤ قیامت میں شفاعت چاہتے ہو۔ تو بغیر قیمت کے نہیں ملے گی۔

نمازوں سے شفاعت نہیں ملے گی۔ روزوں سے شفاعت نہیں ملے گی۔ اگر تم

نے نائی کا چار آنہ ہفتہ بچا لیا۔ اس سے شفاعت نہیں ملے گی۔ یہ وردی ہے مسلمان

کی۔ واڑھی ہونا یہ وردی ہے۔ بے وردی سپاہی کچھ اجائے تو سزا ہو جاتی ہے

یہ وردی ضرور چاہیے۔ مگر تم اس سے شفاعت چاہو۔ یہ نہیں ہوگا۔ اللہ

نہ تمہارے بالوں سے مرعوب ہوتا ہے۔ نہ تمہاری جماعتوں سے مرعوب ہوتا

ہے۔ نہ تمہاری جمیتوں سے مرعوب ہوتا ہے۔ نہ تمہاری کثرت سے مرعوب

ہوتا ہے۔ اللہ یہ ان چیزوں کا کوئی رعب نہیں ہے

اگر شفاعت چاہتے ہو قیامت میں۔ تو قربی“

کی موت دینا پڑے گی۔ اس کے بغیر شفاعت نہیں ہوگی۔ اب اگر اس قربی“

کی شفاعت چاہتے ہو۔ تو اللہ کے احکام کی تعمیل کرنا پڑے گی۔

نمازیں اس لئے پڑھنا ہوں کہ قربی“ کا ہو جاؤں۔

روزہ ہمیں اس لئے رکھنا پڑتا ہے کہ قربی“ کے ہو جائیں۔

ہمیں سچ اس لئے بولنا پڑتا ہے کہ "قربانی" کے ہو جائیں —

ہمیں آپس میں محبت اس لئے کرنا پڑتی ہے کہ قربانی کے ہو جائیں —

اتحاد و اتفاق اس لئے رکھنا پڑتا ہے کہ ہم قربانی کے ہو جائیں —

شفاعت جب ہوگی جب ہم قربانی سے مودت کریں گے —

صحابان! بات ختم کرتا ہوں۔ انشاء اللہ قیامت کے دن ہم جائیں گے قیامت

ہیں — ایک دوسرے کو ہم پہچاننے گئے — وعدہ کرو جھوٹے — نہ اگر مجھے
فرشتے بھگا دیں رائے کے جا رہے ہوں جہنم کی طرف — تو تم شور مچا دینا —

”گھٹو — کہاں لے جا رہے ہو۔ ہم آئے پیر محل والے — پہلے ہمیں مجلس

کر لینے دو —“ بس مجلس کا لفظ آیا نہیں — اور فرشتوں کی مجال نہیں جو مجھے چھوڑ

نہ دیں —“ قیامت کے دن دیکھنا — تم منظر شفاعت کا — وہاں نہ

رسول شفاعت کریں گے۔ نہ انبیاء شفاعت کریں گے — وہاں شفیع روزِ حرا

ہی "قربانی" ہوگی — اس کی تم مودت کرو — یہ وہاں تمہاری شفاعت کرے گی۔

— کیا سنا تو میں نے یہ بھی تھا علماء سے — پڑھا بھی ہے کتابوں میں — کہ قیامت

میں زلزلہ آجائے گا — وہاں جائیں گے قیامت والے — ابراہیم جیسے جلیل القدر

پغمبر گھٹنوں کے بل کھڑے ہو جائیں گے — یہ ہون کی ہوگی قیامت کی — کب

— ؛ جب شور مچے گا — قیامت والوں — خبردار — بشار — ناطق اپنا

مقدرے کر آئی ہے — خدا کی کپہری ہیں — اللہ کی عدالت میں ستیہ آئی

ہیں — مقدرے کر — اور ستیہ جھکتی ہوئی — سنبھلتی ہوئی — ڈرتی ہوئی

آئیں گی — آواز آئے گی —

”وہی بی — جھکتی کیوں ہو —؛ تو آپ فرمائیں گی۔

مجھے عدالت کا بڑا سحت تجربہ ہے۔ مجھے مقدمے کا بڑا تلخ تجربہ ہے۔“

خداوند! — آج میں اپیل لے کر آئی ہوں۔ تو نے قیامت تاریخ رکھی تھی اپیل کے لئے
آج میں اپیل کر رہی ہوں —

خداوند! — پہلا تو میرا دعویٰ یہ ہے کہ بھرے مجمع میں مجھے جھوٹا کہہ دیا — اور
خداوند! — دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ میرے گھر میں ایک دن میں بہتر قتل ہو گئے —
خداوند! میرا جو مقدمہ قتل ہے — اُس قتل کے مقدمے کے لئے ایک عینی گواہ پیش
کرنا چاہتی ہوں — ادا آئے گی — وہ کون ہے؟ — بی بی فرمائیں گی
"خداوند! — وہ میری بیٹی زینب ہے — وہ چشم دید گواہ ہے۔ میرے بہتر
کے قتل کا —" اب عدالت الہی کی طرف سے گواہ کی طرف سے جاری ہوں گے
اور عدالت کا سمن لے کر حوران جنت شام جائیں گی —
"بی بی زینب! تمہیں اللہ کی عدالت نے بلایا ہے — اٹل کے مقدمے کی گواہی دو —
الہی زینب! یہ کہہ دے —

ہیں اسی طرح آنا چاہتی ہوں قیامت میں جس طرح شام کے بازار میں گئی تھی —
اس شکل سے زینب آجائے گی — اونٹ پر بیٹھی ہوئی — زین العابدینؑ مہار پکڑے
بزنے — شہیدوں کے سر ساتھ ساتھ — اور ہم سب گرد اکٹھے ہو جائیں گے —
بی بی! ساری عمر روتے رہے۔ آج تو آئی ہے — ہمارا پڑسا لے —
بی بی کہیں گی —

"اب آج مقدمے کا فیصلہ یہی ہے کہ میں تمہاری شفاعت کروں گی؟
بی بی! — تو موت کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں — اتنا ثبوت ہم دیتے ہیں
کہ تیرے غم میں غم کیا تھا — تیری خوشی میں خوشی کی تھی — جس دن تمہارا غم کا دن تھا
اُس دن ہمارے گھروں میں آگ نہیں جلی تھی — اُس دن ہمارے بچوں تک نے ماتہ
کیا تھا — آپ دیکھ رہی تھیں —

ہماری عورتیں ننگے سرزین پر بیٹھتی تھیں — ہم نے ماتم ماتم کر کے خون بہا دیا تھا — اور جس دن آپ کے گھر خوشی تھی — جس دن آپ کے گھر ولادت تھی اُس دن ہم نے شاندار جلسے کئے تھے — اُس دن ہم نے روشنیاں کی تھیں — اُس دن ہم گلے ملے تھے — اُس دن ہم نے ایک دوسرے سے مصافحے کئے تھے — اُس دن ہم نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی تھی — جس کا ثبوت آج گلستانِ رضویہ — (درد آباد) میں امامِ رضا کی ولادت ہے — آج ہمارا عیدِ گادن ہے — آج ہماری خوشی گادن ہے —

آج ہماری جڑی سترت گادن ہے

ہمیں رونے کا غنڈہ دینے والے! کبھی ہمارا ہنسنا بھی دیکھ جایا کر — آج ہمارا خوشی کرنے کا دن ہے — آج ہمارا مبارکباد کا دن ہے —

آج ہم ساری عمر قید میں زندگی بسر کرنے والے باپ کو اُس کے بیٹے کی مبارکباد دینے جا رہے ہیں — آج ہم نے رسولِ مَدِ آلِ رسول کو مبارکباد دینی ہے، امامِ رضا کی ولادت پر تہنیت کرنی ہے — اللہ کا ہم شکر ادا کرتے ہیں — رسول کو ہم مبارکباد پیش کرتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ

مولانا! — یہ زمانے کا دستور ہے کہ جب شہنشاہوں کے گھر کوئی ولادت ہو تو وہ اپنی رعایا پر دو قسم کے انعام فرماتے ہیں —

۱۔ قیدیوں کو رہا کیا جاتا ہے۔ اور

۲۔ رعایا میں انعام تقسیم کیا جاتا ہے —

ہم میں سے جو کُن ہوں کی قید میں قید ہیں — آج کے صدقے میں اللہ انہیں

آزاد کر دے — اور

دوسرا انعام ہمیں کیا ملے گا؟ — ہم نہیں مانگتے۔

اس لئے کہ اگر ہم نے بڑی سے بڑی شے بھی مانگی تو وہ ہماری حیثیت کی بڑی
 ہوگی — اور تو اگر چھوٹی سے چھوٹی شے بھی مانگا کرے گا — تو وہ تیری حیثیت کی چھوٹی
 ہوگی —

یہ انعام ہم تمہاری مرضی پر چھوڑتے ہیں —

جو مناسب سمجھو — ہمیں دے دو —

اللہ! ہمارے دلوں میں مودتِ محمدؐ و آلِ محمدؐ پیدا کرے۔

ان کی مودت کے ساتھ زندہ رہیں۔ اور ان کی مودت کے ساتھ دم نکلے۔

• بحقِ محمدؐ و آلِ محمدؐ •

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

(ذ)

جب چیزیں ہوں تو
 ایک ہو کر کئے والی ایک ہو نہ ٹوکنے والی
 تو
 بُت پرستی کی عادت یہ کہلوادے گی
 کہ
 ”ہمیں نہ ٹوکنے والی کافی ہے۔“

(خطیبِ آلِ محمدؐ)

آنکھ

۱ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِۃ

خداوند عالم کی حمد و ثنا کے بعد حضرات محمد و آلِ محمد پر درود و سلام۔

حضرات گرامی قدر! گرمی بڑی شدید ہے۔ آپ صاحبان اس گرمی میں یہاں تشریف لائے ہیں۔ میں آپ کو دو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ پہلی مبارک تو اس بات کی کہ سید الشہداء کے دربار میں آپ لوگوں کو حاضری دینے کا شرف ملا ہے۔ دوسری مبارک اس بات کی کہ آپ جبرئیل کے پروں کی طرح ذوالفقار کی زوئیں آئے ہوئے تھے اللہ نے آپ کو پکایا۔

میرے سامعین! عجب سے پہلے حضرت علامہ حافظ تیر ذوالفقار علی شاہ مدظلہ العالی یہاں وعظ فرما رہے تھے۔ میں بھی نیچے بیٹھا ہوا اُس رہا تھا۔ زیادہ کچھ تو مجھے یاد نہیں رہا۔ صرف اتنا یاد ہے کہ قبلہ حافظ صاحب کچھ آنکھوں کے بارے میں خطاب فرما رہے تھے۔ لہذا میں بھی چاہتا ہوں کہ آنکھوں کی بات ہی کی جائے۔

اللہ نے بڑی نعمت عطا فرمادی ہے۔ یہ آنکھ۔ آنکھ کے بغیر دنیا آباد ہی نہیں۔ جس کی آنکھ نہیں۔ اُس کے لئے دنیا آباد ہی نہیں۔ دانست گئے کھانے کا سوا دگیا۔ آنکھیں گئیں دنیا کا لطف گیا۔ یہ آنکھ بڑی عجیب شے ہے۔ جو خدا نے بنائی ہے۔ اب میں اپنے نوجوان عزیزوں کو جو کالوں میں پڑھتے ہیں۔ آج کل کی فضا میں پرورش پاتے ہیں۔ سیاست کے میدان میں رہتے ہیں۔ جو نہیں گھنٹے سیاسی گفتگو کرتے ہیں۔ اور خدا جانے کیا کیا باتیں کرتے ہیں۔ جو ہم جیسے بڑھوں کی سمجھ میں نہیں آتیں اُن کی خدمت میں یہ عرض کرتا ہوں کہ انسانوں کا بدن ایک ملک ہے۔ سر سے پتیکہ جیتتا ہی بدن ہے۔ یہ ایک ملک ہے۔ اس ملک میں جنگل بھی ہے۔ اس ملک میں صحرا بھی ہے۔ اس ملک میں دریا بھی ہے۔

ہیں۔ اس میں ٹہریوں کے پہاڑ بھی ہیں۔ نرض ہر شے اس ملک میں موجود ہے۔ پورا بدن انسان کا ایک ملک ہے۔

اب اس ملک میں بہت سی قومیں آباد ہیں۔ ایک قوم کا نام باقہ ہے۔ ایک قوم کا نام اپوں ہے۔ ایک قوم کا نام ناک ہے۔ ایک قوم کا نام سر ہے۔ مختلف قومیں میں جو بدن کے ملک میں آباد ہیں۔ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں۔ تو ملک آباد رہتا ہے۔ باقہ کی مدد کرنا ہے ہونٹ ہونٹ کی مدد کرنا ہے۔ یہ مدد کرتے ہیں تو ملک آباد رہتا ہے۔ اور اس مدد کرنے میں کبھی بھی لڑائی بھی ہو جاتی ہے۔ لڑائی ہونا بھی ملک کے لئے ضروری ہے۔ لڑائی کے بغیر بھی گزارا نہیں۔ لڑائی بھی زندگی کی علامت ہے۔ دیکھو نا۔ اگر یہ زمین سے نہ لڑیں تو راستہ کیسے طے ہو۔ راستہ جب ہی طے ہوتا ہے جب پیروں کی زمین سے لڑائی ہوتی ہے۔ روٹی سے لڑائی ہو جائے تو پیٹ بھرتا ہے۔ پانی سے لڑائی ہو جائے تو پیاس بھگتی ہے۔ کھیت میں بل جیوں چا دو تو فصل آتی ہے۔ لب سے لب لڑے تو بات بنتی ہے۔ تالو سے زبان لڑے تو الفاظ نکلتے ہیں۔ پک سے پک لڑے تو آنکھ دکھتی ہے اور آنکھ سے آنکھ لڑے تو سواد آتا ہے۔ لڑائی بھی ضروری ہے۔

مہر نوح انسان کا بدن ایک ملک ہے۔ اس میں بہت سی قومیں آباد ہیں۔ کوئی قوم آنکھ ہے۔ کوئی قوم پیر ہے۔ کوئی قوم سر ہے۔ کوئی قوم باقہ ہے۔ کوئی قوم ناک ہے۔ اور پاؤں اس لئے اکڑتے ہیں کہ وہ تعداد میں زیادہ ہیں۔ قسمت میں بوٹے ہیں۔ تعداد تو ان کی بہت زیادہ ہے۔ سارے ملک میں۔ بدن کے سارے ملک میں سب سے زیادہ تعداد جو موجود ہے وہ پیروں کی ہے۔ مگر ان کی قسمت میں بوٹے ہیں۔ ان سے کم تعداد ہاتھوں کی ہے۔ مگر یہ اپنے کاموں سے اتنے شرمندہ ہیں کہ اگر انہوں نے صحیح صحیح کام کئے ہوں تو اپنے مالک کے سامنے بالکل صحیح حالت میں جاتے ہیں۔ اور وہ کوئی بُرے کام کئے ہوں اس قوم نے۔ تو مالک کے سامنے شرم کے مارے بغلوں میں منہ چھپا لیتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس قوم نے کوئی بُری حرکت کی ہے۔ ہاتھوں سے کوئی ناقابل عمل عمل ہوا ہے۔ جب ہی تو مالک کے سامنے شرم کے مارے بغلوں میں منہ چھپائے

ہوئے ہیں۔ نیک ہوتے تو صاف سامنے کھڑے ہوئے ہوتے۔

بندہ پر ذرا اس ملک میں ایک ٹکڑہ ہے۔ جو سینہ کہلاتا ہے۔ اس سینے کے اندر اس ملک کا پایہ تخت ہے۔ اس پایہ تخت میں اس ملک کا بادشاہ رہتا ہے۔ ساری رعایا آرام کرتی ہے۔ وہ دھڑکتا رہتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اُس نے اپنا دھڑکتا بند کیا ہو جس دن بادشاہ حرکت بند کر دے گا۔ ساری رعایا ماتم ہو جائے گی۔ نہ الجھڑے میں آتا ہے۔ نہ دیکھنے میں آتا ہے۔ بے تو غائب۔ مگر بے بادشاہ۔ اُس کی بدولت تمام رعایا زندہ ہے۔ ہاتھ کام کرتا ہے دل کی بدولت۔ زبان بولتی ہے دل کی بدولت۔ آتا ہے دل جاتا ہے دل۔ پسند کرتا ہے دل۔ ناپسند کرتا ہے دل۔ زندگی ہے دل۔ جب ہی تو زندگی کو اردو زبان میں "جی" کہتے ہیں۔ دیراجی چاہتا ہے، دل بادشاہ ہے اس ملک کا۔ اور اس کا وزیر ہے دماغ۔ دماغ مشورے بنا کرتا ہے۔ بادشاہ اُسے منظور کرتا ہے پھر ساری قومیں کام کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ اب لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ زیدی صاحب! یہ غلط کہہ دیا تم نے دل بادشاہ ہے۔ دماغ وزیر ہے۔ وزیر بیٹھا ہے اوپر بادشاہ بیٹھا ہے نیچے۔ دماغ کو نیچے بیٹھنا چاہئے تھا۔ تو اب انہیں کون سمجھائے۔ کہ یہ دل خدا کا بنایا ہوا بادشاہ ہے۔ دماغ اللہ کا بنایا ہوا وزیر ہے۔ اور اللہ کے بنائے ہوئے وزیر، بادشاہوں سے اوپر رہتے ہیں کسی کو تعین نہ آئے تو تعین میں جا کے دیکھ لو۔ بہ نوح دل ہمارا بادشاہ ہے۔ دماغ جارا وزیر ہے۔ ہاتھ پاؤں جو ہیں یہ قومیں

ہیں۔ اور ان کے درمیان معدہ شریف ہیں۔ یہ وزیر خزانہ ہے تمام خوراک دماغ کو باہر سے آتی ہے ان میں آتی ہے یہ پھر اُسے تقسیم کرتے ہیں۔ جتنی آپ نے روٹی کھائی نا آج۔ اُس روٹی سے بدن میں پیرا۔ تیز پیرا بنتی ہیں۔ ایک کا نام ہے لغم۔ ایک کا نام سُفرانہ ایک کا نام سودا۔ اور ایک کا نام ہے خون۔ یہ چار چیزیں بنتی ہیں تمہاری غذا سے۔

اب میں تم سے نہیں پوچھنا کسی ڈاکٹر سے پوچھ لو کسی حکیم سے پوچھ لو کہ تمہاری غذا سے بنتی تو ہیں یہ چار چیزیں مگر میان سے بناؤ چاروں ایک جیسے، لغم، سُفرانہ، سودا، کمال دیتے کے قابل۔ سو دماغ دینے کے قابل ہو۔ آخری خون بدن میں رکھنے کے قابل، اپنے خون کی نشان دہی اور بے۔ لغم، کمال، شہیں مارے کہیں ہی اسی جگہ سے بنا ہوں۔ لیکن خون خون ہے۔ لغم، لغم ہے۔ جگر جگر ہے۔ دگر دگر ہے۔

اور یاد رکھو بزرگو! انسان کی عادتیں، سیرت میں، مزاج میں اثر کرتا ہے خون! آپ نے وہ لطیفہ سنا ہو گا کہ ایک بے چارہ مولوی تھا۔

مسجد اذان دیا کرتا تھا۔ وہ ہو کیا بیمار۔ داخل ہوا ہسپتال میں۔ اُسے ضرورت پڑی خون کی اتفاق سے۔ وقتی طور پر خون تیل سکا۔ اور وہ اگیا جو شادی بیاہ میں من بلائے آجاتے ہیں۔ اب اُسے اگیا کہوں یا اگئی کہوں بہر نوع وہ اگیا تو ڈکڑنے اُسی کا خون دے دیا۔ مولوی صاحب اچھے ہو گئے۔ اب چونکہ اُس کا خون آیا تھا بدن میں۔ اُس کی تاثیر کیا ہوئی۔ کہ جب مولوی صاحب نے مسجد میں جا کر کبھی اذان۔ اور جب مسی الصلوٰۃ پڑھتے تو تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ خون کا اثر تھا۔ اگر آدو پاؤ خون کا اثر بدن میں ہوگا ایک مولوی سے تالیاں بجا سکتا ہے تو بناؤ اُس کے خون کی کیا تاثیر ہوگی جس سے رسوں کے تیرا سارا خون میرا خون ہے۔

یہ نوع غذا سے چار چیزیں بنتی ہیں: بھج، سنا، سودا اور خون۔ اور ہمارا معدہ وزیر خزانہ ہے۔ یہ غذا کو تقسیم کرتا رہتا ہے۔ خون کی جگہ خون بھج دیا۔ بھج کی جگہ بھج دی۔ جہاں جہاں جس کا ٹھکانہ ہے اُسے بھج دیا۔ اور

اسی ملک میں جہاں سر بھی آباد ہے۔ جہاں ہاتھ بھی آباد ہیں۔ جہاں پیر بھی آباد ہیں۔ جہاں ساری قومیں آباد ہیں۔ اسی ملک میں آنکھ بھی آباد ہے۔ یہ بھی ایک قوم ہے۔ ہاتھوں سے چھٹی ہے پروں سے چھوٹی ہے۔ تعداد میں سب سے کم ہے گویا آنکھیں ملک کی اقلیت ہیں۔ گویا عیان کیا جانے لاکھڑت کی قسمت میں وہ بات نہیں ہے۔ جو اقلیت کی قسمت میں ہے۔ یہ پیر ہاتھ اکثریت میں ہیں۔ ان کی قسمت میں چیز نہیں جو اقلیت والی قوم آنکھ کی قسمت میں ہے۔ اور وہ کیا۔ نور اور رونا جو کسی ملک میں اقلیت ہوا۔ اللہ سے نور بھی دیتا ہے۔ اُسے رونا بھی دیتا ہے۔ اور جہاں نور ہو وہاں رونا آسانی نہیں ہے۔ تو اقلیت گھر ہے نور کا مرکز۔ اکثریت کو راستہ دکھاتی ہے۔ پاؤں چل نہیں سکتے اگر اقلیت رہبری نہ کرے۔ ہاتھ کام نہیں کرتے اگر اقلیت رہبری نہ کرتے۔ جیت تک اقلیت کو قائم و باعظمت نہ بناؤ۔ تو کام نہیں کرتیں۔ آنکھ رہبری کرتی ہے۔ پورے ملک میں کہیں بھی ٹوٹ لگ جائے آنکھ نور اپنی بھیجتی جاتی ہے۔ اور جا کر اُس کی مدد کرتی ہے کہیں کوئی گستاخ ہو وہیں شفا ہو جاتی ہے اس آئینہ کی حفاظت

کا اللہ نے یہ انتظام کیا ہے کہ سات پردوں کے پیچھے، معشوقہ نور کو آرام سے بٹھا کر سامنے اس کی مسہری کے پردے لٹائے۔ پردوں کے بعد پلوں کی چمبن لٹکانی۔ اس کے اوپر عمارت لٹکانے تاکہ آنکھ دیکنا چاہے تو پلکیں چھو کے پہنچے آئینے کو صاف کر دیں۔ پھر معشوقہ چشم آنکھ سے نکلنے کا ارادہ کرے۔ بڑی اداسے لٹکتا ہے نور آنکھ سے، آنکھ میں خراش نہیں آتا۔ دروازہ نہیں کھلتا۔ پلوں کی نہیں کھلتی۔ نور سات پردوں سے سر کر رہا رہا۔ آسمان تک پہنچا۔ پھر آیا۔ نور کی رفتار سے کہ پلوں کی زنجیریں ہتی رہیں اور نور آسمان پر جا کے بوسھی آیا۔

یہاں آنکھوں میں نور رہتا ہے۔ وہاں نور کے ساتھ کالے رنگ کی پتلیاں بھی ہیں۔ نور سے کھڑکی میں کالے رنگ کی پتلیاں۔ ساری عمر جو گنی نور کے گھر میں رہتے ہوئے، گمراہ نامراد وہی ہالی کی کالی میں بیٹھا کیا، انہوں نے اپنی نفرت سے کہ وقت بڑے تو پتہ جائیں۔ اور ان پتلیوں کے اندر اللہ نے پانی کا حوض رکھا ہے۔ اگر ابھر سے ذرا سا بھی کوئی ذرہ آجاتا تو فوراً حوض سے پانی بہا کے صاف کر دیا جاتا۔ چونکہ آنکھ تازہ رہے اسلئے ابھر کی چیز کو برداشت نہیں کر سکتی۔ بڑے سے نفرت کرتی ہے۔ اچھے سے رغبت کرتی ہے۔ سترہ جو تو خوشی سے دیکھنے کی کئی کئی ہو تو منہ پھیرے گی۔ آنکھ میں یہ کمال ہے کہ بڑوں سے نفرت کرتی ہے۔ اچھوں کو پسند کرتی ہے اور یہ اقلیت کا درجہ ہے کیونکہ اس میں نور ہے۔ پھر اللہ نے ایک اور کام کیا ہے کہ آنکھیں دو بنا دیں۔ اگر ایک ہوتی دو کی بجائے۔ تو اللہ کو کوئی نقصان تھا۔ نہ تو کوئی اعتراض تھا۔... مگر اللہ نے کہا: "نہیں دو بناتی ہیں چونکہ نور ہے اور نور میں نہیں بیٹتا۔ جب تک دو نہ ہوں۔ ایک نور کبھی آج تک بیٹھا ہی نہیں جب بھی نور بیٹھا دو کر کے بیٹھا تاکہ اگر ایک نور بیٹھا تو دوسرا نور اس کی جگہ کام دے گا۔ اللہ جب کوئی نور دنیائیں بیٹھا ہے۔ تو اس کا وہی بھی ساتھ ہی بیٹھا ہے بغیر وہی کے نور کے پہلا نور آ ہی نہیں سکتا۔

اب اگر اللہ کہ بیٹھو عزیزو۔ اگر خدا نخواستہ آنکھ چل جائے گی تو ہم ناک سے دیکھ لیا کریں گے ہم کہتے ہیں "دیکھو ناک سے" اور تم کہتے ہو "ناک کی تو ہم کرتے ہیں ہم"۔ اسی سے تو کہتے ہوں مجلس میں نہ جایا کرو۔ یہ ناک کو برا کہہ رہے ہیں۔ ناک نہیں دیکھ سکتی، ویسے ناک چہرے کی ناک ہے۔ ناک

کی خاطر گھرا بڑھا جاتے ہیں۔ تاک کی خاطر کنبے تباہ ہو جاتے ہیں۔ تاک کی خاطر نکل و عمارت ہو جاتی ہے۔ تاک بڑی عزت کی چیز ہے۔ پھر اس کا کیا علاج کیا جائے۔ تاک چاہے جتنی ہی عزت کی تھے سبھی کو زور کی جگہ تو نہیں لے سکتی۔ بس اتنی بات کہتے ہیں کہ تاک زور کی جگہ نہیں لے سکتی۔ اسے تم کہتے ہو بڑا کہتے ہیں۔ میرے ماسین! ہاتھ میں تو دو۔ مگر جب بھی دیکھتی ہیں۔ ایک۔ کوئی فرق بیان کر سکتے ہیں۔ یہاں تک ایک آنکھ نے دیکھا۔ یہاں تک دوسری آنکھ نے دیکھا۔ دو ہونے کے باوجود نظر ایک ہے۔ یہ نہ تو کمال کد ہو دو مگر نظر ایک ہو۔ جو داہنی دیکھ رہی ہو۔ وہی بائیں دیکھ رہی ہو۔ کیا مجال جو ان دونوں میں فرق آتی ہے۔ یہ بھی آنکھ کا کمال ہے۔ اور یہ ہے محرم زور کو!

یہ بھی سن لو میری تقریر کا آخری فقرہ۔ "آنکھ نازک تو اتنی کہ زور اساریہ جو برداشت نہیں کر سکتی اور طاقتور اتنی کہ خدا نے کہے جو کہیں لڑ جائے۔" اگر یہ لڑ جائے تاکہیں تو سب ہی بچ جاتی ہے اور یہ زور کی صفت ہے کہ نہ زور اکت و دکھائے پڑے۔ تو جو کی روٹی کھڈنا لگائے سے ڈٹے۔ اور اگر لڑ جائے تو حیرت کے درندہ روئیں۔ پہلوانوں کے سر نہ روئیں۔ حد یہ کہ جبریل کے پر نہ روئیں۔ نہ اُس کی نزاکت۔ کوئی حد ہے نہ اُس کے طنز کی کوئی حد ہے۔ اور اللہ تمہیں، مجھے سب کو اس زور کی نعمت سے محروم نہ کرے۔ یہ بڑی عجیب شے ہے۔ یہ بڑی نعمت کی چیز ہے۔ اور

نوس کی آنکھ کی نشان بن ازلہ ہے۔ اس آنکھ کی قیمت آدھ کوئی اندازہ کر سکتا ہے نہیں۔ خدا ماننے کوئی ہزار دفعہ تمہاری آنکھ سے ڈر کے زرد مال سے صاف روٹی ہے۔ اور ستیہ

گرواں کو کرنی لیا میں آنکھ صاف کی اور گرواں اپنی سچی زینب کو دے اور فرمایا۔ "یہی زینب! میں یہ بت جانی کا مرہم لاتی ہوں۔ اور زینب اپنے بھائی کے زخموں کا مرہم بنا لیتی ہے۔ اور یہی بھائی مل کر اللہ سے دعا کرتے ہیں۔ خداوند! — دیکھ لے۔ یہ قوم اپنے گھروں کو چھوڑ کر اپنی آسائش و آرام کو چھوڑ کر بیان قائم کر رہی ہے۔" تمہاری آنکھوں کی بڑی عزت ہے۔ تمہاری آنکھوں کی بڑی قدر ہے۔

جہادِ اکبر،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

”خداوند عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضراتِ محمد و آلِ محمدؑ پر درود و سلام“
حضراتِ محترم! معاف کرنا۔ آج مجھے رسول سے دیر ہو گئی۔ اور وہ میرے بس کی بات
نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہم دنیا میں معصوم تو آئے نہیں۔ معصوم تو وہی لوگ تھے جنہیں خداوندِ عالم
نے معصوم پیدا کیا تھا۔ کوئی بننے سے تو معصوم بنا نہیں۔ جسے اللہ معصوم پیدا کرے وہی معصوم
ہے۔ اور اگر کوئی معصوم بنا چاہے۔ تو یہ ہماری معصومیت ہے جو ہم معصوم بنائیں گے یہ نہ
سوچیں کہ یہ آدمی نہیں بنا رہا ہے۔

بہرِ نوعِ معصوم وہی ہے جسے اللہ نے معصوم پیدا کیا ہے — لفظِ در معصوم، جو
ہے۔ یہ لفظ ”عمت“ سے بنا ہے۔ عمت کے معنی ہے پاک۔ جو تقاضا زیادہ برائوں سے
پاک ہوتا جائے گا۔ اتنا ہی زیادہ ورنہ معصوم ہوتا چلا جائے گا۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ
جہاں ”عمت“ کا لفظ بولا جائے۔ وہاں اس کے معنی یکساں ہوں۔ معصوم کا لفظ جہاں بھی بولا
جائے اس میں سارے معصوم یکساں ہوں۔ یہ نہیں ہو گا۔ معصوم ہونا اور بات ہے
اور ہر معصوم یکساں ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ آدم کی معصومیت اور بات ہے۔ خاتم کی معصومیت
اور بات ہے۔ چونکہ ہم چودہ معصوم کی معصومیت میں رہتے ہیں ہر وقت۔ اس لئے ہمارے
سامنے جب لفظِ معصوم آئے۔ ہم ہر معصوم کو اسی میزان سے ناپتے ہیں جو ہم نے بنا ہے۔
حالانکہ ان کی معصومیت اور ہے۔ ان کی معصومیت اور ہے۔ فرق کیا ہے۔ ؟

باقی مسموم جو ہیں۔ وہ وہی کام کرتے ہیں جو ٹھیک ہو۔ وہ کبھی غلط کام نہیں کرتے۔ ہمیشہ وہی کام کرتے ہیں جو درست ہو۔ اور یہ چوڑہ جو ہیں۔ یہ پہلے ٹھیک نہیں سوچتے۔ بلکہ یہ جو بھی کر دیتے ہیں۔ وہ ٹھیک ہے۔ یہ فرق ہے ان کی معصومیت میں اور ان کی معصومیت میں۔ پہلے وہ حق کو تلاش کرتے ہیں۔ پھر حق کے پیچھے چلتے ہیں۔ اور حق انہیں تلاش کرتا ہے۔ حق ان کے پیچھے چلتا ہے۔ ان کی معصومیت کی شان اور ہے۔ ان کی معصومیت کی شان اور ہے۔

بہر نوا۔ اللہ جنہیں معصوم پیدا کر دے۔ وہ پیدا ہی معصوم ہوتا ہے۔ اور پھر اسی وقت سے معصوم کی پرورش، اس کی خوراک، اور اس کی ضروریات۔ عصمت کے لحاظ سے ہوتی ہیں۔ اس لئے ہر معصوم پر صدقہ حرام ہے۔

حالانکہ صدقہ پاک ہے۔ صدقہ کوئی نجس چیز تو ہے نہیں۔ مگر معصوم کی معصومیت کے لئے نامناسب ہے۔ اسی لئے یہ حدیثیں مشہور ہیں مسلمانوں میں۔ کہ مسلمان جب کوئی کھانے پینے کی چیز حضور کی خدمت میں لاتے تھے۔ کوئی فرد ظلاتے ہوں گے۔ اور وہ بھی عرب کا فرد ظ کھجور وغیرہ (یہی ثر ما الیا فرد ظ ہے جو عرب میں ہوتا ہے۔ میں نے اس وقت میں جا کر خیال کیا۔ یا اللہ۔ یہاں سنگترہ، مالٹا کیوں نہیں پیدا کیا۔ بعد میں خیال آیا۔ اللہ نے ٹیک کیا ہے کہ یہاں سنگترہ مالٹا وغیرہ پیدا نہیں کیا۔ کیونکہ جانوروں میں اونٹ پیدا ہوا تھا۔ اگر یہ رزق نہ دیا ہوتا تو سارا پہل اونٹ کھاتا۔ اللہ نے ایسا پھل پیدا کیا جہاں اونٹ نہ لانا نہ بیچ سکے) بہر نوا۔ عرب کا فرد ظ یہ کھجور ہے۔ اور جب لوگ یہ کھجور لے کر تھکے، اور چرانے نھے جناب رسالت آج کی خدمت میں۔ تو رسول ان سے پوچھتے تھے۔ اور یہ بتاتے تھے۔

دوسرے ہوتے تھے۔ "یا صدقہ" لائے ہو۔ اگر وہ کہنے حضور تھے دسکے ہیں۔ تو آپ فرماتے "حسن بیٹا۔ اور آؤ۔ حسین بیٹا۔ ادھر آؤ۔ علی تم بھی آؤ۔ یہ تمہارے۔ کھاؤ بیٹے۔ اور اگر لائے تو کہہ دیتا۔ در حضور یہ صدقہ ہے۔" تو حضور انہوں کو روک

دیتے۔ اور امحباب سے فرماتے — ”بسم اللہ۔ نوش فرمائیں —“ اور وہ نوش فرماتے تھے — یہ فرق رکھا تھا اللہ نے۔ معصوم کی پرورش و تربیت کا انداز ہی اور ہے۔ اور پھر یہ بتانے کے لئے کہ ہم تم سے امتیازی نشان رکھتے ہیں۔ رسول ہمیں سبق دیتے تھے — ایک دن امام حسن مجتبیٰ ایک خرمائاٹھا کر امام حسین کی طرف لے گئے — قریب تھا کہ جس خرمائے نے اُدھم سے رسالتا تب نے کہا ”ہٹیا۔ نہ کھانا —“ تمہیں معلوم نہیں یہ بات کہ صد قدم پہ حرام ہے — ”بات ختم ہوئی۔ پوچھنے والے پوچھ بیٹھے — قند! آپ نے سچے سے اس طرح کہا جیسے پیسے سے یہ بات جانتا ہو۔ حالانکہ یہ بچہ ڈیڑھ سال کا ہے —“ تو حضور نے فرمایا: —

”ہاں مجھے معلوم ہے۔ یہ ہرٹھک جانتا ہے۔“ اسے کس نے سکھایا۔ —

” جس نے مجھے سکھایا۔ اور یہ میرا بچہ لوح محفوظ کا مطالعہ کرتا ہے۔ دیکھو ہم معصوم

ہیں۔ ہم یہاں آکر نہیں پڑھتے۔ ہم پڑھانے کے لئے آئے ہیں۔ ہم بتانے آئے ہیں۔ ہم سیکھنے

نہیں آئے۔ ہم کھانے آئے ہیں۔“ بات کو مختصر کرتا ہوں —

میں آیا ہوں لاہور سے۔ اور مجھے پتہ ہے کہ کراچی کے مومنین کو مجھ سے بڑا پیار ہے۔

بڑی محبت ہے۔ مجھے محسوس یہ ہوتا ہے کہ مجھ سے بڑا پیار ہے کراچی والوں کو۔ میں آگیا

یہاں۔ ”آؤ زیدی صاحب۔ آپ نے یہاں مجلس پڑھنا ہے۔ تشریف رکھئے۔“ سامنے

بڑے بڑے بزرگ سامعین بیٹھے ہیں۔ جب میں آکے بیٹھ گیا منہ پہ۔ تو آپ نے زور پڑھا۔

میں نے جیب سے ایک کتاب نکالی۔ اور مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ اور اب آپ اس

انتظار میں ہیں کہ یہ شروع کرے۔ اب آپ درد پڑھ رہے ہیں۔ اور میں نے کہا۔

”دھڑھو بھٹی۔ میں ذرا کتاب پڑھ لوں۔ پھر مجلس سناؤں گا۔“ تو لوگوں نے کہا۔ ”زیدی صاحب

اگر یہیں آکے پڑھنا تھا تو پھر آپ نے تکلیف کیوں فرمائی۔“ — جیب

اپنے مودی کو آپ برداشت نہیں کر سکتے۔ جہاں آکے پڑھے۔ تو ایسے رسول کو کون بڑا

کرے جہاں آکے پڑھے۔ آخر یہی کہیں گے تا۔ قبلہ۔ پڑھنا تھا۔ تو وہیں سے پڑھ کر

آنا تھا جہاں سے آئے ہو۔

بہر کیف۔ یہ معصوم ہیں۔ یہ پڑھانے آتے ہیں۔ پڑھنے نہیں آتے۔ یہ دنیا کو سبق سکھانے آتے ہیں۔ یکینے نہیں آتے۔ ان کا ہر قول، ہر فعل، ہر عمل غیر معصوموں کے لئے انسان بنانے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ اور پھر اس میں لطف یہ ہے کہ کسی کو مجبور نہیں کرتے۔ وہ خدا کی عطا کی ہوئی طاقت خارجی سے نہیں سوانٹے۔ وہ اسے سمجھا دیتے ہیں اپنے قول سے۔ اپنے عمل سے کہ بن جا۔ جو بن جائے، وہ بن جائے۔ اور جو نہ بنے وہ نہ بنے۔ بہر نوع کسی سے نہیں بگاڑتے۔ ان کی سب سے بن جاتی ہے۔ چاہے کوئی بنائے یا نہ بنائے۔ دن تم بنو، نہ بنو، ہم تمہیں سمجھاتے رہیں گے۔ یہ ان کا سمجھانے کا طریقہ ہے۔ خواہ عمل سے سمجھانا پڑے یا قول سے سمجھانا پڑے۔

اور ان معصومین نے جو سب سے بڑا سبق دیا۔ جو طریقہ ابتداء سے شروع ہوا ہے۔ یعنی آدم سے لے کر آج تک۔ آج یکم محرم ہے اور ۱۳۹۰ھ تک۔ انسانوں کو انسان بنانے کے لئے ابی اسلمی بن کسی معصوم نے تجویز نہیں کیا۔ جیسا کہ ان معصوموں نے ان دس دنوں میں دیا ہے۔ جو آج سے شروع ہو رہا ہے۔ دس دن دس ہو گا۔ اس کے بعد ہم اسے بیٹھ کے دہرائیں گے۔ اس کے بعد یاد کرنے کی کوشش کریں گے۔ درنہ خدا گواہ ہے کسی مذہبی عقیدت یا تعصب کی بنا پر نہیں کہہ رہا۔ عام بات کہہ رہا ہوں کہ اگر انسانوں کی زندگی میں یہ دس دن رات باقی ہیں۔ اگر کوئی شرافت و انسا نیت کا نام دنیا میں باقی ہے۔ تو صرف ان دس دن کی بدولت باقی ہے۔

دیکھو نا۔ دنیا کو سبق دے دیا جاتا ہے۔ شرافت اسے کہتے ہیں۔ انسا نیت اسے کہتے ہیں۔ دنیا کے شریف ترین خاندان کا آغاز یہ ہوا تھا۔ انجام یہ ہوا تھا۔ یہ ان دس دن میں بتایا جاتا ہے۔ اور اس کو سزا کی انسا نیت اور بڑی ہے۔

آج ایسا وقت بھی آگیا تھا کہ دنیا کو سبق دینے والوں کو مجبور ہونا پڑا۔

یہ مجبوری آج کی نئی بات نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم نے بھی ہجرت کی۔ حضرت اسماعیل نے بھی ہجرت کی۔ اُن کی ماں کا تقاضا بھی اُگیا ہے ہجرت کی یادگار۔ انہوں نے بھی ہجرت کی۔ تمام انبیاء کو مجبور ہو کر اپنے اپنے وطن سے ہجرت کرنا پڑی۔ مگر ان کی ہجرتیں ایسی تھیں۔ آج ہجرت مگر دس دن کے بعد واپس وطن آگئے۔ اور آلِ محمد کو بھی ہجرت کرنا پڑ گئی۔ محمد نے تو پہلے ہجرت کی تھی۔ جہاں سے سن عجمی کا آغاز ہوا۔ یہ آلِ محمد کی ہجرت ہے۔ وہ دشمنوں کے خوف سے رات کے وقت ڈرتے ہوئے گئے تھے۔ اور غار میں جا کر پناہ لی تھی۔ یہاں وہ بات نہیں تھی۔ آلِ محمد نے اس شان سے ہجرت کی کہ دن کا وقت تھا۔ تمام اہلِ مدینہ دکھ رہے تھے۔ اور مدینہ کی رُوح اہلِ مدینہ سے یہ کہہ رہی تھی۔

”خدا حافظ۔ میں واپس نہیں آؤں گا۔ مدینہ دو۔ میں اب تمہارے شہر میں نہیں آؤں گا۔ مجھے اس شہر کی ایک ایک اینٹ سے محبت ہے۔ میں یہیں پیدا ہوا تھا۔ میری پرورش یہیں ہوئی تھی۔ اور

مدینہ والے تمہیں یاد ہو گا۔۔۔ مدینے کی دیواروں میں بھی یاد ہے نا۔ کہ میرے نانانے کا ندھے پہ مجھے سوار کیا تھا۔۔۔ مدینے کے بازار و تمہیں یاد ہے نا۔ کہ خدا کے رسول نے مجھے کا ندھے پہ سوار کیا تھا۔۔۔ میں کسی کو اپنے ساتھ جانے کے لئے مجبور نہیں کرتا۔۔۔ میں کوئی ٹٹے نہیں جارہا ہوں۔ کوئی مالِ قیمت نہیں لے گا۔۔۔ میں مرنے پر تیار ہوں۔۔۔ میرے ساتھ جو جانا چاہے۔۔۔ چلے۔۔۔ جو جانا چاہے۔۔۔ اعلائی عام ہے۔۔۔ میں کسی کو روکوں گا نہیں۔۔۔“

اور جہاں تک میری مملکت کا تعلق ہے قبلہ! جب آپ نے فرمایا کہ جو جانا چاہے میرے ساتھ چلے۔۔۔ تو یہاں انسان جو حضور کی خدمت میں آیا ہے۔ یہ کہنے کے لئے کہ قبلہ! میں چلوں گا۔۔۔ پیدا شخص جس نے آکے کہا کہ درود میں ساتھ چلوں گا۔۔۔

وہ تھے حضور امام زین العابدینؑ ————— اور امامؑ نے سر سے پاؤں تک شہزادے کو دیکھا ————— اور فرمایا: ”تمہارے منہ پر یہی تہا ہے۔ تمہاری ہی شان ہے جڑا بیٹا۔ برابر کا بھائی بڑا ہے۔ تو میرا قوت بازو ہے۔ تم میرے ساتھ چلو گے ————— مگر مجھے خیال آتا ہے ————— تم میں شاہی خزن ہے۔ تمہاری ماں شہنشاہ کی بیٹی تھی۔ تمہارا مزاج شہنشاہی مزاج ہے سفر بڑا تکلیف دہ ہے۔ بیٹا! کہیں تمہارا شہنشاہی مزاج اس تکلیف کو برداشت نہ کر سکے —————“

”ابا حضور! میں حضور کا بیٹا ہوں۔ میں ساتھ چلوں گا۔“

ایک بات مولانا نے اور پوچھی

”سجاد بیٹا۔ تم میرے دلدار اکبر ہو۔ اس لئے تم سے پوچھتا ہوں۔ کہ میں سفر میں جہاد کروں گا۔ یہ جہاد دو قسم کا ہوگا۔ ایک جہاد اصغر۔ ایک جہاد اکبر۔ تم کون سا جہاد کرو گے؟“

امام زین العابدینؑ نے جواب دیا

”ذلیل۔ میں چونکہ دلدار اکبر ہوں۔ اس لئے میرے سپرد جہاد اکبر فرمائیں۔“ مگر اپنی

زبان سے تشریح فرمائیں۔ ان دونوں جہادوں کی —————“

امامؑ نے فرمایا۔ ”سنو بیٹا۔ ایک بیابان میں ایک وحشی فوج کے بیچ میں گھر کے تین دن بھوکا بیابان سارہ کے بیدردی سے قتل ہو جانا۔ قبر نہ ملنا۔ کفن نہ ملنا۔ یہ جہاد اصغر ہے۔ اور ایک جہاد اکبر ہے بیرت لال۔ وہ یہ ہے کہ ماں، بہن، بھوپھی، بچوں کو ساتھ لے کر۔ ان کے سر کھٹے ہوئے ہوں گے۔ بال کٹھے ہوئے ہوں گے۔ اور بازاروں میں پھرائی جائیں گی۔ اور باوجود طاقت کے کچھ نہ کہنا ————— یہ جہاد اکبر ہے۔ تم کون سا جہاد کرو گے۔“

پس یہاں آکر میں نے اپنی مجلس ختم کر دی ہے۔ اور اتنی بات کہہ کے ختم کرنا ہوں کہ

خواب ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں۔ یہ خواب

یہ میرے اعتقاد کی بات ہے۔ کہ جب محرم کا پانچواں دن شروع ہوتا ہے پہلی رات کو۔ اور آپ لوگ مجلس کرتے ہیں تو مصومین تشریف لاتے ہیں ان مجلسوں میں۔ اور مصومین کے متعلق تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ دو مصوموں کے متعلق تو میرا ایمان ہے۔ کہ وہ تشریف لاتے ہیں۔ آپ کی مجلس کا وقت دیکھا۔ اور امام زین العابدینؑ نے کہا

”دبھ بھی اماں۔ چلو مجلس ہو گئی“

ان مجلسوں میں امام زین العابدینؑ بھی ہوں گے۔ اور حوروں کے ساتھ جناب زینبؑ بھی تشریف فرما ہوں گی۔ اور اچھ آک محسوسہ سفر کرنے کے لئے گھر سے روانہ ہو گئے۔ اور چلتے وقت جب محل میں عصمت کبریٰ سوار ہونے لگیں۔ اور ناقہ جیب لایا گیا دروازہ پر۔ امام علیہ السلام خرد اٹھے اور اٹھ کے فرمایا

”بھائیو۔ ذرا ایک طرف بیٹھ جاؤ۔ میں خود زینب کو سوار کرتا ہوں“ امام تشریف لائے دروازے پر۔ اور زینب چادر میں برقعہ میں سرھٹکاٹے خاموش برآمد ہوئیں۔ ایک بازو علی اکبر کے ہاتھ میں۔ ایک بازو سید الشہداء کے ہاتھ میں۔ اور امام نے محل کا پردہ اٹھایا۔ جناب غازی نے بلند آواز سے آواز دی

در محلے والو۔ خیر دار۔ کوئی بچہ بھی ادھر سے ادھر نہ گزرنے پائے۔ کوئی سوار یہاں سے گزرنے نہ پائے۔ کوئی آواز نہ بلند ہونے پائے۔ زینب سوار ہو رہی ہیں۔“

اور جب محل کے بالکل قریب پہنچیں۔ سوار ہونے کا وقت آیا۔ تو فرمائی ہیں ”رسین۔ ذرا ٹھہرو۔ اکبر بیٹا تم بھی ٹھہرو۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔ تم سوار کرنے آئے ہو۔ تم نے بہت تکلیف کی۔ میں خود سوار ہو جاؤں گی۔ کسی اور منزل پر

مجھے کون سوار کرے گا ————— ” جب بی بی نے یہ فقرہ کہے تو امام زین العابدین
آگے بڑھے۔ اور عرض کی

” پھوپھی اماں ————— میں سوار کرتا ہوں ————— “ اور خانہ آلِ محمد روانہ ہو
گیا ————— ہمیں انسانیت کا درس دینے کے لئے —————

خدا ہمیں بصدقہ محمد و آلِ محمد توفیق دے۔ کہ ہم اتنا دیکھ جائیں۔ کہ ہم انسان ہیں۔
اور انسانیت کا وہ درس جو محمد و آلِ محمد نے ہمیں دیا ہے اس میں پورا اتریں۔ خدا ان
مجلسوں کو قبول و منظور فرمائے۔ آمین

” بحق محمد و آلِ محمد۔ ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم “

” اللهم صلی علی محمد و آلِ محمد “

~ ~ ~

جب آلِ محمد امریت کی تلواروں سے

نہ کٹ سکے تو ان کے پروردہ مورخین نے

اپنے زہر آلود قلم سے آلِ محمد کو قتل کرنا

شروع کر دیا۔

(خطیب آلِ محمد)

معصوم — کا فیصلہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خداوندِ عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضراتِ محمد و آلِ محمد پر درود و سلام
حضراتِ گرامی!

خداوندِ عالم ہی محمد و آلِ محمد آپ حضرات کی توفیقات میں اور اضافہ کرے۔ اور
آپ کی اس عبادتِ عظمیٰ کو جو آپ اس زمانے میں کرتے ہیں، خدا قبول فرمائے۔
محترم بزرگان!

انسان کو ہر وقت ہر لمحہ محمد و آلِ محمد کی نصرت کی ضرورت ہے اور نہ ہی ان
کے بغیر زندگی میں انسان کا گزارا ہو سکتا ہے۔
میرے سامعین!

”زندگی“ کا لفظ میں بول دیتا ہوں۔ اور اس لفظِ زندگی سے زندہ دلوں
کے ذہن میں صرف یہی زندگی آتی ہوگی۔ جو اس دنیا میں ہماری زندگی گذر رہی ہے۔
حالانکہ اس زندگی کو زندگی کہنا، زندگی کے ساتھ مذاق کرنا ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہوتی
جس میں نہ آنے میں بس یہ جانتے میں بس۔ نہ یہاں آتے میں اختیار۔ نہ یہاں سے جانے میں اختیار۔
اتنی یہ بس زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ ایک زبردست نئے حکم دیا۔ ”جاؤ“۔ ہمیں آنا
پڑ گیا۔ اور جب وہ حکم دے گا ”واپس آؤ“۔ چاہے ہم مر جائیں ہمیں جانا پڑے
گا۔ جب تک حکم ہوگا ”یہاں رہو“۔ ہمیں رہنا پڑے گا۔ اگر خود جانے کی

کرکشی کی بھی۔ اور مرگئے۔ چے گئے۔ تو وہ بھیجے والا پکڑ لیا۔ کہ حرام موت تھی راکر
 بیچ گئے تو حکومت پکڑے گی۔ خودکشی میں پالان کر دے گی۔

بہر فرغ۔ نہ جانے میں بس ہے۔ نہ یہاں رہنے میں بس ہے۔ ایک زبردست

طاقت نے یہاں بھیج دیا۔ آنا پڑا۔ اور جب بلا لے گا۔ تو جانا پڑے گا۔

اور سچی بات تو یہ ہے۔ اس وقت اگر ہم سے پوچھا جاتا کہ "رتنم جانا چاہتے ہو۔

۔۔۔۔۔ اس وقت کا تو مجھے پتہ نہیں۔ اب میں شاید یہی جواب دیتا۔

"نہیں"۔ اور غالباً جیب بھی میں راضی نہیں تھا آنے پر۔ بھیج دیا زبردستی جو

چلا آ رہا تھا۔ ثبوت یہ ہے۔ کہ اگر میں ہنسی خوش آتا۔ تو آتے ہی ہنستا۔

لیکن میں راضی نہیں تھا آنے پر۔ جب ہی تو میں آتے ہی رویا۔ اور لطف کی بات یہ

ہے کہ گھر میں خوشیاں تھیں میرے آنے پر۔ مگر خوشی جیب ہوئی تھی۔ جب

میں رویا تھا۔ جیب تک میں رویا نہیں تھا۔ نہ ماں خوش تھی۔ نہ باپ خوش تھا

۔۔۔۔۔ نہ بہن خوش تھی۔ نہ بھائی خوش تھا۔ کسی کو میری زندگی کا یقین نہیں تھا۔

جیب تک میں رویا نہیں تھا۔ گویا انسان نے آتے ہی زندہ رہنے کا

ثبوت دیا رونے سے۔ زندہ رہے گا جو روئے گا۔۔۔۔۔ روزِنا زندگی کی

علامت ہے۔

بہر فرغ۔ بچہ پیدا ہوتے ہی روزِنا ہے۔ اور پھر یہی نہیں کہ بعد میں روزِنا نہیں۔

بلکہ جب کوئی ضرورت پیش آئے۔ وہ اُسے حل کرنے کے لئے سے۔ بھوک لگی۔

جیب رونے لگا۔ سردی لگی جیب رونے لگا۔ گرمی لگی جیب رونے لگا۔ نیمذ

آئی جیب رونے لگا۔ گویا زبان ہی روزِنا تھی۔ گفتگو ہی روزِنا تھی۔ ساری

زندگی ہی روزِنا تھی۔ جب سوائے رونے کے کچھ کام نہ تھا۔ تو ساری کائنات کہنت تھی۔

دیہ معصوم ہے۔ پوری کائنات کا فیصلہ تھا کہ معصوم ہے۔ اور جیب روزِنا کم ہرنا چلا گیا۔

بہر زما۔ میں رویا کرتا تھا۔۔۔ پھر زندگی اور برصحتی گئی۔۔۔ اور نہ نامک ہرنا
 گیا۔۔۔ بچپن آیا۔۔۔ بچپن رخصت ہوا تو شباب آیا۔۔۔ آنکھ جھپکی، شباب رخصت
 ہوا۔۔۔ تزیہ بوٹھا پیا آگیا۔۔۔ ہم نے کہا۔ چلو یہی قیمت ہے۔۔۔ تزیہ حضرت بھی چلے
 گئے۔۔۔ اور اس کے بعد وہ آخری منزل ہے۔۔۔ جسے موت کہتے ہیں۔۔۔ موت آگئی۔۔۔
 موت آئی تو زندگی ہماری جو یہ گذر رہی تھی۔۔۔ ختم ہو گئی۔۔۔ مگر یہ علم نہیں کہ موت کب
 آئے گی۔۔۔ یہ کسی کو معلوم نہیں کہ موت کب آئے گی۔۔۔ لیکن موت نے آنا ضرور ہے
 ۔۔۔ یہ پتہ ہے آئے گی۔۔۔ مگر یہ پتہ نہیں کہ آئے گی۔۔۔ اور موت
 انسان کو روزیہ سبق دیتی ہے۔۔۔ کہ جس کا آنا ضروری ہوا اس کے آنے کا وقت معین نہیں ہوتا
 ۔۔۔ چاہے وہ امام ہو یا موت۔۔۔ آئے گا ضرور۔۔۔ وقت معین نہیں ہوتا
 ۔۔۔ آنا ضرور ہے۔۔۔ ضرور آئے گا۔۔۔

بچپن ہم نے دیکھا۔۔۔ شباب ہم نے دیکھا۔۔۔ بڑھاپا ہم نے دیکھا۔۔۔ اور موت بھی
 آئی۔۔۔ ضرور آنا تھا۔۔۔ مگر کسی دانش ور نے یہ نہ کہا کہ
 بچپن برحق ہے۔۔۔ کسی نے یہ نہ کہا کہ شباب برحق ہے۔۔۔ کسی نے یہ نہ کہا کہ
 بڑھاپا برحق ہے۔۔۔ جس نے کہا۔۔۔ یہی کہا۔۔۔ ”موت برحق ہے“۔۔۔
 جس کا آنا ضروری ہو۔۔۔ بس وہی برحق ہے۔۔۔ چاہے امام ہو یا موت۔۔۔
 حضور!

یہ ہماری زندگی ہے۔۔۔ موت کی پہلی آئی اور یہ زندگی ختم ہو گئی۔۔۔
 اس زندگی کے لئے کیا کچھ کرتا ہے آدمی۔۔۔ خلا کی پناہ۔۔۔ انسان کو اس زندگی کو
 برقرار رکھنے کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔۔۔ خوشامدی، خدمتیں، اطاعتیں، عینیں، مجتہدین
 اور جو کچھ بھی ہے وہ اس زندگی کے لئے کر رہا ہے۔۔۔ جس نے ایک دن ختم ہو جاتا ہے۔۔۔
 اس کے بعد جو زندگی شروع ہوگی۔۔۔ اُس میں اور اس زندگی میں یہ فرق ہے۔۔۔

کہ اُس زندگی نے ختم نہیں ہونا — اس زندگی میں موت ضروری ہے — اس زندگی میں جینا ضروری ہے — یہاں جی نہیں سکتے — وہاں مرنہیں سکتے — یہاں مجبور ہیں مرنے پر — وہاں مجبور ہیں جینے پر —

اب اس چھوٹی سی زندگی کو بچانے کے لئے کتنی احتیاط ہے انسان کو — نزلہ ہو گیا — بیمار ہو گیا — طبیعت خراب ہو گئی — کیا کرنا ہے — زندگی پڑ جائے۔ کس ڈاکٹر کو بلاؤ — حکیم کو بلاؤ — ڈاکٹر آگئے — اب ڈاکٹر کے ہم محتاج ہیں — اس نے تبصہ دیکھی — حالات دیکھے — قیاس سے اندازہ کیا — اور کڑی سے کڑی دوا دے دی — مگر اس زندگی کو بچانے کے لئے ہم نے پی ٹی (P.T. INJECTION) انجکشن کیا — وہ تکلیف برداشت کر لی — اس زندگی کے لئے د (OPERATION) آپریشن کر دایا — ہاتھ پاؤں کٹوا دیئے — بہر حال اس زندگی کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے — اور

محترم ماسعین!

بیماری میں مرین کی یہ خواہش ہوتی ہے۔ کہ کوئی قابل ڈاکٹر مل جائے — جس سے بیماری جاتی رہے — زندگی محفوظ ہو جائے — اب ہم مشورہ کر کے ایک بڑے اچھے ڈاکٹر کے پاس پہنچے — تاکہ علاج کر دلائیں — اور لوگوں نے کہا کہ بہترین ڈاکٹر ہے — اس سے بہتر ڈاکٹر تو شہر میں ہے ہی نہیں — مگر ایک ذرا سانسفق ہے — اور وہ یہ ہے کہ یہ جان کے نہیں — اپنے اختیار سے نہیں — بلکہ کبھی کبھی بھولے سے — سہواً سنتے ہیں کوئی ایسی دوا لکھ دیتا ہے۔ جو ضرر ہوتی ہے۔ آپ ایمان سے تباہیں۔ ایسے ڈاکٹر کے سنتے پر اعتماد کریں گے — ؟ جو منہلی سے کبھی کبھار کوئی غلط دوا لکھ دیتا ہو — ؟ — نہیں — اس کے ہر سنتے پر شک ہوگا — کبیر ایسا نہ ہو کہ اس میں بھی کوئی غلط دوا لکھ دی ہو — جب

اس ذرا سی زندگی کے لئے کسی ایسے ڈاکٹر پر ہمیں اتنا دہنیں۔ جو کبھی کبھی بھولتا ہو۔ تو اس ہمیشہ کی زندگی کے لئے کسی ایسے کا دامن کیسے پکڑ لیں جو بھولتا ہو۔ جس سے غلطی ہو سکتی ہو۔ اب تلاش کرنا پڑتی ہے اس زندگی کے لئے ان ڈاکٹروں کی، ان طبیبوں کی، ان پچانے والوں کی جن کے متعلق یہ یقین ہو جائے۔ کہ نہ سہواً، نہ عمدہ، نہ ارادنا۔ ان سے کبھی غلطی ہو سکتی ہی نہیں۔ اور ذرا سا شک ہو جائے کہ ان سے غلطی ہو سکتی ہے۔ اُسے نہ اس زندگی میں پسند کریں۔ نہ اُس زندگی میں پسند کریں گے۔ جس طرح ایک مقدمہ ہو جاتا ہے عدالت میں اور کسی دکیل پر اگر یہ شبہ ہو جائے۔ کہ قابلِ ذمہ ہے، لائقِ توہر ہے۔ تا فر ن بھی بہترین جانتا ہے۔ ساری باتیں ٹھیک ہیں۔ مگر کبھی کبھی غلطی سے غلط بحث کر دیتا ہے۔ ایسے دکیل کو ن دکیل کرے جو کبھی بھی غلطی کر سکتا ہو۔ اور جب اس عدالت میں ہم ایسے دکیل کو دکیل کرنا پسند نہیں کرتے۔ تو عاقبت کی عدالت کے لئے کون ایسے دکیل بنائے ان سے سہواً غلطی ہو سکتی ہو۔

اگر اس بار رُدم میں ہم اُس دکیل کو تلاش کریں گے جس سے کبھی غلطی نہ ہو۔ تو بارہ رُدم میں وہ کیوں نہ تلاش کریں جس سے غلطی ہو سکتی ہی نہیں۔ جو کبھی غلطی نہ کر سکتا ہو۔ ایسے کو تلاش کرو۔

یاد رکھو میرے سامعین!

ساری دنیا میں صرف محمد و آلِ محمد ہی وہ ہیں جن سے نہ کبھی غلطی ہوئی۔ نہ ہو سکتی ہے۔ ان سے نہ کبھی بھول ہوئی نہ کبھی سہواً ہوا۔ اور جب وہ ہیں موجود نہ بھولنے والے۔ تو ہر ایک کے ہاتھ میں اُن ہی کا دامن ہو۔ اور

رہ نہ بھولے والو!

ہم بھولنے والوں کا تم سہارا ہو۔ ہم بھٹکنے والوں کا تم سہارا ہو۔ ہم، تمہیں محمد و آلِ محمد کو کیوں نہ یاد کریں۔ جو کہ وہ اس دنیا کے بھی ماہر ہیں۔

اور اس دنیا کے بھی عالم ہیں — وہ بونٹختائیں گے۔ جو طریقہ بتائیں گے — وہ بہترین ہو گا۔

گو یا محمد و آل محمد خود غلطی سے تبرا ہیں — اور صاحبان !

اسی کو مذہب کی اصطلاح میں "معصوم" کہتے ہیں — معصوم کے معنی یہی ہیں کہ جس سے

سہواً، عمداً، علم میں، عمل میں، جاننے میں، کرنے میں، قدم اٹھانے میں، چلنے میں، پھرنے میں، بیٹھنے میں،

اٹھنے میں، سونے میں، جاگنے میں، بیماری میں، آزاری میں، کسی عالم میں بھی غلطی کا احتمال ہو سکتا ہی نہیں

_____ بس ذہبی معصوم ہے — اور جس سے ذرا سی غلطی ہو سکتی ہو — کہ

صاحب ! یہ معصوم تو ہے — تندرستی میں تو معصوم رہتا ہے مگر جب بیمار ہو جائے تو دماغ

میں ذرا سانسینان کا مرض (-----) معلوم ہوا وہ معصوم ہی نہیں — ہم

اُسے معصوم ہی نہیں مانتے _____ اور معصوم کے تو معنی یہی ہیں کہ _____

_____ کیا مجال جو کہیں غلطی ہو _____ کیا مجال جو کہیں نقص آجائے _____

_____ بہر حال۔ وہ ایک طویل زندگی ہے جس نے کبھی ختم ہی نہیں ہونا _____

_____ یہاں تزیہ بھی ہے — اگر ایک ڈاکٹر کی غلط دوا چلی۔ آج اُس سے تکلیف بڑھ گئی۔

شام کو دوسرا ڈاکٹر بلایا — اُس نے دوا دی۔ کل ٹھیک ہو گئے — چلو ایک دن کی تکلیف تھی۔

برداشتت کرنی _____ اور وہاں اگر غلط دوا مل گئی — اور وہاں اگر ایک دن کی

تکلیف ہو گئی — تو وہاں کا ایک دن ہے پچاس ہزار سال کا _____ وہاں ایک دن کی تکلیف

بڑی مصیبت ہوگی _____ اس لئے پورے غور سے ان طبیعوں کو تلاش کرنا پڑے گا جن سے

_____ احتمال ہی غلطی کا نہ ہو — جن سے شبہ ہی غلطی کا نہ ہو _____

بات یہ ہے حضور !

_____ کہ معصوم، معصوم میں فرق ہے۔ ہر معصوم یکساں نہیں ہوتا — ایک معصوم تو

_____ وہ ہے — جو وہی کرتا ہے جو ٹھیک ہو — کبھی غلطی کرتا ہی نہیں — وہ کرنے سے پہلے

_____ دیکھ لیتا ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے — وہ عمل سے پہلے دیکھ لیتا ہے کہ میں جو کر رہا ہوں۔ وہ

ٹھیک ہے ————— مگر میں جن چودہ معصومین کا ذکر کر رہا ہوں ————— ان کے معصوم ہونے میں اور باقی انبیاء کے معصوم ہونے میں میرے نزدیک فرق یہ ہے کہ ————— باقی وہی کرتے تھے جو ٹھیک ہوتا تھا۔ اور یہ ٹھیک نہیں تلاش کرتے ————— بلکہ یہ چوڑہ جو کر دیتے ہیں۔ ————— وہ ٹھیک ہوتا ہے۔ ————— ان معصوموں کو پہلے تلاش کرنا پڑتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ نہیں۔ ————— درست ہے کہ نہیں۔ ————— وہ حق کو تلاش کرتے تھے۔ ————— اور حق۔ ان چودہ معصومین کو تلاش کرنا ہے۔ ————— وہ حق کے پیچھے چلتے تھے۔ ————— حق ان کے پیچھے چلتا ہے۔ ————— جدھر ان چوڑہ نے رُخ کر دیا۔ ————— حق ہو گیا۔ ————— جو بات انہوں نے کہہ دی، ————— حق ہو گئی۔ ————— جو ان کے منہ سے نکل گیا، ————— حق ہو گیا۔ ————— ان کی معصومیت اور ہے۔ ————— ان کی معصومیت اور ہے۔

یہ چوڑہ معصوم۔ وہ معصوم ہیں۔ یہ حق تلاش نہیں کرتے۔ ————— حق انہیں تلاش کرنا ہے۔ ————— کہیں ہنس دیے تو مینا حق ہو گیا۔ ————— کہیں بیٹھ گئے تو مینا حق ہو گیا۔ ————— کہیں کھڑے ہو گئے تو کھڑا ہونا حق ہو گیا۔ ————— جس طرح ناز پڑھ لی۔ وہی ناز حق ہو گئی۔ ————— جس طرح روزہ رکھ لیا۔ ————— وہی روزہ حق ہو گیا۔ ————— کہیں جا گئے رہے تو جاگنا حق ہو گیا۔ ————— اور کہیں چادر تان کے سر گئے تو سونا حق ہو گیا۔

اب اس مصل میں غلام بھی ہیں، دانشور بھی ہیں، رکلا بھی ہیں۔ میں بے پڑھا لکھا سادہ آدمی آپ کے پیچ میں آ کے پھس گیا ہوں۔ ————— اللہ جانے۔ ————— آپ کیا کہیں گے۔ کیا نہیں کہیں گے۔ ————— یہ آئی ہوئی بات ہے۔ ————— وہ کہتا چلوں آپ سے۔ ————— کہ جس انسان کی زندگی، ساری رات سنت نازیں پڑھیں میں گزری ہوں۔ ————— نمازِ شب پڑھا ہوں۔ ————— وہ اگر ساری رات سوتا رہے اور میں جا کے اُسے نمازِ شب کے لئے جکادوں۔ ————— ”اُٹھو۔ نمازِ شب کا وقت ہے۔“ ————— اور وہ کہے۔ ————— ”آج ہی نہیں اٹھنا۔ آج مجھے حکم ہے سونے کا۔“ ————— ”تو بتاؤ جس رات اُسے

سونے کا حکم تھا۔ اس رات اگر اٹھ کے نماز پڑھنے لگتا۔ یہ مناسب تھا یا نامناسب
 ؟ ”نامناسب“ — معلوم ہوا کہ کہیں ان کی نماز بہتر ہوگئی اور
 کہیں ان کی نیند بہتر ہوگئی — گویا آج کی رات اس عابد کے لئے نیند نماز سے بہتر ہے۔
 تو یہ وہ معمول ہیں جن کا ہر عمل صحیح ہوتا ہے — یہ چاہتے ہی وہ ہیں جو اللہ جانتا ہے
 اور جن کی نیت ہی وہ ہو جو اللہ چاہے ان کے عمل میں کہیں غلطی ہو سکتی ہی نہیں — جن
 کی شبیہت و خواہش ہی وہ ہے جو اللہ جانتا ہے۔
 میں آپ سے پھر جلد متعرفہ کتنا چلوں کہ
 یاد رکھو میرے سامعین!

عسجد آل محمد کی ان اداؤں پہ دنیا مرقی ہے۔ کہ آپ نے ساری زندگی
 وہی کیا جو خدا نے چاہا — اپنا چاہا کیا ہی نہیں — بس جو خدا نے چاہا، وہ آپ نے چاہا —
 خدا نے چاہا۔ ”ناقہ کرو“ — ”بہت اچھا“
 خدا نے چاہا کھانا کھارو — ”بہت اچھا“
 خدا نے چاہا۔ ”سوؤ“ — ”بہت اچھا“
 خدا نے چاہا۔ ”جاگو“ — ”بہت اچھا“

جب ساری زندگی آپ وہی کرتے رہے۔ جو خدا نے چاہا — تو خدا کے مدد کا تقاضا

یہ ہے کہ —

اگر تم زندگی بھر وہی کرتے رہے جو خدا نے چاہا — تو قیامت کے دن اگر اللہ
 مدد کرے گا — تو مدد کا تقاضا یہ ہے کہ —

یہاں تم نے وہی کیا جو اللہ نے چاہا — وہاں
 اللہ وہی کرے گا — جو تم چاہو گے — یہاں تم وہی کرتے رہے جو اللہ نے چاہا —
 وہاں اللہ وہی کرے گا — جو عسجد آل محمد چاہیں گے — مدد کا

تعاظی ہی ہے۔۔۔۔۔ اس لئے محمد و آلِ محمد میں کوئی جھول یا غلطی برکتی
 ہی نہیں۔۔۔۔۔ شہیتِ اللہ کی۔۔۔ ارادہ اللہ کا۔۔۔ اور عملِ ان کا۔۔۔ اسی
 لئے اللہ ان کے انصاف کو اپنا ماتھہ کہتا ہے۔۔۔ ان کے کام کو اپنا کام کہتا ہے۔۔۔ ان
 کی آنکھ کو اپنی آنکھ کہتا ہے۔۔۔ کیونکہ ان کی آنکھ دیکھتی ہی وہی ہے۔ جو اللہ دیکھے۔۔۔ چاہتا ہے
 اللہ۔۔۔ عمل یہ کرتے ہیں۔۔۔ یہ صرف محمد و آلِ محمد تھے۔ جن کے عمل کو اللہ اپنا
 عمل کہتا ہے۔۔۔ جن کا ارادہ وہ تھا جو خدا کا ارادہ تھا۔ جن کی شہیت وہ تھی جو خدا کی شہیت
 تھی۔۔۔ وہ چاہتے وہی تھے۔ جو خدا چاہتا تھا۔ وہ کرتے وہی تھے جو ارادہ الہی تھا۔ اس
 کے بغیر وہ عمل کوئی کرتے ہی نہیں تھے۔۔۔ خواہ دنیا نے انہیں تہید بھی کیا۔ انہیں گھروں
 میں محووظ بھی رکھا۔ انہیں سب کچھ کیا۔ مگر کوئی یہ نہ کہہ سکا۔ کہ ان میں غلاں غلطی تھی۔
 وہ دشمنوں کے مجمع میں کھڑے ہو کے کہتے تھے۔۔۔ ”ہم جو بتِ خدا
 ہیں۔۔۔“ ”ہم اللہ کی شہیت ہیں۔“ ”ہم اللہ کا ارادہ ہیں۔۔۔“ اور
 دشمنانِ آلِ محمد، آلِ رسول کی زبان ٹوڑنے کے لئے تہید تو انہیں کر دیتے تھے۔۔۔ مگر
 ان کی یہ طاقت نہیں تھی۔ کہ وہ یہ کہہ دیں۔ کہ ”یہ غلط کہتے تھے۔۔۔“ وہ
 جو کرتے تھے۔ بالکل صحیح کرتے تھے۔ کیا مجال جو ان کے کسی عمل میں خرابی آجائے۔
 اپنی اپنی عقل کے مطابق لوگ شورے ضرور دیتے تھے۔ اور وہ آلِ رسول ان کا شکر یہ ادا
 کرتے تھے۔۔۔ مگر کرتے وہی تھے جو اللہ چاہتا تھا۔

سابعین!

بہ تبار۔ انہی آلِ محمد کی فردا علیٰ حضور سید الشہداء حضرت امام حسینؑ علیہ السلام
 کو بہت سے آدمیوں نے اپنی عقل کے مطابق شورے نہیں دیئے تھے۔۔۔؟
 ”در حسینؑ بیعت کرو۔“ ”در حسینؑ کہیں دوڑ چلے جاؤ۔“ مگر حسینؑ ہر ایک کا شکر یہ
 ادا کر رہے ہیں۔۔۔ لیکن حسینؑ کو ماوہ چاہتا ہے جو اللہ چاہتا تھا۔ اور

بلکہ فرمایا ————— ” میں علی کا بیٹا ہوں ، اور سعیت نہیں کروں گا ————— “ مگر یہ فرمایا
ان لوگوں کے سامنے جو علی کو دیکھے ہوئے تھے۔ جو علی کے ساتھ رہے ہوئے تھے —————
جن کے سامنے علی کی ساری زندگی تھی ————— ان کے سامنے اپنے کو علی کا بیٹا کہہ کے انکار
کرنے کے معنی یہ ہیں کہ —————

”وہ اُس نے یہ کام کہیں کیا تھا نہ میں کروں گا —————“ میں یہ کام نہیں کروں گا —————“
اب ”نہیں“ کہہ کے حسین گھرا گئے۔ دنیا حیران ہو گئی۔ کہ اتنی بڑی سلطنت کے
سامنے حسین ————— ”نہیں“ کہہ رہے ہیں ————— اللہ جانے ارادہ کیا ہے ————— کیا
کریں گے ————— ؟

حسین گھرا آئے تو بہن ملی

”حسین! کیا بات ہوئی تھی —————“ تو مولانا نے فرمایا

”بہن! کیا تباؤں ————— مجھ سے یزید کی بیعت مانگی گئی تھی —————“

”تم نے کیا جواب دیا حسین! زینبؓ نے پوچھا

”بہن! میں تم مشورہ پاتا ہوں“

”حسین! تم امام وقت ہو ————— معصوم ہو ————— تمہیں مشورے کی کیا ضرورت ہے۔“

”بہن! بات یہ ہے کہ تم عمر میں تو مجھ سے چھٹی ہو ————— مگر تم ہی تو وہ

ہو اس بات کی کہ اماں کے بعد ہم نے تمہاری عزت اماں کی طرح کی ہے —————

باوجود بڑا بھائی ہونے کے ہر معاملہ میں تم سے مشورہ لیا ہے ————— اور

آج بیعت یزید کا سوال ہے زینبؓ! بولو۔ کیا جواب دوں۔“؟

تو بی بی نے فرمایا

”حسین! میرا امتحان لے رہے ہو ————— سنو حسین! جو خون تمہاری رگوں میں ہے۔

وہی میری رگوں میں ہے۔ جو دودھ تم نے پیا ہے۔ وہی میں نے پیا ہے۔

جو تمہارا نام ہے۔ وہی میرا نام ہے۔ ————— جو تمہارا باپ ہے۔ وہی میرا باپ ہے۔ —

جو تمہاری ماں ہے وہی میرا ماں ہے

بس فرق اتنا ہے حسین!

تیرے سر پہ آیا کلام ہے ————— مگر

دیکھ حسین!

میرے سر پہ اماں کی چادر ہے۔ ————— میرا امتحان نہ تو حسین!

تو اُم نے فسرایا

در زینب!

میں امتحان نہیں ے رہا۔ ————— شورہ چاہتا ہوں۔ —————

”حسین!

اگر تو نے مجھے یہ عزت بخشی ہے شورے کی تو پھر میں میرا جواب آ

”کیا جواب ہے زینب تمہارا،“

اگر مجھ سے پوچھتے ہو حسین!

”تو کہو در نہیں۔“

اب زینب نے کہا۔ ————— ”نہیں۔“ ————— تو حسین نے اپنا سر فوراً سجدے میں

رکھ دیا۔ ————— اور کہنے لگے

”مخلوق! —————

تیرا شکر ہے۔ ————— میری بہن کی ”نہیں“ بھی میرے ساتھ شامل ہو گئی۔ —————

اب دنیا کی کوئی طاقت ہماری ”نہیں“ کو ”ہاں“ سے نہیں بدل سکتی۔ ————— ”مگر

زینب ایک بات سنا۔ ————— میں بھی ”نہیں“ کہہ کے آیا ہوں۔ ————— تم بھی نہیں کہہ رہی

ہو۔ ————— ہم بہن، بھائیوں کو اس ”نہیں“ کی تمیت دینا پڑے گی۔ ————— مگر

”زینب!“

میری قیمت اور ہے تمہاری قیمت اور ہے۔۔۔۔۔ اب بی بی بولی
 ”حسین! مجھے کوئی پرواہ نہیں۔۔۔۔۔ نکلنا کر۔۔۔۔۔ میں اپنی مدد نہیں۔۔۔۔۔ پتہ قائم رہوں گی۔۔۔۔۔“

”زینب!“

دو میدان سر کرتے پڑیں گے۔۔۔۔۔ ایک کربلا کا میدان۔۔۔۔۔ ایک شام کا میدان۔۔۔۔۔
 تو زینب نے پوری شان سے کہا
 ”میں بھی فاتح اعظم کی بیٹی ہوں۔۔۔۔۔ ایک میدان حسین! تو اپنے حصے میں رکھ۔۔۔۔۔“
 ایک میدان میرے سپرد کر۔۔۔۔۔
 حسین!

کربلا تیرے سپرد۔۔۔۔۔ شام میرے سپرد۔۔۔۔۔ کربلا
 تو فتح دینا۔۔۔۔۔ شام میں فتح کروں گی۔۔۔۔۔ اگر دنیا کے سب سے
 بڑے نام کو گالی نہ بنوادوں تو زینب نہ کہنا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔
 میں حسین!

شام تو میں تمہاری فتح کروں گی۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔
 کربلا میں تیرے ساتھ شرم کروں گی
 یوں کام کریں گے حسین! کہ بلا جا کر۔۔۔۔۔ کہیں قانون ہوں۔۔۔۔۔ میں گھر میں بیٹھوں گی۔۔۔۔۔
 تو مرد ہے تو ابرو نہ۔۔۔۔۔ ہاں کے سارے کام تیرے سپرد۔۔۔۔۔
 گھر کے اندر کے سارے کام یہ۔۔۔۔۔ سپرد۔۔۔۔۔ گھر میں عزتیں ہیں۔۔۔۔۔ عورتوں کی سرداری میں
 کروں گی۔۔۔۔۔ سروں ہاں مرد تو کرنا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔
 میں حسین!

شہیدوں کا سردار تو ہیں

اور _____ اسیروں کی سردار میں بزدلی
 کسی شہید کو گھر میں کپڑے پہنانا میرے ذمے
 اور _____ میدان سے لاشیں لانا تیرے ذمے
 دیکھنا حسین!

تو بھی بھائی قربان کرے گا میں بھی بھائی قربان کروں گی — تیرا بھائی قربان ہوگا
 عباسؑ جیسا — میرے دو بھائی قربان ہوں گے — ایک حسینؑ جیسا — ایک عباسؑ
 جیسا — تیرا ایک بھتیجا قربان ہوگا — تاسم جیسا — میرے دو بھتیجے قربان ہوں گے
 ایک اکبرؑ جیسا — ایک تاسم جیسا —
 دیکھنا حسین!

دو بیٹے تو قربان کرے گا — ایک اکبرؑ — ایک اسمعٰلؑ — دو ہیں
 بھی قربان کروں گی — مگر میرے بچوں کا تیرے بچوں سے کوئی مقابلہ نہیں حسین! —
 تیرے بچے شہزادے ہیں — میرے بچے ان کے غلام ہیں — مگر ایک وعدہ کرتی
 ہوں حسین!

دو بیٹے قربان کرنے کے بعد نور بی بی پہ جو تیری نسل قیامت تک باقی رہے گی — اور
 میری بیٹی شہزادہ کی — میری نسل ختم ہو جائے گی — اب تیرا ہی کوئی
 بیٹا مجھے مان کہو تو مجھ سے — دوسرا میرا کوئی بیٹا نہیں رہے گا جو مجھے مان کہو کے
 پہ سے کا —
 اور _____
 میں حسین!

کر بلا تیرا علاقہ ہے — تمام میرا علاقہ — کر پانچ نفع کرنے کے
 بعد تو قیامت تک اپنے مفروضہ علاقے میں رہنا — اور میں قیامت تک اپنے مفروضہ
 علاقے میں رہوں گی — کر بلا میں تیرے ناسرائیں گے حسین! میری روح فرشتہ برکتی ہے

ناروں کو دیکھ کے _____ مگر خدا کو ایسا بھی پیدا کر دے گا جو میرا دروازہ
بنا دے گا۔ میرے ان بھی کوئی آجایا کرے گا۔ _____ اور
آخری فیصلہ یہ ہے حسین!

جتنے بچے ہیں بارے ساتھ۔ _____ ان میں جتنے لڑکے ہیں۔ وہ تیرے سپرد
_____ اور جتنی لڑکیاں ہیں وہ میرے سپرد۔

شوگے یہ فقرہ صائبان! فیصلہ بہن بھائی کا

در لڑکے حسین تیرے سپرد۔ _____ لڑکیاں میرے سپرد

علیٰ اصغر لڑکا ہے۔ _____ وہ تیرے سپرد

کیئٹہ لڑکی ہے۔ _____ وہ میرے سپرد

حسین! اصغر تیرے ہتھے ہیں۔ _____ کیئٹہ میرے ہتھے ہیں۔ اور حسین!

اگر اصغر کا گلا زخمی ہوگا تو تیری گود میں۔ _____ وہ تیرے ہتھے کا ہے۔ _____ اور

کیئٹہ کے کان زخمی ہوں گے تو وہ میری گود میں۔ _____ وہ میرا حق ہے۔ _____

دونوں بہن بھائی مل کے اس میدان کو سر کریں گے۔ _____ اور

حسین!

میں تجھے اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔ _____ ہر مقام پر ہر شکل میں تیرے

ساتھ رہوں گی حسین! _____

دنیا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ کی کتاب ہے۔ _____ کہ بلا جا کر پتہ چلا کہ کیا ہو گیا

_____ اور میری گفتگو ختم ہو گئی۔ _____ بیباکین ختم ہو

_____ گیا۔ _____

یاد رکھو سامعین!

آج دنیا میں جتنی مجلسیں ہورہی ہیں۔ _____ یہ سب زینب کا دست ہے۔ _____

درد ایک غیر آبادی میں ٹٹ جانے اور مرجانے والے کانٹے کو کوئی جان بھی نہ سکتا۔۔۔۔۔
 زینبؓ اوٹھ کے منیر پہ بیٹھ کر۔ ننگے سر۔ بازاروں میں جا کر مجلس نہ پڑھتی۔۔۔۔۔
 دروگو۔۔۔ میرا حسین مارا گیا۔۔۔۔۔

یہ زینبؓ کی مجلسیں ہیں جو ساری دنیا میں ہو رہی ہیں۔۔۔۔۔ یہ زینبؓ
 کے مدتے ہیں جو رہا ہے جو کچھ ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ اور اللہ کا کوئی نام نہ لیتا (اللہ تو
 ہے اور برگا) اللہ کا کوئی نام نہ لیتا۔ اگر محمدؐ نہ ہوتے۔ اور محمدؐ کا کوئی لکھ نہ
 پڑھا۔ اگر حسینؑ نہ ہوتے۔ اور حسینؑ کا کوئی نام نہ لیتا۔ اگر زینبؓ نہ
 ہوتی۔۔۔۔۔ آج زینبؓ کی بدولت سارے نام لے جا رہے ہیں۔۔۔۔۔ اور
 میرے سامعین!

برہا پ کو بیٹی سے اور برہانی کو بہن سے محبت ہوتی ہے۔ میں تو سمجھا یہ
 ہوں کہ جب ہم مصیبت میں پکارتے ہیں وہ یا علیؑ اور تو علیؑ زینبؓ سے کہتے ہیں۔۔۔۔۔
 در بیٹی زینبؓ!

فلان نے مجھے مدد کے لئے پکارا ہے۔ تیری اجازت ہو تو
 جاؤں۔۔۔۔۔ یہ زینبؓ کا کا نام ہے۔

اللہ میں مردت محمدؐ و آل محمدؐ عطا فرمائے۔ بحق محمدؐ و آل محمدؐ
 ”ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم“

~ ~ ~

”لاریب“ کتاب کا۔۔۔۔۔

”مفسر“ وہی ہوگا۔۔۔۔۔ جو۔۔۔۔۔

”ولاعیب“ ہوگا۔۔۔۔۔

(خطیب آں محمد)

محبت

رض
(حلیب ابن منطاہر)

دغدغہ مند عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام
حضرات گرامی!

دنیا میں سب سے بڑی کشش کی شے کوئی ہے۔ جو انسان کا دل کھینچتی ہے۔ جو انسان
کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ تو وہ ہے ہی "محبت"۔ اگر محبت ختم ہو جائے تو یہ دنیا ہی
ختم ہو جائے۔ دنیا کا تم ہی محبت کے بل بوتے پر ہے۔

مولیٰ صاحبان! قرآن پڑھ پڑھ کے ہمیں بتاتے ہیں۔ کہ دنیا سے کادوں جو ہوگا۔ اس دن
بھائی سے بھائی بچا ہوگا۔ بیٹا باپ سے بچا ہوگا۔ اور باپ بیٹے سے اور عزیز ازیز سے
نفرت کرے گا اور ایک دوسرے سے جاگیں گے۔ "اس سے میں یہ سمجھا ہوں۔
کہ اُس دن "محبت" نہیں رہے گی۔ لہذا اس محبت نہ ہونے کے معنی قیامت ہے۔ جس
دن محبت نہیں ہوگی۔ کیا تاؤں۔ کیا ہوگا۔؟ بس قیامت ہوگی۔

اور "محبت" کا ایک ایسا عظیم رشتہ ہے۔ جو انسانوں تک ہی محدود نہیں۔ دنیا کی
ہر شے میں اس کی حیثیت کے مطابق "محبت" ہے۔ پتھر میں بھی محبت ہے۔ نباتات
میں بھی محبت ہے۔ حیوانوں میں بھی محبت ہے۔ اور انسانوں میں بھی محبت ہے۔
آپ نہ کہیں۔ کہ پتھر کوئی نا سمجھ شے ہے۔ پتھر بھی سمجھا رہے۔ اُسے

بھی محبت ہے — پیٹھر میں بھی جان ہے۔ زندگی ہے۔ حیات ہے — اگر پیٹھر میں جان نہ ہوتی — تو پیٹھر پیٹھر کو مار کر اُسے کُشتہ نہ کہتے — لفظ ”کُشتہ“، اس بات کی دلیل ہے — کہ ”زندہ تھا — اب کُشتہ ہوا —“ بہر نوع پیٹھر میں بھی زندگی ہے۔ پیٹھر میں بھی محبت ہے۔

جب کوئی پیٹھر معدن کے اندر کچھ اور بنا چاہتا ہے — فیروزہ، عقیق، امیرا یا کوئی اور شے — تو اُس پاس کے ذرے اُسے چپٹے رہتے ہیں — اور وہ امیرا بنا رہا ہے — اور جن ”ذروں“ میں اس ”امیرا“ کے ساتھ ”امیرا“ بننے کی ”ملا جبت“ ہے — وہ ہر حالت میں اس کے ساتھ ”والبتہ“ رہتے ہیں — اور جن ذروں میں امیرا بننے کی ملا جبت نہیں ہوتی — وہ چپٹے تو رہتے ہیں اُس کے ساتھ — مگر ذرا سی حرکت ہوئی تو — دو گئے

اسی طرح درختوں کی حالت ہے جناب!

درختوں کو بھی محبت ہے — نفرت بھی ہے — آپ دیکھتے ہیں — کیسے ہرے بھرے سرسبز دشا داب درخت ہیں — ان کے پتے، شاخیں، پھول، پھل کتنے اچھے ہیں — ان میں زندگی ہے — حیات ہے — مگر — ان کو زندگی بخشنے میں ان کی وہ شاخیں جو زمین کے اندر غائب ہیں — اگر درخت کا تعلق ان شاخوں سے منقطع ہو جائے — جو زمین کے اندر شاخیں ہیں — تو درخت ختم ہو جائے۔ گویا باہر کا حصہ زندہ ہے اس کی بدولت جو زمین میں غائب ہے — اگر اس غائب سے سلسلہ منقطع ہو جائے۔ تو یہ درخت بھی مردہ ہو جائے

اب جو شاخیں زمین میں ہیں۔ وہ بڑی نرم و نازک ہیں۔

تلاشِ غذا میں پلتی ہیں زمین میں ——— حیت تک نرم زمین طئی رہتی ہے ——— وہ چلتی رہتی ہیں ——— اگر کوئی پتھر سلتے آئیں ———
 توہیں سے مزہ مڑیا ——— ہڈان میں بھی نفرت و محبت کا مادہ موجود ہے ——— جو شے پسند ہے درسمان اللہ! ——— اور جو ناپسند ہے ——— دھجھوڑ بھی ——— دفعہ کرو ——— جانے دو ———
 بہر نوسہ درختوں میں بھی محبت و نفرت کا مادہ موجود ہے ———

اور حیوان کی نفرت و محبت تو ظاہر ہی ہے ——— اگر آپ اس کے سامنے اچھا سا چارہ رکھیں ——— تو کیسے چارے کھائے گا ——— اور اگر کڑی بیکر مارنے کو جائیں ——— وہ بھاگ جائے گا ——— پتیا بھی ہے ——— محبت بھی کڑا ہے
 پھر لطف یہ ہے ——— کہ حیوان میں جبرائیت کے باوجود ——— انسان سے خصوصیت ہے ——— کہ لوگ اس کے ہمدرد بڑے ہو جاتے ہیں۔ حیوان سے لوگوں کو ہمدردی بڑی ہو جاتی ہے ——— حالانکہ اتنی ہمدردی انسان سے نہیں ہوتی ——— جتنی حیوان سے ہوتی ہے ———

سامعین!

اگر میں کسی کی غذا، کسی کی شے، اس کی مرضی کے بغیر کھائوں ——— تو عمر بھر بے ایمان کہلاؤں ——— مگر آپ کا گھوڑا، آپ کی بکری، آپ کا جانور، میرے جانور کی گھاس کھا گیا ——— سارا چارہ کھا گیا بغیر اجازت کے ——— اب میں اُسے مارنے لگا ——— تو دیکھتے دیکھتے مالے اس کے حنائی بن گئے ———

درزیدی صاحب!

جانے بھی دو ——— حیوان ہے مدیچارہ ——— سو سارا چارہ کھا گیا ——— پھر بھی بیچارہ ساری گھاس کھا گیا ——— پھر بھی بیچارہ ——— پورا باغ کا باغ کھا گیا ——— پھر بھی بیچارہ ———

بہر زور۔ لوگ ایسے حیوان کے حاسی بن جاتے ہیں ————— لہذا حیوان میں بھی
 ”نفرت و محبت“ کا مادہ ہوتا ہے۔ —————

اور انسان کی زندگی کا تو دار مدار ہی ”محبت“ پر ہے۔ اسے محبت بھی ہے
 اور نفرت بھی ہے۔ ————— یہ چاہتا بھی ہے۔ بچتا بھی ہے۔ محبت نہ کرنا بھی
 خلاف فطرت ہے۔ ————— محبت کو بھی فطرت ہے۔ —————
 سامعین!

”محبت“ خود ”نفرت“ کی خاتی ہے۔ جب کسی سے آپ
 کو ”محبت“ ہو جائے گی۔ ————— تو خود بخود اس کے مخالف سے
 ”نفرت“ ہو جائے گی۔ ————— لہذا محبت خود خالی نفرت ہے۔
 ————— مگر شرط یہ ہے۔ کہ ہو ”محبت“۔

مصیبت یہ بن گئی ہے۔ کہ آج کل کے زمانے میں۔ جس میں ہم ہیں۔ اس میں
 محبت بے ہی نہیں۔ ————— بلکہ ”محبت نامی“۔ ————— ایک شے ہے۔ جس طرح گھی کی جگہ
 گھی نامی چیز بکتی ہے۔ ————— دودھ کی جگہ دودھ نامی شے بکتی ہے۔ اسی
 طرح محبت نہیں۔ محبت جیسی ایک شے ہے۔ جس کا نام لوگوں نے ”محبت“ رکھ لیا ہے۔
 میں بیٹھا ہوا تھا اپنے کمرے میں۔ ————— اُدھر سے ایک صاحب ملنے
 آئے۔ ————— دُور سے میں نے انہیں دیکھا کہ وہ آ رہے ہیں۔
 میں نے کہا

”لا حول و لا قوۃ الا باللہ“۔ ————— یہ بلا۔ اب کہاں سے آگئی ہے۔
 خواہ مخواہ کو میرا سر کھائے گا۔ ————— اسے چائے پلا نا پڑے گی۔
 اور میں نے بہت سی برائیاں کیں۔

اور جب وہ حضرت آگئے کمرے میں بالکل قریب۔ ————— نہیں

فورا دکھڑا ہو گیا

”بسم اللہ تشریف لائیے۔ آنکھیں ترس گئیں آپ کے

دیکھنے کو۔۔۔ بڑی خوشی ہوئی ہے۔۔۔“

اس ”نفاق“ کے معنی لوگوں نے ”محبت“ رکھ لیا۔۔۔ حالانکہ ہے یہ نفاق۔۔۔“

مگر اس کے معنی ہیں ”محبت“۔۔۔ مدخاب! بڑا اخلاق ہے۔۔۔“ یہ ”نفاق“ ہے۔۔۔ جس کو لوگ ”محبت“ کہتے ہیں۔

بعض اذنان دھوکا بھی لگ جاتا ہے آدمی کو۔۔۔ محبت نہیں ہوتی۔۔۔ مگر سچو بیٹنا

ہے کہ محبت ہے۔۔۔ حالانکہ محبت نہیں ہوتی۔۔۔ نیلیں گزر جاتی ہیں آدمی کی۔

مگر وہ دھوکا ختم ہی نہیں ہوتا۔۔۔ جس طرح مارے شامروں کی نیلیں گزر

گئیں۔۔۔ اور وہ آج تک اسی دھوکا میں مبتلا ہیں۔۔۔ کہ ”پردانے کو شمع سے

محبت ہے۔۔۔“ یہ زاد دھوکا ہے۔ اور کچھ بھی نہیں۔۔۔ دیوان کے دیوان بھر دیئے

انہوں نے۔۔۔ ہزاروں۔۔۔ کھنوں شعر لکھ دیئے انہوں نے اس معنی پر۔۔۔ کہ وہ جو

پردانے ہوتا ہے نا۔۔۔ جانور، چنگا سا۔۔۔ دے شمع سے محبت ہے۔۔۔ ”وہ

شمع پہ عاشق ہے۔۔۔“

اب ان سے کوئی پوچھے

”پردانے نے نہیں کہا تھا۔۔۔ مدد محبت ہے شمع سے۔۔۔“؟

اس نے تم سے شورہ بابت۔۔۔ مدد محبت ہے شمع سے۔۔۔“

تم کیسے سچے محبت ہے۔۔۔؟

مگر ہم نے شمع کے قریب بیٹھا دیکھ کے یہ سمجھ لیا ہے۔۔۔ کہ

پردانے کو شمع سے محبت ہے۔۔۔“

زمین میں کرتا ہوں

”شاعرو! ”

”قرب سے ہرنا اور بات ہے — محبت ہرنا اور

بات ہے —“

کوئی شمع نے انہیں چپٹی لکھی تھی کہ — آجاؤ —“

کوئی شمع نے آدمی بھیجا تھا — کہ — آجاؤ —“

شمع یہاں روشن ہوئی — وہ خود آگے — شمع کا یہ اخلاق تھا — کہ

اُس نے جھڑکا نہیں — بہر حال وہ آگے — اور اُس کے اس کے گرد اکٹھے ہو گئے

— اب اُس کے گرد اکٹھے ہونے سے آپ سمجھے محبت ہے — اور آپ کو دھوکا

لگنے کا سبب یہ ہوا — کہ شمع یہاں روشن تھی — پر دانے بھی نہیں موجود تھے —

اب شمع ہم اُٹھا کر یہاں سے کہیں اور لے گئے — تو وہ بھی ساتھ ہی ”ہجرت“ کر کے

چلے گئے — اس سے ہمیں یہ دھوکا ہوا — کہ انہیں بڑی محبت ہے —

حالانکہ ایمان سے پروانہ جتنا ہے شمع سے — اور جتنے کے بعد ہند

کرتا ہے — کہ شمع وہیں روشن ہے — اور اس کی ”دمیت“

کوئی ”دراٹیں“ پڑی ہے — کوئی ”بائیں“ پڑی ہے —

اب ان شاعروں کو کون سمجھائے — اور اگر میں سمجھاؤں بھی تو میری بات ان کی

سمجھ میں کہاں آئے گی — سینکڑوں برس کی دمان میں بیٹھی ہوئی بات — میرے کہنے

سے تھوڑا نکل سکتی ہے۔

بھائی شاعر! عزیز! ”

تمہارا غلط خیال ہے —

کہ پردانے کو شمع سے محبت ہے —“

بالکل محبت نہیں ہے — اُسے بڑی سخت عداوت ہے شمع

سے — پروانہ تو عاشق ہے اندھیرے کا۔ اُسے تو محبت
 ہے اندھیرے سے ————— اور
 شمع چونکہ اس کے محبوب کو، اندھیرے کو فنا کرتی ہے — یہ نامراد
 اُس سے رٹنے آجاتا ہے — اندھیرے کی حماقت میں شمع سے
 رٹنے آجاتا ہے —

تمہیں کیا خبر۔ کہ اس کی نیت کیا ہے —————؟

تمہیں کیا خبر۔ کہ اس کے دل میں کیا ہے —————؟

اگر تمہیں اس کی نیت کا، دل کا پتہ چل جائے ————— تو پھر پتہ چلے
 کہ حقیقت کیا ہے —————

اب یہ سارے اکٹھے ہو کے کہتے ہیں

دزدیدی صاحب!

آپ بحیثیت مولیٰ، ہم پر موصوب ڈال رہے ہیں —
 کہ مدیری بات مان لو۔ ————— یہ بھی کوئی قرآن و حدیث ہے۔
 جو ہم مان لیں ————— یہ تو شاعری کی بات ہے ————— اس معاملے
 میں مولیٰ کو کیا دخل ————— مولیٰ اور شاعر تو ایک دوسرے
 کی ضد ہوتے ہیں ————— یہ تو ہمارا مسئلہ ہے۔ ہم بہتر
 جانتے ہیں۔ —————

بھائیو!

تم بہتر جانتے ہو گے ————— مگر تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ————— کہ
 درخش سے پروانے کو محبت ہے۔ —————

اور میرے پاس دلیل ہے ————— کہ ”پروانے کو شمع سے نفرت ہے۔ —————“

دیں میری سُن لو — اس کی آمد بدیتم کر دو — تو میں تائل ہر طویل
کا

شع دوشن ہے — — پرماز تار ہے — قربان ہے —
موجود ہے — اور جب بچرنگی — — پھر
گھر چلا گیا

اگر محبت ہوتی — تو میت چھوڑ کر چلانا جاتا —
عمر بھر تَسربان رہنا — اور میت چھوڑ کے چلے جانا —
یہ کوئی محبت کی باتیں ہیں

مگر اب آپ لوگ کہتے جریں — کہ مد محبت ہے ، — — انتہ
کہنے داروں کی بات کو کون ٹال سکتا ہے — ہزاروں آدمی ل کے
جو کہہ رہے ہیں — اب اس بات کو کون روک سکتا ہے — اور
یہ شاعر صاحبان ! مجھے گھوڑ رہے ہیں کہ

دو دین سے تو ہم تائل ہو گئے — مگر باہر نکل — — پھر
پوچھتے ہیں — —

اس بات کا میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے — محض اپنی تعداد
زیادہ ہونے پر اڑتے ہیں — اور مجھے تنہا سمجھ کر ڈرا
لیتے ہیں —

بہر نوع — شع سے پروانے کو بالکل محبت نہیں ہے —
سامعین !

محبت چیز ہی اور ہے — محبت شے ہی اور ہے — محبت کا انداز ہی
اور ہے — «محبت» ایک ایسی شے ہے جو بیان نہیں ہو سکتی — یہ ذوق کی شے

ہے — محبت بیان نہیں ہو سکتی۔ اور

”محبت“ وہی جانتا ہے۔ جس سے اس کا واسطہ پڑا ہو۔ کہ اس میں کیا لطف ہے۔؟
 - محبت میں جو دیوانگی ہے۔ اس پر شاہیں قربان ہو جاتے ہیں۔ محبت میں جو
 دیوانے کو لطف آتا ہے۔ وہ شاہی میں لطف نہیں آتا۔

میرے محترم سامعین!

اگر دنیا میں اصلی، واقعی اور حقیقی محبت کی مثال ہے۔ تو وہ ایک اور
 صورت ایک محبت ہے۔ اور وہ ہے ”ماں کی محبت“۔ ”ماں“ جو بیٹے سے محبت کرتی
 ہے۔ وہ ہے ”واقعی“ اور ”حقیقی“ محبت۔ بس اس سے بہتر محبت کئی دنیا
 میں ہے ہی نہیں۔

بچو! آپ کو یاد ہوگا۔ کہ جب تم دوسری تیسری کلاس میں
 پڑھتے تھے۔ اس وقت ایک کہانی پڑھی تھی۔ ”ماں کی محبت“
 سے متعلق۔

ایک بچہ تھا۔ اس پہ دو عورتوں کا جھگڑا ہو گیا۔ ایک
 کہے۔ ”میرا بچہ ہے۔“۔ ایک کہے ”میرا بچہ ہے۔“
 دو عورتیں ایک بچے کی ماں ہونے کی مدعی ہو گئیں۔
 حاکم کے سامنے جب فیصلے کے لئے آئیں۔ اور حاکم خاکوٹی بڑا ہی
 قابل انسان۔ اس نے فیصلہ یہ کیا۔ کہ

دونوں کے دو ٹکڑے کر کے آدھا آدھا بانٹ دو۔
 اب جو بھٹی ماں تھی۔ وہ تو راستی ہو گئی۔ اور جو سچی ماں تھی
 اُس نے کہا

”دانا۔ یہ بچہ میرا نہیں ہے۔ اسی کو دے دیں۔“

اس بچے کو کچھ نہ کہیں —

حضور والا!

یہ ہے درساں کی محبت کی ایک مثال۔ اس سے پتہ چلتا ہے — کہ
جب چیز ہو ایک — اور اس کے دو بیزار ہوں دو — ایک ہو جھوٹا — ایک
ہو سچا — اور اگر اس چیز کے بگڑنے کا اندیشہ ہو جائے — تو سچا گھر
بیٹھ جاتا ہے
میرے مخمزم بزرگو!

مصیبت کے وقت انسان کے کام نہ پیرہ آتا ہے — نہ کوئی اور شے آتی ہے
اگر مصیبت میں کوئی شے یاد آتی ہے تو وہ صرف ”محبت“ ہے — محبت ہی کام
آتی ہے — اگر بڑے بڑے بزرگانِ دین اور انبیاء کرام نے بھی کوئی مطالبہ کیا ہے —
تو وہ ”محبت“ ہے — وہ بھی ہی چاہتے تھے کہ ”محبت“ ہو۔
دیکھو نا!

سینکڑوں کی تعداد میں آدمی کر بلا میں حسین کے ساتھ آ رہے تھے — اور ہر منزل
پر حسین! ان سے کہہ رہے تھے —
”بھائیو!“

میں رٹنے نہیں جا رہا ہوں — کوئی ٹھک فتح کرنے نہیں جا رہا
ہوں — کوئی مالِ عنیت ہمیں ملے گا — میں
مرنے جا رہا ہوں — میں تباہ و برباد ہو جاؤں گا — میرا
گھر ٹٹ جائے گا — میرے بچے ذبح ہو جائیں گے —
میں قربانی بن جائے گا — ہمیں کفن نہیں ملے گا — جو میرے ساتھ ہیں
گے — ان پر بھی یہی گزرے گی — تم داپس چلے جاؤ —

چنانچہ — بڑے اچھے اچھے ٹرنے والے جوان، واپس چلے گئے — اور جاتے جاتے
 جھوٹ کے صورت بہتر رہ گئے — اب چونکہ امام نہیں چاہتے تھے۔ اُن کی ضرورت
 نہیں تھی — اس لئے انہیں رخصت کر دیا — اس لئے کہ انہیں محبت نہیں
 تھی — ساقہ تو ہر لیئے تھے — مگر محبت نہیں تھی — اس لئے اُن ساتھ
 آئیوں کو رخصت کر دیا — اور جس سے محبت تھی — اُسے گھر بیٹھے کو خط بھیج
 رہا لیا —

درستہ بتائیے —

اگر ضرورت تھی — تو اپنی کیوں جانے دیا — اور اگر ضرورت
 نہیں تھی — تو اُس بڑے آدمی کو کیوں بلا یا؟ — مگر
 حسین! خدا کو رہے ہیں — اور خط کی صرف دو سطر ہی لکھیں —
 ایسا معلوم ہوا ہے — — کہ اُس وقت بہت ہی پریشانی کا عالم ہو گا — اس
 لئے مطویل خط نہیں لکھتے — بڑی پریشانی کے عالم میں مختصر سا خط لکھا — اور
 خط کی عبارت کیا تھی

درجائی حبیب!

یا اخی حبیب!

حبیب کا دل تو درجائی کا لفظ پڑھ کے ایب دم الٹ پیٹ ہو گیا —

در حسین! — اور مجھے جانی کے —

درجائی حبیب!

میں تمہارے علاقے میں آ گیا ہوں — بڑی محنت سے یہاں چھس گیا

ہوں — اگر مناسب سمجھو — تو میری مدد کو آؤ —

اور آخری فقرہ جس نے حبیب کے کھجے کے ٹکڑے کر دیئے — وہ یہ تھا۔

مد حبیب!

جی تہیں کبھی تکلیف نہ دیتا — مگر مجبوری یہ بن گئی ہے کہ

میرے ساتھ زینب بھی ہے —

بہر فرج۔ مولانا نے خط لکھا — مد حبیب! آگے — پھر حسین کی

چھوٹی سی فرج کی مدح بن گیا — حبیب! مدح تھا حسین کی چھوٹی سی فرج کا —

اور میں اپنے بیان کو یہاں آ کر ختم کرتا ہوں — کہ بی بی زینب کو حبیب سے اتنی

محبت تھی — اپنے بھائی کے درست سے — بی بی کو اتنا اعتماد تھا حبیب پر — کہ

جب شام عاشور خیمے جلنے لگے — اور زینب پریشان ہوئی ہے — تو

بی بی نے پریشان ہو کے حسین کو نہیں پکارا — عباؤں کو نہیں پکارا —

ایک دم گھبرا کے فرماتی ہیں

”د بھائی حبیب!

آؤ نا — دیکھو!

— مجھ پہ کیا گزری —

اور بزرگانِ من!

جب تاننا آل محمد کو نے میں داخل ہوا — آگے آگے ہمارا پکڑے ہوئے امام

زین العابدین چلتے پھرتے ٹھہر گئے — وہ ٹھہرے تو ناقہ ٹھہرا — اور

جب ناقہ ٹھہرا — تو اُس پر سوار بی بی نے یہ سمجھا — کہ شاید جتنیے کو کوئی تکلیف ہو گئی

ہے — گھبرا کے پوچھتی ہیں

”د بیٹا۔ زین العابدین! — کیا بات ہے —؟“

امام فرما تھے ہیں

”اماں — کچھ نہیں —“

اب بی بی پڑھتی ہیں

مدیٹیا! یہ بچہ کون ہے تمہارے ساتھ — ”

تو امام نے فرمایا

”اے ماں — یہ چھوٹی بیٹی کا بیٹا ہے — ہم جیب کے تھے سے

گزر رہے ہیں — ”

وہیں سے بی بی نے آواز دی

”جیب کے بچے!

میرے بھتیجے! برخردار!

”اے ماں کہاں ہے — ”

”میں اُسے جیب کا پُرسا دوں گی — ”

سانے ایک مکان کے چھتے سے آواز آئی

”وہ بی بی! ریح سے تیرے استقبال کے لئے بیٹھی ہوں — ”

حضور دالا!

یہ سب محبت کے کرشمے ہیں — آج کربلائے معلیٰ جا کے دیکھو —

گنچ شہیدان ایک طرف ہے — اور جیب کی مزرعی ایک طرف ہے —

”روندہ جیب“.. حرم کے برآمدے میں ہے — بالکل یوں معلوم ہوتا ہے کہ

حسینی زکوار کا پرائیویٹ سیکرٹری ہے — اس سے اجازت تو — تو اندر

جاؤ — اور جیب کا نڈان ”بہی اسد“ سے تھے — اور یہ ”بہی اسد“

وہ ہیں — جنہوں نے سید الشہداء کو دفن کیا تھا — اب بھی ہر سال تیسری محرم کو آتے

ہیں اسی طرح — جس طرح جیب آئے تھے دفن کرنے — اور جیب

وہ صحن میں آکر مٹی ڈال کے مولا کی معزومی قبر نالتے ہیں — تو ان کا شیخ آتا ہے

حرم میں حبیبؐ کی مرضی پر۔ اور وہ حبیبؐ کی مرضی کی پیر کے کہتا ہے

حبیبؐ! تم میرے شکر گزار میں۔۔۔۔۔

حبیبؐ! آیات تک تو نے ہماری آبرورکھی۔۔۔۔۔

حبیبؐ! تیری وجہ سے تیرے خاندان کی عزت بن گئی۔۔۔۔۔

خداوندِ عالم اپنے فضل و کرم سے میرے، آپ کے دل میں دعوتِ آلِ محمدؐ پیدا کرے۔۔۔۔۔

اے آلِ محمدؐ!۔۔۔۔۔ ہم تمہیں گواہ کرتے ہیں۔۔۔۔۔

الرحمت کے استحسان میں ہم پر سے نہیں اتارتے تو اتنا دعویٰ ضرور ہے۔ کہ تمہارے دشمنوں

سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔۔۔۔۔ اب تمہاری مرضی ہے۔۔۔۔۔ بدھ صر جاہو بے جاؤ۔۔۔۔۔

ہم گنہگار ہیں۔ بہت زیادہ گنہگار ہیں۔۔۔۔۔ مگر شریعت اور اچھے خدایوں کو اپنا گناہ۔۔۔۔۔ تو

ہم اتنا کلام ہے۔۔۔۔۔ تمہاری شان تو یہی ہے۔ کہ ہم جیسے گنہگاروں اور ذلیلوں کو

اپنا گنہگار۔۔۔۔۔ اللہ میں دعوتِ محمدؐ و آلِ محمدؐ عطا فرمائے۔۔۔۔۔ بحق محمدؐ و آلِ محمدؐ۔

در بنا لقبنا انک انت السميع العليم۔ اللہم صلی علی محمد و آلِ محمد

۔۔۔۔۔

شمع۔۔۔۔۔ جلتی ہے۔۔۔۔۔ پتنگ کا موجود ہے

۔۔۔۔۔ جب۔۔۔۔۔

بوجھ گئی۔۔۔۔۔ تو گھر چلا گیا

۔۔۔۔۔ اگر۔۔۔۔۔

محبت ہوتی۔۔۔۔۔ تو میت چھوڑ کر چلا نہ جاتا

(حبیبِ آلِ محمدؐ)

اللہ نے آدم کو خلافت کے لئے چنا۔

کہا تھا فرشتوں نے — یہ خون ریزی کرے گا — یہ فساد کرے گا۔
 آپ حضرات بزرگ بیٹھے ہیں — آپ بتائیں ایمان سے — فرشتوں کی یہ کہی ہوئی
 بات اولاد آدم نے سوئی صدی صحیح ثابت کر دکھائی یا نہیں۔ خون ریزی و فساد اولیٰ بات فرشتوں
 کی کسچی ثابت ہوئی یا نہیں — اس زمین کو فتنہ و فساد سے اولاد آدم نے بچہ دیا۔ یا
 نہیں؟

بے چارے کوئی غلط تو نہیں کہہ رہے تھے۔ ٹھیک کہہ رہے
 تھے — مگر بڑے کی بات تھی۔ انہیں یہ نہیں کہا اللہ
 نے کہ ”تم غلط کہتے ہو“ وہ فساد نہیں کرے گا — خون ریزی
 نہیں کرے گا۔ .. بلکہ انہیں اسی طرح جھڑک دیا۔ جس طرح
 چھوٹوں کو بڑے جھڑکتے ہیں۔ ” اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ “
 خیردار! کچھ نہیں کہنا تم نے — ہم بہتر جانتے ہیں —
 وہ بے چارے پُپ ہو گئے — مگر ان کا خیال جو تھا۔ وہ
 بالکل صحیح ثابت ہوا۔

اب فرشتے جو یہ کہہ رہے تھے — ان سے پوچھو —
 ”فرشتو! تمہیں کیا خبر۔ یہ خون ریزی کرے گا۔
 تمہیں کیا خبر — ”فساد“ کرے گا — کیا تم
 — ”عالم خیب“ ہو —
 فرشتے جواب دیتے ہیں۔

”جناب — خیب کا علم تو ہمارے فرشتوں کو بھی نہیں۔“
 ”پھر تم نے کیسے سمجھ لیا۔“

فرشتے بولے ”حضور! یہ تو سامنے کی بات تھی۔۔۔۔۔ اس میں غیب کی کیا بات تھی۔۔۔۔۔ ہمیں پتہ تھا کہ۔۔۔۔۔“

آدم کس طرح بن رہا ہے۔۔۔۔۔ اس کو بتا دیکھتے ہی ہم سمجھ گئے تھے کہ اس کا ”بنا“ جو ہے۔ یہ ہمیشہ ”بنا“ نہیں رہے گا۔ ضرور بگڑے گی بات۔۔۔۔۔

سامعین! اللہ نے حکم دیا جبرئیل کو۔ زمین سے مٹی لاؤ۔۔۔۔۔ جبرئیل نے حکم خدا سے مٹی اٹھانے۔۔۔۔۔ زمین سے مٹی اٹھائی۔۔۔۔۔ زمین پوچھ بیٹھی۔۔۔۔۔

”قبلہ! کیا ارادہ ہے۔۔۔۔۔ مٹی کہاں لے جا رہے ہو۔۔۔۔۔؟“

جبرئیل نے جواب دیا

”اس سے اللہ کچھ بناانا چاہتا ہے۔۔۔۔۔“

زمین نے کہا۔

”جانے بھی دو۔۔۔۔۔ کیوں خاکساروں کو بناتے ہو خواہ مخواہ کیلئے۔“

کچھ ایسا زمین گر گرائی۔ چلائی۔ فریاد کی۔۔۔۔۔ جبرئیل کو ترس آگیا۔ چھوڑ دیا پتاجبرئیل نے میکائیل کو بھیجا۔

”تم مٹی لاؤ۔“

میکائیل نے آکے مٹی اٹھائی۔۔۔۔۔ زمین نے پھر پوچھا

”قبلہ! کہاں لے جا رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ میکائیل نے کہا۔

”اس سے اللہ کچھ بنائے گا۔۔۔۔۔“

مٹی نے پھر فریاد کی۔ ”چھوڑ دو۔۔۔۔۔ جانے دو۔۔۔۔۔ میرا خاک بنے گا۔۔۔۔۔“

پتاجبرئیل کو بھی ترس آگیا۔۔۔۔۔ پھر وہ آئے تیسرے فرشتے اسرافیل نے

انہوں نے کہیں سے مٹی اٹھائی۔ زمین پھر روئی پھینچی۔ چلائی۔۔۔۔۔ پھر وہ چھوڑ گئے۔

آخر اللہ نے ملک الموت کو حکم دیا۔

میں ہے ————— ”مٹی“ اس میں ہے ————— ہوا اس میں ہے۔
 ایسے چار کو ملا کر بنایا گیا ہے ————— نہ ان چاروں کی نسل ایک
 ————— نہ مذہب ایک ————— نہ مزاج ایک ————— نہ طبیعت ایک
 ————— کسی کا کوئی مزاج ————— کسی کا کوئی مزاج ————— کسی کا
 کوئی خاندان۔ کسی کا کوئی خاندان ————— ایسے چار کب تک مل
 کے رہیں گے۔ ضرور فساد ہوگا۔ ضرور جھگڑا ہوگا ————— وہ
 فرشتے تو آدم کی اجزائے ترکیبی ہی دیکھ کر سمجھ گئے تھے ————— کہ
 ایسے چاروں کو ملا کر کبھی اکٹھا نہیں کیا جاسکتا۔ ————— ان میں ضرور
 ٹھنڈ پڑے گی۔ —————

اب ہم سب ان چار کے بنے ہوئے ہیں ————— ہیں تو ان چار کے بنے ہوئے آپ
 حضرات ————— مگر ایمان سے ایک جی ہم سے یہ نہیں کہتا ————— کہ ”میں تو ہوائی“ بندہ
 ہوں۔ حالانکہ ”ہوا“ بھی موجود ہے۔ ”میں تو آبی“ بندہ ہوں۔ حالانکہ ”پانی“ بھی
 موجود ہے۔ اور ”ناری“ تو کون کہے گا۔ —————

دیسے جب پوچھو ————— ”بھی خاکی بندہ ہوں۔“ ————— ”باقی یاد ہی نہیں رہے۔
 ان کا نام بھی کبھی یاد کرو۔“ ————— ہوائی بھی کبھی بن جایا کرو۔ ————— آبی بھی کبھی بن جایا کرو۔
 ————— ناری بھی کبھی بن جایا کرو۔ ————— ویسے لڑنے مرنے کو تیار۔ ————— کہ چاروں میں
 دیسے جب پوچھو۔ خاکی بندہ ہوں۔ بات کیا ہے حضور! —————

————— سٹھی بھردانے تھے ہمارے پاس ————— ہم نے وہ پانی میں پھینکے۔
 ————— تو گل گئے۔ ————— ہوا میں پھینکے۔ ————— تو اڑ گئے۔ ————— آگ میں پھینکے
 تو جل گئے۔ ————— اور خاک میں ڈالے تو ایک سو ہو کے واپس آ گئے۔
 ہم نے چاروں کو آ زمانا کے دیکھ لیا۔ ————— جو ہماری امانت واپس کرے اسی کا نام لینا۔

باقی سے ہمارا کیا واسطہ — ہم تو خاکی بندے ہیں۔

بہر نوح اللہ نے آدم کو چن لیا۔ اس کے بعد نوح کو چن لیا۔ پھر آل نوح کو چن لیا۔ پھر آل عمران کو چن لیا۔ جس کو جس کام کے لئے چنا۔ بہترین چنا۔

چننے کے لئے عربی میں لفظ آتا ہے "اصطفیٰ"۔ "اصطفیٰ" اللہ نے چن لیا۔

ایک عربی ہی کا لفظ ہے "انتخاب" اس کے معنی بھی یہی ہیں۔ مگر "انتخاب" میں اور "اصطفیٰ" میں فرق یہ ہے کہ "اصطفیٰ" کے معنی میں "چن لینا" اور "انتخاب" کے معنی میں "چھانٹ لینا"۔ "چھانٹ لو"۔ یہ انتخاب ہے "چن لو"۔ "اصطفیٰ" ہے۔ تو جس بندے کا "اصطفیٰ" ہوتا ہے وہ "چنا" ہوا ہوتا ہے۔ اس کے معنی میں چن لینا اور جس کا "انتخاب" ہوتا ہے۔ وہ "چھٹا" ہوا ہوتا ہے۔ اس کے معنی میں "چھانٹ لینا"۔ اگر بہت سے میں سے ایک چنے۔ "یہ اصطفیٰ ہے" اور انگریزی پڑھے لکھے حضرات بتاتے ہیں کہ بہت سے چنیں۔ تو یہ سلیکشن () ہے اور ایک چنے۔ تو یہ سلیکشن () ہے۔

"اصطفیٰ" کے معنی میں (سلیکشن) اور "انتخاب" کے معنی میں (سلیکشن) تو اللہ ایکشن نہیں کرتا۔ وہ سلیکشن کرتا ہے۔ وہ چن لیتا ہے۔ میں کو چن لیا۔ وہ اس کے لئے موزوں ثابت ہوا۔ کیا مجال ہو وہ غلط ہو جائے۔

بہر نوح اللہ نے تمام کائنات کی نبوت و رسالت کے حضور مصطفیٰ کو چن لیا۔ اور یا چنا کہ نام کا جو بنا دیا۔ "مصطفیٰ"۔ "یہ ہمارا چنا ہوا بندہ ہے"۔ یہ کائنات کی رسالت کے لئے ہے۔ "یہ عالمین پر حکومت کرنے کے لئے ہے"۔ اسے چن لیا۔ اس سے بعد اس چنے ہوئے کی پھیلائی ہوئی، لائی ہوئی ہدایت کو کون سنسجال سکتا ہے؟۔ اس کے لئے اللہ نے بندے چن لئے۔

اب آپ سچوں چراں، کریں یا حجت کریں — آپ کی "چونا چونی" کو اللہ
اپنے مقابلے میں نہیں سمجھتا۔ — اُس نے سچ لیا جسے سچ ہی لیا۔
اب آپ خود جھانٹتے ہیں۔ آپ کی مرضی۔ — محمدؐ کے بعد
اب یہ اُس کی ہدایت کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ — محمدؐ کو کچھ دانا میں تو یہ
"چینا ہوا" کہئے "بالکل ٹھیک ہے:۔" — بالکل درست ہے۔ —
بہر نوح یہ بندے بھی اللہ نے سچ لئے۔ —

میرے عمر "م ساعین" دیکھنا — خدا نواز آئے اگر کراچی پوسٹ میں آتی تھی یہ کہہ کے کرتا۔
کر لے کہ "یہ بندہ جرائم پیشہ ہے، اور سارے کراچی والے اکٹھے ہو کر یہ کہیں۔ —
"صاحب غلط ہے — یہ تو بڑا نیک آدمی ہے۔ —"
تو پولیس پوچھے گی "جناب — آپ کب سے واقف ہیں۔ —"
اور آپ جواب دیں۔ —

"جب سے کراچی آیا ہے — ہم اس کے ساتھ ہیں — ایک منٹ کو ساتھ نہیں سمجھو؟
ہم نے — کراچی سٹیشن سے جو ساتھ ہوئے ہیں — کتنے ٹنگ ساتھ ہیں۔ —"
پولیس جواب میں کہے گی

"حضور — اس نے جرم کئے ہیں لاہور میں۔ — اب آپ چُپ ہیں۔ —
لہذا ایسے آدمی جو بیان آنے کے بعد ساتھ ہوئے ہوں — وہ کیا گواہی دیں گے۔ —
گواہی تو اصل وہ دیکھا جو وہیں سے ساتھ ہوا ہو۔ جہاں سے ہم آئے ہیں۔ —

اب ایسا گواہ تلاش کرو۔ جو کہ یہ حضور یہ غلط ہے۔ جہاں جہاں یہ تھا۔ وہیں وہیں میں
تھا۔ — جہاں یہ تھا۔ وہاں میں تھا۔ میں گواہی دیتا ہوں اس کی — میں شہادت دیتا
ہوں اس کی — اسی باتوں کے لئے اللہ نے چُن لیا۔ — تو اللہ چُن لیتا ہے
اور اُس کا چناؤ کبھی غلط ہو سکتا ہی نہیں۔ — بہر نوح اللہ نے رسولؐ کے بعد بارہ انسان

پہننے کے لئے کہ —————

”تم اس کام کے لئے ہو۔ جو کچھ محمدؐ فرمائے ہیں۔ اس پر خود عمل کر کے دنیا کے دماغوں میں بٹھا دو
کہتی ہے۔“

اور دیکھو! ”تم وار و خد بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ کہ زبردستی ہر ایک کو اپنی بات منواؤ۔“
تم انہیں بتا دو کہ ”قی یہ ہے۔“ پھر جمائیں۔ اور ان کا کام جاننے۔ انہیں
بھگاڑا کرنے دو۔ انہیں لڑنے دو۔ آپ ہی دیکھ کر دیکھی ہو کہ کسی عورت پر آجائیں گے۔
تم کیوں خواہ مخواہ کے لئے کسی کے خلاف موافق ہو۔ تم بڑے قیمتی ہو۔ تم کوئی مفتی
نظور نہ رہی ہو۔ جو فتوے دیتے پھرو۔ پہلے آپ منٹ لیں۔ پھر خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔
انہیں اپنی اپنی بات کہنے دو۔ جو کچھ کہہ رہے ہیں۔
اور آل محمدؐ خود آ کے عمل سے سمجھاتے رہے۔

”دیکھو جیسی! یوں کرنا ہے۔ اس طرح کرنا ہے۔ نماز اس طرح پڑھنی ہے۔ روزہ
اس طرح رکھنا ہے۔“ اور ہم لوگ ہوشاگرد تھے ان کے ہم بھی بیٹھے سنتے رہے۔
انہوں نے نماز سکھائی۔ ہم سیکھتے رہے۔ زبان سے تو وہی کہتے رہے جو وہ کہلا رہے تھے۔
دیے کہتے رہے ”نہیں“

دیکھو! روزہ رکھنا ہے۔ روزہ رکھ لیا۔ پھر ہم نے کیا کیا۔ دو تین
منٹ رات سے پہلے۔ کھول لیا۔

اللہ نے کہا! محمدؐ! تمہارا کام تھا صرف بتانا اور سمجھانا۔ مگر یہ شرطی طالب علم ہیں۔ انہوں
نے وقت سے پہلے روزہ کھول دیا ہے۔ انہیں ہمارے پاس بلاؤ۔ اور بیچ پکھڑا کر دو۔
تین منٹ پہلے کھولنے کے جراتے میں رات کو دو گھنٹے کھڑا رہنا پڑا۔ اگر دو تین منٹ
اور صبر کر لیتے تو رات آرام سے سوتے۔

یہ نوع محمدؐ و آل محمدؐ ہمیں سکھاتے رہے۔ اور ہم ان کے سکھائے ہوئے کے مطابق عمل کرتے رہے

اور انہوں نے جس کو جس کام کے لئے چنا۔ وہ اُس کے لئے موزوں نہیں انسان ثابت ہوا۔ جس بندے کو جس کام کے لئے چنا۔ وہ ایسا موزوں ثابت ہوا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ پیدا ہی اسی کام کے لئے ہوا ہے۔ اس کی پیدائش کا مقصد ہی یہی ہے۔

بزرگانِ مہی آرام اور راحت کے وقت اطمینان سے بیٹھ کر کسی کو کسی کام کے لئے چنا اور بات ہے۔ اور انتہائی پریشانی کے عالم میں جبکہ حالت ایسی ہو کہ اپنی اولاد کے انتہائی خوبصورت چہرے سامنے ہوں۔ اور یقین ہو جائے کہ کل یہ چہرے سامنے نہیں ہوں گے پھر گھر کی طرف نظر جائے۔ کہ میری پردہ دار عورتیں جن کی آواز گھر سے باہر آنا مجھے گوارا نہیں۔ ان کا یہ سارا پردہ صرف کل تک ہے۔ کل شام کو یہ پردہ نہیں رہے گا۔ اس پریشانی و اضطراب کے عالم میں کسی کو چنتا۔ اور وہ چناؤ غلط نہ ہو۔ یہ اللہ کے چنے ہوئے کا کام ہے۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ اگر خدا کے کسی اور بندے پر یہ عالم ہوتا۔ پہاڑ ہوتا تو پانی ہو کر بہ جاتا۔ مگر یہ اللہ کے چنے ہوئے کی بات ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود۔ کیا مجال کہ پریشانی پر عمل آجائے۔ کسی بات میں فرق آجائے۔ پوری شان و استقلال کے ساتھ موجود ہیں۔ کوئی پرواہ نہیں کسی بات کی۔ ذرا جھجکنا نہیں۔ گھبرانا نہیں۔ پریشان ہونا نہیں۔ اس عالم میں چناؤ ہو رہا ہے۔ اپنے تو چنے ہی تھے۔ اب حسین نے کہا۔

”آؤ۔ ایک نظر دشمن کی فوج پر بھی ڈال دیکھیں۔ شاید اس ٹڈی ڈل میں کوئی ایسا ہو جو ہمارے قابل ہو۔ شاید ان کسکروں ڈھیر میں کوئی ایسا ہے۔ جیسے ہم چن لیں۔ حسین نے اس مجمعِ عام پر ایک نظر ڈالی۔ اور نظر سے چن لیا۔

”ہے ایک ہمارے قابل ہے۔“ جیسے راستے میں ہم نے آب دی۔ جیسے ہم نے آبدار بنایا تھا۔“

اربابِ ذوق! فقرہ میں کہتا ہوں سمجھ تم لینا۔“

— جس کی تلواروں نے آلِ عمر سے انصاف نہ کیا — اُن کے قلم کیا انصاف کریں گے۔
جو چاہیں لکھ دیں — لفظ کے بدلنے سے مطلب بدل جاتا ہے — جس طرح ہمارے
سامنے یہ لکھ دیا کہ —

”حسینؑ نے (معاذ اللہ) ایک رات کی اُس فوج سے مُہلت مانگی تھی —“

حضرات! مُہلت تو وہ مانگتا ہے جسے کوئی انتظام کرنا ہو — جس نے کہیں چلے جانا
ہو — جس نے کہیں سے لگ منگوانی ہو — جس نے کہیں سے رسد منگوانی ہو — مگر
حسینؑ مُہلت مانگ کر کیا کرتے — جو مرنا ہی ٹھہرا۔ تو کل کیا۔ اور آج کیا —
”حسینؑ نے تو مُہلت نہیں مانگی تھی — یہ غلط لفظ ”مانگی“ کا لکھ دیا تو حسینؑ نے — بلکہ
حسینؑ نے اُس فوج کو ایک رات کی مُہلت اور دی — تاکہ وہ سوچ سچھ لیں۔ وہ کیا کر
رہے ہیں —

حسینؑ نے مُہلت اپنے لئے نہیں مانگی تھی، بلکہ انہیں سوچنے بچھنے کی ایک رات کی اور
مہلت دی تھی۔

”دیکھ لو۔ غور کرو — کیا کر رہے ہو۔ سوچ لو کیا کر رہے ہو —

کل تو تمہیں، مجھے، دونوں کو اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے —

دیکھو — میرے انا کے سامنے جانا ہے تمہیں — میں نہیں ایک رات

کی اور مہلت دیتا ہوں — اور اس مہلت میں میں چوں لوں گا اُسے جو

میرے قابل ہو گا۔“

لہذا مولائے ایک رات کی مہلت دی تھی — حسینؑ نے رات رات میں چوں لیا —

اور چٹا بھی اُسے جو واقعہ کہ بلا کا بظاہر سب سے بڑا ذمہ دار تھا۔

کیوں صاحبانِ بصیرت! واقعہ کہ بلا کا سب سے بڑا ذمہ دار وہی شخص نہیں ہے جو راستے

میں فائدہ اہل بیتؑ کو گھیر کر لے آیا — جو ایک ہزار سواروں کے ساتھ جا کے ایک بے عجز فائدہ

برفوع - رات کو نگاہ انتخاب پر گئی حُر اپنے خیمہ میں کل روٹنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔
 آخر ایک فوج کا سردار ہے۔ اسی تیاری کے دوران کان میں ایک آواز آگئی۔۔۔۔۔ کوئی
 بی بی کہہ رہی تھی۔

”حُر! میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔۔۔۔۔“

حُر گھبرا گیا۔۔۔۔۔ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”یہ کس کی آواز ہے؟۔۔۔۔۔ کس نے کہا ہے؟۔۔۔۔۔ کون ہے؟۔۔۔۔۔“ یہ حُر کے

ضمیر کی آواز تھی۔۔۔۔۔ اُس نے کہا۔

”میں سمجھ گیا۔ اس ساری بات کا میں ذمہ دار ہوں“ صبح ہوئی۔۔۔۔۔ حُر کا رنگ ہی بدلا

ہوا تھا۔۔۔۔۔ انداز ہی اور تھا۔ اپنے ہزار ”رسالہ“ کو لٹے ہوئے امیر شکر کے پاس آئے۔ اور کہا

عمر ابن سعد!۔۔۔۔۔ کیا لازماً ادا ہے حسین سے۔۔۔۔۔“

کیا صلح کی کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔“

کیا یہ جنگ ٹل نہیں سکتی۔۔۔۔۔“

عمر سعد کہتا ہے۔

”حُر اب ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ چونکہ حسین کو تو لایا ہے

لہذا ”ہراول“ بھی تو ہیں۔۔۔۔۔ تیری طرف سے پہلا حملہ ہونا چاہئے۔“

حُر نے کہا۔۔۔۔۔ ”عمر! تمہارے بات سن۔۔۔۔۔ مجھے یہ احتمال نہیں تھا کہ نوبت یہاں تک

پہنچ جائے گی۔۔۔۔۔ حسین کو یہاں تک لانے کا میں ذمہ دار ہوں۔۔۔۔۔

مجھے خود اپنی ذمہ داری کا احساس ہے۔۔۔۔۔ لہذا میں حسین کو

یہاں تک لانے کی معافی مانگنے جا رہا ہوں۔۔۔۔۔ حسین مجھے

معاف کر دے گا۔۔۔۔۔“

عمر سعد کہتا ہے ”بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ انا بڑا سنگین جرم اور معاف

ہو جائے۔؟
 حُر کہا ہے۔

”عمر! میں جن کے پاس جا رہا ہوں۔ اُن کے رحم و کرم سے میں نَفْت
 ہوں۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے سزا دے گا۔“
 یہ کہہ کر اُدھر سے اُدھر چلا۔

ادھر سے اُدھر چلا۔۔۔ اُدھر سے امامؑ نے اپنے ساتھیوں کو فرمایا۔
 ”دیکھتے ہو۔۔۔ اُدھر سے کوئی آ رہا ہے۔“
 امامؑ کے ساتھیوں نے عرض کی۔

”اب مولا! ہم دیکھ رہے ہیں۔۔۔ کوئی تیزی سے گھوڑا دوڑا رہا ہے
 آ رہا ہے۔۔۔ اب امامؑ کے ساتھیوں نے تلواروں کے قبضوں
 پر ہاتھ رکھ دیا۔۔۔ تیر کمان والوں نے کمانوں میں تیر چُن لے۔
 سب امامؑ کے گرد اکٹھے ہو گئے۔۔۔ سبھی اُدھس کی فوج سے
 کوئی سپاہی آ رہا ہے۔۔۔ جھینٹے و زہریلے جو نقتیب
 تھے امامؑ کی چھوٹی سی فوج کے۔۔۔ انہوں نے آواز دی۔
 ”سپاہیو! ہوشیار۔۔۔ اولادِ رسولؐ میں سے کسی کے کوئی زخم
 نہ آنے پائے۔۔۔ گویا تمام سپاہی تیار ہو کر کھڑے ہو گئے
 امامؑ نے حکم دیا۔

”دیکھو بھئی! میرے حکم کے بغیر کسی کا تیر نہ چل جائے۔۔۔ کسی کا
 وار نہ چل جائے۔۔۔ اسے آنے دو۔ جو آ رہا ہے۔“

اب سب کی نظریں اُسی گھوڑا سوار پر لگی ہوئی ہیں۔۔۔ جب وہ، اُدھر قریب آیا۔
 تمام حسینی فوج نے دیکھا۔ کہ وہ، اپنے گھوڑے سے اُترا۔ گھوڑے کی باگ

ڈال دی اپنے کانڈھے پر — اور ایک رومال اپنی جیب سے نکال کر اس سے اپنے دونوں ہاتھ باندھ لئے — اور وہیں سے پکارا۔

”رحمۃ للعالمین کے بیٹے!“

کیا دنیا کا سب سے بڑا گنہگار، تیرے دربار میں آسکتا ہے۔؟

خُڑکا یہ کہتا تھا — کہ امامِ شہداء!

”جاس بھائی! تم میری فوج کو یہاں روکے رکھو — میں خود اسے

لینے جاتا ہوں —“

امام، خُڑکے قریب آگئے — اور خُڑنے کوئی تہتید نہیں اٹھائی۔ کوئی

داسٹے نہیں دیئے — کوئی لمبی چوڑی گفتگو نہیں کی — صرف اتنا کیا — کہ

آتے ہی امام کے گھوڑے کی رکاب پکڑ لی — اور رکاب پر سر رکھ کر کہتا ہے۔

”اَخْطَاْتُ يَا اَبْنَ رَسُولِ اللّٰهِ“

اے رسول کے بیٹے! مجھ سے تصور ہو گیا ہے۔“

بس اتنا فقرہ کہا ہے۔ — ”مجھ سے تصور ہو گیا ہے۔“ اور امام نے جھک

کر اس کی پیشانی ہاتھ میں رکھی — سر اٹھا کے سینے سے لگایا اور فرماتے ہیں۔

”بھائی خُڑ! تم نے معاف کر دیا۔“

سامعین! امام کا بھائی کہتا تھا — کہ جتنے سوار تھے فوجِ حینیٰ کے، سب گھوڑوں

سے نیچے اتر آئے — اور کہنے لگے۔

”ہم سے بے ادبی ہو گئی — امام کا بھائی پیدل کھڑا ہے۔“

بہر نوع، خُڑ کو مرلوانے بھائی کبہ کے معاف کر دیا — اور اسی خُڑ سے سب

سے پیلے جھپٹ بٹگیر ہوئے۔ ”خُڑ! مبارک ہو۔“

غرض ایک ایک سپاہی آکے خُڑ سے بٹگیر ہوا — اور شمس الشہداء اور حضور

قمر بنی ہاشم، سپہ سالار افواجِ طاہرہ حنیئہ، جناب عباسِ غازی نے سر پر علم کا پھر رہے مکمل دیا۔ شہزادہ علی اکبر اور شہزادہ امیر تائب نے بروصہ کے چچا۔ کہہ کے سلام کیا۔
— جنگل میں عید ہو گئی — اور حیب " مبارک و سلام کی آوازیں بیت الشرف میں پہنچی —
— تو جناب زینب نے سن لیں — خیمہ کے دروازے تک آئیں —

اشارے سے عمن و محمد کو بلایا — شہزادے آئے اور عرض کی

" اماں! کیا بات ہے۔؟ "

شہزادہ علی عالم نے پوچھا۔

" بیٹو! آج کیا خوشی ہو رہی ہے۔ کیا عید ہو رہی ہے؟ "

تو شہزادوں نے عرض کی۔

" اماں! — جس آدمی نے راستہ روکا تھا نا — وہ آیا ہے۔ —

اب وہ ہماری طرف آ گیا ہے۔ — مولانا نے اُسے بھائی کہہ

کے معاف کر دیا ہے۔ —

بی بی نے فرمایا۔

" اچھا یہ بات ہے۔ تم دونوں جاؤ۔ ایک طرف کی دامن طرف

کھڑا ہو جائے ایک بائیں طرف کھڑا ہو جائے۔ —

اور دیکھنا! " ناموں کہہ کے بات کرنا۔ اور یہ کہنا کہ۔

" اماں۔ دعائیں دے رہی ہیں۔ "

سامعین!

شہزادے آئے۔ " مولانا کو " ناموں کہہ کے ہاتھ کی دامن کی دامن دیں۔ —

اور مولانا بیٹن کو حیران ہو گیا۔ رنگ دروہ کی طرح سفید ہو گیا۔ تمام بدن کی ہڈیاں

ٹکڑے ٹکڑے ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ابھی دم نکل جائے گا۔ — مولانا نے پوچھا۔ —

”خُڑا! کیا بات ہے —؟“

خُڑا نے عرض کی۔

”فاطمہ کے بیٹے! کیا عرض کروں — حضورؐ نے تو معاف کر دیا — حضورؐ سے

یہی توقع تھی — مگر جب میں نے راستے میں گستاخی کی تھی — تو مجھے پتہ ہے

کہ عملوں سے دوسرے کی آواز آئی تھی — میں جب مطمئن ہو سکے مروں گا۔ جب زینب

کی زبان سے معافی کا لفظ نہ سن لوں — لہذا حضورؐ میرے سفارشی بن جائیں —“

مولانا نے فرمایا۔

”خُڑا! گھبراؤ نہیں — میں تمہیں چمکا ہوں —“

مولانا خُڑا کو لے کر دواؤں تک تشریف لائے — پر وہ اٹھا — امام اندر

خُڑا باہر — بیچ میں پردہ —

امام نے فرمایا۔

”زینب! بہن!

خُڑا ہماری طرف آ گیا ہے — زینب! جواب میں فرماتی ہیں

”حسین! مبارک ہو — ایک ساتھی مل گیا —“

ادھر سے خُڑا نے دواؤں سے آوازی

”مشکل کشا کی بیٹی!“

اپنی اماں کی چادر کے سوتے میں مجھ گنہگار کو معاف کر دو۔ میں نے

بڑا انصاف کیا ہے —“

بس صاحبان!

جو کہنے کی بات تھی وہ یہ ہے کہ اگر زینب! جواب میں فرماویں۔

”ہم نے معاف کر دیا —“ — یہ بھی بڑا اخلاق ہے — جبریلؑ

حُیْن نے بھی معاف کر دیا تھا۔ زینبؓ بھی معاف کر دے گی۔ مگر جو جواب دیا ہے علیؑ کی بیٹی نے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خاندان "بس اللہ کا چنا ہوا خاندان ہے۔ اور کسی کی طاقت نہیں یہ جواب دینے کی۔ حُر نے گڑا گڑا کے معافی مانگی۔

شکل کشا کی بیٹی! مجھے معاف کر دو۔ میں شکل میں پھنس گیا ہوں۔

زینبؓ جواب میں کیا فرماتی ہیں۔

”بھائی حُر! مجھے شرمندہ نہ کرو۔“

گنہگار معافی مانگ رہا ہے۔ اُد کریمؑ شرمندہ ہو رہا ہے۔

”بھائی حُر! مجھے شرمندہ نہ کرو۔ تو ایسے وقت میں آیا ہے میرے دعدے پر۔ کہ تیری کوئی خاطر نہیں کر سکتی۔ تجھے بٹھا نہیں سکتی۔ کچھ کھلا پلا نہیں سکتی۔ حُر! ایک تجھ سے دعدہ کرتی ہوں کہ قیامت کے دن میرے باپ کی حکومت ہوگی۔ آج کے بدلے وہاں تیری دعوت کروں گی۔ اس دن کی دعوت میرے ذمے ادھار رہی۔ اُد سُن حُر!“

دنیا میں اتنا دعدہ تجھ سے کرتی ہوں۔ کہ اگر اس فوج بے جانے مہلت دے دی تو میرا دعدہ ہے کہ حیئنؑ سے پہلے تیری لاش پہ آؤں گی۔ اور یہ سفید بال کھول کے تجھے ”بھائی“ کہہ کے روں گی۔ یہ میرا تجھ سے دعدہ رہا۔

بی بی نے اس طرح معاف کر دیا۔ حُر، موٹا کا چنا ہوا بندہ تھا۔

سامعین! آج کربلا کے زائرین نے دیکھا ہوگا کہ حُرؓ کا روضہ اندس گنج شہیدان میں باقی شہیدوں کے ساتھ ہونا۔ تو کون سمجھتا۔

”ایک معاف کئے ہوئے گنہگار کے ساتھ کیا کرم ہوا۔“

علیہ روضہ بنا ہوا ہے۔ دنیا کا زائر سلام کو جاتا ہے۔ صبح سے شام تک۔

ہر رہی ہیں — میں نے خورہ کی ضریح پکڑ کے کہا تھا۔

ہاں شبید اٹو زندہ ہے — تو مجھے بول کے جواب دے۔ ایک
شاہنشاہ کی فوج کی انفری میں زیادہ لطف آیا یا ایک غریب الغراء، بھولے
پیازے کی مہانی میں زیادہ لطف آیا۔

بہر نوح۔ یہ حسین کا چٹا ہوا بندو تھا۔ کیا مجال جو حسین کے چٹاؤ میں کوئی غلطی ہو جائے
محمد و آل محمد جب کسی کو کسی کام کے لئے چن لیتے ہیں تو وہ یقیناً اس مقصد کے لئے موزوں ثابت
ہوتا ہے۔

خداوند عالم۔ اپنے حبیب کے صدمے میں ہم سب کو یہ توفیق دے کہ قیامت کے
دن حسین فرماویں

”ان بندوں کو میں نے چن لیا ہے؟“

اللہ ہمیں موزوں محمد و آل محمد عطا فرمائے۔

رَبَّنَا اقْبَلْ مَنَّا انْتَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

اصطفا

کھوٹا روپیہ اسے کہتے ہیں — جو

پینک کا بنایا ہوا ہو

کھرا روپیہ اسے کہتے ہیں — جو

سرکار کا بنایا ہوا ہو (خلیب آل محمد)

اسلام — روزه براندام ہو گیا؟

(مصائب شہزادہ امیر قاسم)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

در خداوند عالم عز اسنہ وجل جلالہ کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام

حضرات گرامی تدریاً

ہمارا اس دنیا میں آنے کا مقصد ہی مرتبہ یہی ہے کہ ہم حضرات محمد و آل محمد سے اپنا تعلق قائم رکھیں — اور تعلق ہی ایسا قائم رکھیں کہ ہم اپنے ہر قول و عمل کو ان کے آداب و اتباع بنا دیں۔ کہ ہماری کوئی بات یا کوئی عمل ان کی مرضی سے بغیر نہ ہو۔ اور ہمارے کسی عمل و قول سے ان کی (مذا و نحواً) ناز و نگی کا پہلو نہ نکلنا ہو — ہمیں ایسا عمل کرنا چاہیے جس سے آل محمد خوش رہیں — ہماری خرابی و نجات خود کوئی شے نہیں ہے — ہمیں تو ہر لمحہ ہر وقت ان کی خوشنودی چاہیے۔

ناز ہے۔ روزہ ہے۔ بڑے نیک اعمال جو ہم کرتے ہیں — بے شک ان کی تبت میں یہی ہے کہ ہم ”قربۃ الی اللہ“ کو رہے ہیں — اس کے ذریعہ سے ہم خدا کے قریب بنا چاہتے ہیں — مگر ”قربۃ الی اللہ“ نہیں ہے — اللہ کے قریب بنا نہیں ہے — جب تک ہم محمد و آل محمد کو قریب نہ کر لیں — تبنا زیادہ ہم محمد و آل محمد کو قریب رکھیں گے۔ اتنا ہی زیادہ ہمیں اللہ سے قریب حاصل ہوگا — اور جتنا محمد و آل محمد سے دوری ہوگی۔ اتنا ہی اللہ سے دور ہوگا۔ ورنہ اللہ بذات خود قریب یا بعید ہونے والی شے نہیں ہے — اللہ تو قریب ہے۔ بس قریب ہے

تقریب ہے۔۔۔ یہ نہیں کہ کبھی قریب ہو گیا۔ اور کبھی بعید ہو گیا۔ اللہ تو وہی ہے جہاں ہے۔۔۔ بس آلِ محمد کی خوشنودی ہی خدا کی قربت ہے۔ اور ان ہی کو خوش رکھنا خداوند عالم کے قریب ہونے کی دلیل ہے

محترم سامعین!

آپ نے نماز پڑھی۔ بے شک قریباً الی اللہ پڑھی۔ خداوند عالم کے ”تقرب“ کے لئے پڑھی۔ اور اس تقدس کے ساتھ کہ بدن پاک ہو۔ لباس پاک ہو۔ اور وہ پانی پاک ہو جس سے آپ نے وضو کرنا ہے۔ اتنی طہارت کے ساتھ آپ مصطفیٰ پر آئے کھڑے ہو گئے۔ اور حسبِ فرمانِ رسولؐ کہ ”غزوات کی معراج ہے“ آپ کو وہ معراج ہو گئی۔ اب نازی کی براہِ راست گفتگو ہو رہی ہے۔

اللہ کی حمد بھی کی۔ ثناء بھی کی۔ خدا کی تعریف بھی کی۔ اے رب العالمین، بھی کہا۔ رحمن و رحیم بھی کہا۔ مالکِ یومِ الدین بھی کہا۔ اس سے صراطِ مستقیم پر قائم رہنے کی التجا بھی کی۔ مرغوب و مجال سے بچنے کی بھی دعا کی۔ پھر کوئی اور سورۃ بھی پڑھی۔ اور سرُٹھکا کے اس کی عظمت کا اعتراف بھی کیا۔ پھر سجدے میں سر رکھ کے اس کے اعلیٰ ہونے کا اعتراف بھی کیا۔ اور بیٹھ کر اپنے گناہوں کی بھی معافی مانگی۔ غرض سب کچھ کیا آپ نے نماز میں۔ پھر اس کے بعد واحد اللہ شریکِ ہونے کی شہادت بھی دی۔ محمدؐ کے بعد رسولؐ ہونے کی گواہی بھی دی۔ اور سب کچھ کہنے کے باوجود نماز دیں ہے۔

اب تم اپنی نماز سے کہتے ہو ”قبول ہو جا۔“

تو نماز جو اب میں کہتی ہے ”میں نے قبولِ خاک ہرنا ہے۔“

پھر ہم پوچھتے ہیں ”کیوں۔“ کیا بات ہے؟

تو ہاں کہتی ہے

”مجھے ملکہ قبول، میں ہانا ہے۔ اور اس ملک میں جانے کے لئے مجھے پاسپورٹ چاہیے۔
پاسپورٹ کے بغیر میں کیسے جاؤں گی۔“

نازی بھائیو!

اب اتنی لمبی پٹھی بری ناز! ٹھہری بری ہے بغیر پاسپورٹ کے۔
اب ناز کہتی ہے
”میرا پاسپورٹ کیا ہے؟“

تو ہم نے عرض کی

”آپ خود ہی بتائیں“

اب ناز بولی!

”میرا پاسپورٹ یہ ہے کہ۔۔۔ جب تک ناز میں

رہ دوں نہ آئے۔ میں کیسے جاؤں اس ملک قبول میں۔۔۔“

لہذا اتنی لمبی چرچی ناز! ٹھہری بری ہے کہ جب تک محمد آکرم مسند
پر درود نہ بھیجا جائے۔ میں کیسے جاؤں۔

بہر نزع۔ محمد آکرم محمد پر درود پڑھو تو ناز برونے کی۔۔۔ اب اگر میں درود
یہ پڑھوں ”اللہم صلی علی محمد“۔۔۔ ناز جوئی؟

۔۔۔ نہیں۔

سورم ہوا کہ درود میں محسن ”محمد“ کا نام لینے سے ناز نہیں برتی۔۔۔ اس

سے کہ نعمہ کا نام تو ہم پہلے ہی لے چکے ہیں۔۔۔ اور۔۔۔ جب تک وہ

نام نہ لے۔ جواب تک نہیں یہ۔۔۔ اس وقت تک ناز نہیں برتی۔۔۔ ہم اللہ کا نام بھی

لے چکے ہیں۔ محمد کا نام بھی لے چکے ہیں۔۔۔ یہ صرف لفظ ”آکرم“ ہے جس کی بدست ناز

ہو گئی۔۔۔ اور اگر میں نے ازراہ عقیدت یہ کہہ دیا

”اللہم صلی علی محمد وآلہ آل محمد وآلہ اصحابہؓ“ تو حرکت نہ کرے کہ یہ کتاب ہے
 کہ نماز کے علاوہ اگر یہ درود پڑھ لو تو سبحان اللہ! — مگر نماز میں تم نے در آل محمد
 کے علاوہ کوئی اور نام لے لیا۔ تو نماز غلط ہو جائے گی۔

بس یہاں سے فرق کا پتہ چل جاتا ہے در آل محمد، میں اور در دستان محمد، میں۔۔۔
 کہ آل کا نام نہ لو۔۔۔ تو نماز نہیں برقی۔۔۔ اور صحابہ کا نام لے لو۔۔۔ تو نماز نہیں برقی۔۔۔
 بہر نیت۔ یہ حکم خدا ہے جو ہمیں آل محمد کی طرف لے جاتا ہے کہ ان سے واسطہ رکھو تو نماز!
 نماز ہو جائے گی۔۔۔ ہر عمل بہر عبادت محمد و آل محمد کے ساتھ وابستہ ہے تو سب کچھ
 ہے۔۔۔ اس لئے یہ سب چیزیں تعلق رکھتی ہیں در دین اسلام۔۔۔
 اور ”دین اسلام“ وہ شے ہے۔۔۔ جس سے حضرت محمد و آل محمد نے دنیا کو روشن کر دیا
 ہے۔۔۔ انہوں نے پیچھا دیا دنیا کو کہ اسے کہتے ہیں ”دین اسلام“۔۔۔ یہ شے ہے ”اسلام“۔۔۔
 اس کے معنی ہیں ”اسلام“۔۔۔ یہ سمجھایا ہے ہمیں محمد و آل محمد نے۔۔۔
 سامعین!

آج تو ہماری حالت ہی اور ہے۔۔۔ آج تو آزادی کا دور ہے۔۔۔ ہر شخص دنیا میں آزاد
 ہے۔۔۔ اور اس آزادی کے دور میں ہر شخص یہ کہتا ہے کہ۔۔۔ وہ بس میری بات ہی
 حرفِ آخر ہے۔۔۔

”میں کہتا ہوں،“ میں یہ کہتا ہوں،“ آج ہے میں،“ کا زمانہ

اور اگر کج کی نئی پودے سے پوچھو

”بھئی۔ اسلام کیا ہے۔ دین کیا ہے؟“

”بس۔ وہی جو ہم کہہ رہے ہیں“

آج تو دنیا میں ہر شخص آزاد ہے وہی کہتا ہے جو اپنے ماحول سے متاثر ہو کہ دنیا ہے
 اور ہماری سمجھ تو اتنی ہے کہ میرا ایک عزیز نے والا جو تفریق یونیورسٹیوں

کا ایم لے پاس ہے۔ وہ ایک دن مجھے لے آیا۔ پندرہ تاریخ صبح ماہ شعبان کی۔ شبِ برات کا دن

تھا۔۔۔۔۔ اور میری بچی ضد کر رہی تھی

”ابا! آج پندرہ شعبان ہے“

میں نے کہا

”پھر کیسے“

تو وہ بچی بولی۔

”بابا۔ آج تو شبِ برات ہے“

میں نے کہا

”ہاں بیٹا۔ آج شبِ برات ہے“

بچی بولی

”آج تو بارے اٹم کی پیدائش کا دن ہے“

میں نے کہا

”ہاں بیٹا۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ مگر تم کیا چاہتی ہو؟“

تو بچی نے کہا

”بابا۔ آتش بازی چلائیں گے۔۔۔۔۔“

میں بولا

”نا بیٹا۔۔۔۔۔ موری صاحبان کا فتویٰ ہے کہ آتش بازی نہیں چلانی چاہیے۔۔۔۔۔ آنا

پیرہ بھی حوسے میں لگاؤ۔۔۔۔۔“

مگر وہ بچہ ضد کر رہا تھا۔۔۔۔۔ بھلا معصوم کی ضد کو کون روکے۔۔۔۔۔ آخر اسی تین یونیورسٹیوں

کے پڑھے لکھے نوجوان کو میں نے تین روپے دیئے اور کہا

”دو روپے دو روپے“

تم تین یونیورسٹیوں کے پڑھے لکھے ہو۔ ذرا تین روپے بے جا کے انار تو لے آؤ۔
 بچی ضد کر رہی ہے کہ شب برات ہے۔ اور دیکھنا انار ذرا اچھے ہوں۔
 وہ برغزدار روانہ ہو گئے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے۔
 اور رومال میں بندھے ہوئے انار میرے سپرد کر دیئے۔

وزیری صاحب!

بہترین نقد صاری لایا ہوں۔

سامعین! اب آپ بتائیں۔ لایا انار ہی مگر صبح لایا۔؟

”ہنیں، غلط لایا۔ تین یونیورسٹیوں کا ایم اے پاس۔ تین روپے

کے انار لایا۔ پر اچان سے بناؤ۔ صبح لایا؟

غلط لایا۔ آخر صبر کر کے خاموش ہو گیا۔

”اچھا بھی“

ایم اے ہونا اور بات ہے۔ بات کا سمجھنا اور بات ہے۔

اب جو بچی کو میں نے بلایا

”بے بیٹی۔ انار آگئے۔“

جناب! انار دیکھتے ہی اس کے چہرے پر تو بھجڑیاں چھوٹ گئیں۔ اور وہ بچی

پورے غصے میں بولی ”یہ انار کون لایا ہے۔“

بہر روز، معصوم کی فرمائش اور متقی۔ لانے والے کی سمجھ اور متقی۔ خیر صبر کر لیا۔

تین نے کسی اور کو بھیجا کہ انار لگوائے۔ آج اس دن کے بعد وہی برغزدار

پھر ملنے آگئے۔ اس دن بچی کا طبیعت کچھ خراب تھی۔ ڈاکٹر نے انار بتایا تھا

اور آدمی کوئی تھا نہیں اس وقت میرے پاس۔ آخر میں نے ان کو ہی پیسے دے

دیئے اور کہا

”یٹیا باڈا تکلیف کرو۔ آدھ سیر انار لے آؤ۔“

مگر اس دن کے ڈر سے برٹے اب جو انار لائے تو بہترین آتش باز کے انار لائے

سامعین! لایا انار ہی ہے۔ دونوں مزنیہ انار لایا۔

ایمان سے بنا ڈھیج لایا؟ رتہیں۔ عطل لایا۔

اپنی زبان۔ آسان سا لفظ۔ روزترہ استعمال ہونے والا لفظ۔ اور

وہ بھی پڑھا کھا آدمی۔ عطل بھی نہیں لایا۔ کوئی یہ بھی نہیں

کہہ سکتا کہ عطل لایا۔ انار ہی لایا مگر عطل لایا۔

ایسے عطل کو میج کہہ دینا۔ چاہے وہ ایک ہی ہو۔ چاہے دو لایا ہو یا چھ لایا ہو۔

کچھ بھی ہو۔ میج کہہ دینا ایسے عمل کر۔ یہ بھی عطل ہی بات ہوئی۔ کیوں؟

معی کو نہ سمجھا۔ موقع کو نہ سمجھا۔ وقت کو نہ دیکھا۔ حالات کو نہ دیکھا۔ یہ نہ پتہ چلا

تاریخ کیا ہے۔ یہ نہ پتہ چلا آج موقع وہی کیا ہے۔ اور ایک موقع وہی نہ سمجھنے سے

ایک پڑھا کھا آدمی! میج چیز لکر بھی عطل ہو گیا۔ اور

اتنا غلط کار انسان! اگر قرآن دیکھ میں لے کر یہ کہے کہ

”میں سمجھ گیا۔“ ار سے تو تو انار نہیں سمجھا۔ معلّم تجھے کیا معلوم!

تجھے کیا پتہ کہ یہ بات کب کہی تھی۔ کہاں کہی تھی۔ کس سے کہی تھی۔ کس نے کہی تھی

کس وقت کہی تھی۔ یہ صرف تیری تپاس آرائی ہے

زور دیکھئے صاحب! میں سمجھ گیا۔

”بھئی کیا سمجھا؟“

”قرآن مجید میں لکھا ہے کہ رسول تم جیسا بشر ہے،“ انالشیو مثلکم

”صحیح۔“ ٹھیک ہے۔ لکھا ہے کہ ”یہ تم جیسا بشر ہو۔“ مگر یہ آیت اللہ نے

کب نازل کی تھی۔ کہاں نازل کی تھی۔ اللہ نے کب یہ فقرہ رسول سے کہوایا تھا۔

تباؤ تو یہی ایمان سے — جب ابو جہل سانسے بیٹھے تھے۔ جب کہا تھا رسولؐ نے نہ میں تم جیسا ہوں۔ — جگ بدر میں جو رسولؐ سے ٹڑ رہے تھے۔ اُن کا فردوں سے رسولؐ نے کہا تھا۔ میں تم جیسا ہوں۔ — جگ اُحد میں جو ٹڑ رہے تھے رسولؐ اُن سے کہہ رہے تھے۔ میں تم جیسا ہوں۔

”نہیں جناب! یہ اُن سے نہیں کہا تھا کہ میں تم جیسا ہوں۔“

”پھر کس سے کہا تھا۔ — فرق تو شکلا ہی آخر —“

پھر عام بات تو نہ رہی — سارے مسلمانوں سے وہ کہہ نہیں سکتے۔ چند مسلمان ایسے تھے جو عمر بھر کافر رہے اور آخر دنوں میں مسلمان ہو گئے۔ — پھر کس سے کہا رسولؐ نے کہ میں تم جیسا ہوں۔ — کوئی خاص موقع ہر گانا کہنے کا۔ —

اے حضور والا!

بات مختصر کرنا ہوں۔ — حلقہ محدود بننا جا رہا تھا۔ — اور محدود ہوتے ہوتے جب ایک چادر میں سمٹ کے آگے چار آدمی رسولؐ کے ساتھ۔ — اور جب رسولؐ کو چادر چاند لگے ہوئے تھے۔ —

تو اس وقت اللہ بھی خوش تھا۔ — رسولؐ بھی خوش تھا۔ — چادر میں سب بیٹھے تھے۔ — اپنا ماحول تھا۔ — اپنا گھر تھا۔ — اپنی جگہ تھی۔ — اپنا داماد تھا۔ — اپنی بیٹی تھی۔ — اپنے بیٹے تھے۔ — سب اپنے ہی اپنے تھے۔

اور وہ اپنے، کا لفظ! آتنا پیارا ہوتا ہے کہ خدا جانے۔ — لفظ ”اپنا“

اور لفظ ”پیارا“، خود بخود آ جاتا ہے۔ — جس طرح اپنا گھر۔ —

اپنا کنبہ۔ — اپنا خاندان۔ — اپنا ماحول۔ — اپنا داماد۔ —

اپنی بیٹی۔ — اپنے بیٹے۔ — چادر میں سب بیٹھے تھے۔

اور اتفاق سے امیر المؤمنینؑ نے یہ پوچھ لیا۔

مدیا رسولی اللہ!

ہم جو اس وقت اکٹھے بیٹھے ہیں چادر میں۔ اللہ کے نزدیک اس کی
فصیلت کیا ہے؟

رسولؐ نے فرمایا

”وہ سب اللہ۔۔۔ اس کو اگر کوئی بیان ہی کرے گا۔ تو اس کی تمام حاجتیں پوری
ہو جائیں گی۔“

مخانی نے کہا

”مصور کے صدقے میں بہن بڑی سادت نعیب ہوئی ہے۔“
رسولؐ مسکرا دیئے اور پیار سے جھالی کی پیشانی چوم لی۔ اور فرمایا۔۔۔
”تم میرا شکر یہ شادا کرو۔۔۔ میں بھی تم جیسا ہوں۔“ اور اس وقت
اللہ نے آئے تعبیر بھی نازل کر دی۔

بہر نورا۔۔۔ قرآن سمجھنے سے پہلے۔۔۔ مرقع دیکھئے۔۔۔ محل دیکھئے کہ یہ بات
رسولؐ نے کب کہی تھی۔۔۔ کہاں کہی تھی۔۔۔ کس سے کہی تھی۔۔۔ کس وقت کہی تھی۔۔۔
تب جا کر تمہیں کہیں قرآن کی سمجھ آئے گا۔
اور یاد رکھو بزرگو!

قرآن اللہ کی کتاب ہے۔۔۔ اور آئی مجسّمہ اس کتاب کے محافظ ہیں (حاکم نہیں) وہ اس
کتاب کے محافظ ہیں۔ اور کتاب ان کی محافظ ہے۔ اور مصنف نے اس نزاکت کے ساتھ
اس کتاب کو لکھا ہے۔ کہ عربی زبان ”فتحیہ کی ہے اس کتاب کے لئے۔۔۔ اور عربی گرامر
کی اتنی احتیاط ہے اس اللہ کی کتاب میں کہ جہاں زہر ہے۔ ہی رہے گا۔ جہاں دزیر،
ہی رہے گا۔

کب اللہ کے دزیر، کو کوئی دزیر، کر دے۔۔۔ اور دزیر، کو کوئی دزیر، کر دے۔

تو سارا ایمان زیر و زبر ہو جائے گا۔۔۔ یہ کتاب اسلام کا نظریہ ہے۔ یہ کتاب اسلام کا قول ہے۔۔۔ مگر آل محمد عمل کر کے بتاتے ہیں اس پر۔ کہ اس میں یہ لکھا ہوا ہے۔۔۔ اسے یوں کرنا ہے۔۔۔ اسے اس طرح کرنا ہے۔۔۔ دیکھو نا!

تعلیم کا قاعدہ بھی ہے (لفظ "قاعدہ" یاد رکھنا) کہ معصوم بچہ گیا مدرسے میں پڑھنے۔۔۔ اور سامنے آگئی ایک کتاب۔۔۔ جس کا نام ہے "قاعدہ" (جو کتاب معصوم کو پڑھائی جائے اسے "قاعدہ" ہی کہتے ہیں) اور اس قاعدہ میں معصوم کو پڑھایا گیا جاتا ہے۔۔۔

"الف"۔۔۔ "ب"

نرا "الف"۔۔۔ "ب" ہی نہیں۔۔۔ بلکہ بچے کو دوہن نشین کرانے کے لئے "الف" کے سامنے "الف" سے "آم" "ب" سے "بکری" اور "ش" سے "شیر" نرا پڑھایا ہی نہیں جاتا۔ بلکہ سامنے "آم"۔۔۔ "بکری" اور "شیر" کی تصویر بھی دکھائی جاتی ہے۔۔۔ تاکہ بچہ صرف "ش" سے "شیر" ہی نہ رٹ لے۔ بلکہ وہ شیر کی تصویر بھی دیکھ لے۔۔۔ بہتر ہے۔۔۔ یہ بچوں کو سکھانے کا "قاعدہ"۔۔۔ محض کتاب ہی نہ رٹاؤ۔۔۔ جو پڑھ رہے ہو۔ اس کی تصویر بھی دکھا دو۔۔۔ لہذا خدا تبارک ہے۔۔۔ دیوں کرتے رہو۔۔۔ اور آل محمد اس کی تصویر ہیں۔۔۔ اس کی تعبیر ہیں۔۔۔ بغیر ان کے تعلق کے تہدی پڑھائی ادھر رہ جائے گی۔۔۔ گویا بغیر تعلق آل محمد نہ کتاب پوری ہو سکتی ہے اور نہ کافی ہو سکتی ہے۔۔۔ کتاب ہے "لا دیبے فیہ" اور اس کی تصویر وہی بن سکتا ہے۔ جو ہو "لا عیب فیہ" جس میں کوئی عیب ہی نہ ہو۔

سامعین!

ایک بات بتاؤ۔۔۔ جو سورہ تہیہ کا نوٹ ہوتا ہے اس کے کاغذ کی بازار میں کیا قیمت ہے؟ بعد پڑھنا "دھیانی و بیروہ کے تقریباً"

چار آنے قیمت ہوگی۔ اصل قیمت سے اس کاغذ کی چار آنے۔ اور بازار میں اسی کاغذ کی قیمت ہے ایک ترازو پیہ۔
اب بتاؤ۔ کیوں؟

معلوم ہوا۔ کہ اس سوزو پیہ کے ٹٹ پر یہ ضمانت لکھی ہے یا بتائی گئی ہے کہ یہ کاغذ جو تمہیں دیا جا رہا ہے۔ یہ نرا کاغذ نہیں ہے بلکہ سوزو پیہ کا سزا گرفت کے خزانے میں محفوظ ہے۔ اور یہ اس محفوظ شدہ ہونے کی رسید ہے۔ اور اگر وہ خزانے میں

سوزو پیہ کا سزا نہ ہے تو یہ کاغذ صرف چار آنے کا ہے۔ اگر سوزو پیہ کا سزا محفوظ ہے تو ٹٹ کے پاس تو اس کاغذ کی قیمت سوزو پیہ ہے گو بازار میں کاغذ کی قیمت جب ہی ہوتی ہے۔ جب

اس کا ہم قیمت کہیں محفوظ ہو۔ اسی طرح اللہ کی کتاب کی قیمت جب ہے جب اس کی قیمت کی کوئی شے کہیں محفوظ ہو۔ کہیں غائب ہو۔ اور اگر وہ نہیں ہے تو چھپر کاغذ۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ صاحب!

محفوظ کی کیا ضرورت ہے۔ ہماری کتاب ہے۔ ہم جب چاہیں بازار سے خرید کر لاسکتے ہیں۔ تو ان کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ حضور و لالا! ہماری کتاب بڑا اور بات ہے۔ اور صاحب! کتاب ہرنا اور بات ہے۔

سامعین! یو پی میں ایک چٹت نو لکٹور، ایک بہت بڑا دولت مند شخص گذرا ہے۔ وہ کتابی چھاپتا تھا۔ لاکھوں قرآن مجید چھاپ دیئے اس نے۔ یہاں تک کہ ہماری تمام مسجدوں میں ہندوستان کی، ایران کی اور کابل کی مسجدوں میں کٹور کے چھپے ہوئے قرآن موجود تھے۔ اتفاق سے دانی کابل!

تشریف لائے ہندوستان میں۔۔۔۔۔ آج سے تقریباً پچاس سال پہلے کی بات ہے۔ وہ جب
 لکھنؤ آئے۔ اور شاہی مہمان ٹھہرے۔۔۔۔۔ اور لکھنؤ کے معززین انہیں ملنے گئے۔۔۔۔۔
 تو بڑت۔ نو لکھنؤ بھی گیا۔۔۔۔۔ وہ بھی ایک معتزرو دولت مند آدمی تھا۔۔۔۔۔ اس
 نے جا کر سلام کیا

دالی کابل نے پوچھا

”تم کون ہو؟“

نو لکھنؤ نے جواب دیا

”میں نو لکھنؤ ہوں۔“

”اچھا۔ آپ کیسے آئے۔۔۔۔۔“

”حضور! سلام کر یہاں آیا ہوں۔ میں نے لاکھوں قرآن چھاپے ہیں۔۔۔۔۔“

تو دالی کابل جبران ہو کر پوچھا ہے

”تم ہو نو لکھنؤ؟“

میں تو یہ سمجھا تھا کہ نو لکھنؤ کسی ملک کا نام ہے۔۔۔۔۔“

اب شاہ بہت خوش ہوا۔۔۔۔۔ اور لکھنؤ کو اپنے ساتھ بٹھایا۔۔۔۔۔ اور عورتی دیر

کے بعد شاہ کا ناشتہ آیا۔۔۔۔۔ وہ لکھنؤ میں کا ناشتہ۔۔۔۔۔ جس میں جینے ہوئے گوشت

کے سوا اور کچھ ہتھالی نہیں۔۔۔۔۔ اور نو لکھنؤ بے چارہ برہمن!

دال روٹی کھانے والا۔

اب شاہ نے کہا

”او لکھنؤ! ہمارے ساتھ ناشتہ کرو۔۔۔۔۔“

اب شاہی حکم ہے۔ وہ بے چارہ بڑا جبران۔۔۔۔۔ آخر اس نے نررتے ہوئے کہا

”در حضور! میں تو ہندو ہوں۔“

اب دانی کابیل نے حیران ہو کر پوچھا

”کیا کہتا ہے تم ہندو ہو۔۔۔ تم مسلمان نہیں ہو۔۔۔“

”حضور! نہیں ہوں“

”پھر تم نے قرآن کیوں چھاپا؟“

حضور والا! قرآن چھاپنا اور بات ہے۔ مسلمان ہونا اور بات ہے۔ قرآن چھاپنے

والا ضروری نہیں کہ مسلمان ہو۔ اور کہیں قرآن جمع کر کے چھاپ دینے سے x x x x x اور

بات ہے۔۔۔ یہ کون سا کمال ہے۔۔۔ یہ کام تو نوکلشٹر بھی کر سکتا تھا۔

پھر نزع قرآن چھاپ لینا اور بات ہے۔۔۔ صرف اور صرف محمد وآلہ محمد ہی

ایسے ہیں جو اپنے عمل سے سمجھاتے ہیں۔ اپنے قول سے سمجھاتے ہیں۔ اور

کہیں کہیں ایسا ہوتا ہے کہ یہ کر دیتے ہیں قرآن پھر بتانا ہے وہ یہ کر دیا۔

”یہ ٹھیک ہے۔۔۔ تو قرآن کے ساتھ آلہ محمد کا ایسا ساتھ ہے کہ یہ کبھی چھوٹ

سکتا ہی نہیں۔

میرے معترم سامعین!

یاد رکھو۔۔۔ میرے اس فقرے کو کہ کتاب ہے ”کلا دیب فیہ“ اور

اسے سمجھا ہی سکتا ہے جو ہو ”لا عیب فیہ“۔ اس بے عیب کو بے عیب

انسان ہی سمجھا سکتا ہے۔۔۔ اس معصوم کتاب کو معصوم ہی سمجھا سکتا ہے۔ اور

اسلام میں بذاتِ خود کوئی نقص نہیں۔۔۔ ہماری کچھ بر نقص ہے۔ اور ہماری نا سمجھی سے

جو ہمارا گھڑا ہوا اسلام ہے۔ اس میں نقص آجاتا ہے۔ پھر آکے آلہ محمد اس کا علاج کرتے

ہیں۔ اور اگر وہ نہ آئیں۔ تو پھر ہمارا گھڑا ہوا اسلام دنیا میں راجھ ہو جائے۔

سامعین! ایک بات آپ سے عرض کروں کہ لوزان نوح کے بعد حضرت نوح کے تین

بیٹے زندہ رہے۔ ان کے بڑے فرزند کا نام تھا ”سام“۔ اس سے چھوٹے کا

نام تھا "حام"۔ اور اس سے چھوٹے کا نام تھا "یاث" ان تینوں بیٹوں کی نسل آگے چلی ہے۔ کچھ سآئی نسل ہے۔ کچھ باسآئی نسل ہے اور کچھ یاثی نسل ہے

دنیا میں سب سے پہلے جب نظام حکومت رائج ہوا تو وہ "سام" جو بڑے بیٹے تھے۔ ان کی اولاد نے سب سے پہلے حکومت قائم کر لی تھی۔ اور آہم اور یانتھ کی اولاد کو رعایا کر لیا۔

اب یہ "سام" کی اولاد دُنیا کے مختلف خطوں میں اس لئے حکومت کرتی رہی۔ کہ ہم "سام" کی اولاد ہیں۔ ہم بڑے بیٹے کی اولاد ہیں۔ اور یہ ہمارے چھوٹے بھائی "حام" اولاد "یاث" کی جو اولاد ہے وہ ہمارا رعایا ہے۔

سیکڑوں سال پہلے ہمارا "سام" کی اولاد حکومت کرتی رہی محض اس لئے کہ ہم "سام" کی اولاد ہیں۔ اور دُور سے بھائیوں کی اولاد رعایا محض اس لئے کہ دُور سدا کی اولاد ہیں۔

تو بڑوں کا نظریہ تھا حکومت کرنا۔ اور چھوٹوں کو رعایا رکھنا۔ اور یہ دماغ میں بس گیا، آدمی کے کہ بڑا ہوتا ہی اس لئے ہے کہ وہ حکومت کرے اور چھوٹا ہوتا ہی اس لئے ہے کہ محکوم رہے۔ تو "سام" نے اور اس کی نسل نے ہزاروں برس حکومت کر کے ان کے دماغ میں بٹھا دی یہ بات کہ چھوٹوں کو رعایا بنا چاہیے اور بڑوں کو حاکم ہونا چاہیے۔

آج تک یہ ہر آدمی کے دماغ میں یہ موجود ہے کہ جو حکومت محض اس لئے حکومت کرے۔ ہم بڑے ہیں۔ اس لئے حکومت کریں کہ ہمارے پاس دولت ہے، لہذا حکومت ہے۔ ایسی حکومتیں جو بڑے قابلیت کے محض بڑے ہی پر حکومت کریں۔ ایسی حکومتیں آج دنیا میں "سامراج" کہلاتی ہیں۔

بس یہی بات تھی حضورِ والا!

کہ انسان کی نا سبھی نے "اسلام" کے انتظام کی ذمہ داری شام کے ایک نا اہل شہزادے کے سپرد کر دی۔ وہ شام کے تخت پر بیٹھ گیا۔ اور دُنیا نے اس تخت نشین کے سپرد اسلام کا نظام کر دیا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ "میں جانتا ہوں۔ اسلام

کافلام کیا ہے؟

بس یزید لعین کا یہ اعلان کرنا تھا کہ "اسلام کا امیر میں ہوں۔" — "اسلام کا نظام میرے پاس ہے۔" — "اسلام پر تو جناب عجیب و غریب کیفیت طاری ہو گئی۔" — "اسلام تو لرنہ برا نام ہوا۔" — اس کی تو شکل ہی وہ نرہی۔ — اس کا تو طریقہ ہی وہ نرہا۔ — ایسی بیماری لگی "اسلام" یزید لعین نامی بیماری۔ کہ اسلام تو مرنے کے قریب ہو گیا۔ — اور جب بالکل مرنے کے قریب ہو گیا۔ — تو اسلام ایک ایک سے کہتا ہے۔

"اسلام کے گلہ گویا!"

اسلام کے دعویدارو! مجھے "یزید لعین" نامی بیماری لگ گئی ہے۔ — کوئی ہے جو مجھے بچا لے۔ — مجھے جھوٹی حدیثوں کا زہر پلا دیا گیا ہے۔ — مجھے جھوٹے فتوؤں کا زہر پلا دیا گیا ہے۔ — مجھے آمریت نے تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ — مجھے زبردستی کی حکومت نے برباد کر دیا ہے۔ — اور

— اور مراد مراد یزید لعین تھا۔ — اس نے تختِ حکومت پر بیٹھ کر جو نکتہ سنا ڈالی ہے اپنے نقشہ پر۔ — دیکھا کہ اتنی دُشمن ہمارے زیرِ نگیں ہے۔ — اتنے لوگ ہمیں سلام کرنے والے ہیں۔ — اتنے بڑے بڑے مقتدین اور دفتر دارانِ مذہب! ہمارے چوکاٹوں کے پائے پکڑے ہوئے ہیں۔ — بڑے بڑے محافظانِ دین اپنا ریش مبارک سے ہمارے آستانوں کی حادوب کٹھا کر رہے ہیں۔ — ہر شخص بجا سرکار! بجا سرکار کہہ رہا ہے۔ — پس وہ "دین کا مالک بن کے بیٹھ گیا۔" — اور اس کے دین کے مالک بننے سے "دین اسلام" بیمار ہو گیا۔ — اور بیمار بھی اتنا کہ مرنے کے قریب ہو گیا۔ — اور آواز ہی دے رہا ہے۔ — "مجھے بچاؤ۔"

مگر کسی کو کیا غرض پڑی ہے جو بیمار کو بچاتے۔ — کسی کو کب ضرورت پڑی ہے کہ بیمار

تیار داری کرے۔۔۔۔۔ یہ تو وہی بچا تیں گے ناجر اپنے گھرواے ہوں۔۔۔۔۔
 احسنہ اسلام کی آواز فضا میں گونجنے ہوتی اس کے کان میں پہنچ گئی۔ جن کے گھسہ مکے
 تھی۔۔۔۔۔:

”ہمیں کس نے پکارا ہے؟“

”ہمیں کس نے آواز دی ہے؟“

”یہ کون کہہ رہا ہے ہم نے کون تیار ہیں؟“

”ہن! ذرا بچا تو تو۔۔۔۔۔ ہمیں مدد کے لئے کون پکار رہا ہے؟“

احسنہ بہن بھائی نے پہچان لیا۔۔۔۔۔

”ارے یہ تو اسلام ہے۔۔۔۔۔ کیوں اسلام کیا بات ہے؟“

اسلام نے عرض کی۔۔۔۔۔

”حضور! میں بیمار ہو گیا ہوں۔۔۔۔۔ میں تو مر رہا ہوں۔۔۔۔۔ میں تو

مرنے کو تیار ہوں۔۔۔۔۔“

”حسین!“

مجھے آکے بچاؤ

تمہارا میرا رشتہ ہے حسین!

جس گھر میں تم پیدا ہوئے

۔۔۔۔۔ اسی گھر میں میں پیدا ہوا۔۔۔۔۔ جس گھر میں تم پلے! حسین! اسی گھر میں میں

پلا ہوں۔۔۔۔۔ بس فرق اتنا ہے۔۔۔۔۔

حسین!

میں محمد کے سینے میں پل رہا تھا۔۔۔۔۔ تو محمد کے سینے

میں پل رہا تھا۔۔۔۔۔

محمدؐ کی زبان سے الفاظ نکلتے تھے تو سیدی فذا بنتے تھے اور محمدؐ کی زبان سے دُردو
 نکلتا تھا تو تیری فذا بنتا تھا۔
 — اور حسینؑ !

— بچپی میں ہم سب تو کھیتے تھے

حسینؑ !

— یاد نہیں ! اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔

دیکھنا !

— رسولؐ من ز پڑھو رہے تھے — یہ اسلام تھا یا نہیں — اُدھر

سے حسینؑ آگئے — دونوں بچپی کے ساتھی — حسینؑ کو دیکھتے ہی اسلام نے

سجسے میں آواز دی

، آؤ حسینؑ کھیلو —

حسینؑ آکے کمر پر بیٹھ گئے اور رسولؐ سجدے میں — اسلام بھی ہے اور

حسینؑ بھی ہے -

”یہ بچپی کا کھیل تجھے یاد ہے نا حسینؑ !“ — اور جب تک تیرا دل نہیں بھر گیا

تھا — میں نے سہ نہیں اٹھایا تھا —

اور حسینؑ !

تو کمر پر بیٹھا تھا اور پیچھے نازریوں کی صفیں تھیں - انہیں یہ شک ہو رہا تھا کہ

رسولؐ پر ’وحی‘ آ رہی ہے — آختری بڑی دیر بعد رسولؐ نے سجدے سے سر

اٹھایا —

روایتیں تو کہتی ہیں کہ بہترۃ دفعہ سبحان ربی الاعلیٰ کہا حسینؑ گتے رہے جب

بہترۃ پورے ہو گئے تو اُتر آئے — !

پہنچے گھر۔ ماں کو سلام کیا۔

”اماں! سلام“

”حسین کہاں گئے تھے؟“

”اماں۔ مسجد میں گئے تھے۔“

اب ماں نے پوچھا:

”حسین! نانا کیا کر رہے تھے۔؟“

حسین نے جواب دیا۔

”اماں! نانا من زپڑھ رہے تھے۔“

”پھر تم نے کیا کہا؟“

”اماں! میں مسجد سے میں نانا کی کمر پر بیٹھ گیا تھا۔ اور بڑی

دیر بیٹھا رہا۔ نانا نے صبحان ربی الاصلیٰ“ کہتے رہے۔

جب میں اتر آیا۔ تب نانا نے سر اٹھایا۔“

تو سیدہ نے فرمایا

”بیٹا حسین! نانا نے کو تکلیف ہوئی ہوگی۔“

اب جو بیٹی نے یہ فرمایا تو حسین پورے جوش میں فرماتے ہیں۔

”اماں!“ اسٹی میری بات۔

اگر میرے کمر پر بیٹھنے سے مسجد میں نانا نے محسوس کیا۔

تو اماں! میں تیرے دودھ کی قسم کھا کے کہتا۔ کہ اس مسجد سے کا

بدلہ نہ آتا رہوں تو حسین نام نہ رکھنا۔

اس مسجد کے بدلہ۔ میں آتا رہوں گا اس مسجد کے بدلہ۔ اور

بدلہ اس طرح آتا رہوں گا۔ اماں! نانا نے نورا اٹھایا تھا مسجد سے

چاہے دیر میں اٹھایا تھا _____ مگر

انہی میں ایسا سجدہ کروں گا اس کے بدلے میں کہ سرتو خود کھڑوں

گا سجدے میں _____ مگر خود نہیں اٹھاؤں گا _____ قابل

اٹھا کے لے جائیں گے۔ میں نہیں اٹھاؤں گا _____

آج اسلام کہہ رہا ہے حسین سے _____!

”آ حسین مجھے بچا۔“

حسین نے اسلام کی نبض دیکھی۔ اس کا پسینہ دیکھا۔ چاروں طرف سے اُسے جانچ

کے دیکھا۔ اور حسین کی بعیرت نے اسلام کا ایک سرے کر لیا۔ اس کی

بیاری کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ اُس کا دل دیکھا۔ دماغ دیکھا اور فٹ پایا۔

”مریض کی حالت خراب ہے۔ اسے تو خون دیا جائے گا۔“

ڈاکٹر صاحبان کہتے ہیں۔ کہ خون دینا مریض کا آخری نوحہ ہے

یہ آج کل کے ڈاکٹروں کی ایجا د نہیں۔ یہ حسین نے ایجا د کی تھی

”اسلام تو مریض ہے۔ اسے خون دیا جائے گا۔ مگر سرخون نہیں دے خون

جو مریض کے خون سے مطابقت کرے۔“

سامعین!

اسلام کا خون بھی دیکھو۔ اور جو خون دینے آئے ہیں ان کا خون بھی دیکھو

_____ اگر اسلام کے خون کے ساتھ مطابقت کرتا ہو تو لیب جانتے گا۔ اور

مطابقت نہ کرتا ہو تو انہیں شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا جائے گا۔ دھچخون

لیا جائے گا جو اسلام کے خون کے ساتھ مطابقت کرتا ہو۔ ورنہ ہر خون ہر لیب کو نہیں

دیا جاتا۔ غلط خون سے مریض کو تکلیف پہنچاتی ہے۔ اب اسلام کو وہی خون

ڈیا جائے گا جو اسلام کے خون سے مطابقت کرتا ہو۔

اسلام دینِ معصوم ہے۔ اے درخون دیا جلتے گا جو دینِ معصوم کا خون ہو گا۔
 اور یہی تو تلاش تھی حسینؑ کی۔ اور کیا ہے۔۔۔۔۔ ساتھ تو بہت تھے حسینؑ
 کے۔ مگر ہر منزل پر کہہ رہا تھا۔
 ”چلے جاؤ“

جو ساتھ تھے انہیں کہہ رہا تھا ”چلے جاؤ“۔ اور جو گھر بیٹھے تھے انہیں خط لکھ کر
 بٹا رہا ہے۔۔۔ ”آ جاؤ۔۔۔ یہاں تک رات کو چراغِ گل کر کے کہتا تھا۔۔۔
 ”چلے جاؤ“۔۔۔ میں نے اسلام کو خون پینچا نا ہے۔ اور خون وہی دیا ہے۔
 جو اسلام کے خون سے مطابقت رکھتا ہے۔ تاکہ اسلام زندہ رہے۔ وہ کبھی مرنے
 نہ پائے۔۔۔“

تو ہر وہ شخص! جو خون دینے آیا تھا اسلام کے نام پر۔ اُسے یہ خیال پلایا ہو گیا کہ
 ”اللہ جانے میرا خون اسلام کے خون سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں“
 اسی خیال کے ماتحت جو ان یہ سوچنے لگے
 ”واللہ جانے۔ کل ہماری باری آتے گی یا نہیں“
 بوڑھے اور جوان تو سمجھا رہے تھے۔۔۔ چھوٹے بچے بھی یہ سوچنے لگے۔۔۔
 ”اللہ جانے۔ کل ہمارا خون اسلام کے لئے حسینؑ لیں گے یا نہیں۔۔۔“
 اور حضورؐ والا!

آج آپ کو ایک بچے کی بات سنانا ہوں۔ اُسے نکر ہو گئی کہ میرا خون بھی
 کل کام آتے گا یا نہیں۔؟
 اور بچو! تم نے فوز سے سنا ہے۔۔۔ تمہارے ہم سب شہید کی بات ہے۔۔۔
 کہ اُسے نکر ہو گیا کہ اللہ جانے میرا خون اسلام کے قابل ہے بھی یا نہیں۔
 شبِ عاشورؑ۔۔۔ رات کے دو بجے کا وقت۔۔۔ اور حسینؑ بیٹھے ہیں

مصلے پر — اور راز دنیا نہ ہو رہا ہے عہد و معبود کے درمیان — دُنیل سے بے خبر
 ہیں حسیا — اللہ سے لو لگائی ہوئی ہے — اور اچانک انہیں محسوس ہوا کہ
 قریب کوئی آ کے بیٹھا ہے — آنکھوں کو — دیکھا — اور دیکھتے ہی حسیا
 بڑا بے چین ہو گیا — بچے کو اٹھائے گود میں بٹھایا — کیلجے سے لگایا — اور
 فراتے ہیں -

”بیٹا تم!“

”تم رات گئے کیوں آتے ہو — میں نے کہا تھا اپنی اماں کے پاس رہ کر
 — — — — — مگر تم کیوں آ گئے —“
 حسیا بچے کا سیدھا سو گھکتے ہیں اور روتے ہیں

”بیٹا!“

”تجھ سے بھائی حسن کی خوش بگوار ہی ہے — — — — — اے آج بھائی
 حسن نہ ہوتے —
 حسن بھائی!“

”میں جنگل میں اکیلا رہ گیا ہوں — — — — —“

”مولا نے قاسم کو کیج سے لگایا — بہت ہی پیار کیا — اور پوچھا —
 ”بیٹا!“

”رات کے وقت کیوں آتے ہو؟“

”قبل کیا بتوں — — — — — اماں سے میری کچھ باتیں ہو رہی تھیں — اور باتوں

کے دوران میری ماں یہ کہہ بیٹھیں کہ — — — — —

”ات سم بیٹا!“

”میں سیدانی نہیں ہوں — — — — — میں غیر خاندان کی ہوں — — — — — میرا دودھ

پیلے _____ اللہ جانے

میرے دودھ میں تاثیر ہے بھی یا نہیں _____ اللہ جانے
تیری قربانی قبول ہوگی یا نہیں۔۔۔

اور قبیلہ !

اماں نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ میرے دل میں یہ اشتیاق پیدا ہو گیا کہ جا کے سوڑ
سے پوچھ آؤں

”میرا خون بھی اسلام کی رگوں میں جائے گا۔۔۔ کل کے مرنے والوں میں
میرا نام بھی ہے۔۔۔۔۔؟“

اب جو بچے نے یہ پوچھا۔۔۔ بارہ سال کا بچہ۔۔۔ اور یہ پوچھ رہا ہے کہ
”کل کے مرنے والوں میں میرا نام ہے یا نہیں۔۔۔“

حیئن نے تو آنکھیں چوم لیں۔۔۔ پیشانی چوم لی۔۔۔ سینے سے لگایا۔۔۔ اور
بچہ ہے کہ بار بار پوچھتا ہے کہ
”چچا جان !

بتاؤ نا۔۔۔ کل کے مرنے والوں میں میرا نام ہے یا نہیں۔۔۔“

اب مولانا ”ماں“ نہیں کہتے۔۔۔ پیار کرتے ہیں بار بار
پھر بچہ پوچھتا ہے
”چچا جان !

بتاؤ نا۔۔۔ کل مرنے والوں میں میرا نام ہے؟
اب جو بچے نے ضد کی۔۔۔ تو مولانا نے فرمایا
”بیٹا تاں تم !

تم تو بڑے بڑے۔۔۔ تیرے چھوٹے بھائی اصغر کا نام بھی ہے۔۔۔“

چاہتی ہوں ————— مگر شادی کیسی ہو ————— !
 آج میں اس کی شادیت سے شادی کرنا چاہتی ہوں

بی بی !

تم میرے ساتھ حسین کے پاس چلو — اور میرے سامنے کہو اذکر —
 ”رکھی یہ بھی شہید ہوگا“ تاکہ مجھے بھی اطمینان ہو — اور اس بچے کو بھی

اطمینان ہو —

اے حضور !

”تائیم کی ماں کے یہ نعرے سن کر زینبؓ تو کھراگئی — جہاد کو ساتھ لیا۔

امام کی خدمت میں پہنچی — اور زینبؓ کہنے لگی

”بھابھی جان ! آپ خود بات کر لیں —“

اور اتنی شرمیلی خاتون تھی تائیم کی ماں، حسنؓ کی بیوہ — کہ آج پہلی دفعہ حسینؓ سے

بات کر رہی تھی۔

بر حسینؓ !

امامؓ زاناؓ !

امامؓ نے پوچھا

”کون ! —“

تو تائیم کی ماں بولی

”بومولاً !“

تیسری بیوہ جہادچ ہوں —————

تجھ سے بھیک مانگنے آئی ہوں —

حسینؓ، اگر آج حسنؓ زندہ ہوتے — تو میں نہ آتی — میں چکر پیرہ ہوں۔ اس سے

مجھے خود آنا پڑے گا۔۔۔ میں آج سواہی بن کے حسین! تیرے دروازے پہ آئی ہوں۔۔۔
 اپنی ماں کی چادر کے صدقے میں میری بیوہ جھولی میں خیرات ڈال دو حسین!
 اب مولانا نے فرمایا
 ”در بھلا بھی جان! فرمائیے کیا حکم ہے۔۔۔؟“
 در حسین!

میں تمہاری ادنیٰ کینز ہوں۔۔۔ اپنے بھتیجے کا دل نہ توڑ حسین!
 اسے بتا دے کہ کل شہیدوں میں اس کا نام بھی ہے۔۔۔
 امام نے بچے کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔۔۔ پیار کیا۔۔۔ کھیسے نکایا اور فرمایا۔۔۔
 ”تو تاسم کی ماں!“

ملن رہو۔۔۔ کل تیری قربانی سب سے زیادہ قبول ہوگی۔۔۔
 اور ماں بیٹا دونوں اٹھنا ان سے خیسے میں آگے۔۔۔ اور ماں نے آتے ہی دو رکعت
 نماز شکر یہ کی پڑھی
 ”وہ یا اللہ۔۔۔ تیرا شکر ہے۔۔۔ میری نیک کائنات نیک راہ میں کام آئے گی۔۔۔“
 اور میرے سامعین!

یوم عاشور میدان شہادت گرم ہو گیا۔۔۔ اور تاسم کی ماں اسی طرح مٹتی
 پی بیٹھی ہیں۔۔۔ اور جب دوپہر کا وقت ہوا۔۔۔ تو تاسم خیسے میں آئے اور عرض کیا
 ”در اماں۔۔۔ سلام۔۔۔“
 ماں جواب میں کہتی ہے

”در بیٹا! ابھی زندہ ہو۔۔۔؟ میں تمہاری سمیت دیکھنا چاہتی ہوں میرے نعل
 میں تمہارا لاشہ دیکھنا چاہتی ہوں میرے فرزند!“
 ”در اماں! میں جا رہا ہوں۔۔۔“ میں تو نیرے سلام کے لئے آیا تھا۔۔۔“

تاقاسم نے ماں کو بڑھ کے بڑے ادب سے سلام کیا — اور ماں نے پیار کر کے نصیحت
کیا — اور حسین تاقاسم جانے لگے تو تاقاسم کی ماں نے آواز دی
”تاقاسم بیٹا! ذرا ٹھہرنا —“
تاقاسم واپس آئے — اور بی بی زینب کے پاس سے گئیں
”بی بی!

میرا بچہ جا رہا ہے — میری کمانی کام آرہی ہے — میرا بچہ پر دان
چڑھ رہا ہے — بی بی! اپنے ہاتھ سے اسے دو لہا
نادو —“

زینب نے عامر پہنایا اور کہا
”دو ذرا باہر سے حسین کو بلاؤ —“
حسین بیت اشرف میں تشریف لائے — تو تاقاسم کی ماں نے عرض کی
”د حسین!

میں نے اس کے باپ حسن کا عامر بڑی حفاظت سے رکھا ہے — وہ
آج میرے بچے کے سر پہ باندھ دو حسین!“
اور حسین نے عامر باندھ دیا — اور تاقاسم خیمے سے باہر آئے —
اور حسین نے گود میں لے کے گھوڑے پر سوار کیا — تاقاسم چلے گئے —
اور حسین ایک ریت کے ٹیسے پہ کھڑے ہو گئے — اور
زینب دروازے میں کھڑی ہو گئیں — تاقاسم کی ماں مہلتے پہ بیٹھ گئی — اور
تاقاسم کی نظر فوجوں پر — حسین کی نظر تاقاسم پر — زینب کی نظر حسین
پر — تاقاسم کی ماں کی نظر زینب کے چہرے پر — یہاں سے
وہاں تک نظر کا تار بن گیا — اور دس منٹ گزرے ہوں گے

جو تاسم گھوڑے سے گرے — حسین طیلے سے گرے — زینب
 دروازے میں گری — اور تاسم کی ماں سجدے میں گری
 ”یا اللہ!“

تیرا شکر ہے — تو نے میری قربانی قبول فرمائی — مجھ بیوہ کی
 قربانی منظور فرمائی —
 اور خیمے میں ماتم شروع ہو گیا — سیدانہوں نے سر کے بال کھول دیے
 میرے سامعین!

تاسم اناکم بن بچہ تھا — کہ جب اور شہید گھوڑے سے گرے
 تو انہوں نے حولا کو پکارا — مگر تاسم اناکم بن بچہ تھا کہ جب یہ گھوڑے سے
 گر گیا ہے — تو حسین کو نہیں پکارا — پکارا تو کس کو پکارا
 دراماں! میں گر گیا —

اور فوج میں نقرے بجنے لگے۔ فوج میں طبل بجنے لگے۔ تو یہ طبل بجا اس بات
 کی علامت تھی کہ بچہ شہید ہو گیا ہے — اُدھر طبل بجنے — اُدھر سیدانہوں نے
 سر کے بال کھول کے کہا شروع کر دیا
 ”ماتے تاسم!، ”ماتے شہزادے!“

تو تاسم کی ماں کہتی ہے

”بی بیو! مد نہیں — یہ جو طبل بج رہے ہیں — یہ میرے بیٹے کی موت
 کے نہیں ہیں —“

یہاں خدائے سخن میرا نیس کا ایک شعر ہے — کہ جب طبل جنگ بجنے
 لگے دشمن کی فوج کی طرف سے — تو
 تاسم کی ماں کہتی کیا ہیں

”بی بیو! رو نہیں سے

باجے والوں کی صدا زیرِ تنات آتی ہے

کیسا لاشا! میرے بچے کی برات آتی ہے

”دیکھتی نہیں ————— یہ باجے کی آواز آرہی ہے ————— میرا بچہ دو لبابن گیا ہے —————

یہ میرے بچے کی برات آرہی ہے“

اور زناٹم کی ماں نے اتنا فرمایا مر لڑے

”حسین!

یہ تیری بیوہ جہادج ہوں ————— میرا کوئی زور نہیں ہے ————— آج

حسن زندہ ہوتے۔ تو میرا زور بھی تھا —————

حسین!

اگر ہو سکے تو زناٹم کی لاش لے آؤ ————— میں ایک دفعہ لاش کو گود میں

لیکر رونا چاہتی ہوں —————“

اور امام میدان میں تشریف لے گئے لاش لانے کے لئے

میرے سامعین!

جب امام پہنچے میدان میں ————— تو اتنے میں داہنی طرف کے

گھوڑے بائیں طرف دوڑ گئے ————— اور بائیں طرف کے گھوڑے داہنی طرف دوڑ

گئے ————— اور زندگی میں اس نازک ترین شہزادے کا جسم پامال ہو گیا ————— ان

گھوڑوں کے سوں سے۔ کہ امام زمانؑ زیارت تاجتہ میں فرماتے ہیں۔

میرا سلام ہو اس شہید پر جس کی داہنی طرف کی پسلیاں ٹوٹ کے بائیں طرف آگئی

تھیں ————— اور بائیں طرف کی پسلیاں ٹوٹ کے داہنی طرف آگئی تھیں۔ —————

اور جب حسینؑ پہنچے ————— تو لاش کا یہ عالم تھا۔ کہ امام فرماتے ہیں

ذنا تم بیبا!

مجھے معاف کر دو۔۔۔۔۔ میں ذرا دیر سے پہنچا ہوں۔۔۔۔۔

بیبا!

تیری ماں سے وعدہ کر آیا ہوں تیری لاش لانے کا۔۔۔۔۔ اب لاش

اٹھانے کے قابل نہیں رہی۔۔۔۔۔

بیبا!

میں کیا اٹھاؤں۔۔۔۔۔

یہ کہہ کر مولانے اپنی عیا بھجائی۔۔۔ اور لاش کے کٹے کٹے اٹھا اٹھا کے عبا میں

رکھے۔۔۔ اور عبا کے چاروں کونے پکڑے۔۔۔ اور گٹھڑی کی طرح لے کر گھر میں

آگئے۔۔۔ اور فرمایا

”وزینب!

۔۔۔۔۔ یہاں آؤ۔۔۔۔۔ میں تا تم کی لاش لایا ہوں۔۔۔۔۔ مگر اس کی ماں کو نہ دکھانا۔۔۔۔۔

کہیں ایسا نہ ہو۔۔۔۔۔ وہ مر جائے۔۔۔۔۔“

ماں نے سن لیا۔۔۔۔۔ اور باہر آئیں اپنے خیمہ سے

”حسین!

میں کیوں مر جاؤں گی۔۔۔۔۔ دکھاؤ مجھے۔۔۔۔۔ کیا بات ہے؟“

اب جو حسین نے تا تم کی لاش کے کٹے کٹے کٹے گٹھڑی ساتھ رکھی۔۔۔۔۔ تو بی بی نے پہلے تو

درد رکھتے نماز پڑھی۔۔۔۔۔ پھر فرمایا

”وزینب! کھنڈم ارتقیہ! بی بیو! آؤ۔۔۔۔۔ مجھے مبارک باد دو۔۔۔۔۔ میری

قربانی سب سے زیادہ قبول ہوئی ہے۔۔۔۔۔

دیکھو! میرا ہدیہ سب سے زیادہ قبول ہوا ہے۔۔۔۔۔“

امام نے لاش سے جا کے گنچ شہیدان میں رکھ دی — اور یہ میرے بیان کا آخری
نفر ہے قبلہ!

کہ تاسم کی لاش کو اکبرؑ کی لاش پر رکھ کر حسینؑ دونوں لاشوں کے بیچ میں بیٹھے
ہیں — ایک ہاتھ اکبرؑ کی لاش پر — ایک ہاتھ تاسم کی لاش پر رکھ کر حسینؑ نے
آسمان کی طرف منہ اٹھا کے بلند آواز سے کہا
« وَاعْرَبُوا »

« یا اللہ! میں غریب ہو گیا » —

« نہ میرا اکبرؑ نہ میرا تاسمؑ رہا » —

« رانا اللہ وانا الیہ راجعون »

~ ~ ~

نمانے کے قدموں نے — عرش کو

عرشِ معلیٰ بنا دیا

احسن

تو اے کے سجدوں نے — فرشتے کو

کر بلائے عرشِ معلیٰ بنا دیا

(خطیبِ آلِ محمد)

امن

(شہادت حضورِ قمر بنی ہاشم)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”خداوند عالم عز اسماء و جل جلالہ کی حمد و ثناء کے بعد حضراتِ محمد و آلِ محمد پر درود و سلام“

حضرتِ گرامی !

اللہ کی سب سے پہلی نعمت تزیہ ہے۔ کہ اُس نے میں انسان پیدا کیا ہے — اور
اس کے بعد اُس کا دوسرا کرم ہم پہ یہ ہے۔ کہ انسان بنانے کے بعد اُس نے اپنے فضل و کرم سے
میں مسلمان بنایا — اگر غیر مسلم کے گھر کہیں پیدا ہو جاتے — تو شاید وہی ہرتے — یہ
ادب بات ہے کہ کوئی کوئی ایسا ہوتا ہے دنیا میں، جو اپنی تحقیق و تلاش سے لوٹ پلٹ کے
ادھر آجائے — ورنہ عموماً انسان وہی ہوتا ہے جہاں پیدا ہو — جس طرح
کوئی مسلمان کے گھر پیدا ہو جائے — وہ مسلمان ہے — جو ہندو کے گھر پیدا ہو جائے —
وہ ہندو ہے — جو عیسائی کے گھر پیدا ہو جائے — وہ عیسائی ہے — اور
اکلا فقرہ میں کہ دوں !

جو کسی ”بندے“ کے گھر پیدا ہو جائے — وہ ”بندہ“ ہی ہے — اور

جو اللہ کے گھر پیدا ہو جائے — وہ اللہ — x x x x x x x x

خدا کا یہ فضل ہے کہ اُس نے ہمیں انسان پیدا کیا ہے — اور دوسرا احسان یہ ہے کہ اُس نے ہمیں مسلمان پیدا کیا ہے — اور تیسرا احسان اللہ کا یہ بھی ہے کہ ہم مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ ایمان بھی ہیں اور مومن بھی ہیں — یہ اللہ کی طرف سے بہت بڑی عزت ہے — کہ کسی کو دولتِ ایمان مل جائے — دُعاؤں پر جائے — میرے محترم سامعین!

”مومن“ کا لفظ بنا ہے ”ایمان“ سے — ”مومن“ اُسے کہتے ہیں جس میں ایمان ہو — اور ”ایمان“ کا لفظ بنا ہے ”امن“ سے — جہاں ”امن“ ہے — وہاں ”ایمان“ ہے — اور جہاں ”ایمان“ ہے — وہاں ”مومن“ ہے — جہاں ”ایمان“ ہے — وہاں ”مومن“ نہیں ہے — مومن کبھی ”بدامن“ نہیں ہوتا — چونکہ ایمان کے معنی ہی ”امن“ قائم رکھنا ہے —

خود جیٹو — دوسروں کو جینے دو — بدامنی نہ ہونے پائے — اسے ”مومن“ کہتے ہیں اور جو اپنے قول و عمل و فعل سے، زبان سے بدامنی کرے — تو سمجھیے اُس کے ایمان میں کمی ہے — ایمان کے تو معنی یہی ہیں کہ ”امن“ کو ہر حالت میں قائم رکھا جائے — یہاں تک کہ باوجود طاقت اور قوت کے کوئی شخص محض ”امن“ قائم رکھنے کے لئے اپنے حقوق کو چھوڑ کے بیٹھ جائے — تو ایسا مومن ”مکمل ایمان“ کہلاتا ہے — سامعین!

باوجود اتنی طاقت ہونے کے محض ”امن“ قائم رکھنے کے لئے اپنے حقوق کو چھوڑ دیا — یہ نہیں کہ بوجہ کسی کمزوری کے بیٹھ گیا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ کمزوری کی وجہ سے بیٹھ جائے — مگر طاقت ہوتے ہوئے — قوت ہونے ہوئے — ہزلیت ہوتے ہوئے — پھر بیٹھ جانا — یہ ”مکمل ایمان“ ہی

کر سکتا ہے _____ اور _____

رسولؐ جب کسی ایسے انسان کا نفارت کروا دے کہ وہ یہ کلمہ ایمان ہے

_____ " _____ تو ہم فوراً سمجھ جائیں گے کہ وہ ایمان والا نہ ہو

ہے؟ _____ بس جو اُس سے وابستہ ہے _____ وہ ایمان

والا ہے _____ اور جو اس سے وابستہ نہیں ہے _____ وہ ایمان

مومن بھی ہے! والا نہیں ہے!"

آپ نے یہ حدیث سنی ہوگی _____ میں آپ کو سناتا ہوں۔ قرآن مجید میں آیت

ہے

در کلمہ طیبہ کی مثال شجرہ طیبہ جیسی ہے۔"

اب میں رسول کی حدیث سناتا ہوں

ایک دن حضور رسالتؐ آگے منبر پر تشریف فرما تھے _____ اصحابؓ

کا مجمع سامنے بیٹھا ہوا تھا _____ اور اس آیت کا ذکر

ہو رہا تھا

کلمہ طیبہ کی مثال شجرہ طیبہ جیسی ہے ایسا

شجرہ طیبہ جس کی جڑ زمین میں ہے جس کی

شاخ آسمان میں پہنچی ہوئی ہے۔

تو حضورؐ نے اس کی تفسیر فرماتے ہوئے فرمایا

"مسلمانو!

وہ شجرہ طیبہ جس کی جڑ زمین میں ہے _____ جس کی شاخ آسمان میں ہے _____ وہ

شجرہ طیبہ! میں اور میری اُمّ ہے _____ اور میں اُس شجرہ طیبہ کی جڑ ہوں _____ اور

بیرا جانی علی! اُس شجرہ طیبہ کی شاخ ہے _____ اور آپ حضرات کے متعلق فرمایا ہے _____

”جو ہمارے چاہنے والے ہیں۔ جرم سے محبت کر لیا ہے ہیں۔ جنہیں ہم سے پیار ہے۔۔۔۔۔ وہ اس ”شجرہ طیبہ“ کے ”پتے“ ہیں۔۔۔۔۔“

ماتشاء اللہ۔ چشم بد دور۔۔۔ آپ اُس ”شجرہ طیبہ“ کے پتے ہیں۔۔۔۔۔ مگر شرط یہ ہے کہ محبت ہو۔۔۔ پیار ہو۔۔۔ پھر آپ اُس شجرہ کے پتے ہیں۔۔۔۔۔ (پتے بازی نہ ہو)۔۔۔ اگر واقعا آپ کو محمد و آل محمد سے محبت ہے تو آپ اُس ”شجرہ طیبہ“ کے پتے ہیں۔۔۔۔۔ اور

”پتے کی صفت یہ ہے عزیزو!

برجانے والا۔۔۔ ”پتے“ کو دیکھ کر بنا دے۔۔۔ کہ یہ نخل درخت کا ”پتا“ ہے۔۔۔ درخت بر جو دیا نہ ہو۔۔۔ صرف ”پتے“ کی شکل و صورت ہی دیکھ کر بنا دیا جائے۔ کہ نخل درخت کا ”پتا“ ہے۔۔۔۔۔ اور اگر ہم واقعا ”معصوم“ درخت کے ”پتے“ ہیں۔۔۔ تو ہمیں ایسا ہرنا چاہیے۔ کہ ہمارے اعمال و افعال و اقوال کو دیکھتے ہی دینا بنا دے کہ۔۔۔ ”کسی معصوم درخت کے پتے ہیں۔۔۔ چرنکہ ”پتے“ سے پنز چل جاتا ہے۔ کہ یہ کس درخت کا ”پتا“ ہے

اگر کسی ”درخت کے پتے“ مر جائے ہوئے ہوں۔۔۔ تو پتوں کو مر جھایا ہوا دیکھ کر دنیا سمجھ لیتی ہے۔۔۔۔۔ کہ آج درخت کے پاس ”پانی“ نہیں ہے۔۔۔ اس کی جڑ میں کوئی ”عدم“ ہے۔۔۔ جب ہی تو پتے مر جھائے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ اور اگر ”پتے“ تروتازہ ہوں۔۔۔ تو پتے چلتا ہے کہ ”شجر“ کی جڑ تروتازہ ہے۔۔۔ شاخیں تروتازہ ہیں۔۔۔۔۔ چونکہ پتوں کو دیکھ کر درخت کی حقیقت معلوم ہوتی ہے

بہر نوح۔۔۔ خدا کے فضل و کرم سے آپ لوگ اُس شجرہ طیبہ کے ”پتے“ ہیں۔۔۔ علیٰ سناخ

ہیں اور رسول اُس کی جڑ ہیں۔۔۔۔۔

سامعین!

بناؤ۔ کوئی ایسا دخت دیکھا ہے آپ نے — جس کے پتے، شاخ کی بجائے جڑ،

پر اُگتے ہوں؟ — — — — — ”تہیں“

بیشہ ”پتیا“، جڑ سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر کہاں — — — — —؟

وہ شاخ کے دامن کو مضبوط پکڑے بیٹھا ہے — — — — — پتے کی صلاحیت یہی ہے —

پتے کی شان یہی ہے کہ — — — — — ”وہ جڑ کے فیض سے زندہ ہے — — — — — مگر کب؟“

جب وہ شاخ کے دامن کو پکڑے بیٹھا رہا — — — — — ”دامن“، ”ترما“ ہے ”پتے“ کے ہاتھ میں

”شاخ“ کا — — — — — اور فیض پہنچتا ہے اس کی ”شاخ“ کی معرفت اُسے ”جڑ“ کا — — — — — اور

اگر کوئی گستاخ ”پتیا“ — — — — — یہ ضد کر بیٹھے کہ

”جب جڑ موجود ہے — — — — — تو شاخ سے کیا واسطہ — — — — —“ اور وہ شاخ سے

جدا ہو کے جڑ کے قدموں میں اُسکے بیٹھ جائے ”وہ پتیا“، — — — — — تو دو پاروں تو خیریت

سے گزریں گے — — — — — پھر ”حلیہ“، ”بڑ جائے گا — — — — — شکل خراب ہو جائے گی —

رنگیں چھوٹی جائیں گی — — — — — رنگت زرد ہو جائے گی — — — — — موت طاری ہو جائے گی

زندگی جواب دے جائے گی — — — — — شکل بے شکل ہو جائے گی — — — — — سستی کہ

ایک تڑوللا آئے گا — — — — — اور آگ میں پھینک دے گا

غرض شاخ کا دامن چھوڑنے سے — — — — — ایسا ہوا ہے ”جڑ“

کے تدموں سے — — — — — مگر شاخ کا دامن چھوڑ دیا — — — — — اس لئے جڑ کا

کوئی فیض اُسے نہیں پہنچتا — — — — — ایک

ہوا کا جھونکا آیا — — — — — ادھر اڑا کے لے گیا — — — — — پھر

جھونکا آیا — — — — — ادھر اڑا کے لے گیا — — — — — اور

ہوا کے ہر جھونکے سے اڑنے والے ”پتے“، ”وہی ہوتے ہیں۔

جو شاخ کا دامن چھوڑ دیں — — — — —

اور اگر کہیں شاخ کا دامن مضبوط پکڑے بیٹھے رہتے — — — — — تو

ہوا کے جھونکوں سے جھومتے بھی رہتے — اور اپنا مرکز

بھی نہ چھوڑتا

بہر فرس — خداوند عالم نے ہم پر یہ اپنا فضل فرمایا ہے —

کہ ہمیں اُس در شجرہ طیبہ، کا در پتہ، بنایا ہے — اور ہم

دنیا کو در پتہ، دیتے ہیں — کہ ہم کس شجرہ طیبہ کے در پتے — ہیں۔

ہماری حالت سے اندازہ ہوتا ہے — جس دن ہمارے گھر میں

غم ہو — دنیا سمجھے گی کہ — وہ ان کے شجر میں غم ہے —

اور جس دن ہمارے گھر میں خوشی ہو — دنیا سمجھ لیتی ہے — ”ان کے شجر میں خوشی ہے۔“

میرے محترم سامعین!

خدا نے ایسے مُرشد ہیں عطا فرمائے ہیں — ایسے محبوب ہیں عطا فرمائے

ہیں — ایسے پیارے پیتھوا ہیں عطا فرمائے ہیں — کہ انہیں برحالت میں ہم سے

نہ پادہ ہم سے پیار ہے — وہ سر سے پیر تک ہمارے لئے رحمت ہی رحمت ہیں —

اُن کا وجود — رحمت — اُن کا ہنسا رحمت — اُن کا اُٹھنا رحمت — اُن کا

بیٹنا رحمت — اُن کا جاننا رحمت — اُن کا سونا رحمت — اُن کا بونا رحمت —

اُن کا سکر رحمت — سر سے پیر تک رحمت ہی رحمت — اور ہم تو اس بات پر

نمانا ہیں — کہ ہمارا مُرشد — ہمارا رہبر — ہمارا پیتھوا — ہمارا پیر — ہمارا سائیں!

جس کے ساتھ ہمارا تعلق ہے — وہ خدا کے فضل و کرم سے دنیا میں — ہے۔

ہمارا اُمّ ”ہے“ — ہمارا وارث ”ہے“ اور جب ہمارا اُمّ ”ہے“ —

تو اسی لئے ہم ”امامیہ“ کہلاتے ہیں — اور وہ امامیہ نہیں کہلا سکتا — جس کا امام

تھا — امامیہ وہی ہیں — جن کا ”امّ“ ”ہے“ — لہذا ہم امامیہ ہیں

ہمارا وارث ”ہے“ — ہمارا ”امّ“ ”ہے“ — ہمارا اُن سے تعلق

ہے — ہمارے ہر وقت وابستگی ہے — یہ اور بات ہے کہ وہ
 ”غائب“ ہے — مگر مد ہے —
 یاد رکھو — اہل ایمان !

”ایمان“ کا لفظ ”امن“ سے بنا ہے — اور ”امن“ قائم رہتا ہے اس یقین
 سے — کہ کوئی دارت ہمارا ہے — جو ”غائب“ ہے — چونکہ یقین ”امن“ کو قائم
 رکھتا ہے —

سامعین !

ہیں تزیہ روزمرہ کی مثالیں — مگر ان ہی مثالوں سے
 بات سمجھ میں آتی ہے — جس طرح یہ بچے جو
 بیٹھے ہیں منبر کے قریب آکے — بہت سے انہیں کہتے
 ہیں کہ ”اٹھ جاؤ —“

میں کہتا ہوں — ”رہیں — ایسا نہ کرو —“

کیونکہ بچوں کو منبر کے پاس بیٹھا چاہیے — اور جہاں تک
 میری زبان کا تعلق ہے — وہ میں جان بوجھ کر نہایت سلیس
 زبان میں گفتگو کرتا ہوں — تاکہ ان بچوں کو بھی یاد ہو جائے
 کیوں بچو !

یاد ہر جاتی ہے — ؟

”ہاں —“ — بچے کہہ رہے ہیں ”ہاں —“ چونکہ معصوم کبھی
 غلط بات نہیں کہتا — وہ صحیح کہتا ہے — اور اگر معصوم کی
 کسی بات میں غلطی نظر آئے — تو یہ معصوم کی غلطی نہیں ہوگی —
 بلکہ یہ ہماری سمجھ کی غلطی ہوگی — ورنہ معصوم جو کہتا ہے —

وہ بالکل ٹھیک، کتنا ہے —————
 بہ نزع — نچے اپنے گھروں میں شرارت بھی کرتے ہیں —
 بچوں کو شرارت کرنی چاہیئے — کیونکہ بچپن کے معنی ہی یہی ہیں —
 کہ اس میں شوخی بھی ہو — شرارت بھی ہو — ایسا تو نہیں ہو
 سکتا — کہ بچہ بڑوں کی طرح خاموش بیٹھا رہے — اور
 جو بچہ بچپن میں شرارت نہ کرتا ہو — وہ تو بچپن کی توہین کرتا ہے
 — بچپن کی عزت ہی یہی ہے — کہ اس میں تھوڑی سی شرارت
 بھی ہونی چاہیئے — درخباتت، بڑی چیز ہے — کہ بچہ
 گلیوں میں گالیاں بکنا چھڑنا ہو — اتنا پیٹا ہو — چوری کرتا ہو —
 مدرسے نہ جاتا ہو — یہ خباتت ہے — مگر جہاں تک شوخی
 اور شرارت کا تعلق ہے — وہ نچے میں ہوتی چاہیئے —
 بچپن کا زیور ہے — بچے کا سر ہے — بچے کا جوہر ہے —
 چنانچہ ہر گھر میں چند شرارتی نچے موجود ہوتے ہیں — اور
 مدرسے میں تو محلہ بھر کی شرارت اکٹھی ہوتی ہوگی —

سامعین!

ایک دن میں گیا مدرسے میں — کہ باکے دیکھوں کہ محلے بھر کی
 شرارت کیا رہی ہے — اور
 دیکھتا کیا ہوں قبلہ! کہ کلاس میں بیٹے ہوئے ہیں — ایسے
 بیگی بلی بنے ہوئے — کہ جیسے شرارت کرنا جانتے ہی نہیں —
 وہ جو گھر والی شرارت تھی — وہ بالکل بے ہی تہیں ان میں — ایسے
 آرام سے بیٹھے ہیں — کہ کیا مجال جو کوئی شرارت کر جائے —

— اب میں نے شیٹے میں جو جھانک کے دیکھا — تو ماسٹر صاحب بھی نہیں تھے — پھر بھی بڑے آرام سے بیٹھے ہیں — میں نے آواز دی

بچو!

تمہارا ماسٹر بھی موجود نہیں ہے — تم شرارت کیوں نہیں کرتے — تمہاری تو عادت ہے شرارت کرنا — ”اسن“ سے کیوں بیٹھے ہو — ”؟“
تو بچوں نے کہا

”مولوی صاحب! شرارت نہیں کرنا — ماسٹر صاحب تو نہیں ہیں — مگر ڈریس بے کہ کہیں — ”آئے جائیں —“
حضور! تمام شہزادے بیٹھے، اس ڈر کی وجہ سے — کہ کہیں ماسٹر صاحب آئے جائیں — اور — یہ ڈر دامن کو نام رکھتا ہے۔
اسی ”اسن“ سے ”ایمان“ بنتا ہے

سامعین!

تھوڑی دیر بعد اب چہرہ اس نے آکے کہہ دیا بچوں سے

”بچو!

آج ماسٹر صاحب نہیں آئیں گے —

بس — یہ سنا تھا کہ ”رنہ نہیں آئیں گے“ — اب جو آنے والے کا

ڈر نہ دیا — تو پھر وہ شرارتیں ہوتی ہیں کہ خدا کی پناہ! — کتابیں پھٹ گئیں۔

دو دات قلم ٹوٹ گئے — ایک دوسرے کے گریبان پھٹ گئے — ”دوسرے

کی گرد آسمان پہنچ گئی — اور —

سامعین!

اب کلاس میں جا کر دیکھو — ایک بچہ نہیں پوری جماعت کی جماعت —
پورے اہل جماعت شہریر ہو گئے — ایک نہ آنے والے کی وجہ سے — ڈر نہیں
تھا آنے والے کا — اس لئے کہ اُس نے آنا نہیں تھا —

اور نیچے ابھی شرارت میں مشغول ہی تھے کہ کسی نے کہہ دیا —

دماغ صاحب آگئے ہیں —

تو پھر خباب! تمام نیچے اپنی اپنی جگہ پہ بیٹھ گئے — ایسے

الطینان سے — کہ میں آپ کو کیا بتاؤں

دو کتابیں بھی کھل گئیں — دو کتابت فلم بھی رکھائی —

آنے والے کا ڈر ہے — تو کتاب کی بھی خیریت ہے —

کتاب بھی جیب ہی محفوظ ہے — دو کتابت نہیں بھی ہوش ہے

— صرف ڈر کی وجہ سے

میرے سامعین!

یہ شہ کا بہت بڑا احسان ہے — کہ ہماری آن محسنت دالنگی ہے —

ہمارا اُن سے تعلق ہے — ہمارا ایمان ہے کہ ہمارا وارث ہے — وہ ہمیں دیکھو رہا

ہے — اور اُس کے ڈر سے ہم میں دامن، بھی ہے — اور ایمان بھی ہے —

اس لئے کہ ہمارا وارث موجود ہے — لا وارث کی زندگی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے

— ہمارا وارث موجود ہے — سر در کائنات سے یکرا نام غائب تک ہمارے

وارث موجود ہیں — اور —

حضور والا!

حضور سر در کائنات کو کتابیار تھا اپنے ساتھیوں سے — اپنے چاہنے والوں

سے ————— انا ان چاہنے والوں کو نہیں تھا ————— جتنا حضور سرور کائنات کو اپنے ساتھیوں سے
 پیار تھا ————— چاہے عرب ہو ————— چاہے عجم ہو ————— چاہے کالا ہو ————— چاہے گورا ہو ————— رسول
 کو پیار تھا ————— اور یہ پیار ہی کی بات تھی نا ————— کہ فیصیح اللہی عربوں کے ہوتے ہوئے اذان
 کا کام حضرت بلالؓ کے سپرد تھا ————— جو مد اللہ اکبر، ہمیں کہہ سکتے تھے جو جہنمی ہونے کے
 ————— اور مدنی، کو دس، کہہ کے بولتے تھے ————— مگر بلالؓ اذان کتے تھے مسجد
 کے گھد گھد سے۔

ایک دن لوگوں نے مشورہ کر لیا ————— کہ مدعوں کے ہوتے ہوئے یہ جہنمی اذان کیوں
 دیتا ہے ————— یہ بدلا جائے ————— “ ————— جمع کا وقت تھا ————— عربوں نے حسان ابن ثابت
 اصحابی رسولؐ کے چھوٹے بھائی سے جو بہت خوش امیر تھے ————— انہیں کھڑا کر دیا گلدستہ مسجد
 پر اذان کہنے کے لئے ————— اب جو انہوں نے اذان کہی ————— تو عرب جھوم گئے —————

مد لطف آگیا اذان کا ————— “

اب بلالؓ چپ کھڑے ہیں ————— اذان ہو گئی ————— اور مسلمان اب اس انتظار
 میں ہیں ————— کہ حضورؐ تشریف لائیں ————— تو غماز پڑھیں ————— جیب دیر ہو گئی ————— تو در دولت
 پہ حاضر ہوئے ————— اور عرض کی

دیار رسول اللہ!

تشریف لایئے ————— مسجد میں نماز پڑھانے کے لئے ————— “

تو رسولؐ پوچھتے ہیں

مد آج اذان نہیں ہوئی ————— “

مسلمانوں نے عرض کی

مد قید! آج تو وہ اذان ہوئی ہے کہ لطف آگیا ————— “

رسولؐ نے فرمایا

”ہم نے نہیں سنی۔۔۔۔۔ میں تو آواز نہیں آئی۔۔۔۔۔ کس نے اذان
کہی تھی۔۔۔۔۔“

مسلمانوں نے کہا۔۔۔۔۔ کہ قبلہ نفل شخص نے۔۔۔۔۔
تو رسولؐ فرماتے ہیں
دیکھو؟

میرے بلالؓ کو کیا ہوا تھا۔۔۔۔۔“

”حضورؐ!

ہم نے آج چالا تھا کہ ”سرب“ کی زبان سے اذان ہو۔۔۔۔۔“
حضورؐ نے فرمایا

”ہمیں“ کالے کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جلے گا۔۔۔۔۔ میرے بلالؓ سے اذان
کہلو اور۔۔۔۔۔“

چنانچہ بلالؓ نے اذان کہی۔۔۔۔۔ حضورؐ برآمد ہوئے۔۔۔۔۔ اور اس واقعہ سے
دنیا کو سبق دے دیا۔۔۔۔۔ کہ میں کسی جگہ اگر کسی جنتی کو بھی مقرر کر دوں۔۔۔۔۔
تہیں حق نہیں کہ اُسے ٹہا کے کسی اور کو وہاں لے آؤ۔۔۔۔۔“

بہرِ نوحہ۔۔۔۔۔ رسولؐ یہی چاہتے تھے۔ کہہ ایک سے محبت ہو۔۔۔۔۔ آپس
میں محبت کرو۔۔۔۔۔ ایک دوسرے کے بھائی بن کے رہو۔۔۔۔۔ جو اپنے لئے چاہو۔۔۔۔۔
وہی اپنے بھائی کے لئے چاہو۔۔۔۔۔“

رسولؐ نے اس بات کو سب سے بڑا نساء قرار دیا کہ ایک موسم بھی دوسرے مومن کے پس پشت
اس کی برائی کرے۔۔۔۔۔ غیبت کرے۔۔۔۔۔ اور

اگر کسی میں کوئی گناہ ہے۔۔۔۔۔ وہ اُس کے پس پشت بیان کر دو۔۔۔۔۔ تو یہ ”غیبت“
یہ۔۔۔۔۔ اور اگر گناہ نہیں ہے۔۔۔۔۔ دیے جھوٹ کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔ تو یہ ”بتیان“ ہے

اللہ اس گناہ کو معاف نہیں کرتا ————— لہذا آپ سب بھائی بن کے رہیں —————
 آپس میں محبت کریں ————— اور ایسی محبت پیدا کرنے کے لئے جب رسولؐ جویت دیا
 کہ مدینے تشریف لائے ————— اور مدینے کی مسجد بن گئی ————— تو ایک دن
 رسولؐ نے اپنی مسجد میں یہ انتظام فرمایا ————— کہ تمام مسلمانوں کو اکٹھا کر لیا ————— تمہارا
 صحابہؓ کو حکم دیا

”سب جمع ہو جاؤ۔۔۔۔۔۔“

اور جب وہ جمع ہو گئے ————— تو آپ نے فرمایا

”ہر آج میں چاہتا ہوں کہ تمہارے دل ایک دوسرے سے ملا دیں ————— لہذا آج
 میں تمہارے درمیان میں ”مراعات“ قائم کروں گا ————— ایک دوسرے کو بھائی بنا لیا جائے
 چنانچہ آپ نے منبر پر بیٹھ کے حکم دیا
 ”ظلال صاحب اٹھیں۔“

ایک صاحب اٹھے

پھر فرمایا ————— ”ظلال صاحب اٹھیں۔“

وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے

تو پھر آپ نے فرمایا ————— ”وہ آپ دونوں کو میں نے بھائی بنا دیا ہے۔“

اور وہ ایک دوسرے کو بھائی کہہ کر گلے ملنے لگے تھے ————— اسی طرح تمام مسلمانوں کو
 ————— دو دو کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا ————— کسی انصاری کے ساتھ کسی مہاجر

کو ————— کسی مہاجر کے ساتھ کسی انصاری کو ————— کہیں دو مہاجر دو کو ————— کہیں دو
 انصاریوں کو ————— غرض سب کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا

اس بھائی بنانے میں کافی دیر لگ گئی ————— ہر بھائی اپنے بھائی کے گلے میں ہتھ ڈالے دے

اُسے مبارک باد دے رہا تھا ————— اُسے بل رہا تھا ————— وہ کہہ رہا تھا ہاتھ نہ خلی۔۔۔۔۔۔

وہ کہہ رہا تھا: "انتہی"۔ غرض رسولؐ کی مسجد میں عید ہو رہی تھی (جب ہم عید کو گلے ملے ہیں نا۔۔۔ یہ اُس دن کے گلے ملنے کی یادگار ہے)۔

تو اُس وقت جب مسلمان بھائی بن کر خوش ہو رہے تھے۔۔۔ تو دیکھا دنیا کے ایک شخص پچکے کو تے میں اُداس کھڑا ہے۔۔۔ اور سب مل رہے تھے گلے سے مگر وہ تنہا اُداس کھڑا ہے۔۔۔ اور رسولؐ اپنے منبر پر تشریف فرما ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ بہت اُداس کھڑا ہے۔۔۔ تو فرمایا:

”ادھر آؤ“

جب وہ پہنچا رسولؐ کے سامنے۔۔۔ تو حضورؐ نے پوچھا:

”تم کیوں اُداس ہو۔۔۔ خاموش کیوں کھڑے ہو۔۔۔؟“

”حضور!۔۔۔“

آپؐ نے سب کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا ہے۔۔۔ اور یہ بھائی بن کر کتنے خوش ہو رہے ہیں۔۔۔ مگر آپؐ نے مجھے کس کا بھائی نہیں بنایا۔۔۔ میں کس کے گلے مل کے کہوں کہ۔۔۔ ”تو میرا بھائی ہے۔۔۔“

رسولؐ کا یہ سننا تھا کہ آپؐ منبر کے نیچے کے نیچے پہ تشریف لاتے اور فرمایا:

”علیٰ! ادھر آؤ۔۔۔ ان میں سے کوئی اس قابل نہیں کہ تم اس کے بھائی بنو۔۔۔“

”تو میرا دنیا اور آخرت میں بھائی ہے۔“

”علیٰ!“

میں نے ہم مزاجوں کو بھائی بنایا ہے، جو مزاج سے مزاج ملتا تھا وہ اُس کا بھائی ہے۔۔۔ اور تیرا مزاج کسی سے بنا نہیں۔ دانتے میرے۔۔۔ تو میرا بھائی ہے یا علیٰ! ”انتہی“

یا علیٰ! تو میرا بھائی ہے دنیا اور

آخرت میں —————

سامعین!

ڈاکٹر صاحبان کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جو خون مر لیں کو دیا جاتا ہے۔ تو اس خون کی

تاثیر اس مریض کے مزاج میں آجاتی ہے

مثلاً کسی بڑے غصیاری آدمی کا خون دے دیا گیا مجھے — پنج تو میں گیا — مگر

زندگی بھر غمگین آتا رہے گا — اور کسی حلیم آدمی کا خون آ گیا۔ تو علم آجائے گا —

جیسا خون کسی کو دے دو — اس کی تاثیر وہی دہتی ہے —

تو اب بتائیے —

اس کے خون کا کیا کینا۔ جسے رسولؐ لگے سے لگاکے یہ فرمائیں۔

در علیٰ! تو میرا بھائی ہے اس دنیا اور آخرت میں۔ کیونکہ —

تیرا سارا خون میرا خون ہے —

اور لطف آیا ہو گا حضور والا!

جب رسولؐ نے تھے گو گو د میں لیکر خدا کے گھر سے چلے ہیں —

اور اپنے گھر لاکے گھوڑے میں سار دیا — خاندان بنی ہاشم پوچھتا ہے —

”محمد!“

مبارک ہو — خداوند عالم نے بڑا اچھا بھائی مٹھا کیا ہے — ابی طالب کا

بیٹا ہے — خدا کے گھر پیدا ہے —

”بھئی! خیر مبارک ہو — آپ لوگوں کو بھی مبارک ہو —“

چنانچہ سب خاندان بنی ہاشم رسولؐ کو مبارک دے رہا ہے — اور رسولؐ مسکرا کر

ذخیر مبارک کہہ رہے ہیں۔۔۔۔۔ اتنے میں (حضرت) ابو جہل تشریف لائے (ابو جہل) کی مشہور شخصیت تھی۔ ان کا ذریعہ معاش یہ تھا کہ جب کسی بڑے گھر کا بچہ پیدا ہوتا۔۔۔۔۔ تو وہ جاتے اور جا کے دُعا دیتے۔۔۔۔۔ اور کسی بٹ کے پیر کی بیچے کی مٹی بطور سُرْمہ انیس بچے کی آنکھ میں لگا دیتے۔۔۔۔۔ اور ۵ سے لیکر پانچ روپیہ تک انعام لیکر گھر واپس آجاتے) چنانچہ ابوجل بڑے خوش۔ کہ بہت بڑے گھر میں بیٹا پیدا ہوا ہے۔۔۔۔۔ انعام ہی بہت بڑا ملے گا۔۔۔۔۔ ایک چاندی کی سلائی بنوائی۔۔۔۔۔ چاندی کی سُرْمہ دانی بنوائی۔۔۔۔۔ اور سُرْمہ باریک پیس کے سے گئے۔۔۔۔۔ اور رسولؐ کو جا کے سلام کیا

”مُحَمَّدُ اِسْلَامٌ۔۔۔۔۔“

حضورؐ نے پوچھا

”و ابوجل! کیسے آئے۔۔۔۔۔“

”د حضورؐ!

بچے کی مبارک باد دینے آیا ہوں۔۔۔۔۔ اور اپنا حق لینے آیا ہوں“
اب رسولؐ ہنسی روکے بیٹھے ہیں۔۔۔۔۔ جی چاہتا ہے ہنسنے کو مگر منہ ہی روک کے بیٹھے ہیں اور فرماتے ہیں

”بچہ لیا ہوا ہے گھوڑے میں۔۔۔۔۔ بچہ جانے اور آپ جاہلین۔۔۔۔۔“

ابوجل بچے کے قریب آیا۔۔۔۔۔ چہرے سے کپڑا اٹھایا

”و انشاء اللہ۔۔۔۔۔ بڑا خوبصورت ہے۔۔۔۔۔“

اب رسولؐ ہنسی روکے بیٹھے ہیں۔۔۔۔۔ ابوجل بچے کے اور قریب آیا۔۔۔۔۔ سلائی میں سُرْمہ لگایا۔۔۔۔۔ پھر ذرا اور قریب ہوئے۔۔۔۔۔ یا میں ہاتھ سے بچے کی آنکھ کھولی۔۔۔۔۔ دایم ہاتھ سے ارادہ کیا سُرْمہ لگانے کا۔۔۔۔۔ سلائی آنکھ کے قریب پہنچی ہی تھی۔۔۔۔۔ کہ بچے نے آنکھ کھائی۔۔۔۔۔ اور ایک زور سے جو طمانچہ مارا۔۔۔۔۔

تو ابو جہل ماعب کا منہ پھیر گیا — جہل ادھر رہ گیا — ابو ادھر رہ گیا —
 بے چارہ شرم کے مارے اٹھ کے چلا گیا اور جانتے وقت صرف یہی کہا —
 ”یہ خاندان یاد دو کر ہے —“

بہر زور — خاندان کے لوگ بڑے خوش اور کہتے ہیں

محمد!

”خندانے بڑا بہادر بچہ عطا کیا ہے — ذرا زیارت تو کرو اور اس بچے کی
 — پسو۔ اس کی شکل تو دیکھیں کیا شکل ہے۔“

ان کا بھینکارا کہ ہمیں اس بچے کی شکل دکھاؤ — اور رسول کو یہ ڈر نہ بچے اسی شکل کے
 برستے ہیں جس گھر پیدا ہوتے ہیں (جس طرح باپ، بھائی، ماموں اور چچا وغیرہ کی شکل) —

اب یہ بچہ جو اس گھر میں پیدا ہوا تھا — اُس کے مالک کی کوئی شکل ہی نہیں تھی —
 رسول حیران ہیں کہ اس کی کیا شکل بتاؤں — ادھر لوگ سمجھے کہ بچہ بد صورت ہو گا۔
 جب ہی تو محمد کچھ نہیں بتاتے — ادھر رسول کو یہ شکل آن پڑی تھی کہ کس کی شکل

بتاؤں ————— آخر

گھر کے مالک نے دجی کی

محمد!

ذرا سی بات سے گھبرا گئے — لوگ شکل پوچھتے ہیں اور تم اس کی شکل بتاتے
 ہوئے گھبراتے ہو —“

کہہ دو ان سے کہ

ہم — ”وہ اللہ ہے —“

انہ — ”عین اللہ ہے —“

زبان — ”سن اللہ بت —“

اور ماٹھ — ”ید اللہ“ ہے۔۔۔۔۔“

اور کس کی شکل ہے — ساری اللہ کی شکل ہے —

اب حضور نے اُن سے کہہ دیا کہ چہرہ دروہ اللہ ہے — آنکھ ”میں اللہ“ ہے —

زبان ”لسان اللہ“ ہے — اور ماٹھ ”دید اللہ“ ہے — پھر خیال یہ آیا کہ دعائیں

بند مانگ کے اپنی مدد کے لئے میں نے اسے اللہ سے مانگا تھا — مگر اللہ نے ایک ایک کر کے

پھر واپس لے لیا — میرے پاس کیا بچا —

تو جبر اللہ نے ابھی نہیں کہا تھا نا — وہ جلدی جلدی رسولؐ نے کہہ دیا

”یا علی!“

”دیکھ دمی، لٹھک لٹھی، تیرا خون، میرا خون ہے —“

”تیرا گشت، میرا گشت ہے —“

سامعین!

گشت، خون رسولؐ نے دے دیا — اور

ماٹھ، آنکھ اللہ نے دے دیا — اور

ہم دیکھتے کیا ہیں — کہ علیؑ گوارے میں بیٹے برٹے ہنس رہے ہیں

”یا علی!“

تم کیوں ہنستے ہو —؟

علیؑ فرماتے ہیں

”آج لطف آگیا —“

”قبلاً! کیا لطف آگیا —؟“

”آج ہم بٹ گئے — آج ہم تقسیم ہو گئے — آدمے اللہ کے حصے میں آ گئے —“

آدمے رسولؐ کے حصے میں آ گئے — اب ہمارے پاس تو کچھ رہا نا — جو ہم

سے محبت کرے گا۔ آدھی اللہ سے کرے گا۔ آدھی رسول سے کرے گا۔ اور
جو ہم سے مدد کرتے گا۔ آدھی اللہ سے کرے گا۔ آدھی رسول سے کرے گا۔

سامعین!

آج پھر رسول نے علیؑ کو گلے سے لگایا۔

”علیٰ!

تم میرے بھائی ہو دنیا میں اور آخرت میں۔ میرا رشتہ تم سے قائم رہے
گا۔ تم یہاں بھی میرے بھائی ہو وہاں بھی میرے بھائی ہو۔“
اور اللہ کا یہ فرمان ہے کہ جنیت میں کچھ بھائی ہوں گے۔ وہ
میں سے تختوں پہ بیٹھے ہوں گے۔ اور
ہم بھی دیکھیں گے۔ ایک تخت پہ ایک بھائی ہو گا ایک تخت پہ ایک بھائی ہو گا
بیچ میں ہم کھڑے ہوں گے۔ ادھر دیکھا۔ درود پڑھ لیا۔
ادھر دیکھا سلام کر لیا۔

بہر نوح۔ بھائی کا بڑا عجیب رشتہ ہوتا ہے۔ بازو کی قوت بھائی ہوتا ہے
دل کا سہارا بھائی ہوتا ہے۔ دنیا کی زرینت بھائی ہوتا ہے۔ آنگن کی رونق بھائی ہوتا
ہے۔ اور بھائی کے مرنے سے کھڑوٹی ہے۔ یہ عجیب رشتہ ہے بھائی کا
رسول کہتے ہیں

”یا علیٰ!

تو میرا بھائی ہے۔ تو دنیا میں بھی میرا بھائی ہے۔ تو آخرت میں بھی میرا بھائی
ہے۔ اور ایسا عجیب بھائی کہ دنیا نے ایسا بھائی دیکھا ہی
نہیں۔

اولاد تیری ہوگی۔ نس میری کھلائے گی۔ بیٹے تیرے

جب مرکز رحمن ہوا ہے — اُس جنگ میں علیؑ کی فوج کا علم ان ہی محمد حنفیہؑ کے ہاتھ میں تھا — یہی علم دار تھے — اور وہ جو علیؑ کی دستیں ہیں جنگ کے موقع پر (جوشج البلاغہ میں محفوظ ہیں — اور دوسری کتابوں میں بھی) وہ ان ہی محمد حنفیہؑ کو دستیں ملی تھیں — کہ
 درو محمد! —

یہ علم سنبلو — اور میدان جنگ میں جاؤ —

درو کیجو!

سب سے پھلی صف پہ تمہاری نظر رہے — پہنٹا طرے بائیں
 مگر تمہارے قدم اپنی جگہ سے نہ ہٹنے پائیں — اپنے ہاتھوں کو مضبوط
 جالیٹا — اپنا سر خدا کے سپرد کر دینا — اور حاکم کرنا —
 جاؤ ٹیٹا!

تلاش — خدا تمہارا محافظ ہوگا —

یہ فرما کے علیؑ نے محمد حنفیہؑ کو میدان جنگ میں بھیجا — اُس نے دانقاً
 شہادت کے جوہر دکھائے — اور جب جوہر شہادت دکھا کے واپس آئے — تو
 علیؑ نے شہد کا شربت پلایا — ساتھ میں بٹھایا — جاکے دامن سے ہوا کی —
 جیب تازہ دم برنگے — تو دوبارہ بھیج دیا — پھر خیب تازہ دم برنگے —
 تیسری دفعہ پھر بھیج دیا — جیب تیسری دفعہ بھیج رہے تھے — تازہ دم
 کر کے تو

محمد حنفیہؑ کے ہنر سے نکل گیا

د بابا جان!

جو میرے بڑے بھائی ہیں حسنؑ حسینؑ — اس دفعہ انہیں بھیج دیں —

علیؑ کا یہ سنا تھا کہ فرمایا
”محمد صغیر!“

میں سمجھ گیا ————— تو بانی سے ہچکچا رہا ہے — اس لئے کہ تیری ماں کے

دودھ کا اثر یہی ہے —————

اب جو مولانا نے یہ فقرہ کہا کہ مذتیری ماں کے دودھ کا اثر ہے —————

تو بچے کو نصرت آگئی ————— دد زہہ ”جو بچہ بڑی ہوئی تھی ہاتھ سے اُتے

توڑ دیا اور اب کے جو حملہ کیا تو درجنگ حمل، کا فیصلہ ہی کر دیا —————

بہر نزع۔ ایسا بہادر بیٹا خدانے علیؑ کو عطا فرمایا ————— اُدھر حسن و حسین جیسے

بیٹے ————— رادھر محمد صغیر جیسا بہادر بیٹا علیؑ کے پاس موجود — جس کی بہادری کی

دھاک بیٹھی ہوئی تھی دنیا میں ————— ان بیٹوں کے ہوتے ہوئے —————

ایک دن امیر المومنین نے اپنے بڑے بھائی مسعز بن عقیلؑ کو بلایا ————— عقیلؑ

آئے ————— علیؑ تعلیم کو آٹھے ————— اور عقیلؑ کہتے ہیں

کہ یا علیؑ! تم امام زمانہ ہو ————— تم میری تعظیم نہ کرو —————

مولانا نے فرمایا

در عقیلؑ بھائی!

میں نے بعثت امام نہیں بلایا ————— بلکہ بھائی عقیلؑ سے آپ کو بلایا

ہے ————— آپ بڑے بھائی ہیں ————— اور بڑا بھائی باپ کے برابر ہوتا ہے —————

میں آج آپ سے خاص بات کہنا چاہتا ہوں —————

عقیلؑ نے پرچھا

کہ یا علیؑ! کونسی بات —————؟

مولانا نے فرمایا

”تقیل سبائی!“

میں یہ کہا جاتا ہوں۔ آپ عرب کے تمام خاندانوں سے واقف ہیں
 کسی ایسے خاندان میں میرا عقد کرادیں۔ جو عرب بھر میں بیادری میں مانا ہوا
 خاندان ہو۔ میں ایک بہادر خاندان کی بہادر لڑکی سے عقد کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ
 اُس لڑکی کے بطن سے جو بیٹا پیدا ہو۔ وہ میری شجاعت کا وارث ہو۔“

تقیل نے کہا

”ٹھیک ہے۔ میں رات بھر غور کروں گا۔ کل صبح بتاؤں گا۔“
 اگلے دن صبح تقیل نے شریف لائے۔ اور کہنے لگے
 ”یا علی!“

میں نے وہ خاندان ٹھہر لیا ہے۔ جہاں تمہاری شادی کرانا ہے۔“
 مولانا نے پرچھا

”کون سا خاندان۔“

تو خباب تقیل نے فرمایا

”بنی کلاب۔“

خاندان ہے۔ لوگ اُس خاندان کے آدمیوں کے نام اپنی تلواروں پر کندہ کر لیتے

ہیں۔ علی اُس خاندان میں تمہارا عقد ہو گا۔“

خاندان ”بنی کلاب“۔ خیموں میں رہتا تھا۔ اتفاق سے (بنی کلاب)

دینے سے دس بارہ میل کے فاصلے پر نیچے ڈالے ہوئے تھے۔

آپ نے کہا

”علی! وہ آئے ہوئے ہیں۔ میں ابھی وہاں تمہاری خواستگاری کے لئے

جاتا ہوں۔“

چنانچہ عقیل خود چل کے قبیلہ بنی کلاب کے پاس پہنچے۔ اور قبیلہ کے سردار سے
 ملے۔ جس کا نام تھا خزیمہ۔ قبیلہ کے سردار نے پوچھا

”آپ کون ہیں۔۔۔؟“

جناب عقیل نے جواب دیا

”میں عقیل ہوں۔۔۔“

”دکون عقیل۔۔۔؟“

”ابنِ طالب کا بڑا بیٹا۔۔۔“

اب جو سردار نے یہ سنا کہ ابنِ طالب کا بڑا بیٹا میرے سامنے کھڑا ہے۔۔۔
 تو اس نے عقیل کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا۔ اور کہنے لگا
 ”اے بعضۃ البلد کا بیٹا!

سید العرب کا بیٹا!

امیر القوم کا بیٹا!

ابنِ طالب کا بڑا فرزند! تو یہاں کہاں ٹھہر گیا۔۔۔

ہم خادموں کے گھر جو موجود ہیں۔۔۔“

چنانچہ تمام قبیلہ استقبال کر کے عقیل کو اپنے قبیلے میں لے گیا۔ ایک بہترین نیچے

میں ٹھہرایا۔۔۔ تین دن تک جب فرائض مہمانی ختم ہو گئے۔ تو سردار قبیلہ
 عرض کرتا ہے

”اے امیر العرب کے بیٹے!

آپ نے کیوں زحمت فرمائی۔۔۔ آپ حکم فرمائیں

۔۔۔ ہمارے لئے کیا حکم ہے۔۔۔“

جناب عقیل نے کہتے ہیں

دریختی!

تو ہمارے خاندان کو مانتا ہے ————— ؟

در سبحان اللہ ————— وہ دن برگا۔ جو تیرے خاندان کو نہیں مانتا ————— وہ تو کوئی نابینا

ہی ہوگا ————— جس نے تیرے خاندان کی عظمت نہ دیکھی ہو۔ ————— بنی ماشتم کا خاندان

آفتاب و قناب کی طرح روشن ہے۔ ————— اور ابالی طالب کی اولاد ساری دنیا سے زیادہ

معزز و محترم ہے۔ ————— سفیر و حکم فرماؤ!

در سحرار!

میں چاہتا ہوں۔ کہ میرے خاندان کا درشتہ تیرے خاندان میں برہائے۔

در شیخ پوچھتا ہے

در حضور!

نہ سے بڑھ کے ہماری عزت اور کیا ہوگی ————— آپ حکم فرمائیں

کس کا رشتہ چاہتے ہیں ————— ؟

تو آئیغ نے فرمایا

”میں اپنے چھوٹے بھائی علی کا رشتہ تیرے خاندان میں چاہتا ہوں۔ —————“

بس اُدھر حقیق نے در علی کا نام لیا۔ ————— اور تمہیے کا شیخ مجرم ہٹایا

در قید! کس کا رشتہ ————— ؟

در علی کا —————“

پھر اُس نے پوچھا —————

در حضور! ایک دفعہ پھر کہیں ————— کس کا رشتہ ————— ؟

در علی کا —————“

بار بار پوچھتا ہے وہ ————— مانتا اُگھاتا ہے —————

”خدا یا! کس کا نام آیا ————— ٹکی کارشتہ اور ہارسے گھر — ہا سے

خانان ہیں:“

”حضرت!

میری بچی موجود ہے ————— جب حکم دیں —————“

جناب عقیلؑ نے کہا

”سر دار!

مجھے یہی توقع تھی ————— تم یہی جواب دو گے — جاؤ — ذرا ٹکی سے

دریافت کرو —————“

”دقبلہ — رٹکی سے کیا پوچھنا ہے ————— میں جو رٹکی کا باپ کہہ رہا ہوں —“

تو جناب عقیلؑ نے کہا

”سر دار!

یہ اسلامی قانون ہے ————— رٹکی سے پوچھنا چاہیے ————— پھر رشتہ

طے ہو جائے گا —————“

”بہر فرغ۔ ”خرام“ سردار بنی کلاب — گھر آیا — آکے بیوی سے کہا —————

”دستی بھی ہو ————— قسمت یاد رہ گئی ————— نصیب جاگ گیا —————

بیٹی کارشتہ آیا ہے —————“

چونکہ خرام کی ایک ہی الکوتی رٹکی تھی جس کا نام ناظر تھا — بیوی نے سمجھا ————— کہ

کسی بادشاہ کارشتہ آیا ہوگا ————— آخر بیوی نے پوچھا

”دو بتاؤ تو یہی ————— کس کارشتہ آیا ہے —————“

خرام نے جواب دیا

”پہلے شکر یہ کی دو رکعت نماز پڑھ لو ————— پھر بتاؤں گا —————“

جب اُس موٹے کو پوری عزت سزا کر دیا۔۔۔۔۔ تو کہنے لگا
 ”ہمارے گھر۔۔۔ ہماری رطکی کے لئے۔۔۔ علی کا رشتہ آیا ہے۔۔۔۔۔“
 وہ خاتون کہتی ہے
 ”کیوں تم ایسی باتیں کرتے ہو۔۔۔۔۔ علی کا رشتہ اور ہمارے گھر۔۔۔۔۔
 محمد کا داماد۔۔۔۔۔ اور ہمارا داماد بنے۔۔۔۔۔“
 ہمیں خیال بھی نہیں لگتا کہ ہماری اتنی عزت ہو۔۔۔۔۔“
 خرام بولا!

واقعاً۔۔۔ علی کا رشتہ آیا ہے۔۔۔۔۔“
 تو خاتون نے جواب دیا

”سب سے اشد۔۔۔ پھر دیر کیا ہے۔۔۔۔۔“

”ذرا رطکی سے پوچھنا ہے۔۔۔۔۔“

”کیوں۔۔۔ اُس سے کیا پوچھنا ہے۔۔۔۔۔“

”وہ کہتے ہیں کہ اُس سے پوچھ لو۔۔۔۔۔“

چنانچہ سہیلیاں بھوائی گئیں۔۔۔۔۔ سہیلیوں کے ذریعے پوچھوا یا گیا۔۔۔۔۔ تو
 انہوں نے فرمایا

”میرے رشتے کا اختیار، باپ کو ہے۔۔۔۔۔ مگر رات میں نے
 ایک خواب دیکھا ہے۔۔۔۔۔ وہ میری ماں و با کے بتا دیتا

”میں نے خواب میں دیکھا ہے۔۔۔ کوئی تختہ سنا ہے، جنہوں نے مجھے دلہن
 بنایا ہے۔۔۔۔۔ دلہن بنا کے مجھے پیار کیا ہے۔۔۔۔۔ پیرار کے فرمایا۔۔۔۔۔

”مجھے مبارک ہو۔۔۔۔۔ تو میرے بیٹے کی ماں ہے۔۔۔۔۔“

بہر فرح۔۔۔ سہیلیوں نے آکے کہہ دیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور

چند دن بعد۔ خانم لڈنی ہاشم برات لے کر گیا۔ _____ علی کا عقد
ہوا۔ _____ دناطہ کلابیہ۔ _____ حرم عبدیہ "ہم المین" کہلائیں۔ _____ حضرت

ہو کر علی کے گھر آئیں۔ _____
دروازے پر عمل بٹھائی گئی۔ _____ تمام بنی ہاشم ننگی تلواریں بیٹھے ہوئے تھے کہ
پہرہ دے رہے تھے۔
وگو!

نبردوار۔ _____ کوئی ساری پر سوار ہو کے نہ گزرے۔ _____ کوئی مکان کی چھت
پر نہ چڑھتے پائے۔ _____ علی کا دناٹہ سس "آیا ہے" _____ علی کا
حرم آیا ہے۔ _____

پناتیمہ بیٹی محل سے اُتریں۔ _____ دروازے پر آئیں۔ _____ جو کھٹ کو چوما۔ _____
شکر کا سجدہ کیا۔ _____ دروازے کے اندر قدم رکھا۔ _____ اور وہیں
زمین پر بیٹھ گئی۔ _____

خاب زینب نے آ کے کہا

اماں! اندر آو۔ _____

بی بی کہنے لگی

دناطہ کی بیٹیو!

مجھے اماں نہ کہو۔ _____ میں تمہاری خدمت کے _____

آئی ہوں۔ _____ میں تمہاری خادمہ ہوں۔ _____

حنین آئے

اماں! چلو اندر۔ _____

بی بی نے کہا

”شہزادو! میں تمہاری خدمت کے لئے آئی ہوں۔ تمہارے باورچی خانے میں
کام کرنے کے لئے۔ تمہارے نعلین صاف کرنے کے لئے۔ یہ گھر سیدہ
کا گھر ہے۔ تم سیدہ کی اولاد ہو۔ میں تمہاری کینیزوں کے رہوں گی۔“
بہر نوس۔ بی بی نے عقیدت کی انتہا کر دی۔ اور حنین نے محبت کی
انتہا کر دی۔

مستم سامین!

پورا ایک سال گزرا اس شادی کو۔ تو خداوند عام نے
وہ بیٹا عطا فرمایا۔ جس کی علی کو نانا تھی۔

علی مسجد میں بیٹھے تھے۔ اطلاع دی گئی

”دریا علی! مبارک ہو۔ خدا نے بیٹا عطا فرمایا ہے۔“

علی گھر میں آئے۔ ماں کی گود میں بچہ کو دیکھا۔ دیکھ

کے کہتے ہیں

”ماشاء اللہ۔ وہی ہے جس کی مجھے ننانا تھی۔“

علی، اُم البنین سے کہتے ہیں

”اُم البنین!“

”مبارک ہو۔ تو اس بیٹے کی ماں بن۔“

اُم البنین فرماتی ہیں

”دریا علی! اس نے آنکھ نہیں کھولی۔“

علی جواب میں فرماتے ہیں

”ماں۔ مجھے پتہ ہے۔ یہ آنکھ نہیں کھولے گا۔ آخر

میرا بیٹا ہے نا۔“

پھر مولا فرماتے ہیں

”حسینؑ کو بلاؤ۔“

حسینؑ آگئے۔

”حسینؑ!

ذرا بھائی کو گود میں لینا۔“

اب جو حسینؑ نے ہاتھ پھیلائے۔ تو بچے نے آنکھ بعد میں کھولی۔ ہاتھ

دونوں پہلے پھیلا دیئے۔ غالباً ہاتھ پھیلانے کا مطلب یہ تھا

”حسینؑ!

آنکھ تو کھلتی ہی رہے گی۔ پہلے میرے دونوں ہاتھوں کا نذرانہ

قبول فرما۔

آٹا!

”ہاں، دونوں ہاتھ ابھی سے تیری نذر کرتا ہوں۔“

چنانچہ حسینؑ نے گود میں لے لیا۔ بھائی کا منہ چوکا۔ بچے نے

آنکھیں کھولیں۔ اور سب سے پہلے حسینؑ کا چہرہ دیکھا۔ پھر

علیؑ نے گود میں لے کر ایک کان میں اذان کہی۔ ایک کان میں آمین کہی۔ اور

فرمایا

”مجھے رسولؐ نے وصیت کی تھی کہ اس بچے کا نام ”عباسؑ“ رکھنا۔“

چنانچہ ”عباسؑ“ نام رکھا گیا۔

اب جناب زینبؑ فرماتی ہیں

”اسے میری گود میں دو۔“

”ہاں، میں نے گود میں لے لیا۔ اور کان پر منہ رکھ کے کچھ بات کہی۔ تو

امیر المومنین پر چستے ہیں

”دزینب! کیا بات کہی ہے۔۔۔“

”دربابا جان! اماں کی ایک وصیت تھی۔ وہ سنلا ہے۔۔۔“

مولانا نے پوچھا

”دزینب! کونسی وصیت۔۔۔؟“

بی بی نے فرمایا

”اماں نے وقتِ رحلتِ فسایا تھا۔۔۔ کہ ایک بچہ پیدا ہوگا۔۔۔ جاس اُمس

کا نام ہوگا۔۔۔ جب وہ پیدا ہو۔۔۔ تو گود میں لے کے۔۔۔ اس کے کان

میں یہ کہہ دینا

”اماں سلام کہتی تھی۔۔۔“

میرے مقترم سامعین!

ات متحققر کرنا ہوں۔۔۔

حسینؑ کر لگئے۔۔۔ تو حسینؑ تانے کا انچارج عباسؑ!

حسینؑ فرج کا سپہ سالار عباسؑ!

حسینؑ اگر کہیں خط لکھتے۔۔۔ تو کاتب عباسؑ!

کوئی مشورہ کرتے۔۔۔ تو مذیر عباسؑ!

حسینؑ کے ضیوں کا محافظ عباسؑ!

حسینؑ کے بچوں کو بہلانے والا عباسؑ!

غرض کوئی کام ایسا نہیں تھا۔۔۔ جو اس ایک انسان کے سپرد نہیں تھا۔۔۔ دنیا

کا ہر کام اس انسان کے سپرد تھا۔۔۔ اور۔۔۔

ہے۔۔۔ سامعین! میں اپنے بیان کو مختصر کرنا ہوں۔۔۔ کہ کہ بلا میں نہیں محرم الحرام کی رات

کوزینیب نے عباسؑ کو اپنے خیمے میں بلایا ————— آپ تشریف لکھ گئے —————
 عباسؑ نے عرض کی
 ”بی بی! — کیا حکم ہے —؟“
 ”عباسؑ بجائی!“

کلی کیا ہوگا —————؟“

عباسؑ فسراتے ہیں

”وہ آپ فکر نہ کریں ————— آپ ملکہِ عالم ہیں ————— آپ گھبراہٹ میں نہیں ————— جب
 تک میں زندہ ہوں ————— کسی کی طاقت نہیں جو تیری چادر کا نام بھی لے لے —————“
 اب زینیبؑ کو اطمینان ہو گیا ————— حوصلہ ہو گیا ————— اور تمام خیموں میں جتنی عورتیں
 تھیں۔ سب کو بلایا

”بی بی! ————— میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری چادر کی میں ضمان ہوں —————“
 اے حضور والا! جمع ہو گئی ————— جمع کے بعد دوپہر ہو گئی ————— جب تمام سپاہی
 شہید ہو گئے —————
 قبر میں ہاشمؑ سامنے آئے ————— اور آکے حینؑ سے عرض کرتے ہیں
 ”مولاً!“

میں مرنا چاہتا ہوں ————— مجھے مرنے کی اجازت دو مولاً! —————“
 اور حسینؑ نے دیکھ کے فرمایا

”وہ عباسؑ! تم تو میرے علمدار ہو —————“
 ”مولاً! علمدار ضرور ہوں ————— مگر وہ فرج ہے کہاں جس کا میں علمدار ہوں —————
 تو مجھے اجازت دے مولاً!“

کوثرؑ یہ میرے سپاہی میرا انتظار کر رہے ہیں۔

اور مولاً نے اجازت کے ساتھ ساتھ یہ فرما دیا —————

درجائی! نیسے میں جاؤ ————— بچی کی شک بھی لے جاؤ ————— اور اسے
درپانی سے بھر لو —————

چنانچہ عباس خیسے میں آئے ————— بچی کو بلایا
درشہزادی!

مجھے اپنی شک دو —————

بچی نے اپنے ہاتھ سے چاکے کا ندھے پہ شک رکھ دی ————— اور سیکنڈ
نے تمام خیموں میں بچوں کو خوشخبری سنائی

”بچو! مبارک ہو ————— میرا چاچا تھابن کے جا رہا ہے —————“

بہر نوع ————— عباس نے بہنوئی کو سلام کیا ————— زینب کو سلام کیا ————— اور اپنے
نیسے میں گئے ————— زوجہ سے کہا

درخدا حافظ ————— میں جا رہا ہوں ————— ان بچوں کا خیال رکھنا —————

سامعین! اس موقع پر میرا تیس مرحوم کا ایک شعر سنا دوں ————— کہ حبیب بچوں کی بات

کہی ————— تو زوجہ کہتی ہیں

”درآپ بچوں کا نکر نہ کریں —————“

سہ کچھ غم نہ کریں آپ یہ پروان پڑھیں گے

میں تبر کو جھاڑوں کی یہ قرآن پڑھیں گے

بہر نرس ————— زورہ عباس یہ کہہ رہی تھیں ————— عباس میدان میں چلے گئے —————

تمام سبیاں خیمے کے معن میں کھڑی ہیں ————— اور اپنے ہاتھوں میں خالی کوزے لئے پھٹے درخانے

سے باہر نچے کھڑے ہیں ————— سب کی نگر میں علم پر ہیں

علم گیا میدان میں ————— نہر پر پہنچا

سامعین!

یہاں میں ایک شعر اور سنا دوں ————— کہ حبیب عباس نے پانی

سے شک کو بھرا۔ اور دشمن کی فرج کی طرف

پانی اُچھالنے کا طلب یہ تھا کہ —

پیارے ہوں مگر ساحل دریا پہ کھڑا ہوں

خواہش کا نفاذ تازیہ تھا کہ عباسؑ جب پانی بھر رہے ہیں شک

سامعین !

میں — تو ٹہی لیتے — مگر انہوں نے کیا نہیں —

بلکہ ہاتھوں سے پانی اُچھال کر دشمن کو دکھا رہے ہیں — کہ

ع۔ پیارے ہوں مگر ساحل دریا پہ کھڑا ہوں

المختصر عباسؑ جب واپس لوٹے — اور بچوں نے علم کو واپس آتے دیکھا —

تو سیکھنے نے خوش ہو کے کہا در بچو! وہ میرا سقا آ رہا ہے —

سب کی نظریں علم پر لگی ہوئی ہیں — اور تھوڑی سی دیر میں دیکھا کیا

— کہ علم کبھی داہنی طرف جھکتا ہے — کبھی بائیں طرف جھکتا ہے — اب جو علم

کو ڈنگا تے دیکھا — تو جناب زینبؑ نے آواز دی

در حسین ! — یہ کیا ہو گیا ہے — ؟

اور حسینؑ فرماتے ہیں اور زینبؑ !

دیکھ تو میں بھی راہوں — مگر میری مگر ٹوٹ گئی — مجھ سے

چلا نہیں جاتا — میری مگر ٹوٹ گئی —

مومنین ! تھوڑی دیر میں علم سزگوں ہوا — اور حسینؑ لاشے پر پینے —

گود میں سرایا

ع۔ عباسؑ صحابی : ہوا آگئے —

مد مولا ! آپ نے بڑا کرم فرمایا — میں نے تو آواز نہیں دی تھی —

حضورؐ نے بڑی تکلیف فرمائی — اب اگر حضورؐ مناسب سمجھیں — تو

برنبرو الے امامؑ ازین العابدینؑ تک میرے دو پیغام پہنچا دیں —

مولا نے فرمایا ”عباسؑ صحابی ! کہو — کیا بات ہے ؟“

”مولا! ایک تو یہ ہے کہ جب میری قبر بنائیں — تو قبر پر میرا نام نہ لکھیں — بلکہ
 نام کی بجائے یہ لکھیں — ”دیپاسوں کا ستا جو پیسا مارا گیا —“
 اور جب وطن واپس جائیں — تو میری اماں کو میرا سلام کہیں —
 بس اتنا کہنا میری اماں سے کہ

”دہیں نے تیرے دودھ کی عزت رکھ لی ہے —“

اس کے بعد عباس خاموش ہو گئے — رُوح پر دوازہ ہو گئی — امام
 نے علم اٹھایا — علم میں مشک باندھی — علم لیکر خیمے میں آئے —
 سیدانیوں نے علم کی تعلیم کی — اور حسین نے علم زینب کے سپرد کر دیا —
 در زینب!

یہ علم آ گیا — اب اس کا پنجہ آمار دو — اس کا پکا کھول
 دو — اب مجھے کسی علم کی ضرورت نہیں رہی — مجھے جی بھر کے دیکھ لوں!
 میں جا رہا ہوں —“

اور زینب علم لے کر خیمے کے صحن میں کھڑی ہو گئیں — بلند آواز
 میں سرمایا

بی بیو!

آؤ — میری بات سنو — رات میں نے تم سے وعدہ

کیا تھا — کہ میں تمہارے پردے کی ضمانت ہوں — اب میں
 اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں — میں نے جس بھروسے پہ کہا تھا — وہ
 ختم ہو گیا — میرا بھائی عباس مارا گیا —“

(انا لله وانا اليه راجعون)



مگر دکھ اس بات کا ہے کہ انسان اللہ کی بات تو مانتا نہیں۔ اور اپنی بات صرف آخر سمجھتا ہے۔ اور اسی چیز نے انسان سے مُبت پرستی کروائی تھی۔۔۔۔۔ پھر انسان کی عقل ذرا تیز ہوئی۔ اور مٹی پتھر کے مُبت توڑے آدمی نے۔ مگر ایک ایسا مُبت مسلط رہا ہے انسان کے سر پر کہ نہ وہ پہلے ٹوٹا نہ اب ٹوٹا۔ اور نہ ہی اللہ جانے ٹوٹے گا۔ ایک مُبت ایسا مسلط ہو گیا انسان کے سر پر۔

کہ دنیا میں اگر حق کوئی شے ہے تو وہ طاقت ہے۔ جہاں طاقت ہو۔ بس وہ حق ہے۔ جس کے پاس طاقت ہو وہ حق ہے چاہے کسی طرح ہی وہ طاقت آئی ہو۔ کسی طرح ہی وہ طاقت حاصل ہوئی ہو۔ اگر طاقت ہے۔ قوت اگر کسی میں ہے تو اُس کی بات بھی حق ہے اُس کا قول بھی حق ہے۔ اس کا فعل بھی برحق ہے۔ وہ سب کچھ حق ہے۔ وہ اعلیٰ حضرت بھی ہے۔ وہ غلّ سُبجانی بھی ہے۔ اگر طاقت ہے۔۔۔۔۔ یہاں تک طاقت سے مرعوب ہے دُنیا کی طاقت کے سامنے کوئی کچھ نہیں بولتا۔

ایک دفعہ یہ مناظرہ ہو گیا کہ رسولُ نُوْر نے یا خاک تھے؟ (یہ جھگڑے پہلے تہمتیں ہیں نامولوی صاحبان میں۔ یہ بے کاری کے مشغلے ہیں مولویوں کے۔ کہ چلو اور کچھ نہیں تو یہ مناظرہ ہی کر لیں، تو اس میں نواب بہادر پور کو صدر بنایا۔ تو جو نُوْر ہونے کے متکرتھے انہوں نے خط لکھا نواب بہادر پور کو۔

”حضوْر پُر نُوْر، اعلیٰ حضرت۔ نواب بہادر پور!“

آپ فیصلہ فرمائیں کہ رسولُ نُوْر تھے یا خاک۔۔۔۔۔ تا اب اُن سے کوئی پوچھے کہ بہادر پور کا نواب نُوْر پُر نُوْر۔۔۔۔۔ اور رسولُ بے نُوْر۔۔۔۔۔ اور یہ اس لئے کہ طاقت حق ہے دُنیا میں۔ جو طاقت لے کہہ دیا۔ بالکل ٹھیک ہے۔ جو طاقت کے منہ سے نکل گیا۔

بالکل درست ہے۔۔۔۔۔ اسی لئے انبیاء کی بات لوگ نہیں مانتے تھے۔ کہ لوگوں کے ذہن میں یہ بیٹھا ہوا تھا۔ کہ انبیاء کے پاس طاقت نہیں ہے۔ ان کی بات کون مانے۔ یہ امیر نہیں۔ ان کے پاس دولت نہیں۔ ان کے پاس فوج نہیں۔ ان کے پاس لشکر نہیں۔۔۔۔۔ یہ کمزور سے آدمی ہیں۔۔۔۔۔ ان کمزوروں کی بات جھلا فاقتوروں کے مقابلے میں کون مانے۔۔۔۔۔ اس لئے انبیاء کی بات نہیں مانتے تھے۔۔۔۔۔ مگر اللہ نے یہ عیب دُعا کر کے مٹا دیا ہے یہ منوا کے چھوڑ دوں گا۔ کہ طاقت حق نہیں ہے۔

بکہ حق طاقت ہے۔۔۔

دنیوی و دنیوی فرعون جیسے ہو کہ طاقت حق ہے۔۔۔۔۔ طاقت حق نہیں ہے۔۔۔۔۔ بلکہ

حق طاقت ہے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔

یہ منوانے کے لئے وہ ہمیشہ طاقت کے مقابلے میں کمزور کو لانا تھا۔۔۔۔۔ اور جب طاقت کو شکست ہوتی ہے تو کہتا ہے کہ ہم نہ کہتے تھے کہ حق طاقت ہے۔۔۔۔۔ فرعون کے مقابلے میں ابراہیم کو لے آیا۔ اور جب فرعون کو لٹا گئے تھے۔ اور طاقت کو ہو گئی شکست۔ تو اللہ نے کہا۔ دیکھو طاقت کو شکست ہو گئی حق سے۔۔۔۔۔

دنیائے کہا۔ بالکل نہیں۔ کون کہتا ہے کہ حق طاقت ہے۔۔۔۔۔ حق طاقت ہی حق ہے۔۔۔۔۔ کیسے۔۔۔۔۔

فرعون کے پاس پتھر بلانے کی طاقت نہیں تھی۔ ابراہیم کے پاس پتھر بنانے کی طاقت تھی۔ ان کی طاقت نے شکست دی۔ حق نے کوئی شکست نہیں دی۔۔۔۔۔ یہ وہی منہ۔۔۔۔۔ اور اسی کو فرعون کے مقابلے میں لے آئے۔ فرعون کے پاس طاقت۔۔۔۔۔ اسی کو فرعون۔۔۔۔۔ جب فرعون ڈوب گیا۔ غرق ہو گیا۔

زیرا اللہ ہے اُس کے ڈوبنے کا۔ جب یہ ڈوب رہا تھا تا امراد۔ تو موسیٰ کو بڑی آوازیں

تم چاہو تو انگلی کے اشارے سے چاند کو توڑ دو۔ سورج کو پٹ سکتے ہو۔ دن کو رات اور رات کو دن بنا سکتے ہو۔ تمام کائنات کی پلک بھینکنے میں سیر کر سکتے ہو۔ کسنگر اور سپتروں سے کلمہ پڑھوا سکتے ہو۔ مگر

ان کے سامنے طاقت کا مظاہرہ نہ کرنا۔ اگر طاقت کے ذریعے سے انہیں منوایا۔ تو وہی طاقت سچی رہے گی۔ وہ سچی طاقت نہیں مائیں گے۔ لہذا ان کے سامنے تم "طاقت" بن کے رہو۔

اور انہوں نے کیا کیا۔ کہ ہمارے رسول کے سامنے یہ پیش کر دیا۔ قبیلہ! آپ ہمارے بتوں کو بڑا بھلا نہ کریں۔ ہم آپ کو بادشاہ بنا دیتے ہیں۔ آپ ہمارے بادشاہ ہوں گے۔ ہم آپ کی رعایا ہوں گے۔ اس لئے ہمارے بتوں کو بڑا کہنا چھوڑ دیں۔

رسول نے کہا "نہ" میں بادشاہ نہیں بنتا۔ میں جو کہیہ رہا ہوں۔ یہی کہتا رہوں گا۔ دمنیر پہ بیٹھ کے غلط بات کہنا بہت بُری بات ہے اگر میں اُس زمانے میں موجود ہوتا تو الگ لے جا کے رسول کو مشورہ دیتا۔" قبلہ ایسے مواقع روز روز نہیں ملتے۔ بہترین موقع ہے۔ یہ خود تمہیں بادشاہ بنا رہے ہیں۔ بادشاہ بننے کے بعد بادشاہی طاقت سے جو چاہتا منوا دینا کیوں خواہ مخواہ کو تکلیف اٹھاتے ہو۔ مگر

رسول نے کہا۔ کہو اس بند کرد۔ طاقت سے منوانا میرا مقصد نہیں ہے۔ بادشاہ ہونا اور بات ہے۔ دین منوانا اور بات ہے۔ دین سے بادشاہت کا کیا واسطہ۔

بادشاہت اور چیز ہے۔ دین منوانا اور چیز ہے۔

جب دین کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ تو ہم بادشاہت کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ دیکھو! آج میں ٹھکرا رہا ہوں۔ کبھی میرا بیٹا سن ٹھکرا دے گا۔ ہم

بادشاہت کو کیا جانتے ہیں۔۔۔۔۔“

دین طاقت سے نہیں، نا طاقتی سے ہے۔۔۔۔۔ اور نا طاقتی، بھی اتنی کوکھر سے
 گئے بھی تو رات کو چھپ کر۔۔۔۔۔ چند عربوں نے کھر گھیر لیا۔ اور رات کو کھر سے چھپ
 کر گئے۔ اور تین دن تک غار میں چھپے رہے۔۔۔۔۔ اتنی نا طاقتی کا اظہار۔۔۔۔۔
 دینے جا کے بس گئے۔ اور وہاں حملوں پہ حملے ہونے لگے۔ مقابلوں پہ مقابلے ہونے لگے۔
 گرد ہی نا طاقتی، دُبی بوری اے۔۔۔۔۔ وہی فاقہ کشی ہے۔۔۔۔۔ بیٹی کے سر پر چاہ نہیں
 بویاں فاقے کر۔ بی میں۔۔۔۔۔ نا طاقتی ہی نا طاقتی۔۔۔۔۔ مگر یہ تو اچا جاتے
 ہیں کہ در طاقت ہی نہیں ہے۔ بلکہ حق طاقت ہے۔۔۔۔۔ وقت گذرنا رہا۔

نا طاقتی کا اظہار۔۔۔۔۔ اُمد ہو، بدر ہو، غمخوار ہو، خیر ہو، جہان تک فوج
 نقطہ نظر ہے۔ ان کے پاس نا ناقتی ہوتی تھی۔۔۔۔۔ دشمن کے پاس طاقت ہوتی تھی۔
 مگر رسول نا طاقتی سے منور انا چاہتے تھے ہی کو۔

دبیر بھی لوگوں کو یہ خیال رہتا تھا کہ طاقت ہی ہے۔ کیونکہ رسول کے پاس ایک خیر شکن کی طاقت
 ہے۔ اس لئے انہوں نے خیر فتح کر لیا۔ ان کے پاس ایک ذوالفقار کی طاقت ہے۔۔۔۔۔ اس لئے
 انہوں نے فتح کر لیا۔۔۔۔۔ یہ لوگوں کے دلوں میں مٹیٹ گیا تھا کہ طاقت ہی ہے۔۔۔۔۔ یہ
 بات اُس وقت بھی تھی اور آج بھی ہے کہ طاقت ہی ہے۔

آج نوسان دینے میں رہ کر رسول کیے گئے۔ اور صلح حدیبیہ کے آنا پڑا۔
 اس صلح کی تفصیلات اگر آپ دیکھیں۔ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یوں دب
 کے صلح کی ہے کہ خود ساقیوں کو صلح میں ہی نہیں رسالت میں بھی شک ہو
 گیا تھا۔۔۔۔۔ اور وہ شک لگتا جانے گیا بھی یا عمر بھر باقی۔۔۔۔۔
 بہر نوع اتنی نا طاقتی کا اظہار کیا ہے اس صلح میں۔۔۔۔۔

میرے محترم سامعین! رسول دینے میں ہیں۔ تب وہی نا طاقتی کا اظہار۔۔۔۔۔ دوزمان مبارک

شہید ہو گئے۔ تب بھی وہی ناخاقتی کا اظہار ——— حمزہ جیسا چاشمید ہو گیا۔ وہی ناخاقتی۔ آپ کو گھر سے نکال دیا۔ ——— پلے گئے۔ کسی نے آپ پر کوڑا کرکٹ پھینک دیا۔ خاموش ہیں۔ کسی نے رستے میں کانٹے بچھا دیئے۔ ——— چُپ ہیں۔ یعنی اتنی ناخاقتی کا اظہار کہ طاقت کے ذریعے نہیں منوانا۔ بلکہ یہ منوانا ہے کہ حق طاقت ہے ناخاقتی کا پورا مظاہرہ کرنا ہے۔ ——— جب نو دس سال گذر گئے۔ اسی عالم میں ——— تو ایک دن وہ وقت آیا کہ یہی ناخاقتی انسان جو گئے سے ہجرت کر کے چلا گیا تھا۔ رات کو کھپ کر۔ ——— وہ دن کے اُجالے میں پوری دنیا دی طاقت کے ساتھ پھر اسی شہر مکہ میں واپس آیا۔ اور مکہ فتح کیا۔ فاتحہ مکہ بنا۔ ——— اور مکہ سے نکال دینے والوں کے دم نکل گئے۔ کہ اب کیا بنے گا۔ ——— اور جو خون کے پیاسے تھے۔ اُن کے خون خشک ہو گئے۔ کہ اب کیا بنے گا۔ ——— جس کو رات کو گھر سے نکالا تھا۔ وہ دن میں پوری طاقت سے آیا۔ ——— سینکڑوں قبائل ساتھ تھے۔ علم لہرا رہے تھے۔ سوار ساتھ تھے پیادے ساتھ تھے۔ ——— اور پوری شان و شوکت سے عبداللہ کے بیٹے کے مکہ فتح کیا۔ ——— اور حضرت ابوسفیان ران کی ساری سوانح عمری تو مجھے یاد نہیں۔ یہ وہ بزرگ تھے جو ہر جنگ میں رسالتِ نبی کے خلاف فوج کے سپہ سالار ہوتے تھے۔ بڑے خاندانی بزرگ تھے۔ ان کے خاندانی تعارف کے لئے صرف یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ حضرت ابوسفیان وہ تھے جو یزید کے بھی دادا تھے۔

جب رسولِ فتح مکہ کر رہے تھے۔ اپنی فوج کے ساتھ۔ تو یہ ابوسفیان ایک پہاڑی کی چوٹی پہ کھڑے تھے۔ ——— اور رسول کی آمد دیکھ کر بے ساختہ کہنے لگے۔

”عبداللہ کے بیٹے میں بڑی طاقت آگئی ہے۔“ اور عباس، رسول کے چچا پاس ہی کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا کہ کجبت! یہ طاقت نہیں ہے۔ یہ حق ہے۔ اب بھی تو طاقتِ طاقت چلا رہا ہے۔“ اُن کے ذہن میں ہی یہی بیٹھا ہوا تھا۔ کہ طاقت حق ہے۔ اور کوئی نئے

ہے ہی نہیں دنیا میں — بس اگر حق کوئی شے ہے۔ تو وقت طاقت ہے۔ —
 بہر حال مکہ فتح ہو گیا۔ اور وہی جہنوں نے گھر سے نکالا تھا۔ وہ قیدی بن کے رسولؐ کے
 سامنے آکھڑے ہوئے۔ ہاتھ اُن کے بندھے ہوئے ہیں۔ رسولؐ کے سامنے کھڑے ہیں۔ —
 اب دنیا کے دنیا کے تمام قوانین کے مطابق۔ اگر رسولؐ حکم دے دیں۔ "ان سب کو قتل
 کر دو۔ انہوں نے ہمارے عزیز قتل کئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں ستایا ہے۔" یہ ٹھیک ہے فاتح
 کو سچی ہے اس بات کا۔ وہ کر سکتا تھا۔ — مگر رسولؐ نے کہا "دنیا کے طاقت ور
 فاتحوں والا کام میں نے نہیں کرنا۔" بڑے اطمینان سے جب وہ ہاتھ بندھے ہوئے کھڑے تھے
 رسولؐ کے سامنے تو رسولؐ نے فرمایا

"میں تمہارے لئے فیصلہ کروں۔"

اب اُن کے لبوں پہ جان آئی ہوئی تھی۔ وہ کھینچتے تھے غم کے ایک
 انبار سے سے ہم قتل ہو جائیں گے۔ ہم ختم ہو جائیں گے۔ —
 اور بہت سے اصحاب رسولؐ اپنے قبضوں پہ ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔
 کہ حضورؐ ذرا حکم دیں اور ہم انہیں قتل کریں۔ —

میرے محترم سامعین! ایک دم رسولؐ کے لبوں پہ پلکی سی مسکراہٹ آئی۔ اور آپ
 نے حکم دیا۔ "جاؤ! میں تم سب کو آزاد کرتا ہوں۔" لیجئے۔ اُن کے ہاتھ کھل گئے۔ سب کے
 سب آزاد ہو گئے۔ اب جو وہ آزاد ہوئے۔ تو بڑے شرمندہ۔ اب اُن کے گلہ پڑھنے لگے۔

"یا رسول اللہ! مان گئے۔ ہم مسلمان ہوتے ہیں۔ لا الہ الا اللہ۔ محمد رسول
 اللہ
 ہم مسلمان ہو گئے۔"

سامعین! اب جو وہ مانیں گے۔ تو رسولؐ کو سچی سمجھ کے نہیں مانیں گے۔ بلکہ
 رسولؐ کی طاقت سے مرعوب ہو کر مانیں گے۔ — وہی طاقت
 کو سچی سمجھا ہے انہوں نے۔ کہ رسولؐ ہیں آج طاقت ہے۔ لہذا آج کا یہ پرت

آج حضرت ابوسفیان بھی کلمہ پڑھ رہے ہیں۔

”قبلہ میں مسلمان ہو گیا۔“

کیوں؟

”حلاقت جو تیرے پاس ہے تو فاتح ہو کے جو آیا ہے۔“ حلاقت سے کلمہ

پڑھا ہے۔ گزرات دسی رہی کہ حلاقت حتیٰ ہے۔

بہر نوح رسول نوح کہنے کے بعد غار کعبہ کے سامنے پہنچے۔ کعبے کو دیکھا

اور فرمایا: ”کعبہ ہم آگئے۔“ تو عباس نے انتظار میں تقانا۔ ہم

آگئے۔“

کعبہ نے عرض کیا: ”قبلہ کیا عرض کروں۔“ آپ تو آگئے۔ مگر

میری جان ان سے تو چھڑوا میں جو مجھے لکھیے بیٹھے ہیں۔“

خدا جانے کب سے بیٹھے ہیں اور وہ ہیں ایسے بُت بن کے بیٹھے تھے۔

کہ بیٹے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ اور تین طرح سے

بیٹے تھے۔ کعبے میں بُت۔ (۱) کچھ تو کھڑے تھے۔ (۲) کچھ دیواروں

سے اڑے تھے۔ (۳) اور کچھ گڑھے تھے۔

جو کھڑے تھے وہ تو بوں ہی کھڑے کھڑے آئے تھے۔ اُن کا تو کوئی بھروسہ

ہی نہیں تھا۔ اور جو دیواروں سے اڑے تھے۔ اُن کا سہارا

تھا۔ وہاں چھوٹ جائے تو ختم ہو جائیں۔ اور جو گڑھے

ہوئے تھے۔ وہ بڑے مغرور تھے۔ کہ ہم یہاں کھڑے ہوئے ہیں۔ اُن کے

پوہنے والے بھی بڑے مغرور تھے۔ کہ ہمارے توں کا کوئی کیا بگاڑ سکتا

ہے۔ ہمارے بُت حرم میں گڑھے ہوئے ہیں۔ خاز کعبہ میں گڑھے ہوئے

ہیں۔“

شے بندہ نوذا؛ رسول کیسے کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ بتوں کی طرف دیکھا۔ بتوں نے پھر ٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔۔۔۔۔ "آج کیا ہے؟"۔۔۔ عسا و مبارک رسول کے ہاتھ میں تھا۔۔۔ ایک بت کے سر پہ مارتے تھے اور فرماتے تھے "جاء الحق"۔ وہ لرز جاتا تھا۔۔۔ پھر فرماتے تھے "ذہق الباطل"۔ وہ ٹوٹ کے گر جاتا تھا۔۔۔ جب سارے ٹوٹ چکے تو وہ جو دیواروں میں اُدپر کڑھے ہوئے تھے۔ وہ بڑے ٹھمن تھے۔ کہ۔ رسول کا ہاتھ ہم تک نہیں پہنچ سکتا۔ ہم اونچے کڑے ہوئے ہیں۔۔۔ اب سامنے تمام مسلمان کھڑے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے بت ٹکنی کا منظر دیکھ رہے ہیں۔ رسول نے اُن بتوں کو دیکھا۔ جو دیوار میں کڑے ہوئے تھے۔

اب میں یہاں حضرت علامہ فخر الدین کا فقر دستا بنوں۔ جو انہوں نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ۔۔۔۔۔

بب اُن کڑے ہوئے بتوں کے توڑنے کی باری آئی۔ تو رسول نے مسلمانوں کے جمع کی طرف دیکھا۔۔۔ اور یہ علامہ غنم الدین نے بڑا راز سی ہو کے لکھا ہے۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔ "اُن تمام مسلمانوں میں سے رسول نے چُن لیا علی کو۔۔۔" "یا علی! آگے آؤ۔۔۔" علی آگے آگئے۔۔۔ اور عرض کی۔ "حکم قبیلہ!"۔۔۔۔۔ تو رسول نے فرمایا۔

"یہ بت جو اونچے کڑے ہوئے ہیں۔ ذرا انہیں توڑ دو۔"

"صغور! یہ اونچے ہیں بہت۔ میرا تو ہاتھ دبان تک نہیں پہنچے گا۔"

تو رسول نے فرمایا "دیکھو نا۔ ہم جو کہتے ہیں تمہیں کہ توڑ دو ان بتوں کو۔ دوسروں

سے میں کہہ نہیں سکتا۔ چونکہ وہ برسوں ان بتوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھ چکے ہیں۔

اب اگر وہ توڑیں بھی تو انہیں شرم آئے گی ان بتوں سے۔۔۔۔۔ میں چاہتا ہوں۔ تم توڑو

چونکہ تمہارا ان سے کوئی واسطہ ہا ہی نہیں۔ اور توڑنے کا طریقہ یہ ہوگا

کہ تم میرے کاغذ سے پکڑے ہو کے توڑ دو۔

مگر قبیلہ — میں! کاغذ سے پکڑو۔

”ہاں ہاں۔ میں جو کہتا ہوں — تم میرے کاغذ سے یہ قدم رکھو۔ اور توڑ دو“ اور عجیب منظر بن گیا۔ کہ آخر درجہ کی رسالت جھکنے لگی۔ اور اول درجہ کی امامت ابھرنے

لگی۔ رسول پر قدم پہنچے۔ رسول کا ایک ہاتھ کعبے کی دیوار پر۔

اور قدم بت شکن کے دوش رسول پر۔ اور بت شکن کا نقشہ یہ۔ کہ ایک ہاتھ دیوار

پر رکھا ہوا ہے۔ اور ایک ہاتھ میں بت کی گردن ہے۔ اور رسول

پوچھتے ہیں۔

”یا علی! کہاں ہو۔“

”قبیلہ کیا بتاؤں۔ کہاں ہوں۔ آج عرش سے جو چیز کہئے۔ جھک کے

اٹھاؤں۔ اتنا بلند ہو چکا ہوں۔“

”شنا باش۔ بہت اچھا۔ توڑ دو انہیں۔“

علی نے جھٹکا دیا۔ بت ٹوٹے۔ گرے۔ جس طرح کچی سٹیشیاں ٹوٹ جائیں۔ اس

طرح رسول کے قدموں میں وہ بت ٹوٹ رہے تھے۔ جب تمام بت ٹوٹ

چکے۔ تو رسول نے فرمایا۔

”یا علی! اتر آؤ۔“ مگر علی اب اترتے نہیں۔

علی اتر دنا۔

”قبیلہ۔ اتنا بلند ہونے کے بعد نیچے اترنے کو جی نہیں چاہتا۔“

”علی اتر آؤ نا۔ دیکھتے نہیں۔ دیکھنے والوں کے پیرے اتر گئے ہیں“

اب علی اترتے نہیں۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ۔

بریل آگئے فوراً۔ اور آ کے اُتار کو سلام کیا۔ اور اپنی گود میں

لے کے آرام سے اُتارا — اور جبرئیل نے جو علی کو گود میں لے کے اُتارا —
 اس سے جبرئیل کی نشان اور بڑھ گئی۔ جب جبرئیل کا وقار بڑھ گیا۔ جبرئیل کی حیثیت بڑھ
 گئی — اور یہ ملک ساری عسمر سے عادی ہے۔ اس بات
 کا قرآن صامت خدا سے لے کے نبی کے گھراؤ ناردے —
 جبرئیل قرآن صامت اُتارتے اُتارتے اتنا مشتاق ہو گیا تھا۔ کہ آج
 قرآن ناطق نبی سے بنا اور خدا کے گھر پہنچا دیا —

بہ نوح مکہ فتح ہو گیا۔ رسول کا پرچم سارے مکہ پر لہرانے لگا۔ خانہ کعبہ پر لہرانے
 لگا۔ اذانیں ہونے لگیں۔ اب تمام مسلمان سامنے آ بیٹھے۔ حضرت ابی سفیان بھی تشریف
 فرما ہیں۔ اور اُن کی زوجہ محترمہ جناب بندہ بھی بیٹھی ہیں — اور بھی سب مسلمان
 بیٹھے ہیں۔ کلمہ پڑھ رہے ہیں۔ سب مسلمان بوسے ہیں — اور
 رسول فرماتے ہیں۔

”آؤ۔ بیٹھو۔ تم ہمارے بھائی ہو۔ تم مسلمان ہو گئے۔ نیت کا حال اللہ جانتا ہے۔
 بہ نوح۔ تم سب میرے اصحاب ہو۔“ — اور
 رسول کے کرد و پیش سب بیٹھے ہیں — خدا کے فضل سے اسلام کا بول بالا ہے۔
 سارا جزیرہ عرب مسلمان ہو چکا ہے۔ چاروں طرف اسلام ہی اسلام ہے۔ اور حضرت
 ابی سفیان بھی ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور اُن کے خاندان والے بھی سب بیٹھے ہوئے ہیں
 نیت اور دلوں کا حال اللہ جانتا ہے —

بہ نوح سب کے سب مسلمان ہیں۔

توجہ ہے نا حضور! یہاں تک کہ اتنی قرابت ہوئی رسول سے حضرت ابی سفیان کی۔ کہ
 ان کی ایک صاحبزادی جناب ام حبیبہ کا رسول سے عقد ہوا۔ وہ حرم رسول میں آئیں۔ وہ
 اُم المؤمنین ہیں۔ ہم مومنوں کی وہ ماں ہے — ہمارے لئے واجب الاحرام ہیں۔

توت و احترام سے ان کا نام لینا سہارا فرض ہے۔۔۔۔۔ حضرت ابی سفیان کی دختر نیک اختر ہیں۔ اور امیر شام معاویہ کی بہن ہیں۔۔۔۔۔ ام حبیبہؓ ان کا نام ہے۔۔۔ اور حضرت ابوسفیان کی دوسری بیٹی کی شادی قبیلہ بنی ثقیف کے سردار سے ہوئی۔۔۔ اور یہ قبیلہ بنی ثقیف، جو نغانا عرب میں، حُسن بیان، شیر زبان اور شیریں بیان کے اعتبار سے اس کے مقابلے میں پورے عرب میں کوئی اور قبیلہ نہیں تھا۔

عرب کے چار قبیلے، چار خصوصیات میں مشہور تھے۔

۱۔ عزت و عظمت میں بنی ہاشم۔۔۔۔۔ اور

۲۔ سیاسی تدبیروں میں بنی امیہ۔۔۔۔۔

۳۔ بہادری میں بنی کلاب۔۔۔۔۔ اور

۴۔ حُسن میں بنی ثقیف، اور جو بنی ثقیف کے قبیلہ

کا سردار تھا۔ اُس کا نام تھا "ابومرہ" جس کے ساتھ ابی سفیان کی دوسری

صاحزادی کی شادی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ گویا ابومرہ اور رسالتناہ

آپس میں ہم زلف تھے۔۔۔۔۔ یہ رشتہ ہو گیا۔۔۔۔۔

ابی سفیان کی ایک صاحبزادی ابومرہ کے گھر میں جایا ہی گئی۔ اور

ایک جناب رسالتناہ کے گھر میں تشریف لائی۔۔۔۔۔ جن کا نام تھا

ام حبیبہؓ۔۔۔۔۔ اور اگر آپ اسلامی کتابیں پڑھیں۔ تو ان کے فضائل

بڑے بگتے ہوئے ہیں۔ اور تمام فضائل کا سرنامہ جو فضیلت ہے جناب

ام حبیبہؓ کی۔ وہ یہ ہے کہ ایک دن ان کے والد بزرگوار حضرت ابی سفیان

انہیں ملنے کے لئے آئے۔۔۔۔۔ اور جب آئے اُس حجرے میں جس

میں جناب ام حبیبہؓ رہتی تھیں۔۔۔۔۔ تو آپ اپنے والد کو دیکھ کر بہت

خوش ہوئیں۔۔۔۔۔

”ابا آؤ۔ بسر آؤ۔ تشریف رکھو۔۔۔۔۔“

ابن سفیان تشریف لائے۔۔۔۔۔ اور جب بیٹھے گئے۔ تو ام حبیبہ نے فرمایا۔
ذرا ٹھہرو۔۔۔۔۔“

وہ درمی جو بچھی ہوئی تھی۔ وہ آپ نے تہ کر لی۔ اور زمین پر اشارہ کیا۔۔۔۔۔
”تشریف رکھئے۔۔۔۔۔“

ابن سفیان نے کہا۔ ”بیٹی۔ میں زمین پر۔۔۔۔۔ میں اگر اس درمی
پر بیٹھ جاؤں۔ تو کیا حرج ہے۔۔۔۔۔“
تو جناب ام حبیبہ نے فرمایا۔

”آپ اس درمی پر نہیں بیٹھ سکتے۔ کیونکہ اس پر رسول بیٹھا کرتے ہیں۔۔۔۔۔“
واہ! ام المؤمنین۔ ام المؤمنین ہو تو ایسی ہو۔ جو رسول کی جگہ پر
اپنے باپ کو بھی نہ بیٹھے دے۔۔۔۔۔ یہ ہے جناب ام حبیبہ
کے فضائل کا تعارف۔۔۔۔۔“

حضرت ابن سنیان بڑے خوش تھے دونوں بیٹیاں بڑے گھر میں بیاہی گئیں۔
ہر باپ خوش ہوتا ہے۔ اگر بیٹی کو اچھا رشتہ مل جائے۔ ابو سفیان بھی بہت خوش
تھے۔۔۔۔۔ ایک بیٹی محمد کے گھر میں۔۔۔۔۔ ایک بیٹی ابو امرا کے گھر میں۔ ایک
محمد داماد۔ ایک سردار بنی ثقیف داماد۔ خدا نے ابو مرثد ثقیفی کے گھر ابن سفیان
کی صاحبزادی سے صرف ایک بیٹی عطا فرمائی۔ کوئی اور اولاد نہیں ہوئی۔ صرف ایک
دختر پیدا ہوئی۔۔۔۔۔ اور اس دختر کا نام تھا جناب یسلیٰ۔۔۔۔۔
یسلیٰ عرب میں شہزادیوں کو کہتے ہیں۔ یسلیٰ نام تھا اس ابو مرثد کی بیٹی کا۔۔۔۔۔ اور
یسلیٰ جناب ام حبیبہ کی بھانجی ہوئی۔ اور جناب رسالت مآب خالو ہوئے یسلیٰ کے۔
یسلیٰ وہاں پیدا ہوئی۔ اور جب یسلیٰ جوان ہوئی۔ اور شادی کے قابل ہوئی تو ان کے

باپ کو رشتے کی تلاش ہوئی — آخر نگاہ انتخابِ خاندانِ نبوی ہاشم پر پڑی۔ اُس نے خاندانِ نبوی ہاشم میں سردارِ جوانانِ جنت جناب سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کو منتخب کیا۔

چنانچہ جناب بیٹی سے جناب سید الشہداء کا عقد ہوا۔ اور ابو مراد تقیہ کی بیٹی بیٹی حرم سید الشہداء میں آگئیں۔ سید الشہداء کی پہلی جو حرم محترم تھیں۔ وہ تھیں جناب شہر بانو اُن کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور اُن کے بطنِ طیب سے حضور امام زین العابدین علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اور بیٹی کے بطنِ طیب سے خداوند عالم نے پیٹے تو ایک لڑکی عطا فرمائی۔ اور اُس کے بعد اللہ نے ایک نسر زید عطا فرمایا۔ جن کا نام تھا شہزادہ اعلیٰ اکبر۔

میرے سامعین! جناب امام زین العابدین جب پیدا ہوئے تھے۔ تو اُس وقت امیر المومنین موجود تھے۔ واداک کی موجودگی میں امام زین العابدین پیدا ہوئے تھے۔ ان کی والدہ شہر بانو شاہ ایران کی بیٹی تھیں۔ اور جب امام زین العابدین پیدا ہوئے۔ تو امام حسین علیہ السلام نے انہیں ایک سفید کپڑے میں لپیٹا اور مسجد میں گئے۔ حراب مسجد میں شاکر دور رکعت نماز پڑھی۔ اور نماز چھ کے کہا۔

”خداوند! خدا تو نے یہ نعمت مجھے عطا فرمائی ہے۔ میں تیری ہی تذکرگان ہوں۔“

اور بابہ کے بچے کو وہیں مسجد میں لیٹا چھوڑ کے گھر واپس آگئے۔

حییہؑ تو مسجد میں شاکر کے آگئے امام زین العابدین کو۔ اب

امیر المومنین علیہ السلام مسجد میں گئے۔ دو رکعت نماز پڑھی اور ہاتھ

اٹھا کے دعا کی۔

”خداوند! حسینؑ یہ نعمت تیرے سپرد کر گیا۔ میں تجھ سے مانگنے آیا ہوں“
 اور علیؑ کو دینے کے امام زین العابدینؑ کو گھر میں آگئے۔
 اور آگے آواز دی۔

”زینبؑ بیٹا! میں اسے الگ کے لایا ہوں خدا سے۔ اور
 تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ اُسے تم نے خصوصیت کے ساتھ پرورش
 کرنا ہے۔ اور زینبؑ! اس کے بدن میں شہنشاہی خون ہے۔ خیال کتنا
 باقی بچوں کی طرح اسے نہ پالنا۔ اس کے گہوارے میں زم گدا
 بچھایا جائے۔ چونکہ اس میں شہنشاہی خون ہے۔“

اس طرح زینبؑ نے پالنا شروع کیا۔ اور جب پیدل چلنے لگے تو امیر المؤمنینؑ
 انگلی کپڑے کے چلتے کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ کہیں گرنے نہ جائے۔ جب ذرا اور
 بڑے ہوئے۔ تو امام حسنؑ مجتبیٰؑ اور امام حسینؑ نے یہ انتہام کیا امام زین العابدینؑ
 کے لئے۔ چونکہ اس کے مزاج میں شہنشاہی خون ہے۔ لہذا حکم یہ تھا کہ اس کے
 سامنے کوئی اونچی آواز سے نہ بولے۔ شاہی مزاج ہے۔ برداشت نہیں کرے گا
 اور گھر میں عورتوں کو یہ حکم تھا۔ کہ جب زین العابدینؑ گھر بیٹھے ہوں۔ تو گھر کے اندر
 بھی کسی کے سر سے چادر نہ اترے۔ شاہی غیرت ہے برداشت نہیں کرے گی۔
 گویا امام زین العابدینؑ کی اس شان سے پرورش ہو رہی تھی۔ اس کے
 بعد جب لیسلی کے بطن سے دوسرا فرزند بشکل رسول اللہؐ نے عطا فرمایا۔ تو امیر المؤمنینؑ
 موجود نہیں تھے۔ آخر امام حسینؑ علیہ السلام نے اس بچے کو گود میں اٹھایا۔
 اور لے جا کے اسی طرح مسجد میں ٹھادیا۔ دو رکعت نماز پڑھی۔ اور
 اللہ سے دعا کی۔

”خداوند! یہ نعمت تو نے مجھے عطا فرمائی ہے۔ میں یہ تیری

ہی نذر کرتا ہوں۔ تو ہی مالک ہے اس کا۔۔۔۔۔
 حسین بچے کو لٹا کے چلے آئے۔۔۔۔۔ اب علی تو قتلے نہیں۔۔۔۔۔ آخر
 زینب نے برقع پہنا۔ اور مسجد میں تشریف لائیں۔

”خدا خدا! حسین تو یہ نعمت تیرے سپرد کر گئے۔۔۔۔۔ میں
 مانگنے آئی ہوں، اور اس بیٹے کو جو لیلیٰ کے بطن سے پیدا ہوا
 تھا۔ جن کا نام آج علی اکبر مشہور ہے اسے زینب نے آئیں۔۔۔۔۔
 زینب نے علی اکبر کو پالنا شروع کیا۔ علی اکبر سوتے زینب کے پاس۔ گود میں کھیلتے
 تو زینب کے پاس۔۔۔۔۔ بھول گئے کہاں کون ہے۔ ہر وقت زینب کے ساتھ
 رہتے۔ چوبیس گھنٹے بی بی زینب کے ساتھ رہتے۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ سارے
 مدینے میں علی اکبر، علی ابن زینب مشہور ہو گئے۔ اور اگر گھر میں محلے کی عورتیں آئیں۔
 تو زینب اُسے چادر کے دامن میں چھپا لیتی۔۔۔۔۔ کہیں بچے کو نظر نہ لگ جائے۔ اس
 شان سے پرورش ہو رہی تھی علی اکبر کی۔۔۔۔۔ زینب کبھی گود میں لے کے حسین
 کے سامنے آتیں۔۔۔۔۔ تو حسین مسکرا کے کہتے۔

”وزینب! ماشاء اللہ۔ تمہارا بیٹا تو نبی حسین ہے بڑا سمجھدار
 ہے۔ ہماری تمنا ہے۔ ہمارا دل چاہتا ہے۔ جانی خواہش
 ہے کہ تمہارا بیٹا ہم سے کوئی شے مانگے۔۔۔۔۔ اور
 زینب جواب میں کہتیں۔

”میرا بیٹا غیرت دار ہے۔ میرے ہوتے کیوں مانگے کسی سے؟
 یہ بھائی بہن کی باتیں ہوتیں۔ علی اکبر کو کسی شے کی ضرورت ہوتی۔ تو
 زینب سے مانگتے۔ کوئی شے چاہتے۔ تو زینب سے مانگتے۔ باس
 زینب تیار کرتی۔ کھانا زینب تیار کرتی۔ اس شان سے علی اکبر پلے ہے

اور

زینب نے یہ تیاریاں بھی شروع کر دیں۔ کہ چوٹ لگے یہ میرا بیٹا ہے
اس کی شادی اس شان سے کروں گی۔ کہ دنیا یاد رکھے گی۔ کہ نبی ہاشم
کے شہزادے کی شادی کس شان سے ہوئی تھی۔ بس
اٹھارہ سال پورے ہو جائیں۔ انشاء اللہ اونیسویں سال شادی
کردوں گی۔ اور

سترہ سال پورے ہوئے۔ اٹھارہ سال شروع ہوا جو سفر شروع ہو گیا۔
زینب بھی سفر میں۔ علی اکبر بھی سفر میں۔ اور سفر بھر یہ عالم رہا۔ کہ زینب کی حمل کے
ایک طرف حسین کا گھوڑا۔ ایک طرف علی اکبر کا گھوڑا۔ زینب کے حمل
پہ کبھی علی اکبر کا ہاتھ۔ کبھی حسین کا ہاتھ۔ پھر بھی زینب بار بار
کہتی۔ "علی اکبر بیٹا۔ سر پہ کوئی کپڑا ڈال لو۔ دھوپ نہ لگ جائے بیٹا۔ سامنے
میں بیٹھنا۔ گرمی شدید ہے۔ بیٹا۔ کھانا میرے سامنے بیٹھ کے کھانا۔ میں خود
دیکھوں گی۔" علی اکبر اس ناز دنیاوی سے پتے ہونے کر بلا میں آگئے
امام نے کر بلا کی زمین خریدی۔ تو زینب نے دبی زبان میں امام سے فرمایا۔

"حسین! یہ زمین اگر میرے بیٹے کے نام ہو جائے۔"

تو امام نے فرمایا۔ "اسے بھی حصہ ملے گا۔" اس لالٹے، پیارے زینب

علی اکبر کی پرورش کر رہی تھیں۔ اُدھر ماں لیلیٰ بھی خوش تھیں۔

کہ اللہ نے مجھے علی اکبر جیسا فرزند عطا فرمایا ہے۔

بزرگان من!

میں اپنے بیان کو بہانہ کر ختم کرتا ہوں۔ کہ ساتویں محرم الحرام کو کر بلا میں پانی

بند ہو گیا۔ مگر زینب کے منہ سے ایک دفعہ نہ نکلا کہ میرے خون و محمدؐ

بہر نوتا یہ باتیں ہو رہی تھیں ماں بیٹے کے درمیان
 حضور والا! صبح عاشور میدان شہادت گرم ہو گیا۔ اور صبح سے لے کر دن
 ڈھلتے تک حسین کے کانوں میں آوازیں آتی رہیں۔۔۔۔۔ ”مولا! میں گر گیا۔“
 ”میرے آقا میں گر گیا۔۔۔۔۔“

جس کسی کی بھی لاش اٹھا کے لانے ہیں امام۔ تو سیلی گھبرا کے پوچھتی۔
 ”میرا اکبر زندہ ہے ابھی۔۔۔۔۔؟“ اس لئے نہیں کہ وہ اکبر کی زندگی چاہتی
 تھی۔ بلکہ یہ سننا چاہتی تھی کہ ”اکبر شہید ہو گیا۔“ تاکہ میں سرخرو ہو جاؤں۔ سیدہ
 کے سامنے۔۔۔۔۔ اور جب تمام اصحاب حسین ختم ہو گئے۔ اور صرف عزیز باقی
 رہ گئے۔ تو امام نے آواز دی۔

”اکبر بیٹا!“

”جی قبیلہ“

”ادھر آؤ۔ سامنے آؤ۔۔۔۔۔“ میں حکم دیتا ہوں کہ سب سے پہلے تم
 میدان میں جاؤ۔۔۔۔۔“

بس مولا کا حکم لیا تھا کہ علی اکبر نے سلام کیا۔ (گھوڑے پہ سوار تو تھے ہی، روانہ
 ہو گئے۔۔۔۔۔ ابھی دس بارہ قدم گئے ہوں گے کہ مولا نے آواز دی۔
 ”اکبر بیٹا۔ ٹھہرو۔ واپس آؤ۔۔۔۔۔“

علی اکبر واپس آئے

”گھوڑے سے اترو“

علی اکبر گھوڑے سے اترے۔۔۔۔۔ اب امام نے فرمایا۔

”بیٹا! پہلے گھر میں جاؤ۔ ماں کو سلام کرو۔۔۔۔۔ بہنوں سے ملو۔ گھر والوں

سے رخصت لو۔۔۔۔۔ گھر میں ہو کے پھر جانا۔۔۔۔۔“

علی اکبر گھر میں آئے۔ ساتھ ساتھ امام بھی تشریف لائے۔ دیکھا۔ سامنے ہی صحن
میں زینب بیٹھی ہے۔ تو امام آکے کہتے ہیں۔

” زینب! آج اکبر آ رہے ہیں۔ آج میں سنا چاہتا ہوں۔ پھوپھی بھتیجے میں کیا
بات ہوتی ہے۔ آج میں خود سنوں گا۔ آج کیا گفتگو ہوتی ہے۔“
اکبر نیچے میں آئے۔ پہلے آکے میٹھی کو سلام کیا۔
” اماں سلام!“۔ مگر ماں جواب میں کہتی ہے۔

” تم ابھی زندہ ہو بیٹا! میں تو صبح سے منت ماننے بیٹھی ہوں۔ تیری میت آئے۔ بیٹا!
اُس کعبوت سے میرا رشتہ ہے۔ دیکھنا تیری ماں کو بڑی تشویش ہے اکبر! کہیں ایسا
نہ ہو۔ تیری ماں کا دودھ بہ نام ہو جائے۔“
” اماں! میں جا رہا ہوں۔“

” ہاں بیٹا جاؤ۔ خدا حافظ۔“ اور علی اکبر ماں کو سلام کر کے پھوپھی زینب
کے سلام کو پہنچے۔ اور امام بیٹھے دیکھ رہے ہیں کہ پھوپھی بھتیجے میں کیا بات ہوگی۔
جاتے ہی اکبر زینب کی گود میں سر رکھ کے لیٹ گئے۔ زینب نے پیار کیا۔
اور پوچھا۔

” میرے لال! کیا بات ہے۔“

” اماں کوئی بات نہیں۔ میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھنے آیا ہوں۔“
” بیٹا! اس وقت کیا مسئلہ تمہیں یاد آ گیا۔“

اماں! آپ کو پتہ ہے۔ جب سے میں نے بونا شروع کیا۔ جو بات پوچھی ہے
آپ ہی سے پوچھی ہے۔ جو مانگا ہے۔ آپ ہی سے مانگا ہے۔ آپ ہی کو مان سکتا
ہوں۔ اماں! آج ایک مسئلہ ہے۔ وہ بھی آپ ہی بتادیں۔“
” ہاں بیٹا پوچھو۔ کیا مسئلہ ہے۔“

”اماں۔ میری دادی فاطمہ مرتبے میں زیادہ ہیں یا آپ۔۔۔۔۔؟ آپ دونوں میں کس کا مرتبہ زیادہ ہے۔۔۔۔۔ دادی فاطمہ کا یا آپ کا۔۔۔۔۔؟“

جناب زینب کہتی ہیں۔

”بیٹا یہ کیا پوچھ بیٹھے تم۔۔۔۔۔ تم جیسا سمجھ دار نوجوان یہ کیا سوال کر رہا ہے۔ کجا فاطمہ۔۔۔۔۔ کجا میں۔۔۔۔۔ میں تو فاطمہ کی کنیز ہوں۔۔۔۔۔“

میں زینب کے منہ سے نکلنا تھا کہ میں کنیز ہوں،۔۔۔۔۔ کہ علی اکبر اٹھ کے بیٹھ گئے۔۔۔۔۔ اور بیٹھ کے کہتے ہیں۔۔۔۔۔

”اگر واقعاً فاطمہ کا مرتبہ آپ سے زیادہ ہے۔ آپ اُن کی کنیز ہیں جیسا کہ آپ کہتی ہیں۔۔۔۔۔ تو آج کام تو کر۔۔۔۔۔“

بیٹا کیا۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔

”آج فاطمہ کے بیٹے پہ اپنے بیٹے کو قربان تو کر دو۔۔۔۔۔“ اور ادھر سے اُمّ نے آواز دی۔

”زینب! میں نہ کہتا تھا کہ آج میں سنوں گا، کیا بات ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اب زینب نے اکبر کو سر سے پیر تک دیکھا۔ اور فرمایا۔

”ہاں بیٹا خدا حافظ۔ جاؤ۔“

دونوں بہن بھائیوں نے مل کے لباس پہنایا۔۔۔۔۔ سر پر عمامہ باندھا۔ عمامے کا ایک حصہ گردن کے ساتھ ”نخت الحنک“ کی طرح باندھ دیا۔ علی اکبر کو تیار کیا اور فرمایا۔

”جاؤ بیٹا۔ خدا حافظ۔“

اب جو روانہ ہونے لگے اکبر۔۔۔۔۔ تو ایک بہن نے آکر عبا کا دامن کپڑ لیا۔

”اکبر عبا کی! عبا بے پور مجھ سے بل کے جاؤ۔۔۔۔۔ اسی طرح دوسری بہن ۴۷۔ اُس سے رخصت ہو کے جانے لگے۔۔۔۔۔“

تو سب سے چھوٹی بہن سکینہ آکھڑی ہوئی۔ اور کہنے لگی۔
 ”اکبر بھائی۔ آپ دباں جا رہے ہیں۔ جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا۔ آپ کے بعد
 میرے ابا کا کیا بنے گا۔ میرے ابا پہ کیا گزرے گی۔“ اکبر نے گود میں لے کے بچی تو پیار
 کیا۔ اُس سے رخصت ہو کے جانے لگے۔ خود فوج
 بیزیر اس بات کی ناقبل ہے کہ حسین کے خیمے کا پردہ اٹھتا تھا اور گرتا تھا۔ اٹھتا تھا اور
 گرتا تھا، سو یہ رہا تھا کہ سب سے رخصت ہو کر علی اکبر باہر آنا چاہتے تھے۔ کوئی ٹھپو بھی۔
 ماں بہنیں پھر آ کے اکبر کا دامن پکڑ لیتی۔ اکبر پھر ٹھہر جاتے۔ اور
 میرے محترم سامعین!

جب کافی دیر ہو گئی۔ تو امام نے فرمایا۔

”بی بیو! مسافر کا واسطہ نہ روکو۔ بس اب صبر کرو۔ اکبر کو جانے دو۔“

اور سب خواتین خاموش ہو گئیں۔ اب جو اکبر روانہ ہوئے۔ تو
 ایسا منظر بن گیا۔ کہ حسین جیسا صابری بھی وہ منظر نہ دیکھ سکا۔ اور آنکھوں پر رُوماں رکھ کے
 گھر سے باہر آ گئے۔

منظر کیا بن گیا کہ سب مستورات سے رخصت ہو کر جب اکبر روانہ ہوئے۔ تو ایک آواز

آئی کان میں

”اکبر! اہم سے بھی مل کے جاؤ نا۔“ زین العابدینؑ لیتر بباری سے اٹھ کر کھجی بونی کمر
 کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کہہ رہے تھے۔ دونوں ہاتھوں سے ایک دوسرے کے
 گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔ اللہ جانتے۔ کیا راز و نیاز کی بھائیوں میں باتیں ہوتی ہوں گی۔
 اللہ جانتے۔ کیا گفتگو ہوتی ہوگی۔ بہر فوج بھائی سے رخصت ہو کر اکبر باہر
 آئے۔ اور امام زین العابدینؑ اپنے لیتر بباری پہ جا کے بیٹھ گئے۔ اور حکم دیا۔
 ”پردہ اٹھا دو۔“ میں اپنے بھائی کا جہاد خود دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اکبر باہر آئے۔

ابو حسین نے خود رکاب پکڑ کے علی اکبرؑ کو سوار کیا — علی اکبرؑ سوار ہو گئے۔ تو امامؑ نے فرمایا۔

”جاؤ بیٹا! خدا حافظ“

اب جو اکبرؑ میدان کی طرف جانے لگے۔ تو امامؑ گھوڑے کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ اکبرؑ نے گھوڑہ اردو کا۔ اور عرض کی۔

”قربانہ! آپ تکلیف فرما رہے ہیں۔ اگر آپ حکم دیں۔ تو میں واپس سو جاؤں

آپ کیوں زحمت فرما رہے ہیں —“

مگر آپ نے جواب کیا دیا۔

”علی اکبرؑ بیٹا۔ بات یہ ہے۔ تمہیں ہمارے دل کا احساس نہیں۔ اس لئے کہ تمہارے

کوئی جوان بیٹا نہیں۔ — جاؤ میرے لال۔ میں یہیں بیٹھا ہوں —“

یہ کہہ کے حسینؑ دہلی زمین پر بیٹھ گئے۔ اور ہاتھ اٹھا کے دعا کی۔

”خداوند! گواہ رہنا۔ اُس بیٹے کو بھیج رہا ہوں۔ جو صورت و سیرت میں نیزے

عبیہ سے مشابہ ہے۔ جب میں رسولؐ کی زیارت کا مشائق ہوتا تھا۔ اسے دیکھ لیا

کرنا تھا —“

حسینؑ بیٹھ گئے — اکبرؑ میدان میں چلے گئے۔ — بہاد شروع ہو گیا

شیر خدا کے پوتے کا بہاد، حیدر کرار کے پوتے کا بہاد۔ مگر

سامعین! دورانِ جہادِ ثوبت یہ پہنچی کہ گھوڑے کے گلے میں اکبرؑ نے دونوں ہاتھ

ڈال دئے۔ — اور گھوڑا سوار کو لے کے نوجوں میں گھوم رہا ہے۔

مخضرؑ کرنے لگے۔ اور جب کرنے لگے تو آواز دی۔ ”بیابا بتا ادھر کہ“ ”بابا میں

گھوڑے سے گر رہا ہوں“

حسینؑ نے آواز سنی بیٹھے ہیں خاموش بیسیل آئیں دو آواز پر۔

” حسین! میں سیدانی نہیں ہوں۔ میرے اندر ماشی خون نہیں ہے۔۔۔۔۔ میں
غیر خان کی ہوں۔۔۔۔۔ اس جوان کی ماں ہوں۔ میری ایک التجا ہے۔ جسے آج پہلی دفعہ
کہہ رہی ہوں۔۔۔۔۔ کہ اگر ہو سکے تو اکبر کی لاش لے آئیں۔۔۔۔۔ ایک دفعہ زندگی میں مجھے
میرے بیٹے سے ملا دو۔۔۔۔۔“

حسین اٹھے۔۔۔۔۔ میدان میں آئے۔۔۔۔۔ جب اکبر کی میت ہ قدم کے فاصلے
پر رکھی۔۔۔۔۔ آ کے آواز دی ”اُدعونی یا بُنحی“
” اکبر بیٹا۔ ہمیں لپکارو۔

اکبر بیٹا۔۔۔۔۔ ہمیں آواز دو۔۔۔۔۔ بیٹا ہمیں آنکھوں سے نظر نہیں آ رہا۔ ہمیں
راستہ نظر نہیں آتا۔۔۔۔۔ تم آواز دو۔ ہم تمہاری آواز کے سہارے آئیں گے۔۔۔۔۔
بیٹے نے وہاں سے آواز دی۔۔۔۔۔“

”۔۔۔۔۔ میں یہاں ہوں۔۔۔۔۔ اور آواز کے سہارے
حسین لاش کے سر ہانے پہنچے۔۔۔۔۔ اور منظر کیا دیکھا؟ بیٹا ایک پاؤں پھیلا تا
۔۔۔۔۔ ایک باؤں سمیتا ہے۔۔۔۔۔ حسین دیکھتے رہے اس منظر کو۔۔۔۔۔ پھر
بیٹے کو گود میں لیا۔ اور فرمایا۔

”علی اکبر بیٹا۔ ہم آگئے۔ ہم آگئے میرے بھائی۔ اور علی اکبر نے آنکھیں کھول دیں۔
مام کو دیکھا۔ اور فرمایا۔

”باباجان! آپ نے بڑی تکلیف فرمائی۔۔۔۔۔ میرا آخری دُفت ہے
باباجان“

”جان بیٹا ہم آگئے۔۔۔۔۔ کچھ چاہئے۔۔۔۔۔ کچھ فرمائش؟۔۔۔۔۔ کوئی وصیت؟“
اکبر وہ بیٹا ہے کہ جس کے باپ کو نمتا تھی کہ اکبر مجھ سے کچھ مانگے۔ اور کبھی نہ مانگا۔ آج بھی
حسین کہتے ہیں۔۔۔۔۔ ”بیٹا کچھ مانگو نا۔۔۔۔۔“ اور اکبر کہتے ہیں۔

”ابا آج مانگتا ہوں۔“

”ماں بیٹا مانگو کیا مانگتے ہو۔“ تو علی اکبر نے مانگا کیا۔

”باباجان۔ اگر ہو سکے تو ایک گھونٹ پانی چاہئے۔“ اب حسین کا دل بھر آیا

اور بھرائی آواز میں فرماتے ہیں۔

”بیٹا۔ یہ تو ممکن نہیں۔ فکر نہ کر۔ ابھی تیرے بد بچھے سیراب کریں گے۔“

تمہاری دادی تمہیں سیراب کریں گی۔ گھبراؤ نہیں میرے صل۔ کچھ

اور مانگو۔“

”باباجان! ایک چیز اور مانگتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اگر آپ کو زحمت نہ ہو۔ تو

مجھے گھر لے چلیں۔ میں زندگی میں اپنی ماما سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ماں بیٹا۔ یہ بات ہم پوری کریں گے۔ گھبراؤ نہیں۔“

یہ کہہ کے کیا کیا حسین نے۔ ایک ہاتھ رکھا اکبر کے پیروں کے نیچے۔ اور ایک ہاتھ رکھا

گردن کے نیچے۔ اور بائیں ہاتھ کے سر کے مٹیت اٹھائی۔

جو ان کی مٹیت۔ ٹوڑھا باپ۔ ہاتھ تھر تھرائے۔ لاشہ ٹاڈا دیا۔ پھر

دم لے کے دوبارہ اٹھایا۔ اب کے سینے تک اٹھایا۔ پھر ہاتھ

رزے۔ پھر ٹاڈا دیا۔ اور ٹا کے فرمایا۔

”اکبر بیٹا! میں مجبور ہو گیا ہوں۔ تم ذرا اسی تکلیف کرو۔ تم دونوں ہاتھ میرے

گلے میں ڈال دو۔ کچھ تم سہارا کرو۔ کچھ میں سہارا کروں۔ اس طرح

تمہیں لے چلون گا۔“

علی اکبر نے ایک ہاتھ ڈال دیا باپ کے گلے میں۔ تو حسین نے کہا۔

”بیٹا۔ دونوں ہاتھ ڈال دو۔“ اب جو حسین نے کہا تو اکبر نے جواب دیا۔

”باباجان میں دوسرا ہاتھ سینے سے بٹانا نہیں چاہتا۔ میں آپ کو اپنا سینہ دکھانا

ہنیں چاہتا۔۔۔۔۔“

”بیٹا۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ ہم دیکھیں گے کیا بات ہے۔۔۔“

اب جو حکم دیا امام نے۔ تو اکبر نے ہاتھ ہٹایا۔ اور حسین نے دیکھا۔

”بس یہ بات تھی بیٹا۔۔۔“ دیکھا کیونکہ برہمی کا پھل ٹوٹ کے وہیں رو گیا

ہے۔ ایک انج بھر باہر نکلا ہوا ہے۔ اکبر کا دل برہمی کے ساتھ چھوڑ چکا ہے

مگر حسینیٰ طاقت کو دیکھو۔۔۔۔۔ اکبر کی میت لٹائی۔ خود دوڑا نو بیٹھے۔ ایک

ہاتھ بیٹھے کے سینے پر رکھا۔ ایک ہاتھ سے برہمی پکڑی۔ اور برہمی پکڑ کے منہ آسمان

کی طرف کر کے بلند آواز میں آواز دی۔

”نانا رسول اللہ! داد ابراہیم کو ساتھ لے کے کربلا میں آؤ۔ میرے

دونوں بزرگو۔ آئے دیکھو۔۔۔ میں گھبرا نہیں رہا۔ میری آنکھوں پہ

پیشانی نہیں ہیں۔ میرا ہاتھ لرز نہیں رہا۔ میرا بدن کانپ نہیں رہا

میں نے اپنے اسماعیل کے ہاتھ نہیں باندھے تھے۔۔۔۔۔“

اور یہ کہہ کے حسین نے برہمی کو بلایا۔ برہمی ہی۔۔۔ تو اس میں اکبر کا پھسا ہوا دل ہلا۔

دل کا لہنا تھا کہ پورا بدن لرز گیا۔ اکبر کا بدن لرزا۔ تو کربلا کی زمین میں زلزلہ آ گیا۔ کربلا کی

زمین میں زلزلہ آیا۔ تو حسین کے نیچے لرز گئے۔۔۔۔۔ اور تھیموں کا لرزنا تھا کہ نیچے کے

دروازے کا پردہ گرا۔۔۔۔۔ اور آواز آئی۔۔۔۔۔

”حسین! عظم۔ مجھے بھی آنے دے۔ حسین! اکیلا یہ لاش نہ اٹھا۔

زینب بھی آ رہی ہے۔ بہن بھائی مل کے یہ کام کریں گے۔۔۔۔۔“

حسین نے وہیں سے آواز دی۔

”زینب! میں اکبر کو قربان کرتا ہوں تیرے پردے پر۔ زینب! تو

باہر نہ آنا۔ میں خود اسے لے کر آ رہا ہوں“

علی اصغر۔ ایک سپاہی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خداوند عالم علی جلالہ عزوجل اسماء کی حمد و ثنا کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام بزرگوار محترم! آج کی شب میں آپ لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ میں اس نیت سے بالکل نینیں آیا کہ آپ کو کوئی تقریر سناؤں۔ یا کوئی گفتگو آپ سے کی جائے اس لئے کہ آج مجلس پڑھنے اور سننے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ آج تو ہمیں بغیر کچھ پڑھے اور سنے، محض ہمارا یہ تصور کا رہے کہ آج کربلا کے میدان میں ایک طرف ظالم و جبار بادشاہ کی ٹیڈی دل فوج ہے جس کے ایک ایک سپاہی کے ساتھ ایک ایک سقا موجود ہے جو ان کے گھوڑوں کے سونوں پہ پانی چھڑک رہا ہے اور ان کے پاس حکومت کی ہتیا کردہ ہر قسم کی رسد موجود ہے اور تلواریں تیز کی جا رہی ہیں۔ نیز سے درست کئے جا رہے ہیں۔ کمانیں اور تیر تیار کئے جا رہے ہیں۔ اور دوسری طرف ایک چھوٹی سی فوج ہے۔ مگر آپ بتائیں ایمان سے کبھی تاریخ عالم میں بہتر آدمی بھی فوج کھلائے۔ بہتر آدمیوں کی جماعت کو آج تک کسی نے فوج کہا ہے۔۔۔۔۔۔ پھر فوج میں ہم نے دیکھا ہے کہ جب فوج میں بھرتی ہوتی ہے تو جوان کا قد دیکھا جاتا ہے۔ اس کا سینہ ناپا جاتا ہے۔ اس کی صحت دیکھی جاتی ہے۔ ڈاکٹری معائنے ہوتے ہیں۔ تب جا کے کہیں فوج میں بھرتی ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ مگر یہ بہتر کی عجب فوج ہے۔ اس میں نہ قد دیکھا گیا۔ نہ عمر دیکھی گئی۔ نہ کسی کا سینہ ناپا گیا۔ اس میں ڈیڑھ سو برس کا بڑھا بھی بھرتی ہے۔ سو اس سال کا بوڑھا بھی بھرتی ہے۔ اسی اتو سے سال کے

بوڑھے بھی بھرتی ہیں۔ اس میں تیس سال کا جوان بھی ہے۔ اٹھارہ سال کے نوجوان بھی ہیں۔ نو دس برس کے بچے بھی ہیں۔ اور حد یہ ہے اس فوج کی کہ اس میں چھ بھینے کا سپاہی بھی ہے۔ بتائیے۔ ایسی فوج کہیں دنیا میں دیکھی ہے آج تک کسی نے ایسا رسالہ، ایٹن دیکھی ہے آج تک جس میں یہ صورت ہو، پھر یہ فوجوں کے لئے رسد کے انتظام ہوتے ہیں۔ اچھے سے اچھا کھانا سپاہیوں کو دیا جاتا ہے۔ اچھے سے اچھا سامان انہیں فراہم کیا جاتا ہے۔ اور اگر کسی فوج کو یہ اندیشہ ہو کہ ہماری رسد بند ہو جائے گی۔ تو وہ فوجیں میدان چھوڑ دیتی ہیں۔ مگر ہماری عجیب فوج ہے کہ تین دن سے رسد بند ہے۔ مگر بیٹھے ہیں۔ کیا مجال ہو کسی کی پیشانی پر بل آیا ہو۔ کیا مجال ہو کسی کی پیشانی پر شکن آیا ہو کسی کو ذرا گھبراہٹ ہوئی ہو۔

اور آج کی رات کربلا میں بیٹھنے والوں نے دنیا کے سارے اصول بدل دیئے۔ دنیا کی ساری قدریں بدل دیں۔ دنیا کے سارے ضابطے بدل دیئے۔ دنیا کے سارے طریقے بدل دیئے جب سے دنیا جی ہے اور آج تک کوئی انسان ایسا پیدا نہیں ہوا جو موت سے نہ ڈرتا ہو۔ ہر شخص موت سے ڈرا۔ یہاں تک کہ انبیاء ڈرے۔ اولیاء ڈرے۔ بڑے بڑے خدا رسیدہ ڈرے۔ بڑے بڑے جرنیل و کرنل موت سے ڈرے۔ اور جب موت حسینؑ کے لشکر میں آئی۔ تو وہ یہ سمجھ کے آئی تھی کہ جس طرح ساری دنیا مجھ سے ڈرتی ہے۔ یہ بہتر بھی ڈر جائیں گے۔ مگر موت نے آکر دیکھا کہ وہ بوڑھوں کے پاس گئی تو انہوں نے اُسے خطاب بنا لیا۔ جوانوں کے پاس گئی تو انہوں نے درست بنا لیا۔ بچوں کے پاس گئی تو انہوں سے کھیلنا شروع کر دیا۔ اتنی شرمندہ ہوئی ہے موت حسینؑ اور حسینؑ کی فوج سے کہ موت نے عہد کر لیا کہ جہاں حسینؑ ہوگا اور اُس کا نام ہوگا۔ وہاں نہیں جانا۔ ورنہ کبھی کامر جانا حسینؑ کا نام۔ اب موت نے عہد کر لیا کہ جہاں حسینؑ اور حسینؑ کا نام ہوگا وہاں نہیں جانا۔

بہر فوج آج رات حسینؑ نے سب سے پہلے مردوں کا امتحان لیا۔ تم جو میرے ساتھ آئے ہو۔ تمہارے دل میں یہ خیال تو نہیں کہ فاتح خمیر کا بیٹا آیا ہو ہے۔ میدان فتح ہوگا۔ مال غنیمت ملے گا۔

ایسا نہیں ہے۔ میں یہاں مرنے آیا ہوں۔ جو مرنا چاہتا ہو۔ وہ میرے ساتھ رہے اور دیکھو۔ مرنے کے بعد کفن نہیں ملے گا۔ مرنے کے بعد قبر نہیں ملے گی۔ مرنے کے بعد تمہاری عورتیں اور بچے تیار ہو جائیں گے۔ تمہارے گھر حلاوتیے جائیں گے۔ تمہارے خاندان نباہ ہو جائیں گے۔ ان تمام تباہیوں اور بربادیوں کو اگر منظور کرتے ہو۔ میرے ساتھ ٹھہرو، درختہ جا سکتے ہو، مگر دنیا نے دیکھا کہ اتنی تباہی کے ہوتے ہوئے ان جوانوں نے جواب کیا دیا۔

”حسین! اب تو ہم آبیٹھے ہیں۔ اب تو یہ قدم بہاں سے نہیں ہٹ سکتے“

دنیا سمجھ رہی تھی۔ کہ کہہ رہے ہیں شاید کر کے نہ دکھائیں۔ مگر اگلے دن جو صبح ہوئی۔ تو انہوں نے ایک ایک بات سچ کر کے دکھائی۔ ایک ایک بات انہوں نے سچی کر کے دکھائی۔ جو ایک دوسرے کو روک رہے تھے۔ ”تو ٹھہر بیٹھے میں جاؤں گا“

یہ تو دونوں کی شان تھی۔

حسین نے چاہا کہ چلیں جا کر دیکھیں۔ گھر میں ستورات کہا کر۔ بی بی حسین بی بی الشرف میں آئے۔ آپ نے وہاں عجیب ماجرا دیکھا۔ کہ تمام چاروں طرف خیمے ہیں۔ ان میں چراغ جلے ہوئے ہیں۔ خیمے آباد ہیں۔ عورتیں بیٹھی ہیں۔ مائیں بیٹوں کے پاس ہیں۔ بہنیں بھائیوں کے پاس ہیں۔ شوہر بیویوں کے پاس ہیں۔ عزیز عزیزوں کے پاس بیٹھے ہیں۔ گھر آباد ہیں۔ اور حسین کی نظر جو آباد گھروں پر پڑی تو سر جھٹکے کہا۔ ”خداوند! یہ سادات کا گھر ہے جو آج آباد ہے۔ آج اس میں چراغ روشن ہیں۔ آج یہ گھر لستا ہوا ہے اور اس گھر کی آبادی کی آج آخری رات ہے۔ آج حسین کا گھر آباد ہے۔ اور کل یہ گھر اس طرح آباد نہیں ہوگا۔ کل غریبوں کی رات آئے گی حسین نے وہ آباد گھر دیکھے سب سے پہلے بہن کے خیمے میں دیکھا۔ یہاں کیا ہو رہا ہے۔

موتاً نے دیکھا۔ زینب بیٹی میں۔ سامنے عولن و عمر کو بٹھایا ہوا ہے۔ لباس پہنا دیا ہے۔ تلواریں سامنے رکھی ہوئی ہیں۔ اور زینب انہیں خیر و خندق کے واقعات سن رہی ہیں۔ اور کہہ رہی ہیں۔

تمہارے نانا سید رکڑاڑیوں لڑتے تھے۔ تمہارے دادا جعفر ظیاری کی بہادری کی یہ شان تھی۔ میرے پیارے چچا تم نے میرا دودھ پیا ہے کل میدان جنگ سے تمہاری آواز نہ آئے کہ ہم علیؑ کے نواسے ہیں۔ ہم جعفر ظیاری کے پوتے ہیں۔ زینبؑ دودھ سب بخشے گی جب یہ فوجیں چلاؤ گئیں کہ یہ علیؑ کے نواسے ہیں۔ یہ جعفر ظیاری کے پوتے ہیں۔ اور بچوں نے ایک انگڑائی لے کر ان کے قدموں کی قسم کھا کے کہا۔

”اماں کل اجازت دلادے۔ اگر ان فوجوں کو کوڑے تک نہ بھگا دیں تو دودھ نہ بنشیا“
 امامؑ نے یہ عزم دیکھا۔ یہ وصلے دیکھے۔ دل بھر آیا حسینؑ کا۔ آنسو پونچھے۔ آگے بڑھے۔ اگلے خیمے میں گیا۔ دیکھا کہ جناب سہیل خیمے میں بیٹھی ہیں۔ بیٹے کا سر زانو پر رکھا ہے۔ ایک ہاتھ میں شمع روشن ہے۔ ایک ہاتھ سے بیٹے کے بالوں میں کنگھی کر رہی ہیں۔ شمع سے علیؑ کا چہرہ دیکھ ہی میں اور فرماتی ہیں۔

”میرے نعل! آج دل بھر کے مجھے اپنی زیارت کر لینے دے۔ کل یہ جانا سا چہرہ خاک اور خون میں بھر جائے گا۔“

امامؑ یہ منظر دیکھ کے آگے بڑھے اور دیکھا کہ جناب امام حسنؑ کی بیوہ نے قاسمؑ کو سامنے بٹھا رکھا ہے۔ اور کہہ رہی ہیں ”قاسم بیٹا! آج تیرا باپ حسنؑ موجود نہیں ہے۔ تو مجھے بیوہ کا نعل ہے میں غیر خاندان کی ہوں۔ سیدانی نہیں ہوں۔ میرے دودھ کی عزت رکھنا بیٹا! ایسا نہ ہو کل میرا دودھ بدنام ہو جائے“

امامؑ نے یہ منظر بھی دیکھا اور اس کے بعد امامؑ نے کیا دیکھا کہ دروازے پر بڑھیا دانی فو کھڑی ہے۔

”اماں فضہؑ سلام“

”قصہ تو رونے لگی۔“

”اماں فضہؑ! روتی کیوں ہو“

”حسین خیمے میں جس جس کا بیٹا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو تیار کر رہا ہے۔ اگر آج میرا بھی کوئی بیٹا ہوتا تو میں بھی تیار کرتی۔“

یہ سنا تھا کہ حسینؑ تو بے چین ہو گئے۔ فرماتے کیا ہیں۔

”اماں! فضہ یہ تو نے کیا کہہ دیا۔ کل سب میدان میں زینبؑ عوفؑ و محمدؑ کو بھیجے، لیسے علی اکبرؑ کو بھیجے۔ قاسمؑ کی ماں قاسمؑ کو بھیجے۔ علی اصغرؑ کی والدہ علی اصغرؑ کو بھیجے تو تو مجھے اپنا بیٹا کہہ کے بھیج دینا حسینؑ کی قربانی تیری طرف سے ہوگی۔

اماں نے یہ سن کر بھی دیکھا پھر تھوڑی دیر کے بعد اماں کو ایک کونے سے رونے کی آواز آئی حسینؑ نے کہا۔

”یہ کون رو رہا ہے؟“

جا کے دیکھتے کیا ہیں کہ چھہہینے والے کے گہوارے پر سر رکھے ہوئے اُس کی ماں ”رباب“ رو رہی ہے۔ اماں قریب جا کے کھڑے ہوئے۔

”رباب! کیا بات ہے؟ کیا بچہ ختم ہو گیا؟“

”نہیں مولا! ابھی زندہ ہے۔“

”پھر رو کیوں رہی ہو رباب!“

”تمہارا اپنی قسمت کو رو رہی ہوں۔“ حضورؐ دیکھ رہے ہیں کہ زینبؑ عوفؑ و محمدؑ کو تیار کر

رہی ہیں۔ علیؑ علی اکبرؑ کو تیار کر رہی ہیں۔ قاسمؑ کی ماں قاسمؑ کو تیار کر رہی ہیں۔ کل سب یہ قربانیاں

پیش کر رہی گی۔ اور آپؐ کی ماں فاطمہؑ کے دربار میں سرخرو ہو کے جائیں گی۔ میں بد نصیب ہوں۔

میرا بچہ اتنا چھوٹا ہے کہ میں اسے میدان میں نہیں بھیج سکتی۔ یہ سب قربانیاں والی سرخرو ہوں گی، میں شرمندہ ہوں۔

دوسری بات مجھے یہ رولا رہی ہے کہ آپؐ ہی نے فرمایا تھا۔ کہ آپؐ کی شہادت کے بعد

ہمارے ہاتھ بندھ جائیں گے۔ تو بچے کو سنبھالے گا کون۔ میں گھبرا رہی ہوں۔ یونہی تو تڑپ کے

مرہی جانے گا۔ کاشش! یہ دو سال کا ہونا۔ تو اسے گھٹنوں چلا کر میدان میں لے جاتی۔ میں بڑی عبور ہوں۔“

امام نے رباب کی جو یہ گفتگو سنی۔ تو فرمایا ”رباب! خدا کی رحمت سے ماہوس نہ ہو۔ میں حسینؑ تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ کل تیرے اصغرؑ کو اکبرؑ سے نہ بڑھا دوں تو حسینؑ نہ کہنا۔ ذرا گل ہونے دے۔ دیکھنا تو سہی گل بنا کیا ہے۔ اسے ایسا سیراب کروں گا کہ قیامت تک اس کی پیاس کی یاد نہ کروڑوں سبیلیں لگ جائیں گی۔ یہ فرات کی شے ہے اتنی سبیلیں لگ جائیں گی کہ اگر ساری سبیلوں کے پانی اکٹھے ہو جائیں۔ تو ہزار فرات بن جائیں گے اس کی یاد میں۔“

پھر نوع یوم عاشور حسینؑ رباب کے پاس آئے اور فرماتے لگے۔

”رباب! میں اصغرؑ کو لے جاؤں۔“

رباب خوش ہو گئیں۔ ”مولاً! بے شک لے جائیں۔ میں تو اسی انتظار میں تھی۔“

رباب نے بچہ حسینؑ کی گود میں دے دیا۔ امامؑ لے کے چلے۔ ابھی دس قدم چلے ہوں گے کہ رباب سامنے آگئی۔

”مولاً! ذرا اس بچے کو میری گود میں دے دو۔“

”کیوں رباب! دل نہیں چاہتا بھیجئے کو۔“

رباب گھبرا گئی۔

”نہیں قبلہ! تھوڑی دیر کے لئے چاہتی ہوں۔“ رباب نے بچے کو گود میں لیا لے کے

اپنے خیمے میں گئی۔ اور امامؑ انتظار میں صحن میں کھڑے ہیں۔ بہن بھی ساتھ کھڑی ہیں۔ رباب

پانچ منٹ کے بعد خیمے سے باہر آئی۔ تو بچے کی شکل کیا تھی کہ نیا کرنا پہنا دیا تھا۔ بال درست

کر دیئے تھے۔ آنکھوں میں سرمہ لگا دیا تھا۔ کمرے کی آئینہیں الٹ دی تھیں۔ اور بچے کی مکر

ایک رُو مال سے باندھ دی تھی۔ رباب اس شان سے لائی اصغرؑ کو۔

”حسین! اب لے جاؤ میدان میں۔ پتھر ہے تو کیا ہوا۔ ہے تو شیر خدا کا پوتا۔ میں اسے
سپاہی بنا کے لائی ہوں۔ بیٹا علی اصغر جاؤ سپاہی بن کے“

اب جو امام نے یہ منظر دیکھا تو حسین جیسا صابر انسان کا دل بھی بھرا آیا۔ لے لیا گود میں۔
اور میدان کی طرف چلنے لگے۔ رباب بھرا گئی۔

”کیوں رباب! کچھ کہنا ہے“

جی ہاں! قسم! میں اپنے نچکے سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ آواز دی ”اصغر بیٹا“

اور نچکے نے آنکھ کھولی۔ ماں کی طرف دیکھا۔ اور ماں کہتی کیا ہے۔

”اصغر بیٹا! تم میدان میں جا رہے ہو۔ تم باپ کی گود میں ہو۔ مجھے پتہ ہے کہ تم دس

منٹ بعد اپنی دادی کی گود میں پہنچ جاؤ گے۔ تمہاری بی بی اتون جنت ہیں۔ تم ان کی
گود میں جاؤ گے۔ جا کے اماں کا سلام کہنا۔ اور اگر دادی کے پاس سے گھر کے نہیں

بھیجا۔ تو ماں کی شکایت نہ کرنا بیٹے! کہہ دینا۔ اماں کو پانی نہ۔ یہ ہوا۔ اور دوسری

بات یہ سُن میرے لعل! تمہارے دادا ساقی کو تر ہیں۔ تم باقی کو تر کے پونے ہو تمہارے

دادا تمہیں گود میں لے کے کو تر یہ جائیں گے۔ اور ماں کی یہ بات یاد رکھنا کہ

کو تر پہ پہنچ کر سبھی حسین سے پہلے پانی نہ پینا۔ اور ایک تیسری وصیت اور ہے۔ اصغر بیٹا!

وہ بھی یاد رکھنا کہ مجھے پتہ ہے میدان جنگ میں تمہارے تیر لگے گا تم تیر سے شہید ہو گے۔ میں

یہیں دروازے پہ کھڑی دیکھ رہی ہوں گی۔ جب تیر لگے تمہارے آکر تو رونامت

تمہاری چھ جھینے کی جان ہے۔ شاید رونانا آ جائے۔ اصغر بیٹا! رونامت۔ دشمن کی فوجیں

سلاسنے کھڑی ہیں۔ اگر تم تیر کھا کے روڈ گے تو دشمن یہ کہہ کے تمہیں گے کہ حسین کا بیٹا تو کبھی

نہ روتا۔ یہ رباب کے دودھ کی خرابی ہے۔ تیر سے رونے سے تیری ماں کا دودھ بدنام ہو گا۔

میرے لعل! میں تو جب جانوں جب تیر لگے اصغر ہنس دینا۔ جاؤ خدا حافظ“

اور حسین لے کے میدان میں آ گئے۔

حسین نے اصغرؑ کو ہاتھوں پہ اٹھایا۔

”مسلمانو! اس بچے کو ایک گھونٹ پانی دے دو“

”اصغر بیٹا! میرے کہنے پر یہ پانی نہیں دیتے۔ تم خود ان سے پانی مانگ لو۔ اور بچے نے ہونٹوں پر زبان پھرنا شروع کی۔ اُدھر بچے کی زبان ہونٹوں پر آئی ادھر پوری فوج منہ پھیر کے رونے لگی۔

اب جو عمر سعور نے فوج کا یہ نقشہ دیکھا تو اُس نے مڑلہ کو بلایا۔

”مڑلہ! تو بڑا تیر انداز ہے۔ سارا معاملہ اُلٹ پلٹ ہو جائے گا۔ جلدی سے حسینؑ کے

کلام کو قطع کر دے۔ اِس بچے کو ختم کر دے“

مڑلہ نے بچے کی طرف دیکھا۔ اپنے بازوؤں کی طاقت کو دیکھا عرب کا مانا ہوا تیر انداز،

لوہے کا تیر جس کا وزن بچے کے وزن سے زیادہ تھا؛ کمان میں تیر جو بڑا، ایک گھٹنا زمین پر

رکھا۔ کمان کو پوری طرح کھینچا تیر چلانے کا ارادہ کیا۔ اُدھر اصغرؑ کی طرف اشارہ کر کے

تیر چلانے کا ارادہ کیا۔ دھرا باقہ ہقراٹے اور تیر کمان باقہ سے گر گیا۔ تھوڑی

دیر کے بعد پھر تیر لگایا۔ پھر کھینچا چاہا تیر پھینکے۔ باقہ ہقراٹے تیر کمان

گر گیا باقہ سے۔ جب دو دفعہ یہی ہوا تو سنان ابن انس نامی ایک شخص پاس

کھڑا تھا وہ کہتا ہے۔

”مڑلہ! تو تو بڑا بہادر تیر انداز تھا۔ کیا اس بچے سے ڈر گیا۔ تیر کیوں

نہیں چلتا“

تو مڑلہ جواب میں کہتا ہے۔

”بچے سے نہیں ڈر گیا۔ جب میں تیر چھوڑتا ہوں تو حسینؑ کے خمیے کا پردہ

پٹنے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ اس بچے کی ماں کھڑی ہے دروازے پر۔

میزا دلِ دہل جاتا ہے۔ میرے باقہ سے تیر کمان چھٹ جاتا ہے“

اب کے بوتیری مرتبہ اُس نے تیر جوڑا تو ستان نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا اور
کے — اُس نے تیر چلا دیا۔

ادھر سے تیر چلا۔ ادھر سے باب نے ذرا پردہ ہٹا کے دیکھا۔
باب کو چونکہ اُس کے باپ نے بچپن میں مشق کرائی تھی تیر چلانے کی۔ وہ خوب
واقف تھی تیر کے انداز سے — تیر کو آتا دیکھ کر باب نے کہا۔
”علی اصغر بیٹا! بشیار“

اصغر بیٹا! خبر دار۔

تیر کا رخ یہ ہے کہ اگر تم آرام سے لیٹے رہو گے باپ کی گود میں تو تیر تمہارے اوپر
سے ہو کر حسین کو لگے گا۔ دیکھنا حسین کو تیر نہ لگنے دینا میرے لعل“

پس ماں کا یہ کہنا تھا کہ —

بچہ یا لیٹا تھا، یا اٹھ کے بیٹھ گیا۔ اُس کا اٹھنا تھا کہ تیر گلے میں لگا۔ ادھر گلے
میں تیر لگا۔ ادھر نچنے نے سینے کی طرف ہنس کے دیکھا — مطلب یہ تھا

”اماں! دیکھ لے، میں ہنس رہا ہوں، اماں! میں تیری بات کو پورا کر رہا ہوں“

اور پھر حسین کی طرف نچنے نے دیکھا — حسین کی طرف دیکھنے کا مطلب یہ تھا
”بابا بس! یا کوئی اور حکم ہے میرے لئے“

اماں نے اصغر کو کلیجے سے لگا لیا۔

چاہا گلے سے تیر کھینچے۔ پھر تڑپ گیا۔ پھر تیر کھینچنا چاہا پھر تڑپ گیا۔ حسین
نے زمین پر ٹا دیا اصغر کو۔ اور نچنے سے کہتے ہیں۔

”تم شیر خدا کے پوتے ہو۔ عباس جیسے جبری کے بھتیجے ہو۔ اکبر جیسے بہادر کے
بھائی ہو۔ حسین جیسے صابر کے بیٹے ہو۔

بیٹا! میں تیر کھینچنا چاہتا ہوں۔ میں تو جب ہاتھوں تم سے لپکتا ہوں۔ — یہ جو

ہا امام نے تو بچے بالکل خاموش ہو گیا۔ مگر ادھر گلے سے تیر نکلا اُدھر دم نکل گیا۔ اور امام نے لاشہ کلیجے سے نکال لیا۔ اب گھر میں کیسے لے جائیں۔ رُباب کو کیا جانے دکھائیں۔

سامعین کرام! ستوار سے قبر کھودی۔ بچے کو دفن کیا۔ حسین اپنے دامن کو جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور سکینہؓ جو بچی کھڑی تھی دروازے پر آکے کہتی ہے۔

”اماں! علی اَصغر ختم ہو گئے۔“

ماں کہتی ہے ”تم کیسے سمجھی“

کہ ”بابا جب گئے تھے تو ہاتھ سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ اور آئے ہیں۔ تو ہاتھ کھلے ہیں۔“

اور بزرگو! یہ میرے آخری فقرے ہیں کہ۔ مولائے علی اَصغر کی قبر اس طرح بنائی تھی۔ کہ ایک طرف علی اکبر کی لاش، ایک طرف علی قاسم کی لاش اور بیچ میں اَصغر کی قبر۔ اور جب گیارہ محرم کو اسیران آئی تھو روانہ ہوئے ہیں۔ کہ بلا سے قید ہو کر اور مستورات اپنے دارتوں کی لاشوں سے گذری ہیں۔ تو رُباب وہاں آکے اُتری۔ رُباب نے اَصغر کی قبر دیکھی۔ اور کچھ نہ کہا سوائے اس کے کہ

ایک ہاتھ اکبر کا اَصغر کی قبر پر رکھ دیا۔ ایک ہاتھ قاسم کا اَصغر کی قبر پر رکھ دیا۔ اور اتنا کہا۔ ”دیکھو! تم دونوں بڑے بھائی ہو۔ چھوٹے بھائی سے ہوشیار رہنا۔ ڈراؤنا جنگل ہے کہیں ڈرنے جائے۔“

اَصغر بیٹا! گھبرا نہ جانا۔ باپ کی لاش بھی قریب ہے۔ بھائی بھی قریب ہیں۔“

اِنَّ اللّٰهَ وَاٰتٰى السَّيِّدِ الرَّاجِعُوْنَ و

نقصان اٹھانا ہے

زمانے کی گردشیں اس بات کی شاہد ہیں کہ انسان بڑا نقصان اٹھاتا ہے۔ ذرا سی غلطی انسان کو اتنے بڑے نقصان میں پہنچا دیتی ہے کہ پھر اس نقصان کا کوئی دوا نہ کر سکتا ہی نہیں۔ مگر نقصان سے وہ لوگ بچ جائیں گے اللہ کے فرمان کے مطابق جو وہ انا الذین امنوا۔ درجن لوگوں میں ایمان ہو گا۔ جو صاحبِ ایمان ہیں۔۔۔۔۔۔ وہ نقصان نہیں اٹھائیں گے۔ وہ ہمیشہ نفع میں رہتے ہیں۔ اس ظاہری دنیاوی نفع و نقصان کو تو صاحبِ ایمان نقصان ہی نہیں سمجھتے آئندہ زندگی کے نفع پر ان کی نظر ہوتی ہے، اور وہ دنیا کے نقصان سے محفوظ رہتے ہیں جو صاحبِ ایمان ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ اللہ کا فرمان ہے۔ اسی فرمان کے ساتھ قرآن مجید کی یہ آیت بھی شامل کریں۔

”لوگ دل میں یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ کہہ دیں زبان سے وہ مومن ہیں، بس وہ مومن ہو گئے۔؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔ صرف مومن کہتے سے وہ مومن نہیں بن سکتے۔ بلکہ ان کے ایمان کا امتحان لیا جائے گا۔ امتحان میں ان کو دیکھا جائے گا کہ وہ مومن ہیں کہ نہیں۔۔۔۔۔۔ تو آج کی شب اہل ایمان کے امتحان کی شب ہے۔ آج اہل ایمان کا امتحان ہو رہا ہے۔ آج ان کے امتحان کی رات ہے۔ کل تو وہ آجائیں گے میدان میں۔ امتحان ان کا آج کی رات ہے کہ آج وہ اپنے لئے کیا فیصلہ کرتے ہیں وہ اپنے لئے کیا سوچتے ہیں۔ آج کی رات ان کے امتحان کی رات ہے۔

بزرگانِ مینا تاریخِ عالم کا یہ پہلا واقعہ ہے کہ کسی سردار نے، کسی بادشاہ نے عین لڑائی کے وقت، عین میدانِ جنگ میں جب کہ لڑائی سر پر ہو۔ میدانِ جنگ میں اپنے پیادوں سے یہ کہا ہو کہ ”تم چا سکتے ہو۔۔۔۔۔۔ یہ بے مثلِ شمال صرف کر بلا کے ہی بے مثلِ واقعہ میں لے گی کہ آج جب یقین ہو گیا کہ کل جنگ لازماً ہوگی۔ اور جنگ کا حال معلوم ہے کہ بہتر بھوکے پیاسے یقیناً قتل ہو جائیں گے۔ قتل ہونے کے بعد وہ ویرانی و بربادی جو ان کے قتل کے بعد ہے وہ سب نظر سے ہی محض اور جو اصحابِ قتل ہوں گے ان کی عورتیں بھی بھی ہیں، ان کے بچے بھی ہیں۔

انہیں محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارے قتل کے بعد ہماری عورتوں کے ہاتھ بندھ جائیں گے۔ ہمارے یتیم بچوں کے گلے بندھ جائیں گے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے جس قوم سے ہمارا واسطہ ہے، وہ ہماری لاشوں کو دفن نہیں کریں گے۔ یہ تمام چیزیں آج ان کے سامنے ہیں۔ ان تمام حالات کے ساتھ آج ان کا سردار ان سے ایک انوکھی بات کہہ رہا ہے۔ یہ ان کے ایمان کا امتحان ہو رہا ہے۔ شام کا وقت ہے، بہن نے بھائی سے پوچھ لیا، ”جیٹا! گھوڑوں کے ٹاپوں کی برابر آوازیں آرہی ہیں، معلوم ہوتا ہے، سیکڑوں سوار چلے آ رہے ہیں۔ کیا یہ ہماری طرف آ رہے ہیں؟“ جیٹا نے کہا، ”نہیں بہن! یہ دشمن کی فوج ہے، زینب نے آسمان کو دیکھا، زمین کو دیکھا۔“

”یا اللہ! اس بھری دنیا میں کوئی ہے جو مجھ کے نواسے کی مدد کو آئے؟“

امام زینب کو تسلی دیتے ہیں، ”بہن نہ کہہ کر، میرے ساتھی بھی ہیں، رات ہوئی، غناہ کی ناز سے نارغ ہوئے، آپ نے اپنے چھوٹے بھائی، قمر بنی ہاشم، جناب عباسؓ کو بلا لیا۔“

”عباسؓ! تم میری چھوٹی سی فوج کے سپہ سالار ہو، تم مجھے گن کے بتاؤ کہ اس وقت کتنے سپاہی میری فوج میں موجود ہیں؟“

قمر بنی ہاشم نے گن کے بتایا۔ ”ایک۔ دو۔ تین۔“

”محضو! میں نے گن لے، اکہتر سپاہی ہیں؟“

آپ نے فرمایا، ”بھائی، ایک دفعہ پھر گن، دوبارہ گنا۔“

”ذلیل! میں نے گن لیا۔ اکہتر ہیں مگر میرے؟“

آپ نے فرمایا، ”بھائی، ایک دفعہ پھر گن،“

اب قمر بنی ہاشم سمجھ گئے۔ ضرور گنتی میں کوئی غلطی ہے، جب کہ امامؓ بار بار فرما رہے ہیں۔

اب کے بڑی احتیاط سے گنا۔ جب گنتے گنتے ستر کے قریب پہنچے تو جیسے کاپرہہ اٹھا اتنا فنسہ

برآمد ہوئیں اور سفید رومال میں لپیٹی ہوئی ایک چھوٹی سی شے لاکر سامنے رکھی، اور کہا، ”عباسؓ!

یہ تو گنتی میں رہ گیا تھا۔ اب تیری فوج مکمل ہو گئی؟“

عباسؑ نے بچے کو اٹھا کے کبھی سے لگایا۔ چھ مہینے کا ہے تو کیا ہے، بے توجہ دیکھ کر آرا کا پوتا — اصغرؑ یہی ہے گا اور بچے نے آنکھیں کھول کے چچا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لیں۔ بول تو سکتا نہیں، آنکھوں سے کہہ رہا تھا

در چچا جان! کل وہ جہاد کروں گا کہ دنیا یاد رکھنے گی قیامت تک کہ علیؑ کا پوتا کس طرح جہاد کرتا ہے۔

بہر نوح بچے کو اندر بھیج دیا۔ ماں نے اُسے گہوارے میں لٹا دیا۔ باقی بچے عثمانؑ کی نماز سے نازع ہو کر خیموں میں گئے۔ ماں نے اپنے بچوں کو گل کے لئے لباس پہنائے — اور زینبؑ نے عوان و محمد کو سامنے بٹھا کے کہا

”بیٹو! تمہیں معلوم ہے کہ تم جعفرؑ طیار کے پوتے ہو، جہد کر کے نواسے ہو اور دیکھو نا، کل میدان جنگ میں تم نے پہلی دفعہ جانا ہے — تمہارے بچپن سے، نا تجربہ کاری سے میں ڈر رہی ہوں۔ میں جب جانوں کہ تم اپنی زبان سے نہ کہو کہ ہم علیؑ کے نواسے ہیں، جعفرؑ طیار کے پوتے ہیں۔ میں دروازے پہ کھڑی ہوں گی۔ میں جب خوش ہوں گی جب فوجیں چلا اٹھیں، یہی تمہاری نواسی ہیں۔ یہ جعفرؑ طیار کے پوتے ہیں۔ زینبؑ یہ کہہ رہی تھیں — اور قاسمؑ کی ماں قاسمؑ سے کہہ رہی تھی، ”ٹھیا! آج تیرا باپ حسنؑ زندہ نہیں ہے۔ اگر وہ جتنا تو مجھے کچھ نہ کہتا پڑتا میں تیری بیوہ ماں ہوں۔ میرا کوئی ذرہ نہیں، میرا کوئی سہارا نہیں۔ میں بیوہ ماں تجھ سے کہتی ہوں —“ کل میرا نام روشن کرنا بیٹے! دنیا یہ نہ کہدے کہ ماں کے دودھ کی خرابی تھی۔ اپنی ماں کے دودھ کی عزت رکھنا میرے لعل! — علیؑ اکبرؑ سے بات کر رہی ہے — ایک ایک نانون اپنے اپنے عزیز سے گفتگو کر رہی ہے۔

امامؑ نے دیکھا یہ منظر — آکے صند پہ بیٹھے — حکم دیا — ”بھائی عباسؑ! میرے تمام سپاہیوں کو میرے گرد اکٹھا کرو۔ میں ان سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

حکم کی دیر متی کہ امامؑ کے گرد بہتر سپاہی آکے بیٹھ گئے — ان میں ۱۲۰ برس کا بوڑھا بھی

کہہ دینا کہ تریب کا پردہ بچانے چلے آئے تھے۔ بی کی بیبیوں کو نرنے سے نکال کے لے آئے تھے۔
لوگ خاموش ہو جاہیں گے!

وہ لوگ پھر بھی خاموش رہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا
دریں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ آنکھ میں شرم ہے اس شرم کی وجہ سے تم نہیں جانتے۔
اکبر ٹپٹیا! ذرا چرائے گلی کر دو!
چرائے گلی ہو گیا۔ پھر امام نے فرمایا
درا ب اندھیرا ہے، میں تمہیں نہیں دیکھ سکتا۔ تم جاکتے ہو جس نے جانا ہو۔ میری طرف
سے اجازت ہے!

اب اندھیرے میں آوازیں تو آرہی ہیں۔ پتہ نہیں چل رہا کہ کیا ہو رہا ہے۔ جب پندہ
بین دست کے بعد آپ نے حکم دیا کہ درچرائے دوبارہ روشن کیا جائے!
اب جو چرائے دوبارہ روشن ہوا تو امام نے دیکھا کہ اتنے میں یہ فرق آگیا تھا کہ جینے
جو ان تھے انہوں نے گونٹیاں لگا کے تلواروں کے نیام توڑ دیئے تھے۔ جو بڑھے تھے انہوں
نے گپڑیاں انا کے کمر سے باندھ لیں تھیں کہ کمر سیدھی ہو جائے۔ جو چھوٹے بچے تھے وہ اٹریاں
اٹھا کے کھڑے ہو گئے کہ جو ان نظر آنے لگیں۔ یہ فرق ہو گیا تھا۔
جینے نے جو ان کی یہ ادا دیکھی تو بے ساختہ منہ سے نکل گیا۔

”میرے جیسے عزیز، میرے جیسے رفیق تو آدم سے آج تک کسی کو نہیں ملے۔ تمہارا
نہیں ارادہ جانے کا۔“

اب جو مولانے فرمایا تو ان کا بیٹا صبر بھی لہریز ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے مسلم موسیٰ
آئے۔ بوڑھے آدمی تھے۔ علی کے ساتھ رہ چکے تھے۔ رسول کو دیکھ چکے تھے۔ کھڑے ہوئے
تلوار ٹیک کر۔ بدن میں تھوڑا سا لرزا بھی تھا۔ کہتے گئے۔

”دھین! میں نے تیرے نانا کو دیکھا ہے۔ میں تیرے بابا کے ساتھ رہا ہوں۔ تیرے

دوسری مرتبہ اور بلند آواز سے کہا دریا بنا رسول اللہ! پھر خاموش ہو گئے۔ پھر تیسری مرتبہ کہا در میرے سردار!... پھر خاموش ہو گئے۔ اور خاموش ہو کے ایک دم مڑ گئے نجف کی طرف اور بجائے حسین سے کچھ کہتے — کہتے لگے۔

دریا علیٰ مدد! یا علیٰ! حسینؑ جانے کو کہہ رہے ہیں کیا جواب دوں —؟

امامؑ کو پیار آگیا۔ اٹھ کے ایک ایک کے گلے ملے۔ ایک ایک کی پشیمانی چومی۔

دریں دم سے بڑا غوش ہوں۔ میں تمہارا بڑا احسان مند ہوں۔ میں تمہارا بڑا شکر گزار ہوں۔

جاؤ۔ اپنے اپنے خیمے میں بیٹھ کر کل کے مرنے کی تیاری کرو۔ مگر ایک کام کرنا۔ اپنے خیمے اکھاڑو۔

جہاں جہاں نصب ہیں۔ اور سیدائینوں کے خیموں کے چاروں طرف لگا دو۔ تاکہ اگر رات کی

تاریکی میں اس بے حیا فوج نے اچانک حملہ کر دیا تو سادات کی حفاظت ہو سکے۔

نے ایک دم اپنے خیمے سادات کے چاروں طرف لگا دیے۔ طنابوں سے طنابیں

باندھ لیں۔ اور اس کے بعد امامؑ بیت الشرف میں تشریف لائے۔

حسینؑ جو گھر میں آئے۔ بہن کھڑی تھی۔ زینبؑ پوچھتی ہیں: حسینؑ! میں ساری تقریریں تمہاری

کے پیچھے کھڑی سُن رہی تھی۔ میں نے تیرے دو دستوں کی ساری باتیں سُنی ہیں۔ میں نے بال کھول

کے ان کے لئے دعا کی ہے۔

در حسینؑ! یہ نالمان میں سے کوئی اب چھوڑ کے چلا تو نہیں جائے گا۔ اب ان پر ہے نا

پورا اعتماد!

اب زینبؑ نے جو پوچھا کہ: "اعتماد ہے؟" کوئی جائے گا تو نہیں؟

یہ سوال جو بی بی نے کیا تو بردے کے بالکل پیچھے پہرہ دار کے طور پر حضرت بربر ہمدانی

کھڑے تھے انہوں نے سُن لیا کہ زینبؑ نے یہ پوچھا ہے — رات کا وقت — انہوں

نے ایک دم گھبرا کے کہا۔

و در حسینؑ! زینبؑ! "جلدی آؤ" "نورا" دوڑو! اب جو انہوں نے آواز دے

گھبرا کے تو سب کے سب دوڑتے ہوئے آگے۔ زبیر نے پوچھا ”تو زبیریت تو ہے۔“
 ”خیریت بالکل نہیں، ابھی زینب کو ہماری وفات کا یقین نہیں آیا۔ جیسے میں بعد میں جانا۔“
 پہلے زینب کو یقین دلا کے جاؤ۔

سب تلواریں نیام سے نکل آئیں اور جیسے کے عمن میں آئے
 ”بی بی! اپنے ہاتھ سے سرکاٹ دے اب یہ واپس نہیں جائیں گے اور اتنا اعتماد تھا
 زینب کو اصحاب کی وفات کا کہ عاشور کی شام کو جب تھیمے جلنے لگے تو زینب نے حسین کو نہیں پکارا۔
 عباس کو نہیں پکارا۔ وہاں بھی کھڑے ہو کر زینب نے آواز دی تھی
 ”عجائی حبیب! آؤ نا۔ دیکھو ہم پہ کیا گذر رہی ہے۔“
 بہر نوع تمام اصحاب حسین جا کے اپنے اپنے خیموں میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے وہاں
 قرآن پڑھا شروع کر دیا۔ کوئی قرآن پڑھنے لگا۔ کوئی مناجات پڑھنے لگا۔ کوئی دعائیں پڑھنے لگا۔
 کل کے مرنے کی تیاری ہونے لگی۔

امام زین العابدینؑ بیماری کے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ غشی کا عالم تھا۔ ایک دم غش سے
 آفاقہ ہوا، آنکھ کھلی۔ جو خاتون بیمار دار تھی اس سے پوچھا
 ”یہ آواز کی کسی آرہی ہیں؟“

اس بی بی نے کہا
 ”اصحاب کے خیمے میدانوں کے خیموں کے چاروں طرف لگ گئے ہیں۔ وہ عبادت کر رہے ہیں۔“
 ان کی عبادت کی آوازیں آرہی ہیں۔“

”اچھا یہ بات ہے۔ میرے بابا! کہاں ہیں؟“
 خاتون بولی ”وہ باہر جائے نماز پہ بیٹھے ہیں۔“

امام زین العابدینؑ نے فرمایا
 ”مذہب میرے بابا کو میرا سلام کہو۔ اور کہو کہ بیمار ٹھیک کچھ کہنا چاہتا ہے۔“

”اُمّ تشریف لائے۔ امام زین العابدینؑ تعظیم کو اُٹھے۔ حسین نے بٹھا دیا۔ نبض دیکھی۔
 ”بٹیا! بچا کا کیا حال ہے۔ طبیعت کیسی ہے۔ جلدی جلدی اچھے ہو جاؤ بٹیا! بڑا کام کر رہے ہے۔
 بٹیا! جلدی تندرست ہو جاؤ تمہارے ذمے بڑا کام ہے“
 امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں۔

”بابا جان! میں نے اس لئے آپ کو تکلیف دی ہے۔ یہ جو ہمارے اصحابؑ ہیں۔ یہ جو
 حضورؐ کے دوست ہیں۔ یہ ہمارے محسن ہیں۔ میں ان کا احسان مند ہوں۔ ا۔ بابا! ان کی آخری
 خدمت میں کروں گا۔ میرے ذمے ہے اور بابا! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں ان میں سے ایک
 ایک کی قبر پہ کھڑے ہو کر میں کہوں گا کہ ”میرے ماں باپ تجھ پہ قربان ہوں۔ اتنی عزت ہے
 ان کی میرے دل میں۔“ مگر اس عزت کے باوجود یہ ہیں تو غیر۔ ان کی آوازیں
 ہمارے زمانے خیمے میں آ رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے ہماری عورتوں کی آوازیں وہاں جا رہی ہوں۔
 کیا ان کے خیمے ذرا ٹھٹھے پر نہیں ہو سکتے تاکہ ہماری عورتوں کی آوازیں نہ جائیں وہاں تک۔“
 امام زین العابدینؑ کا یہ کہنا تھا کہ حسینؑ یا بیٹے تھے یا کھڑے ہو گئے۔ پھر بیٹے گئے۔
 پھر کھڑے ہوئے۔ پھر بیٹے۔ اور کہنے لگے

”بٹیا زین العابدینؑ! آج کی رات تو بونہی رہنے دو۔ کل کی رات جو آئے گی تم جانو اور
 پردہ جانتے۔“

”انا لله وانا الیہ راجعون“

جس اُمت میں آدمؑ، لوح اور ابراہیمؑ جیسے پیغمبر

مومنین ہوں۔

ان مومنین کا۔ امیر المومنینؑ کون ہوگا؟

بہار ۳

فاطمہ کا چاند

گر بلا میں قیامت خیز منظر، آسمان سے آگ برتی ہوئی زمین کے زلزلے تپتے تپتے ہوئے، تمام
 مہلے کر بلا بے گناہوں کی لاشوں سے بھرا ہوا، جو محض دینِ الہی کی حفاظت کیلئے اپنی جان اور اپنی
 زندگیاں قربان کر کے، ریت گرم کر لپیٹے ہوئے، آفتاب نصف النہار پر ٹھہرا ہوا، فاطمہؑ چاند
 چہرے پر کر بلا کی گرد، دل میں عزیزوں کے درد، سینے سے بے شیر کلاشر لگائے ہوئے، سر
 جھکائے ہوئے خیمے کے دروازے پر کھڑا ہے اور دردناک آواز میں کہہ رہا ہے

”زینب! کون تم! رقیہ! اماں! نہ! انہم سب پر میرا آخری سلام“

خواتین دروازے کے قریب آئیں، اماں کے گرد حلقہ کر لیا، سیکڑے نے مابا کا دامن پکڑ لیا، زینب
 سامنے بیٹھ گئیں، بائیں ایک طرف خاموش کھڑی ہو گئیں۔ رباب دم بخوردی، خیمے پر اُداسی چٹائی ہوئی
 ہے، علم فوج سرنگوں ہو چکا ہے، عباس کے یتیم بچے حسین کی مابا کا دامن پکڑے ہوئے بوجھ سے ہیں
 ”ہمارے بابا کفر کر آئیں گے۔“ اصحاب کے یتیم بچے، ان کی بیوہ عزیزیں، حسین کے چاروں طرف
 بیٹھی کہہ رہی ہیں

دردِ ساری فریبانیاں منظور ہیں۔ اور حسین کہہ رہے ہیں دوزینب! بہن! اگر قیامت
 تک میں زندہ رہوں، ایک روز جدائی ضروری ہے۔ آج تمہارا بھائی حسین تم سے جدا ہو کے رخصت
 ہو رہا ہے، زینب! مجھے گلے مل کے رخصت کرو۔ دعا کرو۔ خدا مجھے اتنی طاقت دے کہ میں اس
 قربانی کو، اس مقصد کو جس مقصد کے لئے مجھے میری ماں نے چکی میں کر پلا تھا، میرے نان آنے
 کا ذمے پر سوار کیا تھا، میرے باپ نے سینے پر سٹلایا تھا، آج اس مقصد کے پورا کرنے کیلئے خدا ترین ہے

زینب! دعا کرو۔ قاتل کے خنجر کے نیچے میں گھرا نہ جاؤں، بلکہ
سے صلق پر تیغ رہے، سینے پہ جلا دو رہے،
لب پہ ہونام تیرا، دل میں تیری یاد رہے

اللہ کی طرف تعلق رہے، خدا سے میرا واسطہ رہے،

خدا حافظ ہیں! میں جا رہا ہوں، سکینے نے دامن پکڑ لیا۔

» بابا! آپ اس طرف جا رہے ہیں جہاں صبح سے جو گیا وہ واپس نہیں آیا۔ آج رات کو

اگر آپ واپس نہ آئے، تو

! ابا جان! سکینہ کس کے پاس سوئے گی؟

» بیٹیا! تم آج رات اپنی اماں کے پاس سونا۔

» ابا! اماں کے پاس تو چھوٹے بھائی علی اصغر سوتے ہیں۔ میں کیسے سوؤں گی۔

» نہیں میرے لعل۔ آج سے اصغر میرے پاس سویا کرے گا۔ تم اماں کے پاس سویا کرنا۔

اور دیکھنا بیٹیا! خدا نہ کرنا۔ بیمار بھائی کے ہاتھ بندھے ہوں گے۔ پھوپھیاں مجبور ہوں گی۔ زمین پر

آرام سے سو جایا کرنا۔

خدا حافظ ہیں! اب میں جا رہا ہوں۔ اللہ تمہارا نگہبان ہو گا۔ خدا تمہارا محافظ ہو گا۔

دیکھنا بہن! غصے میں نہ آنا۔ ہر مصیبت کو آرام سے برداشت کرنا۔ اُمت کے حق میں

ہر وقت دعا کرنا۔ خداوند عالم ہماری اس قربانی سے دین کی خدمت لے رہا ہے۔ اسلام زندہ رہے،

اللہ کا نام زندہ رہے، ہمارے نانا کا دین زندہ رہے۔

زینب! تیری چادر کے زیر سایہ اگر دین کی زندگی ہے تو چادر قربان کر دینے میں

دریغ نہ کرنا۔

ہیں خدا حافظ! ابی امان اللہ! اب میں جا رہا ہوں، اب اللہ! اللہ زینب! قیامت میں طوں گا،

ویسے نیزے پہ سوار ہو کے ہر وقت زینب! تیرے ساتھ رہوں گا۔

سے شبیر برآمد ہوئے یوں خیمے کے در سے
جس طرح نکتا ہے جازہ کسی گھر سے،

آج حسین نے دنیا سے اپنے تعلق کو منقطع کر دیا ہے۔ سو فیصدی اپنے اللہ کی طرف متوجہ ہے
آج حسین اور خدا کے درمیان کوئی شے حائل نہیں بنانی کو اپنے اس بندے پر ناز ہے، اللہ
اپنی صنعت کے اس شاہکار کو دیکھ کر فخر یہ فرشتوں سے کہتا ہے اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔
میں جانتا ہوں، انسان کے وہ جوہر جو تم نہیں جانتے۔ تم نے دیکھا۔ میرے اس بندے نے میرے
مشق کو کس کمال تک پہنچا دیا۔ میری عبودیت کو کس معراج کو پہنچا دیا۔ آج وہ سجدے کے بل میری
خدمت میں آ رہا ہے۔ میں نے اپنی ندائی کا نظام اُس کے سپرد کر دیا۔ میں نے تباہی دوام کا تاج اس
کے سر پر رکھ دیا۔ آج میں خود اس کے ماں، باپ اور نانا کو اس عظیم فرزند کی عظیم قسم سربانی پر
مبارک باد دوں گا:

آج حسین بھی اللہ سے خطاب کر کے فرما رہا ہے۔ خداوند اے

وہ کیجیے پھر سے ہاتھ پڑے ہیں اکبر میں وہ عباسِ دلدار، وہ حسن کا دلبر
میں نے ایک ایک کو قرباں کیا لیکن گن کر کی امانت میں خیانت نہ ذرا اسے داور
تو نے دولت جو تھی مجھ خاک نشین کو سو نہی
وہ امانت تیری بندے نے زمیں کو سو نہی،

یا اللہ! پہلے کہتا تھا ج "نہ عرباں سرخو ابرو دیکھوں" (پر جو تو خوش ہوتی)
"زینب کو گلے سر دیکھوں"

خداوند! آج میں بالکل تیرے سامنے حاضر ہوں۔ تیری خوشی کے سامنے میرا سر جھکا ہے۔

اگر تجھ کو نہ ہر نسلِ امانت منظور

ذبحِ عابد کو کروں ہاتھ سے میں یہ حضور

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

شامِ غریباں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

حضراتِ گرامی! آج بجائے اس وقت درود و سلام پڑھنے کے سارا جمع بیک زبان ایک دفعہ کہے: «انا للہ وانا الیہ راجعون»

اصل حادثہ گریباں اب شروع ہوا ہے۔ آج کے عصر تک کے کارنامے کی ذمہ داری حسینؑ کے پاس تھی اور عصر کے بعد یہ ذمہ داری حسینؑ سے زینبؑ کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ آپ حضرات نے محرم کا چاند دیکھ کر آج کے عصر تک جتنی مجلسیں کی ہیں، جتنا ماتم کیا ہے وہ شہیدوں کا ماتم تھا اور عصر کے بعد سے اب اسیروں کا ماتم ہے۔

بزرگوں، سزیزوں اور نوجوانوں! اصلہ ماتم اب شروع ہوا ہے۔

حضور امام موسیٰ کاظمؑ عیالسلام کا فرمان ہے کہ

وہ عصر کے بعد ہمارے خاندان پر جو گزر گئی، نہ کوئی بیان کرنے والا اسے بیان کر سکتا ہے

نہ کسی سوچنے والے کے ذہن میں آسکتا ہے اُسے وہی جانتے تھے جن پہ گزر گئی!

دنیا کا شریف ترین خاندان، دنیا کا معزز ترین خاندان، آج اس عالم میں پہنچ گیا کہ رات

ان کی شامِ شہیدان تھی اور آج ان کی راتِ شامِ غریباں ہے۔ اور جن کا خدا نے،

قرآن نے اہل بیتؑ نام رکھا ہے وہ آج دنیا میں بے بیت ہیں۔ ان کا آج کبیر گھر نہیں۔ وہ آج

بے گھر ہیں۔ کوئی سوچ نہیں سکتا کہ ان پہ کیا گزری۔ اور جب آخری رخصت کے بعد

حسینؑ میدان میں تشریف لائے۔ چلے وقت جب بالکل اپنے گھوڑے کے قریب آئے اور سوار

ہونے لگے تو ان کی بچی نے آکے دامن کپڑا لیا۔ سیکٹہ دامن کپڑے کھڑی ہو گئی۔

”باباجان! جارہے ہو، بابا! آپ جارہے ہیں“

”رہاں بیٹا! میں جارہا ہوں“

”باباجان! اگرچہ میں بچی ہوں مگر اتنا میں سمجھ رہی ہوں کہ صبح سے جو گیا ہے، وہ واپس نہیں آیا۔ مجھے یقین ہے آپ بھی واپس نہیں آئیں گے، پیار سے! باباجان! مجھے یہ بتادیں کہ رات قریب آرہی ہے، آپ جارہے ہیں، جنگل ہے یا بان ہے۔ اگر رات کو بڑی ڈرگئی تو کس کسے پاس سوؤں گی۔ اب میں کس کے سینے پہ سوؤں گی یا تو اٹم نے بچی کو فرمایا کید۔“ بیٹا! آج رات اگر تم ڈر جاؤ تو اپنی اماں کے پاس سوتا۔ اپنی ماں کی گود میں سو جانا! تو بچی جواب میں کہتی ہے۔

”باباجان! اماں کی گود میں تو بھائی علی اصغر سو یا کرتے ہیں، میں کیسے سوؤں گی!“

اٹم نے جواب میں فرمایا

”سیکٹہ بیٹا! آج رات سے اصغر میرے ساتھ سوتے گا، اور اٹم رخصت ہو کے میدان میں آگئے اور دنیانے یہ عجیب نظر دیکھا کہ ہزاروں کے تھاپے میں ایک تنگ کندل انسان ہے۔ اس بے جان فوج نے یہ طعنہ زنی کی۔

”حسین! نہ اپنے کو تکلیف دو نہ میں تکلیف دو۔ آؤ گھوڑے سے اتر آؤ تاکہ

یہ جنگ جلدی ختم ہو جائے“

ان کے یہ طعنے کی آواز خیمے میں زینب نے سنی۔ زینب نے دروازے پہ آکے کہا

”حسین! مجھے پتہ ہے، تم نے شہید ہونا ہے، مگر یہ قوم یہ نہ سمجھے کہ مجبور ہو گیا، ذرا پانچ منٹ

کے لئے میری اماں کے دو دھکی طاقت بھی دکھا دے“

اور حسین نے تلوار کھینچی۔ جہاد شروع کیا۔ فوج کا پہلا حصہ جھاگ کر خلیہ تک پہنچا تھا اور حسین

فوج کو جھاگ کر گھوڑے کو تیزی سے دوڑا کہ ایک بند ٹیلے پر آتے اور وہاں بلند آواز سے کہتے

”وہنا عبد الرسول! اللہ لوگو! میں رسول کا بیٹا ہوں۔“ اور فوراً جواب میں خیمے سے بہرہ لیتی

» مرحبا یا عبدالموسول اللہ « منشا باش حسین !

— اور جنگ ختم ہوئی — اور حسینؑ فوجوں کے بیچ میں گھر گئے تو زینبؑ یہاں سے آواز دیتی ہے » یا علیؑ مدد !

حسینؑ کے پاؤں رکابوں سے نکل چکے تھے۔ اور مسلمانوں کی تاریخ کا متفقہ فیصلہ ہے کہ حسینؑ کو گھوڑے سے زمین تک آنے میں زبردستی لگے۔ اب ذیقینے کا ترجمہ آپ چاہے سیکھ کر لیں چاہے منٹ کر لیں۔ اتنی دیر کیوں لگ گئی کرنے میں مولا کو — اس کا بیان یہ بتایا گیا ہے کہ فوجیں قریب آگئیں۔ حسینؑ کی لپٹیوں میں برچھیاں لگا دیں۔ حسینؑ دائیں طرف گرتے تو برچھیاں داسے بائیں طرف کر دیتے اور بائیں طرف گرتے تو برچھیاں داسے دائیں طرف کر دیتے۔ تو منٹ اسی کشمکش میں گذرے۔ اس وقت کا واقعہ بھی آپ نے ناہر کا کہ جب اس عالم میں گھوڑے سے گر رہے تھے اور گرتے وقت جو بے ساختہ منہ سے نکلا۔ وہ یہ تھا مدیا عباس ! میں گر گیا۔ « عباسؑ بھائی آؤ دیکھو نا میں گر رہا ہوں»

اور پھر زمین پر آئے۔ کس طرح ؟

زیارت تہیہ میں امام زمانؑ فرماتے ہیں

» میرا سلام ہر اس شہید پر جو نہ زمین پر تھا نہ زمین پر تھا : پھر کہاں تھے — بدن تیروں پر مٹلا ہو گیا اور جب بہن نے دیکھا کہ حسینؑ گھوڑے پر نہیں ہے۔ خالی گھوڑا آچکا ہے تو اب زینبؑ حسینؑ بن گئی۔ اور کہنے لگیں » سیدانیا ! نکر نہ کرو۔ اب میں تمہاری محافظ ہوں « اب میں تمہاری دستہ دار ہوں، دیکھو ! ایسا کرو، کوئی بچہ کہیں گم نہ ہو جائے۔ بچے کے گرتے سے گرتا بانہ دو۔ سیدانیا ! تم اپنے برفقے سے برفقہ بانہ دو۔ میں تمہاری محافظ ہوں — سب سے ہوئے بچے۔ سہمی ہوئی ستورات۔ زینبؑ کھڑی ہیں سامنے — اور اگلا فقرہ میرے منہ سے نکلتا نہیں صاحبان ! لوگ مجھے بھی تہید کہتے ہیں۔ یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے، حقیقت کیا ہے — اس لئے جتنے اس محفل میں سادات ہوں میں ان سے معافی مانگتے ہوئے

اور جو زمینیں ہیں، ان سے معذرت کرتے ہوئے یہ عرض کرتا ہوں کہ پھر دنیا نے یہ دیکھا کہ
 زینبؓ دروازے پہ کھڑی تھیں اور بے جیا فوج شور مچاتی ہوئی کہ اب خاندان رسالت
 کے گھروں کو لوٹ لو، چلی آرہی ہے۔ گھر کا محاصرہ ہو گیا۔ اور خیموں میں آگ لگنے لگی۔
 جب ایک خیمہ جل جانا میدانوں دوسرے خیمے میں آجائیں۔ وہ جل جانا تیسرے خیمے میں آجائیں۔
 اب میں آپ کو یہ واقعہ بھی سنا دوں کہ رات میں نے آپ کو یہ بات کہی تھی، «امام
 زین العابدینؓ نے فرمایا تھا کہ اصحاب کے خیمے ذرا فاصلے پہ ہو جائیں تاکہ ان تک ہماری مستورات
 کی آواز نہ جائے۔» آج وہی زین العابدینؓ اپنے بستر بیماری پر بیٹھے ہوئے ہیں۔
 زینبؓ پہنچی۔ بیٹے کا سر گود میں لیا۔ گجرا اٹھ کا عالم۔ پریشانی کا وقت۔ اور کہتی
 ہیں «بیٹا! ذرا اٹھو۔ بیٹا! ذرا اٹھو۔ تین چار دفعہ بیٹا کہہ کے پکارا۔ آنکھ نہ کھولی۔»
 آخر زینبؓ گھبرا کر کہتی ہیں

«امام زمانہ! ذرا اٹھ کے بیٹھو»

اب جو امام کہہ کے پکارا تو اٹھ کے بیٹھ گئے۔

«اماں! کیا ہوا»

«بیٹا! ہوا یہ کہ تو اب امام ہے۔ اور میں تیری امامت میں تجھ سے پہلا مسدہ پوچھنے آئی
 ہوں۔ یوں تو تو میرا بیٹا ہے مگر بحیثیت امام کے میرا بادشاہ ہے۔ مجھے پہلا مسدہ یہ بتا کہ خیمے
 ساتھ جل گئے۔ اب بتا کہ ہم ان جیتے ہوئے خیموں کے ساتھ جن کمر جا میں یا نامحرموں میں باہر نکلیں
 _____ «اور امام نے پہلا مسدہ یہ بتایا۔ دو علیکن بالصبر»

«اماں! عورتوں، بچوں کو نہ کراس جگہ میں نکل جاؤ۔ اب پردہ ساکت ہو گیا ہے»

اب حرم حسینؓ جگہ میں ہیں۔ چادریں اتار گئی ہیں۔ نیچے ماؤں سے چٹے ہوئے ہیں۔ سب سے
 ہوئے ہیں۔ کربلا کے ریت کے ادنیٰ اونچے پیلوں پر جا کے سیدائیاں بیٹھ گئی ہیں بچوں کو
 لے کر۔ رات ہو گئی ہے۔ _____ ایک طرف بے سر کے لاشے ہیں۔ _____ یک طرف

میں پورا فرج ہے۔۔۔ ایک طرف بے کس تیدانیاں ہیں۔۔۔ بچوں نے رات تک شور مچایا "میں پانی چاہیے"۔۔۔ مگر آج کوئی بچہ کچھ نہیں کہہ رہا۔۔۔ سب اٹکی کی گود میں خاموش بیٹھے ہیں۔۔۔ یا تو دن کے واقعے سے سہم گئے ہیں یا یہ سوچتے ہیں "اب کس سے مانگیں"۔۔۔ اب پانی لانے والا کون ہے"۔۔۔ خواتین خاموش بیٹھی ہیں۔۔۔ اہا زمان ان کے بیچ میں بیٹھے ہیں اور زینب فرماتی ہیں

"بی بیو! مگر نہ کرو آج رات میں تمہارا پہرہ تنگی۔ میں تمہاری حفاظت کروں گی"

اس کے بعد روایات بڑی مختلف ہیں۔۔۔ میں کوئی بیان کروں اور کوئی نہ کروں۔ ایک یہ بھی روایت ہے کہ زینب پہرہ دسے رہی ہیں۔ بیچ میں ساری خواتین بیٹھی ہیں۔ اس پہرے کے عالم میں زینب نے دیکھا کہ سامنے سے ایک سوار چلا آ رہا ہے۔ اور زینب نے یہیں سے آواز دی

"آنے والے ٹھہر۔ آج میرا پہرہ ہے۔ خبردار! آگے نہ آنا"۔ مگر وہ سوار بڑھتا چلا آیا۔۔۔ زینب آگے بڑھیں۔ "میں تجھے کبھی ہوں آگے نہ آؤ" اور یہ کہہ کے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔۔۔ بس۔ باگ کا پکڑنا تھا کہ سوار نے نقاب اٹک دی۔ اور زینب نے پہچان لیا۔ اور سوار نے کہا "بیٹا زینب! میں آیا ہوں"۔ اور زینب نے رکاب پکڑ لی "بابا! اب آئے ہو"

"بابا! اب پہنچے ہو"

اور یہ بھی ایک روایت ہے کہ آج کی رات کے پیسے حصے میں پانی کی مشک آگئی۔۔۔ اب میں اس تحقیق میں کہاں پڑوں کہ پانی کی مشک آنے کی روایتیں کتنی ہیں۔ مختلف روایتوں کے باوجود نتیجہ یہ ہے کہ پانی کی مشک آگئی۔۔۔ کچھ کھانا آگیا۔ وہ زور بڑھ کر آئیں یا کوئی اور لے کر آیا۔ بہرے پانی آگیا۔۔۔ میں آپ سے پوچھا ہوں کہ کڑلا کے سب واقعات ہیں ان سیدائینوں کے لئے سب سے سخت ترین وقت یہی تھا کہ نہیں کہ جب ان کے

سانے پانی کی مشک رکھی گئی۔ اُن کے دلوں سے پوچھو۔ ان پہ کیا گذری تھی۔
 ایک نظر پانی کی مشک پر تھی اور ایک ایک بی بی آواز دے رہی تھی۔ علی اکبر! تم نے مرتے دم
 ایک گھونٹ پانی مانگا تھا، کوئی کہہ رہی تھی، ”عباس! واپس آ جاؤ۔ پانی کی مشک آگئی“ کوئی
 کہہ رہی تھی ”استغریبا! پانی آگیا۔ اب کیسے پیو گے“۔ سب سے سنت وقت برداشت
 کے لئے یہی تھا کہ پانی کی مشک ان کے سامنے رکھی تھی۔

امام زین العابدین آئے۔ مشک کا دانا کھولا۔ پانی یا۔ در پھو بھی اماں! پانی
 پیئیں۔ اور زینب کہتی ہیں ”بیٹا! زین العابدین! میں! یہ پانی!!“

میں پیوں!!

پہلے کلاس میں پانی لے کر سب بی بیوں نے حسین کی ماتھ پر صحنی ”حسین! پانی پیو پانی نذر
 پیش کر رہے ہیں“ وہ زینب کو پیش ہوا۔ زینب نے سیکڑے کو اٹھایا۔ ”بیٹا سیکڑے!
 یہ پانی پیو! سیکڑے نے بھی اتکار کر دیا۔ زینب نے بھی اتکار کر دیا۔ امام
 زین العابدین نے اعجاز کی طاقت سے پھر بھی کو یہ منظر دکھایا کہ زینب نے دیکھا کہ ”کوئی
 کنارہ ہے۔ رسالت آ آب بیٹھے ہیں۔ حیدر کر آ بیٹھے ہیں۔ اور حسن مجتبیٰ
 بیٹھے ہیں۔ اور کربلا کے سارے شہید سامنے کھائے۔ ہیں۔
 حسین بھی کھڑے ہیں اور علی مرتضیٰ ہاتھ میں کونڑ کا جام لے کر حسین کو پیش کرتے ہیں اور
 حسیں جواب میں کہتے ہیں

”بابا۔ ابھی نہیں۔ ابھی میری زینب پیاسی ہے۔ بابا۔ ابھی نہیں۔

ابھی میرے پیچھے پیاسے ہیں۔“

زینب نے یہ منظر دیکھا۔ زینب نے پانی لے کر کہا

”سکینہ بیٹا! پیلے تم پیو۔“

سکینہ نے کہا

”اے۔ پلے آب“

”نہیں بیٹا! پلے پتوں کو پلاتے ہیں“

بس بھائیو! پتوں کا نام سننا تھا کہ شہزادی پانی کا وہ طرف لے کر گئے شہیداں کی طرف

دوڑی اور بڑا آواز سے کہا

”راصع بھائی! تم میرے چھوٹے بھائی ہو، پلے تم پانی پیو۔ سیکھو بعد میں پیے گی“

”انا للہ وانا الیہ راجعون“

~ ~ ~

حسین اور خدا کے درمیان آج کوئی شے حائل نہیں۔

خالق کو اپنے اس بندے پہ ناز ہے۔ اللہ اپنی صنعت

کے اس شاہکار کو دیکھ کر فخر یہ فرشتوں سے کہتا ہے

”إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ“

دین بچا ہے اللہ کا۔ کلمہ پڑھا گیا تو۔ محمد کا۔ اور بہو بیٹیاں قید

ہو گئیں تو غریب اپنی طالب کی — (خطیب آل محمد)

فی سبیل اللہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خداوند عالم عزوجل اسمذوجل جلالہ کی حمد و شتاد کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام
محترم سامعین!

اللہ کا یہ فرمان ہے "جو لوگ فی سبیل اللہ قتل ہو جائیں۔ ان کو مردہ مت کہو"
اب یہ مردہ مت کہو ہے ایک اشتباہ باقی ہے کہ صرف کہنے کی ممانعت ہے۔ کہ
مردہ انہیں کہو نہیں۔ اگر ہم دل میں سمجھ لیں تو کوئی حرج نہیں۔ زبان سے صرف
کہنے کی ممانعت ہے۔ کہ انہیں مردہ کہو نہیں۔ ویسے دل میں ہم انہیں مردہ سمجھ لیں تو کوئی
حرج نہیں۔ اس اشتباہ کے رنج کرنے کے لئے دوبارہ حکم ہوتا ہے "لَا تَقُولُوا لِمَنْ
يَقْتُلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْواتًا بَلْ اَحْيَاءٌ دَلِكُمْ لَا تَشْعُرُونَ" دل میں یہ خیال بھی نہ کرنا جو سبیل اللہ میں
قتل ہو جائیں۔ کہ وہ مردہ ہیں۔ وہ زندہ ہیں۔ اور اللہ کی طرف سے انہیں رزق مٹا ہے۔
اور ان کی حیات ہے اور وہ یقیناً زندہ ہیں۔ مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور
نہیں۔ وہ زندہ ہیں اور ہمیں ان کی زندگی کا شعور نہیں۔ یہ اللہ نے صاف کہہ دیا۔ کہ
تمہارے شعور سے باہر ہے ان کی زندگی۔

ویسے تو ہمارا ایمان ہے کہ ہم میں سے جو بھی مرتا ہے وہ زندہ ہے۔
کا فر بھی زندہ ہے۔ رہنے کے بعد جانا کہاں ہے۔ ایک جگہ سے دوسری
جگہ منتقل ہو گئے۔ یہی انتقال ہے مومن بھی زندہ ہے۔ منافق بھی
زندہ ہے۔ وہ اپنی جگہ زندہ ہے۔ وہ اپنی جگہ زندہ ہے۔

ختم ہو گیا۔ ایک یہ زندگی ہے — اور ایک یہ زندگی ہے کہ

ع قاروں ہلاک شد کہ پہل خانہ گنج داشت

قاروں باوجود اتنی دولت ہونے کے مر گیا۔ — اور

ع نوشیرواں ز فرد کہ نام نلو گذاشت

اور نوشیرواں آج تک زندہ ہے اس لئے کہ وہ نیک نام چھوڑ گیا۔ تو ایک زندگی یہ بھی ہے
نام نیک کی زندگی — جس کا نام زندہ ہے بس وہ زندہ ہے۔ —

اگر زندگی کے لئے یہی شرط ہوتی کہ ہم اپنے سامنے چلتا پھرتا دیکھیں تو زندہ مائیں

تو خدا کو کون زندہ مانتا۔ اُس کے حئی ہونے کا کون اقرار کرتا۔ —

اُس کا نام ہی ہم میں زندہ ہیں تو وہ زندہ ہے۔ ورنہ ہم نے کہاں دیکھا ہے اُسے چلتا پھرتا۔

پہر نون جو اللہ کی حیات ہے۔ وہ بھی ہمارے شعور سے باہر ہے۔ اور جو اللہ

دالوں کی حیات ہے وہ بھی ہمارے شعور سے باہر ہے۔

اب اُز دونوں کی حیات یکساں ہو جائے۔ تو معاذ اللہ۔ وہ شریک باری تعالیٰ

ہو جائیں۔ — اس شرک سے بچانے کے لئے اللہ نے کب دیا اور انہیں

رزق مٹا ہے۔ — بس یہ فرق ہے اُن میں اور اللہ میں۔ کہ وہ

رزق کے محتاج ہیں۔ اور اللہ رزق کا محتاج نہیں۔ — ورنہ

اُن کی بھی حیات ہے۔ وہ زندہ ہیں۔ اور زندہ رہیں گے۔

موتے وہ میں جو انہیں مارنا چاہیں۔

آج یہاں اس وقت ایک فقہرہ کبہ کے اربابِ ذوق کے لئے اس مضمون کو آگے بڑھاتا

ہوں۔ کہ یہ زندگی جو ہے۔ اُن کی ہے جو سبیل اللہ میں مرجائیں۔ — اگر کوئی شخص یہ

مجھے کہ یہ آیت حسینؑ پر بھی صادق آتی ہے تو اس میں ذرا سی مجھے جھپکا ہٹ ہے۔ اور وہ

اس لئے کہ — حسینؑ اُن میں نہیں ہیں جو سبیل اللہ میں مرجائیں حسینؑ خود سبیل اللہ سے

اور اس کے ثبوت کے لئے بہت سی چیزیں ہیں میرے پاس۔ جو ساری میں اس وقت بیان نہیں کر سکتا۔ اس وقت آپ کو صرف ایک حدیث سنانا ہوں۔ اور حدیث وہی صحیح ہے جو قرآن سے مطابقت کرتی ہو۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ

”وہ میں، شہید وہ میں جو سبیل اللہ میں مرجائیں۔“ — اور حدیث یہ کہتی ہے ”من مات علی حب الیٰ محمد مات شہیداً“ جو آل محمد کی محبت میں مرجائے۔ وہ شہید ہے۔ معلوم ہوا۔ جب تک آل محمد اور سبیل اللہ ایک نہ ہوں۔ جب تک اس حدیث اور آیت کا تقابح نہیں ہوتا۔ — حسینؑ اُن میں شامل نہیں۔ — حسینؑ تو خود سبیل اللہ ہے حسینؑ کے ساتھ جو مرجائیں۔ وہ زندہ ہیں۔ وہ زندہ رہیں گے۔ حسینؑ تو ہے ہی زندہ۔ وہ زندہ تھا۔ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

میرے سامعین!

کیا بتاؤں۔ — دنیا کی طبیعتوں کو بدلنا تھا۔ زمانے کے مزاج میں ایک انقلابِ اعظم لانا تھا۔ ایک اسلام والے نظام کو دنیا میں عملاً پیش کرنا تھا۔ جن کے لئے اللہ نے حسینؑ کو چن لیا۔ اور وہ اس کے لئے سامنے آ گیا۔ حسینؑ! تجھے تو میں پنتا ہوں اس انقلاب کے لئے۔ اب اپنے مددگار تو چن لے۔ جن کو تو ساتھ لے جانا چاہے۔“

اور اللہ کے چناؤ میں معاذ اللہ کوئی فرق آ ہی نہیں سکتا۔ اُس نے ایسا چنا حسینؑ کو۔ کہ اس سے بہتر کوئی تھا ہی نہیں۔ — مگر حسینؑ نے بھی ایسے چننے ہیں کہ کیا مجال جس کو جس کام کے لئے چن لیا۔ اُس نے وہی کچھ نہ کر دکھایا ہو جو اللہ چاہتا تھا۔ اُس نے وہی کچھ نہ کر دکھایا ہو جو مشیت الہی تھا۔ —

اب اگر کوئی یہ کہے کہ حسینؑ تجربے کی بنا پر چن رہا تھا وہ آدمی۔ کسی کی ساٹھ سالہ زندگی کا تجربہ تھا۔ کسی کی پچاس سالہ زندگی کا تجربہ تھا۔ کسی کی تیس سالہ زندگی کا تجربہ تھا۔

اُونٹ سے اپنے آپ کو گرا دیا تھا۔۔۔۔۔ اب یہ لفظ میں نے کبہ دیا اور آپ نے مس لیا۔ کہ
 ”زینب نے اپنے آپ کو کھڑے اُونٹ سے گرا دیا۔“

کسی سوار سے پوچھیں۔ جو کھڑے سے گرتا ہو کسی اور ایسے آدمی سے پوچھیں جو کسی اونچی
 جگہ سے گرا ہو۔۔۔ گرنے والے کی فطرت یہ ہے۔ کہ جب وہ گرنے لگتا ہے۔ تو اپنے آپ
 کو سنبھالنے کے لئے پہلے ہاتھوں کو زمین پر رکھتا ہے۔۔۔۔۔ اب زینب
 نے جو گرایا اُونٹ سے اپنے آپ کو۔ تو ہاتھوں سے کس طرح سہارا لیا۔ ہاتھوں سے پتے
 آپ کو کس طرح سنبھالا۔۔۔؟۔۔۔ ہاتھوں کے متعلق تو آپ جانتے ہی ہیں۔

آج سے ایک مدت پہلے میرا اپنا یہ خیال تھا۔ کہ شاید باظہار بندھے علی
 روایتیں جو ہیں۔ لیکن یہ رونے کے لئے ہم نے بنائی ہوں۔۔۔۔۔
 مگر جب میں نے امام زمان کی زیارت ناحیہ پڑھی۔ تو اُس میں باظہار بندھنے
 کا ذکر تھا۔۔۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ ضرور بندھے ہوں گے۔ پھر
 یہ تشویش ہوئی کہ کس طرح بندھے تھے۔ بازو بندھے تھے۔ گلنیاں بندھی
 تھیں۔ کس طرح بندھے تھے۔ تو اس کے متعلق جی امام زمانؑ ہی نے
 فرمایا کہ۔۔۔۔۔

”میرا سلام ہو میری دادی زینب پر جس کے دونوں ہاتھ اُس کی گردن
 کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ اب اس عالم میں زینب نے
 اپنے آپ کو کھڑے اُونٹ سے گرایا۔۔۔۔۔ تو امام زین العابدینؑ یا تو
 اپنے باپ کے لائے کو دیکھ رہے تھے۔ یا ایک دم مڑ گئے پھوپھی کی طرف
 پھوپھی! یہ کیا ہوا۔۔۔“ تو زینب بلا وقفہ اُٹھنے کھڑی ہو گئیں
 اور کہتی کیا ہیں۔۔۔۔۔

”بیٹا زین العابدین! میں کیا لہجہ رہی ہوں۔ تمہارے پیارے ہاتھ

کیا ہو گیا۔ لاوارثوں کے وارث! کیا تم مرنا چاہتے ہو۔۔۔۔۔ پھر
 ہمارا وارث کون ہو گا۔۔۔۔۔

تو امام جراب میں کہتے ہیں:-

”اماں! کیوں نہ مر جائے وہ جوان بیٹا جو ایسے باپ کی میت کو اس
 عالم میں تھیوڑ جائے۔“

اماں زینب نے تقریر فرمائی:-

”بیٹا! دل شکستہ نہ ہو۔ کھیرا نہیں۔ تیرے باپ کی قبر بنے گی۔ یہاں
 حسین کا روضہ بنے گا۔ یہاں حسین کا شہر آباد ہو گا۔ روئے زمین کے
 انسان تیرے باپ کی زیارت کو آئیں گے۔ یہاں حسین کا دربار ملے گا
 ۔۔۔۔۔ زینب نے یہ تقریر فرمائی۔۔۔۔۔ اور

اس کے بعد تمام اہل سنت بیٹھ گئے۔ تیسری آراٹے۔۔۔۔۔ ایک ایک خاتون اپنے وارث پہ
 اپنے بیٹے پہ۔ اپنے عزیز پہ جا کر اذاعی رونا رو رہی تھی۔ رخصت ہو رہی تھی۔۔۔۔۔
 اور زینب حسین کے پاس آکھڑی ہوئیں۔ بیلا علی اکبر کی لاش پہ آکھڑی ہوئیں۔ قاسم کی
 ماں قاسم کی لاش کے کندھوں کے پاس آئیں۔۔۔۔۔ ہر خاتون اس سے جس کا رگڑا تھا۔
 رو رہی تھی۔

تو زینب یہ کہہ رہی ہوں کی دیر میرے اپنے تصور کی بات ہے،

حسین! میں لاش پہ رونے نہیں آئی۔۔۔۔۔ میں یہ کہنے آئی ہوں۔
 نسا باش حسین! تو نے یہی اماں کے دودھ کی عزت رکھی۔
 تو نے میرے اماں کی لاج رکھ لی حسین!
 تو نے میرے باپ کی آبرو رکھ لی حسین!
 تو نے اپنے بڑے جان کی عزت رکھ لی حسین!

شہادت حسین!

تو اپنا کام کر چکا۔ اب میری باری ہے۔
 تو کر بلا فوج کر چکا تھے کہ بلا کی فوج مبارک ہو حسین! —
 حسین! اب یہی شام فوج کرنے جا رہی ہوں۔
 حسین! جب تو کر بلا میں جہاد کر رہا تھا۔ میں خیمے میں بیٹھی اپنے سر کے بال
 کھول کر تیری فوج کے لئے دعا کرتی رہی۔
 اب میں جا رہی ہوں فوج لے کے شام فوج کرنے۔
 اب بتا حسین! میں کیا کروں۔ اگر سو کے حسین! تو میری فوج
 کا معائنہ تو کر کے دیکھو۔ اس فوج کو لے کے جا رہی ہوں۔
 اتنی بڑی سلطنت کو مٹانے کے لئے اس فوج کو لے کر جا رہی ہوں

اور

افواجِ قاہرہ زینبیہ کا معائنہ کرنے کے لئے حسین نیزے پہ سوار ہو گئے اور زینبیہ
 نے اپنی فوج کو دو صفوں میں کھڑا کر دیا۔ ایک صف میں بیوہ عورتیں۔
 ایک صف میں یتیم بچے۔

حسین! دیکھو یہ فوج ہے جس سے دنیا کی بڑی سلطنت کو فوج کرنے جا رہی ہوں۔
 عورتیں اور اڑتالیس یتیم بچے۔ قیدی ہوئے کھڑے ہیں۔
 حسین! ذرا ان کی دردی ہی دیکھو لے۔
 وردی کیا ہے۔ سر چلے بونے ہیں۔ ہاتھ بندھے ہیں۔
 حسین! اس فوج کے ساتھ جا رہی ہوں یتیمی حکومت کو فوج کرنے۔

میرے ختم نامعین! بیباکانہ اہل رسول کر بلا سے روانہ ہوا تو اس وقت ان کے
 قیدیوں کی تعداد تھی۔ پونسٹھ عورتیں اور اڑتالیس یتیم بچے۔ تعداد کو

ایک بار پھر سُن لو۔ چونکہ عورتیں اور اڑتالیس تیسیم بچے جب کر بلا سے چلے تھے —
 قبلہ! آپ بزرگ ہیں۔ آپ ہی سے فریاد کر سکتا ہوں۔ یا پھر اللہ سے
 فریاد ہے کہ ہمارے قیدیوں کی تعداد بھی چونکہ عورتیں اور
 اڑتالیس تیسیم بچے جب کر بلا سے روانہ ہوئے — اور جب شام
 میں بڑید کے سامنے پہنچے تو کل بارہ تھے —

اب میں کس سے پوچھوں۔ باقی کہاں گئے۔ اب میں کہاں تلاش کروں۔ کہ ہمارے باقی
 کہاں گئے۔

بہر فرج ان قیدیوں کو لے کے زینب روانہ ہوئی۔ اور گونے لے
 دروازے پر پہنچ گئی۔ گونے کا دروازہ زینب کا پہچانا ہوا دروازہ تھا۔ اسی
 دروازے سے اُس دن وہی داخل ہوئی تھی۔ جب باپ یہاں بادشاہ تھا۔ اُس وقت
 زینب شہزادی کی حیثیت سے آئی تھی۔ وہی دروازہ پھر سامنے آگیا
 اور زینب نے پہچان لیا۔

”اُون! یہ وہ دروازہ ہے“ اور اتنا کہہ دیا۔

”اس دروازہ سے ہم نہیں جائیں گے۔“

ادھر فوج کا اصرار کہ زینب! تمہیں چلنا پڑے گا۔ اور ادھر زینب کا فرمان کہ ہم نہیں
 جائیں گے۔ تو شہزادہ آگے اہوا سامنے۔ زینب! تمہیں چلنا پڑے گا،
 زینب! تم جھولتی ہو۔ کت تم گونے کی شہزادی نہیں ہو۔ بلکہ ہماری تیب ہی
 ہو۔ تمہیں چلنا پڑے گا! اب جو ہونے کی رد و فرج — تو زینب
 کی گود میں جو بچی بیٹھی تھی تین سال کی — وہ کہتی ہے۔

”اماں!“ تو زینب پر اب دیا

”کیوں بیٹیا!“

کون سلام کر رہا ہے _____ تو دوبارہ آواز آئی _____
 "اسلام علیک یا نبوت رسول اللہ" "اے رسول کی بیٹی! میرا سلام ہو _____"
 زینب نے اب جو نظر اٹھا کے دیکھا _____ دیکھتی کیا میں _____
 دروازے پر بے سر کی لاش لٹکی ہوئی ہے۔ اور اُس شہید کی لاش سے سلام کی آواز
 آرہی ہے _____

زینب نے فوراً پہچان لیا
 "کون! بھائی مسلم"

"ہاں زینب! تمہارا سفیر! دروازے پر تمہارے استقبال کو حاضر ہے"

اور سامعین! کونے کی گلیوں اور بازاروں سے گزرتا ہوا۔ ان بے بس و مجبور قیدیوں
 کا قافلہ _____ دربار ابن زیاد میں پہنچ گیا _____ جب دربار ابن زیاد میں
 یہ قافلہ پہنچا۔ تو ابن زیاد نے کافی دیر کے بعد کہا۔ کہ جو قیدی ہم نے قید کر لئے تھے تاکہ وہ
 حسین کی مدد کو نہ پہنچ سکیں۔ اُن میں ایک مختار نامی قیدی ہے _____ اُسے یہاں
 دربار میں حاضر کرو _____ چنانچہ مختار دربار میں آگیا۔ پیروں میں بیڑیاں پڑی
 ہوئی ہیں۔ زنجیروں میں جکڑا ہوا۔ اور ابن زیاد بڑے غرور و تکبر سے بولا _____
 "مختار! ہم نے تمہیں اس لئے قید کیا تھا کہ تم کہیں حسین کی حمایت کو نہ چلے جاؤ۔
 حسین آگئے ہیں کونے میں _____ اب کیا ارادہ ہے _____"

مختار نے کہا "مخدا نے اگر اس قید سے رہا کر دیا۔ تو میں جاؤں گا۔ حسین کی مدد کو"

ابن زیاد نے کہا۔ ادھر آؤ۔ دیکھو یہ حسین ہیں _____

اب جو مختار نے حسین کا سر دیکھا تو اسی قید کے عالم میں ساتھ کھڑے ہوئے سپاہی کی تلوار کے
 قبضہ پر ہاتھ ڈال دیا _____ بس مختار نے قبضہ میں ہاتھ ڈالا _____ ادھر سے

امام زین العابدین نے ہاتھ سے اشارہ کیا _____

”مختار لڑائی نہ کرنا۔ میرے ساتھ پھوپھیاں اور بنیں آئی ہوتی ہیں

میرے ساتھ پردہ دار خاتون آئی ہوتی ہیں۔۔۔ اور۔۔۔

ابن زیاد نے مختار کو دوبارہ قید خانے میں بھیج دیا۔۔۔ اور جب کافی دیر ہو گئی۔

قیدیوں کو کھڑے کھڑے ابن زیاد کے دربار میں۔۔۔ اور دینا نے یہ انقلابِ اعظم دیکھا

کہ تخت پر ابن زیاد اور سامنے زمین پر قیدی امام زین العابدین۔۔۔ اب ابن زیاد

نے کافی دیر کے بعد بڑے تکبر و غرور کے ساتھ سر اٹھایا۔۔۔ اور سر اٹھا کے کہتا ہے

شعر سے۔۔۔

”یہ قیدی ہیں؟“

”ہاں۔ یہ ہیں“

ان قیدیوں میں یہ بچی کون ہے۔۔۔؟“

تو شعر کہتا ہے بڑھ کے

”یہی تو ہے حسین کی وہ بچی۔ جس سے حسین بہت پیار کرتے تھے۔ سکینہ بنت الحسین

یہی ہے۔۔۔۔۔“

”اچھا یہ بچی ہے اسے میرے سامنے لاؤ“

شعر نے قیدیوں سے بڑھا کے بچی کو سامنے کر دیا۔ اب ابن زیاد پوچھتا ہے

”یہ بچی! تیرا نام کیا ہے۔۔۔؟“

وہ جواب نہیں دیتی۔ آخر اس نے بیمار بھائی کی طرف دیکھا۔ کیا حکم ہے۔ تو بھائی نے

اشارہ کیا۔ بات کر دیشا۔۔۔

اب بچی نے بات کی۔

”میرا نام تو فاطمہ ہے۔۔۔ مجھے پیار میں سکینہ کہتے ہیں۔۔۔“

مگر بات اس طرح کی کہ زبان میں مکتل آگئی۔۔۔۔۔

اب ابن زیاد پوچھتا ہے۔

”بچی۔ تمہاری زبان میں کسکت کیوں ہے۔“

”میرا گلا اتنا مضبوط بندھا ہوا ہے کہ میں بول نہیں سکتی۔“

ابن زیاد کہتا ہے کہ اس بچی کا گلا کھول دو۔۔۔۔۔ اور گلا کھول دیا گیا۔۔۔۔۔

منٹ تک گلے کو سہلایا گیا۔۔۔۔۔ جب ذرا ٹھیک ہوا۔ اب وہ پوچھتا ہے۔۔۔۔۔

”ماں۔ بچی۔ تیسرا کیا نام ہے؟“

”مجھے مکینہ بنت الحسین کہتے ہیں۔“

”تم نے یہ دونوں لفظ اپنے منہ پر کیوں رکھے ہوئے ہیں؟“

”میری بھینسیوں، ماؤں کے بال ہیں۔ ان سے انہوں نے چہرا چھپایا ہے۔ میرے بال

چھوٹے تھے۔ میں نے ماتحتوں سے چھپایا ہے۔۔۔۔۔ ہم خاندان رسالت کی بچیاں ہیں۔ ہمارے

گھر سے دنیا نے پردہ سیکھا ہے۔۔۔۔۔“

اب اس ظالم نے پوچھا۔

”بچی تیرے ہونٹ کیوں خشک ہیں؟“

”کافی عرصے سے میں نے سیر ہو کے پانی نہیں پیا۔۔۔۔۔“

”کیوں نہیں پیا۔۔۔۔۔“

”کر بلا میں پانی ملا نہیں۔۔۔۔۔ اور میرا سقا پانی لینے گیا تھا۔ وہ واپس آیا نہیں!۔۔۔۔۔“

”کہاں گیا تمہارا سقا۔۔۔۔۔؟“

”وہ تو مجھ سے فرات کہہ کے گیا تھا۔۔۔۔۔ اماں کہتی ہیں کہ وہ کوثر پہ چلا گیا۔۔۔۔۔“

اس کے بعد ابن زیاد پوچھتا ہے۔

”بچی! اگر تیرے باپ حسین زندہ ہوتے۔ تو یہ بنا، وہ تیرے ہی کیا خاٹ کرتے۔۔۔۔۔“

تو بچی نے پورے بچپن کے لمحے میں کہا۔

”صبح کے وقت میرے باپ مجھے گود میں بٹھا کر اپنے ہاتھ سے تازہ خرے کھدیا کرتے

تھے۔۔۔۔۔“

اب ابن زیادؓ کے علم کی یہ آخری منزل ہے۔ وہ انت کہتا کیا ہے۔

”بچی۔ میں نے تیرے لئے تازہ خرے منگوا رکھے ہیں۔ تو کھائے گی؟“

بچی نے پھر بھائی کو دیکھا۔ بھائی نے پھر اشارہ کیا۔۔۔۔۔

بچی نے کہا۔۔۔۔۔

”ہاں۔۔۔۔۔ اور سکینہ آگے بڑھی۔ تو ابن زیادؓ نے کہا۔۔۔۔۔

”بیٹھے۔ اس شبت میں تازہ خرے ہیں۔“

اب بچی نے جو بیٹھ کے اٹھایا رومال۔ تو رومال اٹھاتے ہی گر پڑی۔

”بابا! تم یہاں جو۔ میں تمہیں تین دن سے تلاش کر رہی ہوں۔ یہ کہہ کے گر گئی تھنت

یہ۔۔۔۔۔ اور ادھر بچی گری۔ اور ادھر ابن زیادؓ کی سنگ دلی اور بڑھی۔۔۔۔۔

اور وہ کہتا ہے۔

”بچی! بیوں نہیں۔۔۔۔۔ تم خاندان رسالت نے دنیا میں یہ مشہور کر رکھا ہے

کہ تم سب کا خاندان ہیں۔۔۔۔۔ ہم صاحبِ اعجاز ہیں۔۔۔۔۔ ہم معجزہ

دکھاتے ہیں۔۔۔۔۔ میں تو جب جانوں۔ جب حسینؑ کا سر خود اٹھ کے تیرے

پاس آجائے۔۔۔۔۔ اب جو ابن زیادؓ نے سخن کی بات کہی تو بچی جوش میں آ کے چند

قدم نیچے بٹ گئی۔ اور پھیرے کے اُس نے پھٹنا ہوا کرتا چھلادیا۔

”ابا جان! خاندان کی عزت کا سوال ہے۔ تیری سکینہ کی محبت کا سوال ہے۔ میری گود میں

اور حسینؑ کا سر بھی تو لپکا تازا ہو گا۔ میں آگیا اور کوہِ شہر میں زلزلہ آگیا! امام زین العابدینؑ نے بڑھ کے پہن کر لیا۔

”سکینہ بس۔۔۔۔۔ زین قیامت آجائے گی۔ ابھی تو کروڑہا انسان پیدا ہوں گے جو تیری قیام کو رومال کے

سکینہ ایسی کروڑہا تیری ہم سن چسپاں ہوں گی جو رات دن تیری نیچی کا ماتم کریں گی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۙ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے تھے مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے

تاکہ تمہارے اخلاق سے کی تکمیل کروں

إِنَّا لَعَلْفِئُكُمْ عَظِيمٌ

پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ، اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ نے پوری نوع
انسان کو راہ ہدایت رکھائی اور انسانیت کو اس کے شرف سے بہرہ ور کیا۔ ہادی اسلام حضرت
محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل انسان کی گردن پر کئی جھوٹے خداؤں کی غلامی
کا طوق جڑا تھا۔ اور چار سوظلم و ناانسانی اور عساریا کے ازہیرے پھیلے ہوئے تھے
یہ ہے وہ عداوت کہ یہاں تک بغیرت حق کو حرکت ہوں اور اسی اعظم حضرت محمد صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم انسانیت اور تمام عالمین کے لئے رحمت بن کر تشریف لائے و مَسَا
رِسلناک۔ الابرار حمة اللعالمین حضور نے اپنی پاکیزہ اور رفیع تعلیمات کے
ذریعے زندگی کا نیا فنون پیش اللہ کی واحدیت اور انسان کی برابری کی تعلیم دی تو ابلی
نسی اور خاندانی بڑائی کے انسانیت کو نظر سے خارج و بن سے اکھاڑ کر غفلت اور
بڑائی کو زیاد اچھے اعمال اور اچھے اخلاق پر رکھی اور ظلم و ناانسانی کی ہر شکل کو ممنوع
قرار دیا۔ آپ کے اثر اچھے ارشادات اور حیات افروز و اعطا کا مقبولہ بن سکا۔ کہ
صدیوں کے دشمن بھائی بھائی بن گئے اور ضربوں کمزور و بھاری اور زیر دستوں کے سر پر دستکت
ہوئی تو مار ڈوٹ گئی۔ رضی اور غلام روتوں کو عظمت اور مسرت کے نئے افق نظر آئے

خاتم و جبار حکمرانوں کا تسلط ختم ہونے پر انسانی ذات اور شخصیت کو نشوونما کے نئے موافق اور اسباب میسر آنے۔ جہات کی جگہ علم و عرفان نے لے لی اور افلاس و محکومی کے بدلے غنا اور آزادی کی روشنی پھیلنے لگی۔

ہدئی اعظم کی تعلیم نے پوری انسانیت کا رخ بدل دیا اور گتہ ارضی پر حریت و مساوات کا نیا سوز و طلوع ہوا۔ کالے گورے اور عربی و عجمی کی تفریق ختم ہو کر اقوام و ملل اخوت اور وحدت کے روح پرور رشتے میں منسلک ہو گئیں۔ سرور کونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے حسن اخلاق کے وہ جوہر دکھائے کہ تمام اہل عرب عش عش کر اٹھے اور آپ کو صادق اور امین کہنے پر مجبور ہو گئے جن میں اپنے پرانے اور زودست دشمن سب ہی شامل تھے۔ اس ضمن میں ایک مشہور واقعہ درج کرتا ہوں۔

جب نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ شروع کی تو بکتے کے لوگ آپ کے خلاف ہو گئے۔ آپ جب بازاروں اور گلیوں سے گزرتے تو آپ پر پتھر مارتے اور کوڑا کرکٹ پھینک دیتے۔ ایک بوڑھی عورت کا یہ معمول تھا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے گھر کے نیچے سے گزرتے تو وہ آپ پر کوڑا کرکٹ پھینک دیتی۔ آپ نگاہ اٹھا کر دیکھتے اور مسکراتے ہوئے سر اور پیڑھے جھاڑ لیتے۔ ایک دفعہ آپ اس بوڑھی عورت کے گھر کے نیچے سے گزر رہے تھے کہ اس دن کوڑا کرکٹ آپ پر نہ پھینکا گیا۔ آپ حیران رہ گئے اور سوچنے لگے کہ ضرور کوئی وجہ ہے کہ آج اُس بوڑھی عورت نے کوڑا نہیں پھینکا۔ آپ نے اُس کے گھر کا رخ کیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی کون ہے؟ آپ نے جواب دیا میں ہوں محمد۔ اُس نے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ بڑھیا کئی روز سے بیمار پڑی تھی۔ آپ نے پوچھا اے عورت کیا بات ہے۔ اُس نے ڈرتے ہوئے کہا کہ میں کئی روز سے بیمار ہوں۔ میرا کوئی سہارا نہیں۔ میں نے کئی روز سے کچھ نہیں کھایا پیا۔ آپ نے

اس عورت کو تسلی دی اور کہا کہ تو ٹکڑے کر میں تیری خدمت کروں گا۔ آپ نے اُسے دوا لے کر دی۔ کھا اٹھایا۔ پانی پلایا اور اجازت لے کر چلے گئے۔ اس طرح کئی روز اس کی تیمارداری کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ عورت بالکل ندرست ہو گئی اور معافی مانگنے لگی کہ وہ مجھے معاف کر دیں۔ حضور نے اُسے معاف کر دیا اور وہ عورت آپ کو بہترین اخلاق دیکھ کر سمان ہو گئی۔

حضرت رسالت پر اسمعیٰ اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میں نے اتنی مہربانی کی ہے جتنی آپ کی زندگی تمام انبیاء نے رام اور مصعبین عام سے محض نظر آتی ہے۔ کئی برس مضر علاقہ پکارا کرتا تھا۔ لَبَّ سَعْدًا لَبَّ سَعْدًا مَا لَا تَفْعَلُونَ وغیرہ۔ حرم میں کہتے وہ کھینچا ہوا حضور خوراقی احلیم کا آپ کو نہ بھیجے۔ اغاثی وعلیٰ کا جو کتا آپ دو سرور کر سکتا ہے مجھے خود اس اسمعیٰ کی بکری ہانسنے تھی۔

انہوں نے پوچھا۔ تم قرآن نہیں پڑھتے؟۔ آن خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان للقرآن۔ آپ کو، فخلق بہترین قرآن نھا۔ مجبورہ صحائف آسمانی اپنے راعیوں کے بہترین اقوال کا مجموعہ ہیں لیکن کیا ان کا ایک حرف جمہا اپنے مبتغی کے عمل کا دعویٰ ہے؟۔ قرآن مجید لاکھوں تن الفین اور اہل عناد کی بھیڑ میں اپنے راعی کی نسبت گویا ہے۔ اَذَلُّكَ اَعْلَىٰ خَلْقٍ عَظِيمٍ (اے محمد! تم افلاق کے بڑے درجے پر ذلت آتا رہے یعنی ہے کہ اہم ترین حضرت خدیجہ الکبریٰ جو نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد پچاس برس تک آپ کے حرم پاک میں زوجیت سے مشرف ہو کر ہدم ووسا ز رہیں۔ آغاۃ نبوت میں آپ کو ان الفاظ سے تسلی دیتی ہیں۔ "ہرگز نہیں خدا کی قسم۔ خدا آپ کو ٹھکنے نہ کرے گا۔ آپ رحم کرتے ہیں۔ مقروض کا بار اٹھانے میں۔ غریبوں کی اعانت کرتے ہیں۔ مہانوں کی ضیانت کرتے ہیں۔ حق کی حمایت کرتے ہیں۔ مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ حضور اکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق عالیہ کے متعلق فرماتی ہیں کہ سرور کونین کی عادت کسی کو بُرا بھلا کہنے کی نہ تھی۔ بُرائی کے بدلے بُرائی دُکرتے بلکہ درگزر فرماتے تھے۔ آپ نے کسی سے ذاتی معاملے میں کبھی انتقام نہیں لیا۔ آپ نے نام لے کر کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی۔ آپ نے کبھی کسی غلام لوٹائی کر کسی عورت کو۔ کسی خادم کو۔ کسی جاندار کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا۔ آپ نے کبھی کسی درخواست رد نہیں فرمائی۔ چہ جائیکہ وہ ناجائز نہ ہو۔ آپ جب گھر تشریف لاتے تو نہایت خنداں ہنستے مسکراتے ہوئے۔ دوستوں میں پاؤں پھیلانا نہ بیٹھتے۔ ہاتھیں ٹھہر ٹھہر کر اس طرف فرماتے کہ کوئی یاد رکھنا چاہے تو رکھ لے۔ رات کی تنہا ہوں اور خصوصی اوقات میں اپنے دشمنوں کی اصلاح کے لئے دعا میں فرماتے۔ آپ نے کبھی کسی کے لئے بدعنانہ کی۔ آپ حُسنِ اجلاق کے مجسم بکیر تھے۔ آپ نے زندگی کے ہر شعبہ میں اخلاق کے وہ مایہ ناز نمونہ چھوڑے ہیں جو رہتی دنیا تک سنسلیں رہیں گے۔ آپ نے ہمسائوں سے ہمیشہ محبت اور شفقت سے پیش آنے کی تلقین فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ ہمسائے کے بہت حقوق ہوتے ہیں یہاں تک کہ ہمسایہ رشتے دار سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

ہمارے سرکار اور پیادہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجسمِ عمل تھے۔ اپنا کام خود اپنے دست مبارک سے کیا کرتے تھے۔ سرکارِ دو عالم اپنے پچھے پرانے کپڑے خود سی لیتے۔ کبریا کا دودھ خود دودھ لیتے۔ اپنے جوئے خود گانٹھ لیتے۔ جھاڑو خود دے لیتے۔ غرض گھر کا ہر کام خود کر لیتے تھے۔ حضور اکرمؐ نے ہمیشہ مساواتِ بھائی چارے اور سادگی کا درس دیا۔ آپ نے بے جا صرف اور فضول خرچی سے منع کیا اور فرمایا میانہ روی اختیار کرو۔ حضور اکرم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ عفو و درگزر کی تلقین فرمائی کرتے اور کہا کرتے کہ مسلمانوں کے لئے بہتر ہے کہ دشمن کو معاف کر دے اگر کسی سے

غلطی سرزد ہو گئی ہو تو اُسے درگزر کر دے۔ غصے کی حالت میں اپنے نفس پر قابو رکھے۔ جس نے اپنے غصے پر قابو رکھا اس نے اپنے آپ کو ہلاکت سے بچا لیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر تمام دشمنوں کو معاف کر دیا تھا اور یہاں تک کہ اپنے چچا حضرت حمزہؓ کو قتل کروانے والی عورت منہ نہ کو بھی معاف کر دیا۔

تجارت میں آپؐ نے عملی طور پر حصہ لیا اور اس کے ساتھ ساتھ آپؐ نے تجارت کے فضائل اور اصول بیان فرمائے۔ مسلمانوں کو تجارت کی ترغیب دلاتے ہوئے فرمایا کہ سچا امانت دار تاجر قیامت میں انبیاء اور سچے لوگوں کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ آپؐ نے تجارت کے غلط طریقوں سے منع فرمایا۔ چنانچہ آپؐ کا ارشاد ہے کہ ذخیرہ اندوزی کرنے والا۔ لعنتی ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا جس نے ذخیرہ اندوزی کی وہ گناہ گار ہے۔ طلاوت کی مذمت کرتے ہوئے کہا جس نے دھوکا دیا وہ میری آمت میں سے نہیں۔

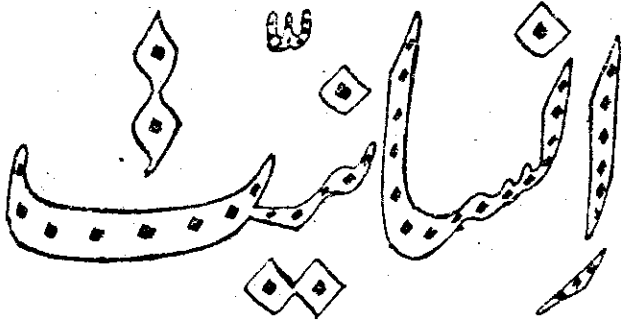
قربان جانیے اس معنی انسانیت اور رحمت اللعالمین کے جنہوں نے عملی طور پر مزدوری فرما کر مزدوروں کے حوصلے بلند کر دیئے اور معاشرے میں ان کو باعزت مقام دلایا۔ مسجد نبویؐ کی تعمیر میں حصے لے کر آپؐ نے پتھر۔ مٹی اور گارا اٹھانے والوں کی رہنمائی کی صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم سے زیادہ پتھر حضور اکرمؐ نے اٹھائے تاکہ آنے والا مزدور آپؐ کا اسوہ حسنہ دیکھ کر احساسِ فرض کا حامل بنے۔ آپؐ نے فرمایا کہ مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا علم کو طلب کرو خواہ تمہیں اس کے لئے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ ایک دوسرے مقام پر فرمایا۔ گہوارے سے لے کر تبریکِ علم حاصل کرو۔ ایک اور مقام پر تمام مسلمانوں پر علمِ دین کا طالب کرنا فرض قرار دیا۔ آپؐ نے فرمایا میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ تاکہ تمہارے اخلاق کو مکمل کر دوں۔

آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہمیشہ بچوں سے پیار تھا وہ بچوں سے محبت

اور شفقت سے پیش آنے کی تلقین فرماتے۔ آپ کو بچوں سے اتنا پیار تھا کہ آپ جب کبھی بچوں کے قریب سے گزرتے تو کمال شفقت سے ان کو سلام کرنے میں پہل کرتے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ والدین اپنے بچوں کو جو سب سے قیمتی اور اعلیٰ تحفہ دے سکتے ہیں وہ بچوں کی اچھی تربیت اور اچھی عادتیں پیدا کرنے کا تحفہ ہے۔ آپ نے فرمایا وہ ہم میں سے نہیں جو چھوڑوں پر شفقت اور بڑوں کا ادب نہیں کرتا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ لوگوں کو خدا کی راہ میں خیرات کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ حضرت ام سلمیٰ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں رنجیدہ تشریف لائے میں نے رنجیدگی کا سبب پوچھا۔ آپ نے فرمایا ام سلمیٰ اکل جو سات دینار آئے تھے، شام ہو گئی تھی وہ میرے بستر پر پڑے رہ گئے تھے۔ خیرات کرنے میں دیر ہو گئی۔

دنیا سے رحلت کے وقت جب آپ بیمار تھے تو آپ کو خیال آیا کہ چند اشرفیاں گھر میں موجود ہیں۔ آپ نے انہیں خیرات حکم دیا۔ فرمایا جلدی کرو۔ ایسا نہ ہو کہ میں اس سے رخصت ہو کر جب اپنے رب سے ملوں تو اس وقت میرے گھر میں اشرفیاں موجود ہوں۔





یہ شہادت ہے اُس انساں کی کہ اب حشر تک
 آسمانوں سے آئے گی انساں انساں

رضوان علی

یہ میری خوش قسمتی سمجھیں یا یہ کہ میری زندگی کا رخ اس طرف مڑ گیا — خدا جانے
 کیا قصہ ہوا کہ تقریباً ساری ہی زندگی اس طرح سٹیج پر کچھ نہ کچھ ہونے لگ گئی اور چھوٹے
 بڑے ہر قسم کے مجمعوں میں کچھ نہ کچھ بات ضرور کی — زیادہ تر میری گفتگو کا موضوع
 یہی تذکرہ محمد و آل محمد رہا — اور اسی مناسبت سے شاید ان طلباء نے بھی مجھے
 حکم دیا کہ زبان اگر کچھ عرض کروں — بہت ہی ڈرا — یہاں میں اتنا ڈر رہا تھا
 اتنا ہوا کہ مجھے دو تین طالب علم پکڑ کے لٹے ہیں — ایک بے پڑھا لکھا آدمی مدرسے
 میں آتے ہوئے ڈرتا ہے — مجھے بڑا ڈر لگا کر وہاں آ کے میں کیا کہوں —
 طلبہ کا مجمع ہے — اہل علم کا بھر مٹ ہے — بال کی کھال نکالنے والوں کا مجمع ہے —
 سہ بات کو سچنے سمجھنے والوں کا اجتماع ہے — ستاروں کو تہید کرنے والوں کا مجمع ہے
 حکمت کی نہریں جاری کرنے والوں کا مجمع ہے — سائنس کے دیباہنہ والوں کا مجمع ہے —
 چاند پکندیں پھینکنے والوں کا اجتماع ہے — ذروں کا جگر پھاڑنے کے قیامت ڈھانے
 والوں کا مجمع ہے — دنیا جبر کے سائنس اور عقل و فلسفے اور منطق کو دل میں سمونے
 والوں کا مجمع ہے —

اور کہنے والا ازکار رفتہ بوڑھا آدمی — بھلا میرا آپ کا کیا ربطہ کیا جوڑہ؟ میں
 جس زمانے کی آپ سے بات کر دنگا وہ زمانہ آپ سے کبھی کا پرانا ہو گیا — نئی بات
 مجھے آتی نہیں — اگر پرانے یونیورسٹی کیس میں کوئی بلا تو چلا جانا — نیو کیس میں پرانا
 آدمی — تو بھائی ٹیرے ذہن میں تو کوئی بات تم سے کہنے کے لئے ہے نہیں —
 نہ کوئی موضوع ہے ایسا جو تمہارے سامنے بیان کیا جائے نہ کوئی گفتگو — بڑے ہی
 شوق سے بے خودی کے عالم میں وہ سن رہا تھا جو باتیں ہو رہی تھیں — بڑی اچھی

شاعری، بہترین نثر کی گفتگو — میرا دل لگا ہوا تھا کہ ستارہ ہوں — اچانک حکم ہوا کہ تو بھی کھڑا ہو کے کچھ بول — اب یہ طلبہ خود بہتر جانتے ہیں کہ اپنی محفل میں کتنا ہی چپکنے والا ہو طالب علم، جب سبق سنانے کا موقع آتا ہے تو بات اور ہو جاتی ہے — اب میں اتنے استادوں کے سامنے سبق سنانے کھڑا ہوا ہوں — کہیں بھول جاؤں، کہیں غلطی ہو جائے — کہیں اور کوئی بات ہو جائے تو میں کیا کہوں؟ کیا بات کروں؟ بہر کیف ایک مذہبی ماحول میں گفتگو کرنے والا آدمی اپنی بات مذہبی طور سے ہی شروع کرتا ہے — پتہ نہیں آپ کو میرا مذہبی طرز پسند بھی آئے گا یا نہیں؟ — میں دہی مذہبی باتیں جو میں کیا کرتا ہوں —

مسلمان بچو! — مسلمان بچو میں نے اس لئے کہا ہے کہ اس مجمعے کے سامنے مجھے یہ ثابت کرنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ اسلام کوئی بڑا اچھا مذہب ہے — اس لئے کہ یہاں سبھی مسلمان ہیں — تمہیں اسلام کی خوبی بتانے کی کیا ضرورت ہے — ہونا! مسلمان؟ آپ تو سب ہی مسلمان، خدا کے فضل سے — اور یہ اللہ کا احسان ہے کہ اللہ نے آپ کو پیدا ہی مسلمان کیا — یہ اللہ کا فضل ہے نا — اگر اللہ کسی مسلمان کی بجائے کسی عیسائی یا یہودی کے گھر میں پیدا کر دیتا — ہو سکتا ہے ہم وہی ہوتے — اس لئے مسلمان ہیں کہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے — کیوں بھی یہی ہے نا، ایسا تو ایک آدھ آدمی کہیں کوئی ہوتا ہے — جو پیدا کہیں ہو — عیسائی وغیرہ کے گھر اور اپنی تحقیق سے مسلمان ہو — یہ بہت کم مثالیں ہوتی ہیں — عام طور پر مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گئے لہذا مسلمان ہیں — اور ایک اور مشکل بنتی ہے — تمہیں تو اندازہ نہیں اس بات کا کہ میں پیدا ہوا مسلمان کے گھر میں — لہذا ہوں میں مسلمان — اگر خدا نخواستہ خدا نخواستہ توبہ، توبہ — ایسا ہونے کبھی — اگر میں ہو جاؤں عیسائی — اور پکا کٹر عیسائی ہوں — بڑا ہی

مزد عیسائی بنوں۔ مگر ساری زندگی عیسائیوں کو مجھ پر خبیہ رہے گا کہ ممکن ہے جاسوس ہو۔ ہو سکتا ہے مسلمانوں نے جاسوس کر کے بھیجا ہو۔ انہیں مجھ پر یقین ہی نہیں آئے گا۔ جب بیٹھا کریں گے آپس میں چار عیسائی کہیں گے۔ ہونہ ہو، ”وہ جوتوں ہو ہی ہے“۔ یہی کہا کریں گے۔ قسمیں کھاؤں۔ لاکھ انزار کروں۔ کچھ بھی کہوں۔ مگر وہ کہیں گے۔ ”اُدہوں ہے وہی“۔ تو کیوں شبہ رہے گا مجھ پر مسلمان ہونے کا ساری زندگی، اب وجود میرے تردید کرنے کے۔ چونکہ میں پیدا ہو گیا ہوں مسلمان کے گھر میں۔ سمجھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو شخص جس کے گھر میں پیدا ہوا۔ یہ کچھ قدرتی سمجھا بات ہے۔ وہ لاکھ کہے کہ میں وہ نہیں ہوں۔ مگر جس گھر میں پیدا ہوا جائے۔ اس پر شبہ و ہتک ساری زندگی۔ ہونہ ہو وہی ہے۔ جس گھر میں جو پیدا ہوگا۔ تو یہ بات ہے بھائی۔ ہمیں خدا نے مسلمان گھر میں پیدا کر دیا۔ ہم اللہ کے فضل سے مسلمان ہیں اور ہم مسلمان کا یہ (نور) ایمان ہے کہ اللہ نے جب اس کائنات کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا اور یہ میں پڑھے لکھے حضرات کے سامنے پھر کہہ دوں کہ یہ جو الفاظ ہم استعمال کریں گے گفتگو میں۔ خدا سے متعلق، رسول سے متعلق تو یہ الفاظ ہیں جو ہماری عقل کی رسائی میں بڑے اچھے الفاظ ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ صحیح معنوں میں ان کی شان کے مطابق بھی ہیں جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اللہ کے لئے الفاظ ہمارے پاس ہیں۔ جن سے ہم اللہ کا ذکر کر سکیں۔ بس اللہ کے لئے ایک ہی لفظ ہمارے پاس ہے۔ کیا؟ کہ بس اللہ۔ اللہ کیا ہے؟ اللہ یعنی اللہ کیا ہے۔؟ اللہ آگے؟ کہ اللہ ہی اللہ خیر صلا۔ بس اللہ۔ اللہ کیا ہے؟ اللہ۔ اور کوئی لفظ اجماعی تک ہے ہی نہیں ہمارے پاس اللہ کے لئے سوائے اللہ کے۔

اور بڑے سے بڑے علمائے اہل علم۔۔۔۔۔ بڑے بڑے علمائے کرام بھی جب اللہ کی بات کرتے ہیں تو عجز برہو کے۔۔۔۔۔ تو وہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانان اللہ۔۔۔۔۔ اسے بھی اللہ تو ہے، کیا کریں اللہ کو۔۔۔۔۔ تو کہتے ہیں۔۔۔۔۔ مسلمانان اللہ سے ڈرو۔۔۔۔۔ سنا ہے یا نہیں تم نے؟ اللہ سے ڈرو۔۔۔۔۔ سنا ہے تا؟ مسلمانان اللہ سے۔۔۔۔۔ عالم کا وہ غلط قبیلہ و کعبہ کافرمان، مودان کا ارشاد۔۔۔۔۔ طنز بیٹھے میں سامنے۔۔۔۔۔ اللہ سے ڈرو۔۔۔۔۔ اور ڈرو اللہ سے۔۔۔۔۔ اللہ سے ڈرو۔۔۔۔۔ ایک دفعہ سنا دو دفعہ چار دفعہ، دس دفعہ۔۔۔۔۔ آخر بار بار اولی صاحب نے اللہ سے جو ڈرایا تو خدا شہاد ہے۔۔۔۔۔ کائن کے دشمن کا تو مجھے پتہ ہے۔۔۔۔۔ یہ تو اتنے ڈر گئے ہیں اللہ سے کہ جہاں اللہ کا ذکر ہوا ڈر کے مارے نہیں جاتے۔۔۔۔۔ مولوی صاحب جو کہتے ہیں، اللہ سے ڈرو۔۔۔۔۔ رشتہ چلے جا رہے ہیں، سدا سے سجد آجائے۔۔۔۔۔ چکر اگے گزرتے ہیں۔۔۔۔۔ کیوں بھی چکر اگے کیوں گزرے۔۔۔۔۔ کہ کبھی سب سے پہلے ہے۔۔۔۔۔ پھر؟ کہ اللہ سے ڈرو۔۔۔۔۔ مولوی صاحب نے کہا تھا۔۔۔۔۔ ہم اللہ سے ڈرتے ہیں۔۔۔۔۔ تو اللہ سے ڈرا ڈرا کے، ڈرا ڈرا کے۔۔۔۔۔ ایمان سے ہم لگلا کا لڑا اہمال ہوا ہوا ہے۔۔۔۔۔ اور کوئی ہم میں سے جرأت کر کے مولوی صاحب نہیں کہتا۔۔۔۔۔ مولوی صاحب، اللہ سے ڈرو۔۔۔۔۔ کیوں اللہ کے بندوں کو اللہ سے ڈرا رہے ہو، خواہ مخواہ کے لئے۔۔۔۔۔ بھلا اللہ سے ڈرنا بھی کوئی انسانیت ہے؟ اللہ کے بندوں کو اللہ سے ڈرنا بھی کوئی بات ہے۔۔۔۔۔ بس ڈرا رہے ہیں۔۔۔۔۔ کیوں بھائیو! ڈر تو اردو زبان کا لفظ ہے۔ ڈر کے معنی میں پچنا۔۔۔۔۔ کس سے پچنا؟ اُس سے پچنا، جس سے اندیش ہو ستانے کا۔۔۔۔۔ جس سے اندیش ہو دکھ پہنچانے کا۔۔۔۔۔ جس سے اندیش ہو اذیت پہنچانے کا۔۔۔۔۔ اب بتاؤ اللہ کوئی سانپ ہے؟ بچھو ہے؟ کیا ہے؟ جو اس سے ڈریں۔۔۔۔۔ ہیں ستانا

ہے؟ ہمیں نقصان پہنچاتا ہے؟ ہم پر ظلم کرتا ہے؟ ہمیں اذیت دیتا ہے؟

پھر ڈرو کیوں اللہ سے — بولو بھی — کہتے ہیں ڈرو — کیوں ڈرو —

کیا وہ بے ڈرنے کی؟ کیا اللہ ہم پر مہربان نہیں — اللہ ہمیں پیار نہیں کرتا —

اللہ ہم سے محبت نہیں کرتا — اللہ کو ہم سے پیار نہیں — ہم سے زیادہ ہم سے

پیار نہیں ہے اللہ کو — اللہ جیسا پیارا، اللہ جیسا محبوب، اللہ جیسا اچھا —

اللہ جیسا حسین — اللہ جیسا معشوق — اس سے ڈرا ڈرا کے مار دیا لوگوں کو

— کہ اس سے ڈرو — اللہ سے — یاد رکھو میرے محترم بھائیو، بہنو، عزیزو

— اگر کوئی مولوی صاحب کہیں تو بے شک میرا نام لے دینا — گناہ میرے ذمے

— اللہ سے مت ڈرو — سمجھے — اللہ ڈرنے کی چیز نہیں ہے — اللہ ڈراؤنی

شے نہیں ہے — اللہ ظالم نہیں ہے — اللہ ستا تا نہیں ہے — دیکھو

بچو، اللہ محبوب ہے، اللہ معشوق ہے، اللہ پیارا ہے — اللہ حسین ہے —

سمجھے جب وہ حسین ہے، وہ محبوب ہے — وہ پیارا ہے — اس لئے اس میں

ادا میں بھی بڑی ہیں۔ اور اس کی اداؤں میں ایک بڑی ادا یہ بھی ہے کہ وہ ذرا روٹھ جانا

ہے — تو ڈرو اس بات سے کہ اللہ کہیں تم سے روٹھ نہ جائے — کہیں ناراض

نہ ہو جائے — یہ تو سکہ بات ہے کہ جتنا بڑا حسین ہوگا، اتنا ہی بڑا نازک

مزاج ہوگا — جتنا بڑا حسین ہے اللہ، اتنا ہی بڑا نازک مزاج ہے — ذرا

سی بات پہ روٹھ جاتا ہے — ہر وقت ڈرتے رہو کہ کہیں روٹھ نہ جائے —

اگر روٹھ گیا تو پھر "یار منادوں اوکھا" — پھر اُسے منانا بڑا مشکل ہوگا —

تو اللہ سے اس بات سے ڈرو کہ کہیں وہ تم سے روٹھ نہ جائے اور دیکھو میری بات

سنو عزیزو! — اللہ کو یاد رکھو — سمجھے — اللہ کو یاد رکھو —

مولوی صاحبان ہمارے سامنے ترمیم کرتے ہیں — اذکر اللہ ۵ — اللہ کو یاد کرو —

تو میں کہتا ہوں۔ مولوی صاحبان جانے بھی دو۔ یہ ترجمہ عربی کا نہیں ہے۔ اللہ کو یاد کرو۔ یاد کرو میں کوئی سواد ہی نہیں۔ یاد کرو میں کوئی لطافت ہی نہیں۔ سن رہے ہونا بھی میری بات؟ پکٹی بات؟ جب سنے سے تمہارا دل بھر جائے کہہ دینا میں اسی وقت بیٹھ جاؤں گا۔ جب تک سنتے رہو گے میں تمہیں سنا تا رہوں گا۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کسی نے سنائی تمہیں۔ جب تک سنتے رہو گے میں سنا تا رہوں گا تو دیکھو بھائی یہ ترجمہ غلط ہے۔ اللہ کو یاد کرو۔ یاد کرو کو اگر زندگی میں ایک دفعہ یاد کرو تو پورا ہو گیا۔ عید کے دن کہہ دیا۔ یا اللہ۔ یاد کرو پورا ہو گیا۔ باقی سال یاد نہ کرو بے شک۔ یہ کون سی بات ہے۔ چاہے کسی ذلت بھی یاد نہ کرو۔ کوئی بات ہی نہیں۔ اللہ کو ایک دفعہ بھی کہہ دیا۔ یا اللہ۔ یاد کرو پورا ہو گیا۔ باقی سال یاد نہ کرو۔ بے شک یہ کون سی بات ہے۔ چاہے کسی ذلت بھی یاد نہ کرو کوئی بات ہی نہیں۔ اللہ کو ایک دفعہ بھی کہہ دیا اللہ۔ یاد کرو پورا ہو گیا۔ اللہ ہم سے یاد کرو کا مطالبہ نہیں کرتا۔ اللہ کہتا ہے۔ فَأَذْكُرْنِي ۝ کیا معنی؟ اللہ کو یاد رکھو۔ اب تم خود تباؤ پڑھے لکھے پنجو۔ یاد کرو اور یاد رکھو میں کوئی فرق ہے کہ ہیں۔ بولو بھی اللہ کو یاد کرو اور بات ہے۔ اللہ کو یاد رکھو۔ اب سوچو کوئی فرق ہے یا نہیں اس میں ہے یا فرق؟ اور پھر آیت کا اگمہ تیور دیکھو۔ آیت کا اگر لہجہ دیکھو پھر ترجمہ کرو تو یہ ترجمہ بے گاس کا اللہ کو یاد رکھو، دہنہ یاد رکھو پھر یہ ترجمہ بنتا ہے اور ترجمہ ہی نہیں بنتا کوئی۔ تو اللہ ہمیں یاد ہے۔ ہم اسے یاد رکھتے ہیں اور اللہ کا ہی ذکر کرتے ہیں محفل میں، مجلس میں مسلمانوں کی تو میرے بھائی بھائی۔ اللہ نے ارادہ کیا کہ کائنات کو پیدا کرے تو اس نے کائنات کو پیدا کرنے میں ہم مسلمانوں کے استفاد کے مطابق۔ اس کے دلائل کے لئے اس وقت ذلت نہیں

چونکہ سب مسلمان مانتے ہیں اول مخلوق جو پیدا کی — وہ تھا نورِ حضورِ سرورِ کائنات ۴
 کیوں مسلمانو! ہمارا یہ ایمان ہے یا نہیں؟ ہم مانتے ہیں یا نہیں — اول مخلوق — پہلی
 شے جو اللہ نے بنائی — سب سے پہلے جو بنایا — وہ تھا حضورِ رسالت مآب کا
 نور — سمجھے نا حضور؟ اور جب نورِ حضورِ کائنات بنا دیا نا! — تو اس کیسے نے
 گوارا نہ کیا کہ میں بھی اکیلا اور بنا ہوا بھی رہے اکیلا — لہذا اسے کے چاروں طرف
 چار چاند لگا دیئے — تاکہ یہ چار، پارچ ہو جائیں — میں اکیلا رہوں۔
 اب جب یہ چار پارچ ہو گئے تو اور ترقی کی — انہیں بارہ چودہ بنا دیا۔ جب بارہ
 چودہ بن گئے تو اللہ نے ایک یونیورسٹی کھول دی کہ یہاں بیٹھ کے کیا کرو گے۔
 یونیورسٹی کھل جاتے — تم تعلیم دیا کرو — تم پڑھایا کرو — اور ایک لاکھ
 چوبیس ہزار طالب علم اس یونیورسٹی میں داخل کر دیئے — اور محمد ہو گئے اس کے
 وائس چانسلر — اور بارہ چودہ ہو گئے پروفیسر اور ایک لاکھ چوبیس ہزار پڑھنے
 بیٹھ گئے — جو طالب علم پاس ہوتا رہا، ڈگری ملتی رہی عہدہ لے کے آتا رہا —
 کسی کو زمین پہ پانی بہانا سکھا دیا اور آگیا — کسی کو آگ کو گلزار بنانا سکھا دیا اور آ
 گیا — کسی کو وائرس پہ بات کرنے کا طریقہ سکھا کر کلیم بنانا سکھا دیا اور آگیا — کسی کو
 موت سے ٹھکر لے کے ہمیشہ جینا سکھا دیا اور آگیا — غرض اپنا اپنا پڑھ کے سارے
 شاگرد آتے رہے — تو جو ہے نا صاحبان — جب ایک لاکھ چوبیس ہزار ہو کے
 آگئے اور سب اپنا اپنا کام کر گئے تو اللہ نے اساتذہ کرام کی طرف دیکھا — جو چودہ
 پڑھانے والے تھے اور جوان کے راس و رئیس تھے — حضور محمد مصطفیٰ — ان کی
 طرف دیکھا — اور دیکھ کے یہ کہا ہوگا — ہوگا لفظ یاد رکھنا — یہ ہوگا
 لفظ میں آپ کے ڈر کے مارے کہہ رہا ہوں — کہیں پوچھنے لگو کہ یہ کس کتاب
 میں لکھا ہے — کتاب میں نہیں، یہ میرے دل کی کتاب میں لکھا ہے — یہ کہا ہوگا۔

— کہ محمد سنتے بھی ہو۔ شاگرد تو اپنا اپنا کام کر کے چلے گئے۔ اب
 اگر مناسب سمجھیں تو آپ خود چلے جائیں ذرا۔ کیوں کیا خیال ہے؟ جاؤ گے؟ جانا
 ہے؟ کیوں محمد جاؤ گے؟ جانا ہے؟ ہیں؟ کیا بات ہے؟ جاؤ گے؟ دیکھو محمد
 سنو، اگر باقی نبیوں کی طرح تم بھی نبی ہوتے تو حکماً بھجیتا۔ جاؤ۔ محبوب جو ہوتے
 — اس لئے پوچھتا ہوں۔ جانا ہے؟ جاؤ گے؟ کیا خیال ہے؟ جانا ہے؟
 اچھا جا رہے ہو۔ بسم اللہ تشریف لے جاؤ۔ بہت اچھا تمہاری مرضی
 ہم تو تمہاری مرضی دیکھتے ہیں۔ چلے جاؤ۔ ہیں؟ مگر کیا؟ تم تو اداس ہو گئے
 — محمد! اداس نہ ہو۔ اگر وہاں کبھی دل گھرا جائے تو مل جایا کرنا۔ جاؤ؟
 پوچھا جا کے اب کریں کیا۔ کہ اب جا کے۔ اب تک جو سوالا کھ پڑھے تھے وہ
 پرانی یونیورسٹی میں پڑھے تھے۔ تم سکتے میں جا کے۔ ایک جنگل میں بالکل ریگستان
 میں نیوکیمپس قائم کر دینا۔ بالکل نئی یونیورسٹی قائم کر دینا۔ اب کے ایک بالکل نئی
 یونیورسٹی قائم ہو جائے نیوکیمپس بن جائے۔ دنیا بھی کیا یاد کرے گی کہ پڑھنے کا طرز بدل
 گیا۔ انداز بدل گیا۔ بالکل نیوکیمپس قائم کر دو وہاں جا کے۔ سمجھے
 — بہت اچھا۔ تم اس یونیورسٹی کے ہو گے اپنا ریح اور آگے طلبہ تمہارے
 آئیں گے۔ انہیں پڑھایا کرنا۔ بالکل نیوکیمپس قائم کر دینا وہاں جا کے۔
 بہت اچھا۔ اب چلے وہاں سے۔ جا رہے ہو؟ کہ ہاں۔ اور یہ
 نعل میں کیا ہے؟ کہ یہ میری کتاب ہے۔ اسے پڑھ پڑھ کے دنیا کو پڑھاؤنگا
 یونیورسٹی میں۔ اچھا تم ایک کام کرو۔ کتاب یہیں چھوڑ جاؤ۔ تم خود
 جاؤ۔ کہ اگر کتاب یہاں رہ گئی تو وہاں پڑھاؤنگا کیا۔ کہ واد محمد۔
 لو اتنی بات بھی تم مجھ سے پوچھتے ہو۔ دیکھو جب بڑے آدمیوں کے بچے گھر سے
 کالج آتے ہیں تو ان کی نعل میں بستے نہیں ہوتے۔ ان کے نوکر پیچھے بستہ لے کر آتے

ہیں۔۔۔۔۔ آپ تشریف لے جلیں۔ آپ کی یہ کتاب آپ کا نوکر جبرائیل لے کر حاضر ہو گا۔۔۔۔۔ آپ تشریف لے جلیں کتاب وہ لے کر آئے گا۔۔۔۔۔ جا میں آپ اور دیکھو ایک بات سنو۔۔۔۔۔ جہاں میں تمہیں بھیج رہا ہوں نا، وہاں جانساز بنا کے۔۔۔۔۔ وہاں جا کے بالکل نہ پڑھنا۔۔۔۔۔ وہاں پڑھو گے تو میری بی بی نکالی بات بگاڑ جائے گی۔۔۔۔۔ کون، بچہ، تم مجھے ایک بات بتاؤ۔ تم جو مجھے لاکھوں سے لاکھ ہو کار میں چھوٹے بڑی عزت سے اور مجھ سے کہا۔۔۔۔۔ زید کو احباب ایک آکر رو کر دو۔۔۔۔۔ اب زید کا صاحب کھڑے ہوئے بیان نظر کر کے۔۔۔۔۔ جیسا میں سے نکال سکے گا وہاں سے پڑھنا شروع کر دیا۔۔۔۔۔ آپ نے کہ بسم اللہ۔۔۔۔۔ کتاب پھول کو دیکھتے ہو۔۔۔۔۔ ہاتھ سے ٹھہرنے کا اشارہ ہے۔۔۔۔۔ زید کی بی بی نے کہا کہ زید ہاتھ سے ٹھہرنے اور اشارہ کرنے کا اشارہ ہے اسے تباہ پڑھو تا کچھ۔۔۔۔۔ زید کی بی بی نے کہا کہ تیرے ہاتھ پر اب ہاتھ سے ٹھہرنے کا اشارہ ہے۔۔۔۔۔ زید نے کہا کہ ہاتھ پر ہاتھ تو پڑھ لوں۔۔۔۔۔ سارے لڑکے اٹھ کر چلے گئے۔۔۔۔۔ جھکیا کیوں پیسے گئے۔۔۔۔۔ کہ اس پاگل مولوی کو کون مانے جو یہاں آئے بڑھے۔۔۔۔۔ اب وقت بڑا جنرل علی کی تندر رہا ہے اور اشارہ کا وقت قریب آ جا رہا ہے۔۔۔۔۔ اس لئے یہ بات فتنہ کرنا ہے۔۔۔۔۔ بہر حال یہاں آ کے مکتب کھولنا۔۔۔۔۔ دیکھو یوں کر دو۔۔۔۔۔ پیسے زیادہ غالب علم ہو تو بڑھ کر۔۔۔۔۔ قحور کی سی خوش رکھنا۔۔۔۔۔ اپنے گھر والوں کو چھینچ کر دو۔۔۔۔۔ پیسے ان سے تسلیم شروع کرو۔۔۔۔۔ جب وہ آج رہا ہے۔۔۔۔۔ پھر اور تمام سے بات کرنا۔۔۔۔۔ اندر سے لے کر باہر کے لے کر۔۔۔۔۔ اپنے انزب اٹھنے کو قریب دار۔۔۔۔۔ پھر اور وہاں سے بات کرنا۔۔۔۔۔ جب پتہ چلے گا تو یہاں کہیں میں اپنی کلاس چاہیں طالب علموں کو کھلی۔۔۔۔۔ جو رسموں کے اپنے کھڑے گئے۔۔۔۔۔ وہ آسکے بیٹھ گئے جناب پڑھنے کے لئے۔۔۔۔۔ اور ہر سب دن کئی

نہیں — طالبِ علی میں سن و سال نہیں دیکھا جاتا — پڑھنے کے شوق میں بچہ بھی
 پڑھ سکتا ہے — بوڑھا بھی پڑھ سکتا ہے — یہ اور بات ہے کہ بچے کا
 ذہن تیز ہوتا ہے — اب مجھے اتنا اچھا یاد نہیں ہو سکتا جتنا تمہیں یاد ہو سکتا ہے —
 — تو جناب اس میں رسولِ مہکامہ سارا خاندان اکٹھا ہو کے بیٹھ گیا — چالیس آدمی بیٹھ
 گئے — بھئی ہمیں یہیوں بلایا ہے — کہ میں نے ایک نئی تعلیم گاہ قائم کی ہے —
 میں اس میں درس دینا چاہتا ہوں — اگر میرا علم تم نے پڑھ لیا اور سمجھ گئے
 آسے تو ساری دنیا کی حکومت تمہارے قدموں میں ہوگی اور عاقبت کی نجات تمہارے پاس
 ہوگی — میں ایسی چیز تمہیں بتانے کے لئے آیا ہوں — کہ اچھا بناؤ — تو میرے
 محترم سامعین — اللہ تمہیں سلامت رکھے — محمد مصطفیٰ جیسا معلمِ اعظم اور
 اس کی پہلی کلاس — پہلی کلاس میں اتنے بڑے معلم کی تقریر — پہلی گفتگو —
 تمام طلبِ گوشِ ہوش کھولے بیٹھے تھے سننے کے لئے کہ دیکھیں کیا کہتا ہے — مگر معلم
 اتنا عالمگیر معلم تھا کہ وہ صرف اس جامعیت کا معلم نہیں تھا بلکہ عالمین کا معلم تھا — عالم کی
 ہر شے کا معلم تھا — اُدھر اس نے تقریر کرنے کے لئے گلا صاف کیا — ...
 ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں — اُدھر اس نے کہا ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں — ادھر کائنات کی
 ہر شے سراپا گوش بن گئی سننے کے لئے — سمجھے نا حضور؟ درختوں کا پھو پھو کان
 ہو گیا سننے کے لئے — ہر ذرہ دوش ہوا پہ سوار ہو گیا سننے کے لئے — فلک
 نے ستاروں کی بلیک لگالی سننے کے لئے — چلتا ہوا سورج ٹھہر گیا سننے کے لئے
 — چاند کے سینے پہ داغ پڑ گیا سننے کے لئے — سوا لاکھ انبیاء آسمانِ اول
 پہ اتر آئے سننے کے لئے — اللہ نے کہا — ما شاء اللہ — قدرت نے کہا
 — سبحان اللہ — فطرت نے کہا — بسم اللہ — اور محمد نے تقریر شروع کی
 زلفِ الہام کو شانہ ہونے لگا — شہیدِ جبریلؑ کو جنبش ہونے لگی — اور تقریر میں

فرمایا کہ میں تمہارے لئے خیر دنیا اور آخرت لے کے آیا ہوں۔ بولو ایسا کون
 تاگر دہے جو میرے علم کو اچھی طرح سمجھ کر اس معاملے میں میرا ساتھ دے اور میرے
 بعد میری درسگاہ کا پرنسپل بنے۔ بولو کون ہے؟ بس ادھر اعلان ہوا
 --- خیر دنیا اور آخرت کا پیغام لایا ہوں --- چالیس کے چالیس سامعین
 خاموش بیٹھے رہے۔ مگر --- دنیا کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی --- عالم کی
 چلتی ہوئی نبضیں عکس گئیں --- جب رسول کی آواز پر لیک کھنکے کے لئے کونے
 سے ایک دس سال کا بچہ اٹھا --- سمجھے نا حضور؟ پوری پچیس کی ادا --- پیروں پر
 مٹی پڑی ہوئی --- کرتے کے ٹن کھلے ہوئے --- جیبوں میں خرے بھرے ہوئے
 پوری پچیس کی ادا سے کونے سے ایک بچہ اٹھا --- قبضہ ذرا اب کے فرماؤ کیا کہا
 ہے؟ --- یہ اب کے فرماؤ اس نے کہا تھا کہ کام تو بچتے ہی کریں گے آپ کا --- قربانی
 دیں گے --- مرٹیس گئے --- مگر پہلے ہم سمجھا دیں کہ چاہتے کیا ہیں؟ بے سمجھے بوجھے
 ساتھ ہر لینا عقلمندوں کا کام نہیں --- پہلے ہم سمجھ لیں کہ کیا کہہ رہے ہو --- ہاں
 سجدہ میں بھی تڑا جاتے آپ چاہتے کیا ہیں --- ہاں حضور ذرا اب کے فرمائیں آپ چاہتے
 کیا ہیں؟ کہ بیٹا، بچتے، برنوردار --- میں یہ کہہ رہا ہوں کہ کون ہے جو اس معاملے میں
 میرا ساتھ دے گا --- بس یہ کہنا تھا کہ کون ساتھ دے گا --- بچتے نے اڑیاں اٹھا
 کے کہا --- انا ناصر حرکت یا رسول اللہ --- اے اللہ کے رسول میں تیرا نام
 ہوں --- میں تیری مدد کروں گا --- بیٹا --- یہ بچوں کا کھیل نہیں --- "قبضہ میں جان
 پھیل کے کہہ رہا ہوں" --- بیٹا یہ بڑا مشکل کام ہے --- کہ --- "تو ایجاہ" --- میں
 مشکل کشتا جو ہوا --- مشکل کام سمجھ کے کہہ رہا ہوں کہ میں تیرا ساتھ دوں گا ---
 یا محمد نہیں --- اگر یا محمد کہہ کے وعدہ کرتا تو زندگی بھر وعدہ تھا ---
 یا رسول اللہ، میں تیری نصرت کروں گا --- گویا جب تک تیری رسالت ہے، میری

نصرت ہے۔ جہاں جہاں تیری رسالت ہے، وہاں وہاں میری نصرت ہوگی
 میں نیر سے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا کروں گا۔ گویا آج سے دُنیا متعارف ہوئی علی
 سے۔ وہ چالیس آدمیوں کا مجمع جو رسول کی تقریر سن رہا تھا اس بچے کی طرف دیکھتا
 رسولؐ نے مسکرا کے کہا ”میں بھی یہی چاہتا تھا۔ کہ مجھ سے نظر ہٹے تو اس پہ آئے
 رُسکے۔“ دیکھو یہ بچہ کتنا ہے۔۔۔ آج طالبِ پیچھے۔۔۔ عیبِ علمِ پیچھے۔ اس
 بچے کی تقلید میں جس نے معلمِ اعظم کے فرمان پہ وعدہ کیا تھا۔ میں تیرا ساتھ دوں گا۔
 آرزو اس کا ذکر کرنے کے لئے نئے کیمپس میں بچے لکھتے ہیں۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ
 اس دس سالہ بچے نے تجوہِ وعدہ کیا تھا کہ تیری تعلیم پر میں عمل کروں گا۔ آج اس نے کس کس
 طرح عمل کیا ہے۔۔۔ کہیں عمل میں نسیل تو نہیں ہوا۔۔۔ کہیں عمل میں بچہ کچھ پایا تو نہیں۔ کہیں عمل
 میں گھبراہٹ تو نہیں۔ کہیں عمل میں پریشان تو نہیں ہوا۔۔۔ افسوس کہ وقتِ نیر اتنا
 کہتا ہی چیزیں بیان کر جاتی ہیں۔ اور وقت، جو بھی اتنا اور وقت ختم ہو جائے امامِ وقت
 کا ذکر ختم نہیں ہوگا۔ یہ وقت اس قابل ہی نہیں کہ اس کو سونے کے اپنے اندر۔۔۔ سمجھے۔
 ہاں یہ اور بات ہے کہ کبھی وجد میں آکر اس کا ذکر سننے کے لئے کہا ہوا سورج پلٹ کے
 آجائے۔۔۔ یہ بات اور ہے۔۔۔ درندہ یہ وقت ختم ہو جائے گا، ذکر ختم نہیں ہوگا۔
 وعدہ کر لیا اس نے کہ میں آپ کی تعلیم پر عمل کروں گا۔ اور قیامت تک مسلمان بچوں کو سبق
 دے گیا کہ مسلمان بچو!۔۔۔ اپنے معلم کی بات کو اچھی طرح سمجھ لو۔ اپنے بزرگ کی
 بات کو اچھی طرح سمجھ لو۔ جو وہ تم سے کام لینا چاہتا ہے اسے اچھی طرح سے سمجھ
 لو۔ اس کے ہر پہلو پہ غور کرو۔ اس کو اچھتے طریقے سے اپنے ذہن میں بٹھا
 لو۔ اور جب تمہاری سمجھ میں آجائے تو آنکھیں بند کر کے نہیں۔ سونے کے
 سمجھ کے، غور کر کے۔ پھر اس سے وعدہ کرو تو عمل میں رکاوٹ نہ ہونے پانے
 عمل میں بچہ کچھ ہٹ نہ ہونے پانے۔ عمل میں بچہ رکنا نہیں۔ پھر عمل اس

گھر میں خطرہ ہے۔ بڑا سخت خطرہ ہے۔ تو بتاؤ پتہ جو جب گھر کا بزرگ خطرہ
بتائے تو بچے کے دل پر کیا گذرے گی۔ ہیں؟۔ وہ بھی ڈرا ہو گا یا نہیں؟
وہ بھی گھبرایا ہو گا یا نہیں۔ خطرہ ہے قبلہ۔ اور جب اتنا تجربہ کار بزرگ
کہہ رہا ہے خطرہ ہے تو پتہ بھی گھبرایا ہو گا۔ اس اُنیس سالہ بچے نے گھبر کے پوچھا
قبلہ خطرہ ہے؟۔ کہ ان بیٹا خطرہ ہے۔ واقعی خطرہ ہے؟۔ کہ بہت
ہی خطرہ ہے۔ خطرہ ہے؟؟۔ کہ یقیناً خطرہ ہے۔ پھر قبلہ کیا پروگرام
ہو گا۔ میں گھر چھوڑ کے جا رہا ہوں۔ کیوں؟۔ خطرہ ہے۔ اچھا
قبلہ، میں کیا کروں؟ کہ تم یہیں رہو۔ کیوں؟۔ خطرہ ہے۔ سمجھے آپ
اب بتاؤ پتہ۔ اگر وہ لڑکا یہ کہہ لے کہ میں تو نہیں رہتا۔ تو کسی اخلاقی ضابطہ
میں اس کا یہ انکار کرنا بڑی بات ہے؟ وہ کہہ سکتا ہے یا نہیں کہ جب خطرہ ہے
تو میں بھی نہیں رہتا۔ مگر دنیا حیران ہو گئی یہ سن کے جب اس بچے نے کہا کہ
خطرہ ہے؟ کہ ان بہت خطرہ ہے۔ پھر۔ کہ میں جا رہا ہوں۔
اور میں! کہ تم یہیں رہو۔ کہ اچھا میں یہیں ہوں۔ آپ جائیں۔
خطرہ۔ خطرہ ہے۔ تو ہوا کرے۔ میں یہیں ہوں۔ حیرت میں آگئی ساری
دنیا کہ یہ بچہ کیا کہہ رہا ہے؟۔ تو اسے اس وقت یہ بتایا گیا کہ اس نے سوچ سمجھ کر وعدہ
کیا تھا۔ نفرت کا۔ اس لئے یہ کہہ رہا ہے۔ کہ میں یہیں رہوں گا۔
رسول جانے لگے تو اس بچے سے کہتے ہیں کہ بیٹا گھر میں خطرہ ہے۔ خطرہ بڑا
ہے۔ بہت ہی خطرہ ہے۔ لہذا چوکس نہ رہنا۔ کیوں؟ خطرہ ہے
ہوشیار نہ رہنا۔ کیوں؟ خطرہ ہے۔ خبردار نہ رہنا۔ کیوں؟
خطرہ ہے۔ بے خبر سو جانا۔ کیوں؟ خطرہ ہے۔ ہے نا عجیب بات
بالکل بے خبر سو جانا۔ اس لئے کہ خطرہ ہے۔ سمجھے حضور۔

اس نے کہا لیجئے قہد میں سو گیا۔ اپنے بستر پہ لیٹ گیا۔ کہ ٹھہر دو تمہارے
بستر پہ خطرہ نہیں۔ میرے بستر پہ لیٹو کہ خطرہ یہاں ہے۔ اب
خطرے کا مرکز سٹ کے بستر پہ گیا تھا۔ یہاں لیٹو۔ وہاں لیٹ گیا۔
یہاں سو جاؤں؟ کہ نہیں ایسے نہیں۔ اگر میرے بستر پہ تم، تم ہو کے سوئے
تو خطرہ نہیں۔ میرے بستر پہ تم، ہم بن کے سوئے۔ میں؟ لیٹو۔ لٹایا
اپنی چادر اوڑھا دی۔ اپنے عمامہ سرمانے رکھ دیا۔ اپنے نعلین قریب
قریب رکھ دیئے۔ اپنی تلوار پاس رکھ دی۔ تاکہ دیکھنے والے، سونے والے
کو جانے والا سمجھیں۔ ہیں۔ سو جاؤ۔ سو گئے؟ سو گئے۔ صبح تک
کروٹ نہیں لی بستر کی سلوٹ گواہ ہے۔ اسی طرح آرام سے سوتا رہا۔ ساری
رات سوتا رہا۔ یہ ہے سوش سمجھ کر کسی اسکیم کو۔ پھر اس پر نصرت کا
وعدہ کرنے کا نتیجہ۔ بے سوچے سمجھے، بغیر سوچے ہوئے وعدہ کر لینے سے
یہ استقامت پیدا نہیں ہوتی۔ خوب سمجھ لو کہ ہم نے کیا کام کرنا ہے
پھر وعدہ کرو تو اتنا پکا وعدہ کرو۔ سو گیا آرام کے ساتھ۔ سو گیا یا نہیں؟
اور اللہ نے کیا کیا۔ رات کو سونا دیکھ کر اللہ نے۔ لوجی یہ آخری فقرے
سونا دیکھ کر اللہ نے۔ کیوں بچو اللہ بھی کبھی سوتا ہے۔ ہیں؟ نہیں
سوتا !!! اے لو۔ اللہ تو کبھی سوتا ہی نہیں۔ کبھی نہ سونے والے نے آج
کا سونا جو دیکھا۔ تو اس نے کہا محمدؐ یہ بڑا کھرا سوتا ہے۔ بڑا بہترین سوتا
ہے۔ میں نے اسے پرکھ کے دیکھا ہے۔ بہت ہی بہترین سوتا ہے۔ اس
میں کوئی غیبی و غمش نہیں۔ یہ سونا میں خرید نہ لوں؟ یہ سونا میں خرید لوں۔
محمدؐ تم درمیانی بن کے یہ سونا مجھے خریدو دادو۔ محمدؐ تمہیں کہیں اور۔
سونے والا تھا کہیں اور۔ وہیں سے آواز دی۔ سونے والے۔

کہ جناب عالی! — دہی سوتے میں کہا — سونے والے — ماں کیا ہے؟
 — سونا بیچتے ہو؟ — ”جی ماں — ”کیا لوگے؟“ — ”قبلہ کیا دو گے؟“ —
 خریدنا کون ہے؟ کہ کبھی نہ سونے والا اللہ خرید رہے — اچھا! — اللہ خرید
 ہے؟ — — پھر بیچتے ہو؟ کہ بیچتا ہوں — کیا قیمت لوگے؟ کہ قبلہ ہات سنو۔
 جب اللہ جیسا خریدار ہو تو قیمت پہ جھگڑا کرنا خلاف تہذیب ہے — اللہ سے کہو
 کہ سونا میرا حاضر ہے، قیمت میں جو اس کی مرضی ہے وہ دیدے — جو مرضی
 ہے دیدے — بس مرضی قیمت ہے — سونا حاضر ہے — اللہ نے کہا
 — ”منظور“ — سودا ہو گیا — کہ قبلہ یہ مرضی ملے گی کب؟ کہ قیامت میں
 — قیامت کا ادھار؟ — بیعانہ مل جائے تاکہ سودا پٹکا ہو جائے — اللہ نے
 بیعانے میں جنت دے دی — جنت تیری قیمت نہیں — یہ بیعانہ ہے —
 جنت پہ قبضہ کر لیا — سچھے نا حضور — ہوئی جو شادی تو وہی جنت — جو اس
 دن بیعانے میں ملی تھی — منہ دکھائی میں بیوی کو دے دی — خریدی تھی شوہر نے
 — خاتونِ جنت کہلاتی ہے بیوی — بیوی نے بچوں کے نام کر دی — رسول
 نے رحبطی کر دی — انتقال کی — الحسن والحسین سید
 شبلب اهل الجنة — باپ نے خریدی — ماں ملکہ نبی — حسین
 مالک بنے — بقول شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے اللہ نے جنت کے صدر دروازے
 پر یہ نام لکھ کر لگا دیئے — محمد، علی، فاطمہ، حسن، حسین
 انشا اللہ — نیوکمپس کے نوجوانو! — تم چلنا جنت میں — چلو گے یا
 نہیں؟ ہیں؟ جاؤ گے نا؟ — (آوازیں انشا اللہ) — انشا اللہ کی کیا بات
 ہے — جائیں گے — وہاں ضرور جانا ہے — وہاں جاؤ گے — مجھے بھی
 آواز دے لینا — سواد آ جائے گا — جب دروازے پر یہ نام لکھے دیکھیں

گئے نہ۔ اگر کسی فرشتے نے روکا بھی تو کہہ دینا "فرشتے ہٹ جا ہمارا وقت ضائع نہ کر۔۔۔ یہ نام نہیں دیکھنا۔۔۔ اندر تو محفل ہو رہی ہوگی۔۔۔ زیدی تقریر کر رہا ہوگا۔۔۔ چلو چلیں اندر"۔۔۔ انشاء اللہ یہ نام دیکھ کے ہم فوراً پہنچ جائیں گے۔۔۔

تمہاری محفلوں کو اللہ قبول کرے۔۔۔ تمہارے اندر تقویت دین عطا فرمائے۔۔۔ دینی محفلیں منعقد کرنے کا تم میں شوق اور شعور پیدا کرے۔۔۔ جب کوئی دینی محفل منعقد کیا کرو اگر میری صحت ٹھیک ہو تو مجھے ضرور بلایا کرو۔۔۔ آج تو بیماری کے عالم میں، میں نے چند منٹ آپ سے باتیں کر لی ہیں۔۔۔ مجھے بلایا کرو ضرور۔۔۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔۔۔ اللہ تمہیں سلامت رکھے۔۔۔ خوب سونج کے سمجھ کے۔۔۔ غور کر کے۔۔۔ ذہن میں بٹھا کے۔۔۔ ہر پہلو اور نشیب و فراز کو دیکھ کر جو عزم کرو پھر اس پر بنیان مرصوص کی طرح جم جاؤ سمجھے؟ بے سوچے سمجھے قدم اٹھانا۔۔۔ حیدری جوانوں کی شان نہیں ہے۔۔۔ اللہ تمہیں سلامت رکھے۔۔۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔ فی امان اللہ۔۔۔

(۲۳ رمضان المبارک ۱۴۲۶ھ۔ ایس۔ ٹی۔ سی نیوکیمپس، پنجاب یونیورسٹی لاہور کے

طلبا سے خطاب)

تتیا

موت و حیات

عنوان

فصل اول
مصائب

موت و حیات
اہم سوسائٹی کا نام

کبھی گزر رہوں بعد کے بازاروں
لاٹیں روم کے ابھرنے لگیں دیواروں

سید جعفر علی

مترجم سامعین! جب سے دنیا جی سے اور جب تک۔ دنیا رہے گی، اس آسمان کے نیچے۔۔۔ اس زمین کے اوپر، حسین جیسا کوئی شہنشاہ ہوا، نہ ہوگا۔۔۔ یہ سب بڑا شہنشاہ ہے جس کا سینے نام ہے۔۔۔ سب سے بڑا بادشاہ ہے جس کا حسین نام ہے۔۔۔ اگر آپ یہ کہیں کہ ہمارے باقی آئمہ بھی بادشاہ تھے۔۔۔ باقی رسول بھی بادشاہ تھے، تو انہیں بادشاہت یا حکومت اللہ نے ازراہ کرم عسائری تھی اور حسین نے شہنشاہی قیمت دے کر لی تھی۔۔۔ اُس نے کسی کا احسان نہیں رکھا۔۔۔ اُس نے ہر شے کی قیمت ادا کر لی ہے۔۔۔ دنیا کا سب سے بڑا شہنشاہ ہے حسین۔۔۔ سب سے بڑا بے مثل بندہ ہے حسین سب سے بڑا بے نظیر بندہ ہے حسین مجھے بناؤ سامعین کرام۔۔۔ تم مجھے بتاتے رہو میں بولتا رہوں۔۔۔ یہ بتاؤ کہ حسین کا نام تمام رسولوں میں بے مثل ہے کہ نہیں؟ بولو جی؟ بے مثل ہے۔۔۔ تمام رسولوں میں حسین کا نام بے مثل ہے۔۔۔ اور تمام دیوبوں میں حسین کا باپ، بولو جی؟ بے مثل ہے۔۔۔ اور تمام دنیا کی عورتوں میں حسین کی ماں بے مثل ہے۔۔۔ اور ساری دنیا کے بھائیوں میں حسین کا بھائی حسن؟ بولو جی بے مثل ہے۔۔۔ اور ذرا سٹوٹ کے بتانا۔۔۔ ساری دنیا کی بہنوں میں حسین کی بہن بولو جی۔۔۔ بے مثل ہے۔۔۔ دنیا بھر کے بیٹوں میں حسین کے بیٹے؟ بے مثل۔۔۔ دنیا بھر کے شیرخواروں میں حسین کا شیرخوار؟ دنیا بھر کی بیٹیوں میں حسین کی بیٹی؟۔۔۔ دنیا بھر کی فوجوں میں حسین کی فوج؟۔۔۔ دنیا بھر کے دوستوں میں حسین کے دوست؟۔۔۔ دنیا بھر کے دشمنوں میں حسین کے دشمن؟ بولو جی بے مثل ہے یا نہیں؟ حسین کی ساری زندگی بے مثل ہے، حسین کی موت بے مثل ہے، حسین کی نماز بے مثل

ہے۔ حسین کی یادگار بے مثل ہے۔ حسین کا یہ دربار بے مثل ہے؛ جہاں آئی
 بے مثالیاں اکٹھی ہو جائیں اس بندے کے لئے بے تکلف کہہ دو۔ حسین کیسے
 مشکلمہ شیخ تو وہ انسان ہے کہ تیری مثل کہیں ہے ہی نہیں؛ نہ اللہ کی کہیں مثل
 ہے، نہ حسین کی کہیں مثل ہے۔ اس کی اللہ ہونے میں مثل نہیں، اس کی بندہ ہونے
 میں مثل نہیں۔ ایسے بے مثل شہنشاہ کے دربار میں تم آ کے بیٹھے ہو۔ تم بڑے
 خوش نصیب ہو کہ اتنے بڑے شہنشاہ اعظم کے دربار میں آئے۔ اللہ تمہیں سلامت
 رکھے، خدا تمہیں خوش رکھے۔ اللہ تمہارے آنے کو قبول فرمائے۔ اب
 میں تمہیں پڑھائیں اور عرض کر دوں، حسین کی شہنشاہی کی۔ حسین کے دربار
 میں آنے کی۔ حسین کی خدمت میں پہنچنے کی۔ دیکھو بھائیو۔ دیکھو عزیزو۔
 کہو میں حسین سے محبت ہے۔ ہے؟ میں؟ ہے؟ یا؟ حسین سے محبت
 ضرور ہے۔ آپ کو حسین سے محبت ہے۔ یقیناً ہے۔ آپ نے کیوں کی ہے
 یہ محبت حسین سے۔ بولو بھئی۔ یہ حسین سے محبت آپ نے کیوں کی ہے اس کا
 جواب دو مجھے۔ ہم نے کی نہیں محبت۔ محبت کی نہیں جاتی۔ محبت ہو
 جاتی ہے۔ ہمیں حسین سے محبت ہو گئی ہے۔ ہم نے کی نہیں ہے۔ اس نے
 کہ حسین بندہ ہی ایسا ہے کہ اس سے محبت ہو جائے۔ اس سے ہمیں محبت ہو گئی ہے
 ہے۔ نا حسین سے محبت۔ کیوں بھی ہے حسین سے محبت؟ آج اس
 کی محبت کا اثر ہے کہ لاہور شہر میں ایک مرد مرگ حسین کے نام پر رگ ہوئی ہے۔
 رگ ہوئی ہے یا نہیں؟ پولیس کھڑی ہے۔ ادھر بھی، ادھر بھی۔ میں آیا تو
 میں نے دیکھا ادھر بھی پولیس کھڑی تھی، ادھر بھی پولیس کھڑی تھی۔ میں نے پوچھا
 پولیس کے جوانو؛ کیوں کھڑے ہو؟ یہاں کیوں ٹھہرے ہوئے ہو؛ کہ بیٹی آج حسین کا دربار
 لگا ہوا ہے۔ ہم اس انتظام کے لئے کھڑے ہیں کہ کوئی خرابی پیدا کرنے والا نہ آجائے

کوئی گڑبڑ کرنے والا نہ آجائے۔ بس پولیس نے مجھے یہ بیان کیا اور وہیں مجلس ہوگئی کہ۔۔۔ واہ اے حسین۔۔۔ واہ۔۔۔ آج پولیس اس لئے کھڑی ہے کہ تیرے دربار میں بد نظمی نہ ہو اور ایک دن پولیس اس لئے کھڑی تھی دربار میں کہ بازار دالو آؤ آج حسین کی بہن آرہی ہے۔۔۔ بازار دالو۔۔۔ آؤ۔۔۔ دیکھو حسین کا کنبہ آ رہا ہے۔۔۔ اُس دن بھی پولیس بازار میں تھی۔۔۔ آج بھی پولیس بازار میں ہے۔۔۔ اُس دن بھی مجمع تھا، آج بھی مجمع ہے۔۔۔ اس مجمع کا انداز اور تھا اس مجمع کا انداز اور ہے۔۔۔ محترم بھائیو۔۔۔ کربلا کے میدان میں جہاں حسین جیسا عظیم بادشاہ آیا تھا۔۔۔ وہاں اس کے ساتھ اس کی بہن بھی آئی تھی۔۔۔ حسین کی بہن بھی تھی کربلا میں۔۔۔ اور میں یہ کہا کرتا ہوں کہ کربلا کا اصل ہیرو زینب تھی۔۔۔ اس کے گرد گھوم رہا تھا تمام کربلا کربلا کا۔۔۔ دونوں بہن بھائی کربلا میں آ کے بیٹھ گئے۔۔۔ روز رات کو بہن بھائی آپس میں باتیں کیا کرتے۔۔۔ جب پچھلی رات ہوتی تو زینب بلاتی، آؤ حسین باتیں کریں۔۔۔ اللہ جانے پھر موقع ملے گا یا نہیں بھائی بہن کو بات کرنے کا۔۔۔ بات کیا ہوتی؟۔۔۔ زینب کہتی حسین! تو نے جب سے اس جنگل میں آ کے خیمے لگائے ہیں مجھے روزانہ رات کو خیمے کے پیچھے سے کسی خاتون کے رونے کی آوازیں آتی ہیں۔۔۔ اللہ جانے کون روتی ہے۔۔۔ امام فرماتے ہیں بہن! پہچاننے کی کوشش کرنا۔۔۔ یہ میری اماں روتی ہے۔۔۔ پہلے دونوں بہن بھائی اماں کے رونے کی باتیں کرتے۔۔۔ پھر آپس میں بیٹھ کے گفتگو کرتے۔۔۔ زینب پوچھتی، حسین ارادہ کیا ہے؟ کربلا میں آنے کا مقصد کیا ہے؟۔۔۔ چاہتے کیا ہو؟ تو حسین کہتے۔۔۔ زینب میں۔۔۔ اللہ کے نام کو دنیا میں زندہ رکھنے کے لئے۔۔۔ اللہ کی اذان کو قائم رکھنے کے لئے۔۔۔ اللہ کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے میں اپنی جان دینا چاہتا ہوں۔۔۔ میں سر جانا چاہتا ہوں۔۔۔ ذرا غور سے فقرہ سنا دو سنتو۔۔۔ حسین کیا کہا تم نے؟ تم مرنا چاہتے ہو؟

کہ ہاں میں مرنا چاہتا ہوں۔ ذرا غور سے فقہ و سنناد دستو۔۔۔ حسین کیا کہا تم نے؟
 تم مرنا چاہتے ہو؟ کہ ہاں میں مرنا چاہتا ہوں۔ میں آیا ہی اسی لئے ہوں کہ بلا میں۔
 کہ مر جاؤں گا مگر اللہ کا نام نہیں مننے دوں گا۔۔۔ تو زینب نے سسکا کے کہا
 لے حسین سن۔ تو عبی علی کا بیٹا، میں عبی علی کی بیٹی۔ جو خون تیری رگوں میں وہی
 میری رگوں میں۔ جو جوش تجھ میں وہی مجھ میں۔ جو تیرا مانا وہی میرا مانا۔ جو تیرا پاپ
 وہی میرا پاپ۔ جو تیری ماں وہی میری ماں بس فرق اتنا ہے کہ تیرے سر پر انا کا عمامہ
 ہے۔۔۔ یہ دیکھ میرے سر پہ اماں کی چادر ہے۔ میں بھی وہی ہوں حسین جو تو
 ہے۔۔۔ تو تو ارادہ کر چکا نامرنے کا؟۔۔۔ ہاں ہیں! میں نے ارادہ کر لیا۔
 مگر میری بات سن لے۔ بے شک حسین تو مر جا۔ اپنے ارادے کو پورا کر لے
 میرا بھی زینب نام ہے۔ حسین میں تجھے قیامت تک نہیں مرتے دوں گی۔ اگر
 گلی گلی کو پے کو پے، بازار بازار، تیرے دربار نہ گلوادئے تو زینب نہ کہنا۔ میں دنیا
 بھر میں تیرے دربار گلوادوں گی۔ ساری دنیا سے حسین حسین کرا دوں گی۔ یہ
 زینب نے تہتہ کیا۔ چنانچہ آج یہ زینب کا اقبال ہے کہ اتنا بڑا دربار یہاں لگا ہوا
 ہے۔ یہ زینب نے کام کیا تھا۔

میرے محرم بزرگو۔! دوسویں کے عشر تک حسین کا کارنامہ تھا۔ اس وقت
 حسین اپنا کام کر رہے تھے۔ عشر تک حسین نے یہ جو کچھ کیا۔ پھر عشر تک حسین اپنا
 کام کر کے اپنے مفتوح علاقے میں آرام سے سو گئے۔ حسین تو سو گئے۔ اب چارج
 زینب کے سنبھال لیا۔ لاشے پر رونے نہیں آئی تھی۔ آئندہ زندگی کا چارج
 لینے آئی تھی کہ حسین اب میں چارج لے رہی ہوں۔ چنانچہ زینب نے چارج لیا۔
 حسین میں اپنی فوج لے کر شام جا رہی ہوں۔ اگر دنیا کے سب سے بڑے بہتر محبسی۔
 دنیا کے سب سے بڑے شہنشاہ کے نام کو گالی نہ بنوادوں تو زینب نہ کہنا۔

لے حسین میں جا رہی ہوں شام — لو بھائیو! چند فقرے سن لو — خدا تمہیں
 سلامت رکھے — زینب گیارہ تاریخ کو تیار ہو گئی شام جانے کے لئے —
 اور زینب نے اپنی فوج کو لائن میں کھڑا کر دیا — حسین اگر مناسب سمجھے تو ذرا میری
 فوج کا معائنہ کر لے، جو فوج لے کے جا رہی ہوں اتنی بڑی سلطنت فتح کرنے —
 اور حسین، انواعِ قاہرہ زینبہ کا کا معائنہ کرنے کے لئے نیزے پر سوار ہوئے —
 زینب کی فوج دیکھی — ایک لائن میں بیوہ عورتیں — ایک صف میں یتیم بچے —
 چونسٹھ عورتیں، اڑتالیس بچے — یاد رکھنا فوجوالو — گیارہ محرم کو کربلا میں
 کتنے تھے؟ چونسٹھ عورتیں، اڑتالیس بچے — ایک لائن میں عورتیں کھڑی تھیں —
 ایک لائن میں بچے کھڑے تھے — حسین نے زینب کی فوج کو دیکھا — ماشاء اللہ
 زینب بڑی عجیب فوج ہے — کہ حسین ذرا میری فوج کی دردی بھی دیکھو — اب
 جو فوج کی دردی دیکھی تو حسین نے نیزے پہ آنکھیں بند کر لیں — وہ دیکھ نہ سکے۔
 — دردی کیا تھی؟ گردن سے ہاتھ بندھے ہوئے، سر کھلے ہوئے — یہ زینب کی
 فوج کی دردی تھی — اس فوج کو لے کے جا رہی ہوں یزید کو فتح کرنے حسین
 — زینب گیارہ کو روانہ ہو گئی — فوج میں سپاہی کتنے تھے؟ چونسٹھ عورتیں، اڑتالیس
 بچے یتیم جنہیں لے کے چلی ہے کربلا سے زینب — چلدی کربلا سے — روانہ ہو
 گئی — ایک فقرہ کہہ کے آگے بڑھوں — چونسٹھ عورتیں، اڑتالیس بچے لے
 کے چلی کربلا سے — میرے بھائیو، میرے عزیزو — میرے بزرگو، میرے دوستو،
 جب پہنچی ہے شام میں یزید کے سامنے — تو بچے عورتیں سب مل کے کل بارہ تھے —
 یہ بتاؤ کہاں تلاش کریں؟ باقی کہاں گئے؟ ہماری چونسٹھ عورتیں کہاں گئیں؟ ہمارے بچے
 کہاں رہ گئے؟ یہاں سے وہاں تک اس راستے میں قبریں بنی ہوئی ہیں — اگر کوئی
 جاتے اس راستے سے جس سے اہل بیت گئے تھے — کہیں پتھروں کی قبریں، کہیں خواتین

کی قبریں۔ اس طرح پہنچی۔ کوٹے کی منزل ط کی، شام کے ملک میں پہنچی
 شام کے شہر دمشق میں داخل ہوئی۔ جہاں جہاں بیٹھے ہو جیسی۔
 دمشق بڑا شہر ہے۔ پوری طرح آراستہ کیا گیا اس شہر کو۔ کہ آج زینب
 نے گذرنا ہے۔ شہر سمایا گیا۔ بازار آراستہ کئے گئے۔ حکومت
 کا حکم ہے کہ کوئی آدمی آج گھر میں نہ بیٹھے۔ عورتیں جھنڈوں پر، بازاروں میں،
 دکانوں کے تعڑوں پر۔ بچے بڑے۔ بیچ میں سے آل محمد کا قافلہ گذرا
 آگے آگے نیروں پر سر بیچھے بیچھے قیدی۔ کبھی اس بازار میں۔ کبھی اس
 بازار میں۔ تقریباً ایک ہفتہ دمشق شہر کے مختلف بازاروں میں ان کو بھرا یا گیا۔
 اس ایک ہفتے تک یزید اپنا دربار بنانا اور سجاتارنا۔ ہنڈال بنایا گیا۔ قناتیں
 لگا میں گئیں۔ ساہاں لگائے گئے۔ تمام دنیا کے سفیر اور امراء بلائے گئے
 اپنی حکومت کے امراء بلائے گئے۔ سات سو کرسیاں بچھائی گئیں۔ نیچے فرش
 پہ آدمی بٹھائے گئے۔ جب دربار پوری طرح آراستہ ہو گیا تب حکم ہوا کہ قیدیوں
 کو رے کر آؤ۔ اب قیدی دربار میں آئے۔ سن رہے ہونا بھی؟ قیدی دربار میں
 آئے۔ اور اس مجلس میں جھٹنے سید بیٹھے ہیں، ان سے پوری معافی کے بعد
 میں اب یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دربار میں زینب کی طلب ہو گئی۔ زینب کو
 دربار میں بلا یا گیا۔ ہنڈال بنا ہوا تھا۔ عظیم الشان ہنڈال تھا۔ سات
 سو کرسیاں لگی ہوئی تھیں، سینکڑوں آدمی فرش پر بیٹھے تھے اور اس کے صدر گیٹ سے
 لے کے دو دو فرلانگ تک دو طرفہ قناتیں تھیں۔ ان قناتوں کے ساتھ اندر
 کی طرف ہنگی تلواریں لئے سپاہی کھڑے تھے تاکہ بچے اور عورتیں جب ان سپاہیوں کے
 بیچ سے گذریں تو اتنے ڈر جائیں کہ جب یزید کے سامنے آئیں تو فوراً سجدہ کریں۔
 بے سہارا عورتیں، سہمے ہوئے بچے۔ جب پہنچے امام زین العابدین، ان قناتوں کے

کے قریب قافلہ کو لے کے اور یہاں سے وہاں تک سپاہی کھڑے ہوئے دیکھتے
 تو آپ نے فرمایا۔ بھو بھئی ان کیا ارادہ ہے؟ زینب نے کہا۔
 میرے ڈرو نہیں۔ میں آگے آگے چلتی ہوں۔ تم میرے ساتھ آجاؤ۔ زینب آگے
 باقی کبہ پیچھے۔ جس سپاہی کے قریب سے گزرتیں وہ تھر تھر کانپتا، تلوار اس
 کے انگوٹھ سے گر جاتی۔ یہ سارا نا املہ بڑے کیا۔ جب بالکل پہنچائی کے دروازے
 پہ پہنچے اور اندر کی جھلک دیکھو کہ سات سو کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں لوگ۔ کچھ نیچے
 بیٹھے ہیں۔ یہ جھانک دیکھ کے کہتے ہیں۔ ”بیٹا! اب تو اندر جانے کی میری عمر سننا
 نہیں ہے۔ مجھ سے اب نہیں جایا جاتا اندر۔ میں اب نہیں جاؤں گی۔
 ام نے فرمایا۔ اتان جواب کی مرضی؟ زینب رکھی ہی تھیں دروازہ پر۔
 کہ ایک شخص شہنشاہ میر حسین کا سرک کے گڈرا۔ سر جو زینب کے قریب
 سے گڈرا۔ زینب کو دیکھا۔ سر کے لب بٹ۔ ”زینب میری خاطر آؤ
 کوئی بات نہیں۔ میں جو ساتھ ہوں۔ دربار میں چلی گئی۔ ایک
 طرف سر رکھ دیا گیا۔ ایک طرف قیدی کھڑے ہو گئے۔ بچے ہیں۔ بڑے ہیں
 سب کھڑے ہیں۔ دو تین گھنٹے گزر گئے قیدیوں کو کھڑے کھڑے۔ نہ
 ان سے کوئی بات کرتا ہے۔ مسلمانو! میری بات ڈر سے سننا۔ جب دو تین
 گھنٹے کے بعد اپنے شغل سے فارغ ہوا تو زینب پر چلتا ہے۔ ”یہ ہیں قیدی؟
 کہ ان۔ ”ان قیدیوں میں خاطر کی بیٹی کون سی ہے؟“ ان قیدیوں میں
 قاتل کی بیٹی کونسی ہے؟ اس کے جواب میں کوئی اور نہ بولا۔ یہ ایک
 دم قافلہ کی بیٹی آگے بڑھی۔ اور پورے جوش سے کہتی ہے۔
 ”ادھر سے آزاد کردہ غلاموں کے ذلیل بچے، خبردار! اس نجس زبان سے میری ماں
 کا نام نہ لینا۔“ اتنا بڑا سخت جواب سن کر۔ زینب گھبرا گیا۔ شہنشاہ بیت

رخست ہو گئی۔ چہرے پہ پسینہ آگیا۔ حواس گم ہو گئے۔ پریشان ہو گیا۔ اور پریشان ہو کے کہتا ہے:۔ زینب! تم نے بڑے جوش میں بات کہی۔“

”لعین! میں کیا کہوں، میرا تو سارا جوش و طاقت کر بلا میں رہ گئی۔ مگر یاد رکھ۔“

”تیرے دربار میں اگر مجھے حسین کی موت بھی قبول گئی۔ یہاں وہ مصیبت مجھ پر گزری ہے۔“

”یہ شریفوں کے سنسنے کی بات ہے۔“ یزید کہتا ہے۔ ”یہاں کیا مصیبت گزری؟“

”کہ اس سے بڑھ کر بھی اور کوئی مصیبت ہوگی کہ میں زینب۔ اور مجھ سے بات کروں۔“

”بتا اس سے بڑھ کر کیا مصیبت ہوگی کہ میں حیرے سانھ بات کر رہی ہوں؟“ اب۔

”تو وہ بالکل ہی گھبرا گیا۔ یہ دو چار فقرے ہی ہی نے کہے۔ دربار تھا دربار تک لگا ہوا۔ دربار کے اُدھر۔ کونے میں۔ رسول کا ابو دردہ صحابی،“

”ناہینا۔ وہ بھی بیٹھا تھا ایک گھر سی پر۔ اُس نے اپنے ساتھ والے سے پوچھا

”صحابی میں تو ناہینا ہو گیا۔ مجھے سمجھ نہیں آئی۔ یہ قصہ کیا ہے۔ یہ علیٰ

کہاں سے آگئے؟ یہ بالکل علیٰ کی آواز ہے۔ میں نے پہچان لیا یہ علیٰ بول رہے ہیں۔ اُس کے ساتھی نے کہا۔ بابا یہ علیٰ نہیں۔ کہ پھر علیٰ کا کوئی بیٹا ہوگا؟ حسین ہے، عباس ہے، کون بول رہا ہے؟ اس ساتھ والے نے دہرایا

”بابا چپکارہ۔ علیٰ کا بیٹا نہیں، علیٰ کی بیٹی ہے۔“ اب تو بڑھے صحابی نے پہچین

ہو کے کہا۔ کون سی بیٹی، کہ علیٰ کی بیٹی، زینب۔“ میں!!!۔ زینب

دربار میں کیسے آگئی؟۔ وہ دربار میں کیوں آگئی؟۔“ تو ساتھی نے کہا۔ ”ہا ہا ہا ہا

آئی ہی نہیں، ننگے سر بھی ہے اور ماتھ بھی بندھے ہوئے ہیں۔ بس یہ سنا تھا کہ رسول

کا صحابی بے چین ہو کے اپنی کرسی سے اٹھا اور وہیں سے اُس نے آواز دی۔“

”زینب ڈرنا مت، میں آ رہا ہوں۔ زینب گھبرانا نہیں، میں آ رہا ہوں۔ میں تیرے

نانا کا صحابی ہوں زینب۔ میں آ رہا ہوں زینب۔ گھبرانا نہیں۔“ یہ لہہ لہہ

جو بڑھا صحابی چلا دلوں سے۔۔۔ نابینا تھا۔۔۔ کہ سیوں سے ٹکراتا ہوا۔۔۔
 بیٹھنے والوں سے ٹکراتا ہوا۔۔۔ دربار کا نقشہ درہم برہم ہو گیا۔۔۔ لوگ اٹھ کے کھڑے
 ہو گئے۔۔۔ اس بڈھے کو آنا دیکھ کے۔۔۔ جب سب لوگ کھڑے ہو گئے
 ۔۔۔ دربار منتشر ہو گیا۔۔۔ تو زینب آگے بڑھ کر ذرا اونچی جگہ کھڑی ہو گئی۔۔۔
 اور اونچی جگہ کھڑے ہو کے سر کے مچھلے سے چہرے کے بال ہٹانے۔۔۔ لوہ میرے
 بیان کا آخری فقرہ ہے دوستو۔۔۔ بال ہٹانے کے چہرے سے پوچھتی ہے۔۔۔
 اے دربار والو۔۔۔ اے ہمارے چاروں طرف کھڑے ہونے والو۔۔۔ یہ بتاؤ تم ہندو
 ہو؟ انہوں نے کہا نہیں۔۔۔ ادھیسیائی ہو؟ عجمی ہو؟ یہودی ہو؟ کیا ہو؟ انہوں نے
 کہا نہیں، ہم سب مسلمان ہیں۔۔۔ سات آٹھ سو آدازیں برابر آئیں۔۔۔ کہ ہم سب
 مسلمان ہیں۔۔۔ سنا ہے نا۔۔۔ آٹھ سو آدازیں۔۔۔ ہم سب مسلمان ہیں۔۔۔
 مسلمان ہو؟ "کس کا کلمہ پڑھتے ہو؟" ایک ہزار آدازیں بیک وقت آئیں کہ
 محمد کا۔۔۔ ادھر انہوں نے محمد کا نام لیا۔۔۔ ادھر بی بی نے کہا
 محمد کا کلمہ پڑھنے والے بے عزیز تو۔۔۔ سناؤ آؤ اور محمد کی بیٹی کا تماشا
 دیکھو۔۔۔ آؤ محمد کی بیٹیوں کا تماشا دیکھو۔۔۔ او بے غیر تو آؤ۔۔۔ محمد
 کی بیٹیوں کے کھلے سر دیکھو۔۔۔ لوگ دیواروں سے سر مار رہے تھے۔۔۔
 زینب ہمیں پتہ نہیں تھا۔۔۔ ہمیں علم نہیں تھا۔۔۔ اور اس کے بعد یزید کو دربار
 کرنا میسر نہ ہوا۔۔۔ یہ اس کا آخری دربار تھا۔۔۔ اتنی بڑی فتح حاصل کی جو آج تک
 فتح ہے۔۔۔ اب یہ سارے مجمع سے میں کہہ رہا ہوں۔۔۔ جہاں تم محمد سے
 بچوں کی عزاداری کے لئے آئے ہو۔۔۔ تم محمد کے بیٹوں کی عزاداری کے لئے
 آئے ہو۔۔۔ تم محمد کے بچوں کو رونے کے لئے آئے ہو۔۔۔ جس نے مجلس
 کی ہے اس کا شکریہ۔۔۔ اس نے صرف ماتم پچھا دی محمد کے بچوں کے لئے

آنے والو خدا تمہیں اجر عظیم دے — خدا تمہیں اسکا بڑا ثواب دے —
 تم رونے کے لئے آگئے — دیکھو بیٹا، نے بولنے کے لئے، تماشے کے لئے،
 سارا سارا دن گزار دینا اور بات ہے اور رونے کے لئے گھر سے آکے بیٹھنا اور
 بات ہے — یہ تمہاری محبت کی دلیل ہے — تم سے محمد خوش ہیں —
 محمد کا اللہ خوش ہے — اگر کوئی عمل نیک ہے تمہارے نامہ اعمال میں تو بس یہی رونا
 ہے — یہی مجلس ہے — اللہ اے قبول کرے — خدا اے منظور کرے —
 خدا ان گھروں کو آباد رکھے جہاں فاطمہ کے اجر بڑے ہوتے گھر کا ذکر ہوتا ہے — سیدو،
 خدا شاہد ہے، ہمارا گھر ایسا اجر کہ دنیا میں کسی کا گھر ایسے نہ اُجڑا — ہم ایسے برباد
 ہوتے اس دنیا میں کہ اس طرح کوئی برباد نہ ہوا — ہم ایسے دیران ہوتے، کوئی
 ایسا ویران نہ ہوا — ہماری قبروں سے قبریں نہ ملیں — گھر سے گھر نہ ملے — کوئی
 کہتا ہے، کوئی کا نہیں ہے، کوئی نجف میں ہے — جب وہاں سمائی نہ ہوئی تو کوئی —
 بی بی لاہور میں ہے — ہم اُجڑ گئے — برباد ہو گئے — ایسا کوئی گھر تباہ نہ ہوا
 جیسا ہمارا گھر تباہ ہوا — ایسا کوئی گھر برباد نہ ہوا جیسا ہمارا گھر برباد ہوا —
 فاطمہ کے گھر کی بربادی پہ رونے والو اللہ تمہارے گھروں کو آباد رکھے — اللہ تمہارے
 بچوں کو بڑی ترقی دے — اللہ تمہارے بچوں کو سلامت رکھے — تمہیں سب کو
 خوش رکھے — بحق محمد و آل محمد — میں آپ حضرات کا ایک دفعہ پھر شکریہ
 ادا کر دوں آپ تشریف لائے — آپ کے آنے کا میں بڑا شکر گزار ہوں — پوریس
 کے جوانو تمہارے انتظام کا بھی شکریہ، فوج کے جوانو، تم لاریوں میں بیٹھ کے آنے
 ہو — تمہارا بھی بہت شکریہ — بچو — بڑو — جس طرح بھی تم آئے ہو تمہارا
 شکریہ — دیکھو بیٹا — سفید دارطھی کے بوڑھے، اگر جھکی ہوئی — لکڑی
 مکتے چلے آرہے ہیں — بابا کہاں جا رہے ہو؟ کہ فاطمہ کے بیٹوں کو رونے

— عورتیں برتنو پہننے ہوئے اپنے اٹھائے ہوئے چلی آرہی ہیں — بی بی کہاں جا
 رہی ہیں — بی بی کہاں جا رہی ہے؛ کہ بی بی کے بچوں کو رونے جا رہی ہوں —
 اس سے بڑھ کے کوئی عبادت نہیں دُنیا میں — اللہ تمہاری اس عبادت کو قبول کرے
 اللہ تمہاری اس سعی کو شکوہ کرے — اللہ تمہاری اس مجلس کو قبول کرے —
 بحق محمد و آل محمد — آمین —

————— ۰۰۰ —————

موت و حیات

عنوان

موت و حیات

فَضَائِل

امام موسیٰ کاظمؑ

مصائب

کبھی گزر اہوں بغداد کے بازاروں سے
لاشیں روہ کے بھرنے لگیں دیواروں سے

سید جعفر طاهرؑ

حضرات! کافی دیر سے آپ مجلسِ عزاء میں تشریف فرما ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اتنی دیر تک بیٹھنے سے اب آپ حضرات کافی تھک چکے ہوں گے۔ اور میں کوئی مجلس پڑھنے اس وقت حاضر نہیں ہوا آپ کی خدمت میں۔ بلکہ اختتامِ مجلس پر ننگریہ کے الفاظ ادا کرنے حاضر ہوا ہوں۔ میری آواز پہنچ رہی نا جناب؟ (بھئی یہ آواز نہیں جا رہی بٹیا) اچھا اب جا رہی ہے آواز۔ دیکھو میرے معزز سامعین! میں جو صحیح بات کر رہا ہوں میرے اور آپ کے درمیان یہ ذاتِ شریف وسیلہ ہے۔ یہ چاہیں تو میری آواز پہنچائیں چاہیں تو نہ پہنچائیں۔ اگر وسیلہ ٹھیک ہو تو کام ٹھیک ہوتا ہے۔ وسیلہ غلط ہو تو کام غلط ہو جاتا ہے۔ اس وسیلے (لاؤڈ سپیکر) کا اس لئے اعتبار نہیں کہ یہ کرائیے کا وسیلہ ہے۔ بہر نوع خدا کرے یہ کام دیتا رہے۔ خدا کرے یہ آپ تک میری آواز پہنچاتا رہے۔ ہاں تو میں اس عرض سے آغاز کرتا ہوں کہ ہر انسان تین چیزوں سے مل کر انسان بنتا ہے۔ ایک جُزُو کا نام ہے۔ روح، ایک جُزُو کا نام ہے۔ نفس۔ نفسِ ناطقہ۔ روح و نفس و جسم ان تینوں چیزوں کے مجموعے سے انسان، انسان بنتا ہے۔ میری بات پہ غور فرمایا آپ نے۔ آپ اور ہم سب ان میں چیزوں سے مل کر بنتے ہیں۔ ایک جسم ہے۔ ایک روح ہے۔ ایک نفسِ ناطقہ ہے۔ پوری توجہ ہے نا صاحبان۔ جسم جو ہے۔ یہ جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس کے سنا ہے چار جزو ہیں۔ سنا ہے۔ میں نے اس لئے کہا کہ اصلی بات ڈاکٹر صاحبان اور کئی حضرات جانتے ہیں۔ ہم ملا لوگ تو سنی سنائی بات کرتے ہیں۔ سنا ہے کہ جسم

کے چار جزو ہیں چار عناصر ہیں کیا کیا ہیں وہ چار عناصر بھی؟
 جن سے جسم بنتا ہے وہ اربعہ عناصر کیا ہیں؟ آگ، پانی، مٹی، ہوا
 لوجی میں بوڑھا ہو گیا چار کے نام ہی یاد نہیں اللہ جانے کیا کیا ہیں
 ان چار سے انسان کا جسم بنا ہے۔ ایک آگ ایک کیا؟ پانی
 ایک کیا؟ مٹی ایک کیا؟ ہوا یہ چار جب آپ کے باوا
 آدم بنے تھے وہ بھی انہی چار سے بنے تھے تو فرشتوں نے دیکھ کے کہا تھا
 کہ یا اللہ یہ پتلا جو ان چار سے بنا ہے ضرور فساد کرے گا کیوں فساد
 کرے گا؟ کہ یہ ایسے چار اکٹھے ہوئے ہیں جن کا خاندان مختلف، قبیلہ مختلف
 نسل الگ، قوم الگ، ایک دوسرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے جوڑا،
 چار کب تک اکٹھے رہیں گے بہر فروع ہم ان چار سے مل کر بنے ہیں
 اب آپ نے کہا ہے کہ آپ کہ جزو چار ہیں مجھے تو یاد نہیں ایک
 آگ ایک پانی، ایک مٹی، ایک ہوا مگر جس سے میں پرچھتا ہوں کہ
 بھی تم کون ہو کہ جی میں تو خاک کی بندہ ہوں کوئی یہ نہیں کہتا کہ میں ہوائی بندہ ہوں
 حالانکہ آپ کہتے ہیں کہ ہوا بھی ہے ہمارے اندر کوئی نہیں کہتا میں تو
 جناب آبی بندہ ہوں کسی نے اپنے آپ کو ناری نہیں کہا آج تک ٹرنے
 کو تو چار اور نام لینے کو ایک بہر فروع ان سے ہمارا جسم بن گیا دوسرا
 جزو ہے ہمارا نفس اس کے بھی اجزاء ہیں وہ بڑی لمبی تشریح ہے،
 وہ سناؤں تو وقت بڑا لگے گا اس کے بھی اجزاء ہیں وہ بڑی لمبی
 تشریح ہے اسی طرح رُوح ہے۔ میرے عزم بھائیو جسم کو بھی غذا کی ضرورت
 ہے، نفس کو بھی غذا کی ضرورت ہے رُوح کو بھی غذا کی ضرورت ہے
 یہ تینوں چیزیں زندہ رہیں تو جسم زندہ رہتا ہے اگر کوئی انسان رُوح

کو تو بہت غذا دے دے اور جسم کو تباہ کر دے۔ اُس نے وَن تھر ڈ انسٹا تباہ کر دی۔ اور اگر کوئی جسم کو پالتا ہے تو یہ بھی غلط۔ ہر چیز کو پالنا چاہئے۔ اب یہ بتائیے کہ یہ جو موت آتی ہے۔ جو انسان مرتا ہے۔ وہ کیسا شے ہے؟ کیوں بھی کیا چیز ہے وہ؟ موت کیا ہے؟ بولونا بھی، موت کیا ہے؟ آپ اس لئے نہیں بتا رہے کہ جو تباہ رہے ہیں انہوں نے ابھی موت کو دیکھا نہیں۔ جنہوں نے دیکھا یا وہ آکے بتاتے نہیں۔ اس شے پتہ ہی نہیں چلتا کہ موت کیا ہے۔ ہے ایسی ضروری چیز موت۔ ایسی ضروری چیز۔ کہ جو اللہ کو نہیں مانتے۔ وہ موت کو مانتے ہیں۔ اتنی ضروری ہے۔ اور انسان کے ساتھ تو ایسی چٹھی ہوئی ہے موت۔ انسان ہی نہیں، ہر شے کے ساتھ۔ معاف کرنا بھائیو۔ ابھی ہمارے جناب جس صاحب تقریر کر رہے تھے۔ اللہ جانے وہ مجلس میں بھی یا چلے گئے۔ اگر وہ ہوتے تو میں اُن سے پوچھتا کہ ہم نے کیا گناہ کر لیا۔ ہم نے کیا جرم کر لیا۔ اس دُنیا میں آنا کوئی ایسا گناہ ہو گیا ہم سے کہ چاہے یہاں ایک سانس لو چاہے لاکھ سال کی عمر پاؤ۔ سزا نے موت ضروری ہے۔ حرام ہے کہ اور کوئی سزا ہوتی ہو۔ جیل وغیرہ کی۔ سیدھی سزا موت ہوتی ہے۔ آئے ہو تو مرنا پڑے گا۔ سمجھے۔ جانا پڑے گا۔ چاہے مر جاؤ، مرنا پڑے گا۔ لازمی مرنا پڑے گا۔ خوشی سے نہیں جاؤ گے۔ چار بندے اٹھا کے لے جائیں گے۔ بہر حال مرنا پڑے گا۔ یہ مرنی کی شے ہے۔ جسم جو ہے انسان کا۔ یہ تو ہے ہی مرنا۔ یہ کبھی زندہ ہوتا ہی نہیں۔ یہ جسم جسے کہتے ہیں۔ اور روح جس چیز کا نام ہے۔ وہ ہمیشہ جب پیدا ہو چکی، وہ زندہ ہے اور زندہ ہی رہتا ہے۔ روح نے مرنا نہیں، جسم نے جینا نہیں۔ پھر مرنی کی شے ہے

اس کی تشریح ہمارے خالق نے کی۔ کہ نہ جسم کو موت ہے نہ روح کو موت ہے۔
 روح ہمیشہ زندہ رہے گی۔ جسم میں زندگی ہے ہی نہیں۔ لہذا موت
 کا سوال ہی نہیں۔ مرنے کیا شے ہے۔ اس نے بتایا۔ کہ سزا مرنے کی کیا
 شے ہے؟ کل نفس ذائقۃ الموت وہ تیسرا جزو جو نفس ہے وہ موت کو
 چکھتا ہے۔ مرنے کا وہ بھی نہیں۔ کیا دلیل ہوگی نہیں مرنے والے چکھا
 نہیں کرتے۔ موت کو چکھتا ہے وہ۔ نفس موت کو چکھتا ہے۔ مرنے
 کا وہ بھی نہیں۔ زندہ رہتا ہے۔ پھر زندہ کس طرح رہتی ہیں یہ چیزیں
 ان کے زندہ رہنے کے بڑے طریقے ہیں قبہ۔ جسم الگ ہو گیا۔ نفس الگ
 ہو گیا۔ روح الگ ہو گئی۔ جسم مٹی میں مل گیا۔ نفس ناطق عالم برزخ میں
 چلا گیا اور روح جو تھی وہ کہاں گئی۔ وہ "یاد" بنی۔ فقرہ مزایا رکھنا۔
 مرنے والے کا جسم مٹی میں گیا۔ نفس عام برزخ میں گیا۔ جسم مٹی میں چلا جاتا
 ہے۔ اور روح یاد بن کے چاہنے والوں کے دل میں سما جاتی ہے۔ اسے یاد رکھتے
 ہیں اور وہ یاد رہتا ہے۔ توجہ ہے ناصحاب۔ یہ روح کی شان ہے۔
 اور میں اس گفتگو کو مختصر کروں۔ موت و حیات کی گفتگو تو بڑی لمبی، طویل ہے
 کہ حضرات محمد و آل محمد جن کے ہم غلام ہیں اور جن کے اوپر ہمارا ایمان
 ہے۔ جن کی تعلیم کو ہم اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ انہوں نے موت و حیات
 کے اقدار و فلسفے ہی بدل دیئے سارے۔ بہر نوع، حضرات محمد و آل محمد
 نے اس کی شان ہی عجیب بیان کی ہے۔ وہ دو جملے میں حضرات محمد و آل محمد
 کی شان میں کہدوں۔ تو حضرات محمد و آل محمد اپنا تعارف کیا کرتے ہیں کہ
 کہ محمد فرماتے ہیں۔ کہ میں محمد اور آل محمد ہم سب ایک نور سے

ہیں — کیوں بھٹی یہ سنا ہے کہ نہیں؟ ٹھیک ہے نا؛ کہا ہے نا انہوں نے؛ تو برابر ہو گئے نا؛ جب ایک نور سے ہیں تو ہو گئے مناسب برابر؛ انہوں نے کہا نا؛ ہیں تو ایک ہی نور سے — مگر اتنا اچھا فقرہ کہا — یہ خطاب کیا ہے آل محمد کے فرد اعلیٰ، علیٰ کو — یا علیٰ تو اور میں ایک نور سے ہیں — تو علیٰ کا سینہ تن گیا ہو گا نایہ سن کے کہ میں جب ایک نور سے ہوں تو برابر ہو گیا — سمجھے نا جناب — اگلا فقرہ فرمایا — انا شمس و انتک القمر — نور تو ایک ہی ہے میں شمس ہوں تو قمر ہے — میری بدولت تو روشن ہے فرق ہو گیا یا نہیں ہو گیا؛ اب شمس و قمر میں کیا فرق ہے قبلہ؛ رسول شمس ہیں، علیٰ قمر ہیں — شمس و قمر میں فرق یہ ہے — کیوں بھٹی کبھی آپ نے یہ جھگڑا سنا ہے کہ کل شمس نکلتا تھا یا نہیں؛ کیوں بھٹی کبھی جھگڑا سنا ہے — کیوں بھٹی کل سورج ہوا تھا یا نہیں — سنا ہے؛ نہیں نا؛ سورج میں سب متفق رہتے ہیں — چاند کی باری آئی تو اختلاف ہو گیا — ہوتا ہے یا نہیں؛ اختلاف — بناؤ آج چاند ہوا یا نہیں؛ اختلاف ہوتا ہے یا نہیں — اللہ جانے چاند ہوا یا نہیں؛ پھر اختلاف ہوتا کب تک ہے؛ پہلی کو جھگڑا ہوا پتہ نہیں آج پہلی ہے یا دوسری؛ دوسری کو جھگڑا ہوا — تیسری کو جھگڑا ہوا — تیسری تک جھگڑ کے سب خاموش ہو گئے — کہ بھٹی خاموش رہو — چاند کا فیصلہ چودھویں پہ ہو گا — جب چودھواں آئے گا اب پتہ چلے گا کہ تاریخ کیا ہے؛ چودھویں تک چاند میں جھگڑا ہوتا ہے — بے یا نہیں ایسا ہی؛ — جہاں چاند ہے وہیں کہیں سورج بھی ہے — مگر کبھی آج تک آپ نے سنا کہ بھٹی آج سفر نہ کرنا — میان آج شمس در عقرب ہے — سنا ہے کبھی؛ آج سورج عقرب میں ہے — سنا ہے کبھی آپ نے؛ اور قمر در عقرب؛ سنتے ہو یا نہیں؛ عقرب

کیا ہے؟ — کچھ ستارے ہیں منحوس — سنا ہے — جب تک سورج
 رہتا ہے — یہ منحوس نامراد اللہ جانے کہاں چھپے رہتے ہیں — جہاں قسم
 کا زمانہ آیا عقرب بھی آگیا — کیا ہوا جی قمر در عقرب ہے — یہ ہوتا ہے
 قسم در عقرب ہوتا ہے — یہ کتنے دن رہتا ہے قمر در عقرب؟ — کتنے دن؟
 صرف تین دن — قسم در عقرب صرف تین دن رہتا ہے — جہاں تین دن گزرے
 — اے لو — قمر در عقرب ختم ہو گیا — یہی قمر در عقرب ہے — چاند پہ —
 سمجھ میں آ رہا ہے نا صاحبان — اب تمہیں پتے کی ایک ادربات بتا دوں —
 اُسے بڑے غور سے سنا — اور اس کے بعد میں اپنا بیان ختم کر دوں گا — سورج
 میں ایک صفت اور ہے — وہ طلوع بھی ہوتا ہے اور غروب بھی ہوتا ہے —
 یہ صفت ہے یا نہیں شمس کی — غروب بھی ہوتا ہے، طلوع بھی ہوتا ہے — کیوں بھئی
 سورج نکلتا بھی ہے صبح کو اور شام کو غروب بھی ہوتا ہے — ہے یا یہ صفت شمس کی
 — فرق یہ ہے کہ جب شمس طلوع کرتا ہے تو بند دروازے کھل جاتے ہیں —
 یہی ہوتا ہے نا، بند دروازے کھل جاتی ہیں — کاروبار جاری ہو جاتا ہے —
 لوگ اپنا کام شروع کر دیتے ہیں — تمام دنیا میں روشنی ہو جاتی ہے — یہ شمس
 کے چمکنے کا زمانہ ہے — اور جب شمس غروب ہوتا ہے — کھلے دروازے بند
 ہو جاتے ہیں — کاروبار بند ہو جاتے ہیں — جب تک شمس کا وجود ہے اس
 وقت تک سب کچھ کا دور ہوتا ہے — جہاں شمس غروب ہو گیا اب چور کی باری
 آجاتی ہے — یہ میں شمس کی بات کر رہا ہوں — کوئی اور خیال اپنے دل میں
 نہ لانا — یہ ہے شمس کی حالت — تو میرے محرم سامعین — شمس کے
 طلوع سے دنیا کو فائدہ — شمس کے طلوع سے دنیا آباد — شمس کے آباد
 ہونے سے دنیا میں آبادی — جہاں شمس غروب ہوا ایسا اندھیرا آ جاتا ہے کہ میں کیا

بتاؤں۔ پورا اندھیر ہوتا ہے۔ آپ کہیں گے ستارے جو ہیں۔ بزاروں ستارے اسی شمس کی روشنی کی بدولت چمکتے ہیں۔ مگر اس کو پہچان کرین کرے کہ ان میں مغوس کتنے اور نیک کتنے۔ اصلی حیات کا مرکز شمس ہے۔ اصلی زندگی کا مرکز شمس ہے۔ اصلی توانائی کا مرکز شمس ہے۔ یہ طلوع رہے تو اس کی شان اور ہوتی ہے عزیز ہو جائے تو دنیا میں اندھیرا آجاتا ہے بڑا فرق ہوتا ہے قبلہ۔ کبھی کبھی اس کو گرہن بھی لگ جاتا ہے۔ آپ نے بھی دیکھا ہوگا سورج کو گرہن لگتے ہوئے۔ ہوتا ہے، مگر گرہن لگ جاتا ہے یہ بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ جب بھی ہمارے کسی امام کی شہادت ہوئی ہے۔ اس دن سورج کو ضرور گہرا لگا تھا۔ ضرور لگا تھا۔ جب بھی شہادت ہوئی ہے۔ آج حضور امام موسیٰ کاظمؑ کی شہادت کی تاریخ ہے۔ امام موسیٰ کاظمؑ کی شہادت کی تاریخ ہے آج صاحبان۔ آج آپ کے امام کی شہادت کی تاریخ ہے۔ اور آج آپ شمس کا جہلم بھی کر رہے ہیں۔ گویا امام کی شہادت بھی ہے اور شمس کا گرہن بھی۔ ضرور گرہن ہوتا ہے شمس کو امام کی شہادت کے دن۔

میرے محترم بزرگو، بھائیو، عزیزو۔ میں اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں یہ کہہ کے آپ حضرات میں سے سینکڑوں ایسے ہونگے۔ ان سامعین میں جنہوں نے چند دن پہلے شمس کا جنازہ دیکھا ہوگا۔ دیکھا تو مانا نہیں؟ کیوں بچو دیکھا تھا؟ کتنے آدمی تھے؛ کوئی کتا تو ٹھہرا ہی تھا۔ آپ نے ہزاروں آدمی تھے۔ اتنا بڑا جنازہ تھا یا نہیں؟ جنازہ دیکھا تو مانا؟ اور اس جنازہ سے کتنا متاثر ہوئے؟ میں آپ یہ جنازہ بھی دیکھ لیں ذرا کہ آپ کا امام تیس دن سے زہر سے شہید ہو گیا۔ گھر میں نہیں۔ ہال بچوں میں نہیں۔ قبرستان میں۔ جب

امام کی شہادت ہو گئی — چار مزدور جنازہ اٹھا کے دجلہ کے پل پہ رکھ آئے
صرف چار مزدور — آج کے دن ایسا جنازہ بھی اٹھا تھا — سمجھے حضور
والا — مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ کہ آج ہم چار مزدوروں والے جنازے کا واسطہ
دے کر اپنی اموات کے لئے دعا کرتے ہیں — کہ خداوند اسس عزیزب جنازے
کے صدقہ میں ہمارے دلوں پہ رحم فرما — ان کے درجات کو عالی کر —
ان کو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا — ان کو بارہ امام کی خدمت میں
پہنچا — یہ امام کی خدمت کرتے رہے ساری عمر — اور یہ ان کی خدمت میں
پہنچیں گے جن کی خدمت کرتے رہے — اور مظفر علی شمس میں چالیس سال سے
تیرا واقف تھا — میں نے تجھے خدمت آل محمد کرتے دیکھا آل محمد اپنے خادموں
کو کبھی باپس نہیں کرتے — ایک سیکنڈ کا خدمت کرنے والا اگر حضرت خُر
بن سکتا ہے — تو چالیس سال کے خادم — تو خدا جانے کیا بنا دیں اسے —
یہ تو بہتر جانتے ہیں — خدا ان کے جوار میں جگہ دے — ان کی خدمت
میں پہنچائے — آدسب مل کے دعا کریں — دعا کا وقت ہے —
یہ شہادتِ امام کا دن ہے — سب مل کے پکارو — یا اللہ! ہم تیرے دربار میں
تیرے اولیاء کے دربار میں آتے اٹھائے بیٹھے ہیں — ہم بھکاری حاضر ہیں —
ہمیں یہ بھیک عطا فرما کہ ہمارے سب کے گناہوں کو معاف کر دے — ہماری اموات
پر رحم فرما — ہمارے جانے والوں کے درجات کو عالی کر — ہم جو باقی ہیں —
ہمیں توفیقات غیر عطا فرما — ہم میں آپس میں اتحاد و اتفاق عطا فرما — ہم
سب ایک دوسرے کے جانشین ہو کے رہیں — اللہ دین آل محمد کو حمایت فرمائے
اور کلئہ دین آل محمد کی حفاظت فرمائے جسے اللہ دین آل محمد —
ان دعائیہ فقروں اور آپ کے شکر کے بعد میں آپ حضرات سے رخصت ہونا

ہوں۔۔۔ اب ایک نعرہ لگاؤ پھر فاتحہ پڑھنا۔۔۔ نعرہ تکبر۔۔۔ نعرہ رسالت
 نعرہ حیدری۔۔۔ کلمہ ولایت۔۔۔ کلمہ ولایت۔۔۔ شاباش۔۔۔ نعرہ
 تکبر۔۔۔ نعرہ رسالت۔۔۔ نعرہ حیدری۔۔۔ کلمہ ولایت۔۔۔ اسے
 پکایا رکھنا۔۔۔ ولایت کا کلمہ ہے۔۔۔ جو دسی کے عادی ہیں وہ ولایت سے
 مانوس نہیں ہوتے۔۔۔ دسی وہ ہوتی ہے جو خود بنا لیں۔۔۔ خود بنانے والوں
 کو کیا پتہ کہ ولایت میں کیا لطف ہے ؟ آپ کلمہ ولایت کو بالکل یاد رکھیں سمجھے
 ۔۔۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔۔۔ یہ کلمے اس طرح قائم و دائم رہیں۔۔۔

بحق محمد وآل محمد



(۲۱ جولائی ۱۹۷۶ء بمطابق ریسرچ ہال نسبت روڈ۔ لاہور
 بر موقع چیلڈن صاحب مظفر علی صاحب شمس مرحوم)

باب الحوائج

امام موسیٰ کاظمؑ

بڑوں کی طرف سے چھوٹوں کو عطیات ملتے ہیں۔ ان کے کئی نام ہیں۔ بڑوں میں اللہ بھی ہے۔ ہے اللہ بھی تو بڑا۔ ہے نا؟۔ اس کی طرف سے بھی عطیات ملتے ہیں۔ ان کے کئی نام ہیں۔ جو اللہ کی طرف سے عطیے ملتے ہیں وہ بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے عام بات بتاؤں آپ کو۔ کہ آپ صبح سے شام تک ایک مزدور نے مزدوری کی اُسے جو مزدوری ملتی ہے عطیہ عوض کہلاتی ہے۔ اس کا نام ہے عطیہ عوض۔ یہ بدلہ ہے اس کی محنت کا۔ خوب سمجھ رہے ہیں نا آپ میری بات کو۔ اگر اس کی مزدوری جو ملے ہوئی ہے۔ اپنے جو ملے کی ہے ایک دو آنہ زیادہ دے دیا جائے۔ یہ کہلاتا ہے فضل۔ سمجھے آپ۔ یہ اس پر فضل ہے۔ یہ جو زیادہ دے دیا ہے یہ کہلاتا ہے فضل اور اگر مزدوری نہیں کی ویسے ہی کوئی کام آپ کا کر دیا۔ باقاعدہ مزدور نہیں تھا ویسے ہی کوئی کام کر دیا آپ کا۔ تو اگر آپ نے کچھ دیا تو وہ نہ مزدوری ہے نہ وہ فضل ہے۔ اسے کہتے ہیں انعام۔ توجہ ہے نا صاحبان۔ وہ کہلاتا ہے انعام۔ اور اگر کسی نے اُس پر ترس کھا کے کچھ دے دیا۔ فاقہ کش تھا بیچارہ۔ ٹھٹھمر رہا تھا۔ کپڑا نہیں تھا۔ تو ایسے دینے کو کہتے ہیں کرم۔ ایسا دینے والا کہلاتا ہے کریم۔ توجہ ہے نا صاحبان!

بقول پنجابیوں کہ "روح کے پیا" خوب پیا۔ جب پیٹ بھر گیا۔ چھوٹے چھوٹے
تھے تھے ہونٹوں میں زبان مضبوطی سے پکڑ لی۔ بھٹی چھوڑ دیا۔ اسی طرح گھر تک
پہنچے۔ رسولؐ کی گود میں علیؑ ہیں۔ گھر والے سب اکٹھے۔ ابی طالب بھی
ہیں۔ بچے نے آنکھوں آنکھوں میں سب بزرگوں کو گواہ بنایا۔ کہ محمدؐ پیدا ہونے
ہی مجھے "زبان" دے چکے ہیں۔ اب اس ذکر سے بھی ہماری عبادت ہو گئی۔
اب تمام لوگ پوچھنے لگے محمدؐ کس شکل کا ہے۔ محمدؐ خاموش۔ آخر گھر کے
مالک نے "دمی" کے ذریعے بتلایا۔ محمدؐ۔ کہ دو۔ ہاتھ۔ "یہ اللہ ہے۔ آنکھ
"عین اللہ ہے۔ زبان۔ لسان اللہ ہے۔ جسم۔ جسد اللہ ہے۔ یہ عجیب
بات ہے۔ علیؑ کا ہاتھ۔ اللہ کا ہاتھ۔ علیؑ کا چہرہ۔ اللہ کا چہرہ۔ علیؑ کا جسم
اللہ کا جسم۔ علیؑ کی زبان۔ اللہ کی زبان۔ تو اربابِ دوق کے لئے ایک فقرہ
کہتا ہوں۔ کہ الگ الگ اجزا کرو تو اللہ۔ اور اتنے اللہ اکٹھے ہو جائیں تو علیؑ
عجیب بندہ آگیا۔ جسے آج تک علیؑ والے اللہ کہتے ہیں اور اللہ والے علیؑ
کہتے ہیں۔ سمجھ میں آیا۔ کہ کیوں سمجھ رہے ہیں کہ ایسے کا ذکر عبادت ہے کہ نہیں۔
تو میں عرض کر رہا تھا۔ علیؑ نے محمدؐ کی زبان سے دور وہ پیا۔ جو علیؑ سے بچ رہا تھا۔
وہ بچوں نے "باپ کا مال" سمجھ کے پیا۔ کس کی زبان سے باپ کا مال سمجھ کے بچوں
نے پیا۔ بچوں کی بات اور تھی علیؑ کی بات اور تھی۔ علیؑ ایک دفعہ دوشِ رسولؐ پر
سوار ہوئے اور تم نے کہا سبحان اللہ۔ اور بچوں نے اس کو کھیل کا میدان بنا دیا۔
جب دیکھو کاندھے پر سوار۔ رسولؐ مسجد میں جا رہے ہیں۔ یہ کاندھے پر سوار۔
مگر وہ پتے پتے تھے ہی اس قابل۔ کہ بچے راکب نہیں اور رسولؐ مرکب بنے۔ اب وہ
کہیں۔ مہار چاہیے۔ رسولؐ نے زلفیں پکڑا دیں۔ بیباہر باگ ہے۔ اب پکڑنا
کے ہاتھ میں رسولؐ کی زلفیں نہیں تھیں بلکہ باگ تھی اور باگ کے معنی یہ ہیں۔

موڑ دیں مڑ جائے۔ بدھر بھیر دیں پھر جائے۔ رسالت کی بانٹ ان بچوں کے
 ہاتھ میں تھی اور میں کہنا یہ چاہتا ہوں۔ کہ اتنی بڑی رسالتوں کی بانٹیں سنبھالنا زمان
 کے لئے بچوں کا کھیل تھا۔ یہ بچوں کی شان تھی اس انداز سے پرورش پائی تھی
 بچوں نے۔ جس طرح پہلے تھے یہ بچے۔ تین چار سال کے ہوئے تو رسولؐ
 گود میں لے کے بیٹھ گئے۔ بچو۔ عزیزو۔ میں سے تمہیں بڑے پیار سے
 پالا ہے۔ بڑی محبت سے پالا ہے۔ جی ماں قبیلہ۔ آپ نے بڑا پیار
 کیا ہے۔ اگر میرے دین پہ کبھی دنت اگیا تو کیا کرو گے۔ اب بچوں کے
 تیور دیکھنے کے قابل تھے۔ رسول بھی رو پڑے دیکھ کر۔ بچوں نے کھڑے
 ہو کر انگڑائی لی۔ تو قبا کے بند ٹوٹ گئے۔ نانا پرواہ نہ کر۔ گھر لگا دیں
 گئے۔ بچے لگا دیں گے۔ تیرے دین پر حرف نہیں آنے دیں گے۔ اور اگر
 ہمارا یقین نہ آئے۔ تو تم خود جنت سے آکر دیکھ لینا۔ مومنین! آج محرم
 کی آٹھ تاریخ ہے اور رسول جنت سے کربلا آتے ہوئے ہیں۔ اور وہ دیکھ
 رہے ہیں کہ بچوں نے کیا کرنا ہے۔ آج انہوں نے دیکھا ہے کہ بچوں نے کیا کیا
 ہے۔ وہ فرض ادا کر رہے ہیں۔ رسول دیکھ رہے ہیں۔ مگر حسین چاہے
 کچھ بھی کریں۔ آخر رسول کے نواسے ہیں۔ آخر علی کے بیٹے ہیں۔ آخر فاطمہ کے
 بیٹے ہیں۔ حسین کی بات تو حسین کے ساتھ رہی۔ اگر زینب کا کوئی کمال ہے۔ تو
 زینب کی بات قبیلہ زینب کے ساتھ ہے۔ کہاں فاطمہ کی بیٹی۔ کہاں علی
 کی بیٹی۔ اس کی شان بھی یہی تھی۔ جو اُس نے کیا۔ میں نے کہا ہوں حسین ایسا
 عظیم پارسا ہے جو اُس سے چھو گیا۔ اُسے حسین بنا دیا۔ حسین نے بہتر حسین
 بنا دیئے۔ خاندان کی نہ پوچھو۔ حسین اور زینب کی نہ پوچھو۔ غیروں کو دیکھو
 اُن کے جذبے کیانٹھے۔ انہیں دیکھ دیکھ کے رسول قرآن ہو رہے تھے۔ انہیں

دیکھ کے رسولؐ خدا ہو رہے تھے۔ میرے بھائیو! میرے عزیزو! حسین کے ساتھ غیر بھی تھے نا؟ ایک صحابی شہید ہو گیا۔ "جنادہ"۔ اس کا نام تھا۔ حسین لاشے پہ گئے اٹھا کے گینچ شہیداں میں رکھا۔ خیمے کی طرف جو دیکھا تو خیمے کا پردہ اٹھا ایک فردوس ساں کا پچھ دوڑتا ہوا نکلا۔ حسین نے آواز دی۔ آلِ محمد۔ اس بچے کو رکھو۔ یہ میدان میں کہاں آ رہا ہے۔ اتنے میں دو پتھر میلان کے قریب آ گیا۔ کمر سے تلوار بندھی ہوئی۔ پتھر چھڑتا تھا۔ تلوار تھی بڑی وہ گھسٹتی ہوئی آ رہی تھی۔ حسین نے بڑھ کے بچے کو گود میں اٹھالیا۔ کہاں جا رہے ہو۔ قبلہ مرنے جا رہا ہوں۔ میں دشمنوں سے لڑوں گا۔ میرے بیٹے تم کس کے بیٹے ہو؟ میں اس جنادہ کا جو ابھی مرا ہے۔ تمہارا باپ مرا ہے۔ تو یتیم ہوا ہے۔ اپنی ماں کے پاس جا کر بیٹھو۔ تو بچہ کہتا ہے۔ یہ کمراتاں نے باندھی ہے۔ یہ تلوار مری اماں نے خود باندھی ہے۔ میری اماں نے کہا ہے۔ بیٹا جا کر مہجڑو۔ یہ سن کر قرآن ہو گئے حسین۔ یہ غیروں کے عزائم تھے۔ قہر میں نے تمہیں ہر مجلس میں حسین کے دوستوں کی ادا میں سنائی ہیں۔ یہ غیروں کی ادا میں تمہیں اگر مناسب سمجھو تو بات کہ دوں۔ اپنوں کی۔ آلِ محمد اُچڑ گئے۔ سب کچھ لٹ گیا۔ خیر۔ میرے فرجوانو۔ آج آلِ محمد یہ سہارا ہیں۔ جو لوگ حسین کے خاندان کے نہ تھے۔ مگر حسین کے پاس کہ حسین بن گئے۔ خدا گرا ہے کمال کر دکھایا ہے۔ کہو اُبڑ کی ماں۔ سنیانی تو نہیں تھی مگر ایمان سے کمال کر دیا۔ حد کر دی۔ اُبڑ کی لاش آئی ہوئی ہے۔ اور حسین کہتے ہیں۔ اس کی ماں کو جلاؤ۔ اپنے بچے کی لاش پر آئے تو پہے جواب یہ ملا۔ کہ قبلہ نماز پڑھ رہی ہے۔ امام نے پوچھا۔ سبیل کیا نماز پڑھ رہی ہے۔ کہا۔ سورہ شکرانے کی نماز پڑھ رہی تھی۔ میری کمانا نیک راہ میں لٹ گئی۔ ایل

اپنے بیٹے کی لاش کو آکر دیکھ۔ پانچ منٹ گزر گئے۔ خیمے سے سیلی نہیں آئی۔
اب جو گئے نا، دیکھنے۔ دیکھا کہ سیلی خیمے میں گھوم رہی ہے۔ زینب
نے آواز دی۔ الکر کی ماں۔ باہر آؤ۔ کہا حسین کی بہن مجھے خیمے کا دروازہ نظر
نہیں آ رہا۔ مجھے در نظر نہیں آتا۔ ہاتھ پکڑ کے لائے۔ قاسم کی ماں تو سیدانی
نہیں تھی۔ یہ غیروں کا کمال تھا۔ دو چار فقرے سن لو۔ میرے جوان بیٹو۔!
میں تمہیں رونا نہیں دیکھ سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ہر وقت خوش رہو۔ مگر مٹا
کرنا۔ میری کہانی ہی ایسی ہے۔ اس لئے میں تمہیں جان کے نہیں لڑاتا۔ رہا ہے۔
بھی اسی گھر میں ہے۔ غیر خاندان کی ہے نا، یمن کے رئیس کی بیٹی ہے سیدانی
نہیں ہے۔ غیر خاندان کی ہے۔ ساری شہادتوں کے بعد حسین خیمے میں آئے
۔ بہن زینب میری ساری قربانیاں قبول ہو گئیں۔ کسی کے بدلے کو نہ نہیں آیا۔
اب میں چاہتا ہوں کہ کوئی نذرانہ پیش کروں۔ اللہ کے سامنے۔ کوئی نذرانہ پیش
کرنے کے لئے کوئی شے ہے۔ زینب نے کہا۔ کہ میرے پاس تو دو ہیرے
مجھے ختم ہو گئے۔ سیلی نے کہا۔ میرا تو اٹھارہ سال کا شب چراغ تھا۔ گل ہو گیا
۔ فردہ نے کہا کہ میرا واحد سہارا قاسم تھا۔ وہ بھی تقسیم ہو گیا۔ ہم سب
خالی ہاتھ میں۔ ایک کونے میں سے رباب کی آواز آئی۔ حسین! ذرا سی نیلم
کی کسی میرے پاس ہے۔ ایک نیلم کا ٹکینہ ہے میرے پاس اگر تیرے کام آئے
تو اسے لے لے۔ کہا رباب اسے لے جاؤں۔ کہا لے جاؤ۔ جہاں جہاں صلوات
ہو میری بات سنو۔ حسین چلے آئے۔ آگے آگے حسین پیچھے پیچھے رباب۔
جب خیمے کے دروازے پہنچے۔ رباب نے کہا۔ مولاً ذرا ٹھہرنا۔ ذرا یہ پچھ
مجھے گود میں دینا۔ رباب نے دو منٹ گود میں لیا۔ اور اصرار کی بہن سیکھ کر
ساتھ لیا۔ دونوں کورے کر خیمے میں آگئی واپس جہاں زینب تھیں۔ حسین زینب

کو دیکھ کر کہا۔ سن حسین۔ سن زینب۔ تم فاطمہ کے بیٹے بیٹی ہو۔ میں
 غیر خاندان کی ہوں۔ تمہارے گھرانے میں آئی تو فاطمہ کی بہو کہلائی۔ تم نے
 مجھے بڑی عزت بخشی۔ تمہارے گھرانے سے مجھے یہ دوا لعل ملے۔ ایک سکیٹہ
 ایک اصغر۔ میں تمہاری دیر میں لاوارث ہوں گی۔ نہ سیکے ہوں کے دسرال
 ۔ میں تمہاری امانت سنبھال نہیں سکتی۔ لہذا یہ تمہارے سپرد۔ یہ کہہ کر سکیٹہ کو
 بٹھا دیا زینب کی گود میں۔ اصغر کو دے دیا حسین کی گود میں۔ زینب تو جانے
 اور سکیٹہ جانے۔ حسین تو جانے اور اصغر جانے۔ دو وزن کو سپرد کر دیا۔ حسین
 اصغر کو لے گئے۔ سکیٹہ کو زینب نے گئی۔ سکیٹہ یہ وہاں کیا گذری۔ اُس پر کیا
 گزر گئی۔ اگر بہت ہے تو سن لو دو چار لفظ۔ کیوں بھئی نوجوانو!۔
 تم میں ہے ہمت اس تقد کو سننے کی۔ میں تو بوڑھا ہو چکا ہوں میں تو پڑھ لیتا ہوں
 ۔ جوانوں کے خون میں گرمی ہوتی ہے۔ حیدرآباد (سندھ) میں میں نے سکیٹہ
 کی شہادت پر صبحی تمہی کئی نوجوانوں نے چاقو مار لئے تھے۔ بچو! بھائیو!
 سکیٹہ۔ زینب کے ساتھ اور تیر و محرم ہے۔ اور ابن زیاد کے دربار میں کھڑی
 ہے۔ ابن زیاد نے پوچھا۔ کہ یہ بچی کون ہے۔ بتایا گیا۔ کہ یہ حسین کی بیٹی ہے۔
 حسین سے اسے بڑا پیار ہے۔ کہنے لگا بچی آگے آؤ۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا
 ہوں۔ بچی نے بھائی کو دیکھا۔ پھوپھی کو دیکھا۔ ناخرم سے بات کی اجازت
 ہے؟ پھوپھی نے بھائی نے اجازت دی۔ بچی نے بات کی۔ سنو گے بھائی
 ۔ بات اس طرح کی کہ لب ہل رہے تھے آواز نہیں آرہی تھی۔ بڑی دیر تک لب
 پلٹے رہے آواز نہیں آئی۔ ابن زیاد کہتا ہے کہ مجھے آواز نہیں آتی۔ تو امام زین العابدین
 نے فرمایا۔ کہ بچی تو بول رہی ہے مگر اس کا کلا اتنا مضبوط بندھا ہوا ہے کہ اس کی
 آواز نہیں نکل رہی۔ اس کا کلا کھلو ایا گیا۔ پانچ منٹ تک بچی گلے کو سہلاتی

رہی۔ جب حواس ٹھیک ہوئے تو ابن زیاد نے پوچھا۔ کہ تیرا نام کیا۔
 کہا فاطمہ نام ہے مگر باپ مجھے پیار سے سکینہ کہتے تھے۔ بچی اگر اس وقت
 حسین زندہ ہوتے تو مجھے کیا کھلاتے۔ بچی نے کہا کہ بابا مجھے تازہ خرے کھلایا
 کرتے تھے۔ سونگے نامیرے بھائیو! اجازت ہے کہ دوں لفظ۔ اجازت
 ہے۔ اجازت ہو تو بتا دوں۔ وہ بے حیا خلیفہ کہتا ہے۔ بچی نے
 تازہ خرے منگائے ہیں کھائے گی۔ اس پر بچی نے بھائی کو، پھوپھی کو دیکھا
 ۔ اشرارہ کیا۔ کہہ دو۔ ہاں۔ کہا لے آؤ۔ بچی کے آگے طشت
 لایا گیا۔ رومال اٹھایا گیا۔ کوزہ میں زلزلہ آگیا۔ بچی ہائے بابا کہہ کے
 گر پڑی۔ ابھی بات ختم نہیں۔ سکینہ تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تمہارا خاندان معجز
 ہے۔ میں تو تب جانوں کہ حسین کا سر خود تیری گود میں آئے۔ یہ سنا تھا کہ جویش
 آگیا۔ جلال آگیا۔ حیدر کی پوتی کو۔ سر کو چھوڑ کر چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اور
 پھٹا ہوا گرتنہ پھیلا دیا۔ بابا جان۔ میری محبت کا واسطہ۔ پھوپھی زینب
 کی قیر کا واسطہ۔ بابا میری عزت کا سوال ہے۔ مجھے دربار میں شرمندہ نہ کرنا۔
 حسین کا سر اڑ کر سکینہ کی گود میں آگیا۔ کوزہ کے باہر در لرز گئے۔ زلزلہ
 آگیا۔ آج کی مجلس کو میں اپنی طرف سے آپ کی طرف سے بانیاں مجلس کی طرف
 سے حضرت سکینہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ شہزادی ہماری حامی کو قبول فرما
 شہزادی ہم کہ بلا میں ہوتے تو مجھے قید نہ ہوتے دیتے۔ در بدر نہ ہونے دیتے۔
 اپنے باپ اور دادا سے ہماری سفارش کرنا کہ خدا ان گھروں کو آباد رکھے۔ جن میں
 سادات کے اُجڑے گھروں کا ماتم ہوتا ہے۔ خدا تم سب کو سلامت رکھے۔ بحق
 مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ
 اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

آلِ ابی طالب

عنوان

آلِ ابی طالب^۳
شہزادہ علی اکبر^۴

فضائل
مصائب

پہرے آخری سلام کو اکبر^۳ بھگے ہوئے
نقشہ کھنچا ہوا ہے رکوع رسول کا^۴

ترکی و ترکی

خداوند عالم کی حمد و ثنا اور حضرات محمد و آل محمد علیہم السلام پر درود و سلام کے بعد میں اس طرح گزارش کرتا ہوں کہ اللہ اپنے علم و فضل کے مطابق اپنا جو کام لینا چاہتا ہے، کسی انسان سے۔ اس کام کے مطابق آدمی وہ خود چن لیتا ہے اس سے میں نے یہ کام لینا ہے۔ اس سے یہ کام لینا ہے۔ انسان، خدا خود انسانوں میں سے چن لیتا ہے اپنے کام کے لئے۔ سمجھ لے رہے ہیں نا صاحبان۔ اللہ کے یہاں الیکشن نہیں، اللہ کے ہاں سلیکشن ہے۔ اب میں انگریزی لفظوں کے معنی تو جانتا نہیں سنتے ہوتے ہیں نہ کہہ دیتے ہیں۔ ہم لوگ کرتے ہیں الیکشن اور اللہ کرتا ہے سلیکشن۔ ہم بہت سے ل کے چنتے ہیں ایک کو اور اللہ چنتا ہے بہت سوں میں سے ایک کو۔ سلیکشن کا ترجمہ چننا اور الیکشن کا ترجمہ ہے جھٹلانا۔ جو بندہ سلیکشن سے آئے وہ چنا ہوا ہوتا ہے۔ جو الیکشن سے آئے وہ جھٹلا ہوا ہوتا ہے۔ بہر نوع اللہ چن لیتا ہے اپنے کام کے لئے اس آدمی کو جسے موزوں سمجھتا ہے تو جہ ہے نا صاحبان۔ اور اس بڑی مختصر سی تمہید کے بعد میں اپنی مجلس شروع کرتا ہوں تاکہ تھوڑے وقت میں ختم ہو۔

میرے محترم سامعین! اللہ نے اپنا کام لینے کے لئے جس خاندان کو چن لیا وہ خاندان بنی ہاشم کہلاتا ہے اس خاندان کو اللہ نے چن لیا تھا۔ اس لئے کہ اس خاندان سے وہ اپنا کام لینا چاہتا تھا۔ اس لئے یہ خاندان، اللہ نے چن لیا۔ اور اس بنی ہاشم کے خاندان میں سے بھی برفرد سے کام نہیں لیا بلکہ اس خاندان کا جو فرد جس کام کے لئے موزوں ہوا وہ کام اللہ اس فرد سے لیتا رہا۔ عبدالمطلب سے کہنے کی حفاظت کا کام لیا جب ابراہم آیا تھا ہاتھی لے کر۔ اور عبدالمطلب کے بعد ان کے جانشین حضرت ابوطالب سے جن کا نام نامی ہے عمران کیت ہے ابوطالب۔

جن کے خطابات ہیں بیضۃ البلا، شیخ البطلی، سید القوم۔ یہ ان کے خطابات ہیں۔ سب سے پہلے عرب میں لفظ سید، جناب ابوطالب کے لئے استعمال ہوا اور آج تک ان کی نسل کے ساتھ یہ لفظ مشہور ہو گیا۔ جناب ابوطالب سے بھی کام لیا۔ اللہ نے۔ اور یہ کام ابی طالب کے سپرد ہوا کہ میرے رسول کو جو میری اس تمام مخلوق میں ہیں سے سب سے زیادہ معزز اور قیمتی ہے، لے ابوطالب اس کو ہم تیرے سپرد کرتے ہیں۔ تم اسے پالو اور پرورش کرو۔ توجہ فرمائی نا صاحبان۔ اللہ نے اپنی سب سے قیمتی شے سپرد کر دی ابوطالب۔ یہ فقرہ آپ نے سن لیا۔ اسکی ذرا سی تشریح کہ دوں آپ سے۔ میرے ہاتھ میں یہ ملل کارروماں ہے۔ پتہ نہیں آٹھ آنے کا ہے، چھ آنے کا ہے۔ ایسا ہی کچھ ہو گا چھ چار آنے کا۔ میں چاہتا ہوں یہ رومال کسی کے سپرد کروں۔ اب اتنا مجمع ہے میرے سامنے۔ سب ماشاء اللہ مومن ہیں۔ میں نے یونہی ہاتھ بڑھا کے ایک آدمی کو دے دیا رومال۔ اب مجلس کے لبر پوچھتا پھرتا ہوں۔ جھٹی میرا رومال کس کے پاس تھا، کہاں ہے؟ کون سے گیا وہ رومال میرا؟ لوگ کہیں گے نزدیک صاحب، تم نے خود غلطی کی۔ کسی جانے پہچانے کو دینا تھا۔ کسی ایماندار کے سپرد کرنا تھا۔ کسی شریف آدمی کے سپرد کرنا تھا۔ جب ایک کپڑے کا رومال سپرد کرتے ہوئے جان پہچان دیکھنی پڑتی ہے۔ شرافت دیکھنا پڑتی ہے، ایماندار دیکھنا پڑتی ہے تو اللہ نے محمد جیسی قیمتی شے سپرد کرتے وقت یہ نہیں دیکھا ہو گا کہ یہ بندہ شریف ہے یا نہیں؟ ایماندار ہے یا نہیں؟ اور اللہ جسے اتنا ایماندار سمجھے کہ محمد جیسی شے سپرد کرے، ایسے ایماندار کو بے ایمان کہنا، بے ایمانی ہے کہ نہیں چہرہ نوح یہ تو کام اللہ نے ابی طالب کو دیا، اور ابی طالب نے اپنی گود میں نبوت کو بس پالا، امامت کو بس پالا۔ گویا زید من ابی طالب پل کر نبوت آخری نبوت بن گئی، اور امامت پہلی امامت بن گئی۔ ابی طالب کی پرورش کے بعد تو یہ کام اللہ ابی طالب سے لے رہا تھا

اور آج تک خدا کا کام نسلِ ابی طالب کے پُردے ہے اور اللہ کی بگڑی بنانے کے لئے آج جس ابی طالب کا کنبہ دنیا میں زندہ ہے اور قائم۔ یہ کام اللہ نے ابی طالب کے پُردے کیا۔ میری بات پر توجہ ہے نا صاحبان۔ بڑی مختصر مختصر بات۔ ادھر ابی طالب تھے قابل کہ آتے ہی سامنے شیطان آگیا۔ ابراہیم کے آتے ہی سامنے فرود آگیا۔ موسیٰ کے سامنے فرعون آگیا۔ اس خاندان بنی ہاشم کے مقابلے پر خاندان نبی۔؟ وہی آگیا جو آپ کہہ رہے ہیں۔ یہ خاندان آگیا۔ اس خاندان میں بھی بہت بڑے بڑے آدمی پیدا ہوئے۔ بڑے بزرگ آدمی پیدا ہوئے، ایک صاحب فرماتے تھے کہ جتنے بڑے آدمی پیدا ہوئے سب اس خاندان میں ہوئے۔ وہی خاندان جس کا نام آپ سے رہے ہیں "بنی ہاشم میں کوئی بڑا آدمی پیدا نہیں ہوا"۔ میں نے کہا بالکل۔ بنی ہاشم میں تو جو پیدا ہوا بچہ پیدا ہوا۔ امیہ کے خاندان میں جو پیدا ہوا بڑا پیدا ہوا۔ یہ خاندان بنی ہاشم کے مقابلے کا خاندان ہو گیا۔ وہ دن تھے تو یہ رات تھے۔ اس خاندان میں بھی بڑے آدمی تھے۔ اس خاندان میں بھی بڑے آدمی تھے۔ اس خاندان کے بڑے آدمیوں میں سے ایک بڑے آدمی کا نام ایسا ہوا وہ تھے حضرت ابی سفیان۔ نام سُنہ ہے نا آپ نے۔ حضرت میں نے اس لئے کہا کہ بڑے حضرت تھے۔ اگر آپ چاہیں تو ان کے فضائل بھی بیان کر دوں۔ حضرت ابوسفیان کے۔ سنیں گے آپ؟ فضائل پڑھوں؟ لوصاحبان اس ایک جملے پر فضائل ختم کرتا ہوں یہ یزید کے سہمی دادا تھے۔ یہ ان کے فضائل ہیں۔ یزید کے دادا جان۔ حضرت ابوسفیان۔ یہ اس خاندان میں پیدا ہوئے۔ جتنی جنگیں رسالتِ مابے سے ہوئیں ان سب جنگوں میں کفر کی فوج کے پیرسار ہی حضرت سفیان ہوا کرتے تھے۔ توجہ ہے نا صاحبان۔ مکہ کی فتح کے بعد اسلام کا اعلان کر دیا اور یہ بدلنے لگے۔ پیرسار سے محترم صحابین بڑے عور سے سُنہ شروع کرنا اب میں

مطاب کی بات سنا رہی ہوں آپ کو تاکہ اپنے وقت میں مجلس بھی ختم ہو جائے اور بات بھی ختم ہو جائے۔ اس حضرت سنیان کے تین چار بیٹے تھے۔ جن میں سے ایک شہرہ آفاق بیٹا۔ وہ ہے امیر شام۔ یزید کے والد بزرگوار۔ یہ ان کا شہرہ آفاق بیٹا ہے، ابوسفیان کا۔ سمجھے حضور۔ نام بابر نہیں، بلکہ کا کوئی۔ نامور بیٹے تھے۔ اور جناب کئی بیٹیاں بھی تھیں ان کی۔ اس وقت اس مجلس میں مجھے آپ کی مندرکشت پوری کرنے کے لئے، مجلس سنانے کے لئے ان کی دو بیٹیوں کا ذکر کرتا ہوں۔ حضرت ابوسفیان کی دو بیٹیوں کا تذکرہ آپ کو سنا ہے۔ یہ آپ سنیس۔ اور عور سے سنیس۔ ان کے دو بیٹیاں تھیں۔ ایک کا نام تھا ام حبیبہ، ایک کا نام تھا جادیدہ۔ یاد رکھیگا آپ کو۔ ایک ام حبیبہ، ایک جادیدہ۔ یہ جو حضرت ابوسفیان کی بیٹی تھی، ام حبیبہ، ان کی شادی ہوئی تھی حضور سرور کونین سے۔ ابوسفیان کی بیٹی اور ہم مومنوں کی ماں، جناب ام حبیبہ۔ ام حبیبہ ہماری ماں تھیں۔ ان کے باپ سے بہار کیا رشتہ ہوا؟ سنو گے؟ کس نے مجھ سے پوچھا، ام حبیبہ تو ہماری ماں ہیں، ان کے باپ سے کیا رشتہ ہے۔ میں نے کہا۔ نا۔ نا۔ بہر نوح یہ ام حبیبہ حرم رسول ہیں، ام المومنین ہیں۔ واجب الاحترام ہیں۔ رسول کی بیوی ہونے کی حیثیت سے اور ہم مومنوں کی ماں ہیں اور ہمارے دلوں میں ان کی بڑی عزت ہے ان ہونے کی حیثیت سے۔ سمجھے نا آپ؟ ان کے فضائل کتابوں میں بھرے پڑے ہیں، بحیثیت ام المومنین مگر سب سے بڑی فضیلت ان کے جو مسلمانوں نے کتابوں میں لکھی ہے وہ یہ ہے کہ جناب ام حبیبہ ایک دن رسول کے گھر بیٹھی تھیں، ان کے باپ ابوسفیان ان سے ملنے آئے۔ مسلمان تھے نا۔ مسلمان ہونے کے بعد یہ شادی ہوئی تھی۔ جب انہوں نے حجرے میں تلو رکھا۔ آگے کہا بیٹی خیریت تو ہے؟ جب باپ آتا ہے ملنے۔ تو بیٹی نے درج جو کچھ دانتی وہ سمیٹ دی۔ زمین پر اشارہ کیا ابا جیحو، لٹریٹ رکھو۔ کہا دیکھو ام حبیبہ تم نے یہی

توہین کی ہے۔ جانتی ہو ہم کون ہیں؟ ہم عرب کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ ہم لاکھوں لاکھوں لیکر آئے تھے مقابلے کے لئے۔۔۔ دنیا ہوا کچھ بڑھتی ہے، ہمیں دیکھ کر شیطان تک جھکتا ہے۔ تم نے ہمیں کی تجھلے۔ یہ درمی کیوں سمیٹ رہی۔ ہیر، مٹی، پتھر نہیں دیا۔ اتم جیبہ نے بڑے ادب سے کہا کہ جناب بات یہ ہے کہ یہ درمی وہ ہے جس پر رسول مٹیئے ہیں۔ اس پر آپ اس طرح نہیں بیٹھ سکتے۔ یہ راقعہ کلے کر مسلمان مورتی یہ لکھتے ہیں کہ یہ ہے اس کے کابل اللہ بیان ہونے کی دلیل۔ یہ ہے اُس کے اتم المؤمنین ہونے کی دلیل۔ میں بھی مٹی پر یہی کہتا ہوں کہ واہ اتم جیبہ، اتم المؤمنین ہو تو ایسی ہو کر رسول کی جگہ پر باسنا کو نہ بیٹھیں دے۔ یہ ہے نشان اتم المؤمنین۔ سمجھ رہے ہو نا، جان۔ اور میرے مختصر سامعین اللہ آپ کو رسالت رکھے اور خوش رکھے۔ میں ایک بات آپ سے بیچ میں ضمناً کہنا چاہتا۔ چونکہ جدید فتنوں سے رہنا ہے اور بات بھی کرنی ہے۔ آپ پر چھیں گے کہ کس کتاب میں کہیں نہیں۔ یہ خود کہاں ہے؟ کہیں نہیں۔ یہ میں اس لئے دل کی بات کہہ رہا ہوں کہ یہی بتائے دیتا ہوں۔ اگر اس پر کوئی اعتراض ہے تو وہ گھر پر ہے۔ یہ میرے مذہب کی کتاب کی بات نہیں ہے کہ قیامت کے دن ایران کا شمشاد، نوشیروان، جس کے لئے کتابوں میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ بجز یہ ہائے کا لہجہ کا زہونے کے۔ اللہ سے کہیں کچھ اسطافرا سے کہہ جو آگ کو اس سے دور رکھے گا، یہ اُسے رسالت کو حد سے گارہ تو کتابوں کی بات ہے، اور میں اپنی بات کہتا ہوں۔ یہ لکھا ہے کہ اسے کیلئے؟ جب فرشتے نے جارہے ہونگے اسے جہنم میں، یہ میری ذاتی بات ہے اور یہ جاتے جاتے کہہ دیکھا جہنم میں تو میں جلا جلاؤنگا، پر جانے سے پہلے میں ذرا اپنے نواسے سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کو لے تھے زین العابدین زین العابدین سے اس کا اما سامتا ہو جائے گا اور زین العابدین سے کہے گا تم میرے نواسے ہو۔ فرشتے خود شرمنا جائیں گے۔ اسکو جہنم میں لے جاتے ہو گے۔ اللہ خبر کرنا چاہتا ہے اس کے گھر نواسہ پیدا کر دیتا ہے اور میں کے گھر نواسہ نہ ہو اس کا کوئی بچہ پیدا نہیں۔

کوئی اسے بچا نہیں سکتا۔ یہ جناب ام حبیبہ کی بات آریکے ذہن میں آگئی۔ اب اسے میں پلٹ کے
 دوسری بہن کا قصہ سنائے۔ جس طرح عرب بنی ہاشم شرافت میں مشہور تھے۔ اور ان کا مقابلہ
 خاندان سیاست میں مشہور تھا۔ یہ لفظ میں نے احتیاط کہا ہے، سیاست ہیں۔ اسی طرح عرب
 ہیں ایک خاندان تھا جو حُسن میں مشہور تھا۔ اس کا نام تھا خاندان بنی ثقیف۔ یاد رہے گا
 آپ کو خاندان بنی ثقیف حُسن میں مشہور تھے۔ اور خاندان بنی کلاب یہ شجاعت میں مشہور تھا۔
 یہ عرب کے مشہور خاندان تھے۔ اگر بہادر کا نام نو تو بنی کلاب سمجھے جاتے تھے۔ اگر حُسن کہو تو
 بنی ثقیف سمجھے جاتے تھے۔ اگر شریف کہو تو بنی ہاشم کہنے جاتے تھے۔ اگر عمار کہو تو....
 پھر وہ.... یہ تھے مشہور عرب کے خاندان۔ تو بنی ثقیف کے خاندان کا رہیں اور جو
 شیخ تھا اس کا ابو عمرو نام تھا۔ ابو عمرو ثقفی۔ حضرت ابوسفیان کی دوسری بیٹی،
 ام حبیبہ کی سگی بہن۔ ابو ذرہ ثقفی سے بیاہی ہوئی تھی تو ابو عمرو ثقفی، خاندان ثقیف
 کا سردار اور رسل تھا آپس میں کیا ہوئے تھے۔ بولو۔ بہن وہ آپس میں ہم زلفت
 ہوتے۔ ایک بہن ابو عمرو ثقفی کے گھر میں تھیں اور ایک بہن جناب رسالت کے گھر
 میں۔ آپ گھرا تو نہیں گئے میری اس بات سے۔ سُن سے ہونا عورت سے۔ رسالت آپ
 کے گھر تو کوئی اولاد نہیں ہوئی جناب ام حبیبہ سے۔ ابو عمرو ثقفی کے گھر جو ابو سفیان کی
 صاحبزادہ تھی ان کے ایک بڑی پیدا ہوئی۔ سمجھے نا۔ ایک بڑی پیدا ہوئی ابو عمرو ثقفی
 کے گھر۔ ابوسفیان کی بیٹی، امیر شام کی بہن، ان کے ایک بڑی پیدا ہوئی جس کا نام تھا یلی۔
 اب یاد رکھیں گے نا۔ یلی ابو عمرو ثقفی کی بیٹی، ابوسفیان کی نو مسلم۔ نام آپ کی بیٹی
 تھیں۔ یہ یزید کی کیا ہوئی؟ بولو نا؟ بولو تھی۔ امیر شام کی چھانچھی تھی یہ یزید کی
 چھوٹی زاد بہن تھیں۔ حقیقی چھوٹی زاد بہن، جناب یلی۔ یہ ہوئی جناب یلی۔
 اب یہ بات بھی آپ کی سمجھ میں آگئی نا۔ ابو ذرہ ثقفی کی جو بڑی تھی ان کا ابوسفیان سے
 کیا رشتہ تھا چھوٹی؟ فواسی کا۔ امیر شام کی کیا تھیں وہ؟ چھانچھی۔ یزید کی کیا تھیں؟

کچھ بھی زاد بہن۔ کس خاندان سے تھیں۔ بنو ثقیف سے۔ بنو ثقیف کی صفت کس بات کی تھی۔؟ حسن و جمال کی۔ تو لیلیٰ اپنے زمانے میں رئیس بنی ثقیف کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے ان تمام خوبوں کی مالک تھیں جو اس خاندان کی تھیں۔ سمجھ میں آرہے نامہ جان کے۔ جب یہ جوان ہوئیں لیلیٰ تو ان کے باپ کو شادی کی فکر ہوئی۔ اس نے چاہا کہ میں اپنی لڑکی کی شادی کروں۔ جہاں جہاں بیٹھے ہیں بڑے غور سے سُننا بات کو۔ وہ اپنے گھوڑے یا ناتے پہ سوار ہوا حضور اور مدینے آیا۔ وہاں مدینے کی مسجد میں حضور سید الشہداء امام حسین سے اس کی ملاقات ہوئی اس ایوارہ نشی کی۔ امام حسین علیہ السلام سے وہ ملا۔ آپ کے خدمت میں امام حسین کی وہ بیٹھی گیا اور بیٹھ کے عرض کیا اس نے کہ قبلہ میں ایک دفتر آپ کے نانا کے پاس بھی آیا تھا۔ میں نے آپ کے نانا سے ایک حدیث سنی تھی وہ مجھے پوری طرح یاد نہیں ہے۔ میں آپ کو وہ سناتا ہوں۔ اگر کہیں بھی بھول جاؤں تو۔۔۔

قبلہ آپ اس کی تصحیح کر دیں۔ آپ نے کہا ہاں سناؤ کیا ہے؟ اس نے کہا آپ کے نانا نے یہ فرمایا تھا کہ اگر تمہیں کو مشکل پیش آئے تو ایسے شخص کے پاس جانا مشکل کو حل کرنے کے لئے جو تمہارے علاقے میں تمہاری دسترس میں سب سے زیادہ عالم ہو۔ اس نے کہا یہ ٹھیک ہے۔ وہ حدیث جو آپ نے فرمائی تھی؟۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے تجھے صحیح یاد ہے۔ یہی کہا تھا میرے نانا نے۔ اس نے کہا کہ قبلہ آگے بھی ہے۔ کہ ہاں کیا؟ کہ آگے فرمایا تھا آپ کے نانا نے کہ اگر عالم تمہیں نہ مل سکے تو ایسے شخص کے پاس جانا جو حسب اہل نسب میں سب سے زیادہ شریفین ہے۔ اس نے کہا ٹھیک ہے؟ آپ نے فرمایا بالکل ٹھیک ہے۔ تو نے ٹھیک کہا۔ اس نے کہا حضور آگے یہ کہا تھا کہ اگر حسب نسب والا نہ ملے تو ایسے بندے کے پاس جانا جو سب سے زیادہ حسین ہو تویری نظروں میں۔ آپ نے فرمایا ہاں ٹھیک ہے۔

بالکل ٹھیک۔ کہا حضور مجھے ایک کام ہے۔ میں ایسے آدمی کے پاس بیٹھا ہوں جو علم میں بھی سب سے زیادہ ہے، حسب نسب میں بھی سب سے بہتر ہے، حسن میں بھی سب سے

بہتر ہے۔ یہ تینوں صفیق ہیں۔ میری مشکل آپ حل کریں گے۔ سُن لیا آپ نے۔ آپ نے اس کی یہ بات سُن کے اب اس سے یہ سوال کیا کہ ہم تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ اُس نے کہا قبہ فرمائیے کیا پوچھنا ہے؟ کہ یہ بتلاؤ کہ دُنیا میں سب سے بڑا آدمی کونسا ہے؟ میری بات کو آپ حضرات سمجھ رہے ہیں۔ اُس نے کہا حضور، سب سے بڑا آدمی دُنیا میں وہ ہے جس کے پاس علم مع علم کے۔ علم نہیں۔ علم مع علم کے۔ اس کے ساتھ بے صبری ہو تو یہ علم کی توہین ہے۔ علم ہو مع علم کے۔ آپ نے فرمایا ہے شک تم نے ٹھیک کہا۔ اچھا۔ اور اگر یہ نہ ہو کسی کے پاس پھر؟ کہ قبہ اس سے دوسرے نمبر پر آدمی وہ ہے جس کے پاس دولت ہو مع سخاوت کے۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا بالکل ٹھیک کہا۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر۔ کہ حضور میرے نمبر پر آدمی وہ ہے جس کے پاس فقیری ہو مع قناعت کے۔ آپ نے فرمایا شاہنشاہ بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ بالکل درست ہے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو کہ حضور اسل آدمی کو مر جانا چاہیے۔ اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ آپ نے ٹھیک کہا۔ تو نے بالکل صحیح جواب دیئے۔ اب بتاؤ تم کی چاہتے ہو تم سے؟ کیا مانگنے آئے ہو۔ اس نے کہا مانگوں؟ کہ ہاں۔ میری بات قبول فرمائیں گے۔ کہ بالکل۔ کہ حضور مجھے خدا نے ایک لڑکی دی ہے۔ میں خاندانِ ثقیف کا رئیس ہوں۔ میرے اور کوئی اولاد نہیں۔ میں حضور کی خدمت میں اس سے آیا ہوں۔ میری تمنا یہ ہے کہ جیسی میری لڑکی ہے، داماد میرا وہ ہو کہ میں دنیا کے سامنے فخر سے کہہ سکوں کہ اُوٹدیکھو یہ ہے میرا داماد۔ آپ نے فرمایا تم کیسے چاہتے ہو؟ کہ حضور اگر میری لڑکی کو قبول فرمائیں۔ آپ نے فرمایا منظور ہے۔ چنانچہ لیلیٰ کا عقد حضور سید الشہداء سے ہوا۔ تو جو فرمائیے انا جان د بات یہ میری غور فرمائیے ہیں حضور۔ سید الشہداء کی پہلی بیوی جو ثقیف والہہ ام البنین تھیں وہ ایران کی شہزادی تھیں۔ پھر عقد ہوا آپ کا لیلیٰ سے۔ یہ قبیلہ بنی شیبہ کے سردار کی بیٹی تھیں۔ پھر عقد ہوا آپ کا رباب سے جو نعل کے ایک رئیس امراء بن تیسوں کی بیٹی

تجیں۔ بہر نوح حضور۔ اس وقت میرا مطلب یہ سنانا تھا۔ یہ بات با درہے گی نا آپ کو۔
 یاد رکھو گے نا اس کہانی کو۔ اللہ باری کا عقد ہو گیا حضور سید الشہداء کے
 ساتھ۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ اب میری کہانی غور سے
 سننے رہنا۔ تاکہ وقت میں بات بھی ختم ہو سکے۔ اور آپ بھی سن لیں۔ میرے محترم
 سامعین اور وہ محترم حضرات جو دھوپ میں بیٹھے ہیں مجھے کا بڑا احساس ہے۔
 مگر میں دھوپ میں بیٹھے والوں سے یہ بات کہتا ہوں۔ تم قدری دیر بیٹھو گے۔ پھر آگے
 بعد اٹھ کے گھر چلے جاؤ گے۔ اور حسین کی شہزادی فاطمہ کبرا پور سے چھ سال دھوپ میں
 بیٹھی۔ چھ سال تک دھوپ میں بیٹھی رہی۔ پورے چھ سال۔ بہر نوح۔ یہ نعم حسین
 دھوپ اور یوں کو مٹا دیتا ہے۔ ساری چیزیں ختم کر دیتا ہے۔ تو میرے محترم سامعین!
 حضور سید الشہداء کو خدا نے جب پہلا بیٹا امام زین العابدین عطا فرمایا پھر فرزند تھا سید الشہداء
 امام زین العابدین۔ تو آپ نے اپنے بیٹے کا نام علی رکھا۔ اور بچے کو قطعاً رومال میں لپیٹ کر
 مسجد میں لے آئے۔ وہاں مسجد میں لٹا کر دو رکعت نماز پڑھی اور کھٹا کھٹا دعا کی امام
 نے۔ خداوندائے نعمت تو نے مجھے دی تھی۔ میں تیرے ہی سپرد کرتا ہوں۔ یہ کہہ کے
 مسجد میں لپٹا چھوڑ کر بچے کو، گھر آگئے۔ جب زین العابدین علیہ السلام پیدا ہوئے،
 امیر المؤمنین اس وقت دنیا میں موجود تھے۔ انہیں یہ معلوم ہوا۔ مسجد میں گئے۔ دو رکعت
 نماز پڑھی۔ خداوندائے حسین تو تیرے سپرد کر گیا۔ میں مانگنے آیا ہوں۔ امام زین العابدین
 کو جناب امیر نے آئے ساتھ اور کہا کہ میں نے اسے خدا سے مانگ لیا ہے۔ میں پاؤں نکلا۔
 یہ میرا بیٹا بن کے رہے گا۔ میں پرورش کروں گا اس کی۔ یہ تو امام زین العابدین کی بات
 ہوئی۔ اب تفصیل میں جائیں تو بڑی دیر ہو جائے گی۔ اس کے بعد آپ کے گھر بیٹیاں ہوئیں
 اس کے بعد حسب درجہ جیسا پیدا ہوا جسے آپ علی اکبر کہتے ہیں تو یہ بطن جناب سیدہ لیلیٰ سے
 پیدا ہوا۔ جناب علی اکبر جو لیلیٰ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ یہ بناؤ علی اکبر کا یزید

سے کیا رشتہ تھا۔ بولو۔ ایلی تھی نا پھر بھی زاد بہن۔ علی اکبر کی ہوتے۔ یاد رکھنا اس بات کو۔ علی اکبر کی ہوتے یزید کے۔ ہیں؟ بھانجے۔ سمجھ رہے ہو نا صاحبان۔ اور دوسرا کچھ ایلی کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی۔ جس کا نام ہے فاطمہ صغرا۔ ہیں۔ فاطمہ صغرا کیا ہوئیں یزید کی۔؟ بولو نا عصبی؟ بھانجی۔ یاد رکھو گے اس بات کو۔ اس بات کو تم نے یاد رکھا تو ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنا۔ جب حسین جانے لگے کہ بلا تو آپ نے حکم دیا فاطمہ صغرا ہمارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ اسے ہم ساتھ نہیں لے جائیں گے۔ پوچھا بیٹیوں نے کیوں؟ کہ یہ یزید کی بھانجی ہوتی ہیں۔ اگر بقیہ ہو کے دربار یزید میں گئی اور یزید نے بھانجی کے رشتے کی وجہ سے اسے قیدیوں سے جدا کر دیا۔ محل میں بھجھ گیا۔ نیک نیتی سے بھانجی سمجھ کے۔ بھجھ یا محل میں۔ قیامت تک ہمارے دشمن ہمارے شیعوں کو یہ طعنہ دیا کریں گے۔ اس لئے اس لڑکی کو لے جانا مصلحت کے خلاف ہے۔ اسے ہم نہیں لے جائیں گے اب سمجھے آپ فاطمہ صغرا کو کیوں چھوڑا تھا۔ ورنہ بیماری حسین کے لئے کیا شے ہے۔ اب آپ ذہن میں آگئی بات۔ جب شہزادہ علی اکبر پیدا ہوئے۔ دوسرے فرزند تو حسب عادت حسین نے اس بیٹے کو بھی لے جا کر مسجد میں لٹا دیا۔ وہی دور رکعت نماز پڑھی۔ وہی دعا کی خداوند اتو نے یہ نعمت مجھے دی تھی۔ میں تیرے سپرد کرتا ہوں۔ اس وقت امیر المؤمنین توڑتے نہیں۔ حسین تو مسجد میں لٹا کے چلے آئے۔ اور برقعہ پہن کر زینب گئیں۔ مسجد میں۔ اور جا کے مسجد میں دو رکعت نماز پڑھی اور بچے کو اٹھایا۔ خداوند اسے میں ناکھن ہوں علی اکبر زینب لے آئیں مانگ کے۔ اچھا تم جانو اور تمہارا بچہ جانے۔ جناب علی اکبر، زینب کی گود میں پلے۔ زینب کی گود میں پرورش پائی، زینب کے پاس ہے۔ سیاں تک کہ جس طرح امام زین العابدین، علی ابن حسین کہلاتے ہیں۔ علی اکبر، علی ابن زینب مشہور ہو گئے۔ زینب کا بیٹا علی اکبر۔ زینب کے بیٹے مشہور ہو گئے۔ اٹھتا زینب کے ساتھ کھاتا پیتا زینب کے ساتھ۔ گود میں زینب کی۔ اگر کوئی شے مانگنی تو زینب سے۔ کوئی

مندگرنی ہو جناب زینب سے۔ بالکل سو فیصد اس شہزادہ کا تعلق جناب زینب سے تھا۔ میری بات سن رہے ہیں صاحبان۔ اللہ تمہیں سلامت رکھے۔ اہم حسین اکثر زینب سے کہا کرتے تھے بہن میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارا بیٹا مجھ سے بھی کوئی شے مانگے۔ زینب جناب میں کہتیں۔ میرا بیٹا غیرت دار ہے۔ وہ کیوں مانگے۔ میں موجود ہوں۔ کبھی علی اکبر نے حسین سے کوئی سوال نہ کیا۔ حسین کے دل میں یہ تمنا تھی کہ یہ مجھ سے کچھ مانگے۔ مجھ سے کوئی سوال کرے۔ مگر سب مانگتے زینب سے۔ جو سوال کرتا زینب سے۔ جو عرض کرتا زینب سے۔ ان کا نام ہی قبیلہ دنیا میں علی ابن زینب مشہور تھا۔ کون ہیں علی اکبر۔ زینب کے بیٹے ہیں۔ حسین کے بیٹے نہیں کہلاتے تھے۔ علی ابن زینب کہلاتے تھے، باہر جانے لگتے تھے نا گھر سے تو زینب بازو پکڑ کے دھمکیں کرتی تھی، میرے بچے کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ مشہور عربی کا محاورہ ہے۔ علی اکبر سے زینب کہا کرتی تھی کہ بیٹا اس طرح نہ چلا کر، یہ بالکل علی کی چال ہے، ادھر ادھر چلا کر۔ اس طرح پابندی تھیں۔ سترسواں سال تھا کہ مدینے سے روانہ ہو گئے۔ چلے۔ سنوئے۔ اور آپ سنیں گے تو حیران ہوں گے۔ حیران کیا اس خاندان کی ساری باتیں ایسی ہیں۔ جب آل محمد، خواتین، مدینے میں سوار ہونے اپنی سواریوں پر تو اس وقت عصر کا وقت تھا۔ ۲۸ ربیع ثانی۔ سنوئے مسلمانو۔ ایک ایک ناقہ آتا تھا دروازے پر۔ اور آواز آتی تھی "مادرہ قاسم کی سواری حاضر ہے"۔ اور مادرہ قاسم آتی تھیں۔ قاسم سلام کر کے انہیں سوار کراتے تھے۔ پھر آواز آتی تھی فداں خاتون۔ فداں خاتون، اور اس خاتون کے متعلقین سوار کراتے۔ سب سے آخر میں کاہے پردوں والی محل دروازے پر آئی، ناقہ بٹھایا گیا۔ اس وقت سید الشہداء مسجد میں بیٹھے تھے۔ اصحاب رسول سے گفتگو فرما رہے تھے۔ آپ نے پاس بیٹھنے والوں سے فرمایا۔ بھائیو فدا مجھے اجازت دو میں خود کھڑے ہو کر زینب کو سوار کراؤں گا۔ امام خود تشریف لائے اور قمر بنی ہاشم نے آواز دی۔ غلے والو، اب زینب سوار ہو رہی ہے۔ اور دیکھو کوئی شخص

سواری پر چڑھ کر زمین سے نہ گذرنے پائے۔ کوئی آدمی چھت پر نہ چڑھے پائے۔ محفل میں شور نہ ہو۔ خبردار جو کسی نے کوئی ایسی بات کی۔ اس طرح ایک ایک خاتون سوار ہر رہنمائی ام خود آئے بہن کو سوار کرانے۔ جب آپ آئے ہیں سوار کرانے بہن کو ایک بازو زینت کا حسین نے ایک بازو علی اکبر نے ہاتھ میں لیا۔ اس طرح دروازے تک آئیں۔ اور جب دروازے پر پہنچی ہیں اس طرح تو یہ پہلا موقع ہے کہ زینت نے اپنی زندگی میں علی اکبر سے کہا کہ بیٹا میرا بازو چھوڑ دو۔ علی اکبر نے چھوڑ دیا۔ پھر حسین سے کہا آپ بھی چھوڑ دو۔ انہوں نے بھی چھوڑ دیا۔ بہن کیا بات ہے؟ کہ بس میری منشا یہی ہے مجھے سوار کرانے کے لئے زین العابدین کو بھیجو۔ اور حضور نام زین العابدین آگئے۔ کہا بیٹا تم مجھے خود سوار کرو۔ میرا تمہارا ساتھ ہے۔ سوار ہو گئے روانگی ہو گئی۔ اور سید الشہداء نے حکم دیا کہ میرے باپ کے گھوڑوں میں سے جو سب سے شریف ترین گھوڑا مودودہ زین العابدین کی سواروں کے لئے مخصوص کیا جائے۔ فاعی طور پر زمین بنایا گیا تھا۔ امام زین العابدین کے لئے۔ نہایت نرم و نازک تھا۔ تاکہ سوار ہو کر کوئی تکلیف نہ ہو۔ گھوڑے کو خاص طور پر سکھایا گیا تھا کہ وہ اشارے کے مطابق چلے۔ لوگوں نے عرض کیا قبلہ۔ آپ اور بیٹوں کی پرداہ نہیں کرتے زین العابدین کی بڑی پرداہ کرتے ہیں۔ امام نے جواب میں فرمایا کہ معافی بات یہ ہے کہ اس کے ان ایران کی شہزادی تھیں۔ اس کے بدن میں شاہی خون ہے۔ اس کا مزاج شہنشاہی ہے۔ یہ کوئی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کا شاہی مزاج ہے۔ شاہی مزاج تکلیف برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے میں نے یہ انتظام کیا ہے کہ شاہی مزاج کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ اور بات آگئی زبان پر۔ وہ بھی کہتا چلنا۔ جب زبان پر بات آئی ہے تو تمہیں سنا دوں۔ گھر میں یہ حکم تھا۔ اب سننا بڑے غور سے۔ گھر میں یہ حکم تھا مستورات سے سید الشہداء امام حسین کا کہ دیکھو بیویو۔ دیکھو میری بہنو۔ گھر کے اندر جب زین العابدین بیٹھے ہوں تو گھر کے اندر۔

بیٹے کا شاہی مزاج ہے یہ برداشت نہ کر سکے گا۔ اس کا شاہی مزاج اس چیز کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اور اس شخص میں میری جتنے نوجوان بلیٹھے ہیں۔ ہمارے خون میں اب وہ ولولہ نہیں رہا۔ ہمارے خون میں اب وہ حرارت نہیں رہی ہے۔ نوجوانوں سے معافی مانگ کر۔ ان کے خون میں گرمی ہوتی ہے نوجوانوں کے۔ ان سے میں معافی چاہ کر یہ بات سننا چاہتا ہوں۔ نوجوانو! ذرا غور سے سننا میری بات کو۔ تمہارے خون میں گرمی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں بھی نوجوان تھا۔ آج سے اکیس سال پہلے کی بات ہے اور میں کون گیا تھا۔ دل میں نے یہ واقعہ پڑھا جو ابھی تمہیں سناتا ہوں تو نوجوانوں نے چاقو مار لئے تھے۔ پھر میں نے پڑھا چھوڑ دیا اس واقعہ کو۔ اب میں اسے نرم کر کے پڑھا ہوں۔ نوجوانوں سے ڈر کے۔ امام زین العابدینؑ کا واقعہ تمہیں سناتا ہوں۔ امام زین العابدینؑ روانہ ہوئے مدینے سے تو بالکل ۱۲ سال کے تندرست جوان شہزادہ۔ امام نے چہرے پر نقاب ڈلوادی۔ اور کسی کے نہیں۔ لوگوں نے کہا قبلہ ان کے چہرے پر نقاب کیوں ڈلوادی۔ فرمایا یہ شہزادہ ہے۔ اس کے ہاتھ میں شاہی خون ہے اور شاہی خون بازاروں میں بے نقاب نہیں چل سکتا۔ میں کس طرح تمہیں وہ منظر سنائیں۔ باپ کے ساتھ ساتھ گھوڑے پر زین العابدین سوار۔ کربلا پہنچے۔ حسینؑ سے وہ سوسے نمبر کا انسان امام زین العابدینؑ۔ چوتھا امام۔ وہی اعزاز تھا جو حسینؑ کے دوسرے نمبر کا ہونا چاہیے۔ توجہ سے نا صاحبان۔ میرے محترم سامعین، نوین تاریخ آئی محترم کی۔ نو کی شام کو امام زین العابدینؑ کو بخار ہوا۔

یہ غشی کب تک رہی؟ دسویں کی شام تک۔ اللہ نے یہ انتظام کیا تھا۔ اس واسطے یہ غشی مسلط کر دی تھی کہ امام کی ہل من ناصیہ کی آواز ان کے کانوں تک نہ پہنچے۔ ورنہ جہاد فیض ہو جاتا اور اہمیت کا سلسلہ ختم ہو جاتا۔ جب بخار ہوا۔ آپ اپنے بستر پر لیٹے ہوئے تھے بخار انتہا کا تھا۔ غشی کا عالم اور ایک سندھی خاتون جو آپ کی ماں کے ساتھ گئیں تھیں،

شہر بانو کے۔ وہ آپ کی دایہ تھیں۔ تیمار دار تھیں۔ اسے امام زین العابدین کی آماں کہتے تھے۔ وہ پاس بیٹھی تھیں۔ جب رات کے نو دس بجے تو آپ نے سنا۔ سید الشہداء نے اپنے خیمے میں اپنے ساتھیوں کو بلا کے ایک کانفرنس کی اور اس میں یہ فرمایا۔ آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہ تم جا سکتے ہو۔ سنا ہے نا آپ نے؟ یہ نہیں کہا تم جاؤ۔ اگر کہتے جاؤ۔ پھر وہ رُک نہ سکتے۔ پھر انہیں جانا پڑتا۔ یہ نہیں کہا، یہ کہا کہ تم جا سکتے ہو۔ تمہاری مرضی۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ ہم نہیں جائیں گے، جو آپ نے سنا ہے۔ تو امام نے فرمایا۔ اچھا تم ایک کام کرو۔ اپنے خیمے اٹھاؤ جہاں جہاں نئے گھرے ہیں۔ اور سید انبیوں کے خیموں کے چاروں طرف لگاؤ۔ سن رہے ہو، تاکہ سادات کے خیموں کی رات میں حفاظت ہو سکے۔ اور یہ بے حیا فوج اگر رات میں حملہ کرنا چاہے تو ان سادات کی حفاظت ہو سکے۔ چنانچہ سب اصحاب کے خیمے اکٹھے کے چاروں طرف لگ گئے۔ میری بات سن رہے ہو نا غور سے۔ انہوں نے اپنے خیموں میں بیٹھ کے قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ منا جاتیں پڑھنا شروع کر دیں۔ مذہب اہلبیت کے قصیدے پڑھنا شروع کر دیئے۔ مرنے کی عید ہو رہی تھی۔ ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے کہ جیسی مبارک ہو۔ کل مرنا ہے۔ رات کے ایک بجے کا وقت اور ان کے خیموں سے آوازیں آرہی تھیں قرآن کی۔ حدیث کی، منا جاتوں کی۔ تم تیار ہونا۔ اب بات جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ جب ان کی آوازیں بلند ہوئیں۔ خیموں میں قرآن پڑھنے کی۔ منا جات پڑھنے کی اس وقت امام زین العابدین کو غشی سے آفاقہ ہوا۔ آپ ذرا بیدار ہوئے۔ بیدار ہو کے پوچھا اپنے تیمار دار سے کہ کس کی آواز میں سن رہا ہوں۔ تو خاتون نے کہا کہ جو ہم سے اصحاب ہیں جو ہمارے جانثار ہیں۔ وہ اپنے خیموں میں قرآن پڑھ رہے ہیں۔ دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ان کی آواز آرہی ہے یہ۔ آپ نے فرمایا اچھا۔ او۔ میرے آبا کہاں ہیں۔ کہ وہ وہاں مٹے پر بیٹھے ہیں۔ کہ تم جاؤ اور میرے آبا کو یہ کہو کہ بیٹے کو غشی سے آفاقہ ہے

اور آپ کو سندھم کتاب ہے۔ اس قانون نے آکے امام کو سلام پہنچایا۔ امام مصلے سے اٹھے
 اور سیدھے بیارکے خیمے میں گئے۔ امام زین العابدینؑ تعظیم کو اٹھے۔ امام نے بچھایا۔ نبض
 دیکھی۔ پدیشانی پہ لاتھہ رکھا۔ بیٹا بخار کا کیا حال ہے؟ طبیعت کیسی ہے؟ بیٹا جلدی
 جلدی اچھے ہو جاؤ۔ بڑا کام کرنا ہے۔ میں مٹھنیں کو یہ بات کہتا ہوں۔ جس کسی کو پریشانی ہو
 یہ دُعا پڑھ لیا کرے۔ چھوٹی سکی دُعا ہے۔ کتابوں میں لکھی ہے۔ وہ دُعا تعلیم کی۔ جب یہ باتیں
 ہو چکیں تو بٹانے پوچھا۔ بیٹا تم نے مجھے کیوں یاد کیا تھا، موت۔ کہ آبا ایک بات عرض کرنی ہے۔
 ماں کہو بیٹا۔ یہ جو ہمارے اصحاب ہیں۔ یہ جو ہماری فرج ہے۔ جو ہمارے سپاہی ہیں۔ جو
 ہمارے مددگار ہیں۔ یہ ہمارے محسن ہیں۔ میں قیامت تک ان کا احسان مند رہوں گا۔ ان کے
 ہم شکر گزار ہیں۔ اور آبا ان کی آخری خدمت جو ہے دفن کی وہ تو تین لڑوں گا۔ اور میں
 آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک کی قبر پہ کھڑا ہوں کہ میں کھڑا ہوں۔ میرے ماں
 باپ تجھ پر قربان ہوں۔ تم ہمارے محسن ہو۔ تم نے ہماری بڑی مدد کی ہے۔ وہ بیٹا ٹھیک
 کہتے ہو یہ ہمارے بڑے محسن ہیں۔ کہ قبیلہ ان تمام باتوں کے باوجود میں جو عرض کرنا چاہتا
 ہوں وہ یہ بات ہے یہ سب کچھ صحیح مگر میں تو نا محرم۔ ان کی آواز ہمارے زمانے خیموں میں
 آتی ہے۔ لیکن بے ہماری عزتوں کی آواز وہاں جا رہی ہو۔ ان کے خیمے ذرا ناصلے پر نہیں
 ہو سکتے۔ یہ کہنا تھا کہ امام بیٹھے تھے۔ اُٹھے۔ سید الشہداء پھر بیٹھے۔ پھر اٹھے۔ پانچ
 چھ مرتبہ کبھی اُٹھے، کبھی بیٹھے۔ گھبرا کے کہتے ہیں بیٹے سے، بیٹا زین العابدین۔ آج کی
 رات تو یونہی رہنے دو۔ کل جو رات آئے گی، تم جانو اور خیمے۔ ایک دفعہ پھر غش آ گیا امام
 زین العابدین کو۔ اس غش سے کہ آنا تہ سوا یہ پھر بتاؤں گا۔ اب آرام سے آرام سے
 سنتے چلیں کہانی کی طرح۔ اور ہرے سوز۔ جہاں معین ہر سال میں حاضر ہوتا ہوں۔ تہہ نہیں
 اٹکتے کہ آنا ہو۔ امن ہے یہ عیب و اعور یاریت ہو۔ میں آپ سے بڑے خلوص سے یہ معافی
 مانگتا ہوں۔ یہ میں آپ کو اپنے گھر کی کہانی سننا رہا ہوں۔ میں شرمندہ ہوتا ہوں، مجددی بن گئی ہے۔

کہانی ایسی ہے میں کیا کروں۔ دل نہیں چاہتا سنانے کو۔ مگر کہانی ایسی ہے۔ بات کو میری سنو گے؟ اہم کی فوج میں جو مردی تھے ان کا نام تھا حجاج ابن سعور۔ جب صبح ہوئی تو وہ اذان کے لئے اٹھے۔ اہم نے فرمایا۔ حجاج بھائی آج تم اذان نہ کہو۔ انہوں نے کہا بہت اچھا۔ اور آپ نے فرمایا علی اکبر بیٹا آج تم اذان نہ کہو۔ شہزادہ علی اکبر نے اذان کہی۔ ادھر کہا اللہ اکبر۔ ادھر لوگوں کے کانوں میں رسول کی آواز گونجی اور تمام خواتین خمیوں سے نکل کر باہر آگئیں۔ اور زینب نے حکم دیا بی بیہ غاموشی سے اذان سنو۔ اس کے بعد یہ آواز نہ سن سکو گی۔ اذان ہوئی۔ نماز ہوئی۔ اور اس کے بعد اہم نے تیاری کی، رخصت ہوئے۔ میدان میں آگئے۔ میں مختصر کرتا جا رہا ہوں اب بات کو۔ چند لمحوں میں تیاری مہنے لگی میدان کی۔ اور سید الشہداء کے کان میں آواز آتی رہی۔ مولانا میں گھر گیا۔ میرے آقا میں گھر گیا۔ اور ہر آواز پہ اہم جاتے رہے۔ جب تقریباً قریب قریب پچاس لاشیں جبین اٹھا چکے تو اس وقت ایک بچ گیا۔ پچاس لاشیں اٹھانے کے بعد۔ حیثین کے صحابیوں میں ایک صحابی تھے مسیب کے مہنے والے۔ سعید نام تھا۔ بڑھے آدمی تھے۔ وہ آئے مولانا کے سامنے اور کہنے لگے قبلہ ظہر کا وقت ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ خراج تھے نمازیوں میں مشور کرے ظہر کا وقت ہے۔ کیا چاہتا ہے تو سعید؟ کہ قبلہ یہ میری آخری نماز ہے۔ میں آپ کے ساتھ جماعت سے پڑھنا چاہتا ہوں۔ چند ساتھی جو باقی رہ گئے تھے بیٹھ کے سب نے تیمم کیا اور آپ نے فرمایا اس فوج سے کہہ دو کہ چند منٹ کے لئے تیر روک دے۔ ہم یہ جماعت کی آخری نماز پڑھ لیں۔ فوج نے تیر روک دے۔ صف بن گئی۔ اور یہ سعید صف میں سے نکلے، جنہوں نے نماز کا کہا تھا۔ کہا مولانا آپ نماز پڑھائیں میں سامنے کھڑا ہوں۔ کہ کہوں؟ کہ میں آپ تک کوئی تیر نہیں آنے دوں گا۔ ادھر سے تیر آتے رہے۔ ادھر سے یہ سعید پسلیوں پر تیر روکتا رہا۔ تمام تیر گھس گئے بدن ہیں۔ ادھر اہم نے سلام پھیرا۔ ادھر یہ گرا گود میں مع ان تیروں کے۔ اور گرا کر پوچھتا ہے ہل و فیت یا بن رسول اللہ۔

رسول کے بیٹے اب مجھ سے راضی ہیں۔ میری نماز ہو گئی ہے قبلہ؟ اور امام جو اب میں فرماتے ہیں انہی اماموں نے فی الجسہ سیدنا میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں۔ جب میں جنت میں جاؤں گا تو میرے آگے آگے چلے گا۔ سید نے فرمائش کی۔ قبلہ اگر میں وہاں آگے چلوں گا تو میری ایک فرمائش ہے۔ کیا؟ کہ یہ تیر میرے بدن سے نہ نکالنا۔ میں ان تیروں سمیت تیرے نانا کے سلام کو جاؤں گا۔ اسی طرح جنت میں جاؤں گا ان تیروں سمیت اور اس کے بعد سید کو دہیں لیٹے ہیں۔ ایک دم کہنے لگے قبلہ یہ کسی نے میرا سراپا بچا گود میں لے لیا ہے۔ امام نے فرمایا سید میرا سلام کہو یہ میرے نانا آگے۔ قبلہ یہ کوئی میرے سینے پہ ہاتھ پھیر رہا ہے کہ میرے بابا حیدر کو لڑا ہیں۔ یہ کوئی میرے ہاتھ دبا رہا ہے۔ کہا یہ میرے بھائی حسن آگے۔ اور ایک دفعہ گھبرا کے سید نے کہا یہ میرے پیروں کے پاس کوئی آگیا۔ امام نے فرمایا سید ذرا پاؤں ہٹا دو میری اماں آگئیں۔ میری اماں ہیں۔ اور میرے معزز سائیں! سید کی شہادت ہو گئی۔ اس واقعہ کو مومناں روم نے اپنی مثنوی میں نظم کیا ہے انہوں نے نماز کی بجائے یہ کام کیا تھا۔ اس بات کو مولانا روم مثنوی میں لکھتے ہیں۔

نماز ظاہری ذکر و سجد است ، نماز عاشقان ترک وجود است

یہ ذکر اور سجدے ، یہ ظاہری نماز ہے ، وہ عاشقوں کی نماز تھی جو تیر کھانکے کرے ،

میں نے جب کہ بلائے معلیٰ میں محرم کیا تھا نا بھائی تو دوسوین محرم کو ہزاروں قافلے نامی آئے تھے۔ ایک دروازے سے آتے تھے تو دوسرے سے نکل جاتے تھے۔ ایک بچے نلہ کے وقت ایک قافلہ آیا۔ سچس میں جواڑوں کا۔ گرتے انہوں نے اتارے ہوئے تھے۔

حسین حسین۔ نام کرتے ہوئے حرم میں داخل ہوئے۔ اور تمام لوگوں نے انہیں راستہ دے دیا۔ وہ آگے صریح کے چاروں طرف کھڑے ہو گئے۔ ایک ہاتھ سے صریح پکڑ لی اور ایک ہاتھ سے نام شروع کر دیا۔ تمام حرم میں کھرام مچا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا یہ کون ہیں؟ تو مجھے بتایا کہ یہ سید ، جنہوں نے نماز پڑھائی تھی۔ یہ اسکی اولاد ہیں۔ یہ ہر سال

ظہر کے وقت آتے ہیں یہاں۔ اب ان کا زجر سنو یہ کیا زجر پڑھ رہے ہیں۔ اور وہ زجر ہیں کہہ رہے تھے۔ حسین ظہر کا وقت ہے اٹھو۔ سعید کی اولاد حاضر ہے۔ اور اسی نماز کے وقت حضرت حبیب بھی شہید ہو گئے۔ اصحاب سب شہید ہو گئے۔ اب باری اولاد کی آگئی۔ اور مولا، آقا کی آواز آئی بند ہو گئی۔ اب صرف اولاد باقی رہ گئی بنی ہاشم کی۔ یہ باقی رہ گئے صرف تو انہوں نے جو ان کے سامنے کھڑے ہوئے تھے مسلم کے بچے عقیل کے بچے۔ حضرت مسلم کے بھائی جناب عباس چاروں بھائی سمیت، جناب میٹر کے دوسرے صاحبزادے، امام حسن کے بیٹے، یعنی اولاد بنی ہاشم۔ یہ سامنے کھڑے ہوئے انہوں نے ایک نظر سب پر ڈال کر اور خود فرمایا "بستی یا بیتیہ" ان سب سے پہلے بیٹا اکبر تم جاؤ میدان میں۔ میں یہ نہیں گوارا کرتا کہ دوسرے بچے شہید ہو جائیں اور میرا بیٹا بچ جائے سب سے پہلے تم جاؤ بیٹیا۔ بس اس حکم کا سزا تھا علی اکبر روانہ ہو گئے۔ ابھی دس بیس قدم گئے ہوں گے کہ انہوں نے آواز دی واپس آؤ۔ علی اکبر واپس آئے۔ حکم؟ کہ جانے سے پہلے خیمہ میں جاؤ۔ ماں کو سلام کرو، چھو بھی سے ملو۔ بہنوں سے رخصت ہو۔ چہرہ۔ علی اکبر نے گھوڑا وہیں چھوڑا۔ اتر کے گھوڑے سے خیمے میں گئے، اور انہوں نے گئے۔ انہوں نے ساتھ گئے۔ سنو جہاں جہاں بیٹھے ہو۔ سب سے پہلے ماں کے پاس گئے لیلی کے۔ اور جا کے سلام کیا۔ اماں سلام۔ جو جو مستورات میری بات سن رہی ہوں عورتیں، وہ بھی سن لیں۔ اور مرد بھی سن لیں کہ لیلی جواب کی رہتی ہے؟ لیلی کہتی ہے سلام کے جواب میں۔ اکبر بیٹا تم ابھی زندہ ہو؟ میں تو منت ماننے بیٹھی ہوں میرا لال کہ تیری میت آئے تو شکر ہے کی نماز پڑھوں۔ سنو علی اکبر بیٹا۔ میرا معاملہ بڑا نازک ہے بیٹا۔ میرا اس کم سخت سے رشتہ ہے یزید سے۔ تجھے پتہ ہے یا نہیں؟ اگر تو کسی سے چھپے رہ گیا ہے کسی اور وجہ سے رہ جائے۔ کہیں دنیا یہ نہ کہہ دے کہ ماں نے روک لیا ہوگا۔ بیٹا تیری ماں کی عزت کا سوال ہے۔ جلدی جا۔ اور بیٹے نے کہا اماں میں جا رہا ہوں۔ تم نکرت کر دو۔

یہ کہہ کے آئے پھر بھی کے پاس۔ باپ نے فرمایا زینب سے بہن زینب، اکبر تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کچھ بات کرنے آئے ہیں۔ آج میں سننا چاہتا ہوں کہ پھر کبھی جھتیجے میں کیا بات ہوتی ہے۔ زینب ذرا سنبھل کر بات کرنا آج۔ علی اکبر گئے۔ اماں سلام زینب نے دعائیں دیں۔ لیٹ گئے۔ گود میں سر رکھ دیا پھر بھی کے۔ اور کچھ کبھی نے پیار سے سر پر ہاتھ پھرنا شروع کر دیا۔ امام دیکھ رہے ہیں کہ بات کیا ہوگی۔ بات کیا کی بیٹے نے اٹاں۔ بیٹا۔ میں نے ساری عمر کبھی کوئی بات پوچھی تو آپ سے۔ کوئی مسئلہ پوچھا تو آپ سے۔ سیکھا تو آپ سے۔ کوئی سوال کیا تو آپ سے۔ آج میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔ اور زینب کہتی ہے ماں بیٹا پوچھو کیا پوچھنا ہے۔ کرو سوال۔ کہ اماں یہ بتلاؤ کہ خدا کی نظروں میں آپ کا مرتبہ زیادہ ہے یا دادی فاطمہ کا۔ اور زینب جواب میں کہتی ہے کہ بیٹا۔ اتنے سمجھ دار ہو کے یہ کیا پوچھ رہے ہو۔ میں تو فاطمہ کی ادنیٰ کینز ہوں۔ میں کجی۔ فاطمہ کجی۔ جب زینب نے یہ کہا تو اٹھ کے بیٹھ گئے، اور بیٹھ کے کہتے ہیں اماں۔ اگر یہ بات ہے کہ دادی فاطمہ کا مرتبہ بہت زیادہ ہے آپ سے تو آج ایک کام تو کرو۔ کیا بیٹا؟ کہ آج فاطمہ کے بیٹے پر اپنے بیٹے کو قربان کر دو۔ اور امام نے فرمایا۔ زینب میں نہ کہتا تھا ذرا سنبھل کے بات کرنا۔ اب بتاؤ کیا جواب دوگی؟ زینب نے سر جھکایا۔ اور دونوں بہن جھائیوں نے گھر سے ہو کر باس پھنایا اور اکبر کو رخصت کیا۔ شیمے سے۔ خود فوج بزیڈ اس بات کی راہی ہے۔ ہم غور سے دیکھو ہے تھے۔ حسین کے شیمے کا پردہ کبھی اٹھتا، کبھی کرتا تھا۔ بڑی دیر تک گئی۔ تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ علی اکبر رخصت ہو کے گھر سے جب باہر نکلنے لگتے ہیں کبھی کوئی بہن آگے دامن پکڑ لیتی ہے۔ کبھی کوئی پھر بھی روک لیتی ہے۔ کبھی چچی روک لیتی ہے۔ جب بڑی دیر ہو گئی تو امام نے منہ پایا۔ بی بیو مسافر کا راستہ نہ روکو۔ اکبر کو جانے دو۔ بی بییاں دم بخود ہو گئیں۔ علی اکبر آخری مرتبہ روانہ ہوئے۔ تو جہاں جہاں سنبھلے۔

صاحبو۔ اب کے جو چلے ہیں آخری مرتبہ تو ایسا منظر بن گیا کہ حسینؑ جیسا صابری بھی آنکھوں پر
 دیوانی رکھ کے باہر آگیا۔ دیکھ نہ سکا اس منظر کو۔ وہ یہ تھا کہ اکبرؑ روانہ ہوئے
 کانوں میں ایک آواز آئی۔ اکبرؑ سمجھتے نہیں ملتا۔ اب جوڑ کے دیکھا تو بیمار بھائی
 چلا آ رہا تھا۔ اور دونوں بھائی ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ اب یہ منظر حسینؑ بھی
 نہ دیکھ سکے۔ باہر آئے۔ اور بس بھائیوں اب میں مختصر کر دوں۔ میں بھی تھک گیا ہوں
 بھائی سے رخصت ہو کے علی اکبرؑ باہر آئے۔ کس کس بات کو کیوں اور کیوں کہہ کر۔ چنانچہ
 نوجوانو تم نے ماتم کرنا ہے اور میرا ذاتی ایمان ہے کہ بیس صفر کی چلم کی مجلس میں چلے وہ
 کہیں بھی ہو دو معصوم ضرور آتے ہیں۔ ایک امام زین العابدینؑ اور ایک جناب
 زینبؑ۔ اور بی بی زینبؑ سے آپ کی سفارش ہے کہ بی بی آج یہ شہ جن جراح
 میں مجلس ہو رہی ہے۔ میں ان سادات کی اجازت سے جنہوں نے یہ مجلس کی ہے۔ یہ
 اعلان کرتا ہوں کہ تم تیرے علی اکبرؑ کا چلم کر رہے ہیں تاکہ بخاری یہ جس ابتری مجلس
 ہو جائے۔ باہر نکلے اور امام نے خود گھوڑے کی رکا۔ پکڑ کے سوار کر لیا۔ سوار
 ہوئے۔ چلے۔ پیچھے پیچھے حسینؑ اور آگے آگے اکبرؑ۔ جب دس بیس قدم چلے۔ گھوڑا
 رکا۔ بابا میں نہ جاؤں؟ آپ کیوں آ رہے ہیں۔ حسینؑ نے بس ایک جواب دیا۔
 علی اکبرؑ بیٹا، تم میں میرے دل کا اندازہ نہیں۔ تمہارے کوئی جوان بیٹا جا نہیں۔
 حسینؑ بلیٹھ گئے۔ اکبرؑ چلے گئے۔ اب میں اپنی وہ مختصر گفتگو کر دوں۔ اکبرؑ
 میدان میں، حسینؑ ریت کے ٹیلے پر۔ زینبؑ دروازے میں۔ ابلی متعلیٰ پر۔ علی
 کی نظر زینبؑ پر۔ زینبؑ کی نظر حسینؑ پر، حسینؑ کی نظر اکبرؑ پر۔ اکبرؑ کی نظر جن
 پر۔ سن رہے ہونا میری بات کو؟ اور مختصر (۱۶۶)۔ دس گزے پونجے
 اکبرؑ گھوڑے سے گدے، حسینؑ ٹیلے سے گدے۔ زینبؑ دروازے پر کھڑی۔ علی
 میں کھڑی۔ گھوڑی دیو بعد حسینؑ اٹھے۔ میدان میں آئے۔ جب علی اکبرؑ کو میت

نو دس قدم کے فاصلے پر رہ گئی۔ تو کھڑے ہو کر آواز دی۔ ابراہیم، یہیں جاؤ۔
 یہیں آواز دو۔ ہم تمہاری آواز کے سہارے تم تک پہنچیں گے۔ یہیں بیٹا رستہ نظر نہیں
 آ رہا۔ ہماری آنکھیں کام نہیں کر رہی ہیں۔ اور ابراہیم نے آواز دی "ایسا یا ابراہیم"
 بابا میں یہاں ہوں۔ پیچھے۔ لاش کو دیکھا۔ ابراہیم تو اب بے تھے۔ جوان کا تھکا پٹا جو
 باپ نے دیکھا۔ گھرا گئے۔ میں نے کہنے یہ لفظ تو۔ اب تمہیں میں خدائے سخن ابواکھلام
 انیس کا ایک شعر سنانا ہوں۔ جب بیٹے کو تڑپتے دیکھا تو حسین نے کیا کہا۔ اس کو انیس
 نے نظم کیا ہے۔ تڑپتے دیکھ کر علی ابراہیم کو حسین کی فرماتے ہیں؟ کہ بیٹا
 بے چین ہر دم دل میرا گھبراتا ہے بیٹا

تم بے چین ہو میری دل گھراتا ہے

میرا دل کہ اب صبر میں فرق آتا ہے بیٹا

بیٹھ گئے۔ لاشے کو گود میں لیا۔ ابراہیم آگئے۔ بابا آپ نے بڑی تکلیف فرمائی۔ سنو گے
 جوانو۔ حسین نے ہزاروں دفعہ کہا ہے زندگی میں کہ ابراہیم سے کچھ مانگو۔ میرا دل
 چاہتا ہے کہ تم کچھ مانگو۔ آج پینا موقع سے کہ ابراہیم کہتے ہیں، بابا میں ایک چیز مانگتا
 ہوں۔ حسین کی تمنا ہے ساری عمر کی۔ حسین نے کہا مانگو بیٹا کیا مانگتا ہے۔ پہلی مرتبہ
 مانگا ہے بیٹے نے۔ کیا؟ بابا ایک شے چاہیے۔ کیا میرے لالہ؟ ایک گھونٹ پانی کا۔
 مانگا بھی تو کیا مانگا۔ حسین نے آسمان کو دیکھا اور کہا بیٹا یہ تو ممکن نہیں۔ اور کوئی شے
 مانگو میرے لالہ۔ آبا اور شے یہ مانگتا ہوں کہ مجھے جینے میں سے چلو تاکہ میں بچا امان
 سے جا سکے بات کر سکوں۔ ہاں یہ بات، ہم کریں گے۔ تو اب میں ختم کر رہا ہوں گفتگو۔
 توجہ سے سنا جوانو۔ تم نے آج جوانوں کا ماتم کرنا ہے یہاں۔ اہم نے لاش اٹھائی۔
 ہمتہ کانپے۔ لاش گرنے لگی۔ لٹائی، دوبارہ اٹھائی۔ سہ بارہ اٹھائی۔ جب جوان
 کی میت بڑھے باپ سے ڈانٹو سکی، تو باپ نے فرمایا ابراہیم بیٹا یوں کرو۔ دونوں ہاتھ میرے

گلے میں ڈال لو۔ کچھ تم سہارا کرو۔ کچھ میں سہارا دوں۔ ابتر نے ایک ہاتھ باپ کے گلے میں ڈال دیا۔ باپ نے فرمایا، بیٹا دونوں ہاتھ۔ کہ آبا میں بایاں ہاتھ۔ اپنے سینے سے ہٹا نہیں چاہتا۔ مولانے کہا کیا بات ہے؟ میں اپنا سینہ آپ کو دکھانا نہیں چاہتا آیا۔ نہیں میرے دل دکھاؤ کیا بات ہے؟ امام نے حکم دیا۔ ابتر نے ہاتھ ہٹایا۔ حسین نے دیکھا۔ کیا دیکھا۔؟ کہ برجھی ٹوٹے کے ذہن نگہ ہوتی ہے۔ ایک پنج باہر نکلی ہوئی ہے۔ حسین نے کہا یہ بات تمہی بیٹا۔ جھراؤ نہیں بیٹا۔ ٹھیا بیٹے کو۔ ایک ہاتھ رکھ بیٹے پر، ایک ہاتھ سے پکڑی برجھی اور بلند آواز سے کہا۔ نانا رسول اللہ، دادا ابراہیم کو ساتھ لے کر کہہ بل میں آؤ، اور آکے دیکھو میری آنکھوں پر پٹی نہیں ہے۔ میرا ہاتھ نہیں کانپ رہا۔ آکے دیکھو تو سہی۔ یہ کہہ کے جو برجھی ہٹی۔ برجھی ملی تو اس میں چھدا ہوا ابتر کا دل ہلا۔ دل ہلا تو سالہ بدن کانپا۔ بدن کانپا تو کہہ کن زمین کانپی۔ کہہ بل کن زمین لڑی تو حسین کے جیسے لوزے۔ خیموں کا ارزنا تھا کہ دروازے سے آواز آئی۔ بہن کو آنے دے۔ دونوں کن کے یہ کام کریں گے۔ اکیل نہ کہ حسین۔ زینب کی آواز حسین نے سنی کہ باہر آنا چاہتی ہے۔ ادھر حسین نے سڑکے ضم دیا کہ حیثیت امام کے حکم دیتا ہوں علی ابتر کے گھوڑے دروازے پہ جا کے زینب کو روک دے۔ امام نے کہا۔ سنتے ہی گھوڑا دروازے پہ پہنچا، تاکہ زینب دروازے پہ رک جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو زینب دروازے سے باہر آجائے۔ اور حسین نے لاش اٹھالی اور لے کے روانہ ہوئے۔ بس بھی یوں میری گفتگو کا افسانہ تھا۔ یہاں بات میں نے ختم کر دی۔ نوجوانوں تم نے ماتم کرنا ہے توج۔ کرنا ہے نا؟ بلو بھئی۔ ایک دفعہ میرے سامنے تو بیٹے پہ ہاتھ مار کے کہو حسین۔

انسان اور انسانیت

میں آج گفتگو میاں سے شروع کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کسی خاص مقصد کے لئے خلق فرمایا ہے اور سب سے بڑا مقصد یہ ہے اور سب سے بڑی بات اللہ ہم سے چاہتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اُس نے ہمیں انسان پیدا کیلئے — تو ہم میں انسانیت ہو۔ جسے اُس نے انسان بنایا ہے۔ وہ کوئی نہیں انسان بن کے رہے۔ فرشتہ بنانا ہمارا یہ بھی اُس کا مقصد نہیں اور ہمارا حیوان بن جانا یہ بھی اُس کی مشیت کے خلاف ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان — انسان ہی بن کر دُنیا میں رہے سمجھے نا۔! حضور — میرے محترم سامعین میں آسان ترین الفاظ میں آپ سے کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ہمارے لئے حیوان بننا انتہائی آسان ہے۔ فرشتہ بننا انتہائی آسان ہے۔ اگر کوئی ذات مشکل ترین ہے ہمارے لئے تو وہ انسان بننا ہے۔ مثلاً خدا نخواستہ اگر ہم ابھی حیوان بننا چاہیں — تو یہ مشکل بات نہیں۔ انسان کو بھی بھوک لگتی ہے۔ اور حیوان کو بھی بھوک لگتی ہے۔ اس بھوک کے معاملے میں ہم مشترک ہوتے یا نہیں۔ اب فرق کیا ہے۔ کہ حیوان کو بھوک لگی۔ وہ گھر سے چلا بھوک میں۔ اس کے سامنے جو آیا وہ کھا گیا۔ اُس نے یہ نہیں سوچا ”اپنا ہے یا پرانا۔ جائز ہے یا ناجائز۔ مناسب ہے یا نامناسب۔“ اس نے کھا یا یہی اُس کا مقصد ہے۔ بغیر کسی سے پوچھے۔ اور اگر میں بھی اسی طرح اپنی بھوک کا انتظام کر لوں اور کھا جاؤں اور نہ سوچوں کہ جائز ہے یا ناجائز۔

مناسب ہے یا نامناسب۔ آپ نے چارہ منگایا تھا۔ اپنے جانور کے لئے کھا گیا ہمسائے کا جانور۔ آپ نے اُس کے چار ڈنڈے مارے۔ دیکھنے والے اس کے حمایتی ہو گئے۔ ارے بھائی جانے بھی دو حیوان ہے بچارہ۔ سارا چارہ کھا گیا۔ پھر بھی اس کے حمایتی۔ سارا کھیت کھا گیا پھر بھی اُس کے حمایتی۔ ہمارا پورا باغ ہضم کر گیا پھر بھی اُس کے حمایتی۔ توجیدان بنا بڑا ہی آسان ہے۔ فرشتہ بنا بڑا ہی آسان ہے۔ آپ نے بازاروں میں نوکری، ولی اللہ، دیکھے ہوں گے۔ ہر کوئی کہہ رہا ہے کہ فرشتہ نظر آ رہا ہے۔ ولی نظر آ رہا ہے۔ یہ انسان بھی کتنا عجب ہے کہ اگر مانے پہ آجائے تو "بازاری" کو ولی۔ مان لے نہ مانے پہ آڑ جائے تو عیسیٰ کو ولی نہ مانے۔ نہ اللہ انسان کا حیوان بنا پسند کرتا ہے نہ فرشتہ بنا پسند کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ اے انسان۔ انسان بن۔ آرام سے رہ۔ اچھا لباس پہنو۔ اچھی خوراک کھاؤ۔ نوشہو رگازو۔ نماز پڑھو۔ اور امن سے زندگی بسر کرو۔ یہ چاہتا ہے اللہ آپ سے۔ یہ نہیں کہ ساری رات بند آواز سے چیختا ہے۔ نیند آتی نہیں۔ بریکاری کا مشغلہ ہے۔ بلند آواز سے چتہ لٹے جا رہا ہے کہ "میرے مولا بلا کو مدینے مجھے۔ اب مولا کو کیا فرض پڑی ہے بولنے کی۔ اب مولا کے پاس بھی جانا ہے تو مولا ہی کو کہا جا رہا ہے کہ خود ہی بلا لے۔ خود جاؤ۔ ہمسائیوں کو تنگ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم خود جانے کی تیاری کرو۔ خود ارادہ کرو۔ تو بلا لے صبح کی نماز تم میں پڑھو۔ ظہر کی نماز مشہد میں پڑھو۔ عصر کی نماز کاغین میں پڑھو۔ مغرب کی نماز کربلا میں پڑھو۔ عشاء کی نماز نجف میں پڑھو۔ پھر اُسے بلانے کا سزا بھی آئے۔ حلال کھاؤ۔ حلال کھاؤ۔ آرام سے رہو۔ مگر یہ عادت انسان میں پیدا ہو گئی ہے۔ حضرت نوح کے طوفان کے بعد۔ دو لفظوں میں بیان کرتا ہوں۔

— ہے تو لمبی چوڑی — تاریخ کی بات — یہ ہے کہ حضرت نوحؑ کے طوفان کے بعد — اُن کے بیٹوں کی نسل دُنیا میں پھیل گئی — اُن کے بڑے بیٹے کا نام تھا — سام — دوسرے بیٹے کا نام تھا — یافث — ایک سام دوسرے یافث اور تیسرے تھے — حام — سام — حام — یافث — سام چونکہ بڑے بیٹے تھے لہذا سام کے بیٹے نے حکومت سنبھالی — یافث اور حام کی اولاد اس کی رعایا ہو گئی — صرف اس لئے سام کی اولاد نے حکومت سنبھالی کہ وہ بڑے بیٹے کی اولاد تھے — چونکہ سوچا اس برس اسی طرح گزر گئے تو یافث اور حام کی اولاد یہ سمجھ بیٹھی کہ ہم دُنیا میں پیدا ہی اس لئے ہوئے ہیں کہ رعایا بن کے رہیں — اور سام کی اولاد یہ سمجھ بیٹھی کہ ہم دُنیا میں پیدا ہی اسی لئے ہوئے ہیں کہ حکومت کریں — تو ہر وہ حکومت جو بجز کسی دلیل کے محض بڑے پن کے دوسرے پر قابض ہو جائے تو وہ آج بھی سامراج کہلاتی ہے تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ انسان کو دُنیا میں انسان ہی بن کر رہنا چاہیے — یہ اللہ کا احسان ہے کہ اُس نے ہمیں انسان پیدا کیا ہے لہذا انسان ہی بن کر رہے — آپ حضرات کی خدمت میں ایک نقطہ پیش کرنا ہے اور نقطے کی حیثیت بھی بڑی ہے — اسے پڑھنے کے لئے احتیاط کی ضرورت ہے — ایک نقطے کے بدلنے سے خدا ”جدا“ ہو جاتا ہے — تو عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انتخاب کا ترجمہ بتا ہے چھانٹنا — چھننا نہیں ہے — اور چھنے کے لئے ہے اندھنی — اس کا اصطنعی ہوتا ہے جو چھنا ہوا ہوتا ہے — اور جس کا انتخاب ہوتا ”چھٹا“ ہوا ہوتا ہے — اور اللہ کے چھنے ہوئے میں معاذ اللہ کوئی شبہ ہو سکتا ہی نہیں غلطی کا شائبہ تک نہیں — اگر چھنے ہوئے میں ذرا سی بھی غلطی نکل آئے تو وہ چھنے والے کی بھی غلطی ہے — اور اگر غلطی نکل آئے تو یا اُس میں خرابی ہے یا چھنے والے نے غلط چھنا — ایک بات ہے اگر آپ حضرات کی سمجھ میں آجائے — کہ ایک شخص نے بڑی خوبصورت کوٹھی بنوائی — عظیم الشان — لاکھوں روپیہ خرچ کیا

اس کے بننے میں — اس میں ایک بڑا قیمتی کمرہ بھی بنوایا — جہلا سا نام بڑنا ہے — بتائیں آپ تیرہ نہیں اس کا کیا نام ہے — ڈرائینگ روم — ہاں — یہی ہے — ڈرائینگ روم — ہاں اس کا نام ڈرائینگ روم اس لئے کہ خرب لوگ اس کو دیکھ کر ڈر جاتے ہیں — اسے سجایا گیا — امریکہ سے تحفے منگوائے — ایران سے قالین منگوائے — ہر ملک سے کچھ کچھ منگوا لاکھوں روپے لگائے — شہرت ہو گئی — کوٹھی بنی — ڈرائینگ روم تو سبحان اللہ — اب جو شور مچ گیا نا — عام — ایک نابینہ بھی چلا گیا — جاتے ہی چیزوں سے ٹکراتا گیا — لا حول ولا — ”اب نظر خود کو نہیں آتا“ — اگر آنکھ ہوتی تو جلوہ دیکھتا — خرابی چیز میں نہ تھی دیکھنے میں خرابی تھی — تو صاحبان! آدم سے لے کر خاتم تک کسی میں کوئی عیب ہو سکتا ہی نہیں ان میں غلطی ہو سکتی ہی نہیں — کبھی بھول ان سے ہو سکتی ہی نہیں یہ نامکن ہے — نہ ان میں معاذ اللہ کوئی خرابی ہو سکتی ہے — نبی ہر شے کا علم رکھتا ہے — یہ خاق کا تخلیقی کمال ہیں اور اس کے کمال میں نقص بتانا یہ اپنی بے ہنری بتانا ہے — یہ جہالت کی دلیل ہے — سارے انبیاء کا بادشاہ بنی تھا ہمارا بنی — اب کئی صاحبان بتاتے ہیں کہ جب پہلی وحی آئی اس کے پاس جبرائیل نے آکر وحی سنائی — تو وہ ڈر گیا — جبرائیل کو پہلی دفعہ دیکھا تھا ڈر گیا — ڈرے ہوئے گھرائے اگر بیوی سے کہا — ام المؤمنین کو بتایا — کہ مجھے آج یہ واقعہ پیش آیا — وہ بیچاری اسے اپنے بھائی کے گھر لے گئی — اور ان کے بھائی کا نام تھا ”ورقہ“ اس ”ورقہ“ نے سارا قصہ سنا اور کہا کہ ”واقعی سچ مچ ہے“ کہا کہ ”ہاں“ کہ پھر تو تم بنی ہو گئے ہو — اچھا تو یہ بات ہے — کہ — ہاں — اب ایک فرقہ کہتا ہوں صاحبان ذوق کے لئے کہ — اب تالیف کو کہتے ہیں — اب ام الکتاب — اس بنی کو سمجھائے گا کون — ایک ورقہ — اسے سمجھا رہا ہے ایک ورقہ — اس کا علم کجا — اس کا علم کجا — اس

کی تعلیم کجا۔ اُس کی عقل کجا۔ جس درجے پر وہ فائز ہوتے ہیں وہاں تک ہماری عقل کی رسائی نہیں ہمارا فہم ان تک پہنچ نہیں سکتا۔ وہ انسان بنانے کے لئے آتے ہیں ہم بننے کے لئے آئے ہیں۔ انسان کو انسان بنانے کے ان کے پاس مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ وہ انسان کو انسان بناتے ہیں پاس ہٹھا کے۔ محبت کر کے۔ پیار کر کے۔ سمجھا کے۔ کہیں دور لے جا کے۔ جتنے ذرائع ہو سکتے ہیں سمجھانے کے وہ استعمال کرتے ہیں۔ دیکھو اگر تم انسان بننا چاہتے ہو تو اس طرح کر دو۔ کہ مجھے نام کام کرتے ہوئے دیکھتے چلو۔ میں جس طرح نماز پڑھتا ہوں مجھے دیکھ کر ویسی ہی پڑھو۔ اب جو دیکھا ہے۔ اس میں سب کچھ آتا ہے نماز پڑھنا کس طرح۔ کھڑا کس طرح ہوتا ہے۔ رکوع کس طرح کرتا ہے۔ سجدہ کس طرح کرتا ہے۔

دیکھو۔ کس کو۔ رسول کو۔ دن میں پانچ دفعہ دیکھا۔ اب اندازہ لگا لو کہ زندگی میں کتنی ہزار دفعہ دیکھا ہوگا۔ کتنی ہزار دفعہ دیکھی ہوئی لاکھوں صحابیوں کی نماز۔ آج تک وہ نماز متنازعہ ہے کہ کس طرح پڑھی جائے۔ کوئی ہاتھ باندھ کے پڑھتا ہے۔ کوئی ہاتھ کھول کے پڑھتا ہے۔ اس نماز کو جس کو ہزاروں مرتبہ صحابہ نے دیکھا اس کا پتہ نہیں ہے کہ ہاتھ کھول کر پڑھنی ہے یا باندھ کر پڑھنی ہے۔ اگر رسول نے ہاتھ باندھ کر پڑھی تھی تو کھولنا غلط اور اگر ہاتھ کھول کر پڑھی تھی تو ہاتھ باندھنا غلط۔ اور یہ فیصلہ نہیں کر سکے مسلمان۔ ہاتھ باندھنے والے کو ہاتھ کھولنے والے کہہ رہے ہیں اور ہاتھ کھولنے والے کو ہاتھ باندھنے والے غلط کہہ رہے ہیں۔ دونوں نمازی ایک دوسرے ہی کو بُرا کہہ رہے ہیں۔ اور جو نہ باندھتے ہیں نہ کھولتے ہیں۔ انہیں کوئی پوچھنے والا ہے ہی نہیں۔ جو ہزاروں مرتبہ دیکھی ہوئی نماز کا مسلمان فیصلہ نہ کر سکے۔ کہ ہاتھ کھول کر پڑھی تھی یا کہ ہاتھ

کھول کر پڑھی تھی۔ اب بتائیں ایمان سے۔ کہ جس قوم کو اپنے رسول کے لاکھوں دفعہ دیکھے ہوئے ہاتھ یاد نہیں رہے اُس قوم کو اگر ایک دفعہ کے اٹھائے ہوئے ہاتھ یاد نہ رہیں تو کون سی بڑی بات ہے۔ تو اللہ نے ہمارے لئے رسول اس لئے بھیجے کہ اے رسول! انہیں انسان بناؤ۔ انہیں نماز روزہ سکھاؤ۔ انہیں جینے کا طریقہ سکھاؤ انہیں بسنے کا سلیقہ سکھاؤ بھائی بھائی کے تعلق بتاؤ رشتہ داروں کے حقوق بتاؤ یہاں تک کہ سوا لاکھ تک انبیاء بھیجے۔ صرف سمجھانے کے لئے۔ ایک لاکھ چیس ہزار تک تو کتابوں میں تعداد ملتی ہے۔ یا اللہ جب انبیاء کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد جو ہم پیدا ہوئے۔ ہمارا کیا قصور ہے۔ پہلے لوگوں میں تو سمجھانے والے نبی موجود تھے اور ہم نے کون سا قصور کیا۔ اب کیا بنے گا۔ اللہ کہتا ہے کہ میں نے نبوت ختم کی ہے ہدایت تو ختم نہیں کی۔ نبوت الگ بات ہے ہدایت الگ بات ہے۔ قبلہ ہدایت کیسے قائم ہے؟ اب اس بات کی وضاحت کرتا ہوں یہ اپنی بات ہے۔ یہ ہمارے یو۔ پی کی بات ہے۔ یہ ہمارے بائبل طریقہ ہے۔ کہ ہمارے بائبل ایک درخت ہوتا ہے "آم" اس کثرت سے کہ "عام" بس عام۔ "آم" عام۔ "عام" عام۔ "عام" اور ہم یو۔ پی والوں کو اتنا پیار تھا۔ "آم" سے کہ یہ جی نہیں چاہتا تھا کہ یہ پھیل ہمارے ملک سے باہر نکلے۔ اسے اپنے علاقے میں محدود رکھنے کے لئے ہم نے اس کی ٹانگیں توڑ کے اُسے ننگڑا کر دیا۔ مگر اُسے ننگڑا بنادینے کے باوجود وہ لاہور میں پک رہا ہے۔ کراچی میں پک رہا ہے۔ نامراد تو یہاں کیسے گیا۔ تجھے تو "دو بان" کے لئے چھوڑ آئے تھے۔ تو صاحبانِ ذوق۔ جس کا دل "گھر" میں نہ لگے اُسے کون روکے۔ یہ "آم" کی بات تھی۔ بالکل مختصر کرتا ہوں حضور والا!۔ خیر۔ "آم" ہوا کرتے تھے ہمارے علاقے میں۔ بعض بڑے اچھے بڑے میٹھے ہوتے تھے اور بعض ذرا ترش۔ حلال کہ ہوتے ایک ہی

”باغ“ کے تھے۔ بعض میں تو مٹھاس بہت زیادہ تھی اور کئی بڑے نرش۔ حالانکہ وہ
”میٹھے“ ام کے دائیں بائیں اکثر ہوا کرتے تھے مگر تاخیر وہ نہ تھی۔ ذرا غور سے سنا
اور کوئی بات یاد نہ رہے گی تو یہ ام کی بات یاد رہے گی۔ خدا تمہیں سلامت رکھے
— اب ام میں ہر سال میوہ آتا تھا۔ کئی سال گزر گئے۔ سالہا سال بیت
گئے۔ اب کیا ہو گیا۔ اب ”فصل“ نہیں ہوگی۔ اس کی دلیل کیا ہے۔ کہ یہ
”بلافصل“ ہے۔ جب ”فصل“ ختم ہوئی تو اب ہو گیا۔ ”بلافصل“ پریشان ہو گئے
کہ اتنا قیمتی پھلدار درخت۔ فصل آتی نہیں۔ اسے کیسے باقی رکھا جائے۔
تو مالی نے جاننے والے نے کہا۔ کہ اس کا طریقہ میں بتاتا ہوں۔ اسے ”بلافصل“
ہو جانے دو اسے ختم ہو جانے دو۔ ایک ام کا پودا۔ اس کی جنس کا پودا۔
ام ہی کا پودا۔ اُسے گھر میں اگاؤ۔ اور جب تمہارے گھر میں اگا ہوا پودا ذرا سیانا
ہو جائے نا! تو اُسے ختم ہونے والے درخت کے نیچے رکھ دو۔ اور اُس جیسی آب و
ہوا ہی میں اُسے رہنے دو اور اس ختم ہونے والے کی ایک شاخ اس پودے ساتھ پیوند
کر دو۔ اور اگر پیوند ہو جائے پکا تو شاخ کو کاٹ دو۔ کہ پودا اس قلم کو
لے کر پھر اپنے گھر چلا جائے۔ نیا درخت تیار ہو جائے۔ باغ عالم میں شجرِ نبوت
نے ایک لاکھ چوبیس ہزار بہاریں دیکھیں۔ اور نبوت کا شجر جب بلا فصل جو ہوا۔
تو اللہ نے اُسی جنس کا۔ جس جنس کی نبوت تھی۔ ایک پودا اپنے گھر اگایا۔
پودا اتنا زور دار تھا کہ گلے میں شکاف آگیا۔ اب جو اللہ کے گھر میں اگا ہوا نبوت کا
پودا۔ اُسی جنس کا۔ اب جو ذرا پر پرزے نکلے۔ تو اُسے ختم ہونے والے
شجرِ نبوت کی آغوش میں دے دیا۔ اب وہاں بھی ویسی ہی مل سکے اور ذرا سنبھل جائے
— اب اس آب ہوا میں جب ذرا شاداب ہوا۔ تو اُس ختم ہونے والے شجرِ نبوت
کی ایک ہری مہری شاخ۔ کا پیوند لگ گیا۔ اور یہ پودا اس شاخ کو لے کر اپنے

گھر آگیا۔ وہ منتہم ہونے والا تھا قیامت تک کے لئے "قائم" ہو گیا۔ میرے معزم
 سامعین!۔ اب ادھر ایک نیا درخت تیار ہو گیا۔ ختم ہونے والے درخت کا
 نام آپ نبوت رکھ دیں۔ قائم رہنے والے کا نام "امامت" رکھ دیں۔ جنس
 دونوں کی ایک ہے۔ معصوم کی معصوم سے ہوئی قلم بندی جناب والا! اب نئی
 شے تیار ہو گئی۔ نبوت کے پلنے کا انداز اور تھا۔ امامت کے پلنے کا انداز
 اور تھا۔ اب جو درخت بنا ہے۔ نبوت و امامت کے اتصال سے۔
 اس کے جو ثمر ہوں گے ان میں نبوت کا اثر بھی ہو گا امامت کا اثر بھی ہو گا۔ اسے میں
 مختصر کرتا ہوں حضور والا!۔ اس نئے درخت پر ثمر آنا شروع ہو گئے۔ بالکل مختصر
 کر دیا ہے میں نے اپنی بات کو۔ ثمر آنے شروع ہو گئے اس درخت پر۔ میرے سامعین!
 اس نئے شجر پر پہلا ثمر جو آیا ہے۔ وہ تو ہر ای پک گیا۔ وہ ہر ای پک گیا۔
 اور دوسرا ثمر جو آیا وہ سرن ہو گیا۔ اور باغیوں میں بٹ گیا۔ جب دوسرا پکے
 ایک سن اور ایک حسین۔ کائنات کئی دفعہ ختم ہو۔ اور پھر بنے۔ مگر کسی
 ماں باپ کے حسن حسین جیسے بیٹے نہ ہوں گے۔ علی کی لاکھ فضیلتیں سہی۔
 سیدہ کے لاکھ شرف سہی۔ مگر جب یہ کہا جاتا ہے۔ حسین کا ابا۔ حسین کی
 اماں۔ ان کی شان ہی اور جو جاتی ہے۔ کہاں کسی کی ایسی اولاد۔ کہاں
 کسی کے ایسے بیٹے۔ کسے نصیب میں ملے۔ اب اس شجر میں جو ثمر آیا حسن
 اور حسین کے بعد۔ اُس کی شان ہی اور تھی۔ اور علی نے اس ثمر کو سفید رومال میں
 لپیٹا۔ لپیٹ کے رسول کے سامنے لے آئے۔ قبلہ حضور نے یہ "نعت"
 فرمائی ہے۔ رسول نے علی کو دیکھا۔ باپ کو دیکھا پھر بیٹے کو دیکھا۔ اور فرماتے
 ہیں کہ یہ تو اپنے باپ کی زینت ہے۔ علی کو بڑا پیار ہے۔ بے انتہا پیار ہے
 اس نعمت سے۔ جس کا نام زینب ہے۔ جب بھی باہر سے گھر میں آتے

تھے۔ پہلی بات پوچھتے تھے میری زینب بیٹی کہاں ہے۔ باپ کے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھاتی۔ باپ کی گود میں کھیلتی۔ سیدہ فرمایا کرتیں۔ یا علی ہے تو بیٹی مگر مجھ سے زیادہ آپ سے پیار کرتی ہے۔ باپ کی گود میں اکثر سو جاتی۔ ہر وقت باپ کا ہی خیال رہتا۔ اور علی سیدہ سے کہتے کہ ناظرہ مجھے اس بیٹے کو اٹھا کے اتنا سکون ملتا ہے میں اتنا مانوس ہوں اس بیٹی سے کہ بیان سے باہر ہے۔ اب حضور۔ پیدل چلنے لگی۔ زینب بیٹی۔ باپ کے ساتھ ٹھہلا کر دو۔ معصوم پیدل چلنے کی عادت ڈالنے لگے تو خاندان کے افراد پر نشان ہو گئے۔ جب چار سال کی تھی کہ ماں کا سایہ سر سے اٹھا ماں نے وصیت کیا کہ تھی بیٹی سے۔ کہ ہے تو زینب۔ بے تو بیٹی۔ یہ حسن اور حسین تیرے بڑے بھائی ہیں۔ اب میں جا رہی ہوں۔ اب یہ ماں کے بورے ہیں ان سے اتنا پیار کرنا کہ انہیں ماں یاد نہ آئے۔ اب بھائیوں نے کیا کیا جب بھی حسن یا حسین گھر میں آتے زینب کو سلام کا موقع نہیں دیا۔ بلکہ پیدل کہدیا گھر میں داخل ہوتے ہی۔ بہن سلام۔ اب میرے معزز سامعین یہ شریف ترین خاندان زمانے کا۔ روانہ ہو رہا ہے مدینے سے۔ روانہ ہوئے مدینے سے۔ اٹھا بیس رجب تھی۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ سادانیوں کی محلیں اور ناقہ دروازے کے ساتھ آ کے بٹھائے جا رہے تھے۔ ایک ناقہ بیٹھا اور خاندان کے نوجوان آواز دیتے۔ مٹھے والو۔ ہوشیار فلاں خاتون سوار ہو رہی ہے۔ وہ خاتون سوار ہو جاتی۔ ناقہ چل جاتا۔ سب کے بعد سیاہ پردے لگے ہوئے ناقہ آیا دروازے پر۔ اور آکر بٹھایا گیا اور قرہنی آشم نے آکر آواز دی۔ مٹھے والو۔ کوئی شخص باہر نہ نکلے۔ کوئی سوار ہو کر نہ گزرے۔ دروازے بند ہوں۔ کوئی پوچھ نہ مچائے۔ اس وقت علی سوار ہوئے۔ اُدھر حسن

میں ہیں رشتہ داروں میں ہیں۔ حسین اٹھے۔ بھائیو اب اجازت دینا۔
 میں خود جا کے ذرا زینب کو سوار کرا دوں۔ امام آئے۔ بہن کو سوار کرایا۔
 ایک بازو حسین کے ہاتھ میں ایک بازو علی اکبر کے ہاتھ میں۔ عون و محمد العلیین
 سنبھالے ہوئے۔ عباس نے محل کا پردہ اٹھایا۔ اب جو محل کے قریب
 آئیں۔ تو فرماتی کیا ہیں۔ حسین بھائی میرا بازو چھوڑ دو۔ اکبر بیٹے میرا ہاتھ
 چھوڑ دو۔ امام فرماتے ہیں۔ بہن کیا بات ہے۔ کچھ نہیں ذرا سیر
 بیٹے زین العابدین کو آواز دو۔ زین العابدین آگئے۔ زین العابدین بھائی زینب
 کو تم سوار کراؤ۔ اور سوار ہو گئیں۔ جناب زینب۔ اور عبد اللہ ابن جعفر
 طیار محل کے پاس خاموش کھڑے ہیں۔ صرف اتنا کہا کہ خدا حافظ۔

میرے محترم سامعین میں بات کو متفرکرتا ہوں۔ یہ لوگ نکتے پہنچے۔
 اور جب نکتے سے حسین روانہ ہوئے۔ تو شہر مکہ سے نکل کے یہ قافلہ ایک
 میل پہنچا ہوگا کہ ایک آواز آئی۔ حسین ٹھہرو۔ اور حسین ٹھہر گئے
 قافلہ ٹھہر گیا۔ گھوڑے کو روک کر حسین نے آواز کی طرف دھیان دیتے ہوئے
 قافلے میں کہا کہ عباس بھائی دیکھو کس کی آواز ہے۔ حضور نے ادھر دیکھ کے
 کہا۔ غالباً عبد اللہ آرہے ہیں۔ شوہر حضرت زینب۔ نکتے سے۔
 سب لوگ اتر گئے۔ عبد اللہ آگئے۔ آئے کس شان سے۔ ایک ہاتھ عون
 کے کندھے پر اور ایک ہاتھ محمد کے کندھے پر۔ پہنچے۔ اما ہم نے فرمایا
 کہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی۔ میں تو ابھی مل کے آیا تھا۔ حسین ایک کام رہ
 گیا تھا۔ ایک بات رہ گئی تھی۔ اور عون و محمد سے کہا کہ بچو! مجھے اس صحرا
 کے قریب لے چلو۔ جہاں تمہاری اماں بیٹھی ہے۔ عون و محمد لائے نافر بھایا
 گیا۔ عبد اللہ مخاطب ہوئے۔ علی کی بیٹی جا رہی ہو۔ اور زینب چھوڑ

میں کہتی ہیں۔ — اپنی تم تیری اجلاز نہ ہو تو اتر آؤں۔ میں تو تیری اجازت سے جا رہی ہوں۔ مگر یاد رکھنا کہ حسین کے بغیر زینب کا جنازہ اٹھے گا۔۔۔ میں روکنا کب ہوں۔ میں تو تاکید کرنے آیا ہوں کہ جاؤ تو ضرور محمد زہرا کی بیٹی زحف طیار سے رئیس کی بیوی سے اور سفر کا معاملہ ہے۔ ملک عراق کا سفر ہے۔ حسین جیسی قیمتی شے تیرے ساتھ ہے۔ خالی ہاتھ جا رہی ہو۔ اگر کہیں حسین پہ مصیبت بن گئی۔ اور مصیبت کو ٹالنے کے لئے اگر صدقہ دینا پڑا۔ تو کیا کر دو گی تم خالی ہاتھ جا رہی ہو۔ امد عون و محمد کے زینب کے ہاتھ میں دے کے کہا کہ یہ روزوں بچتے حاضر ہیں۔ انہیں بجائی کا صدقہ کر دینا۔ اپنی طرف سے صدقہ کر دینا۔ اب زینب نے بیٹوں کو باقی زندگی عمن و محمد کہہ کے نہیں پکارا۔ بھائی کا صدقہ کہہ کے پکارا۔

معزز سامعین کرام! — رات کے ایک بجے کا وقت۔ امام مصلیٰ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کہ اتنے میں جناب فضہ آئیں فرماتی ہیں حسین۔ بہن نے یاد کیا ہے۔ حسین آئے۔ کیا دیکھتے ہیں۔ زینب کے ایک طرف عون کھڑے ہیں۔ ایک طرف محمد کھڑے ہیں۔ حسین نے آتے ہی کہا۔ زینب سلام۔ فرماتی ہیں حسین! ٹھوڑی دیر کیلئے مجھے بہن نہ کہنا۔ تجھے میں نے بھائی سمجھ کے اب نہیں بلایا۔ میری بات سنو۔ تم جو حیدر کے بیٹے۔ میں ہوں جحف طیار کی بیوی۔ آج میں حیدر کے بیٹے سے جعفر کے پوتوں کے لئے شہادت کی صوبیک مانگتی ہوں۔ اور بھائیو قفقہ ختم ہوتا ہے۔ بات ختم کرتا ہوں۔ صبح ہوئی۔ ایک ایک شہید کی لاش آتی رہی خیمے میں۔ اور زینب پوچھتی رہی کہ ابھی عون و محمد زندہ ہیں۔ ابھی عون و محمد کی لاشیں نہیں آئیں۔ بچے گھر میں آگئے ان سلام۔ ہائیں ابھی تم زندہ ہو۔ میں تو صبح سے مصلیٰ پھانٹے بیٹھو ہوں کہ تمہاری لاشیں آئیں اور میں سرخرو

بوجاؤں۔ تم ابھی تک میدان میں نہیں گئے۔ دروازے تک آئی۔
 بچے میدان میں گئے۔ رٹتے رہے۔ خیموں سے جدا بند ہوئی کہ زینب کے بچے
 شہید ہو گئے۔ کہا زینب کہاں ہے۔ رک گئے۔ دیکھا کہ جدے میں ہیں
 امام لاشیں لے کے آئے۔ یا اللہ تیرا شکر ہے۔ اب جو ماں آئی بیٹوں
 کی لاشوں پر بیٹھ گئی۔ بیٹھی ہی تھی کہ چھوٹے کے لب بے۔ کیا کہنا چاہتا ہے۔
 بچہ کہہ رہا تھا۔ ماں اب تو تو راضی ہو گئی ہے نا! ہم پیاسے تھے۔ دندن بڑی لعل
 اور دینک رٹتے۔ اور زینب سر کے بال چوم کر۔ ماتھے کے زخم چوم کر کہہ
 رہی ہیں کہ میرے پیارے بیٹو! اگر کبھی جبر کا ہو تو معاف کر دینا۔ عوں و محمد۔ میں تمہارا
 شکر گزار ہوں۔ اب میری ایک اور بات یاد رکھنا ابھی تھوڑی دیر بعد تم اپنے نانا حیدر
 کنارے پاس پہنچو گے۔ کنارے کنارے۔ اگر ساقی کوثر۔ کنارے کنارے
 تمہیں پانی پلانے تو میرے پیارے بچو!۔ ماں کی بات ضرور یاد رکھنا۔ کنارے
 پہ جا کے بھی حسین سے پہلے پانی نہیں پینا۔ جی بھر کے رولو۔ ان کی ماں کو کسی
 نے نہیں رونے دیا۔ جی بھر کے رولو۔ یہ زینب کے بچوں کی مجلس
 ہے۔ اب میں پردہ نشین خواتین سے کہنا چاہتا ہوں کہ تمہاری مجالس دن کو ہوتی
 رہیں۔ جب تمہاری مجلس ہو تو تمام اکٹھی بو کر سر کے بال کھول دینا اور زینب کو عوں
 و محمد کا پر سہ دینا۔ زینب ہم تیرے بچوں کو رونے آئی ہیں۔ اللہ آپ
 کی مجلسوں کو قبول و منظور فرمائے۔

سنامِ عربیان

صاحبان۔ مختصر سی گفتگو کو پورے غور اور توجہ سے سنیں تاکہ آپ کو وہ بات یاد رہے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ میں آج کی یہ گفتگو اس بات سے شروع کرتا ہوں کہ جتنے بھی انبیاء دنیا میں تشریف لائے۔ جن کی تعداد کا صحیح اندازہ ابھی تک نہیں ملے۔ شہرت عام یہ ہے کہ ایک لاکھ اور چوبیس ہزار۔ یہ شہرت عام ہے۔ یہ نہیں کہ یہ تعداد طے شدہ ہے۔ یہ ایک شہرت عام ہے۔ پھر ان تمام انبیاء میں سے بعض کا ذکر قرآن میں ہے اور اکثر و بیشتر کا تذکرہ نہیں۔ مگر ایک بات ان سارے انبیاء کے متعلق مشترک طور پر قرآن میں موجود ہے۔ کہ ان انبیاء نے اپنے تشریف لانے اور ہدایت فرماتے وقت یہ بیان کیا ہے، بزبان قرآن۔ بزبان خدا۔ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ۔ ہم اس لئے دنیا میں آئے ہیں کہ اسے دنیا والو تمہارے سامنے حق کی اور حکم خدا کی تبلیغ کریں۔ یہ بیان کرتے کرتے کرتے کرتے۔ جب نبوت چلتے چلتے خاتم النبیین پر پہنچی۔ ان سے بھی لوگوں نے پوچھا کیا آپ بھی اسی طرح نبی ہیں جس طرح وہ تھے؟ آپ بھی تبلیغ ہی کے لئے آئے ہیں، جس طرح وہ آئے تھے۔ تو اپنے فرمایا نہ۔ میں تبلیغ کے لئے نہیں آیا۔ میرا مقصد بلاغ نہیں ہے۔ بلاغ کے معنی یہ ہیں کہ بالکل سلیجے ہوئے انداز میں کسی بات کو کسی سے کہدیا جائے۔ اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس کا ذمہ دار وہ کہنے والا نہیں ہے۔ اسے تبلیغ کہتے ہیں۔ سمجھ میں آیا نہ آپ کے۔ آپ کا کیا مقصد ہے؟ تبلیغ؟ کہ نہ میں تبلیغ کے لئے نہیں آیا۔ میرے اللہ نے میرے آنے کا مقصد تبلیغ کے علاوہ مقرر کیا ہے۔ کیا؟ کہ يُعَلِّمُ هُمُ الْكِتَابَ الْحَكِيمَةَ۔ میرا مقصد تبلیغ نہیں تعلیم ہے۔

تعلیم چیز اور ہے، تبلیغ چیز اور ہے۔ میں تبلیغ نہیں ہوں میں معلم ہوں۔۔۔۔۔

سمجھ میں آیا نا صاحبان کے؟ یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آتی جا رہی ہے۔ ایک

یہ بڑا فرق ہے، باقی انبیاء میں اور ہمارے بنی میں کہ وہ سب تبلیغ تھے، ہمارا رسول معلم

تھا۔۔۔۔۔ سمجھ رہے ہونا حضور والا۔۔۔۔۔ تبلیغ کے لئے کوئی بچے جوڑے علم کی ضرورت

نہیں۔۔۔۔۔ مگر معلم کے لئے۔۔۔۔۔ جس چیز کی وہ تعلیم دے رہا ہے اس کی ہر جزئیات

تک کی مہارت ضروری ہے۔۔۔۔۔ تبلیغ کا کام ہے کہدینا۔۔۔۔۔ اور معلم کا کام ہے

سمجھا دینا۔۔۔۔۔ دونوں میں لحاظ بڑا مشکل ہے۔۔۔۔۔ اس لئے کہ تبلیغ کے سامنے

بھی اور معلم کے سامنے بھی جو جمع آئے گا اس میں ذہین ہوں گے۔۔۔۔۔ کچھ کم ذہین کے

ہوں گے۔۔۔۔۔ کوئی کند ذہن ہوں گے۔۔۔۔۔ کوئی توجہ کرنے والے ہوں گے۔۔۔۔۔

کوئی کھٹا ٹھی ہوں گے۔۔۔۔۔ تو تبلیغ نے بات کہہ دی کند ذہن سن رہے ہیں۔۔۔۔۔

توجہ والے توجہ دے رہے ہیں۔۔۔۔۔ مگر معلم کو اس طرح بات کرنی پڑے گی کہ ہر

طبقے کے آدمی کے ذہن میں وہ بات بیٹھ جائے۔۔۔۔۔ گویا اس کا کام ہے سمجھانا۔۔۔۔۔

تو اتنا فرق تو یہ ہو جائیگا تبلیغ اور معلم میں کہ تبلیغ کہے گا کہ معانی ذرا جو سمجھ دار ہیں۔ وہ

آگے آجائیں اور جو نا سمجھ ہیں وہ پیچھے بیٹھیں۔۔۔۔۔ مگر معلم کا کام ہے سمجھانا۔۔۔۔۔

وہ یہ نہیں کہنے گا۔۔۔۔۔ وہ ذریعہ کرے گا کہ بھئی وہ جو ذرا نا سمجھ ہیں جن کی سمجھ ذرا

کم ذریعے وہ ذرا اور قریب آجائیں۔۔۔۔۔ سمجھے حضور۔۔۔۔۔ یہ تین فرق ہے۔۔۔۔۔

تبلیغ میں اور معلم میں۔۔۔۔۔ اگر یہ بات آپ لوگوں کے ذہن میں آگئی ہے اور یقیناً آ

عمتی ہوگی۔۔۔۔۔ کہ ہمارے بنی کا کام ہے تعلیم۔۔۔۔۔ اُن کا کام ہے تبلیغ۔۔۔۔۔ میں

کئی دفعہ آپ کو یہ بات سمجھا چکا ہوں۔۔۔۔۔ آپ ان باتوں کو سرسری سمجھ کر بھول جاتے

میں۔۔۔۔۔ نظر انداز کر دیتے ہیں۔۔۔۔۔ مگر یہ بھولنے کی باتیں نہیں۔۔۔۔۔ انہی کے اندر ساری

بات ہے۔۔۔۔۔ یہی سارا فلسفہ اور منطق ہیں۔۔۔۔۔ کہ تعلیم کا کام یہ ہے۔۔۔۔۔ فقط فائدہ

یاد رکھنا۔ کہ جب بچہ مدرسے میں داخل ہوتا ہے پہلی کتاب جو دی جاتی ہے وہ قاعدہ ہے۔ تعلیم کا قاعدہ یہ ہے کہ جو لفظ بچے بتایا جائے اس کے سامنے اس لفظ کی ایک تصویر بھی بنا دی جائے۔ یہ طریقہ تعلیم ہے۔ الف سے آم تو آم کی ایک تصویر بھی ہو۔ سمجھے۔ اور س سے سانپ۔ سانپ کی ایک۔ تصویر بھی ہو۔ ش سے شیر، شیر کی ایک تصویر بھی ہو۔ تاکہ ادھر بچے ذہن میں ہوشیئر اُدھر بچے کے داغ میں ہوشیئر کی تصویر۔ دونوں چیزیں جب ذہن میں ہوں تب مقصد تعلیم پورا ہوتا ہے۔ اگر یہ تصویر کا قاعدہ کسی بچے نے پڑھا ہے، اُسے یہ تو یاد ہے ش سے شیر۔ شیر کی تصویر نہیں دیکھی اس نے۔ وہ باپ کے ساتھ گیا لاہور۔ ابا بچے چڑیا گھر دکھا دے چل کے۔ ابا اسے چڑیا گھر لے گیا۔ بچے نے پوچھا۔ ابا یہ کیا ہے؟ کہ بیٹے یہ شیر کا بیجرہ ہے۔ اب یہ تو یاد تھا اسے ش سے شیر۔ تصویر نہیں دیکھی تھی اس نے شیر کی۔ وہ شیر کا بیجرہ دیکھنے لگا۔ چڑیا گھر والوں کا شیر مر گیا تھا۔ انہوں نے خالی بیجرہ دیکھ کر اس میں ایک گدھا بند کر رکھا تھا۔ اس بچے نے شیر کی تصویر نہیں دیکھی تھی۔ وہ شیر کی جگہ بیٹھا دیکھ کے گدھے کو شیر سمجھ بیٹھا۔ اگر کہیں وہ ش سے شیر کی تصویر بھی دیکھ چکا ہوتا تو لاکھ اس کا باپ بھی کہتا کہ بیٹا یہ شیر ہے۔ وہ کہتا "ابا کیوں جھوٹ مارتا ہے۔ میں تو شروع میں ہی دیکھ چکا ہوں۔ شیر کی تصویر۔ یہ تو کوئی اور ہے جو شیر کی جگہ آ گیا ہے۔ سمجھ میں آیا۔ قاعدہ یہ ہے تعلیم کا۔ جو بات کہی جائے اس کی تصویر بھی ساتھ ہو۔ دیکھو جو میں کہہ رہا ہوں یہ اس کی تصویر ہے۔ دیکھو یہ کہہ رہا ہوں یہ اس کی تصویر ہے۔ سمجھے، حضور، تصویر سے قطع نظر کرنے والے طالب علموں نے دھوکا کھا لینا ہے اور نظر میں اگر کتاب اور تصویر دونوں رہیں تو طالب علم کبھی دھوکا کھا سکتا ہی نہیں۔ اسے کبھی مغالطہ لگ سکتا ہی نہیں۔

میری بات ابھی طرح ذہن میں اٹھنی نا آپ کے؟ — خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا میرا مطلب یہ تھا کہ رسول اکرام ہے — ہمارے رسول اکرام ہے — کہ وہ مبلغ نہیں ہے بلکہ معلم ہے — معلم تعلیم دیتا ہے — تو تعلیم کے لئے سارے لوازمات تعلیم رسول کے پاس موجود ہیں — رسول خود معلم ہے — اس کا ماحول جو ہے وہ درس گاہ ہے — اس میں کئے والے جو ہیں وہ طلبہ ہیں — سمجھے؟ — ان کا امتحان بھی ہوتا ہے — ان کو پاس نیل کی ڈگری بھی ملتی ہے — کوئی اس میں ڈپل پاس کرتا ہے — کوئی میٹرک تک چلتا ہے — کوئی ایف اے تک چلتا ہے — کوئی بی۔ اے تک جاتا ہے — کوئی ایم۔ اے تک پڑھتا ہے — کوئی بی۔ ایچ۔ ڈی ہو جاتا ہے — یہ مزدوری نہیں کہ کالج میں جتنے داخل ہوں سب یکساں ہوتے ہیں — دماغ کے اختلاف کے مطابق کوئی ڈاکٹر ہو گیا — کوئی وکیل ہو گیا — کوئی انجینئر ہو گیا — کو جو نیل کر نیل ہو گیا — اب ہر ایک سے توقع رکھیں کہ وہ اچھا تر نیل ہے یہ غلط ہے — ہر ایک سے یہ توقع رکھیں کہ وہ اچھا ڈاکٹر بنے یہ غلط ہے — جیسا جیسا جس کا دماغ — جیسی جیسی جس کی طبیعت اویسا وہ بن جاتا ہے — کوئی اچھا تاجر بن گیا — کوئی اچھا سنگر بن گیا — مزاج جیسا ہے اسی طرح — کوئی اچھا بلیک مارکیٹیا بن گیا — تو عرض جیسا جیسا جس کا دماغ ہے ویسے وہ بن جاتا ہے — طلبہ — سارے انجام کار یکساں نہیں بنتے — تو رسول ہیں معلم — ان کا جو ماحول ہے وہ ہے درس گاہ — اس میں داخل ہونے والے ہیں — طلبہ اور لطف یہ کہ فیس کوئی نہیں — آؤ بھی بسم اللہ داخل ہو جاؤ — پھر طلبہ کے لئے عمر کی قید بھی نہیں — جس عمر کا طالب علم آنا چاہے — آؤ بسم اللہ تشریف لاؤ، بیٹھ جاؤ پھر کسی وطن کسی علاقے کی قید بھی نہیں — کوئی کوڑا مقرر نہیں ہے کہ ایران سے اتنے اور عرب کے اتنے اور روم کے اتنے — جہاں کا جو آ جائے — ڈھائی سو برس والا، بسم اللہ

یہ۔ یہ۔ سو برس کا ہے۔ — بِسْمِ اللہ تم بھی آجاؤ۔ — یہ صاحب ایسی اچھی پیدا ہوئے ہیں۔ — بِسْمِ اللہ تم بھی آجاؤ۔ — کوئی قید نہیں۔ — جیسا جیسا طالب علم ہے، آتا ہے، اس کے مطابق اسے پڑھایا جائے گا۔ تو اس طرح یہ درس گاہ ہے۔ — خوب سمجھ میں آرہی ہے نابات صاحبان کے؟ — یہ کالج ہے۔ — یہ درس گاہ ہے۔ — جس میں مختلف جماعتوں میں مختلف نکلوں اور طبیعتوں کے طلبہ داخل ہیں اور اپنی اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق وہ علم حاصل کر رہے ہیں۔ — معلم ذرہ برابر بھی کوتاہی کس کے پڑھانے میں نہیں کرتا۔ — سب پہ یکساں توجہ کرتا ہے۔ یکساں سب سے سلوک کرتا ہے۔ — سب سے مہربانی سے پیش آیا ہے۔ — یہ اور بات ہے کہ گھر جا کے اپنے بچوں کو ٹیوشن کے طور پر پڑھادیتا ہے۔ — بائی مدر سے میں سب کے ساتھ یکساں سلوک ہے۔ — مدر سے میں سب کو یکساں طور پر پڑھاتا ہے۔ — یہ ہمارا رسول معلم ہے۔ — جب معلم ہے۔ — درس گاہ ہے۔ — کالج ہے۔ — تو اس میں درجات بھی ہیں۔ — یہ میٹرک ہے۔ — یہ ایف ایس ہے۔ — یہ بی اے ہے۔ — تو اس کے درجات جو ہیں۔ — وہ جو سیل بس کی کتاب ہے اس درس گاہ کی۔ — جو اس نصاب تعلیم اس کا مقرر کیا ہے وہاں اس کے درجات بھی مقرر کئے ہیں۔ — پہلی کلاس یہ ہے۔ — دوسری یہ ہے۔ — تیسری یہ ہے۔ — چوتھی یہ ہے۔ — سب سے۔ — وہ کلاسیں جہاں مقرر ہوئی ہیں۔ — وہ آیت میں آپ کو سنا کر پھر مجلس شروع کرتا ہوں۔ — اب آپ حضرات نے میری بات پہ غور کر لیا ہے اچھی طرح سے؟ ہوں۔ — آگے نامدر سے میں آگے تم؟ امتحان دینا پڑیگا۔ — یہ نہیں ہوگا کہ چھ مہینے میرا سر کھپاؤ اور امتحان کے وقت بھاگ جاؤ۔ — یہ نہیں ہو سکتا۔ — یہ غلط ہے۔ — امتحان بھی دینا پڑے گا اگر آگے تو۔ — سال بھر بیٹھے رہے کہ یہ پڑھاؤ اور جب میں امتحان کے لئے جاؤں تو بھاگ جاؤ۔ — یہ نہیں ہو سکتا

— امتحان بھی دینا پڑے گا — سمجھے حضور؟ اور یہ امتحان بڑی نامراد شے ہے
 — یہ بچے جو امتحان دیتے ہیں ان سے پوچھو — بڑی ہی نامراد شے ہے یہ امتحان
 — امتحان کے سنٹر سے بڑھ کر کوئی جیل نہیں ہے — کوئی خطرناک جگہ نہیں
 جتنا امتحان کا سنٹر خطرناک ہوتا ہے، جتنا وہ جیل بڑی ہوتی ہے — امتحان بڑی محنت
 چیز ہے — یاد رکھو دستو — میری بات کو بھولنا نہیں — ان باتوں کو یاد رکھنا
 — امتحان انسان کا بھی ہوتا ہے — امتحان حیوانوں کا بھی ہوتا ہے — درختوں کا بھی
 ہوتا ہے — پتھروں کا بھی ہوتا ہے — آپ زمیندار ہیں — آپ تو گندم کا
 امتحان لیتے ہیں — یہ کس قسم کا ہے؟ اور یہ کس قسم کا؟ — تب اسے کاشت کرتے
 ہیں — روٹی کا، کپاس کا امتحان لے کر — کون سی؟ کس قسم کی ہے؟ تب اسے
 کاشت کرتے ہیں یا نہیں — پتھروں کا امتحان بھی ہوتا ہے — حیوانوں کا بھی —
 ضلع سرگودھا میں وہ کیا نام ہے؟ ڈپو — کیا نام ہے اس کا؟؟ — مونا ڈپو —
 اس میں گھوڑے پلتے ہیں — فونج کے لئے — تو ہر سال جو گھوڑے تیار ہوتے
 ہیں نا — وہ جانے ہیں فونج میں — یہ نہیں کہ جتنے گھوڑے مونا ڈپو میں تیار ہوتے
 وہ فونج میں چلے گئے سارے — ایک ماہر آکے ان کا امتحان لیتا ہے گھوڑوں کا
 — بڑے بڑے تیار، تندرست، اعلیٰ درجے کے گھوڑے، پچھلے سامنے کھڑے
 ہیں — اس نے ان میں سے دس چھانٹ لئے — باقی ان فٹ کر دیئے —
 وہ تو بڑے خوبصورت، شاندار تھے — یہ کیوں ان فٹ کئے تم سب؟ — کہ
 ہمارا معیار ہے امتحان کا؟ ہم نے انہیں فونج میں لے جانا ہے — ہم نے ان سے
 توہمیں کھنچوانی ہیں — تو ہم یہ بات دیکھے ہیں کہ فونج میں جو گھوڑا لے جاؤ جو توپ
 کھینچ کے میدان میں لے جائے — چاہے گولے برسیں — چاہے ہوائی جہاز
 اوپر سے بم بارسی کریں — چاہے کچھ ہو — وہ کہیں توپ لے کے بھاگ نہ جاوے

— سینہ سپر ہونا چاہیے اس کو — کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری توپ ہی کو لے کر بھاگ جائے نامراد — دوسرے بیکہ جنگ کے میدان میں ہیں ہفتوں، مہینوں خندقوں میں رہنا پڑتا ہے — دشمن کو تپہ نہ چلے کہ ہم کہاں ہیں — وہیں ان گھوڑوں کو ہمارے ساتھ رہنا پڑتا ہے — یہ صفت ہو اس میں کہ اگر کہیں دشمن کے خطرے سے چھینا پڑے تو کہیں نہ ہانے نہ لگ جائے — ایسے گھوڑے بداصل ہوتے ہیں نامراد — اسی بات ان کا امتحان ہوتا ہے — تو ہر چیز کا امتحان ہے — رسول کا ایک مکتب ہے — کالج ہے — مدرسہ ہے — حضور معلم ہیں — دنیا ان کی طالب علم ہے — اس کی کلاس میں ہیں — یہ پہلی ہے، یہ دوسری ہے، یہ تیسری ہے — اب یہ ان کی تفریق ہے کہ جس کلاس کا کوئی پہلے پاس کرے — ان کلاسوں کی جو ترتیب سلیبس میں ہے وہ یوں ہے — بھائی — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط وَالْعَصْرُ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَفْعِ خَسْرٍ ۝ پہلی کلاس — اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَوَعَلِ الصّٰلِحٰتِ تِیْسِرٰی کلاس — وتواصوا بالحق، چوتھی کلاس — وتواصوا بالصبر، پانچویں کلاس — اب دیکھنا یہ ہے کہ کون انسان کس کلاس میں کامیاب ہوتا ہے — کون داخل ہونے والا کس کلاس ... ؟ ان انسان لفظی خسر — ہنسا نہیں — کہیں ایسا نہ ہو کہ طالب علم تو بڑا پڑانا ہو اور خسر سے ہی راضی ہو جائے یہ پہلی کلاس ہے — ان انسان لفظی خسر — بالکل پہلی کلاس ہے — اس میں تم داخل ہوئے آگے — اس میں تم سب نقصان میں ہو — سب گھٹے میں ہو — یہ گھٹا کیا ہے انسان کو؟ — نقصان کیا ہے انسان کو؟ اس میں بڑی تفصیلات میں قبیلہ — یہ ساری تفصیلات آپ کے سامنے بنیان کرنے کے لئے بڑا وقت چاہیے کہ انسان کہاں کہاں، کس کس طرح نقصان میں ہے — گھٹے میں رہتا ہے — یہ وہ کلاس ہے جس میں سب شامل ہیں — لفظی خسر، والی — اب اس کلاس کو پاس کیا

کسی نے اگے کلاس آئی۔ ان الذین امنوا۔ یہ ہے گویا کچی کلاس۔
اب تم امنوا بن گئے۔ آمنو کے معنی کیا ہیں؟ تمہارے مزاج میں، تمہاری طبیعتوں
میں، تمہارے اخلاق میں، تمہاری عادات میں امن پسندی پیدا ہو۔ یہ ہے اس
— آمنو، کوئی ایسی شے نہیں جو آسمان سے برستی ہو۔ کوئی لباس نہیں جو آدمی
کو پہنا دیا جاتا ہو۔ کوئی اور رنگ نہیں جو آدمی پر چڑھا دیا جاتا ہو۔ آمنو کا لفظ
'ایمان' سے اور ایمان کا لفظ 'امن' سے بنا ہے۔ یعنی اب تم میں جھگڑا فساد نہیں
رہا۔ رٹائی فساد نہیں رہا۔ خواہ مخواہ کو الجھنا نہیں رہا۔ اب تم امن پسند
بن گئے ہو یا نہیں۔ سمجھے نا حضور؟ اب امن دالی کلاس کا جو معلم ہو گا وہ خود
ایسا ہو کہ اس امن میں اس دے بے پہ پہنچ چکا ہو کہ امن قائم رکھنے کے لئے باوجود طاقت کے
دنیا بھر کاتی ہے۔ کچھ بھی کہتی رہے، مگر وہ امن کی خاطر اپنے حقوق کو چھوڑ کر خاموش
بیٹھ جاتے۔ ایسا امن پسند، نکل ایمان کہلا کر آمنو کا مصداق بن جاتا ہے۔
ایسا ہی معلم دوسروں کو امن سکھا سکتا ہے۔ تم آمنو کلاس پاس کر چکے۔
اس لئے تمہارا نام آج سے ہوگا۔ امیر المؤمنین۔ یہ مومنین کی کلاس تمہیں مبارک
ہو۔ امیر تو چھوٹی سی چیز ہے، یہ اور بلند ہوگا۔ یہ نہیں کہ امیر المؤمنین پہ جا کے بات ختم
ہو گئی۔ سمجھے حضور۔ اب تم آمنو کلاس کو پڑھانا۔ تم ہو امیر المؤمنین۔
اس کے بعد کیا ہوگا۔ اس کے بعد ہے۔ عمل الصالحات۔ محض پر امن بن
کے بیٹھ جانا ہی کافی نہیں۔ آرام سے بیٹھے ہیں۔ کہہ دیا کہ امن ہے۔
گھر بیٹھے میں بڑے حوصلے سے۔ کیا ہے، کہ امن ہے۔ یہ امن نہیں۔
سمجھ میں آیا نہ آپ کے۔ کسی کے گھر میں آگ لگ رہی ہے۔ اندر بیٹھے ہیں۔
ہم تو نہیں جاتے۔ کہہ کیا ہے؟۔ جی امن ہے۔ گھر دوسرے کا بجلی،
تم آرام سے بیٹھو، اس کا نام امن رکھو۔ یہ ہے دنیا کی سب سے بڑی حماقت اور

سب سے بڑی ذلالت — اپنا گھر جل رہا ہو اور اُسے نہ کرے آدمی یہ اور بات ہے۔
 گھر کسی کا چلے، صبر ہم کریں — کیا ہے جی؟ امن ہے — یہ بات دنیا کی سب
 سے بڑی ذلالت ہے — سمجھنا حضور والا — تو امن یہی نہیں ہے کہ جی آرام سے بیٹھے
 ہیں کیا ہے جی؟ امن ہے — غلط ہے — اسے امن نہیں کہتے — تو جہے نا حضور
 والا — اسے امن نہیں کہتے — امن کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ساتھ ساتھ عمل الصالحات
 بھی ہوں — تم ہاتھ پاؤں توڑ کے نہ بیٹھ جانا بلکہ جو نیک کام میں دو بھی کرتے رہنا —
 اب یہ جو نیک کام کا لفظ ہے نا — یہ بڑا مشکل لفظ ہے — حضور — ہر آدمی کے
 مزاج کے مطابق نیک کام کا معیار الگ الگ ہوتا ہے — نیک کام ہر ایک کے نزدیک
 الگ الگ ہے — ایک کام ایک کیلئے نیک اور عبادت ہے دہی کام دوسرے کے لئے
 بد اور بدعت ہے — نیک کا معیار الگ الگ ہے — سمجھے؟ کوئی کسی بات کو
 نیک سمجھتا ہے، کوئی کسی بات کو — کلاس کے لڑکے بیٹھے ہیں — ایک نے کہا
 چل یار دوڑیں — سیر تفریح کر لیں — اس کے نزدیک بہت کمال ہے یہ کہ کلاس
 سے بھاگ کے کھیلا جائے — کھیل رہے ہیں — کسی کے نزدیک یہ نیکی ہے — وہ بیٹھ
 کے پڑھ رہے ہیں — اپنی اپنی بات ہے — اصل میں نیکی کا معیار —
 اگر ہم اپنی عقل سے فیصلہ کرنا شروع کر دیں تو پھر نیکی ایسا عجوبہ بن جائے کہ دنیا میں کہیں
 اس کا وجود نہ پایا جائے — ہر ایک الگ الگ شے کو نیکی سمجھے گا — کوئی کسی بات
 کو، کوئی کسی بات کو — ایک مصیبت بن جائے گی یا نہیں — لہذا ضروری ہے کہ
 نیکی کے کام کو طے کرنے کے لئے کہ عمل الصالحات کیا شے ہے — یہ طے کرنے کے
 لئے معلوم ہی کی طرف رجوع کیا جائے — جناب آپ فیصلہ کریں کہ یہ — اس کا معیار
 کیا ہے — ہمارے کرنے سے نہیں — ہم تو اپنے اپنے مزاج کے مطابق صالحات
 بنائیں گے — آپ بتائیں کہ عمل صالح کیا ہے؟ تاکہ ہم ایمان کے بعد وہ عمل صالح کریں —

اور چونکہ آپ معلم ہیں۔ لہذا جو عمل صالح آپ ہمیں بتائیں۔ وہ محض محض بتائیں ہی نہیں۔ اس لئے کہ آپ مبلغ نہیں ہیں۔ وہ کر کے دکھائیں۔ آپ لگ رہے مبلغ ہی نہیں جو صرف بتائیں۔ آپ معلم ہیں۔ عمل صالح ہمیں کر کے دکھائیں۔ اس نے کہا اچھا۔ ٹھہرو۔ آؤ۔ تمہیں کر کے دکھانا ہوں۔ تم دیکھتے رہنا۔ چونکہ یہ عمل کا معاملہ ہے، یہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قول کا معاملہ سننے سے تعلق رکھتا ہے جو میں کہوں اسے سن لو اور جو عمل ہے اسے دیکھو۔ سمجھو۔ تمہیں دیکھنا پڑے گا۔ اب میں تمہیں عمل صالح دکھاتا ہوں۔ دیکھو۔ اے۔ اے۔ اے۔ یہ ہے عمل صالح۔ دیکھو اسے۔ نماز سن کے نہ پڑھنا۔ میں نے کہا یا نماز پڑھو۔ تم نے پڑھ لی نا؟ جس تو کیا دایستہ مونی۔ دیکھو مجھے میں کس طرح نماز پڑھتا ہوں۔ دیکھو۔ آؤ دیکھو۔ نماز عمل صالح جب بنے گی، جب مجھے دیکھ دیکھ کر میرے طریقے سے نماز پڑھو گے۔ دیکھتے رہو اچھی طرح۔ دیکھ رہے ہو۔ ہیں؟ دیکھ رہے ہونا؟ دیکھو کہاں نماز ٹوٹتی ہے۔ کہاں نماز مکمل ہوتی ہے۔ دیکھتے رہو۔ اگر نماز پڑھتے ہوئے ایک آدمی نے گھڑی کو چابی دینا شروع کر دی۔ ٹوٹ گئی۔ یہ زائد عمل ہے۔ اس سے غلط ہو جائے گا۔ نماز پڑھتے پڑھتے کسی روتے ہوئے بچے کے سر پر ہاتھ پھیر دیا۔ نماز ٹوٹ گئی نا؟ یہ غلط ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ پھر اگر ان افعال سے نماز ٹوٹتی ہے، کسی معلم نے بتایا ہے۔ تو یہ دیکھتے رہو کہ کہاں نہیں ٹوٹتی۔ اگر بچے کے سر پر ہاتھ پھیر دو تو ٹوٹ گئی۔ اور بچے کو گھنٹہ بھر کر پھینکے رکھو تو نہیں ٹوٹتی۔ یہ معلم بتاتا ہے۔ ہمارے کانٹے کا۔ سمجھو۔ تمہارے فیصلے سے نہیں ہو گا۔ یہ معلم بتائے گا کہ عمل صالحات میں کیا شے؟ کہاں نماز میں نقص آتا ہے کہاں نماز پوری ہوتی ہے۔ یہ معلم سمجھاتا ہے۔ سمجھو۔ کسی سے عداوت نہ کرو۔ کسی سے جھگڑا نہ کرو۔ تمہیں کوئی حق نہیں کسی کو بڑا بھلا کہنے کا۔

معلم کو دیکھو جا کے وہ کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے نماز پڑھو۔ اور نماز کی مقبولیت کے لئے درود شریف پڑھو۔ پڑھو نا درود شریف۔ اللہم صل علی محمد و آل محمد و الاصحاح محمد۔ یہی درود شریف ہے۔ کیا نماز میں یہی درود شریف پڑھو گے۔ نہ وہاں تو نہیں پڑھنا۔ کیوں؟۔ کہ نماز نہیں ہوگی۔ کہ وہاں کتنی پڑھنی ہے۔ کہ میں الا آل محمد تک۔ اور نماز کے بعد۔ پھر الا اصحاب محمد اور نماز میں اگر اصحاب محمد کہہ دو تو نماز نہیں ہوگی۔ اور اگر آل محمد نہ کہو تو نماز نہیں ہونے کی۔ یہ عمل صالح بتایا۔ کہ دیکھو ہم کسی کو بڑا کہتے۔ مگر آل اور اصحاب میں یہ فرق ہے کہ آل کا نام نہ لینے سے نماز غلط اور اصحاب کا نام لینے سے نماز غلط۔ اگر وہاں اصحاب کہہ دو تو نماز غلط۔ آل نہ کہو تو نماز ہوگی۔ یہ عمل صالح ہے جو ہمیں بتایا۔ دیکھو ادھر آؤ۔ جس طرح میں عمل کروں اسی طرح عمل صالح بنتے ہیں۔ تمہارے لئے یہ قانون ہے اللہ کا۔ کیا؟ لا ھو فھو اصواتکم فوق صوت النبی۔ یاد رکھو مسلمانوں، اتنے ادب سے رہنا رسول کے سامنے کہ تمہاری آواز رسول کی آواز سے بلند نہ ہونے پائے۔ جس آواز سے بول رہے۔ اگر تم بولو تو اس کی آواز سے کم آواز میں بولنا۔ خبردار اس کی آواز سے تمہاری آواز بلند نہ ہونے پائے۔ رسول کے ساتھ تمہارا برتاؤ۔ قد جھس بعضکم بعضاً۔ نہ ہو۔ جس طرح تم آپس میں ملتے ہو اس طرح نہ ملنا کہ گلے مل رہے ہیں۔ ہاتھ مل رہے ہیں۔ نہ۔ اس کا فرق رکھنا۔ رسول کا یہ ہے تمہارے لئے، مسلمانوں کے لئے حکم۔ کہ اگر تم رسول کو سامنے آنا دیکھو تو چاہے تم نماز ہی کیوں نہ پڑھ رہے ہو۔ یہ حکم ہے۔ نماز پڑھ رہے ہو اور رسول نے آواز دی۔ ادھر آؤ۔ فوراً۔ اگر تم نے نماز کی وجہ سے اس کی تعمیل نہ کی تو مر گئے، گھر ہے۔ فوراً۔ رسول کے جواب میں۔ یہ بھی حکم ہے۔ سمجھے حضور۔

یہ عمل صالح ہے ہمارے لئے — یہ ہمارا عمل صالح ہے — مگر ہم رسول کا عمل صالح کیا دیکھ رہے ہیں — کہ ہم تو آواز اونچی نہیں کر سکتے — اس کے بلائے پہ نہ بولیں تو کفر ہو جائے اس کے آگے چل پڑیں تو کفر ہو جائے — اس کے سامنے بے لوبی سے بیٹھیں کفر ہو جائے — اس کے گھر میں جھانکنا امت — خبردار — کفر ہو جائے گا — اگر وہ تمہیں کھانے پہ بلائے اس کے برتنوں کو نہ دیکھنا کہ یہ کس چیز کا ہے — یہ کس چیز کا ہے نہ دیکھنا — کفر ہو جائے گا — جس فرش پہ وہ بیٹھا ہے — اس پہ بیچ کے ادب سے بیٹھو ورنہ کفر ہو جائے گا — یہی ہوا تھا نا کہ ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ — ام المومنین رسولؐ کی زود بوجہ عزت — حضرت ابوسفیان کی بیٹی — امیر معاویہ کی حقیقی بہن — یزید کی سگی چھو بھی — جناب ام حبیبہؓ رسولؐ کی حرم محرم تھیں — رسولؐ کی بیوی تھیں ام حبیبہؓ — سمجھ گئے ہونا حضور — وہ جو رسولؐ کے گھر میں تھیں جناب ام حبیبہؓ — ان کے باپ ابوسفیان اپنی بیٹی سے ملنے آئے رسولؐ کے گھر — آئے — بیٹی نے سلام کیا — کھڑے ہو کے تعظیم کی — باپ تھے — جب بیٹھے لگے تو کہا ابا ذر! ٹھہرنا — اب جو درئی کچی تھی، پلٹ لی — بسم اللہ ابا تشریف رکھو — زمین پر — تو ابوسفیان نے بڑے رعب سے کہا — ام حبیبہ جانتی ہو میں کون ہوں — میں عرب کا بے تاج بادشاہ ہوں — میں لاکھوں فوجیں اکٹھی کر لاتا ہوں محمدؐ کے مقابل میں — عرب میں میری دھاک مٹی بھی ہوئی ہے — تو مجھے اس بیٹی ہوئی درئی پہ نہیں بیٹھنے دیتی — ام حبیبہؓ نے کہا — یہ رسولؐ کے بیٹھے کی ہے — تم چاہے کچھ بھی نہیں بیٹھ سکتے — آج مسلمانوں کی کتابیں مہری پڑی ہیں اور وجد آتے ہیں — لوگوں کو — کہ واہ ام حبیبہؓ کیا کہنے تیرے — ام المومنین ہو تو ایسی ہو — کہ نہیں بیٹھنے دیا — باپ کو رسولؐ کی جگہ پہ — ام المومنین ہو تو ایسی ہو — جو رسولؐ کی جگہ باپ کو نہ بیٹھنے دے — ام المومنین کی یہ شان ہے — یہ اس کا احترام کہو — یہ عمل صالح ہے —

ہمارے واسطے — میں زیادہ تشریح میں نہیں جاتا — مگر ادھر تو رسول کا یہ احترام کہ اس کی جگہ کوئی نہ بیٹھے — کہیں اس کی بچھی ہوئی دری پہ کوئی نہ بیٹھ جائے — اس کے سلسلے کوئی اونچا بولے نہیں — اسے آواز نہ دو — اس کے سلام کا طریقہ بھی اور ہونا چاہیے — دیکھو اس کو پکارنا نہ جب وہ گھر میں ہو — یہ کرنا — اور ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ وہی رسولؐ ایک بچی کو دیکھ کر فوراً سر جھکائے تعظیم کو کھڑا ہو جاتا ہے — یہ عمل صالح کی تعلیم ہے جو ہمیں سکھائی — یہ عمل صالح ہے جو ہمیں سکھا جا رہا ہے — کہ دیکھو اسے عمل صالح کہتے ہیں —

تین سو پانچ ماہوں پر نہ اٹھنا — تیسرے روزوں پر نہ اٹھنا — تیسرے قرآن پڑھنے پہ نہ اٹھنا — وارث بھی نہ بڑھانے پہ نہ اٹھنا — دیکھو یہ عمل صالح بھی سیکھو — یہ دو سال کی بچی ہے — دھنائی سال کی بچی ہے یہ آ رہی ہے اور دیکھو — اے — اے — یہ دیکھو —

میں رسولؐ اس کی تعظیم کو کھڑا ہوں — یہ دیکھتے رہنا — کہیں ایسا نہیں ہوا — گھر میں — صحن میں — کمرے میں — باورچی خانے میں کہیں ایسا نہیں ہوا کہ رسولؐ ایسے جھٹھے ہوں — بیٹی آئی ہو اور فوراً تعظیم کو نہ اٹھے ہوں — اسی وقت تعظیم کو کھڑے ہو جاتے تھے — اور یہ رسولؐ اٹھتے تھے تعظیم کو تو جو پاس بیٹھی ہیں — اہمات المؤمنین یا اصحاب — ان کی مجال ہے جو وہ نہ اٹھتے ہوں — وہ یقیناً اٹھتے ہوں گے — یہ عمل صالح ہے — یہ میری کلاس ہے رسولؐ کے مکتب کی — کہ عمل صالح بھی ہونا چاہیے جو رسولؐ نے بنایا ہے — کہ دیکھو — اے — اے — یہ عمل صالح ہے —

اور جب عمل صالح کا امتحان بھی پاس کر لو گے جب اس امتحان میں تم پورے اثر جاؤ گے تو پھر تمہاری انگی کلاس آئے گی تو اوصو بالحق — کہ اب حق کا دامن بھی پکڑو — اب یہ کلاس آئے گی — سمجھنا حضور — اور جب حق کی کلاس میں پاس ہو جاؤ گے تو پھر تو اوصو بالصبر — وال بات آئے گی — یعنی صبر کی — بس یہ آخری کلاس ہے — تو اوصو بالصبر جو ہے — یہ بالکل آخری کلاس ہے — سمجھ میں

آگئی ناساجبان کے۔ بس بعضی جوبات تھی نہ آن کی دہ بہیں ختم ہو گئی۔ یہ مدرسے کا تعارف
 تھا آپ سے۔ یہ جو مجالس ہیں یہ آپ حفلات کو معلوم ہے کہ یہ امام زین العابدین علیہ السلام
 والسلام کے ذکر میں ہیں یہ مجلسیں۔ یہ سب سے بڑا عزا دار کر بلا کی عزا داری کے سلسلہ
 میں یہ مجلسیں ہیں اور بعض لفظوں میں اور ناموں میں اللہ نے یہ تاثیر رکھی ہے کہ ان ناموں سے
 ایک خاص اثر پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً اگر رستم کا نام لو تو خود بخود تصور آتا ہے عدالت
 کا۔ اور زین العابدین۔ کچھ نہ کہو بالکل، خود بخود تصور آتا ہے انتہائی منظر
 کا۔ دنیا کے سب بڑے مظلوم اعظم کی یادگار میں یہ مجلسیں ہیں۔ اور میں بلا خوف
 تردید پوری ذمہ داری سے یہ کہتا ہوں کہ تواصو بالصبر کے امتحان میں جتنا یہ انسان
 کامل کامیاب ہوا۔ جسے زین العابدین کہتے ہیں نہ اس سے پہلے کوئی ہوسکا نہ
 بعد میں۔ تواصو بالصبر کے امتحان میں یاد رکھو کہ زین العابدین کا ذکر نامکمل ہے
 ۔ جس طرح خدا کا کلمہ لا الہ الا اللہ نامکمل ہے، بغیر محمد رسول اللہ کے، اسی
 طرح ذکر زین العابدین نامکمل ہے جب تک اس کی شریک صبر زینب کا ذکر نہ ہو
 ۔۔۔ سمجھے۔۔۔ زینب، شریک حسین نہیں۔ شریک زین العابدین ہے۔
 کر بلا کے معرکے کی ہیرو ہے۔ مرکزی کردار ہیں یہ دونوں چھو بھی جھینجیے۔
 اور حسین کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ حسین کے زمانے میں تو پردے میں بیٹھی
 تھی۔ حسین میدان میں ٹڑ رہے تھے۔ شریک زندگی ہے، شریک عمل
 ہے تو زین العابدین کی۔ یہ امام زین العابدین کی شریک عمل ہے۔ حسین
 کی شریک کار نہیں۔ اور جب تک حسین کا سر نیزے پہ نہیں آیا، زینب کا قدم
 خیمے سے باہر نہیں نکلا۔ بالکل آیا ہی نہیں۔ حسین نے کہا، جی تھا کہ
 بہن میری ایک بات یاد رکھنا۔ بس گھر سے باہر نہ آنا۔ کہ حسین نہ آؤنگی
 نہ آؤنگی۔ کہہ جو دیا مجھ سے کہ نہیں آؤں گی۔ اگر اس حکم کے بعد زینب

گھر سے باہر ایک تدم بھی رکھ دیتی تو آج یہ بات مشہور ہوتی کہ جناب غورنوں
 کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ وہ باوجود سمجھانے کے گھر سے نکل آتی ہیں، اسی لئے زینب
 نکل آئی۔ نہ بالکل نہیں۔ اکبرؑ شہید ہو یا عونؑ و محمدؑ۔ چاہے حسینؑ خود
 کیوں نہ شہید ہوں۔ کہہ جو گئے ہیں، گھر سے باہر نہیں آنا۔ بس نہیں آنا
 زینبؑ تو شریکِ عمل ہے امام زین العابدین علیہ السلام کی۔ سمجھے حضور۔ جس
 وقت حسینؑ اپنا کام ختم کر چکے تو اس نے آکر جگایا ہے امام زین العابدین کو۔
 بیٹا اٹھو۔ تم غور نہیں کرتے۔ قُم یا بُدیتا۔ بیٹا اٹھو۔ پتہ نہیں
 کتنی دفعہ پکارا ہے بیٹا بیٹا کہہ کے۔ بیٹا اٹھو۔ امام نے آنکھ نہیں کھولی
 بیٹا کہہ کے پکارتی رہیں۔ سمجھ گئیں۔ ایک دم پوش میں آ کے کہتی ہیں۔
 قُم یا امام زماننا۔ میرے زمانے کے عتیٰ اٹھ میری مدد کر۔ لے
 امام زمانہ اٹھ۔ اب بیٹا نہیں کہا۔ اب امام کہا۔ امام کہہ کے جو پکارا
 فوراً اٹھ کے بیٹھ گئے۔ اب یہ ذمہ داری ہے۔ کہ امان کیا کہہ رہی ہو؟
 کہ بیٹا تو اس وقت زلمے کا امام ہے۔ اس فقرے سے ہی سمجھ گئے کہ
 کیا ہو گیا۔ بیٹھ گئے اٹھ کے۔ ذرا خیال نہیں کہ بیماری ہے یا تکلیف ہے
 اٹھ کے بیٹھ گئے۔ اچھا امان! میں امام ہوں؟ کہ ہاں بیٹا تو امام ہے
 امام زمانہ ہے اور میں تیری بھونچی زینب ہوں۔ امان میں نے پہچان لیا۔
 کہ بیٹا تو مجھے پہچانتا ہی ہے۔ مزدورت تو مجھے ہے تجھے پہچاننے کی۔
 درنہ میں جاہلیت کی موت سراؤں گی۔ بیٹا اگر تجھے نہ پہچانا۔ تجھے ضرور پہچاننا
 ہے۔ تو زلمے کا امام ہے۔ امان تم سے بہتر معرفت امام کسی کو نہیں
 بیٹا یہ تو بات ہو چکی۔ اب میں تجھ سے بحیثیتِ امام کے یہ حکم لینا چاہتی ہوں کہ جن
 خیروں سے حسینؑ کہہ گئے تھے باہر نہ آنا وہ سب جل گئے۔ جن خیروں سے باہر نہ

آنے کو حسین نے منع کیا تھا وہ خیمے کچھ جل گئے کچھ جل رہے ہیں۔ اب میرے ساتھ تیمم پتے ہیں۔ بیوہ عورتیں ہیں اور بیٹیا یہ بھی سنی لے کہ میں بڑی شرمندہ ہو رہی ہوں ان عورتوں سے۔ کسی کا شوہر مر گیا ہے۔ کسی کا بھائی مر گیا ہے۔ یہ غیر خاندانوں کی ہیں میں ان سے شرمندہ ہوں۔ ہماری حمایت میں یہ سب تباہ ہو گئیں۔ میں ان میں سے ایک ایک کو سمجھا رہی ہوں۔ بی بیوہ، تمہارا بڑا احسان ہے۔ اور بیٹا سب سے زیادہ شرم مجھے اپنی بھرجائیوں سے آتی ہے۔ بڑے بڑے گھرنے کی خواتین ہیں۔ ہمارے گھر میں ان کی شادیاں ہوئی تھیں۔ میں ان کے سامنے بڑی شرمندہ ہو رہی ہوں۔ وہ کیا سوچتی ہوں گی کہ فاطمہ کی بہو بن کے یہی حال ہونا تھا۔ بیٹا میں بڑی مشکل میں پھنس گئی ہوں تو زمانے کا امام ہے۔ مشکل کنٹا ہے۔ میں تجھ سے حکم لینا چاہتی ہوں۔ دل بڑا بڑا گھبرا گیا ہے۔ آخر خاتون ہوں۔ میرا دل بڑا گھبرا گیا ہے۔ تو امام زمانہ ہے۔ حکم دے کہ ان سب عورتوں، بچوں کو ساتھ لے کر تیرے حکم کی دیر ہے ان ہی خیموں میں جل کے مر جاؤں۔ میں ذرا دریغ نہیں کہ دنگی اس بات سے۔ حکم دے جل کے مر جاؤں؟ کیا کروں بنا؟ میں آپ کو کیا بتاؤں اس وقت امام زین العابدین یہ کیا گذر گئی۔ اس کا اندازہ دنیا کا کوئی انسان کر سکتا ہی نہیں، جب آپ نے چھو بھی کہ حکم دیا ہے۔ علیکتا بالصحر۔ اماں بحقیقت امام میں یہ حکم دیتا ہوں کہ ان سب کو لے کے خیموں سے باہر آ جاؤ۔ کوئی بچہ جل نہ جائے۔ باہر نکل جاؤ۔ اس حکم کے دیتے وقت جو گذری ہے امام زین العابدین پر اس کا اندازہ کوئی کر سکتا ہی نہیں۔ کہ کیا گذری اس وقت۔ اور نکل گئے۔ اور میرے محترم سامعین یہ سب ہماری باتیں ہیں، ہم جو آپ سے کہہ دیتے ہیں کہ انہیں جلا ہو خیمہ کسی نے دے دیا تھا۔ یہ غلط ہے۔ جھوٹ ہے۔ اُن کے خیمے کا ایک ایک

ذراہ جل گیا تھا ————— جب نکل گئیں نا باہر ————— جب باہر آئیں —————

آکے ریت کے ٹیلوں پر بیٹھ گئیں ————— اب ان کے سامنے کیا تھا ————— ان مسنورات کے ایک طرف جلتے ہوئے خیموں کی راگھ اور ایک طرف بے سر کے لاشے ————— کبھی ادھر دیکھ رہی تھیں، کبھی اُدھر دیکھ رہی تھیں اور اٹھارہ بھائیوں کی بہن بیٹھی ہوئی یہ سوچ رہی تھی کہ کیا ہو گیا ————— کیا ہو گیا؟ یہ سوچ رہی تھی اٹھارہ بھائیوں کی بہن اور رات ہو گئی ————— اور آپ یقین فرمائیں کہ وہ بچے جو تائب عاشور ساری رات روتے رہے ————— آج نہیں روتے، ایک پتہ نہیں روتا ————— سب ماؤں کی گود میں چُپ ————— یادِ ن کے حادثہ سے ہم گئے ————— اتنے ڈر گئے بچے کہ سہمے ہوئے تھے ————— یا اس لئے نہیں روتے کہ ہم رو کے کیا کر سکتے ہیں ————— کرن مدد کو آنے گا؟ کسے پکاریں ہم ————— سب بچے سہمے ہوئے ہیں ————— بالکل سہمے ہوئے ہیں ————— اب ٹیلوں کی آڑ میں جو مسنورات بیٹھی ہیں ————— چار کسی ٹیلے کی آڑ میں، دس کسی ٹیلے کی آڑ میں ————— جہاں جہاں کسی کو جگہ ملتی کئی وہ بیٹھی گئی بے چاری ————— بس رہے ہونا بھئی ————— اور جب رات تو امام زمانہ اپنی جگہ سے اُٹھے ————— حضرت امام زین العابدین —————

ایک ایک ٹیلے کے قریب گئے جہاں دو خواتین بیٹھی تھیں ————— پوچھا جا کے کہ کون ہے؟ کہ فلاں صحابی کی بیوہ ہے ————— فلاں شہید ہونے والے کی بہن ہے ————— فلاں شہید ہونے والے کی ماں ہے ————— اس کے قریب کھڑے ہو کے کہتے ————— بہن تیرے مرنے والے کا بڑا افسوس ہے ————— میں تیرا احسان مند ہوں ————— میں تیرا شکر گزار ہوں ————— اور جب ایک ایک بابی کو امام نے پُرسا دے دیا تو یہ سب اکٹھی ہوئیں امام کے روبرو اور سب نے بیک وقت بیک زبان ہو کے کہا ————— اسی کو بہن کہتے ہیں جو مل کر گریہ کیا جائے ————— تو سب نے یک زبان ہو کے کہا کہ ————— زین العابدین ————— تیرے سہرے گھوڑے ابرہ جانے کا بڑا افسوس ہے ————— تو آپ نے دعا مانگی —————

اُن سب کا تشکر یہ ادا کیا۔ اور سجدے میں سر رکھ دیا اور سبحان ربی الاعلیٰ کی آواز
 بکرا کی فضا میں گونجی اور صبح تک گونجتی رہی۔ جب صبح صادق طلوع ہوئی تو فوجِ بزیغ
 خود اس بات کی حامل ہے کہ ہم سب نے اپنے کان سے سنا کہ کوئی غیبی آواز آرہی تھی۔
 ارفع راسک انت ستید الساجدین۔ اس عالم میں سجدہ کرنے والے تو ہمارے
 سجدہ کرنے والوں کا بادشاہ ہے۔۔۔ بس اب تو سر اٹھائے۔ سمجھے۔ اور یہ
 بات اور آپ کو بتاتا چلوں کہ رات کے دس بجے جب پُرسہ داری ہو چکی۔ پتھے ہیں
 ہوتے بیٹھے تھے، امام نے فرمایا انا۔ اب ان بچوں کے لئے خوراک کا بندوبست بھی
 ہونا چاہیے۔ کوئی کھانے پینے کی چیز۔ سمجھے حضور۔ حضور نے کہا۔
 بی بی نے دیکھا۔ اپنے ہی جلے ہوئے خیموں میں ایک مشک پڑ گئی تھی۔ بی بی خود
 وہ مشک لے کر فرات پر گئیں اور دو دن سے وہ مشک بھر کے لائیں۔ اور جب مشک لا
 رہی تھیں بھر کے نوکھ رہی تھیں۔ جاسس یہ نہ کہنا۔ تم سب نے مل کر جو کام کئے ہیں
 وہ سب میں کر رہی ہوں۔ میں اب پانی لے جا رہی ہوں۔ ان ننھے بچوں کیلئے
 لے کے آئیں۔ ان بچوں نے پانی پیا۔ اس وقت سے امام زین العابدین کی
 زندگی اور زینب کی زندگی شروع ہو گئی۔ ان دونوں کا تذکرہ جب تک ساتھ
 ساتھ نہ ہو۔ جب تک ذکر مکمل ہوتا ہی نہیں۔ انشاء اللہ العزیز بشرط خیرت بقطر
 زندگی، اگر میں زندہ رہا تو آپ کو ان دونوں کا مفصل ذکر سناؤں گا۔ اور اس
 تذکرے کا انعام میں نے ابھی سے لینا ہے۔ امام زین العابدین سے۔ ان سے انعام
 لینا ہے۔ اور آپ سے یہ کہنا ہے کہ آپ میری ان سے سفارش کر دیں۔ کچھ بات
 ہیں۔ مومنین میں۔ مولا زین العابدین چالیس سال ہو گئے تیرے دروازے
 پر صدا لگاتے ہوئے کوئی اور دروازہ نہیں دیکھا تیرے دروازہ کے بغیر۔ دنیا تو گذر
 گئی ہے اور گذر جائے گی۔ عاقبت میں تو ہی سہا رہے اور انجام تمہارے

ہے یہ تم دونوں پھوپھی بھتیجیوں کے ہاتھ ہے میں نے پنجاب ابلکہ مغربی
 پاکستان کے گاؤں گاؤں میں زینب کا ذکر پہنچا دیا ہے لوگ زینب سے آشنا
 نہیں تھے لوگوں کو زینب کا پتہ نہیں تھا آج لوگوں کو پتہ چل گیا کہ زینب کے
 ذکر کے بغیر یہ ذکر نامکمل ہے باقی انشاء اللہ کل بشرط زندگی آج اتنی
 ہی بات اللہ تمہیں سلامت رکھے تمہیں اس ذکر کی برکات سے نوازے
 بحق محمد وآل محمد آمین

— ۲ اپریل ۱۹۶۰ کوٹ کرم شاہ (بیر مل) —



اضافہ شکرہ

فضائل
مصائب

اضافہ شکرہ
دربار شام

باطل کو کھنکھانے کے لئے شام کی جانب
زینبؓ نہیں شبیرؓ کی تحریک چلی ہے

افسوس
میں نے

جو کہ میں بوجہ اپنی بیماری اور کمزوری کے مختصر وقت میں بڑھتا ہوں۔ زیادہ لمبی تقریر اب مجھ سے نہیں ہوتی۔ کسی زمانے میں دو اڑھائی گھنٹے پڑھ کے مجھے پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ پڑھا بھی ہے یا نہیں۔ اب دس پندرہ منٹ کے بعد تھک جاتا ہوں۔ تو اگر ایسا مضمون شروع کر دوں جو تھوڑے وقت میں پورا نہ ہو سکے تو پھر سامعین بھی بے لطف و بے حظ ہوتے ہیں اور مجھے بھی کوئی لطف نہیں آتا۔ اب میں کوشش کرتا ہوں اس بات کی کہ کوئی ایسی بات کہی جائے جو تھوڑے وقت میں پوری ہو سکے۔ تو بزرگانِ من۔ ایک بڑا پرانا مضمون تھا جو میں کبھی پڑھا کرتا تھا۔۔ ابھی جب میں یہاں آیا تو ڈاکر صاحب پڑھ رہے تھے۔ مجھے وہ بات یاد آگئی۔ پہلے وہ میرے ذہن سے نکل چکی تھی۔ وہ ابھی مجھے یاد آگئی ہے۔ وہی میں شروع کر رہا ہوں۔ وہ مضمون ایسا ہے اسے جہاں ختم کر دو وہیں ختم ہے۔ جہاں شروع کر دو وہیں شروع ہے۔ وہ اس طرح کا ہے۔ آپ میری بات کو غور سے سنیں۔ اور میں آپ کو وہ سناتا ہوں۔

اس مضمون کی جو میں شروع کر رہا ہوں۔ جو تمہید ہے وہ شروع ہوتی ہے انسان سے۔ کہ انسان کے اندر انسان کے پیدا کر نیوالے نے کتنی طاقتیں، قوتیں اور صلاحیتیں رکھی ہیں۔ گویا اس چیز سے شروع ہوتا ہے یہ مضمون کہ انسان میں خود کتنی صلاحیتیں، کتنی طاقتیں، کتنی قوتیں اور کتنے کام کرنے کے جذبے، خود انسان کے اندر، انسان کے خالق نے رکھے ہیں۔ اور پڑھے لکھے حضرات میں یہاں ایک لفظ کہہ کے آگے بڑھتا ہوں کہ انسان کے اندر ولایت کہ وہ صلاحیتیں اور طاقتیں جن کا انسان کو خود علم نہیں کہ مجھ میں کتنی طاقتیں ہیں، ان ساری انسانی طاقتوں کے

یہ شکرِ نعت میں مل رہا تھا۔ وہ سید الساجدین تھا اور زین العابدین بھی تھا جو اللہ نے شکرِ نعت میں عطا فرمایا۔ اب جب یہ نعت مل گئی سید الساجدین زین العابدین والی نور رسول نے کہا لاؤ وہ بھی شکر یہ ادا کر دیں۔ اس کا شکر یہ ادا کیا تو اللہ نے کہا محمد سنتے بھی ہو، اس شکر کے میں تمہیں محمد ہی نہ دے دیں؟ محمد کے شکر کے میں محمد مل گیا جس کو آپ محمد باقر کہتے ہیں۔ مجھے حضور۔ اس نے کہا۔ یا اللہ تیرا شکر۔ اس نے کہا اچھا۔ یہ یگانہ صدق سے شکر یہ ہے، تمہیں صادق نہ دے دیں۔ اللہ نے حضرت صادق دے دیا۔ شکر یہ ملتے جا رہے ہیں۔ رسول کا شکر چلتا رہا، اللہ کا اضافہ چلتا رہا۔ چلتے چلتے جب گیارہویں پہنچے۔ اب تو اللہ کہ اپنے خزانے کا جائزہ لینا پڑا۔ یہ تو شکر ختم ہی نہیں ہوتا۔ یہ تو مجھے اضافہ کرنا پڑے گا۔ کہا محمد! سنتے بھی ہو۔ اب بالقطع طے کر لو۔ بار بار نہیں۔ گیارہویں تک تو ہم دیتے رہے۔ آج سے بالقطع سودا کر لو۔ کر کیا؟ تمہارا شکر یہ دائم رہے ہمارا اضافہ "قائم" رہے۔ آج یہ چیز جو جلے۔ ہمارا عطیہ قائم ہو اور تمہارا شکر یہ دائم ہو۔ جاؤ تمہیں یہ چیز عطا کرتے ہیں۔ تو جہے ناما جان؟ بہت اچھا یا اللہ دے۔ اب ایسا عطیہ دوں گا، جو قیامت تک قائم رہے گا۔ مجھے نامحسور۔ میرے محرم سامعین۔ میں شور کوٹ پھر کبھی آؤں گا یا نہیں۔ ویسے ہی زندگی کا بھروسہ نہیں اور ہم تو اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں بھروسہ رہا ہی نہیں لہذا کیوں نہ چلتے دقت آپ کو یہ بات کہتا جاؤں کہ خدا کا شکر ادا کرو۔ اللہ کا احسان مانو۔ مانو گے؟ کہ خدا نے تمہیں قائم جیسا امام دیا۔ ماشا اللہ چشم بد دور۔ سو منین خدا تمہیں مبارک کرے کہ تم بے امام نہیں ہو۔ اللہ نے تمہیں امام عطا فرمایا ہے۔ تمہارا امام قائم جیسا ہے۔ ہے نا؟ اللہ وحدہ لا شریک ہے۔ محمد، اللہ کا رسول ہے۔ تھا۔ تو نہیں۔ اور بارہواں امام؟ ہمارا امام ہے۔ تھا۔ تو نہیں۔ ہمارا امام ہے۔

عمل اور موقع کے مطابق عمل میں لانے کا نام اسلام ہے۔ سمجھے۔ اسلام انسان کی کسی طاقت کو معطل نہیں کرتا۔ بلکہ انسان کی طاقتوں کو صحیح طریقے سے استعمال میں لانے کا نام اسلام ہے۔ اسلام، طاقتوں کے تعطل کا نام نہیں۔ وہ طاقتیں جو انسان کے اندر ہیں انہیں صحیح طریقے سے استعمال کرنے کا نام ہے اسلام۔ گھبرا تو نہیں ہے۔ یہ ذرا خشک ہو گیا ہے نامعلوم۔ آپ گھبرا نہیں۔ تو میرے محترم سامعین ایک بات اور بھی کرنا چاہوں آپ سے۔ یہ علم لغت کی بات ہے۔ زبان کی۔ آپ میری پہلی بات سن لی ہے جو اب تک میں نے کہی ہے۔ انسان کے اندر بے شمار طاقتیں اور قوتیں انسان کے خالق نے ودیعت کر دی ہیں۔ اتنی طاقتیں ہیں انسان میں کہ انسان ان طاقتوں کو گن ہی نہیں سکتا۔ اور ان تمام طاقتوں کو جو خالق نے انسان میں رکھی ہیں صحیح طور پر استعمال میں لانے کا نام اسلام ہے۔ توجہ فرمائی نا آپ نے۔ کسی طاقت کو معطل کرنا اسلام نہیں۔ ان طاقتوں کو صحیح استعمال کرنے کا نام اسلام ہے۔ اسے میں علم لغت یعنی زبان کے اعتبار سے ایک بات آپ سے عرض کرتا چاہوں کہ عربی زبان میں طاقت کے کمال کو کہتے ہیں ملکہ۔ سنا ہے فلاں شخص کو اس کام میں ملکہ حاصل ہے۔ ملکہ کے معنی یہ ہیں کہ پوری طاقت حاصل ہے۔ تو عربی زبان میں ملکہ کا لفظ طاقت کے عروج کو کہتے ہیں۔ خوب۔ میری بات پر غور کیا آپ نے۔ اسی ملکہ کو آپ مد نظر رکھتے ہوئے یہ سوچیں کہ جب اللہ نے انسان کو پیدا کیا تو کل ملائکہ کو حکم دیا کہ اس کے تابع ہو جاؤ۔ دنیا کی جتنی قوتیں اور نورسز ستی ہیں ان سب کو حکم ہوا کہ تم انسان کے تابع ہو جاؤ۔ تمام طاقتیں ان کے تابع ہو گئیں۔ صرف ایک نفس انسانی کی طاقت تھی جو شیطان بن کے باغی ہو گئی۔ سمجھے نا حضور!۔ اور جو اس طاقت پر بھی غائب ہو جائے۔ اپنے نفس انسانی کی طاقت پر۔ باقی طاقتوں پر غالب ہونے والا غالب کہلاتا ہے اور جو اپنے نفس

کی طاقت پر غالب ہو جائے وہ غالب علیٰ کل غالب کہلاتا ہے۔ جو اپنے اوپر بھی غالب
 ہو جائے۔ بہر نفع تمام طاقتوں کا منبع و مرکز ہے یہ انسان۔ ان طاقتوں کو صحیح
 استعمال کرنا یہ ہے اسلام۔

اس تمہید کے بعد میں رُخ بدل کے آپ سے آسان طریقے سے بات کروں۔ جہاں
 اور ہزاروں طاقتیں انسان میں ہیں۔ وہاں یہ بھی ایک طاقت ہے انسان میں۔ وہ
 کسی حد پر جا کر رُکنا پسند نہیں کرتا۔ یہ بھی ایک طاقت ہے۔ کسی حد پر پہنچ کر بھی
 وہ رُکنا پسند نہیں کرتا۔ یہ بھی انسان میں ایک طاقت ہے۔ سمجھے نا حضور۔ یہ نہ
 سمجھیں کہ انسان چاند پر جا کر رُک جائے گا۔ وہاں سے کوشش کرے گا کہیں اور
 جانے کی۔ یہ کسی حد پر بھی رُکنا پسند نہ کرنا۔ کسی بھی حد پر جا کر نہ رُکنا یہ بھی انسان کی
 ایک طاقت ہے جو انسان کے اندر موجود ہے۔ توجہ ہے نا میرے محترم سامعین۔ مثال کے
 طور پر جو کبھی میں آپ کو سمجھایا کرتا تھا۔ اور اب سمجھاتا ہوں۔ ایک بچہ مجھے کہتا ہے
 زیدی صاحب مجھے نوکر کرادو۔ کتسی نوکر سی چاہیئے بیٹا۔ کہ یہی دس بیس پچاس روپے
 کی ملی جائے گزارہ ہو جائے گا۔ آپ نے اسے سو روپے کی نوکر سی دلا دی۔ اس سے
 پوچھو مہاں بس۔ جی ہاں۔ آں۔ سو سو روپے ہو جائیں۔ اچھا اس کے
 ڈیڑھ سو ہو گئے۔ کہ بھئی بس۔ کہ۔۔۔ آں۔۔۔ جناب دو سو روپے ہو جائیں۔ اس کے
 آپ نے ہزار روپے ماہوار کر کے دیئے۔ کہ بس؟ کہ آں۔۔۔ آں۔۔۔ دو ہزار۔۔۔ کیا
 مجال جو کسی جگہ رُکنا ہو انسان۔ یہ طاقت انسان میں ہے یا نہیں بھئی۔ ہے۔ سمجھ میں
 آ رہی ہے نا بات۔ سنا بات۔ تو میرے محترم سامعین اسے تم پچاس ہزار روپے ماہوار
 دے دو۔ کہ بس؟ کہ ابھی کچھ اور۔ اسے آپ ایک صلح دے دیں سالم، کہ بس۔؟
 ابھی اور۔ کیا مجال جو اس کی ابھی اور ختم ہو جائے۔ یہ انسان میں طاقت ہے یا نہیں۔
 اگر آپ نے اس چیز کو ذہن میں رکھا۔ بڑا اچھا انسان ہے تقریر کا۔ اگر ذہن میں

رہا تو۔ کہ ابھی اور، کی طاقت ہر انسان میں موجود ہے۔ آپ، مجھ میں، سب میں یہ ہے۔ ایں... ایں... ابھی اور... کہیں بھی پہنچ کے ایں ایں ابھی اور۔ اکثر میں یہ کہا کرتا تھا اور اب بھی یہ کہتا ہوں کہ اس ابھی اور جذبے نے انسان کو بڑھا بڑھا کے خدا بنا دیا۔ انسان جو خدا بن گیا نام، یہ ابھی اور میں تھا۔ سردار بنا۔ ابھی اور بڑا سردار بنا، ابھی اور۔ بادشاہ بنا، ابھی اور۔ شہنشاہ بنا، ابھی اور۔ ملک آگئے، ابھی اور۔ ایں ایں خدا بن گیا اب خدا بن کے اس نے بس نہیں کی۔ یہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا بنوں کہ موت آگئی۔ اگر موت نہ آئی تو یہ کچھ اور بنتا۔ یہ موت نے آکے روک دیا۔ ورنہ خدا بن کے سوچ رہا تھا کہ ابھی وہ اور کیا بنے۔ آپ یقین فرمائیں یہ خدا بننے والے پاگلی نہیں تھے۔ احمق نہیں تھے۔ پتہ تھا انہیں کہ خدا نہیں ہیں۔ یہ ان میں ابھی اور کا جذبہ تھا۔ جہاں خدا بنوارا تھا۔ ورنہ وہ کوئی احمق یا پاگل مقہورے تھے۔ جانتے تھے کہ ہم خدا نہیں ہیں۔ مگر اس ابھی اور، والے جذبے نے بنا دیا۔ اور ایک چیز نے اس کے سمندر نازک پر ہمیں کر دی کہ پاس بیٹھنے والے جو تھے، انہوں نے کہا کہ حضور بجا۔ اس نے ان کا دماغ خراب کر دیا۔ دو چیزیں انسان کا دماغ خراب کرتی ہیں۔ ایک اس کا جذبہ "ابھی اور ایک پاس بیٹھنے والوں کا کہنا کہ حضور باطل درست ہے۔ حضور باطل بجا ہے۔ وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ گویا اب بے جا ہمارے پاس ہے ہی نہیں۔ جو بک دیا وہ بجا ہے۔ یہ پاس بیٹھنے والے بنا دیتے ہیں۔ بیچارے نمروڈ نے، بیچارے فرعون نے ہزاروں دفعہ کہا کہ بابا ہم نہیں بنتے خدا، ہم خدا نہیں ہیں۔ مگر پاس بیٹھنے والوں نے کہا کہ نہیں تمہیں بننا پڑے گا۔ بن گئے۔ بنا جو دیا۔ ان میں اور کا جذبہ تو تھا ہی۔ لوگوں نے بنا دیا۔ بن گئے۔ شروع شروع میں تو انکار کرتے تھے۔ پھر بن گئے۔ یہ انسان میں "ابھی اور" کا جذبہ موجود ہے۔ آپ میں ہے نا ابھی اور؟ آپ لوگوں میں ابھی اور کا جذبہ ہے۔؟

کتاب ہے یہی۔ باتیوں کا مجھے پتہ نہیں۔ ابھی اور کا جذبہ بھی پورا ہوتا رہے اور دنیا میں فدا بھی نہ ہو۔ اس کا طریقہ اللہ نے یہ بتایا کہ سنو یہی تم سے وعده کرنا ہوں، اگر تمہیں میرے وعدے پر یقین ہو۔ پتہ نہیں اللہ کے وعدے پر لوگوں کو یقین ہے کہ نہیں۔ یہ مجھے پتہ نہیں۔ کیوں بھی آپ کو یقین ہے؟ ہیں؟ اللہ کے وعدے پر یقین ہے؟ پتہ نہیں ہے یا نہیں۔ اپنے دل کی گہرائیوں میں سوچ کے مجھے جواب دو۔ اللہ کے وعدے پر یقین ہے؟ ہیں؟ ویسے ہی ناکہ دینا سچ سچ بتانا۔ ہے یا یقین اللہ کے وعدے پر۔ یقین ہے تو وہ تم سے وعدہ کرتا ہے اللہ۔ کہ اگر تم ابھی اور کا جذبہ پورا کرنا چاہتے ہو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ۔ لان شکرتم لا یدینکم۔ اگر ایک نعمت کے ملنے پر تم شکر ادا کر دگے میں اللہ تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس میں اور اضافہ کروں گا۔ تمہارے جذبہ ابھی اور کا میرا ذمہ رہا۔ اور چونکہ اضافہ میرے ذمہ ہے، میری عطا لا محدود ہے۔ تمہارا ابھی اور تک، جائیگا میری عطا نہیں تھکے گی۔ میرے ذمہ ڈالو اس بات کو۔ میں تمہیں عطا کروں گا۔ تمہارا اور کا جذبہ میں پورا کروں گا، نعمت کا شکر تم ادا کر دو۔ ابھی اور، میں تمہیں دیتا رہوں گا۔ تو جب سے صاحبان۔ قبلہ بڑے اختصار کے ساتھ چلنا پڑ رہا ہے۔ بات بھی ہو جانے اور میں تھک بھی گیا ہوں۔ اب مثلاً اس نے نعمت دی ہے ہمیں آنکھوں کی۔ اس کا شکر ادا کر دو۔ اس کا شکر یہ نہیں ہے کہ آنکھوں پر ہاتھ پھیرا۔ یا اللہ تیرا شکر ہے۔ یہ لفظوں کے شکر سے اللہ مطمئن نہیں ہوتا۔ شکر کے معنی میں اس کی ہر دی ہوئی طاقت کو اسی طرح استعمال کرو جس طرح وہ چاہتا ہے۔ بس یہ ہے اس کا شکر۔ آنکھوں سے دیکھو۔ لازماً دیکھو۔ ضرور دیکھو۔ انہیں بند نہ کرنا۔ یہ بند کرنا تو کفرانِ نعمت ہے۔ آنکھیں بند کر کے کوئی بیٹھا رہے۔ مگر وہاں دیکھو جہاں وہ چاہتا ہے۔ وہاں مت دیکھو جہاں وہ نہیں چاہتا۔ ابھی آپ نے وعدہ کیا تھا کہ ہمیں اللہ کے وعدے پر یقین ہے۔

آپ اپنی آنکھوں سے وہ تو نہیں دیکھتے جہاں وہ چاہتا ہے کہ نہ دیکھو۔ یہ کفرِ ناستہ ہو جائے گا۔ آپ کے شہر میں نہیں۔ تو یہ تو یہ تو مسلمانوں کی ہستی ہے۔ لاہور جیسے شہروں میں جگہ کے دیکھیں قطاریں لگی ہوئی ہیں دیکھنے کے لئے۔ ٹرک پر ٹریفک رکا ہوا ہے۔ قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ دیکھنے کے لئے۔ قطار کیوں لگی ہوئی ہے، کہ ہم نے ٹکٹ لینا ہے دیکھنے کے لئے۔ یہ معلوم ہو رہا ہے کہ جنتِ کالمٹ تک رہا ہے۔ ٹوٹے پڑ رہے ہیں ایک دوسرے کے اوپر دیکھنے کیسے۔۔۔ سارا دن کا بازار، میں مزدوری کی پانچ روپے کما کے لائے۔ تین روپے کالمٹ لے لیا، ایک روپے کی سگریٹ پی لی۔ وہاں دیکھنے کے لئے۔ آٹھ آنے کا کچھ کھایا وہاں دیکھنے کے لئے۔ تین چار آنے لے کر گھر آئے۔ بیوی بچوں نے کھانے کے لئے مانگا۔ وہاں ہیں نہیں پیسے۔ وہ تو خرچ کر آئے تھے۔ صبح کو بوس نکال لیا زندہ با دمردہ بار برکت نہیں۔ ہائے او کیمنٹ ہو جاؤ۔ اللہ کو معمول جاؤ۔ برکت نہیں رہی۔ برکت کارڈنا رونے والو۔ کبھی اپنی حرکت بھی دیکھی۔ کمانی کے پیسے تو وہاں ضائع کر آئے۔ یہاں یہ کر لیا۔ اللہ نے کب منع کیا ہے دیکھنے کو ضرور دیکھو۔ مگر وہ دیکھو جو وہ چاہتا ہے۔ وہ مت دیکھو جو وہ نہیں چاہتا۔ بزرگانِ من! پیروں سے چلو۔ پیر چلنے کے لئے ہیں ضرور چلو۔ کون کہتا ہے کہ نہ چل۔ ادھر چلو جدھر وہ چلانا چاہتا ہے۔ اگر تم پیروں سے پورا کام لو۔ دوڑو، بھاگو۔ بلندیوں پہ چڑھ جاؤ، پہاڑوں پہ چڑھ جاؤ۔ اگر ہماری مرضی کے خلاف ہو تو ہم کیا کریں۔ چلو ادھر جدھر ہم چلانا چاہتے ہیں۔ سمجھے۔ ہاتھوں سے ضرور کام لو، انہیں معطل نہ کرو۔ یہ خدا کی نعمت ہے۔ اسے باندھو کے رکھنا کفرانِ نعمت ہے۔ ان سے کام لو، ہاتھوں سے۔ یہ تمہارے کام کے لئے پیدا کئے ہیں۔ اللہ نے تمہیں ہاتھ دیئے ہیں انہیں معطل نہ کرو۔ انہیں خراب نہ کرو۔ وہ کام کرو جو اللہ چاہتا

ہے۔ ورنہ یہ زبان بڑی نامراد شے ہے قبلہ۔ سمجھے۔ اس کی بڑی احتیاط رکھنا۔ سارے اعصاب میں سب سے زیادہ خطرناک شے ہے۔ زبان۔ اس لئے اللہ نے اسے حوالات میں بند رکھا۔ دانتوں کا پہرا سانس کھڑا کیا۔ حضور۔ ہونٹوں کے چھانک لگانے۔ دھن کے قتل میں بند کیا۔ کہیں بے موقع گھر سے نہ نکل لائے ورنہ فساد ہوگا۔ یہ گھر کے اندر رہے۔ اگر یہ کہیں گھر سے نکل آئی بے موقع تو جنگ ہوگی فساد ہوگا۔ لڑائی ہوگی۔ جو گھر میں رہنے کے لئے ہے وہ گھر ہی میں ہے تو ٹھیک ہے۔ اللہ یہی چاہتا ہے۔ زبان کی پوری احتیاط رکھنا۔ ورنہ کیا نائد فساد ہوگا خواہ مخواہ کے لئے۔ ہے ناما جان۔ ہمارے یو۔ پی میں عاوارہ تھا۔ ہمارے دیہات میں۔ کہ آدمی کا سر اٹھ کے صبح، آدمی کی زبان سے کہتا ہے ہاتھ جوڑ کے کہ دیکھنا زبان تو لڑبول کے اندر چلی جائے گی میری شامت آئے گی ذرا خیال رکھنا۔ یہ بات ہے حضور۔ یہ اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے زبان اسے ضرور استعمال کر دو ضرور بولو۔ مگر وہ بولو جو وہ چاہتا ہے، وہ مت بولو جو وہ نہیں چاہتا سمجھے۔ تو اللہ کی نعمت کا شکر یہ ہے جو اس کے منشاء کے مطابق اس کی نعمتوں کو استعمال کرے۔ تو جو ہے ناما جان! یہ تو ہو گیا میرا وعظ۔ اگر آپ گھبرائے نہیں تو اب میں اس کا پھر رُخ بدلوں تقریر کا۔ اسے مختصر کرنا بے ساری بات کو۔ یہ آیت جو ہے کہ شکر کر دے تو نعمت میں اضافہ ہوگا یہ کس پر نازل ہوتی ہے۔ یہ آیت مجھ پر، آپ پر، ہم پر نازل ہوئی۔ ہیں۔ اللہ چاہتا تو ہم پر بھی کوئی آیت نازل کر دیتا؟ نہیں، تو قطعاً نہیں۔ اللہ چاہے بھی تو نہیں کر سکتا۔ اللہ ایسی بات چاہتا ہی نہیں جو نہ ہو۔ ہاں اللہ کیوں چاہے ایسی بات جو نہ ہو۔ تو یاد رکھو میرے بزرگو اللہ جیسا تادہ مطلق جس کی قدرت میں کوئی شک نہیں ہم تک پہنچنے کے لئے رسول کو وسیلہ بنانا ہے۔ تو ہم اللہ تک بے وسیلہ کیسے پہنچیں۔ جب اللہ ہم تک بے

دبیلے کے نہ پہنچا تو رسید ہونا عیب کی بات نہیں ہے۔ سچے بن خیر بہ انگ مضمون ہو جائے گا۔ اسے میں چھوڑتا ہوں۔

تو یہ آیت نازل ہوئی رسول پر کہ۔ تم شکر کرو گے تو میں اضافہ کر دوں گا۔ یہ تباؤ اس آیت کی تعمیل رسول نے بھی کیا یا نہیں۔ شکر کیا ہو گا یا نہیں نے۔ ہیں۔ اور شکر کر کے۔ اللہ نے اپنے حسب وعدہ اضافہ کر لوں۔ اللہ کا وعدہ ہے۔ اب چاروں طرف نظر ڈال۔ جتنی نعمیں اللہ نے دی تھیں رسول کو وہ پہلے ہی کا دن اتنی حد کی دے دی تھیں ان میں اضافے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اب رسول سوچیں کہ اس کا شکر کر کے اضافہ کس شے کا کروں۔ میرے پاس جو نعمتیں ہیں وہ پہلے ہی اس حد کی ہیں اس میں اضافہ ہو سکتا ہی نہیں۔ تباؤ بھئی، اللہ نے رسول کو سیادت دی تھی۔ اس سے بڑھیا اور کوئی سیادت ہو سکتی تھی۔ شرافت دی تھی اس سے بڑھیا شرافت ہو سکتی ہے؛ خلق دیا تھا۔ اس سے بڑھ کر کوئی خلق ہو سکتا ہے۔ انسانیت دی تھی اس سے بڑھ کر کوئی انسانیت ہو سکتی ہے۔ سب بڑی نعمت رسالت دی تھی۔ وہ پہلے ہی ایسی دی تھی کہ ختم کر بیٹھا۔ اور ہے ہی نہ تھی اس کے پاس۔ کس چیز کا شکر یہ ادا کرے جو اس میں اضافہ ہو جائے تو جہے اصحابان، جہاں جہاں بیٹھے ہو صاحبان ذوق۔ ایک نعمت تھی رسول کے پاس ایسی کہ جس کا شکر یہ ادا کر کے وہ اس میں اضافہ کر سکتے تھے۔ اضافہ بھی طولی نہیں، عرضی۔ ایک اضافہ ارضی ہوتا ہے ایک طولی۔ طولی تو اضافہ ختم ہو چکا تھا۔ عرضی اضافہ اس میں کر سکتے تھے۔ وہ کیا تھی۔ وہ تھی نعمت عصمت۔ توجہ ہے ناصحابان۔ اللہ نے رسول کو معصوم بنایا تھا یا نہیں۔ نعمت عصمت۔ عصمت جو بے مبرے بھائیو۔ یہ کچھ شکر ہے۔ کلمہ شکر اسے کہتے ہیں جو ہر جگہ کیساں نہ ہو۔ اسے کہتے ہیں کلمہ شکر۔ جس طرح ہے لفظ سفید۔ تو بناؤ یہ میرے کرنے کا کیا رنگ ہے؟ سفید۔ اور یہ جو کر۔ اپنے ہوئے ہیں اس کا رنگ کیا ہے؟۔ سفید کیا دونوں کا رنگ کیا ہے؟۔ حالانکہ دونوں سفید ہیں۔ اور یہ رنگ کیا ہے؟ سفید۔ حالانکہ یہ سب سفید ہیں۔ مگر کہیں زیادہ ہے کہیں کم

ہوا میں گئے سب کے کو سفید۔ اسی طرح عصمت ہے سب معصوم ہیں۔ کہیں زیادہ کہیں کم۔ آدم کی عصمت اور
 ہے عیسیٰ کی عصمت اور ہے محمد کی عصمت اور ہے۔ آپ آدم کی عصمت کا تیسرا محمد کی عصمت پر نہ کریں۔
 وہاں ترک اولیٰ کی گنجائش ہے یہاں نہیں ہے۔ اسے اُردو زبان میں یوں ادا کر دو کہ انبیاء کی عصمت میں اور
 چودہ معصوم کی عصمت میں یہ فرق ہے کہ انبیاء وہی کام کرتے ہیں جو ٹھیک ہو، غلط کام کرتے ہی نہیں۔ وہی کرنے
 ہیں جو ٹھیک ہو۔ پہلے وہ تلاش کرتے ہیں ٹھیک۔ پھر کرتے ہیں۔ اور چودہ معصوم جو کر دیں وہ ٹھیک
 ہوجاتا ہے۔ بس یہ فرق ہے ان کی عصمت میں۔ سمجھے حضور! وہ پہلے ٹھیک تلاش کر کے کرتے ہیں۔
 یہ جو کر دیں وہ ٹھیک ہے۔ جو کہہ دیں وہ ٹھیک ہے۔ جو کر دیں وہ ٹھیک ہے۔ توجہ ہے ناصحاب
 عصمت اللہ نے دی تھی رسول کو۔ اس عصمت کا شکر یہ ادا کرنا تھا رسول کو۔ اس عصمت کا
 شکر یہ ادا کرنا تھا۔ پوری توجہ صحابان شکر یہ زبان سے نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ تیرا شکر ہے شکر یہ کے معنی
 میں نے ابھی بتائے ہیں۔ اس طرح برکتاً بطرح اللہ چاہتا ہے۔ تو رسول نے عصمت کو اس نشان سے برتا کہ دشمن
 سے دشمن بھی مان گیا کہ صادق ہے اور امین ہے۔ یہ عصمت کی نعمت کو برتنا تھا۔ اسی صداقت اور راستہ
 کے جوئے کو عصمت کہتے ہیں۔ اور کیا ہے؟ انفعال میں عصمت ہوتی ہے۔ نول میں عصمت ہوتی
 صادق ہے۔ نول و نعل کی عصمت کو صداقت و امانت کہتے ہیں۔ گویا دنیا مان گئی کہ معصوم ہے۔ ابھی
 رسول نہیں کہا تھا۔ یہ نعمت عصمت کا استعمال تھا یا نہیں تھا۔ توجہ ہے ناصحابان۔ بات کو نہ ٹھکانا
 ۔ مختصر بھوں۔ دیر نہ ہوجائے۔ چالیس سال مسلسل نعمت عصمت کا اس انداز سے شکر یہ ادا کیا
 کہ امانت مان گئی۔ وہ دشمن مان گئے کہ صادق بھی ہے اور امین بھی ہے۔ اتنا شکر یہ جس نے
 ادا کیا ہو عصمت کا۔ اللہ کو یہ وعدہ اس میں اتنا ذکرنا چاہیے یا نہیں۔ عصمت میں۔ اب
 رسول کی عصمت اتنی ہے۔۔۔ طوفاً تو اس میں اتنا نہ ہونہیں سکتا۔ عرضاً ہو سکتا ہے۔ اللہ نے کہا
 سن مجھ میں اپنے اتنا نے کے وعدے کو پورا کرتا ہوں اس طرح۔ تو اپنی عصمت کا شکر یہ ادا کر۔ بس
 اس شکر یہ میں اتنا نے کے طور پر تجھے ایک اور عصمت عطا کرتا ہوں جس کا نام ہے۔ نائلہ۔ گویا
 شہدہ طاہرہ بیٹی جو رسول کو ملی ہے، شکر یہ عصمت کے اتنا نے میں ملی ہے۔ اور

بیٹیوں کی بات اور ہے، اس بیٹی کی بات اور ہے۔ اگر رسول کے تھیں بھی اور بیٹیاں اس جگہ سے میں نہیں پڑتا۔ وہ تھیں یا نہیں تھیں۔ کوئی کہتا ہے چار تھیں۔ میں کہتا ہوں چار سو بیس ہوں چلو۔ جگہ سے کی کیا بات ہے؟ چار کد تھیں۔ مگر شکرۂ عصمت کے اضافے میں جو بیٹی ملی اس کا نام ہے۔ فاطمہ۔ یہ رسول کو شکرۂ عصمت کے اضافے میں ملی ہے۔ اس کا نام ہے فاطمہ۔ توجہ ہے ناصحان۔ اور چونکہ شکرۂ عصمت میں اضافہ ہو کے ملی ہے۔ لہذا اس کی عصمت کی شان اور ہے، محمد کی عصمت کی شان اور ہے۔ آپ کہیں گے کہ عورتوں میں مریم بھی معصومہ تھی۔ وہ تو تھیں مگر ان کی عصمت کسی شکر یہ میں نہیں ملی تھی اُس کو۔ عطیہ الہی تھا اس میں۔ عصمت کی اتنی ہی مقدار تھی کہ بس ایک پشت چل کے عیسیٰ تک ختم ہو گئی۔ اور یہ شکرۂ عصمت میں ملی ہوئی عصمت تھی جو سیدہ کی شکل میں ملی تھی۔ توجہ ہے ناصحان! اور یہ شرف اللہ نے اس شکرۂ عصمت کو عطا کیا تھا کہ قیامت تک اس کی پیدا ہونے والی نسل معصوم تو نہیں ہوگی مگر بے حکومت کے 'شاہ' کہلائے گی۔ بے یا نہیں حضور والا؟ کہلاتی ہے کہ نہیں کہلاتی؟ بغیر سرداری کے سید کہلائے گی۔ دنیا اُن کے پیر چھونا فرجھے گی۔ یہ اس لئے کہ شکرۂ عصمت کا صلہ ہے حضور والا۔ اگر پیسے پاس ہوں گے تو امیر کہلائیں گے، کچھ نہیں ہوگا تو پینپے ہوئے فقیر کہلائیں گے۔ مرچائیں گے تو پیر کہلائیں گے۔ یہ شرف یاد ہے شکرۂ عصمت کا۔ تو سیدہ طاہرہ، عصمت کے شکرۂ کے طور پر ملی ہے۔

میرے محترم سامعین! اب رسول چاہتا ہے کہ اس نعمت کا بھی شکر یہ ادا کروں، تاکہ اللہ اور اضافہ کرے اب فاطمہ کی نعمت کا کس طرح شکر یہ ادا کیا اُس نے۔ بڑے اختصار کے ساتھ بات کرتا ہوں۔ بیٹی چلی آرہی ہے۔ اگر نری بیٹی ہوتی تو بیٹھے رہتے۔ چونکہ اضافہ شکر تھا لہذا اس کے لئے شکر یہ یوں ادا کیا

کہ بیٹی کا تعظیم کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تعظیم کو اٹھنا اس نعمت کا شکر یہ تھا۔
 اللہ نے دیکھا۔ تمہنے اس نعمت کا شکر یہ ادا کیا۔ لاؤ ہم نعمت کا اور اضافہ کر دیں۔
 فاطمہ کی تعظیم کے لئے اٹھے۔ اللہ نے ایک نعمت حسن کی شکل میں دے دی، لو۔
 یہ شکر یہ نعمت کا سلسلہ ہے جو ہم تمہیں ادا کرتے ہیں۔ تو یہ ہے نامہ صاحبان۔ اب
 یہ فاطمہ والے شکر یہ میں اضافہ ہو کر حسن وال نعمت ملی۔ پوری تو تیرے صاحبان۔
 رسول نے کہا لاؤ اس نعمت کا بھی شکر یہ ادا کروں گا۔ اس کا شکر یہ کس طرح ادا کیا۔
 نماز پڑھانے جا رہے تھے عید کی۔ حسن جو نعمت کا شکر یہ ملا تھا اسے بٹھا رکھا تھا
 کندھے پر۔ زلفیں اسے پکڑا رکھی تھیں۔ بوٹیا چلو۔ یہ ہے شکر یہ نعمت
 حسن جو جمع عام میں رسول ادا کر رہے تھے۔ اللہ کو یہ ادا پسند آگئی۔
 محمدؐ نے حسن کی نعمت کا خوب شکر یہ ادا کیا۔ ہم اضافہ کر کے تمہیں حسین دے دیں۔
 اللہ نے اضافہ کر کے حسین دے دیا۔ حسین جو نعمت ملی۔ کہ اس کا بھی شکر یہ ادا
 کروں گا۔ فاطمہ کا شکر یہ معنی تعظیم کر کے۔ حسن کی نعمت کا شکر یہ یہ تھا کہ نماز
 کو جانے وقت کندھے پہ بٹھا لیا۔ نماز کو جاتے ہوئے، نماز میں نہیں۔ نماز کو
 جاتے ہوئے۔ حسین نامی نعمت ملی تو شکر یہ کا انداز بڑھ گیا۔ اسے جاتے ہوئے
 نہیں۔ عین نماز میں، سجھے۔ سجدہ میں یہ شکر یہ ادا ہو رہا تھا۔ اور فقرہ میں کہتا
 ہوں مساجد ذوق۔ یہ آپ کے ذوق پر منحصر ہے۔ حسین کی نعمت کا جو شکر یہ ادا
 کیا۔ وہ عین نماز میں۔ نماز میں بھی رکوع میں نہیں، قیام میں نہیں۔ سجدے میں
 پشت پہ بٹھا لیا حسین کر۔ یہ حسین نامی نعمت کا شکر یہ تھا۔ کہاں شکر یہ ادا
 ہوا؟ سجدہ میں۔ کہاں؟ عبادت میں۔ چونکہ اس شکر یہ میں عبادت اور سجدہ
 دونوں شامل ہیں۔ اب جو اضافہ بھی ہو گا اس میں سجدہ بھی ہو گا اور عبادت بھی ہوگی۔
 لہذا حسین نعمت کے شکر یہ میں جو ملا وہ سید الساجدین بھی تھا اور زین العابدین بھی

خدا ہے، رسول ہے، ہمارا امام ہے۔ اس لئے ہمارا وجود ہے۔ دُنیا نے ہمیں، تمہارا کرنے کی کوشش کی۔ مگر نہیں۔ ہم ہیں۔ اور میں اس لئے کہ ہمارا وارث ہے، ہمارا امام ہے۔ یہ شیعان کا مہینہ ہے حضور۔ اور شیعان کی فرسابت سے یہ دروچار جلے آپ کے کہہ دوں کہ خدا کے فضل سے ہمارا امام ہے۔ بولو ہے۔

اسی امام کے ہونے کی وجہ سے ہم دنیا کے سامنے سینہ تان کے کہتے ہیں کہ دنیا دلو کیا یاد کر دے گے ہم ہیں امامیہ۔ اور کوئی فرقہ دنیا امامیہ نہیں۔ ہم ہیں امامیہ۔ سمجھے۔ امامیہ؟

کے کیا معنی؟ امام دالا۔ جیسے لاہوریا۔ امامیہ، امام دالا۔ سمجھے۔ ہم ہیں امامیہ۔ اور کوئی دنیا میں امامیہ نہیں۔ ہم ہیں امامیہ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بے امام تو کوئی انسان نہیں دنیا کا۔ کس سے آپ پوچھیں کہ بھئی مسلمان! بتانا تیرا امام کون ہے۔؟

وہ بڑے ادب سے کہنے گا۔ ماشاء اللہ چشم بد دُور۔ میرے امام فلاں بزرگ رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ سمجھے۔ کہ بھئی تمہارا امام کون ہے؟ کہ میرے امام فلاں بزرگ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ کوئی اپنے امام کے ساتھ سوائے تھے کے نہیں کہتا۔ یہ ہم ہیں کہ سینہ تان کے کہتے ہیں کہ کوئی ہم سے پوچھ کے دیکھے۔ ہمارا امام ہے۔ دُنیا کے امام تھے۔ ہمارا امام ہے۔ اس لئے ہم امامیہ ہیں۔ دنیا کے لئے امامیہ نہیں کہ ان کے امام تھے۔ ہمارا امام ہے۔ توجہ نا صاحبان۔ اور یہ شکر یہ نعمت رسول میں جلا ہوا ہے۔ اس نے کبھی ختم نہیں ہونا۔ ہمارا امام خدا کے فضل و کرم سے ہے۔ ہمارا امام ہے۔ موجود ہے۔ کہاں ہے؟ غائب۔ ویسے ہر جگہ ہے۔

غائب ہے۔ اس کی غیبت کا فقرہ سن لو اور پھر میں بیٹھ جاؤں گا قبہ۔ حضور امام علی نقی علیہ السلام ہمارے دسویں امام کی خدمت میں کسی نے عرض کیا کہ حضور وہ امام جو آخری امام ہوگا۔ جو دائم و قائم ہوگا، ذرا اس کی صفت تو بیان کریں کہ کس شان کا ہوگا۔ اب جناب لطافت کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ جنہیں ان لطافتوں کا لطف ہے

بیان کرنے والی ہر معیوم کی زبان — امام بیان والا ہو — امام کی فضیلت ہو —
 پھر اس کے اندر کتنی لطافتیں ہونگی — یہ وہی جانتے ہیں — ہم تو اس کا اُردو ترجمہ ہی
 نہیں کر سکتے صحیح — امام علی نقی علیہ السلام نہرتے ہیں — ہمارے امام کے متعلق کہ
 کیا پوچھتے ہر اپنے امام کی شان —

صاحب الدعوة النبویہ و صولت الحیدریہ

تمہارا امام اس طرح دین کی دعوت دیتا ہے جس طرح اس کا جبر رسولؐ دعوت دیتا تھا۔
 و صولت الحیدریہ — اس کا اقبال حیدر کرار جیسا ہے — وعصمت الفاطمیہ،
 اس کی عصمت ناظر کبڑا جیسی ہے — وحلم الحسینیہ، حسن جیسا اس کا علم ہے۔
 و شجاعت الحئیثیہ، اور حسین جیسی اس کی نجات ہے — اور چلتے چلتے — آپ
 صفت بیان کرتے کہتے گیارہویں پہنچے — والہیۃ العسکریہ، حسن عسکری
 جیسی اس کی ہیبت ہے — یہاں آکے اپنے رک کے فرمایا — تم اس کی غیبت پوچھتے
 ہو — والغیبة الالہیہ — اللہ جیسے اس کی غیبت ہے — اب بتاؤ اللہ کسی بڑیرے
 یا غار میں نائب ہے — اللہ کسی مکان میں غائب ہے — اللہ ہر جگہ ہے اور غائب ہے
 — اسی طرح وہ ہمارا امام خدا کے فضل سے ہر جگہ ہے اور غائب ہے — اس مجلس میں بھی موجود
 ہے — بلوہے — اور یہ مجلسیں کیوں کرتے ہو؟ یہ جلسے کیوں کرتے ہو — یہ اتنا
 خوش کیوں کرتے ہو — مولای صاحبان کی اتنی خوشامدیں کیوں کرتے ہو — پڑھنے والوں
 کی اتنی خوشامدیں کیوں کرتے ہو — تمہاری کیا عرض والبتہ ہے ان سے — تمہارا
 کیا کام والبتہ ہے ان سے؟ ہے یا نہیں؟ محض اس لئے کہ تمہیں یقین ہے کہ ہمارا
 امام ہے اور اس کو راضی کرنے کے لئے یہ اس کے دربار لگاتے ہیں — کہ ہمارا مولا ہمارا
 امام ہم سے راضی ہو جائے — ہم یہ تصور کہ کے بیٹھتے ہیں مجلس میں کہ ہمارا امام یہاں بیٹھا
 ہے اور ہم سب اس کی رعایا اس کے سامنے حاضر ہیں کہ مولا تیرے سامنے تیرا دربار لگانے

کے نئے تیری رعا مانے یہ سب کچھ خرچ کیا ہے۔ لوگوں کو بلا یا ہے۔ موزیوں کی خوشامد کی ہے۔ تیرا ذکر سنتے کے لئے۔ ہم تجھے تیرے بزرگوں کا پڑوسہ دیتے ہیں۔ اور تیرے سلسلے تیرے بزرگوں کے فضائل بیان کرتے ہیں۔ اصل سامع مجلس دہی ہے۔ اسی تصور کی دہر سے میں نے عمر بھر کبھی بیٹھ کے نہ پڑھا۔ میرا ایمان ہے کہ وہ میرا مولا موجود ہے۔ اس کے ہوتے میں کرسی پہ بیٹھ جاؤں یہ بڑی گستاخی ہوگی۔ یہ اس کی شان کے خلاف بات ہے حضور۔ اسی لئے کبھی بیٹھ کے نہ پڑھا آج تک۔ اب تو اس قابل ہو گیا ہوں کہ مولا بہار ہوا تو کیا۔ پہلے دونوں پاؤں سے کھڑا ہو کے پڑھتا تھا۔ اب تیری بارگاہ میں ایک پاؤں سے کھڑا ہو کے پڑھتا ہوں۔ تو اسے قبول فرما۔ ہمارا مولا موجود ہے۔ لو بھائیو! گفتگو ختم ہوتی ہے۔ گرمی کا وقت ہے۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا۔ کربلائی معنی میں مجلس تھی۔ ایک عالم بیان کر رہے تھے اور دہکتے تھے کہ جب تم مجلس منعقد کرتے ہو اس میں امام زمان آ کے بیٹھتے ہیں تو تم یہ تصور کر کے پڑھا کر دو کہ تم امام کو سنا رہے ہو اور اس کے طفیل میں یہ صحیح بھی سن رہے۔ اصل میں امام کو سنا رہے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا کہ جب تم امام کے سلسلے معائب پڑھو۔ بے شک حسین کی شہادت پڑھ دینا کوئی پرزوا نہیں۔ امام سن کے روتے ہیں۔ تم علی اکبر کی شہادت پڑھ دینا پرزوا نہیں۔ علی اصغر کی شہادت پڑھ دینا کوئی بات نہیں۔ عباس کی شہادت پڑھ دینا کوئی بات نہیں۔ امام ان باتوں کو سن لیتے ہیں۔ مگر ایک بات کی احتیاط کرنا۔ کیونکہ امام موجود ہوتے ہیں۔ کہ ذرا سوچ سمجھ کے پڑھنا وہ چیز ایسی ہے جسے سن کے امام بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ ہاں امام بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ پھر فرشتے آ کے ان کے پاؤں ملتے ہیں۔ ان کی دادی آ کے ان کے سر کو گود میں لیتی ہیں۔ پھر انہیں غش سے افادہ ہوتا ہے۔ کیا؟ اس کے سامنے زینب کی قید نہ پڑھ دینا۔ کیونکہ اس کے

لئے ناقابل برداشت ہے۔ وہ ہر شہادت کو سن لیتا ہے۔ زینب کی قید برداشت نہیں کرتا۔ یہ چیز اس کے لئے قابل برداشت نہیں ہے۔ یہ چیز ذرا سنبھل کے پڑھنا۔ یہ چیز ذرا سوچ کے پڑھنا۔ بیٹے وہ نہیں برداشت کر سکتا۔ اسے ذرا سوچ کے پڑھنا۔ زینب کی قید بڑی مشکل شے ہے۔ اسے ذرا خوب سنبھل کے پڑھنا۔ اسے پڑھتے وقت ذاکر کو، مولای کو بڑی احتیاط کرنی چاہیے امام سن رہے۔ زینب کی قید پڑھنی ہے۔ امام سن رہے۔ میرے عمر بھائی! امام نے بھی بتایا ہے، ہمیں نوریہ نہیں تھا۔ امام کے دوجھے کہے میں بیٹھا ہوں۔ امام نے بتایا ہے ہمیں۔ ہمیں کیا خبر تھی۔ ہم نوریہ سمجھے ہوئے تھے۔ ایسا کون ظالم ہے جیسا ہوگا دنیا میں جو بے ضرر سپیدائیوں کے ہاتھ باندھ دے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ شاہ صاحب میں خود قید ہوا تھا۔ میں اپنی جگہ کی ہوئی بتاتا ہوں۔ رات کے دو بجے تھے۔ ۲۹ جنوری سردی کی رات تھی۔ تقریباً پانچو آدمی پولیس کا مجھے گرفتار کرنے آیا۔ پانچو آدمی۔ سارے محلے کا محاصرہ تھا۔ چھتلی پہ پولیس تھی۔ ایک ہنگامہ تھا اور سارا خمد سہا تھا۔ خدا جلنے کیا ہوتا ہے؟ کیا بات ہے؟ کیا عقد ہے؟ جب مجھے گرفتار کیا انہوں نے مجھے کار میں بٹھایا۔ تو کسی سپاہی نے ایس۔ پی سے کہا۔ جناب ہتھکڑی لگا لوں۔ تو اس نے کہا خبردار بڈا س بند کرو۔ کیوں شریف آدمی کو پریشان کر رہے ہو۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ میں نے کہا۔ ایس۔ پی صاحب لاش تم کہ بلا میں کھڑے ہوتے۔ بجائے یہاں کے داں کہہ دیتے کیوں شریف آدمیوں کو پریشان کرتے ہو۔ میرے ساتھ یہ ہوا۔ اور جس دن میں گرفتار ہوا تھا بھائی۔ یہ جی میں آپ کو بتا دوں۔ وہ تاریخ وہ تھی جس تاریخ کو اردن کی فوج نے محاصرہ کر کے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو گرفتار کیا تھا۔ بالکل وہی تاریخ تھی جس دن مجھے گرفتار کیا تھا۔ بہر نوح چلے گئے۔ سپیدائیوں کے ہاتھ بندھ گئے

— مجھے یہ خیال رہا، فکر لگا۔ کہ ہاتھ بندھ گئے۔ کہ ماں بے ضرر سیدانہوں کے
 تو ہمارے ذاکر، مولوی، ام سب یہ سوچے رہے کہ ہاتھ پتہ نہیں کس طرح بندھے تھے
 — پتہ نہیں بازو بندھے تھے ہے نا۔

شامیاں بستند بازو زینب و کلثوم را

پتہ نہیں ہاتھ کس طرح بندھے تھے۔ یہ امامؑ نے مرثیہ میں فرمایا۔ امام کا فرمان ہے
 یہ۔ کسی ذاکر کی بات نہیں کہ روایت غلط ہے۔ یہ امامؑ نے فرمایا ہے کہ میرا سلام ہو۔
 میری دادی زینب پر۔ تم سب بھی سلام کر لو۔ ہمارا سب کا، مولانا زینب دادی
 زینب کو سلام۔ ان کا فقرہ ہے یہ۔ ہمارا نہیں۔ میرا سلام ہو میری دادی
 زینب پر جس کے دونوں ہاتھ جس کی گردن سے بندھے ہوئے تھے۔ امامؑ نے
 بتایا تھا ہمیں۔ اس کے ہاتھ۔ یہ بات ہمیں امامؑ نے بتائی کہ اس طرح میری دادی
 کے ہاتھ گردن سے بندھے ہوئے تھے۔ کہ بلا میں ہاتھ بندھ گئے۔ اور جب
 دمشق کے شہر میں پہنچے ہیں۔ زائرین کو، تمام زائر جو جاتے ہیں وہ تقریباً کربلا کے ساتھ
 شام بھی جلتے ہیں۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں جو زری کربلا کی زیارت کر کے چلا آئے اس
 کی زیارت قبول ہی نہیں ہوتی جو زینب کے سلام کو نہ جائے۔ اب تو جاتے ہیں زائر
 وہاں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ جاتے ہیں بی بی کے سلام کے لئے۔ حضور جو
 شہر آج ہے نا دمشق کا، اس زمانہ میں نہیں تھا۔ اس زمانہ میں تو پیرانا شہر تھا
 — جو اب بھی اندر ہے۔ باہر تو نیا شہر ہے۔ اندر کی طرف وہ پیرانا شہر اب بھی
 ہے۔ اس زمانہ کا شہر تھا۔ جس میں بی بی گئی تھی۔ اور یہ فقرہ بھی آپ سے کہہ
 دوں، ساداتِ عظام مجھے معاف کرنا۔ مجھے مجبوراً یہ کہنا پڑھتے ہیں۔ ساری گلیاں
 سڑکیں مہلا کے تقریباً ڈھائی میل بن جاتا ہے۔ اس میں بی بی گردن سے ہاتھ بندھے
 ہوئے پیدل گئیں۔ یہ مجھے کہنا پڑتا ہے ورنہ اس وقت بی بی کے ہاتھ گردن سے بندھے

ہوئے تھے۔ اور جب بی بی کو طاعونی طاقت کے سامنے پیش کیا گیا تو بھی ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور شام کے زائردوں نے دیکھی ہوگی وہ جگہ جہاں جا کے یہ سادات کھڑے کر دیئے گئے۔ وہاں ایک لکڑی کا چوڑھ سا بنا دیا گیا ہے۔ یہ جگہ تھی جہاں وہ کھڑے ہوئے تھے آگے۔ جگہ محفوظ رکھی ہے۔ جہاں وہ کھڑے تھے اور سامنے طشت میں بھائی کا سر رکھا تھا اور یہاں وہ کھڑی تھیں اور اتنے گرنے سے بندھے ہوئے تھے۔ میں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ بسی سُن رہے ہو۔ خدا تمہاری عزت کی حفاظت کرے۔ جو نقرہ میں نے کہنا تھا وہ یہ تھا۔ ہائے کیا بتاؤں۔ کھڑے تھے اس طرح۔ کوئی مصیبت تھی ایسی جو ان پہ نہ گذر گئی ہو۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا فرمان ہے کہ میری ولادی پر وہ مصائب گذر گئے کہ جنہیں نہ کوئی سوچ سکتا ہے۔ نہ سمجھ سکتا ہے۔ اپنی کوتاہی تھا ان پہ کیا گذر گئی۔ نہ کوئی دماغ انہیں ذہن میں لا سکتا ہے۔ نہ سمجھ سکتا ہے۔ امام موسیٰ کاظم نے فرمایا۔ کوئی مصیبت تھی ایسی جو ان پہ نہ گذری ہو۔ اور یزید کے دربار میں کھڑی تھیں۔ یہ نقرہ میں نے کہنا تھا آخری اب۔ اور میرے عزیز ڈھائی تین گھنٹے گذر گئے کھڑے کھڑے اور یزید اتنا مشغول ہے اپنے نشہ فتنے میں۔ قیدیوں سے بات نہیں کرتا۔ اور یہ کھڑے تھے۔ چھوٹی بچیوں کے پاؤں میں ورم آگئے تھے۔ پیدل چل کے آنا اور کھڑے رہنا۔ اور زمانے کا امام بالکل خاموش کھڑا ہے۔ بی بی خاموش کھڑی ہیں اور گردن سے سیدانیوں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ سب کھڑے ہیں۔ جہاں جناب رباب جو ساتھ کھڑی تھیں وہاں امام حسن کی بیوہ جناب قاسم کی والدہ ساتھ تھیں صرف فاطمہ کی بہوؤں میں یہ دو بہوش تھیں قید میں۔ ایک علی اسغر کی والدہ اور ایک قاسم کی والدہ۔ جناب اسمعیل جو تھیں علی اکبر کی والدہ۔ ان کا راستے میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہ شام تک پہنچی ہی نہیں تھیں۔ یہ دو بہوش

تھیں انہوں نے سر جھکا رکھے تھے۔ اور انہوں بالکل سر نہ اٹھائے۔ اور بانی نے امام زین العابدین سے کہا تھا دربار سے آگے۔ کہ بیٹا مجھے کھاگئی یہ بات کہ میری بھاد جس کھڑی تھیں اور ان کے پیسے کے لوگ کرسیوں پہ بیٹھے تھے۔ وہ کیا کہتے تھے کہ کس خاندان میں بیاہی گئی ہیں ہماری لڑکیاں۔ مجھے شرم کھا رہی تھی۔ یہ لوگ کیا کہتے ہوں گے۔ تو اس وقت یزید نے ڈھائی تین گھنٹے کے بعد ٹوکا ہے انہیں اور کہا کہ ان قیدیوں کے نام بتاؤ یہ کون کون ہیں؟ کیا ہیں؟ یہ چیزیں غور کرنے کی ہیں قبلہ۔ انہیں دیکھ کے لوگوں کو بتاؤ۔ انہیں عام کرو۔ اور پڑھے لکھے حضرات کو بتاؤ کہ دنیا کی ہر تکلیف اور مصیبت اٹھائے ہوئے۔ کہتی کیا ہے اس وقت۔ فقرہ کیا اُس کی زبان سے نکلا ہے۔ یہی تو میں کہتا ہوں۔ یا اللہ یاد رکھ تیری قدرت تو ہے ہی بے انتہا۔ پر ایسے بندے بھی نہیں ہوں گے۔ یہ کمال بھی نہیں ہوگا۔ کہتی کیا ہیں؟۔ الحمد للہ اللہ اکرمنا۔ ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں جس نے ہمیں یہ عزت عطا کی۔ قبلہ کوئی اور ہوتا تو کہتا کہ واہ اللہ میاں ہم کس طرح تیرا شکر ادا کریں۔ تیرے نام پر ہم مر گئے اور تو نے ہماری خبر نہ لی۔ وہاں یہ کہہ کے کہ ہم شکر ادا کرتے ہیں کہ خدا نے ہمیں یہ عزت دی۔ بانی نے منادیا کہ خدا ہے، خدا کوئی ہے۔ یہ زینب کا احسان ہے کہ آج دنیا خدا کو مان رہی ہے۔ ان حالات میں منوایا کہ خدا ہے اور اگر یہ خدا کا وعدہ ہے کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں لانا۔ کہو لنگا۔ یقین کے اس شکر یہ پہ مجھے نہیں معلوم کہ کیا افاضانہ ہوگا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں جس نے مجھے یہ عزت عطا فرمائی۔ جس نے ہمیں یہ شرف عطا فرمایا۔ جس نے ہمیں یہ شان عطا فرمائی۔ ہاتھ بندھے، ظالم کے دربار میں ایک خاتون یہ کہہ رہی ہے کہ خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں یہ عزت عطا فرمائی کہ ہم اس کے دین کے محافظ ہیں۔ اس کی حفاظت میں یہاں قید ہوئے کھڑے ہیں اور ہم خدا کا شکر ادا

کہتے ہیں۔ جو مومنین یہاں موجود ہیں یا اللہ تم تیرا شکر ادا کرتے ہیں کہ تو نے ہمیں
 ان شکر گزاروں کے حق کا شناسا بنایا۔ محمد وآل محمد کی معرفت ہمیں دی۔ ان
 کا ذکر کرنے اور ان کی مجالس برپا کرنے کی توفیق ہمیں عطا فرمائی۔ بس بھائیو اللہ
 تمہیں سلامت رکھے۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ میرا بیان ختم۔ زندگی رہی۔ تو
 انشاء اللہ بھری کبھی

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

شورکوٹ شہر
 ۸ اکتوبر ۱۹۷۱ء

حسینیت

عنوان

حسینیت
دربارِ شام

فضائل
مصائب

دربارِ میرِ شام کا منظرِ عجیب سے
زینبؓ کو ل رہی ہے وراثتِ تولدِ گئی

لخترِ خیرِ نوحہ

عظمتیں

اسلام اور انسانیت مترادف لفظ ہیں۔ خلاق عالم کی قدرتِ کاملہ نے انسان کو عجیب و غریب صفات سے تصف کر کے صحنِ عالم میں بھیجا ہے۔ نیابتِ اقدس و خلافتِ ارضی کا امانت دار۔ انسان جہاں عترت و شان کی اعلیٰ منزل پر فائز ہے اور تمام مخلوق عالم من جانب اللہ انسان کی اطاعت پر مجبور اور معول ہے۔ کرہ ہائے آسمانی کی عظمت سے لے کر ادنیٰ سے ادنیٰ چیز تک انسان کی مطیع خدمت گزار اور تابع فرمان ہے۔ انسان نے عقلِ خدا داد کی طاقت سے فوادِ عالم کو مستقر و تابع بنا کر ”وَسَخَّرَ لَكُمْ مِا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا“ کی عملی تفسیر اپنے بے پناہ عزم و ارادہ سے مکمل کر دی ہے۔ اور صفتِ انسانی اس تسخیر کی تکمیل میں بہترین مصروف و مشغول ہے مگر یہ انسان جہاں اعلیٰ صفات برگزیدہ اخلاق اور تخلیق و اباخلاق اللہ کا نمونہ کامل ہے اس کے ساتھ ہی شرکی مخلوق بھی انسانی جدوجہد کے ساتھ مشغول عمل ہیں۔ مجبور حلقہٴ انسانی شرکی طاقتوں کے سامنے باوجود ملکی صفات ہونے کے اکثر و بیشتر سپر اندوختہ و سرنگوں ہو جاتا ہے۔ طاغوتی لشکرِ ہمیشہ انسانی ضمیر کو شکست دینے پر آمادہ پیکار و رزم رہتا ہے۔ خداوندِ عالم نے اپنی رحمتِ کاملہ سے انسان کو طاغوتی طاقتوں کی یلغار سے محفوظ رکھنے کا انتظام فرماتا رہتا ہے۔ انبیاء و رسل کے سلسلہ عالیہ اور دماغِ انسانی میں عقل و ویر اندیشی کی مشعل اسی لئے ہے کہ ان قدرتی طاقتوں سے مدد لے کر انسان ”اسفل السافلین“ کی دلدل سے نکل کر ”مناہی اادمہ“ کی معراج کو پہنچے۔ یاد رکھئے

— قانونِ اسلام اسی ہدایتِ الہی و توفیقِ غیبی کا نام ہے اسلام انسان کی انفرادی و اجتماعی و نوعی و شخصی اصلاح و درستی کا ذمہ دار ہے۔ اسلام کی تعلیم اور اس پر عمل تہذیب، اخلاق، تدبیر، منزلِ سیاست، مدن وہ زریں اور قیمتی اصول اپنے دامنِ رحمت میں لئے ہوئے ہے کہ جس نے آنکھ جھپکنے میں ایک وحشی محض قوم کو معلمِ اخلاق و استادِ انسانیت بنا دیا تھا۔ اسلام کی فطری آسان سہل مزاج انسانی تعلیم و تبلیغ نے دشت و صحرا، بحور و کوہ و وادی میں اسلام زندہ باد کی فرائض آواز بلند کرادی تھی۔ پیغمبرِ اسلام کی عظیم شخصیت اور پیغامِ اسلام کی جاذبیت ہر خشک و تر، بلند و پست، یگانے و بیگانے سے کلمہ پڑھوانے میں کامیاب ہوگئی۔ عرب کا فرزندِ صحرا اس فطرت سے جلد مانوس ہو گیا اور ہادیِ اعظم اس پیغامِ مکمل کو اتنا تک پہنچا کر نعیمِ دائمی کی طرف انتقال فرما گیا۔ آپ میری بات سمجھ بھی رہے ہیں نامہ اجاباً۔ بات ذرا دور چلی گئی۔ تو میں عرض کر رہا تھا۔ وہ ہادیِ انتقال فرما گیا مگر اتنی عظیم الشان تعلیم اور آخری خدائی پیغام کو دنیا کے ذہن نشین کرانے کے لئے اجماع اور عصمت پوش معلمینِ الہی کی ضرورت تھی۔ جو اپنے علم و عمل سے مسلمانوں کو صحیح معنوں میں موزنِ کامل بنا دیں۔ ابھی لوحِ دماغ پر اسلام کا نقش سادہ ہی تھا۔ قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج اور فتوحاتِ ملکی کی ہوائے نخوت نے اسلام کی سادگی کی جگہ لے لی۔ خلافتِ راشدہ تک نفاذِ کلباس کسی قدر جسمِ اسلام پر باقی رہا۔ مگر اس دور کے بعد ملوکیت و استبداد پوری شان سے جلوہ گر ہو گیا۔ قصرِ حکومت اسلامی تعلیم اور خدا کی بجائے "السلطان ظل اللہ" کے نعروں سے گونجنے لگا۔ اسلام کے نام پر وہ وہ بدعتیں تھوسیں کہ کفر بھی جن سے شرعاً جائے۔ زبان و دل کی ہم آہنگی رخصت ہو گئی۔ نفاق نے ایمان کا روپ دھار لیا۔ احکامِ الہی مامٹک ہونے لگا۔ زبانی و عوامی اسلام عین ایمان بن گیا۔ اعمال، صالح کی

ضرورت ہے ضرورت ہوگئی علماء راہزن اور ذمہ دارانِ مذہب دین فروش بن گئے۔
 تہذیبِ انسانی نے سرپیٹے لیا۔ قانونِ الہی بلائے طاق رکھ دیا گیا۔
 یہ سب کچھ بانیِ اسلام کے صرف چند سال بعد حریمِ خلافت سے اٹھی ہوئی نوحت
 و عذور۔ بد اعمالی و سفاکی کی سیاہ آندھی چراغِ حرم کو بجھاتی ہوئی۔ شیخ دین و ملت
 کو گل کرتی ہوئی دنیا نے اسلام پر چھائی۔ آمین الہی بحکم خلیفہ
 عرق سے ناب ہو گیا۔

یہ دور فتنہ تھا جب کہ بد اخلاقی۔ اخلاق، بے دینی۔ دین بے ایمان۔
 ایمان، بے حیائی۔ عفت۔ انکارِ معبود عبادت ہو گیا تھا۔ ایسی حالت میں
 زبانوں پر مہریں لگ گئیں اور قواعدِ عمل مفلون ہو گئے۔ آخر غیرت خداوندی نے
 اس نازک دور کے لئے جب کہ کفرِ اسلام بن کر ہم رنگ زمینِ دام میں دنیا کو پھنسا
 رہا تھا اسے قاعدہ جاریہ کے مطابق ترفینِ الہی و تائید کی غیبی کوششیں حسین دنیا کے
 سامنے پیش کیا۔ کون حسین؟ جو ابی طالبؑ کا اور خدیجہ الکبریٰؑ کے معزز اسلام
 کا نواسہ۔ ہاجرہؑ سے اسد کا نبیرہ جلیل اور آپؐ وحی میں دھلی ہوئی زبانِ رسالت
 چوسنے والا۔ اسدؑ کے فاتح اعظم اسد اللہ علی ابن ابی طالبؑ کا فرزند میدانِ عمل میں
 آیا۔ چونکہ رنگِ الحاد زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ عوامِ دین کے نام پر بے دین
 ہو رہے تھے۔ اور شر۔ خیر کا نبادہ اڑھ کر شرارت پھیلا رہا تھا۔ اس
 لئے اس کو روکنے کے لئے اہم ترین اقدام کی ضرورت تھی۔ کسی مصلوب کے انھوں
 میں ٹھکی ہوئی چند کیلیں اور محض کسی نبی زادے کا پھری کے نیچے آجانا اس انقلابِ اعظم
 کو روک نہ سکتا تھا۔ ضرورت تھی کہ اس بڑی ہنگامی مصیبت کو مصیبتِ اعظمی سے
 رد کیا جائے اور اس تخریبی انقلاب کو ذبحِ عظیم سے دبایا جائے۔ سمجھے نامیرے
 محتوم اصعبین، فرزندِ رسولؐ اسی دن کے لئے آغوشِ رسالت میں پل کر پروان

چڑھا تھا حسین کی عظیم القدر قربانی نے خیر و شر میں حدِ اِجاصِل تام کر دی — ایمان و بے ایمانی کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ رکت لکڑ دماغ اور سرِ نو پیدا کی — علماء میں اہتمام اور عوام میں طاغوتی طاقتوں کے خلاف جذبہ جہاد پیدا کیا اور آج تک جو اسلام کے نام پر کسی قدر نیکی دنیا میں موجود ہے وہ اسی بطلِ جلیل کی شہادتِ عظمیٰ کا صدقہ ہے۔ مگر آج پھر دین کا نام تہذیب — اور اسلام دشمنی کا نام خدمتِ دین ہو گیا ہے۔ علماء بے عمل حکام بے عدل اور عوام شتر بے مہار بن گئے ہیں اور کلمہ گو یوں کے خلاف فتویٰ کفر و اجہاد ہے۔ آج زمانے کے بے شمار نیرید دین کو ختم کرنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں — اتحاد و اتفاقِ اسلامی عتقا ہو گیا ہے پابندیِ احکام الہی کا نام حماقت اور خدا و رسول کے احکامِ دفترِ پارلیمنٹ بن گئے ہیں — مسلمان کہلانے والے معاشرت میں یہود، تمدن میں ہنود چمک دمک میں عیسائی اور برادر کشی و فتنہ پروری میں شہرہ آفاق ہو چکے ہیں روحِ مذہب فنا ہو چکی ہے کچھ آثارِ رسم و رواج آثارِ قدیمہ کے طور پر حائل بہ انہدام باقی ہیں — اور بس آج بھی ایمان کی روح ہدایت کی تڑپ — توفیقِ الہی و تائیدِ ایزدی کی ضرورت مشعلِ عقل و خرد ہاتھ میں لے کر حسین کے رُخِ زیبا تلاش کر رہی ہے اس زمانے کا حسین پردہِ غیب سے آئے تو پھر دنیا عدل و انصاف سے پُر ہو جائے

آج پھر تیری زمانے کو ضرورت ہے حسینؑ

— * — * — * — * — * —

حضرت قائم آل محمد علیہ السلام



يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِقُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُنِمْ نُورِهِ
وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝

خدا نے بزرگ و بڑی نعمتیں اور رحمتیں مخلوق پر بے حد و بے شمار ہیں۔ انسانی طاقت ان کے شمار اور ادا کرنے سے عاجز و قاصر ہے ان لامتناہی نعمات میں سب سے عظیم نعمت حضور ختمی مرتبت کا وجود سراپا رحمت ہے۔ یہ اتنا بڑا خدائی انعام جس نے مخلوق کے عرفان و معرفت کے سلسلے خلیفیت کی سرحد سے ملادئیے۔ عالمین کے رب سے آشنا کیا۔ طاغوتی طاقتوں کو ہمیشہ کے لئے شکست دی اور پورا صحن عالم خدائے بزرگ کی باجبروت شہنشاہی کا کلمہ پڑھنے لگا۔ دستورِ دنیا کے مطابق شرارِ بولہبی نے چراغِ مصطفوی کو خاموش کرنے کی سزور کو شمشیر کی سمجھے ناساجدان۔ مگر ارادۃ الہی اس بات پر عمل گیا کہ اس نوری شمع کو مخالف آندھیوں سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دے۔ چنانچہ قادرِ مطلق نے یہ بارہ حجابِ نور جن سے چھین کر شعاعِ محمدی تا قیامت نورِ پاش رہے گی۔ اس انداز سے بنائے کہ ان کے ازل کا جو انداز ہے وہی آخری کا ناز ہے۔ اگر اول کے سر پر تلخ ولایت ہے تو آخری کے بیکر موزوں میں خلعتِ دوامِ ہدایت ہے۔ ذاتِ محمدی تمہہ رسالت سے تو یہ بارہ بردجِ ہدایتِ آخری گردشِ آفتابِ امامت ہیں۔ یہی وہ نورا کا نور ہے جو بیست و شش مرتبہ میں علمی اور عملی طور پر مظہرِ کمالاتِ الوہیت ہے۔

یہ سلسلہ قبل ازل سے شروع ہو کر آخر ابد تک دائم و قائم ہے۔ خلاق عالم نے ایک ایسی جماعت پیدا کی ہے جن کے دل و دماغ ان عصمت پوشش ذواتِ قدسہ کے انوارِ مودت سے جگمگا رہے ہیں اور اس جماعت پر یہ خدا کا فضل ہے کہ وہ محبتِ محمد و آلِ محمد کو دنیا کی ہر متاع سے زیادہ عزیز اور عاقبت میں واحد ذریعہ نجات سمجھتے ہیں اور اپنا جان و مال اور اولاد - عزت - آبرو سب سے اُن کے عشق میں قربان کر دینا سب سے بڑی سعادت جانتے ہیں اُن کی خوشی میں خوشی اور اُن کے غم میں غم منانا بھی ان کا ایمان ہے اور اسی پر اُن کے زین و دنیا کی حیات کا دار و مدار ہے۔ سن رہے ہیں نا صاحبان آپ میری بات۔ چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ پاکستان کے عظیم تاریخی شہر لاہور میں پورا رجب کا بہینہ حضورِ تاجدارِ ولایت کی پُرشکوہ آمد کے جشنِ بلئے مسرت سے جگمگا تا رہا!۔ پوری فضا نعرہ ہلئے حیدری کی آسمانی نواؤں میں گونجتی رہی۔ اور دلائے ساتی کو شکر کے منوالے تشنگانِ معرفت کو مے خانہ الست کے ساغر پلانے رہے۔ برقی روشنیوں میں دلوں کا نور دونوں مل کر دین و دنیا کی برکت سے صاحبانِ توفیق کو مالا مال کرتے رہے۔ اچھی ماہ رجب کی ایمان افروز فضا صحنِ عالم میں ضیا پاشی کر رہی تھی کہ اچانک اُفق پر ماہ مبارک شعبان کا ہلال نمودار ہوا۔ شعبان وہ مہینہ ہے کہ اس کی کوئی تاریخ بھی جاننا رائے آلِ محمد کے لئے یومِ غم نہیں۔ تیسری شعبان شہید اعظم کی ولادت کی عید ہے۔ اور اُس پُرسرت، تقریب میں خوشی کے آسوا جانا تقاصدائے محبت ہے۔ چار شعبان سے پوری دنیا مودت چودھویں بدرِ کامل کے لئے سراپا انتظار ہوتی ہے۔ تو صاحبان اُرھر آسمان پر چاند بڑھتا ہے اور مہر ہاتھ پر عصمت کے شوقِ دید میں اہل ایمان کے چہروں میں نور اور دل میں سرور بڑھتا ہے۔ زندہ دلانِ لاہور حدیثِ عشق سننے کے لئے مقبرہ راوی کی تلاش میں تھروں سے

نسل پرستہ ہیں اور مرتبہ و کامرانی کے لمحات گزارنے کے لئے آتما عشری ستوالے کامران کی بارہ دری میں راوی کے قدموں میں ہر نین گوش ہو کر جا بیٹھے اور مرد قلندر کی عاشقانہ کاوشوں نے جنگل میں نکل کر دیا۔۔۔۔۔ باب مدنیہ علم کے آستانہ اور اس پر سر جھکانے والوں کو مسلسل بارہ دروازے نظر آتے۔۔۔۔۔ ہر دروازہ جنت کا باب اور حل مشکلات کے لئے عمل نفع۔۔۔۔۔ باب محمدی سے عباسی دروازے تک نور کا سماں تھا۔۔۔۔۔ فطرت بکھر گئی تھی۔۔۔۔۔ فضائیں نیا دہا پاشی انوار سے جگمگائیں۔۔۔۔۔ راوی کا بیل سزا پر مستقیم کارا بیل بن گیا۔۔۔۔۔ اور ایک ڈیران درختوں کا بھڑکٹ دیکھتے ہی دیکھتے رشک فرزدوس بریں ہو گیا۔۔۔۔۔ حوران جنت۔۔۔۔۔ جنت کے در پچوں سے حورنظارہ۔۔۔۔۔ چشمہ رکوشہ امواج راوی سے ہم آغوشی کے لئے بے چین۔۔۔۔۔ سماں کا عرش و کرسی اپنے مصنی نور چھوڑ کر۔۔۔۔۔ زمین پر شہنشاہ ارض و سماں کے استقبال کے لئے حاضر ہو گئے۔۔۔۔۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اشرفیت اراضی و سماں کی تیسرے پڑھنے لگا۔۔۔۔۔ راوی کا اندر و رکوشہ عرش بریں ہو گیا۔۔۔۔۔ پوری فضا روحانیت سے معمور ہو گئی۔۔۔۔۔ کہیں نعرہ مائے درود و سلام۔۔۔۔۔ کسی طرف رکوع و سجود و تسبیح و تہلیل کی نضا کہیں ہے یا صاحب العصر و الزمان ادگنی کا نورانی اور روحانی سرور۔۔۔۔۔ ایک طرف نوجوانانِ ملت کی مفضل قصیدہ خوانی کا شباب دوسری طرف علمائے اعلام کا عرفانی خطاب اور حمد نظر تک پھیلے ہوئے مجمع کی لگا ہوں کامرکز۔۔۔۔۔ اسی میں خانے کا ساقی خاکساری میں غلام اوترا ب۔۔۔۔۔ شہرت میں نواب ابن نواب۔۔۔۔۔ عالم کے لئے باعث برکت و فرخ خال۔۔۔۔۔ مفضل اہل ایمان کے لئے مرواں اقبال۔۔۔۔۔ میں نے بھی جا کر عرض کیا۔۔۔۔۔ آج یہ کیا منظر ہے کہ جس کے نظارے میں چودھویں کا چاند ادب و سکوت کے ساتھ محو ہے۔۔۔۔۔ دنیا کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔۔۔۔۔

— اور عالم کی بنفیع حد اعتدال پہ آگئی ہیں پوری کائنات ایک دوسرے سے لگے
 مل کر فرحتِ مسترت سے تعجبم کر رہے مژدہ جانفزا ستارہ ہی سے ہے
 ہوئی کعبے میں ذاتِ صبح کا تارہ چمکا
 بارھواں برسِ امامت کا ستارہ چمکا

سفینۂ آل محمد میں سوار ہونے والے اپنی نجات کے عریضے لے کر کشتیِ ایمان
 میں سپرد کرنے کے لئے پورے ادب و احترام سے کھڑے ہیں میں نے بھی ادب سے
 عرض کیا۔ حضور عالم پناہ؟ صبح کے وقت ادا کر کے فریضہ ساقی پیش کر دے
 ابھی میرا بھی عریضہ ساقی مومنین عالم کو عموماً اور یہ پور کو خصوصاً جشنِ ولادت مبارک ہو
 اور اس ولادت کی برکت سے یملاً اللہ الارض قسماً وعدلاً
 کما ملئت ظلماً وجوراً — اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

عشقِ خدا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خداوندِ عالم کی حمد و ثنا کے بعد حضرات محمد و آلِ محمد پر درود و سلام
محترم سامعین!

مجھ سے پہلے میرے ایک عزیز پر و فیروز سید عمن رضا صاحب میاں وعظ فرما
رہے تھے۔ ساری تقریر تو مجھے یاد نہیں رہی۔ اتنا یاد ہے کہ وہ کچھ "نور" کے بارے
میں کہہ رہے تھے۔ لہذا میں بھی چاہتا ہوں کہ آج آپ کے سامنے نور ہی کے موضوع
پر تھوڑی سی گفتگو ہو جائے۔

حضرات! ویسے تو ہمارا سب کا یہ ایمان ہے کہ تمام انبیاء کرام معصوم اور نور تھے
مگر ایک طبقہ و نکر کا یہ خیال ہے کہ وہ نور نہیں تھے۔ اللہ جانے ان کی بات صحیح ہے یا ہماری
درست ہے۔

ایک دفعہ بہاولپور میں اس بات پر مناظرہ ہو گیا کہ حضور رسالتاً نور تھے یا
خاک؟۔ چنانچہ جو نور کے منکر تھے انہوں نے مناظرہ رکوانے کے لئے نواب بہاولپور
کو ایک درخواست لکھی۔

حضور پر نور۔ نواب بہاولپور! آپ بتائیں کہ رسول نور تھے یا خاک؟

اب ان سے پوچھیے کہ بہاولپور کا نواب تو پر نور اور رسول بے نور۔ کیوں؟
ہم نے کہا "کوئی ایسی بات تباؤ جس سے پتہ چل جائے کہ رسول نور نہیں تھے؟"

انہوں نے کہا " حدیث ہم بتاتے ہیں۔ حدیث بھی وہ جس کا رادی حضرت عثمان ذوالنورین ہے۔

بھئی اذوالنورین کیوں کہتے ہو؟

جواب دیا " تمہیں معلوم نہیں کہ حضرت عثمان کے گھر رسول کی دو صاحبزادیاں تھیں۔ چونکہ رسول کی لڑکیاں تھیں لہذا نور تھیں؛ اب ان سے کوئی پوچھے کہ جب باپ بے نور تھا تو بیٹیاں کیسے نور بن گئیں — بہر زرع مولوی صاحبان میں ایسے جھگڑے چلتے رہتے ہیں۔ بے کاری کا مشغلہ ہے۔ چلو اور نہیں تو مناظرہ ہی کر لو — جس طرح ایک رات ہندوستان کی تمام چمکاڑیں ایک پرانے برگد کے درخت پر اکٹھی ہو گئیں اور اپنی اس کا نفرنس کا صدر ایک بڑھے اُلو کو بنایا۔ کانفرنس میں متفقہ طور پر فیصلہ ہوا تھا کہ سورج نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو ہمیں بھی نظر آتا۔ اب آپ لاکھ دلیلیں دیں کہ سورج ہے مگر ان کی کانفرنس جو فیصلہ کر چکی ہے وہ درست ہے — بہر زرع ایسے جھگڑے چلتے رہتے ہیں اور بے نور آنکھیں بوجہ اپنی بے نوری کے، نور سے منکر رہتی ہیں۔

سامعین! اصطلاحی لفظوں میں نور کے معنی 'ہیں حسین' "حین" ایسا لفظ ہے جس کے معانی آج تک متعین ہی نہیں ہو سکے۔ اس لئے کہ ہر شخص کے مزاج کے مطابق "حین" علیحدہ ہے۔ ہر آدمی کا حسین الگ الگ ہے۔ جنوں کی نظر میں کالی لیلی حسین تھی۔ ایران کا حسین اور ہے۔ افغان کا حسین اور ہے۔ حبشیوں کا حسین اور ہے۔ ہم ہندوستان کا حسین اور ہے اور ان شاعروں کا حسین اور ہے۔ شاعروں کے سارے دیوان تعریفِ حُسن میں بھرے پڑے ہیں۔ اب ان سے کوئی پوچھے۔

" شاعر و! تمہارے حسین میں کیا حُسن ہے؟

شاعر جواب دیتے ہیں۔ حضور! ہمارے حسین کا تدمر کی طرح ہے۔ اس کی گردن راجھی ہے۔ اُس کے رخسار دو انکار سے ہیں۔ اُس کی آنکھیں ہرن کی سی ہیں۔ اس کی پکلیں

تیر ہیں۔ اس کی جینویں "توار ہیں۔ اُس کی زلفیں کالے ناگ ہیں۔"
 سامعین! اگر آپ مناسب سمجھیں تو آنکھیں بند کر لیں اور شاعروں کے اس حسین کا تصور
 کریں۔ ایک سرد کا درخت۔ اوپر رکھیں صراحی۔ اس میں لگائیں دو برن کی آنکھیں۔ دو تلواروں
 کو بانٹ دیں۔ دس ہیں تیر لٹکا دیں اور ساتھ ہی ایک کالا ناگ لٹکادیں۔ بنائیے ایک بلا
 بن گئی یا ایک حسین بنے گا؟

جب ہی تو میں کہتا ہوں "دنیا دار! بنا یا نہ کرو۔ تم حسین بناتے ہو مگر وہ بلا بن جاتی
 ہے" اگر عقل انسانی حسین کے معانی بیان کر سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہیں "بے عیب"
 گویا جرسی کو بے عیب سمجھو وہ اس کا حسین ہے۔ اب اگر حسین کے معنی ہیں "بے عیب"
 تو بتاؤ۔ سوائے اللہ کے دنیا میں کوئی بے عیب ہے؟ چونکہ اللہ حسین ہے لہذا بے عیب ہے
 مسلمانو! تمہارے رسول میں کوئی عیب ہے؟ سب گز نہیں "جب رسول بے عیب
 ہے تو پھر بے ناسیل۔ ہے نانوڑ۔ چونکہ نور کے معنی ہیں حسین لہذا حسین کے معنی ہیں
 "بے عیب"۔ مگر رسول میں اور کچھ نہیں تو حادثہ ہونے کا عیب تو ہے۔ قدیم تو
 نہیں رسول۔ مخلوق تو ہے نا۔ صرف اللہ وہ ہے جس میں کوئی نقص نہیں ہے۔ اللہ وہ
 ہے جس میں کوئی عیب نہیں ہے۔ گویا اصلی بے عیب اگر دنیا میں کوئی شے ہے تو وہ اللہ
 ہے۔ اصلی حسین اگر دنیا میں کوئی شے ہے تو وہ صرف اللہ ہے۔

سامعین!

یاد رکھو! ہر حسین کا فطری خواہش و تقاضا یہ ہے کہ میرا چاہنے والا بھی کوئی ہو۔ حُسن
 ادا اس ہو جاتا ہے، حُسن نملگین ہو جاتا ہے، حُسن مرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اگر حُسن کا کوئی
 چاہنے والا نہ ہو۔ گویا حُسن نظر تازیہ چاہتا ہے کہ جس حیثیت کا میں حسین ہوں اسی حیثیت
 کا میرا کوئی چاہنے والا ہو۔ اب اگر اللہ حسین ہے تو نہ صرف حُسن کے مطابق اللہ کا دل
 بھی یہی چاہتا ہے کہ کوئی میرا چاہنے والا بھی ہو۔ مگر اس حیثیت کا عاشق ہو جس حیثیت کا

میں حسین ہوں۔ گویا اللہ کا حُسن بے تاب رہے گا۔ جب تک اللہ کے حُسن کے مطابق اُسے عشق نہ مل جائے — لہذا اللہ نے چاہا کہ اپنے حُسن کو نمایاں کروں۔
 ”میرے حُسن کو کوئی پہچانے۔ میرے حُسن کا کوئی عاشق ہو۔
 چنانچہ اللہ نے اپنے حُسن کا پہلا عاشق آدم کو بنایا۔

• آدم! ہم سے عشق کرو گے؟

آدم نے کہا۔ ”کریں گے۔

• تم آج سے ہمارے عاشق؟

”ہاں۔ عاشق“ — جب آدم نے کہا ”میں عاشق ہوں، تو معشوق نے شرط لگا دی
 ”نہیں کرنے جانا۔ جو تھے کونے نہ جانا“۔ مگر آدم چوتھے کونے چلے گئے۔ اللہ نے کہا
 ”بس اتنا ہی عشق ہے۔ ایک برخت کی خاطر معشوق کی بات نہ مانی۔ جاؤ زمین پر تمہارے
 عشق کو میں نے آزما کے دیکھ لیا۔ میرے حُسن کے مطابق تمہارا عشق نہیں ہے؛

اب اللہ نے کہا ”کوئی اور عاشق ہے جو میرے حُسن کے مطابق عشق کر کے دکھائے؟

چنانچہ ایک عاشق نے کمر ہمت باندھی۔

”خداوند! میں تیرے حُسن کے مطابق عشق کروں گا۔“

اللہ نے کہا ”شاباش۔ میرے حُسن کے مطابق عشق کر کے دکھاؤ۔“

چنانچہ اس عاشق نے تقریباً نو سو سال منازلِ عشق طے کیں۔ ریاضتیں کیں۔ معنی کیں

پتھر کھانے۔ تکلیفیں اٹھائیں۔ اللہ سے عشق کی مکمل مشق کی اور سب اپنے نزدیک عشق

س کامل ہو گیا تو اللہ نے کہا۔

”میرے چاہنے والے! ہمارے عشق کا امتحان دو۔“

کیا؟

• کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ اور دیکھو کسی نالائق کو آواز نہ دینا۔ چنانچہ وہ بیٹھ گیا

اور مجبوراً نالائق کو بلیا سمجھ کے آواز دے دی

اللہ نے کہا "بس اتنی سی بات۔۔۔" چنانچہ نو سو سال کا عشق ایک امتحان میں ناکام ہو گیا اور زمین شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ پھر ایک اور بندے نے کمر ہمت باندھ لیا۔
"خداوند!۔۔۔ میں تجھے عشق کر کے دکھاؤں گا۔ تو بھی کیا یاد کرے گا کہ کوئی عاشق ملا تھا۔"
اللہ نے کہا:

"اچھا آجاؤ میدان میں"

بہر نوع۔ اُس نے امتحانِ عشق دینا شروع کیا۔ پہلا امتحان میدانِ یہ تھا کہ

بے خطر گود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

اللہ گواہ ہے۔ ابراہیم نے وہ امتحان دیا کہ لطف آگیا۔ اللہ کا عاشق جب کرین سے جھٹکا دے کر آگ میں پھینکا گیا تو آپ بتائیں جب وہ فضا میں آ رہا تھا۔ آگ تک ابھی پہنچا نہیں تھا۔ کرین سے چل پڑا تھا۔ جب فضا میں تھا تو پورا بے بس تھا یا نہیں؟۔
"بے بس" ایسی بے بسی کے عالم میں تو ڈرتے کونستگے کا سہارا ہی کافی ہے۔ اگر کوئی شے اُس کے ہاتھ آجاتی تو وہ اُسے اپنے بچانے کے لئے پکڑ لیتا یا نہیں؟ پکڑ لیتا "اس بے بسی کے عالم میں جبرئیل جیسا قوی فرشتہ اُس کے پاس آیا اور گود میں لے لیا۔"
ابراہیم آگ میں جا رہے ہو؟

"ہاں"

بچالوں۔ مدد کروں؟۔ ابراہیم نے جواب دیا۔

"مدد تو مجھے ضرور چاہیے۔ مگر تم سے نہیں۔ جاؤ، ہٹو، میرا راستہ چھوڑو۔"

جبرئیل سر جھکائے سدرہ پر آکے بیٹھ گئے۔ اللہ نے پوچھا۔

"جبرئیل کیسا مزاج ہے؟"

جبرئیل نے کہا، خداوند!۔ کیا بتاؤں۔ عجیب بندہ ہے۔ ایسے موقع پر مجھے جھڑک دیا۔

اللہ نے کہا "جبرئیل! یہ امتحانِ عشق تھا۔ میں نہ کہتا تھا کہ انی اعلم ما لا تعلمون اب چونکہ اس بندے نے عشق کی اس ادا کو دکھایا ہے لہذا اس کا انعام یہ ہے کہ عشق آگ درنوں مگر ایں گے۔ دیکھتے ہیں عشق کی آگ تو یہ ہے یا یہ آگ؟ چنانچہ آتشِ عشق نے اس آگ کو بھی گلزار بنا دیا۔ بہر نزع! اللہ نے امتحان لیا اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا "ابراہیم! شاہش۔ تم تو میرے عشق میں پورے اترے۔ ذرا ایک امتحان اور بھی دے دو۔"

» خداوند! کیا؟

اپنے بیٹے کو ہمارے عشق پر قربان کر دو۔

"خداوند! یہ بھی کوئی بات ہے۔ میں ابھی اپنے بیٹے کو تیرے عشق میں ذبح کئے دیتا ہوں۔ چنانچہ بیٹے کے گلے پہ چھری تو رکھ دی۔ اللہ کے حسن کے مطابق عشق میدان میں آگیا۔ مگر کیا بتاؤں عینِ وقت پہ اچھے خاصے عاشق کی آنکھوں پہ کیا پٹی بندھ گئی۔"

اللہ نے کہا

"ابراہیم! تم میرے عاشق نہیں۔ درست ہو۔"

بہر نزع۔ اس کے بعد ایک اور زوردار انسان میدانِ عشق میں کود پڑا۔

"میرے اللہ! میں تجھ سے عشق کروں گا۔"

سامعین!

کوئی عاشق یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ کوئی میرے محبوب کا مقابلہ کرے۔ چنانچہ اتفاقاً تختِ مصر پہ بیٹھنے والا فرعون، موسیٰ کے محبوب کا مسخر اڑا رہا تھا مگر عاشق زوردار تھا ڈنڈا لے کر پہنچ گیا۔

"تُو ہے جو میرے اللہ کا مقابلہ کر رہا ہے؟"

"ہاں۔ میں ہوں۔"

” شرم نہیں آتی؟

” نہیں آتی“

” کیا یاد کرے گا؟“

یاد کیا کروں گا۔ بس میں اللہ ہوں۔

اب جو فرعون نے یہ کہا تو موسیٰ کو غصہ آگیا اور پکڑ کر دریائے نیل میں وہ غرطے دے دیے ہیں کہ ”مصری“ تھا گھل کے رہ گیا۔ بہر نوع یہ اللہ کے عشق کا کمال تھا۔ موسیٰ کے بعد اللہ نے چاہا کہ کوئی اور عشق ملے جو میرے عشق کو کمال تک پہنچا دے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ تشریف لے آئے۔

” عیسیٰ! ہمارے حُسن کے مقابلے کا عشق پیش کر دو گے؟

” ہاں خداوند!۔ میں عشق کرنے آیا ہوں۔ مجھ میں بڑا کمال ہے“

” عیسیٰ! تم میں کیا کمال ہے؟

” خداوند!۔ مجھ میں بڑا کمال ہے۔ مجھ میں بڑی خرابیاں ہیں“

مگر جب امتحانِ عشق کی باری آئی تو گھبرا کے کہا۔

” خداوند!۔ بات یہ ہے کہ اب تو واپس بلائے۔ پھر سہی“

چنانچہ اللہ نے عیسیٰ کو واپس بلا لیا۔ اب ان کے بعد حضور خاتم الانبیاء تشریف

لئے۔ محمد اور اللہ کی ساز و نیاز کی باتیں بہت پرانی تھیں۔

اللہ نے محمد سے یہ نہیں کہا ” ہم سے عشق کر دو گے یا نہیں؟ بلکہ محمد نے خود کہہ دیا۔

” خداوند!۔ وہ وقت تو گذر گیا۔ اب میں امتحانِ عشق دینا ہوں۔ اگر تیرے حُسن

کے مطابق عشق پیش نہ کیا تو اپنا کلمہ پڑھو، چھوڑ دوں گا اور اگر تیرے حُسن کے مطابق عشق

پیش کر دیا تو تجھے بھی میرا کلمہ پڑھنا پڑے گا۔“

اللہ نے کہا ” محمد! تم تو بڑے زبردست عاشق ہو۔“

”ہاں۔ زبردست عاشق ہوں۔ اللہ سن!

چونکہ میں ایک نہیں ہوں، پانچ کا مجموعہ بل کے ”محمدؐ بنا ہوں۔ لہذا
اگر میں نے امتحان دے دیا تو تو کہے گا۔
”باقی چار رہ گئے۔“

تو یوں کرتے ہیں میرے اللہ! جو سب سے چھوٹا ہر اُسے اپنے
عشق میں آزما لے۔ اگر اس نے تیرے حُسن کے مقابلے میں عشق دکھایا
پھر تو تو مان جائے گا نا۔“ پھر تو تو تامل ہو جائے گا۔

بس بھائیو!

جب اللہ نے کہہ دیا ”ہے کوئی جو میرے حُسن کے مقابلے میں عشق پیش کرے
تو پر آرزو! آغوشِ محمدؐ سے ایک بچہ اٹھا۔

”خداوند! — نام ہے میرا حسین۔ تو ہے حسین اور میں ہوں حسین۔ اب تیرا
میرا مقابلہ ہے۔ حُسن میں تو کامل اور عشق میں، میں کامل۔ تو حُسن کی انتہا۔ میں عشق
کی انتہا۔ ز تیرے حُسن کی کوئی حد نہ میرے عشق کی کوئی حد۔
میرے اللہ!

”میں تیرے حُسن کے مقابلے کا عشق دکھاتا ہوں۔ تاکہ کیا چاہتا ہے؟
اللہ نے پوچھا ”حسین! دِلن چھوڑنا آسان بات ہے؟

فرمایا ”نہیں۔ مشکل بات ہے۔ جس زمین پہ گھٹنوں چلے ہوں۔ کھیل کے جوان ہرے
ہوں اُسے چھوڑ دینا آسان بات نہیں۔ مگر تیرے عشق پر سب کچھ چھوڑ دیا۔“
”حسین! پردیس میں جانا پڑے گا؟

”ہاں! پردیس میں جا رہا ہوں۔

اللہ نے کہا حسین! جنگل میں جانا ہو گا؟

”اں میں جگہ میں جا رہا ہوں۔ تو اپنا امتحان لے۔ اگر تجھ سے ”بس“ نہ کہلوا دس تو حسین
 نہ کہنا“

”حسین! تیرے سامنے پانی ہے؟“
 ”ہاں ہے“

”حسین! پیسا رہنا پڑے گا“
 ”ہاں پیسے رہیں گے“

آج حسین اور عشق میں ضد پڑ گئی۔ ادھر اللہ کا بے پناہ حُسن ہے۔ ادھر بندے کا بے
 پناہ عشق ہے۔

اللہ نے پوچھا

”حسین! بلو۔ بیٹے کے معاملے میں امتحان دو گے؟“

”ہاں۔ ایک نہیں۔ دو بیٹے۔“

دیکھ میرے اللہ! تیرے اسماعیل سے زیادہ شاندار ہے میرا بیٹا۔

اور دیکھو!

میں اس کے کیچھے سے بر چھی کھینچ رہا ہوں۔

اچھی طرح دیکھ لے میرے اللہ!

میری آنکھوں پر کوئی پٹی تو نہیں بندھی ہوئی۔ میرا ہاتھ تو نہیں

لرز رہا۔ میرے لبوں پر مکراہٹ ہے یا نہیں۔ میرے اللہ

اچھی طرح دیکھ لے۔ کوئی یہ نہ کہے کہ حسین کے دل میں جذبات

محبت تھے ہی نہیں۔ جذباتِ محبت دہا کے عشق دکھارا

ہوں۔ جذباتِ محبت تو اتنے ہیں کہ گالی دلاؤ تو سفید ہو گئی اور

چند سانسوں کے بعد جس کے بر چھی کھینچ رہا ہوں۔

بہر نوح! حسین نے جب عشق کی ساری منزلیں طے کر لیں تو اللہ نے کہا۔
 ”حسین! تُو نے تو کمال کر دیا۔“

حسین نے جواب دیا ”میرے اللہ! ابھی کیا کمال تُو نے دیکھا ہے۔ دیکھ تو سہی
 میرا کمال کیا ہوتا ہے۔“

”حسین! میں تو جب جانوں تیرا عشق کامل ہے جب زینبؓ شکسہ ہو جائے۔“
 بس یہاں آکے حسین ذرا چُپ ہوا ہی تھا کہ ”پیرنا تو اوندہ سپر تام کسند“
 زین العابدینؑ اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔

”خداوند!۔ اس معاملہ میں زینبؓ اسماں دوں گے۔ بے شک میرے سامنے زینبؓ
 شکسہ ہو جائے۔ بے شک میری بہنیں شکسہ ہو جائیں بے شک میری ماں
 شکسہ ہو جائے۔“

بہر نوح! زین العابدین نے کہہ دیا ”خداوند! میں تیرے حُسن کے مطابق عشق پیش
 کروں گا۔“

آج زین العابدینؑ قیدی بن گئے جا رہے۔ پاؤں میں بیڑیاں بھی ہیں، ہاتھوں میں
 ہتھکڑی بھی ہے۔ گلے میں طوق بھی ہے۔ ننگے سر ماں بہنوں کے اونٹوں کی مہار
 بھی ہاتھ میں ہے۔ گرا دل وقت پہ ناز بھی ہے۔ ادھر نماز کا آزل وقت ہے ادھر وہی قیدی
 ہتھکڑی بیڑی کے ساتھ اونٹوں کی قطار پکڑے ہوئے اذان کہہ رہا ہے۔ قدرت نے
 جب یہ ناز دیکھی تو اللہ جیسا معبود کہہ اٹھا۔ ”تو سیدنا ساجدین ہے۔“ جب رات
 بھر اس قیدی کی عبادت دیکھی تو معبود مان گیا ”تُو زین العابدین ہے۔“
 ادھر زین العابدینؑ کہتے ہیں۔

”خداوند!۔ تو نے میرا عشق دیکھا۔ میرا بھائی۔ میرا قوت بازو۔ میرا حراں بھائی علی اکبرؑ
 میدان میں گیا۔ باپ نے ابراہیمؑ والا صبر دکھایا۔“

خداوند! ذرا میرا صبر بھی دیکھوئے۔

سامعین!

یوم عاشور جب علی اکبرؑ میدان میں تشریف لائے تو امام زین العابدینؑ نے حکم دیا۔
 ”میرے بیٹے کا پردہ اٹھا دو۔ میں اپنے بھائی کا جہاد دیکھنا چاہتا ہوں۔“ چنانچہ بیٹے کا پردہ
 اٹھا دیا گیا۔ آپ ہیکہ لگا کے بیٹھ گئے۔ اکبرؑ میدان میں جہاد کر رہے تھے اور جب اکبرؑ کے
 پیچھے پر برہمی لگی تو امام زین العابدینؑ نے اپنی آنکھوں سے برہمی لگتی دیکھی، اکبرؑ نے بعد
 میں پکارا ہے۔ زین العابدینؑ نے پہلے آواز دی ”بابا اکبر زخمی ہو گیا“ اسی دوران حصین
 ابن میر نے وہ برہمی پکڑنے کی کوشش کی۔ جہاں ہڈیوں میں چھنی ہوئی برہمی۔ اس نے جھٹکا دے
 کے چھنی تو برہمی کا پھیل رہا اور اس کی چوب خون سے تر ہو کر اس کے
 ہاتھ میں آگئی تو اس نے خون آنسو پر بند کر کے آواز دی۔

”حسین! زین العابدین!“

”دیکھو یہ علی اکبرؑ کا خون ہے۔“

گویا علی اکبرؑ کو نقل کرنے سے بھی یہ زیادہ شگفتاوت تھی جو باپ، بھائی کو اس طرح
 خون دکھایا۔ اس موقع پر زین العابدینؑ نے حکم دیا۔ ”بیٹے کا پردہ گرا دو“

بس بھائیو!

اب ایک واقعہ اور سن لو۔ جب زین العابدینؑ قید سے رہا ہو کر مدینہ پہنچے تو یزیدؑ
 نے ایک لشکر جیسا جس نے مدینہ کو لوٹا۔ پھر وہی لشکر مکہ کو لٹے آیا، جب انہوں نے
 مکہ کا محاصرہ کیا جو اتنا تو یزید کے مرنے کی اطلاع آگئی۔ اور یزیدؑ کی موت کی خبر سننے کے
 وہ فوج اپنے سردار کو چھوڑ کر بھاگ گئی اس وقت اس فوج کا سردار حصین ابن نمیرؑ تامل
 شہزادہ علی اکبرؑ۔ اب وہ اکیلا رہ گیا۔ مدینہ کو لوٹا تھا۔ مکہ پر غلام کیا تھا۔ وہ یہ سمجھا کہ
 اگر ان لوگوں کے ہاتھ آگیا تو اللہ جانے کیا سزا دیں گے۔ چنانچہ جنگوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔

تاکہ یہاں سے کسی طرح نکل کر شام پہنچ جائے۔ مگر کوئی سبیل نظر نہ آئی۔ آخر بھوک پیاس سے مرنے لگا۔ پانی کی تلاش میں جنگل میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ دیکھا کہ سامنے خیمے لگے ہوئے ہیں۔ قریب گیا۔ پوچھا۔

یہ کس کے خیمے ہیں؟ — کسی نے کہا "امام زین العابدین کے۔"

اب جو اُس نے امام زین العابدین کا نام سنا تو کربلا کا واقعہ یاد آگیا۔ سوچنے لگا۔ انہیں تو میں نے بہت ستایا ہے۔ اگر ان کے ہاتھ آگیا تو اللہ جانے مجھے کیا سزا دیں گے؟ وہیں سے واپس لڑنے لگا۔ ابھی چند قدم چلا ہی تھا کہ اُس کے کان میں بڑی شیریں اور پیاری آواز آئی۔

"بھائی عرب! واپس آؤ۔ کیوں جا رہے ہو؟"

وہ واپس آیا۔ دیکھا تو امام زین العابدین سامنے کھڑے ہیں۔ دل میں خوش ہوا کہ امام نے مجھے پہچانا نہیں۔ آخر کچھ دیر بعد وہ ظالم بولا۔

"قبل مجھے بھوک لگی ہے۔"

امام نے فرمایا۔ "ہاں بیٹھو۔"

جب وہ بیٹھ گیا تو امام نے اپنے باورچی کو حکم دیا۔

بھائی عرب کے لئے گرم روٹی لاؤ۔ ٹھنڈا پانی لاؤ۔"

پہلے اُسے کھانا کھلایا۔ پھر اپنے ہاتھ سے جام بھر کے پانی پلایا۔ جب وہ خوب سیر ہو کے کھا چکا تو اسے نیند آگئی۔ سو گیا۔ اب جو تین چار گھنٹے بعد اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے سوچا۔ "اب تک تو کسی نے مجھے پہچانا نہیں اگر پہچان لیا تو قتل کر دیں گے۔ بہتر ہے فوراً چلا جاؤں۔ چنانچہ ایک دم آنکھ کھلتے ہی چل پڑا۔ ابھی تھوڑی دور چلا ہی تھا کہ امام نے آواز دی۔

ٹھہرو کہنا جا رہے ہو؟

”جناب مجھے جلدی ہے“

امامؑ نے فرمایا ” اچھا۔ یوں کرو۔ میری سواری کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ لے لو۔ تین چار دن کا کھانا ساتھ باندھ لو۔ پانی کی مشکب بھی رکھ لو تاکہ تمہیں راستے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔“

اب جبرائیلؑ نے یہ فرمایا تو حصین ابن زبیر کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔
حضور! شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں:

امامؑ نے فرمایا۔ ” میں نے پہچان لیا ہے۔ تو حصین ابن زبیر ہے نا۔“
بس اب جبرائیلؑ نے اپنا نام سنا تو تھر تھر کاپنے لگا۔

” قبیلہ وہی ہوں۔“

امامؑ نے فرمایا۔

” ڈرو مت۔ گھبراؤ مت۔ کربلا میں ہم تمہارے بہان تھے۔ آج تم ہمارے بہان

ہو۔“

سامعین! یہ فرق ہے آل محمدؑ میں اور ہم میں۔ ان کا عشق اللہ سے ہے۔ بس اس عشق کو دیکھ کے اللہ پکار اٹھا۔

” لے نفسِ مملوئہ!“

تم نے میرے عشق کا کمال کر دیا۔“

شجاعت

ادب ملوکیت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خداوند عالم عزوجل اس لئے جل جلالہ کی حمد و ثنا کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود بھیجا
حضرات گرامی !

اللہ نے انسان میں جو عاقبتیں ودیعت کی ہیں ان میں اسے متفاد عاقبتوں کا ایک بنایا ہے
اور انسان کی خوبی ہی یہی ہے کہ اس میں بیک وقت متفاد عاقبتیں موجود ہیں۔ گویا انسان
انتہائی مہربان و رحیم بھی ہے اور انتہائی بے رحم بھی ہے۔ انتہائی عادل و انصاف بھی ہے
اور انتہائی ظالم بھی ہے۔ انتہائی کمزور بھی ہے اور انتہائی طاقتور بھی ہے۔ انتہائی جاہل بھی
ہے اور بہترین عالم بھی ہے۔ انسان اگر اپنی عورت و شرافت پر آجائے تو فرشتوں سے بھوک
کراسے اور اگر اپنی جاہت پر اتر آئے تو پتھروں کو خود بھوک کرے۔ کہاں انسان کا وہ شرف
کمزوریت سے بھوک کرے اور کہاں اس کی روپیہ کی یہ خود پتھروں سے ملتا ہے جسے کرے یا
گناہ کے پانے گھٹے یا بوسے۔

اہل لاہور آج بے توہینا سب میں رہنے والے ہیں۔ آپ نے تو آقا و اہل بیت پر توہین کی پوچھی
ہیں اور راوی سے واسطہ رکھا ہے۔ مگر ہندوستان میں جہاں دیکھتے تو سچا ہوتا ہے کہ
تقریباً بیس کروڑ انسان کی زبانیں گنگا کران کہتے کہتے ٹھس رہی ہیں۔ اور گنگا بھی یہ کچھ

میٹھی کو بغیر بچے ہوئے، اماں بن میٹھی ہوں۔ اس سے بہتر اند کیا ہے۔ بہ نزع پر سے میں کروڑ ہندوں نے
 گنگا اماں کہہ کر گنگا کا دماغ خراب کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر سال۔ اماں کو خستہ جو آتا تو سیلاب آجاتا
 اور اپنے ہی بچوں کو بہالے جاتی۔ بچے لاکھ کہہ رہے ہیں۔ اماں! جانے بھی دو مگر اماں کو خستہ آیا ہوا
 ہے۔ چنانچہ، اماں کی یہ حالت دیکھ کر بچے رات دن دعائیں مانگتے ہیں۔
 - یا اللہ! اماں کو خستہ نہ آئے!

اماں کناروں سے باہر نہ نکلے۔ اس لئے کہ "اماں گھر سے نکلی نہیں تو بچوں کی خیر نہیں ہے"
 آج سے ایک عرصے پہلے انگریز قوم ہمارے ملک میں آئی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ گنگا میں سیلاب کیوں
 آتا ہے؟ چونکہ گنگا اماں بن کے بیکار میٹھی ہے (اور یہ بیکاری کا مشغلہ ہے کہ چلو اور نہیں تو کناروں
 سے ہی اچھل پڑو۔ لہذا انگریزوں نے جگہ جگہ نہریں کاٹ کاٹ کے چکیاں لگادیں۔ اب جڑاماں
 کو کچی پینا پڑی تو بگڑا ہوا دماغ صحیح ہو گیا۔ بہ نزع، انسان کی عزت تو یہ ہے کہ دنیا کی ہر شے
 اس کے تابع فرماں ہے۔ جبریل جیسا فرشتہ اس کا غلام ہے۔ گویا اگر انسان بلندی پر پہنچنا چاہے تو
 کعبہ کو تین اس کے فلین کو چھوئے اور اگر پستی پر گنا چاہے تو پتھر کو سجدہ کرے۔ انسانی فطرت میں
 یہ عجیب تضاد ہے۔

سامعین! بات سے بات نکلتی ہے اور سلسلہ گنگو بڑھتا جاتا ہے۔ آپ ایمان سے بتائیں
 کہ کون احسن انسان ایسا ہوگا جو بلا متنی ہوش و حواس پتھر کر خد کہا بنا کر۔؟ "نہیں" مگر بڑے
 بڑے عقلمند کہہ رہے ہیں کہ پتھر کو سجدہ کر، اور عقل مند بھی وہ جو لگا بھلی میں تکریم کریں تو دنیا
 کو حیران کر دیں۔ سیاسی گنگو کریں تو ساری دنیا کو چکر میں ڈال دیں اور اگر گھر میں جائیں تو پتھر
 کے سامنے اٹھ جڑ کر بیٹھ جائیں۔ یا تو عقل کی وہ تیزی یا دماغ کی ریزائی۔ اب اگر ان
 سے کوئی پوچھے، تمہاری عقل پر کیا پردہ پڑ گیا کہ تم ان پتھروں کو پوجے۔ چنانچہ انہوں نے جواب دینے
 میں: تمہاری عقل خراب ہے، کون کہتا ہے کہ ہم پتھر کو بوجھتے ہیں۔ ہم تو راجہ کو پوجتے ہیں۔
 ہم تو پراکٹر کو پوجتے ہیں۔ ہم تو پرتما کو پوجتے ہیں۔

پھر تم نے پتھر کیوں سامنے رکھا ہوا ہے؟

وہ جواب دیتے ہیں: "یہ پتھر ہمارا وسیلہ ہے۔"

ہم نے پوچھا: "پتھر کو کیوں وسیلہ بنایا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا: "ہم گنہگار ہیں۔ پتھر بے گناہ ہے۔ وسیلہ وہی بن سکتا ہے جو بلیگناہ ہو۔"

اب تمہیں بھی چُپ ہو گیا کہ گنہگار سے تر پتھر ہی کو وسیلہ بنانا بہتر ہے۔ بہر نزع انسانی فطرت

کی یہ عادت ہے کہ ہر انسان خواہ وہ بڑھا ہوا ہوا جان۔ نادان ہو یا بچہ اُسے ضد ہوتی ہے ٹوکنے والے

سے اور پیار ہوتا ہے نہ ٹوکنے والے سے۔ اب چونکہ اللہ بھی ٹوکتا ہے لہذا انسان نے سرچا کر

چھوڑ دیا ایسے اللہ کو جو ٹوکتا ہو۔ کیوں نہ ہم ایسا اللہ بنائیں جو ٹوکتا نہ ہو۔ چنانچہ تمہیں کو اللہ بنایا جو

کسی کو ٹوکتے ہی نہیں تھے۔ پُرچ لڑو اور داد نہیں کہتے۔ تو زور تو بڑا نہیں کہتے۔ لہذا یہ نہ ٹوکنے والے

اللہ اچھے ہیں۔ — سامعین! اگر چند پشتیں نہ ٹوکنے والے کو پر جتنے گزر جائیں اور جیسا الہی

دو چیزیں سامنے آئیں گی۔ ایک ہر ٹوکنے والی۔ ایک ہونہ ٹوکنے والی۔ تربیت پرستی کی عادت یہ

کہلوا دے گی کہ تمہیں نہ ٹوکنے والی کافی ہے۔ چونکہ عمر بھر نہ ٹوکنے والی کو پر جتا رہا اس لئے ٹوکنے

والے سے نفرت ہو گئی۔ بہر نزع انسان اپنے اعمال و افعال سے فرشتہ بھی ہے اور ذلیل و خوار

بھی ہے۔

عزیز سامعین! انسان کے اندر خدانے ایک شے رکھ دی ہے جسے "عقل" کہتے ہیں۔

عقل ایک ایسی شے ہے جسے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ مجھ میں سب سے زیادہ ہے۔ اپنی ہر

بات اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اور لفظ "اپنا" ہی میں بڑا پیار ہے۔ اپنا گھر، اپنا کنبہ، اپنا قبیلہ،

اپنا خاندان، اپنی اولاد، اپنا مذہب، اپنا وطن، گو یا جہاں لفظ اپنا آجائے بڑا پیار آتا ہے۔

ضلع چنگ کے ایک گاؤں میں چند دیہاتی اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کی بات ہو

رہی تھی۔ ایک نے کہا: "ساڑھے باا سائیں بڑے چکے لوگ تھے۔"

کیا چنگاٹ تھی؟ — "اکیسے چوری کر دے ہونے سن بہشتی۔ اک دھاڑے چوری

ارادہ کرتی ہے۔ قرآن پر تو قائل کیا۔ نہ کسی انجنیر سے نقشہ بنوایا نہ کسی مزدور کو بلا یا۔ نہ کسی معمار کو آنا دوی۔ نہ کسی کاریگر کو پکارا۔ گھر بیٹھ کے کہا۔

دیکھ کر نئے والے! میں غمی کسی ایک مکان بنا نا چاہتی ہوں۔ تڑپیری مدد فرما۔ چنانچہ اللہ نے وحی کی روشنی دے دی۔ وحی کی مشعل ہاتھ میں لے کر کبھی گھر سے نکلی۔ باغ میں پہنچی۔ باغیوں کی طرح باغ کو پامال نہ کیا۔ باغ کی ایک ایک کھوگئی۔ ایک ایک کلی چومی۔ ایک ایک پتے کو پیار کیا۔ ایک ایک شلخ کو سلام کیا۔ ایک ایک درخت پہ جا کے بیٹھی۔ ایک ایک پھول سے گفتگو کی۔ اور تمام پھولوں میں سے ایک پھول کا انتخاب کیا۔ قریب جا کے سلام کیا۔ اس ادا کے سلام کیا کہ پھول جواب میں مسکرایا۔ اور جب مسکرایا تو منہ کھول دیا اور یہ چپکے سے پھول کی گود میں جا کے بیٹھ گئی۔ کتنی پھول سے بیٹھی بیٹھی باتیں کرتی رہی اور پھول ہنستا رہا۔ عارض گل پہ خراش نہ آنے دیا۔ دامن گل پہ گرد نہ پڑنے دی۔ چنانچہ پھول مسکراتا رہا اور یہ اپنے گھر کا مصالحو بھی منع کرتی رہی اور خوراک بھی اکٹھی کرتی رہی۔ پھر ایسا گھر بنایا کہ بنا رہے تو بے کار اور اگر ٹوٹ جائے تو ہمارے لئے "فی شفا اللہ"

بہر زور۔ صرف مکان و عمارت بنانے سے عقل نہیں آتی۔ عقل کے معنی یہ ہیں کہ انسان یہ سمجھ لے کہ اس وقت مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اور یہ سوچ لے کہ عقل اس وقت کیا چاہتی ہے وہ اصل انسانیت ہے۔ اگر عقل یہ چاہتی ہے کہ اس وقت تلوار چلانی ہے تو پھر تلوار اتنی چلائے کہ اس کی چلائی ہوئی تلوار کو قلعوں کے دروازوں سے پہنچاؤں کے سر نہ روکیں۔ حد یہ کہ جبریل کے پر نہ روکیں۔ اور اگر عقل کہہ دے "نہیں" اب تلوار تباہ کرنی ہے" تو بڑے بڑے بزدل اگر گلے میں رستی ڈال لیں تو پرواہ نہیں۔ اگر عقل کہے کہ اب جاگتے رہنا ہے تو ساری رات جاگ کے گزر جائے اور "لیلی المریرہ" دنیا کی تاریخی رات بن جائے۔ اور اگر عقل کہے کہ اب سونا ہے تو ساری رات سو کے گزر جائے تو صبح تک کروٹ نہ لی جائے۔ اگر عقل کہے کہ روٹی کھانی ہے تو کھالی جائے اور اگر عقل کہے کہ بچپن کو فائدے سے نکلنا اور اپنی روٹیاں تینوں مسکینوں میں

بانٹ دو گیا قدرت عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کام کرو جو عقل کے مطابق ہو۔

میرے بھائیو! فلسفہ اخلاق کی اصطلاح میں عقل کے مطابق نقل و حرکت کو شجاعت کہتے ہیں چاہے وہ گھر کے اندر ہو یا گھر سے باہر ہو۔ لڑنے جھگڑنے کو شجاعت نہیں کہتے۔ مالک لکھا ہے کہ شجاعت نہیں کہتے بلکہ عقل کے مطابق عمل کرنے کو شجاعت کہتے ہیں۔

یاد رکھو! عقل کی باتیں اور ہیں۔ دنیا پر قبضہ کرنے کی باتیں اور ہیں۔ دنیا پر تو قبضہ اس طرح ہوتا ہے کہ۔۔۔ رات کو میں سو رہا تھا۔ ایک شخص دیے پاؤں کالی چادر اوڑھے رات کی تاریکی میں میرے کمرے میں گھس آیا اور میری ٹوپی چڑا کر لے گیا۔ بتاؤ جو آدمی میری ٹوپی لے گیا وہ کون ہے؟ ”چور۔ اگر وہ چور پکڑا جاتا تو آپ بھی اس کی پٹائی کرتے۔ پولیس بھی رہنا نڈر یعنی۔ اور عدالت بھی سزا دیتی۔ مگر اُسے سزا نہیں دی گئی اس لئے کہ وہ پکڑا نہیں گیا۔ گویا گورنمنٹ سزا اس بات کی دیتی ہے کہ چور پکڑا کیوں گیا۔ صرف پکڑے جانے کی سزا دی جاتی ہے۔ نہ پکڑا جاتا تو ہمارا دست بھی تھا۔ ہمارا بھائی بھی تھا۔ گویا پاس بھی بیٹینا اور چوری بھی کرتا۔ بہر نزع وہ چور پکڑا نہ گیا۔ اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اگلے دن پھر آ گیا۔ اور میرا کس اٹھا کر لے گیا۔ اسی طرح اور تین چار چوریاں کرنے کے بعد وہ پکڑا نہ گیا۔ اس کا حوصلہ اور بڑھا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے دس بیس آدمیوں کا ایک گروہ بنا لیا۔ اب تو اس کے پاس چاقو وغیرہ بھی آ گیا۔ پستول بھی لے لیا۔ سڑک پہ کھڑا ہو گیا۔ ادھر سے کوئی گذرنا تو درمیانے مارے اور سب کچھ چھین لیا۔ اب وہ کیا کہلائے گا؟ ”ڈاکو“ گویا چور پکڑانا جائے اس کی ترقی یا نئے شکل کو ڈاکو کہتے ہیں۔ دس میں اور ڈاکو کے ڈالے۔ اب بھی وہ نہ پکڑا گیا۔ ہزار دو ہزار کا گروہ بنا لیا تو وہ اشتہاری ڈاکو بن گیا۔ اب بھی وہ پکڑا نہ گیا۔ اس کا حوصلہ اور بڑھا۔ چنانچہ اس نے دس بیس ہزار ساتھیوں کو اکٹھا کر لیا۔ کہیں سے اسلحہ بھی لے لیا۔ اور ایک شہر پر ٹوٹ پڑا۔ وہاں کی پولیس کو مارا۔ شہریوں کو قتل کیا اور قبضہ کر کے وہاں کے گورنمنٹ ہاؤس پہ بیٹھ گیا۔ اب وہ کیا کہلائے گا؟ ”اعلیٰ حضرت“ نفل سجانی گویا چور جو پکڑانا جائے۔ اعلیٰ حضرت بھی ہے۔ نفل سجانی بھی ہے اور فاتح اعظم بھی ہے۔

چونکہ عمر بھر کپڑا لگا بلذات تاج اعظم ہے۔ ہماری کیا مجال کہ ہم اسے چور کہیں۔ یوں بنتی ہے لوکیت۔ یوں بنتی ہے شہنشاہیت۔ یوں بنتا ہے تخت و تاج۔ تخت و تاج کوئی آسمان سے نہیں برستا۔ قتل و غارت اور غضب شدہ تخت کو کہتے ہیں۔

یہ ہمیں خدا نے عطا کیا ہے، یہ ہمیں اللہ نے بخشا ہے۔

سامعین! مصیبت بن گئی ہے کہ وہ خدا نے عطا کیا ہے، کا لفظ بھی مولیوں نے سکھا دیا۔ ایک تھا نیدار کے گھر مولی صاحب کی دعوت تھی۔ مولی صاحب کے اعزاز میں پچاس آدمی اور بلوٹے گئے۔ پچاس قسم کے کھانے۔ یہاں سے وہاں تک دسترخوان۔ اب جو مولی صاحب نے دسترخوان دیکھا تو فرمایا۔ ماشا اللہ۔ دین زندہ ہے۔ اسلام خطرے میں نہیں ہے، بہر نوع! مولی صاحب بہت خوش ہوئے اور پوچھنے لگے۔

”تھانیدار صاحب! آپ کی تنخواہ کیا ہے۔“

قبلہ! انداز ہوتا ہے۔ تین بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا یورپ میں پڑھتا ہے۔ اسے ایک ہزار ماہوار بیٹتا ہوں۔ دوسرا گرنٹ کالج میں پڑھتا ہے۔ تین چار سو روپیہ وہ خرچ کر ڈالتا ہے۔ تیسرا سکول میں پڑھتا ہے۔ سو روپیہ وہ خرچ کرتا ہے۔ والدین زندہ ہیں۔ دوسروں پر یہ انہیں بھیج دیتا ہوں۔ اور تقریباً پچاس روپیہ ماہوار گھڑے کا خرچ ہے۔ تقریباً تین ہزار روپے کا خرچ تبا دیا اور ساندھی کہہ دیا۔ قبلہ! ”تنخواہ تقریباً دو سو روپیہ ہے۔“

مولی صاحب نے فرمایا۔ ” ماشا اللہ۔ اللہ فضل کرے گا۔ بس اس سے لوگوں کو بہمت ہوگئی کہ وہ اس تخت و تاج اور آمدنی کو اللہ کا فضل کہنے لگے۔ حالانکہ ایک چرک ترقی یافتہ شکل کو لوکیت کہتے ہیں۔“

سامعین! ایک حقیقی واقعہ سماعت فرمائیے گا۔ جب کابل کا امان اللہ امیر تھا۔ وہ اعلیٰ حضرت تھا۔ یورپ گیا۔ بیوی (شریا) ساتھ تھی۔ وہاں جا کے وہ اڑنے لگی تو پڑھنے ہوگئی۔ فارغ البال ہو کے، واپس آئی تو پچھتہ شور مچا کہ ایک دن کے لئے تخت کابل پر

میٹھا جب وہ شور مچا رہا تھا تو زمیندار اخبار کے ایڈیٹر مولانا طغریٰ علی خان نے TITEL PAGE پر ایک نظم لکھی تھی کہ جس میں اس کی بے پناہ برائیاں لکھی گئی ہیں۔ نظم کا ایک مصرعہ ملاحظہ ہو۔

خدا کی شان ہے سقے کا پتھر مقابل ہے محمدزایوں سے

اگلے دن جب یہ خبر آئی کہ وہ بادشاہ ہو گیا تو اسی زمیندار اخبار کے (TITEL PAGE) پر پتھر سقے کی شاناز تصویر تھی اور اس کے نیچے لکھا ہوا تھا: "اعلیٰ حضرت حضور پر نورؐ گویا پتھے سقے کو حضور پر نور وہ کہہ رہے تھے جو رسولؐ کے نور ہونے کے نائل نہیں تھے۔ بہر نوع وہ حضور پر نور ہو گیا۔ اُس کے بعد جنرل نادر آیا۔ اُس نے پتھے سقے کو باسز نکال کیا۔ اب یہ ادارہ لکھا گیا: "اچھا ہوا ایک بد معاش کو قتل کر دیا گیا۔" اب جنرل نادر اعلیٰ حضرت بنا دیئے گئے اقبال نے یہی ایک قصیدہ جنرل نادر کی شان میں لکھ کر بھیج دیا۔ چونکہ نادر امان اللہ کا کزنل تھا لہذا اسی کی طرف سے "پتھے سقے کے خلاف لڑا۔ نفع ہوئی تو خود تخت پر بیٹھ گیا۔ ادھر اقبال نے قصیدہ مدح میں لکھ دیا۔ سارا قصیدہ تو مجھے یاد نہیں ہے۔ ایک شعر سنا تا ہوں

دیکھو! ترجمہ تم خود کرنا ہے

قتل کردی کافرِ زندیق را (تو نے کافرِ زندیق) پتھے سقے کو قتل کر دیا۔
زندہ کردی سنتِ صدیق را (تو نے سنتِ صدیق زندہ کر دی۔

ہم بھی بہت خوش ہوئے کہ جنرل نادر نے سنتِ صدیق زندہ کر دی۔ پھر یہ تشویش ہوئی کہ سنتِ صدیق کس طرح زندہ کی گئی۔ رات بھر سوچا۔ دن چڑھے سبھرائی کہ جنرل نادر امان اللہ کا نونر تھا۔ اس کی طرف سے لڑا اور نفع ہونے پر خود تخت پر بیٹھ گیا۔ گویا مالک کے تخت پر بیٹھنا سنتِ صدیق ہے۔ بہر نوع جو چور کپڑا نہ جلے وہ اعلیٰ حضرت بھی بنے اعلیٰ سبائی بھی ہے اور حضور پر نور بھی ہے۔ اگر عقل کے مطابق عمل ہو تو شجاعت کہلاتی ہے۔ ورنہ وہ چوری ہے۔ اور چوری کی ترقی یافتہ شکل کو ملکیت کہتے ہیں۔

عزیز سامعین! میں یہاں اپنے بیان کو ختم کرتا ہوں کہ نوجوان پتھے مجھ سے فرمائش کرتے ہیں

• زیدری صاحب! خیر ساڈ۔ خندق ساڈ!

میں کہتا ہوں "بچو! تہا اگر گرم خون ہے۔ لڑائی میں تمہیں لطف آتا ہے۔ مگر میں بڑھا آدمی ہوں مجھ سے خندق وغیراب بیان نہیں ہو سکتا۔ چونکہ خیر اور سفید دائرہ کا آپس میں کوئی جوڑ ہی نہیں ہے۔ لہذا عزت اسی میں ہے کہ خاموش بیٹھا رہوں۔ اگر میں تمہارے کہنے پر خیر شروع بھی کر بیٹھوں تو بیچ میں سے چھوڑ کر آنا پڑے گا۔ پھر کیا فائدہ۔ بچو! تم ہی میرا مذاق اڑاؤ گے۔" بابا! جب چھوڑ کر آ ہی جانا تھا تو گیا ہی کیوں تھا۔" بہر حال خیر کی جنگ ہو یا خندق کی، اصد کی لڑائی ہو یا بدر کی۔ اگر عقل کے مطابق تلوار چل رہی ہے تو شجاعت ہے ورنہ بیکار ہے۔

اب بتاؤ! جس علی کو رسول "اسعا اللہ کہتا ہوں۔ جسے محمد ید اللہ" کہتا ہوں اس کا کوئی عمل انسانی عقل سے ادھر ادھر تھا؟ ہرگز نہیں۔" مومن بھائیو! تمہارے سینے فخر سے تن نہیں جاتے جب تمہارے سنے کوئی کہتا ہے۔ "علی وہ ہے جس نے خیر فرج کیا۔ علی وہ ہے جس نے خندق فرج کیا۔" ہمیں غرور پیدا ہوتا ہے۔ جب کوئی ہمیں شیعین علی کہتا ہے۔ گویا علی ہمارے غرور کا سامان ہے۔ خدا گواہ ہے۔ ہمارا جی چاہتا ہے دنیا کو کوئی شے نہ لکھیں۔ تخت چم کو ٹھوکر اڑیں۔ جب ہم یا علی کہتے ہیں اُس وقت ہمارا سر درد ہی کچھ اور ہوتا ہے، ہماری شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ علی وہ ہے جس نے خیر کی پڑلیں ہلا دیں، علی وہ ہے جس نے خندق کی گرداڑا دی۔ اتنا بہادر انسان اتنا شجاع انسان، بتاؤ! چیم فلک نے علی جیسا انسان دیکھا ہے؟۔ "ہرگز نہیں" سامعین! میں تم سے نہیں پوچھتا۔ علی سے پوچھتا ہوں۔ یا علی!

میرا ایمان ہے کہ آپ سے زیادہ بہادر انسان دنیا میں آج تک پیدا نہیں ہوا۔ آپ سے زیادہ شجاع انسان چیم فلک نے آج تک نہیں دیکھا۔ "یا علی" کہنے کو میں اسم اعظم سمجھتا ہوں۔ مگر میرے مولا! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ خیر کا فرج کرنا ایک طرف۔ خندق کا فرج کرنا ایک طرف۔ بستر نبیؐ پر بے خطر سو جانا ایک طرف۔ ان سب شجاعتوں کو ایک پلے میں رکھو اور دوسرے پلے میں تین دن کی پیاس میں گرمی کے موسم میں دریا میں جا کر پیاسہ نکل آنا۔ اس

کی مثال پوری کائنات کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ مگر ایک مہادرو دنیا میں ایسا بھی گذرے گا جس نے تین دن کی بھوک پیاس کے باوجود دریا میں جا کے پانی نہ پیا۔ اتنا قابل جرنیل جس نے بہتر کر لاکھوں سے لڑا دیا۔ اتنا قابل سپاہی جس کیلئے کے اوپر پورے کبن کا ڈھارس تھا۔

فری محرم کا دن۔ عصر کا وقت اور امام نماز سے نارخ ہو کر مصلے پر سر جھکانے بیٹھے ہیں۔ عالمِ حریت ہے کہ اچانک بے حیافوج نے حملہ کر دیا۔ یہاں تک کہ گھوڑوں کے ٹاپوں کی گرد سیدانیوں کے خیموں میں آنے لگی۔ سیدانیاں "ناوعلی" دم کر کے پتوں کو لے کر خیموں میں دم بزد کھڑی ہیں۔ جب بدہ کانی قریب آگئے تو حسینؑ سرکار کے کاہنہ انجیٹ نے عرض کی۔

مولانا!

مولانے نظر اٹھائی۔ "بھائی عباس کیا بات ہے؟"

آقا! فوج سیدانیوں کے خیموں کی طرف بڑھی چلی آ رہی ہے۔ میرے سپاہی تیار کھڑے ہیں ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ عباسؑ اپنی انتھار میں ہیں کہ مولانا فرمائیں گے۔ "روک دو" مگر مولانے حکم دیا۔ عباسؑ بھائی! میں حکم دیتا ہوں۔ تم خود اس فوج کے سامنے جاؤ اور ان سے کہ دو۔ میرا امام ایک رات کی مہلت چاہتا ہے۔ اب جو حسینؑ نے یہ فرمایا تو عباسؑ نے گھبرا کر پوچھا۔

مولانا میں اب ان سے مہلت مانگوں؟

"ہاں میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔ تم خود جا کے ان سے مہلت مانگو۔"

عباسؑ نے سر جھکا دیا۔ نیام سے تلوار نکال کے کھڑی گھوڑے پر سوار ہوا۔ سر جھکا ہوا۔ مہلت مانگنے جا رہا ہے۔ ابھی چند قدم چلے ہی ہوں گے کہ امامؑ نے فرمایا! حبیبؑ! ازیرؑ کو ساتھ لے کر احتیاطاً تم بھی چلے جاؤ۔ ہو سکتا ہے کسی بات پر میرے بھائی کو غصہ آجائے۔ چنانچہ دونوں بزرگ بھائی بھی ساتھ ہوئے۔ دائیں طرف حبیبؑ۔ بائیں طرف ازیرؑ تین اور درمیان میں اپنے وقت کا حیدر کرار۔ فوج کے سامنے پہنچ کر گھوڑا روک کر فرمایا۔ "چچا حبیبؑ! مہلت والی بات تم ہی کہہ دو۔ مجھ سے کہا نہیں جاتا۔"

شہزادے! مولائے آپ کو حکم دیا ہے؟

عباسؑ آگے بڑے۔ سر جھکا ہوا۔ بدن پینتہ میں تر۔ دل دھڑک رہا ہے۔ بدن کانپ رہا ہے۔ ہونٹ لرز رہے ہیں۔ بھرائی آوازیں فرمایا۔ "عمر سعد! میرے امام نے ایک رات کی مہلت ۔۔۔۔۔" بس اتنا ہی فقرہ کہا۔ مانگنے کا لفظ نہیں بولا۔ بہر نوح اُس نوح نے مشورہ کیا اور مہلت ہو گئی۔ والیں لوٹے۔ بیچ میں قمر بنی ہاشمؑ اور داہنے بائیں حبیبؑ زبیرؑ تھوڑی دور چلے تھے کہ دونوں بڑھے آپس میں باتیں کرنے لگے۔ حبیبؑ نے زبیرؑ سے کہا۔

"زبیرؑ! تمہیں یاد ہے؟ جب اس نوجوان کی ماں سے علیؑ نے عقد کیا تھا؟"

زبیرؑ نے جواب دیا "ہاں حبیبؑ"

حبیبؑ نے کہا زبیرؑ! عقد کے بعد علیؑ نے کہا تھا کہ اس خاتون کے بطن سے جو بیٹا پیدا ہوگا

وہ میری بہادری کا وارث ہوگا۔"

زبیرؑ نے کہا "ہاں۔ مجھے یاد ہے"

دونوں بڑھوں نے جو یہ بات کہی تو وقت کے حیدرؑ کو رازنے ایک انگڑائی جولی تو گھوڑے کی رکابیں ٹوٹنے لگیں اور گھوڑا ررک کے فرماتے ہیں۔

"حبیبؑ! زبیرؑ! یہ فقہہ سنا کے مجھے بہادری کا جوش نہ دلاؤ۔ میں ٹھہرا ہوں۔ تم دونوں مولائے کے پاس جاؤ اور مجھے لانے کی اجازت دلا دو۔ اگر صبح سے پہلے کونے کے دارالار سے پر حسینؑ کا جھنڈا نہ لہرا دوں تو علیؑ کا بیٹا نہ کہنا"

عباسؑ نے یہ فقرہ جو پڑے جوش میں کہا تو امامؑ نے سُن لیا۔ وہیں سے آواز دی "کس نے میرے شیر کو غصہ دلا دیا۔ عباسؑ بھائی آؤ۔ میں انتظار کر رہا ہوں؟ امامؑ نے بھائی کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیں۔ سینے سے لگایا۔ پیشانی چومی۔

میرے پیارے بھائی۔ کیا بات ہوئی؟ مولائے کوئی بات نہیں تیرا تابع فرمان ہوں۔ جو تو حکم دے گا تعمیل ہوگی"

سامعین! میں اپنے بیان کرانِ فکلوں پر اگر ختم کرتا ہوں کہ جب دونوں بھائی بیت الشرف
میں تشریف لائے تو زینب نے پوچھا۔

”عباس بھائی! کیا فیصلہ ہوا۔“

عباس تو چپ رہے۔ حسین نے کہا ”کل تک کی مہلت۔“

زینب نے رات کو گھر کی تمام عورتوں کی کانفرنس بلال۔ جب تمام عورتیں آپس میں توڑی لی
اُن سے کہتی ہے۔

”بی بیو! مجھے جانتی ہو۔ میں ملٹی کی بیٹی ہوں۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری چادر کی

میں خاص ہوں۔“

عورتوں نے کہا۔ ”بی بی! تیرے وعدے کے بعد ہم بے نگر ہیں۔“ بات ختم ہوئی۔ رات ڈھل گئی

صبح عاشور ہوئی۔ دوپہر ڈھلا۔ حسین جب علم لے کر خالی آئے تو وہی زینب عورتوں سے کہہ رہی تھی۔

”بی بیو! میں نے رات جو تم سے وعدہ کیا تھا۔ اب میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔ جس بھر رس

یہ کہا تھا وہ ختم ہو گیا۔ میرا بھائی عباس مارا گیا۔“

سامعین! فلسفہ اخلاق کی اصطلاح میں عقل کی اس نقل و حرکت کو شجاعت کہتے ہیں۔ تین

دن کی بیوک پیاس کے باوجود دریا میں جا کے پیاسہ گل آنا وہ عمل ہے جسے آج تک

چشم تک نے کہیں نہیں دیکھا۔ مگر اللہ کے چنے ہوئے بندوں نے کر بلا میں عملاً کر دکھایا جس پر

قدرت نے بڑھکر ان بندوں کا چرم لیا اور فرمایا۔

”اے نفسِ مطمئنہ!

دنیا نے تمہاری شجاعت دیکھ لی ہے۔ تم نے وہی کر دکھایا جو اللہ چاہتا تھا۔“

اللہ سے ڈرو

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خداوند جل جلالہ و عزت! اسمہ کی حمد و ثنا کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام! حضرات گرامی قدر! اللہ کا یہ فرمان ہے، "قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ"

اے رسول! میرے ان بندوں سے کہہ دو، ان تک یہ پیغام میرا پہنچا دو کہ اگر تمہیں خدا سے پیار ہے، اگر تمہیں خدا سے محبت ہے۔۔۔۔۔ ماشاء اللہ! جمع تو کافی ہے اتنے بڑے مجمع سے میں پوچھ رہا ہوں۔ "آپ کو خدا سے محبت ہے۔ کیوں بھی خدا سے محبت ہے"۔۔۔۔۔

بات یہ ہے حضور! مجھے پتہ ہے کہ آپ اس محبت کے جواب میں سچ کیا کیوں گئے۔ آپ نے ہاں کیوں نہیں کہا ایک دم۔ اس لئے شاید آپ نے ہاں نہیں کہا کہ ساری عمر گزر گئی آپ کی۔ اور میری بھی۔ علمائے کرام کی زبانی یہ سنتے ہوئے کہ "اے ایسا مذاور۔ اللہ سے ڈرو" اور اتنا ڈرا یا ہے اللہ سے ہمیں ان اللہ والوں نے کہ کُحْبِیْت" میں ہاں کہتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔۔۔۔۔ جو آدمی اٹھتا ہے یہی کہتا ہے "اللہ سے ڈرو" اور کوئی ان ڈرانے والوں سے یہ نہیں کہتا کہ "تم بھی اللہ سے ڈرو" کیوں اللہ کے بندوں کو اللہ سے ڈراتے ہو۔۔۔۔۔ مگر ہر ایک یہی کہہ رہا ہے۔ "اللہ سے ڈرو" اور اتنا ڈرایا ہے اللہ سے ہمیں ان اللہ والوں نے کہ کُحْبِیْتوں کا تو میں کچھ کہتا نہیں۔ آج کی جوان پود انہی ڈر گئی ہے کہ جہاں کہیں اللہ کا نام ہو وہاں نہیں جاتے۔ جہاں اللہ کا ذکر ہو۔ وہاں نہیں جاتے۔۔۔۔۔ اگر جارہے ہوں اور سامنے مسجد آجائے تو فوراً راستہ

کاٹ کے گزریں گے۔ ڈر کے مارے کہ نہوی صاحب جو کہتے ہیں کہ اللہ سے ڈرو۔
مجھے سمجھ نہیں آتی کہ اللہ کوئی ظالم شے ہے جو اس سے ڈرو۔ وہ
کوئی ڈراؤنی شے ہے جو اس سے ڈرو۔ وہ کوئی مستاتا ہے جو
اس سے ڈرو۔ وہ کوئی تکلیف پہنچاتا ہے جو اس سے ڈرو۔
مگر کہتا ہر ایک یہی ہے کہ اللہ سے ڈرو۔ اور ڈرا ڈرا کے اللہ سے
آج ہمارے دل اتنے کمزور کر دیئے ہیں۔ کہ ہم سچ سچ اللہ سے
ڈرنے لگے۔

آج میں آپ سے ایک بات کہتا ہوں۔ اللہ جانے میری یہ بات کسی کو پسند آئے گی
یا نہیں۔ میں اپنی ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں۔ کہ "اللہ سے مت ڈرو" اللہ کوئی ڈرنے
کی شے ہے۔ اللہ تو محبوب ہے۔ اللہ تو بڑی پیاری شے ہے۔ اللہ تو بہت ہی محبت کرنے
کے قابل شے ہے۔ اللہ سے تو پیار کرنے کو دل چاہتا ہے۔ وہ ہم سے ہم پر زیادہ مہربان
ہے۔ اُسے ہم سے اتنا پیار ہے۔ کہ ہماری ضرورت کی چیزیں جو ہم سے پہلے ہتیا کر دے۔ ہم
دُنیا میں آئے نہیں تھے۔ ہمیں سانس کی ضرورت تھی، ہوا پہلے پیدا کر دی۔ ہمیں بسنے کی
ضرورت تھی۔ زمین پہلے پیدا کر دی۔ جس نے ماں باپ جیسے مہربان ہمیں دیئے جس نے پرورش
کے سارے سامان ہتیا کئے۔ جو دُنیا میں ہماری حفاظت کرتا ہے۔ جو چوبیس گھنٹے ہمارے
ساتھ لگاؤ رکھتا ہے۔ ہم سوتے ہیں۔ وہ کبھی سوتا نہیں۔ ہم ٹھہری جاتے ہیں۔ وہ کبھی ٹھہرتا
نہیں۔ ہم اسے پکارتے ہیں۔ وہ فوراً ہمیں جواب دیتا ہے۔ وہ ہم سے بات کرتا ہے۔ وہ ہماری
دعا میں سنتا ہے۔ ہماری التجائیں سنتا ہے۔ ایسا پیارا اور محبوب اللہ۔ ایسے پیارے اللہ سے
ڈرو کیوں۔ اُس سے پیار کرو۔ اُس سے محبت کرو۔ اُس سے الفت کرو۔ اور یہ جو
تمہیں کہا جاتا ہے۔ "اللہ سے ڈرو" اس کے معنی یہ ہیں جو نیکو وہ محبوب ہے چونکہ اُس سے
محبت ہے۔ ڈرو اس بات سے کہ وہ محبوب کہیں روٹے نہ جائے۔ اور اگر تمہیں برا اندیشہ

ہو جائے گا۔ کہ وہ رد ٹھک گیا ہے تو اس رُوٹھے ہوئے کو منانے کا طریقہ یہ ہے۔ ”وَكُونُوا مَعَ
الْمُضَلِّينَ“ سچوں کا ساتھ دو، وہ راضی ہو جائے گا۔“

بہر نوح اللہ کو ہم سے محبت ہے۔ اور اللہ فرماتا ہے۔ ”رسول! ان سے کہہ دو۔ اگر تمہیں
مجھ سے محبت ہے۔ تم مجھے چاہتے ہو۔ تمہیں مجھ سے پیار ہے۔ تو تم ایسا کرو۔ کہ محبت ہے تمہیں۔
اللہ سے اور پیروی کرو تم رسول کی۔ اتباع کرو تم رسول کا۔ حکم مانو تم رسول کا تو مجھ کو اللہ
تعالیٰ اس کا یہ ہوگا۔ کہ اللہ کو بھی تم سے پیار ہوگا۔ اللہ کو بھی تم سے محبت ہو جائے گی جس طرح
تمہیں اللہ سے محبت ہے اُس طرح اللہ کو بھی تم سے محبت ہو جائے گی۔

میرے سامعین! اب آپ ہی بتائیں کہ ہم اللہ سے محبت کریں۔ یہ مرتبہ زیادہ ہے۔ یا اللہ
ہم سے محبت کرے یہ مرتبہ زیادہ ہے۔ —————؟ بہر نوح اللہ فرماتا ہے کہ تم رسول کی پیروی کرو۔
اللہ تم سے محبت کرے گا۔ خداوند عالم تم سے پیار کرے گا۔

ہمارا سب کا دل چاہتا ہے کہ ہم اللہ کے قریب ہو جائیں۔ چونکہ اللہ سے
محبت ہے۔ صبح سو کے اٹھتے ہیں۔ نیند آنکھوں میں بھری ہوتی ہے۔ اور
اُسی نیند کے عالم میں با وضو ہو کر اللہ کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور
کہتے ہیں۔ ”قَدِيبَةُ اِلَى اللّٰهِ“ اس لئے سامنے کھڑا ہوں کہ اللہ سے
قریب حاصل ہو جائے۔ اس سے ہمیں محبت ہے۔ اس کے ہم قریب ہو
جائیں۔ اور لطف یہ آتا ہے۔

نازی بھائیو!

ہم رات کو سوئے۔ صبح کو اٹھے۔ آنکھ میں نیند بھری ہوتی ہے۔ اٹھ کے وضو
کیا۔ اب جی چاہتا ہے کہ اللہ سے بات کریں۔ چونکہ اُس سے ہمیں محبت ہے۔ اور ہمیں بتایا گیا ہے۔
کہ ہر طرف اللہ ہے۔ کائنات میں جہدھر رخ اٹھا کے دیکھو اللہ ہے۔ ہر طرف اللہ ہے۔ شمال میں
بھی اللہ ہے، جنوب میں بھی اللہ ہے، مشرق میں بھی اللہ ہے۔ مغرب میں بھی اللہ ہے، چاروں

ظرف اللہ ہے، پھر جڑھ جاہو نماز پڑھ لو۔ لیکن اللہ کتنا ہے ”نہیں“ اگر تمہیں ہم سے پیار سے تو رسول کی پیروی کرو۔ جب تک رسول کی پیروی نہیں کرو گے تو ہم سے بات تک نہیں کرو گے۔ اگر تمہیں سے ایک کو قبلہ نہیں بناؤ گے میں نماز نہیں قبول کروں گا۔ میرے رسول کو کبھی وہ کس طرح نماز پڑھتا ہے۔ وہ کس ظرف رخ کر کے نماز پڑھتا ہے۔ اگر تم بھی اسی طرح نماز پڑھو گے تو اللہ کا قرب حاصل ہو جائے گا۔ تم اللہ کے قریب ہو جاؤ گے۔

اب ہم نے نماز پڑھنا شروع کر دی۔ اللہ کے قریب ہو گئے۔ (۲۱) ادا سے اللہ سے ہم سے گفتگو کر رہے۔ اس پیار سے اللہ نے ہم سے بات کی ہے کہ جیہاں بھی لطف آ گیا۔ اور اللہ کو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔

ہم نے جا کے اللہ سے کہا کیا؟ ہم کھڑے ہو گئے جا کے اللہ کے سامنے کیوں کہ ہم اللہ کے سامنے کھڑے ہیں۔ شہنشاہوں کے شہنشاہ کے سامنے کھڑے ہیں۔ ایسے عالم میں جب اتنی بڑی جہت سے بات کرنا ہو۔ تو بات کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنا، بڑی گستاخی ہے بڑی بے ادبی ہے۔ ادب سے۔ آرام سے کھڑے رہو۔ نظر ادھر ادھر نہ ہونے پائے۔ پھر دونوں ہاتھ اٹھاؤ۔ کانوں تک لے جاؤ اور کہو ————— ”اللہ اکبر“ یا اللہ جھ سے بڑا کوئی نہیں مگر یہ بات کہنا ہاتھ اٹھا کے۔ یعنی اللہ سے یہ افسار کرنا کہ ”اب ہم تیرے سامنے کھڑے ہیں، ہم نے دنیا کی ہر شے سے ہاتھ اٹھایا ہے۔ اب دنیا کی کسی چیز سے ہمارا واسطہ نہیں رہتا۔“

اللہ نے کہا ”لو لو ————— کیا کہنا چاہتے ہو“ تو ہم نے کہا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
تو پڑھا جو، درجیم ہے تو رب انہی

ہے۔ تو یوم التریاں کا مالک ہے۔ تو میرے، میرے مستقیم پر قائم رکھو۔
اللہ نے کہا: سبحان اللہ! ایسی اچھی بات کہہ ہے تم نے۔ یہ باتوں
تو نے کہاں سے سیکھ لیں؟

ہم نے کہا: حضور! ہم نے ایک کتاب میں پڑھی تھیں۔ "اللہ نے
کہا: "اس کتاب کی کوئی اور بات بھی تمہیں یاد ہے، ہم نے بسم اللہ
پڑھ کے ایک سورتہ اور پڑھ دی۔"

سورتہ پڑھ دی، تو اللہ کی عظمت دل میں پیدا ہوئی۔ فوراً سر جھکا کر
کہا: "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ" تو کتنا عظیم ہے جو مجھ جیسے
حقیر کی سنتا ہے! اب جو سر جھکا کر سر اٹھایا۔ تو اللہ نے فوراً اپنی
گفتگو کی، رسیدے دی: سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ سُبْحَانَ اللَّهِ
بندے جو تو نے حمد کی۔۔۔۔۔ پھر ہم نے اس شکر یہی کیا کہ اس

نے ہم جیسے حقیروں کی بات سُن لی۔ سجدے میں سر رکھ دیا۔
سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ۔ تو کتنا اعلا ہے۔ کچھ جیسے ادنیٰ کی بھی سُن لی
سجدہ کیا۔

اب اللہ نے پیار سے کہا: بندے! تو میرے سامنے کھڑا بھی رہا۔ سر
بھی جھکایا۔ تو نے سجدہ بھی کیا۔ خشک کیا ہو گا۔ بیٹھ جا۔۔۔۔۔
چنانچہ ہم سجدہ کر کے بیٹھ گئے۔ اور ہم نے سوچا کہ: "اس نے بیٹھنے
کا موقع دیا ہے۔۔۔۔۔ اتنا مہربان ہے۔ اس وقت
کو مناسب نہ کرو۔ اب بھی کچھ مانگ لو۔"

اب ہم نے بیٹھ کے مانگا کیا: ایزاولاد انگی۔ نرزق مانگا۔ نرزولت
مانگی۔ نزاہ مانگا۔ پھر کیا مانگا: اَسْتَغْفِرُ اللَّهَ رَبِّي وَآتُوهُ إِلَيْهِ

خداوند! بیٹھا یا ہے تو گناہ بھی معاف کر دے، گنہگار ہو کے بیٹھنا اچھا نہیں معلوم نہیں ہونا، اور اس استغفار کے شکر لیے میں ایک سجدہ اور کر لیا۔ ”خداوند! ایک سجدہ اور کرتا ہوں“

پھر اٹھ کے کھڑے ہو گئے

یہی ہے گفتگو جو نمازی اللہ سے کرتا ہے۔ پھر اللہ سے پیار مجتہد کی باتیں ہونے لگیں۔ پھر سر جھکا کے اُسے عظیم کہا۔ پھر اس نے ریبند ہی۔ سمع اللہ کہہ کے۔ پھر ہم نے سجدے میں سر رکھ کے ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى“ کہا۔ جب دو سجدے کر لئے خدا کے سامنے تو اللہ نے کہا: ”بندے تو نے مجھ سے باتیں کی ہیں، تو نے مجھ سے گفتگو کی ہے۔ تیرا میرے ساتھ پیار ہوا ہے۔ مگر یہ بتا، کہی فریخی، خیالی دہمی اللہ کی تو تو نے عبادت نہیں کی۔“

اب ہم نے دوسری رات کے دو سجدے ادا کر کے بیٹھ کے اللہ سے

گفتگو کی۔

میرے اللہ! میں نے کسی نفل اللہ بات نہیں کی،

پھر کس سے کہ، ”اللہ نے پوچھا

میں نے فوراً کہہ دیا، ”أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ“

میں نے اس اللہ سے بات کی ہے جو لا الہ الا اللہ ہے۔ جو وحدہ لا شریک ہے“

اللہ نے کہا۔ شاباش! تجھے کیسے پتہ چلا، کہ میں لا الہ الا اللہ ہوں، تجھے کیسے پتہ

چلا کہ میں واحد لا شریک ہوں، میں نے عرض کی، کہ مجھے تو خاک بھی پتہ نہیں تھا

مجھے تو یہ بات ایک بندے نے بتائی ہے،

اللہ نے پوچھا ”کون بندہ؟“

یہ نے فوراً کہہ دیا "اَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا عَبْدُكَ وَرَسُولُكَ"
 "مجھے تو یہ بات محمدؐ نے بتائی ہے۔ جو تیرا عبد بھی تھا اور رسولؐ بھی تھا۔"
 اللہ نے پوچھا "محمدؐ کو دیکھا ہے؟"

میں نے کہا نہیں۔

پھر تجھے کیا خبر کہ محمدؐ نے بتایا ہے؟

میں نے عرض کیا "میرے پاسنے والے۔ محمدؐ کی بتائی ہوئی یہ بات مجھ تک
 کچھ لوگوں نے پہنچائی ہے۔"

تو اللہ نے کہا "اب کا نام بھی تو لے جنہوں نے یہ بات تجھ تک پہنچائی ہے؟"

میں نے فوراً کہا "اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ"

اب جو کہا تو اللہ سے بات ہو گئی۔ قرب ہو گیا، پیار ہو گیا۔

میرے محترم سامعین! تم کا جی بیروں چاہتا اللہ سے پیار کرنے کو کس کا؟

نہیں چاہتا بڑی ہمت سے پیار کرنے کو۔ اگر گورنمنٹ ہاؤس جا کے

گورنر سے بات کر آئے تو چار دن گھر والوں سے بات نہیں کرتے۔ اور اگر

صدر سے کو ہیں، آئے۔ تو بتی والے سے بات نہیں کرتے۔

مگر یہ اللہ کا پیار ہے کہ وہ روزانہ پانچ مرتبہ بکا آئے "اَللّٰهُمَّ

مجھ سے بات کر دو۔" اور مجھ سے گفتگو کر دو۔ کوئی چپڑا ہے تمہیں

نہیں روکے گا۔ کوئی زبان تمہیں نہیں روکے گا۔ کوئی لقب

تمہیں نہیں روکے گا۔ کوئی زبان تم سے رشوت نہیں لے گا۔

اور سنتے بھی ہو، اگر میرے گھر آنے کی تمہیں فرصت نہیں، تم مجھے

اپنے گھر پکارو۔ میں آؤں گا۔ تم میرے ساتھ بات کر دو۔ میرے ساتھ

گفتگو کر دو۔ اور پھر دیکھو ایسے محو ہو جانا مجھ سے بات کرنے میں کہ

دنیا کا ہوش نہ رہے۔ کوئی شے یاد نہ رہے بس میں ہوں اور تم بلا

اس ادا سے بات کرنا کہ بس میں ہوں۔ یا تم ہو۔ یہاں تک کہ میرے
ساتھ بات کرتے وقت اگر تمہارے پیر میں لگا ہوا تیر بھی کھینچ لیا
جائے۔ تو تمہیں پتہ نہ چلے (۳۱) سے میں سمجھوں گا کہ تم مجھ سے گفتگو
کو رہے ہو۔

خداوند! "تیر" وہ بات تو ہم نے سُن لی۔ مگر جس کے پیر سے تیر کھینچا تھا۔ اور
اسے پتہ نہیں چلا تھا۔ اس کی یہ بات بھی تو ہم نے سُنی ہے کہ وہ نماز پڑھ رہا تھا۔ اور نماز
کے عام میں سائل نے آواز دی۔ اور سائل کی آواز سن۔ اور اٹھ کر آنگوٹھ دے رہا۔
یا تو اتنی بے خبری۔ نماز میں اتنی محویت کیا تیر کھینچ گیا اور پتہ نہ چلا۔ اس سائل کی آواز بھی سن۔ اور
اللہ نے کہا "تیر" تم کس بات کو غور سے نہیں سنتے۔ اس نے اعتراض
کرتے ہو۔ کون کہتا ہے کہ اس نے سائل کی بات سُننی تھی۔ بتیہیں کس
نے بہکا دیا۔ کہ اُس نے سائل کی گفتگو سُننی تھی۔ تم نے اچھی طرح سے
سارا قصہ پڑھا نہیں۔ تم نے سارے قصے پر غور نہیں کیا۔ بات
یہ ہے۔ نماز ہو رہی تھی۔ سائل مسجد کے دروازے پہ آں کھڑا ہوا۔ اس
نے نمازیوں سے خبرت مانگی۔ وہ مانگا رہا۔ کسی نے نہ دی۔ (۳۱)
لئے کہ جواز کو نہ دینے والا تھا۔ وہ سن ہی نہیں رہا تھا سائل کی گفتگو۔
وہ نماز میں مشغول تھا۔ وہ اللہ کے سامنے کھڑا تھا۔ جب
سائل کو کچھ نہ ملا۔ تو اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کے کہا "یا اللہ
میں تیر سے رسول کی مسجد سے محروم جا رہا ہوں۔" جب تک سائل
مسجد والوں سے مانگا رہا۔ (۳۱) نے کچھ نہ سنا۔ اور جب اللہ سے دعا
کی۔ اور جو اللہ کے ساتھ پہنچا ہوا تھا (۳۱) نے سُن لی۔ اور اگر آپ میری
زبان میں سنا چاہیں تو یوں سمجھو۔ جب سائل نے اللہ سے دعا کی تو اللہ
نے کہا "بھئی یہ نماز، مشغول ہیں۔ انہیں کیوں مانگا کرتا ہے۔ اور کیوں پہنچتا ہے۔"

ہے تو اللہ کے ہاتھ سے لے، اللہ نے اپنے ہاتھ سے زکوٰۃ دے دی۔ مہر نوریہ اللہ سے پیار کی باتیں ہیں۔ اللہ سے محبت کی باتیں ہیں۔ جو اللہ سے پیار کرے اللہ اسے محبوب بنا لیتا ہے۔ اللہ اسے پیار کرتا ہے مگر

میرے محترم سامعین! محبت جو ہے۔ پیار جو ہے۔ یہ بڑی مشکل منزل ہے۔ بڑی کٹھن منزل ہے چاہے نہ کسی سے ہو۔ اور شاعر نے تو کہا ہے کہ پہلی ہے عشق بشر عشق خدا مشکل ہے!

محبوب یہ چاہتا نہیں کہ سب مجھ سے محبت ہو، تو کوئی اور بھی دل میں آئے، یہی اللہ چاہتا ہے۔ کہ جب مجھ سے محبت ہے تو پھر تیرے دل میں ہیں رمواں گا۔ اور کوئی نہ آئے، اور یہی ہے ناعدیت قدسی کا مفہوم!

میں نہ زمینوں میں، رہتا ہوں، نہ آسمانوں میں رہتا ہوں۔ میں تو اپنے چاہنے والوں کے دل میں رہتا ہوں!

کچھ نا صاحبان! اللہ آپ لوگوں کے دل میں رہتا ہے مگر اس دل میں رہنے والی بات کو نہ فریاد بھی، دل میں سوچو اللہ کا گھر ہے تمہارا۔ دل میں اللہ نے اپنا گھر بنایا ہے تمہارے دل میں۔ خوب سمجھ لو اچھی طرح سے سوچو، کہ اللہ نے اپنا گھر بنایا ہے تمہارے دل میں۔ اور تمہارا گھر بھی اللہ نے ایک بنایا ہے جس کا نام ہے۔ "جنت" جنت تمہارا گھر ہے اور تمہارا دل اللہ کا گھر ہے جنت میں تم بسو گے۔ اور تمہارے دل میں اللہ رہتا ہے۔

اب کسی نبوی سے مت پوچھو، ہمیں جنت ملے گی یا نہیں، کسی پر سے مت پوچھو

ہمیں جنت لے گی یا نہیں؟“ یہ تو معاملے کی بات ہے کہ اللہ کا گھر تمہارا دارا ہے جو تمہارے پاس ہے۔ اور تمہارا گھر جنت ہے جو اللہ کے پاس ہے تم اگر اللہ کے گھر میں کسی اور کو بسا دے گا۔ اور اگر تم اللہ کے گھر میں اللہ سے کچھ لے لو گے تو اللہ بھی تمہارے گھر میں تمہیں رکھے گا۔ اگر تم اللہ کے گھر کو کچھ سی سے بددعا یا سے اللہ کے گھر کو تباہ رکھو گے۔ تو اللہ جنت میں تنگ سا مکان دے گا۔ اگر خوش نصیب سے فیاض ہے اللہ کے گھر کو کشادہ رکھو گے۔ تو وہاں تمہیں کشادہ مکان دے گا۔ اگر گناہ کر کے اللہ کے گھر میں اندھیرا رکھو گے۔ تو تمہیں اللہ اندھیرا مکان دے گا۔ اگر نیکیاں کر کے اس میں چراغ روشن کر دو گے۔ تو اللہ تمہیں روشن مکان دے گا۔ جیسا کہ اللہ کے گھر کو رکھو گے۔ ویسا ہی اللہ تمہیں گھر دے گا۔

پھر نور اللہ کا گھر تمہارے پاس ہے۔ اسے تم آراستہ کر دو۔ اور اُسے آراستہ کرنے کے لئے اللہ نے بطور ماڈل ”بظور نمونہ“ اپنا ایک گھر بنایا ہے مکہ میں ”جو بیت اللہ“ ہے۔ اس کو دیکھ دیکھ کر اُسے سجاؤ۔

فقہہ میں کہتا ہوں صاحبان! مجھ تم لینا۔ یہاں کچھ نہ آئے۔ تو گھر بنا کر کچھ لینا، جس طرح اللہ نے اس گھر کو سجایا ہے۔ اسی طرح تم اس گھر کو سجانا۔ جو جس طرح اس گھر کو آراستہ کیا ہے۔ اسی طرح تم اس گھر کو آراستہ کر دو۔ دنیا کے ہاتھوں نے بنوائے ہوئے اس گھر سے نکلوا دینے تلے اسی طرح دنیا کے بنائے ہوئے اس گھر سے نکال دو۔ جیسے اس نے گھر بیڑا بنایا تھا۔ اسی طرح اُسے اس گھر میں جلاؤ۔ بس گھر سچ گیا۔ یہی طریقہ ہے اس گھر کے سجانے کا۔ ایسا سجایا ہو گا گھر لے جا جنت میں کہ لطف آجائے گا۔ اللہ نے وہ گھر اسی لئے بنوایا تھا۔ اور بنوایا ہی ہے نیک بندے سے تھا۔ جس سے اللہ کو بار تھا جس سے اللہ کو محبت تھی

جسے اللہ پسند کرتا تھا۔ اور خدیجہ کو نکم ہوا تھا۔ کہ میرا گھر تو بنا دو اور دیکھنا
اگر مزدور چاہیے۔ تو بیٹے اسمعیل کو۔ کھانا اور مددگار چاہیے۔ تو
بہر شریل کو بھیج دوں گا۔ اور نقتہ چاہیے۔ خود بنا کے بھیج دوں گا۔“

ابراہیم کو خدا کا گھر بنانے کا حکم ہو گیا۔ اب خدا ہاؤس بنے گا رہم نے کیا چچی
میں گورنمنٹ ہاؤس دیکھا تھا جس میں تقریباً پانچ سو کنبے بس جائیں۔ جب ہماری
گورنمنٹ کا اتنا بڑا گورنمنٹ ہاؤس ہے تو خدا کا خدا ہاؤس کتنا بڑا ہو گا، آخر ہم نے عرض کیا
”یا اللہ! کتنا بڑا گھر بنوایا ہے“

اللہ نے فرمایا ”بڑے گھر کی جگہ کیا ضرورت تھی۔ میں نے ابراہیم سے کہہ دیا تھا میرا
گورنمنٹ ہاؤس بس اتنا بڑا ہو۔ جس میں بوقت ضرورت ایک عورت بیٹھ سکے ہیں
اتنا گھر بن جائے اور ابراہیم نے وہ گھر بنا کر شروع کر دیا۔ ایک ردا لگاتے اور رو نہ ہونے
والا ردا مانگتے خداوند میں تیرا گھر بنا رہا ہوں۔“

اللہ نے کہا۔ ”ہاں بھئی! بنا رہے ہو۔“

تیسرے اللہ! میری اولاد کو یہ دینا۔ میری ذریت کو یہ دینا۔ میرے بچوں کو یہ دینا“
اور جب گھر بن کے تیار ہو تو ابراہیم نے عرض کی۔

خداوند! معائنہ کرے گھر بنا رہے۔ اور اعلیٰ حضرت نے معائنہ کیا ”ٹھیک
ہے“ بہت اچھا بنایا مگر ایک کام کر۔ طوفان کرنے والوں کے لئے اس
میں اونٹن کھانے والوں کے لئے میرے گھر کو پاک بھی کر۔ اب خدا کے گھر کو پاک
کرنے کا حکم تھا۔ بیگار میں دنیا بھر کے سفے ”کپڑے گئے ہوں گے۔ مگر وہاں ہم نے بچھا
کہ ابراہیم خدا کے گھر کو کس طرح پاک کر رہے ہیں۔ جتنے پتھر کھینے کی دیوار میں لگاتے
گئے تھے۔ ایک ایک پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ ”سبحان اللہ“ دوسرے پر ہاتھ رکھا سبحان اللہ
تیسرے پر ہاتھ رکھا ”سبحان اللہ“ جب ساروں پتھروں پر سبحان اللہ کہہ دیا۔ تو اللہ نے کہا۔

تس میرا گھر پاک ہو گیا، گویا ابراہیم نے کعبے کی دیواروں کے ایک ایک پتھر پر۔
سبحان اللہ! کہہ کے تمام پتھروں کو تیسع کا دانہ بنا دیا۔ اور جب دیوار دانہ تیسع بن گئی تو آٹا
کو خود ہی راستہ مل جائے گا۔ امام کے بغیر تیسع مکمل ہو سکتی ہی نہیں۔

ہر فرسے مومن کا دل گھر ہے اللہ کا اور مومن کا گھر جنت ہے، اللہ کے پاس تم اللہ
کے گھر کو پاک صاف رکھو گے تو اللہ تمہارے گھر کو پاک رکھے گا۔ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی
ان کی توجہ خصوصی ہم سے ہٹ جائے تو ہماری بقاء فنا میں بدل جائے گی۔ ہمیں اپنی زندگی
میں اور اس زندگی کے بعد کی زندگی میں ان کی بہت ضرورت ہے۔ ہماری زندگی، حیات
خوشی، ہمارا غم۔ ان کے لئے ہے۔ ہم جیسے گے تو آل محمد کی مودت میں — اور میں گے
تو آل محمد کی مودت میں۔ آل محمد کی مودت کے بغیر ہمارا گزارا ہو سکتا ہی نہیں۔

میرے محترم سامعین! میرا بیان یہاں ختم ہونا ہے۔ کہ عشرہ محرم الحرام کی یہ مجالس پاک
ہیں۔ آل محمد کی مودت میں۔ جو انہوں نے اللہ کے حاکم الملک ہونے کی گواہی دی — اور
اللہ کے حاکم الملک ہونے کی گواہی دینے کے لئے حسین اپنے سزبوں و جلال شادوں کے
ساتھ کربلا میں تشریف لائے — ساتویں تک مقدمہ کی سماعت ہوتی رہی۔ دسویں
محرم کو گواہیاں پیش کرنی شروع کیں — اور جب تمام گواہیاں ختم ہو گئیں — تو خود
بنفس نفیس آگے بڑھے۔ اور شہادتِ عظمیٰ کا ان ام لینے کے لئے سرسارک بھوکا دیا —
اللہ نے کہا، کیا چاہتے ہو؟ — نبوت تو پہلے ختم کر چکا — امت پہلے دے
چکا — رحمت تمہاری والدہ کا حصہ تھی وہ مل چکی — رضا تمہارے باپ
کو حاصل ہوئی — اب ایک شے میرے پاس باقی ہے — اور وہ شہادت کبریٰ
ہے — اور وہ تم سے لو — چنانچہ انعام دیا گیا — اور فرمایا گیا —
”حسین! آج سے جتنے میرے گھر ہیں۔ اتنے ہی تیرے گھروں گے جہاں جہاں
میرا تذکرہ ہوگا — وہاں وہاں تیرا تذکرہ ہوگا —“

چنانچہ نیریزید کے خلاف ڈگر ہی ہوئی۔ وہ ذلیل و خوار ہوا۔ اور حضور امام حسین کا نام عالم میں روشن ہوا۔

اللہ ہمیں موت محمد و آل محمد عطا فرمائے۔ اور میں آپ سے آنحضرت کو تائبوں کے عشرت محترم الحرام کا آغاز ہو چکا ہے اور دس دن حضور سید الشہداء کی سواری آپ لوگوں کی جہان ٹھہرتی ہے۔ آپ ان کی ممان نوازی کرتے ہیں پورے ادب و احترام سے جہاں سماعت فرمائیں۔ یہ درس ہے ان بے کفن شہیدوں کا جو حسین کے ساتھ کربلا میں اللہ کے مالک الملک ہونے کی گواہی دینے آئے ہیں۔

بِسْمِ مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ رَبَّنَا لَقَدْ مِثْرَاتُكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

جب چیز ہو ایک ————— دعویٰ ہوں دو

ایک ہو ————— جھوٹا ————— ایک ہو ————— سچا

اگر

اس شے کے بگڑنے کا اندیشہ ہو جائے

تو

سچا

گھر بیٹھا جاتا ہے

اللہ گواہ ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”خداوند عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام“
بزرگوار محترم!

اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا اداوی
عطا فرمایا ہے۔۔۔ وہی ہمارے اداوی ہیں اور وہی ہمارے رسول ہیں اور ہم ان کے
ادوی نکلا ہیں۔۔۔ چونکہ رسول پیدا ہی رسول ہوتا ہے۔ نبی پیدا ہی نبی ہوتا ہے۔
یہ نہیں کہ بعد میں کوئی ترقی کر کے پڑھ لکھ کے محنت و ریاضت کر کے وہ رسول
یا نبی بنتا ہے۔۔۔ نبی کو خدا پیدا ہی نبی کرتا ہے۔۔۔ تو جب حضور پیدا
ہوئے وہ اس وقت بھی نبی تھے۔۔۔ جب اس دنیا میں نہیں تھے اس وقت
بھی نبی تھے۔۔۔ جب یہ دنیا نہیں تھی، جب بھی نبی تھے۔۔۔ جب یہ کائنات پیدا
ہی نہیں ہوئی تھی۔ حضور کو اس وقت بھی نبی تھے۔۔۔ اور جب وقت لفظ
ہی دنیا میں نہیں آیا تھا۔۔۔ جب بھی نبی تھے۔۔۔ جب کوئی وقت نہیں تھا۔
جب بھی نبی تھے۔۔۔ اب اگر کوئی مجھ سے پوچھے ”کب نبی تھے۔۔۔“ حضور
جب سے نبی تھے جب لفظ ”کب“ نہیں پیدا ہوتا تھا۔ بس وہ نبی تھے۔ اور
اگر ان کی نبوت کی شہادت کسی نبی سے ہم لینا چاہیں۔۔۔ تو ہمارے اداوی کے
باپ جناب آدم یہ کہتے ہیں کہ یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں کب سے نبی تھے۔ یہ اچھا
مٹی اور پانی ہی میں تھا اور یہ نبی تھے۔۔۔ تو وہ نبی بنے۔ بلکہ نبی تھے۔۔۔ انہوں نے

چالیس سال تک اپنی نبوت کا اعلان نہیں فرمایا۔ البتہ اپنے عمل سے اپنی گفتگو سے اپنے طور و طریق سے ان لوگوں کے ذہن میں یہ ٹھادیا کہ

”یہ شخص نہ جھوٹ بولتا ہے نہ خیانت کرتا ہے یہ صادق بھی ہے۔ اور

امین بھی ہے۔ اس کی ہر بات سچی ہے۔ اس کا ہر عمل درست ہے۔ جو یہ

کہتا ہے ”ٹھیک“۔۔۔۔۔ جو یہ کہتا ہے ”ٹھیک“۔۔۔۔۔ اور

یہ اتنے کون تھے۔۔۔۔۔ عرب کے زمانے والے۔ جن کی صفت تھی کسی بات کو

ناٹا۔ وہ مانتے تھے۔۔۔۔۔ وہ عرب! جنہوں نے تیسہ دسری کی حکومت کو نہ مانا۔

اور وہ فرزند صحرا! جو اتنا آزاد تھا کہ بریت کے ٹیلوں پر بیٹھ کر حکومت کے تخت پر تازق

اڑاتا تھا۔ اور آزادی کے ساتھ عرب کی کھلی فضا میں اپنی آزادی کے پرچم لہراتا۔ کسی

حکومت و سلطنت کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ کسی فوج اور رسالے کو نظر میں نہ لاتا تھا۔

وہ ان زمانے والوں کے بیچ میں ہے۔۔۔۔۔ اور وہی زمانے والے یہ مان گئے کہ یہ

صادق بھی ہے اور امین بھی ہے۔۔۔۔۔ اور چالیس سال میں مسلسل یہ منوانے کے

بعد جب رسول نے یہ اعلان فرمایا کہ ”میں رسول ہوں“۔۔۔۔۔ تو بات ذرا کچھ اور ہو گئی

وہی لوگ جو پاس بیٹھتے تھے۔ انہیں پاس نہ رہا۔ جن سے خون کا رشتہ تھا

وہ لہو کے پیاسے ہو گئے۔ جو گلے ملتے تھے۔ انہیں بکلا پیدا ہو گیا۔

جن سے پیار تھا وہ در در ہٹنے لگے۔ جن کے دل موسم کی طرح نرم تھے۔

ذہ سنگدل ہو کے پتھر بن گئے۔ جو پھول کی طرح کھلتے تھے۔ وہ کاٹے

بچھانے لگے۔ جن کے ساتھ دوستی تھی۔ وہ دشمنی کے ساتھ پیش آنے لگے

جن کے مزے سکراتے تھے۔ وہ مڑ بنانے لگے۔ جن کی عزت بڑھادی تھی۔

وہ ذلیل کرنے کے درپے ہو گئے۔ جن کے گھر تباہیے تھے۔ وہ گھر سے

بے گھر کرنے کو تیار ہو گئے۔ جو اپنے تھے۔ وہ غیر بن گئے۔ جو ادھر تھے

کیوں سامعین!

ایمان سے بتانا۔۔۔ میں جو یوں منبر پر بیٹھا ہوں آپ کے سامنے
اگر میں یہ کہہ دوں کہ "میں نہیں ہوں" — آپ کیا کہیں گے؟ —
یہ کہو گے نا — "ہم نہیں مانتے" — تو میں پوچھوں گا — "بھئی
کیوں نہیں مانتے" —

"بس، ہم نہیں مانتے" — تو میں کہتا ہوں جناب! میرے نبی
ہونے کی دلیل یہ ہے — کہ میرے نبی ہونے کا اللہ گواہ ہے —
اب میں نے اللہ کی گواہی پیش کر دی — اور آپ لوگوں نے اب
بھی یہ طمانیہ کیا اس بات کو — دیکھو۔ یہ اللہ کو گواہ کرتا ہے۔ اس
اللہ کی گواہی یعنی کون جانتے — کون پوچھے اللہ سے کہ تو گواہ
ہے یا نہیں، — اور نہ ہی مانتے مجھ میں سے کوئی اللہ کے گھر جاتے
کو تیار ہے — اور اگر کسی کو زبردستی چھو دو اور چلا جائے —
تو وہ آ کے بتانا نہیں کہ اللہ نے کیا کہا ہے — اور یہ اللہ کے
گھر جانے کا بورسنہ ہے نا۔ پورا دن (ONE WAY) ہے
قدرت کی ٹریفک کا — انسان آتا بھی اکیلا ہے —
اور جاتا بھی اکیلا ہے — اللہ کے پاس جانے کے بعد کوئی بتانا
ہی نہیں کہ اللہ نے کیا کہا ہے — تو اللہ کی گواہی کس طرح ماننے
لاؤ گی۔ کہ اللہ گواہ ہے —

میرے محترم سامعین!

اللہ کے گواہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ

اگر دنیا میں کسی شخص کی سچائی کو ثابت کرنے کے لئے کوئی ناممکن بات ممکن ہو جائے
— تو بھئی یہ اللہ کی گواہی ہے۔ اس کا اللہ گواہ ہے — ویسے اللہ زبان سے آئے

کچھ نہیں کتلتا۔ اگر کوئی ناممکن بات ممکن ہو جائے۔ تو یہ اللہ کی گواہی ہے۔ اور ناممکن بھی وہ جو عادتاً ناممکن ہو۔ وہ ممکن ہو جائے۔ تو یہ اللہ کی گواہی ہے۔ اور
یہ ہمارے رسول کی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی بے گناہ اور معصوم ہستیوں
اپنی عصمت کو ثابت کرنے کے لئے "اللہ کو گواہ" کوئی رہی ہیں۔ اور اللہ ناممکن کو
ممکن بنا کر ان کی گواہی دیتا رہا ہے

مثال کے طور پر میں آپ سے عرض کروں کہ آج سے ۱۹۷۲ سال پہلے ایسا ہی ایک واقعہ
پیش آیا تھا۔ کہ جناب مریم کی عصمت خطرے میں تھی۔

ایک معصوم خاتون، ایک عبادت خانے میں رہنے والی خاتون، جو اللہ کی مہمان ہو کے
رہتی تھی۔ اور جب وہ اپنی گود میں ایک بچہ لے کے عبادت خانے سے باہر آئیں
تو دنیا کے لئے ایسی بات تھی۔ اب لوگوں نے چاروں طرف سے آکے گھریا۔ اور
پوچھنے لگے۔

"مریم! یہ بچہ گود میں کہاں سے آیا۔؟"

رہنماؤ میرے حترم بھائیو! ان کا پوچھنا کوئی بے جا بات تو نہیں تھی۔ انہیں تو تھا پوچھنے
کا۔ کہ تم جو رہتی تھی خدا کے گھر میں۔ تو یہ بچہ کہاں سے آیا۔۔۔ اب مریم
بیچاری کیا کہے۔ وہ خود بڑی پریشان دکھرائی ہوئی، گود میں بچہ لے ہوئے۔ کہنے لگی۔
"میں بالکل بے گناہ ہوں۔ میری بے گناہی کا میرا اللہ گواہ ہے۔"

اب اللہ کس طرح گواہی دے۔؟

اللہ نے کہا۔ میں گواہی دوں گا۔ میری گواہی کی شان یہ ہے کہ اگر کوئی
ناممکن بات ممکن ہو جائے تو سمجھ لو کہ اللہ نے گواہی دی ہے۔ اور اللہ نے مریم
کی پاکبازگی کی بھی گواہی دے دی۔ اور وہ کیسے!

کہ ایک رو گھٹنے کا بچہ۔ جس کا بولنا عادتاً ناممکن ہے اس کو ممکن بنا دیا۔

اور برخور وار نے پورے شباب میں بلند آواز سے کہا
 ”میں عبد اللہ ہوں۔ اللہ نے مجھے کتاب عطا کی ہے۔“ اللہ نے
 مجھے نبی بنایا ہے۔“

اور سب اعتراض کرنے والے واپس چلے گئے۔ مریم کو اطمینان ہو گیا۔ اور
 اگر ان جانے والوں کو روک کر کوئی پر پوچھے۔ ”نالائقو۔ تمہیں کیا ہو گیا۔“
 یہ تم نے کیا کیا۔ تم تو یہ کہہ رہے تھے کہ مریم نے گناہ کیا ہے۔ مریم نے تصور کیا
 ہے تم تو مریم کی عصمت کے خلاف بات کر رہے تھے۔ اور گواہ جواب میں یہ
 نہیں کہتا ”میری ماں بے خطا ہے۔“ ”میری ماں معصوم ہے۔“ بلکہ وہ جواب میں
 یہ کہتا ہے کہ۔ ”میں نبی ہوں۔“ تمہارا سوال یہ تھا کہ مریم گنہگار ہے۔ اور
 وہ گواہ کہتا ہے کہ ”میں نبی ہوں۔“ اور تم خاموش ہو گئے۔
 تو وہ یہودی جواب میں کہتے ہیں

”جناب خاموش نہ ہوں تو کیا کریں۔ ہم نے آسمانی کتابیں پڑھی ہیں۔
 ان میں لکھا ہے کہ جو بچہ نبی ہوتا ہے اس کے ماں باپ گنہگار نہیں ہوتے۔“
 سرنورہ بات ختم ہوئی۔ بچے نے بواں کے گواہی دے دی۔ اور۔ اگر
 آپ اجازت دیں۔ تو ہمزہ معترفہ کے طور پر ایک واقعہ آپ کو سنانا جاؤں۔ کہ
 جب ہمارے رسول کا گواہ خدا کے کفر میں پیدا ہوا۔ اور رسوا، اسے لینے گئے خدا کے
 گھر سے۔ اور گود میں لیا جا کے بچے کو۔ تو بچے کی ماں نے یہ بات کہی۔
 ”مستند!“

یہ بچہ جیسے گانہیں۔
 کیوں؟ رسول نے پڑھا
 تو بچے کی ماں نے کہا۔

”اس میں زندہ رہنے کے آثار ہیں ہی نہیں۔ بچے کی جو زندہ رہنے کی علامتیں ہیں وہ اس میں ہیں ہی نہیں۔ عین دن ہو گئے ایک تو اس نے آنکھ ہی نہیں کھولی دودھ بھی نہیں پیا۔ اودھین دن ہوئے یہ رویا ہی نہیں۔ یہی زندہ رہنے کی علامتیں ہیں۔ نہ دودھ پیتا ہے، نہ روتا ہے اور نہ ہی آنکھیں کھولتا ہے۔ یہ کیا زندہ رہے گا۔“

رسولؐ نے بچے کو سینے سے لگایا اور فرمایا

”ذہر خردار۔ تم نے آنکھ کیں نہیں کھولی۔“

”جناب! میں جس گھر میں پیدا ہوا ہوں۔ اس کے خاقوں میں جھوٹے خدار کھے ہیں۔ اگر میں آنکھ کھولتا تو ان سے نظر پڑ جاتی۔ اور نظر پڑ جاتی تو ہر سکتا ہے توڑتے ہوئے مرہوت آجاتی۔ اس لئے میں نے آنکھ نہیں کھولی۔ اب آپ آگئے ہیں۔ تو لیجئے۔“

آنکھ کھول دی۔

اب رسولؐ نے پوچھا

”بچے! ایک بات اور بتاؤ۔ آنکھ تو تم نے کھول دی۔ مگر تم روئے کیوں نہیں۔“

”حضور! جی تو میرا بہت چاہا ہونے کو۔ مگر گھر میں میری ماں مٹھی۔ اور میں دوسرا اُس کا ساتھی تھا۔ اور کوئی تمیرا آدمی نہیں تھا۔ اور ساتھی بڑھتے ہوئے زمانہ بچہ پنڈ نہ آیا۔ پھر رسولؐ نے پوچھا

”بچے! تم نے اپنی ماں کا دودھ کیوں نہیں پیا۔“

”ذہر۔ بڑے زور کی جھوک لگی ہوئی تھی۔“

”وہاں جھوک لگی ہوئی تھی تو دودھ پنی لیتے۔“

”ذہر۔ دودھ کیوں پی لیتا۔ جھوک تو بے جھے۔ مگر آپ نے مجھے گواہ کر کے

بلا یا ہے۔ میں خود تو نہیں آیا۔ آپ کا گواہ ہو کر آیا ہوں۔ اور جب گواہ ہو کر

آیا ہوں — تو دنیا کے وکیلوں سے پوچھ لو۔ کہ گواہ کا خرچ خوراک ”مدعی“ کے ذمہ ہوتا ہے —
 لہذا آپ میری خوراک کا انتظام کریں تو میں پیڑوں گا — “
 رسولؐ نے اپنی اہل سنتِ مبارک دہن میں داخل کی — اُس سے دودھ جاری ہوا —
 بچے نے مت پھیر دیا — رسولؐ سمجھ گئے کہ گواہ ذرا تر مال چاہتا ہے — لہذا آپ نے ہاتھوں
 پر بلند کیا — اور اپنی زبان مبارک دہن میں داخل کر دی — اب زبان سے جو دودھ جاری
 ہوا تو خوب پیٹ بھر کے پیا — اور جب پی چکے — پیٹ بھر گیا۔ تو نئے نئے پیار سے
 ہونٹوں سے زبان مضبوط پکری

اب رسولؐ اشارے سے کہتے ہیں

”چھوڑو بھی —“

اور بچہ آنکھوں سے کہتا ہے

”ٹھہرو بھی —“

”پی چکے“

ہاں — پی چکے —“

پیٹ بھر گیا —“

ہاں — بھر گیا“

اب ذرا زبان چھوڑو“

”نہیں چھوڑتا —“

اسی طرح رسولؐ کی زبان دہن میں بیٹے ہوئے گھر آگئے — گھر کے بزرگوں نے

دیکھ لیا —

بچے نے آنکھوں آنکھوں میں بزرگوں سے اشارہ کیا ”خانہ دان کے بزرگو! گواہ رہنا —

میرے پیدا ہوتے ہی محمدؐ مجھے ”زبان“ دے چکے ہیں“

اور ایک طرف تو دنیا کا تازن یہ ہے کہ غم کو مٹائے۔ پھر اگر دنیا کے اس تازن کے ساتھ کچھ دنیاوی حکومتیں بھی شامل ہو جائیں۔ اور غم کو مٹانا چاہیں۔ تو ایسا غم تو مٹ جانا چاہیے مگر اتنی مٹانے کی طاقتوں کے ہوتے ہوئے اگر کوئی غم نہ مٹے۔ تو ناممکن کا ممکن ہوتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے۔ اس میں اللہ کا ہاتھ ہے۔ ورنہ اگر اللہ کا ہاتھ نہ ہوتا تو یہ مٹ جاتا۔ اتنی طاقتوں کے باوجود کسی غم کا زندہ رہنا۔ یہ اللہ کا ہاتھ ہے۔ اس کی عنایت کی اللہ گواہی دیتا ہے۔ اور کر بلا کا سارا واقعہ تو ہے ہی سارا اللہ کا ہاتھ۔ اگر اللہ کا ہاتھ اس میں نہ ہوتا۔ تو یہ ناممکن باتیں ممکن نہ ہوتیں۔ یہ اللہ کا ہاتھ ہے بس۔ ورنہ کس انسان میں یہ طاقت ہے۔ کس انسان میں یہ قوت ہے جب تک اللہ کا ہاتھ نہ ہو۔ کہ ایک بوڑھا باپ ۱۰ اپنے جوان بیٹے کی میت اٹھائے۔ اور بنس پڑے۔ یہ انسان کا کام ہے بنس کے میت اٹھانی۔؟ یہ ماؤں کا کام ہے کہ بیٹوں کو گفن پناہیں مرنے کے لئے۔ اور رات بھر نہیں مانتی رہیں کہ صبح میرے بیٹے کی میت آئے۔؟ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوتا تھا۔

میرے سامعین !

ذرا غور کریں۔ ایک ایسا شخص جس میں علیؑ کی طاقت ہے۔ علیؑ کی قوت ہے۔ اور اپنے زمانے کا جہد رکھتا ہے۔ اپنے زمانے کا علیؑ ہے۔

اور حسینؑ حکم دیتے ہیں اپنے زمانے کے علیؑ کو

”عباسی عباس! میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔“

عباسی! جیسی فوج کا سپہ سالار ہے۔ سپاہی ہے۔ اور سپاہی کا مزاج ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ سپاہی کے نیور ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔ اور اُدھر دشمن کی فوج ہے کہ بڑھی چلی آ رہی ہے۔ فوجیں محرم کی شام ہے۔ اور حسینؑ حکم دیتے ہیں۔ کہ اس بڑھی ہوئی فوج کو روکو نہیں۔ بلکہ جا کر کہو

”مذہبیں تم سے ایک رات کی مہلت چاہتا ہے۔“

دنیا تو سمجھتی ہے۔۔۔ یہ ناممکن ہے کہ عباسؓ جیسا آدمی اور غصہ کو روک لے۔۔۔
 مگر ناممکن کا ناممکن برنا ہی تو اللہ کا ہاتھ ہے۔۔۔ اور ادھر حسینؓ نے عباسؓ کو
 حکم دیا کہ انہیں جا کے کہو
 ”ہمیں ایک رات کی مہلت دو۔“
 عباسؓ نے اتنا جواب دیا
 ”مولاً! میں۔۔۔ ان سے مہلت مانگوں!“
 اور مولاً نے جواب میں کہا
 ”ہاں۔۔۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔۔۔“
 ”بہت اچھا“

”نوار کھول کے دیں دکھ دی۔ گھوڑے پہ سوار ہوئے۔ امامؓ
 نے احتیاطاً حضرت حبیبؓ ابن مظاہرؓ اور حضرت زبیرؓ کو حکم دیا کہ
 تم دونوں بوطے سے بھی ساتھ جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عباسؓ
 کو کسی بات پہ غصہ آجائے۔ کسی پہ جلال آجائے۔۔۔
 اب دائیں بائیں حبیبؓ اور زبیرؓ اور بیچ میں گھوڑے پر
 اپنے وقت کا حیدر رکھو۔۔۔ فرج کے سامنے پہنچا۔ گھوڑا
 روکا۔۔۔ فرجیں بھی رک گئیں۔ اور سر جھکا کے چپکے سے
 کہتے ہیں

چچا حبیبؓ! وہ مہلت والی بات تم کہہ دنا۔۔۔ مجھ سے نہیں کہا جاتا۔۔۔“
 اور جب حبیبؓ نے کہا
 ”عباسؓ! آپ کے لئے حکم ہے مولاً کا۔۔۔“
 تو سر جھکا کے۔ زبان میں کلمت۔ اور ناموشی سے کہتا ہے

”میرے مولا کا حکم ہے۔ ایک رات کی مہلت چاہیے۔“
 یہ کہتے ہی عباسؓ پینے میں تر ہو گئے۔ بدن میں لرزہ آ گیا۔ پورا بدن کانپ رہا تھا۔
 اور فوج نے کہہ دیا
 ”مہلت ہے۔“

اب جو داپس لوٹے تو حبیبؓ دزبیرؓ دونوں بڑھے آپس میں باتیں کرنے لگے۔
 حبیبؓ نے دزبیرؓ سے پوچھا
 ”دزبیرؓ!“

”تہیں یاد ہے نا۔ جب اس جوان کی والدہ سے علیؓ کا نکاح ہوا تھا۔ تو ہم دونوں نکاح
 میں شامل تھے اس وقت۔“

دزبیرؓ نے کہا

”ہاں۔ مجھے یاد ہے۔“

اب حبیبؓ بولا

”دزبیرؓ! نکاح کے وقت بھلا علیؓ نے کیا کہا تھا۔“

”یہی کہا تھا نا۔ کہ اس خاتون کے بطن سے جو میرا بیٹا ہوگا۔ وہ میری

شجاعت کا وارث ہوگا۔“

اب وہ بڑھاز میرے کہنے لگا۔

”ہاں۔ بالکل یہی بات تھی۔“

حبیبؓ نے دزبیرؓ سے تو آپس میں یہ بات کی۔ اور قرظی ہاشمؓ جناب عباسؓ غازیؓ نے سن کے گھوٹے

کی باگ روک لی۔ اور ایک انگریزی جہلی تو گھوڑے کی رکابیں ٹوٹ گئیں۔ اور بھرائی

آواز میں فرماتے ہیں

چچا حبیبؓ!

آج بھی مجلس کے بعد آگ پر ماتم ہو گا۔ ” وہاں بھی گلزار ہوئی تھی۔ یہاں بھی دیکھ لیا۔ اور حضرت ابراہیم نے اللہ جانے کیا کہا ہو گا جس سے آگ گلزار ہو گئی تھی۔ ہمیں جو فقرہ یاد ہے۔ وہ ہم کہہ دیں گے۔ اور وہ یہ کہ ایک دفعہ کہا دوائے حسین ہے۔ آگ بجھ گئی۔

سامعین!

دوائے حسین، کہتے ہیں یہ آگ بجھ کر کیوں جاتی ہے۔ حسین کا نام سن کے آگ شرمنا جاتی ہے۔ جہاں حسین کا نام لیا۔ آگ کو شرم آگئی۔ بات کیا ہے۔؟

آگ جانتی ہے کہ میں وہی آگ ہوں نا۔ جس نے حسین کے خیمے جلائے تھے۔ اس لئے یہ ناسراد آگ شرمنا جاتی ہے۔ اور سامعین!

وہاں صرف مردوں نے جا کر آگ پر ماتم دیکھنا ہے۔ اس لئے کہ مستورات کے لئے وہاں پردے لگا رکھے۔ انظام نہیں ہے۔ اور وہ اس لئے بھی کہ پردہ نشین عورتیں آگ کو دیکھ چکی ہیں۔ کہ بلا میں ان پر گزر چکا ہے واقعہ۔

اور مردوں نے چونکہ آگ میں جلتے خیمے دیکھے نہیں جیب خیموں میں آگ لگی تھی۔ مرد نہیں تھے۔ عورتیں دیکھ چکی ہیں۔

لہذا صرف مرد ہی جائیں گے آگ پر ماتم دیکھنے کے لئے —
 اللہ میں موت محمد و آل محمد عطا فرمائے — اور ہم ان کی موت میں بشیر
 و ران کی موت میں مریں ۔

بج محمد و آل محمد
 «و بنا لقبنا انک انتا السميع العليم»
 (اللہ صلی علی محمد و آل محمد)

~:~:~

لے آل محمد!

اچھے علاموں کو «اپنا» کہنا تو ہر آقا کا

کام ہے

تمہاری شان تو یہی ہے کہ ہم جیسے

گنہگاروں کو «اپنا» کہدو۔

(خطیب آل محمد)

معرفتِ امام

(شہادتِ حضرت سعید)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

”خداوند عالم عزوجل اسرارِ جلالہ کی حمد و ثناء کے بعد حضراتِ محمد و آلِ محمد پر درود و سلام“
حضرات گرامی!

اللہ کی طرف سے مسلمانوں کے پاس آج ذریعہ علم دو چیزیں ہیں۔ ایک کتابِ خدا۔ ایک حدیثِ رسول۔ جسے کتابِ ہدایت کہا جاتا ہے

کتاب کے متعلق تو تمام مسلمانوں کا ایمان ہے۔ کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اختلافِ معانی میں ہو جاتا ہے۔ درجہ جہان تک کتاب کا تعلق ہے۔ اسے دنیا کے تمام مسلمان مانتے ہیں۔ اور سب کا ایمان ہے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اور کتاب اللہ ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ سب کا ایمان ہے کہ یہ کتاب اللہ ہے اور خدا کا کلام ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ ہے ہی نہیں۔

اور حدیثِ رسولؐ جو ہے۔ وہ حضور رسالتِ آپ کا فرمان ہے۔ اللہ کی کتاب کی تشریح و توضیح ہے۔ جسے ”حدیث“ کہتے ہیں۔ اور جہان تک حدیثوں کا تعلق ہے۔ اس میں مسلمانوں میں اختلاف ہے۔ کہ یہ حدیث ضعیف ہے یا قوی ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے یا غلط ہے۔ یہ حدیث ہے یا نہیں ہے۔ یہاں تک اختلاف برداشت ہو سکتا ہے۔

یہ ایک تحقیق ہے۔ اور انسان کو تحقیق کرنی چاہیے کہ واقعاً یہ رسولؐ نے فرمایا ہے یا نہیں۔ مگر ان اصول و قواعد کے مطابق جو کسی حدیث کو پرکھنے کے لئے علمائے حدیث نے سمیٹ کر رکھے ہیں۔ اور ان اصول کے مطابق جب یہ طے ہو جائے کہ واقعاً یہ رسولؐ کا فرمان ہے۔ تو پھر اس کا نہ مانا ہی ہے جیسے کتابِ خدا کا نہ ماننا۔ گویا یہاں تک تو اختلاف ہو سکتا ہے کہ یہ حدیث ہے ہی کہ نہیں۔ مگر جب یہ فیصلہ ہو جائے کہ واقعاً یہ حضورؐ نے فرمایا ہے۔ تو پھر اس میں شک کرنا یا نہ ماننا ایسا ہی ہے جیسا کہ کتابِ خدا کا نہ ماننا۔ اس لئے کہ حدیث جو ہے۔ اصل میں یہ تفسیر ہے۔ تاویل ہے۔ تغیر ہے کتابِ خدا کی۔ اس سے انکار کرنا گویا کتابِ خدا سے انکار کرنا ہے۔

اور مختصر سے لفظوں میں یہ بات بھی سنا تا جاؤں کہ کتابِ خدا میری مراد یہ ہے صرف ”قرآن“ ورنہ کتابِ خدا اور بھی ہیں)۔ آج روئے زمین پر ایسی کتاب ہے جس کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے کہ ”و لا ریب فیہ“۔ اس کتاب میں کوئی شک و شبہ ہو سکتا ہی نہیں۔ ”ورنہ دنیا کی کسی کتاب پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ”و لا ریب فیہ“ ہے۔ یہ صرف اس کتاب کی خصوصیت ہے جو اعلان کرتی ہے اس بات کا کہ ”و لا ریب فیہ“ اور اس میں ریب ہو سکتا ہی نہیں۔ اس میں کوئی شک ہو سکتا ہی نہیں۔ اس کی بات کبھی غلط ہو سکتی ہی نہیں اس کا مصدق وہ ہے جو کبھی غلط بات کہہ سکتا ہی نہیں۔ اور اس ساری کائنات کا پیدا کرنا۔ یہ خدا کا فعل ہے۔ اور ”قرآن“ خدا کا قول ہے۔ اور یہ کبھی ہو سکتا ہی نہیں کہ ایک جگہ مطلق کے قول و فعل میں اختلاف ہو۔ جو قول ہے وہی فعل ہے۔ جو فعل ہے وہی قول ہے۔ اور اگر کہیں غلطی نظر آجائے۔ تو یہ سمجھیے۔ یہ ہماری سمجھ کی غلطی ہے۔ ورنہ غلطی نہیں ہے۔

سامعین! ایک شخص سے کسی نے کہا۔ بربری تمکھیں ٹیڑھی ہیں؟
تجھے ایک کے دو نظر آتے ہیں؟

تو اس نے کہا

”وہ بالکل غلط۔ تم جوڑوٹ بروتے ہو۔ مجھے تو ایک کا ایک ہی نظر آتا ہے۔
اگر مجھے ایک کے دو نظر آتے تو چاند مجھے چار کیوں نہ نظر آتے۔
دو ہیں۔ دو ہی نظر آتے ہیں۔“

بھائیو۔۔۔ اس بات کا علاج نہیں کسی کے پاس۔ یہ ہماری نظر کی
غلطی ہے۔ ہمارے بچنے کی غلطی ہے۔۔۔ ورنہ کتاب میں تو کوئی
دریب ہو سکتا ہی نہیں۔

اب یہ خود عقلِ انسانی بتاتی ہے۔ کہ اگر کتاب ایسی ہے کہ ”لاذیب فیہا“ ہے۔
جس میں دریب ہو سکتا ہی نہیں۔ تو اس کا مفسر بھی وہ ہونا چاہیے۔ جس کی
صفت ہو ”لاذیب فیہ“ جو نہ غلطی کرنے والا انسان ہو۔۔۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ
غلطی کرنے والا انسان مفسر بن بیٹھے اس کتاب کا جس میں ”دریب“ ہے ہی نہیں۔
”لاذیب فیہ“ کا مفسر بھی وہی ہو جو ”لاذیب فیہ“ ہو۔ جس سے کبھی غلطی ہو سکتی
ہی نہ ہو۔ ایسا مفسر ہونا چاہیے کہ کتاب اللہ کا۔۔۔

حضور والا!

لوگ کہتے ہیں کہ انسان میں عقل ہے اور حیوان میں عقل نہیں ہے۔۔۔ حالانکہ
یہ غلط ہے۔۔۔ حیوان بھی بڑا عقل مند ہوتا ہے۔ بلکہ بہت سے حیوان تو انسانوں سے زیادہ
عقل مند ہیں۔ بہت سے حیوان دنیا میں ایسے ہیں جو انسانوں سے زیادہ عقل مند ہیں۔
اور اگر آپ کو یقین نہ آئے تو میں ابھی مثال دیتا ہوں آپ کے سامنے۔۔۔ کسی
بے چوڑے تازے کے حیوان کی نہیں۔ بلکہ ایک نما ساجیوان۔ ایک چھوٹی سی جان۔
دیکھنے میں بے حقیقت۔ مگر انسانوں سے زیادہ ذی عقل۔ اسے کہتے ہیں ”شہد
کی کھسی“

اری دنیا کے انسانوں کے ذرا متبادل تو کر دیکھیں اس شہد کی کھسی کی قتل کا — کتنی
 قتل مند ہے یہ — آپ بھی گھر بناتے ہیں — دو منزلی، پانچ منزلی، دس منزلی
 بیس منزلی ہم نے کوٹھی بنائی — مگر اس کے بنانے میں سینکڑوں مہاروں کی
 خوشامد کرنا پڑی — اور خراجانے ہزاروں مصیبتیں ہیں — جب جا کے کہیں عمارت
 بنی — گھر تیار ہوا — مگر شہد کی کھسی — ایک نخصی سی جان !
 عیب یہ گھر بنانے پہ آتی ہے — تو یہ کس شان سے گھر بناتی ہے — اس کو
 نہ کسی مہار کی خوشامد کرنا پڑی — نہ کسی انجینئر کی خوشامد کرنا پڑی — نہ کسی نقشہ نویس کی
 خوشامد کرنا پڑی

اپنے گھر سے اڑی — سیدی بانغا میں پہنچی — دگر بانسوں کی طرت
 نہیں — مقداروں کی طرح — سب پھولوں کو دکھایا — ہر پھول پہ پھولی نہ
 سائی — ہر پہ نہیں دیکھتی بلکہ پھولوں میں سے انتخاب کیا کہ —
 میرے قابل کونسا ہے — میں سب ایک ہی بانغا کے پھول
 — مگر ایک بانغا میں ہونے سے شہد کی کھسی ہر پھول پہ نہیں بیٹھتی
 — وہ دیکھتی ہے — ”میرے لئے مناسب کونسا ہے“

اور پھر وہ مناسب پھول کے پاس پہنچتی ہے — اور جا کے پھول کو
 سنتاتی نہیں — اُسے پریشان نہیں کرتی — اس کی
 پتیاں نہیں کھیرتی — اس کی موت نہیں لاتی — بلکہ
 بڑے ادب سے پھول کے قریب جا کے کہتی ہے
 ”سلام علیکم“

اور پھول کہتا ہے جواب میں — ”وعلیکم السلام“
 بس پھول کا منہ کھلا اور یہ گودی میں بیٹھ گئی — اور گودی میں بیٹھ

کے آرام سے گفتگو شروع کر دی۔ اور اس خوراک کے ساتھ بات کرتی
 ہے پھول سے۔ کہ یہ بات کرتی رہی اور پھول شتارٹا۔
 یہ اپنی خوراک جمع کرتی رہی پھول کو پتہ بھی نہ چلا۔۔۔۔۔ مارن گل
 پہ خراش بھی نہ آیا۔۔۔۔۔ دامن گل پہ گرد بھی نہ پڑی۔۔۔۔۔ اور
 اس نے اپنی شے اکٹھی بھی کر لی۔۔۔۔۔ اب گھر لے کے آگئی۔۔۔۔۔
 اور ایسا عجیب گھر بنایا کہ گھر کا گھر بھی بتا رہا اور خوراک کا ذخیرہ بھی اکٹھا
 ہوتا رہا۔۔۔۔۔ اگر ہمارا بنایا ہوا گھر ٹوٹ جائے تو بے کا
 ڈھیر۔۔۔۔۔ اور اس کا بنایا ہوا گھر ٹوٹ جائے تو۔۔۔۔۔
 ”لوگوں کے لئے تنغا بھی ہے اور لذت بھی ہے“

اب بتاؤ!

شہد کی کبھی تم سے زیادہ ہوشیار ہے یا نہیں۔۔۔۔۔
 تو آپ کہیں گے۔۔۔۔۔ ”ہوشیار نہیں ہے۔۔۔۔۔“
 ”بات کیا ہے!۔۔۔۔۔ کہ وہ جو گھر بناتی ہے۔۔۔۔۔“
 اللہ اُسے ”روحی“ لکھتا ہے۔۔۔۔۔ اور ہم جو بتاتے ہیں۔۔۔۔۔ ہم اپنی عقل سے بتاتے ہیں۔۔۔۔۔
 وہ بتاتی ہے ”وحی“ سے۔۔۔۔۔ اور ہم بتاتے ہیں اپنی عقل سے۔۔۔۔۔
 پس یہاں سے پتہ چلتا ہے۔۔۔۔۔ کہ اپنے بنائے ہوئے اور وحی کے بنائے ہوئے ہیں
 کیا فرق ہے۔۔۔۔۔ جو ”وحی“ سے ہے۔۔۔۔۔ اُن کی کیا شان ہے۔۔۔۔۔ اور جو ہم بنائیں
 ان میں کیا مصیبت ہے۔۔۔۔۔ اور ایسا عظیم گھرن کے تیار ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اب بتاؤ۔
 شہد کی کبھی ذی عقل ہے کہ نہیں۔۔۔۔۔ اس کے عقل مند ہونے میں آپ کو انکار تو نہیں۔۔۔۔۔
 بہر حال۔۔۔۔۔ یہ سب جانور عقل مند ہیں۔ ان میں بھی عقل ہے۔ ان میں بھی سمجھ ہے۔ جو ان
 سے مراد سے پیش آئے۔ اس سے پیار کرتے ہیں۔ اور جو ڈنڈے کر مارنے بھاگے۔

تو ذرا بھاگ جاتے ہیں۔ اچھوں سے محبت اور برؤں سے نفرت کا مادہ ان میں بھی موجود ہے۔
 اور جس راستے سے ایک دفعہ گزر جائیں۔ کیا مجال جو اس راستے کو بھول جائیں۔
 ہم چاہے بھول جائیں۔ مگر وہ اسی راستے پر چلیں گے۔ اور اگر خطرہ سامنے آجائے۔ تو
 وہیں رگ جائیں گے۔ کیا مجال جو آگے بڑھ جائیں۔ مالک کی حفاظت اور اطاعت بڑی
 شان کے ساتھ کرتے ہیں۔

یہاں تک کہ دنیا کا جنس ترین جانور ہے کتا، اور کتے کو اسلام نے بڑا ہی نجس جانور
 قرار دیا ہے۔ مگر اس نجس جانور کی شرانت بھی آپ نے دیکھی ہوگی۔ اپنے
 مالک کی حفاظت کرتا ہے۔ غیر کو آنے نہیں دیتا۔ بے گنا مگر اس میں بھی یہ
 خوبیاں ہیں۔ صرف اس لئے پالنے سے روک دیا ہے۔ کہ اس میں ایک عیب
 ہے۔ اور وہ یہ۔ کہ ”غیر کے سامنے دم ہلانا ہے۔ اور اپنی جنس کو کاٹنے کو
 ددھتا ہے۔“ اگر تم اسے گھر میں پاو گے تو کہیں تمہیں یہ عادت نہ پڑ جائے۔
 کہ ”اپنے بھائیوں سے لڑو۔ اور غیر کی خوشامد کرو۔“ یہ عیب ہے اس میں
 — در نہ تجاب۔ بڑا اچھا جانور ہے۔ ساری عقل مندیاں ہیں اس میں۔ سارے
 شعور ہیں اس میں۔

انسان تو خواہ مخواہ اگر ہوتا ہے کہ مجھ میں عقل ہے۔ حالانکہ اس سے زیادہ ان
 حیوانوں میں عقل ہے۔ فرق کیا ہے۔ انسان ناطق ہے۔ اور حیران بیچارہ
 ناطق نہیں۔

اب ناطق کے معنی کیا ہیں؟

بولنے والا۔ یہ غلط ہے۔ وہ بھی بولتا ہے۔ یہ ادب بات ہے
 کہ آپ ان کی بولی نہیں سمجھتے۔ اور آپ کے نہ سمجھنے سے توان کی بولی میں کوئی
 فرق نہیں آیا۔ جس طرح انسان، انسان کی بولی نہیں سمجھتا۔ اسی بیان کوئی عیب:

اُسے پکڑنے کے لئے _____ کوئی ٹچر وغیرہ بھیج دیا ہو گا کہ

”جاؤ۔ چیونٹی کو گرفتار کر کے لے آؤ۔“

اور چیونٹی بیچاری کے ہاتھ پاؤں باندھ کے حضرت سلیمان کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اب

تصنیٰ سی جان۔ ذرا سادل۔ اس کا دل تو دھک دھک کرنے لگا۔

اتنے بڑے شہنشاہ کے ساتھ ایک بیچاری چھوٹی جان، چیونٹی، ملام کی حیثیت سے کھڑی ہے۔

سلیمان نے کہا

”ریہاں لاؤ۔“ _____ اور چیونٹی آگئی۔

وہ بولو۔ تم مجھے ظالم سمجھتی ہو۔“ حضرت سلیمان نے نصیحت میں پوچھا۔

”مہ نہیں غیاب،“ چیونٹی نے بڑی عاجزی سے جواب دیا۔

اب سلیمان فرماتے ہیں

”چیونٹی!“

”تم سمجھتی ہو کہ مجھے نظر نہیں آتا کہ تم چل رہی ہو۔“

”رجاب آتا ہے۔“

”پھر تم نے کیوں کہا۔“ اپنی برادری سے کہہٹ جاؤ۔ سلیمان کہیں تمہیں کچل نہ دیں۔

ہم راستے میں کپلنتے ہیں کسی کو۔ تم نے یہ بات کیوں کہی۔“

چیونٹی نے عرض کی

”محضور۔ گذارش یہ ہے۔ کہ ذرا میرے ہوش دحواس ٹھیک ہو لینے دیں۔ پھر

اب دوں گی۔“

جب چیونٹی کے ذرا ہوش دحواس ٹھیک ہوئے۔ تو بولی

”تنبلا“

گذارش یہ ہے۔ کہ ہماری غار کا وقت تھا۔ اور ہماری ساری برادری آپ کی فوج کا تماشہ

کہتے گی۔۔۔ مجھے یہ ڈر ہوا کہ کہیں تاشے میں نماز نہ قضا ہو جائے۔ اس لئے میں نے انہیں
ڈرا کے ہٹایا تھا۔ کہ نماز ان کی قضا نہ ہو جائے۔۔۔ ہماری عبارت ضائع نہ ہو جائے۔“

”راجھا۔۔۔ یہ بات تھی۔۔۔ اب سیماں بہت خوش ہوئے

دو شہاب نشہ تم نے بڑا اچھا کیا ہے۔ تم بہت اچھی ہو چوٹی۔“

اب سیماں نے چوٹی کو اپنے ہاتھ کی تھیلی پہ بٹھایا۔ اور تھیلی پہ ہٹھا کے فرمایا

”چوٹی! تم نے بڑا اچھا کیا ہے۔ ہم تم سے بہت خوش ہوئے۔“

اب ذرا چوٹی کی بھی جان میں جان آگئی۔۔۔ اور حضرت سیماں چوٹی کو ہاتھ کی

تھیلی پہ ہٹھا کے کہنے لگے

”چوٹی! تم بہت ہر شہاب ہو۔ ایک بات بتاؤ۔۔۔ تم بہتر ہو یا میں۔۔۔؟“

سامعین!

چشم بدور۔ آپ پڑھے لکھے حضرات تشریف فرما ہیں۔ ایک بات بتاؤ۔

کہ اگر چوٹی یہ کہدے سیماں سے کہ۔۔۔ ”آپ بہتر ہیں۔“ تو یہ سیماں کی توہین نہیں

۔۔۔ کہ کون سیماں؟۔۔۔ جو چوٹی سے بہتر ہے؟

اسی لئے تزکنا ہوں کہ جب مقابلہ کیا کرو تو کسی مقابلے والے سے کیا کرو۔

اب سیماں کو انتظار ہے کہ چوٹی کیا جواب دیتی ہے۔

سیماں پڑھتے ہیں

”چوٹی! بوزنا۔“

دو قبلہ کیا تاؤں۔۔۔ ”اگر یہ تاؤں کہ آپ مجھ سے بہتر ہیں۔۔۔ تو مجھ

سے بہتر ہونا بھی کوئی بات ہے۔۔۔“

”پھر کچھ تو کہو۔“

دو قبلہ۔ اگر آپ مجبور ہی کرتے ہیں۔۔۔ تو ایک بات کہتی ہوں۔۔۔ کہ اس وقت

آپ کو کیا شے اٹھائے ہوئے ہے۔

سلطان نے کہا

”دہرا“ — ہوا کے اوپر میرا تخت ہے۔

اب چیونٹی نے کہا

دہرا باہ! آپ کو تو اٹھائے ہوئے ہے ”دہرا“ — اور مجھے کیا اٹھائے

ہوئے ہے۔

سلطان نے کہا

”میرا اٹھ“ — تو چیونٹی بولی

”اب قبل آپ ہی بنائیں۔ دم بہتر ہے جسے ہوا اٹھائے ہوئے ہے یا وہ

بہتر ہے جسے نی اٹھائے ہوئے ہے۔“

سلطان بہت خوش ہوئے۔ اور دالسی پر اسے چھوڑ دیا جہاں سے لے اٹھا باخدا

اور یہ بات چیونٹی کی طرح آج تک کسی کتابوں میں آگئی۔ بات تو چیونٹی کی

تھی۔ مگر ہمارے دنوں میں آج بھی چیونٹی کی جہاں کی طرح چل رہی ہے۔ کہ

اگر نبی کسی کو اٹھائے۔ چاہے وہ چیونٹی ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی بات ہی اور ہے۔

اس کی شان ہی اور ہے۔ اس کا انداز ہی اور ہے۔ اس کا دُعا ہی اور ہے۔

اب اس کے مقابلے کا ایک واقعہ اور سن لیجئے۔

امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے ساتھ غزایہ حضرت سلمان فارسی

چلے جا رہے تھے مدینہ سے باہر ایک جنگل میں۔ اتفاق سے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں یہ

چیونٹیاں اپنے دل سے نکل آئیں۔ تو سلمان فارسی نے اس دل کو دیکھ کر کہا۔

مدیاک ہے وہ ذاتِ جبران کی تعداد کو جانتی ہے۔

حضرت امیر المومنین نے فرمایا

”سلمان! تو یہ کہہ کر۔۔۔۔۔۔ یہ کیا کہہ دیا تو نے۔۔۔۔۔۔ بکدروں کو کہہ کر پک ہے، وہ ذات جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔۔۔۔۔۔ اور رہی تعداد! وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔۔۔۔۔۔ اور تری تعداد ہی نہیں جانتا۔ بلکہ یہ بھی جانتا ہوں کہ ان میں ترکتے ہیں اور مادہ کتتے ہیں۔ ان میں فرق کتتے ہیں۔ ان میں فرق کتتے ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ کہاں جا رہے ہیں اور کہاں سے آ رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ آتا تو میں بھی جانتا ہوں۔۔۔۔۔۔ اور سلمان! ادھر آؤ۔۔۔۔۔۔ تجھے بتا دوں۔ تو بھی سمجھ لے۔۔۔۔۔۔“

اپنے دلانے سلمان کے چہرے پہ ماتھ پھیرا۔ اور سلمان سمجھنے لگا چیونٹی کی بات۔
تو ان چیونٹیوں کا سردار اپنی برادری سے یہ کہہ رہا تھا
”جلدی جلدی اپنے گھروں سے نکل کے باہر آؤ۔۔۔۔۔۔“

سامعین!

حضرت سلمان کے وقت چیونٹی اپنی برادری سے کہہ رہی تھی۔۔۔۔۔۔
وہ اپنے گھروں میں جاؤ، اور وہ اس سے کہہ رہی تھی کہ کہیں عبادت
میں فرق نہ آجائے۔ اس سے وہ اپنے گھروں میں جاؤ،۔۔۔۔۔۔
اور یہاں جناب امیر کے وقت چیونٹی کا سردار اپنی برادری
سے کہہ رہا ہے کہ

”جلدی جلدی اپنے گھروں سے نکل کے باہر آؤ۔۔۔۔۔۔ کیونکہ وہ آگیا ہے
۔۔۔۔۔۔ جس کا چہرہ دیکھنا۔۔۔۔۔۔ عبادت ہے۔۔۔۔۔۔“

بہر فرس۔ یہ تو بھی عقل مند ہیں۔ ان میں بھی شعور ہے۔ یہ بھی سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔۔
بولتے ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں ان کی اس سمجھ کا شعور نہیں ہے۔ ورنہ وہ بولتے۔
ان میں بھی شعور ہے۔۔۔۔۔۔ اور ان ہی چیزوں سے قدرت اپنے منظر کا تعارف کراتی ہے۔ یہ
گواہی ہے قدرت کے منظر کی۔۔۔۔۔۔ حالانکہ بظاہر یہ ناممکن ہے کہ ہم ان جانوروں کی عقل شعور

کو انسانی عقل کے برابر سمجھیں۔ مگر جب خدا چاہتا ہے تو اپنی قدرت کی گواہی دینے کے لئے وہ ان جانوروں کی عقل و شعور کا تعارف کروانا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ کی قدرت کیا ہے۔ اس کا شاہکار کیا ہے۔
میرے سامعین!

جب کسی ناممکن بات کو ممکن کر دکھانا ہو۔ تو اللہ اپنی قدرت کے ذریعہ اس کی گواہی دیتا ہے۔ اور اللہ والے اس گواہی کی ضمنی بھرتے کے لئے اپنی شہادت پیش کر دیتے ہیں۔
لفظ شہادت کے معنی بھی یہی ہیں جو گواہی کے معنی ہیں۔

اب آج ہمارے رسولؐ کا کبڑہ کر بلا میں بٹھا ہوا ہے۔ اللہ کے مالک الملک ہونے کی گواہی دینے کے لئے حسینؑ ابن علیؑ اپنے عزیزوں و جاتاروں کے ساتھ کر بلا میں تشریف لائے ہوئے ہیں۔ سازو بن تک مقدمہ کی سماعت ہوتی رہی۔ دسویں محرم کو گواہیاں پیش کرنا شروع کر دیں۔ اور خاندانِ رسولؐ کو گواہی دے رہا ہے کہ
دو گوا!

جو کچھ ہماری جِدتے کہا بت۔ جو کچھ اللہ نے کہا ہے۔ جو کچھ کتاب اللہ نے کہا ہے۔ وہ بالکل حق ہے۔ اس میں کوئی غلطی نہیں۔ اور اگر اس میں کوئی غلطی ہوتی۔ تو ہم اتنی بڑی قربانی نہ دیتے۔ ہم اس کی گواہی دینے آئے ہیں۔ ہم اس کی شہادت دینے آئے ہیں۔

اور لطف یہ ہے میرے پیارے بھائی

سیکڑوں آدمی ساتھ ہیں سینکڑے کھمبے اور موم انہیں فرماتے کیا ہیں۔

بھائیو! میں مر جاؤں گا۔ جو میرے اتار ہوں گے وہ بھی مر جائیں گے۔ کفن

نہیں ملے گا۔ قبر نہیں ملے گی۔ کہ بچے قید ہو جائیں گے۔

عورتوں کے سر پر چادر نہیں رہے گی۔ اگر یہ مصیبت منظور ہو تو

مشہور ہو گیا ہے کہ حبیبؑ بہت بڑھے تھے۔ حالانکہ حبیبؑ تو امام حسینؑ کے ہم سن تھے۔ وہ تو مولانا کے بچپن کے دوست تھے۔ اور حضرت سعیدؑ بہت بڑھے تھے۔ ان کی عمر کہ بلا میں کوئی نوے سال کے قریب تھی۔ اور جب دن کے ایک بجے تک کہ بلا میں شہادت کا بازار گرم بنا۔ اور چند آدمی باقی رہ گئے۔ اس وقت یہ حبیبؑ اور سعیدؑ سامنے آئے مولانا کے۔ اور عرض کی

مولانا!

ظہر کا وقت ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ آخری نماز حضورؐ کی جماعت کے ساتھ پڑھیں۔ آپؑ نے فرمایا

”خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ تم نے اس وقت نماز کو یاد کیا ہے۔ تم اس فوج کو کہہ دو! کہ ذرا دیر کے لئے ٹھہر جائے۔ تاکہ ہم آرام سے نماز پڑھیں۔“ اور حبیبؑ نے یہ بات کہی جا کے۔ اس فوج نے کوئی گستاخانہ جواب دیا۔ اور حبیبؑ تو وہیں شہید ہو گئے

سعیدؑ نے آ کے کہا

مولانا!

حبیبؑ تو شہید ہو گیا۔ میں موجود ہوں۔ آپؑ نماز شروع کریں۔ آپؑ کے سامنے کھڑا ہوں۔ آپؑ نماز شروع کریں۔ اور جب تک کہ ازختم نہیں ہوگی۔ ہمیں آپؑ تک کوئی تیر نہیں آنے دوں گا۔“

سامعین! نوے برس کا بڑھا آدمی۔ سعیدؑ کھڑا ہو گیا حضورؐ کے سامنے۔ اور نماز شروع ہو گئی۔ جو تیرا دھر سے آتا۔ سعیدؑ اسے اپنی بڑھی پسیروں پر روک دیتا۔ پسیراں ٹوٹ گئیں۔ تیر گھس گئے سینے میں۔ اور ادھر امامؑ نے سلام پھیرا ادھر یہ گود میں جاگرا۔ اور گر کے گود میں پوچھا کیا ہے بھل و نیت۔ اور رسول اللہؐ

”لے رسول کے بیٹے! آپ میری اس کارگزاری سے خوش ہیں“

تو امام نے جواب میں یہ فرمایا

”یا سعید! انت امانی فی الجنہ۔“

”سعید! انشاء اللہ جنت میں تو میرے آگے آگے چلے گا۔“

قیامت کے دن جب میں جنت میں جاؤں گا۔ تو تو میرے آگے آگے چلے گا۔

اور جب میں نانا کے، بابا کے سلام کو جاؤں گا تب بھی تو میرے آگے آگے ہوگا۔“

تو سعید کیا التبا کرتا ہے

درمولا! اگر یہ بات ہے۔ تو میری ایک گزارش ہے۔ کہ میرے بدن سے تیرا نکلانا۔

میں تیرے نانا اور بابا کے سامنے اسی طرح جانا چاہتا ہوں۔“

اور یہ کہہ کے موت کا پسینہ آگیا۔ آخر بڑھا آدمی تھا۔ اسی موت کے پسینے میں کہتا ہے

درمولا!

کسی نے میرا سر لے لیا ہے گو دیں۔ مجھے بڑا آرام مل رہا ہے۔“

تو امام فرماتے ہیں

درسعید!

میرا سلام کہو۔ یہ میرے نانا رسول اللہ ہیں۔

درمولا!

کوئی میرے بازو دبا رہا ہے۔ مجھے بڑا آرام مل رہا ہے۔“

مولا نے فرمایا

درسعید! یہ میرے بابا حیدر کوڑا ہیں۔“

درقبکہ! کوئی میرے سینے پہ ہرا جھلی رہا ہے۔“

تو امام نے فرمایا

”یہ میرے بھائی حسن ہیں۔“

اور سونگے بھی آخری فقرہ!

سعید نے کہا

”مولانا کوئی میرے پیروں کے قریب بھی ہے۔“

تو امام نے فرمایا

”سعید! ذرا پرہٹا ہے۔ یہ میری ”آماں“ آگئی ہیں۔“

اسے کہتے ہیں قبیلہ! معرفتِ اُمّ

اسے کہتے ہیں اُمّ کا پہچانا۔

اللہ آپ کو، مجھے، سب کو وہ نظر عطا فرمائے جس سے ہم اپنے اُمّ کو، اپنے آما

در مہر کو، اپنے مولانا و سردار کو، اپنے پیروں کو پہچان سکیں۔

”بحق محمد و آل محمد۔ ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم“

اللهم صلی علی محمد و آل محمد

~ ~ ~

آلِ مُحَمَّد!

تمہارا قصور صرف یہی ہے کہ تم اتنے

اچھے کیوں ہو۔
خطیبِ آلِ مُحَمَّد

شامِ شہیدان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
 اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ سٰجِدُوْنَ

سید زادو!

آج تم اپنے گریبان چاک کر کے زمین پر بیٹھ جاؤ۔ آج سیدانیاں سر کھول
 کے زمین پر بیٹھ جائیں۔ آج کی رات ہمارے گھروں میں روشنی نہیں جلتی پھینے
 آج حسینؑ کی زندگی کی آخری رات ہے۔ کل اس وقت دنیا میں حسینؑ نہیں ہوگا۔
 ”مولانا تیری غربت کی حد ہو گئی۔ آج رات بھی تو نے مانگ کے
 لی ہے۔“

مولانا! ہم نے تیرا جلوس نکالا۔ بازاروں میں ماتم کیا۔
 مولانا! ہم اللہ کو گواہ کر کے کہتے ہیں کہ ہمیں اپنا وطن عید کو یاد نہیں
 آتا۔ مگر جب محرم کا چاند دیکھتے ہیں تو اپنا وطن یاد آجاتا ہے۔
 مولانا! آج جب ہم تیرا جلوس لے کر آرہے تھے تو سوچا جلوس کہاں لے جائیں؟
 آخر عقل نے کہا۔

”آج کہیں نہیں جانا۔ آج خیمہ سادات کے سامنے بیٹھ جانا ہے“

بھائیو!

آج نون محرم کو سادات کا خیمہ آباد ہے۔ بیٹی کے پاس باپ موجود ہے۔ بہن کے پاس بھائی موجود ہے۔ بیوی کے پاس شوہر موجود ہے اور عزیزوں کے پاس عزیز بوجڑ ہیں۔ گو یا آج شہیدوں کی رات ہے اور کل رات جو آئے گی وہ عزیزوں کی رات ہوگی۔

— لہذا میں آج آپ کے سامنے مجلس پڑھنے نہیں آیا ہوں بلکہ پوچھنے آیا ہوں کہ آپ لوگ اس طرح زمین پر کیوں بیٹھے ہیں۔ تمہارے سر کیوں ننگے ہیں۔ تمہارے گریباں کیوں چاک ہیں۔ تم ماتم کیوں کر رہے ہو۔ تم پر کیا گزری؟

بھائیو!

میں تو یہ کہنے آیا ہوں کہ نہ ہمارا کوئی جوان رہا نہ بچہ۔ نہ ہمارے بوڑھے رہے۔ نہ ہمارا گھر رہا۔ لوگوں نے ہمارے کپڑے کے گھر بھی جلا دیئے۔ آج ہمارا بھرا ہوا گھر تباہ ہو گیا۔ آج ہم زمین پر بیٹھے ہوئے گریہ کر رہے ہیں۔

سامعین!

تم سب مل کر ایک دفعہ آواز تو دو —

حسین

کر بلا دالے حسین!

شہنشاہ حسین!

تیرے دروازے پر بھکاری حاضر ہوئے ہیں حسین!

نورن تک تیرا ماتم کیا ہے حسین!

آج تیرے ماتم کو الوداع کہنے آئے ہیں حسین!

حسین! تیری مہمانی نہ کر سکے۔ دل بھر کے تیری عزاداری نہ کر سکے۔

حسین! اگر زندہ رہ گئے تو اگلے سال پھر یہ غم منائیں گے۔ اگر مر گئے تو —

مولا! یہ ہمارا آخری سلام قبول فرما۔

مولّا! ہماری پریشانیوں رفع فرما
 مولّا! ہمارا ملک محفوظ رہے۔ مولّا کو تو ہم نے پکار لیا ہے۔ اب ایک آواز
 اور دو۔

"بی بی زینب! آج شام شہیدیاں ہے۔ تیری پریشانی پہ ہماری
 جان قربان۔"

بی بی! آج شام ہی سے تو نے چادر نہیں اڑھی۔

بی بی! ہماری عورتیں، ہمارے بچے تیری پریشانی پہ قربان ہیں
 ہم سب تجھے پُرسارنے آئے ہیں۔

(خصوصاً چھوٹے بچے مل کے پُکاریں)

"بی بی سکیئنہ! تمہارے غلام حاضر ہیں۔"

کل صبح تو یتیم ہو جاؤ گی سکیئنہ!

آج دل بھر کے باپ سے مل لے سکیئنہ!

ہمارے ماں باپ تیری یتیمی پہ قربان ہیں سکیئنہ!

بس بھائیو!

میں اپنی گفٹنگو ختم کرتا ہوں کہ

یوم عاشور۔ جب تمام عزیز واقارب جام شہادت پی چکے تو حسینؑ بیت الشرف

میں تشریف لائے۔ زہرا کا چاند۔ چہرے پہ کربلا کی گرد۔ دل میں عزیزوں کے درد لئے
 بھرائی آواز میں کہہ رہا ہے۔

زینب!

آج تھلا بھائی تم سے جدا ہو کے رخصت ہو رہا ہے۔

بہن! مجھے گلے مل کے رخصت کرو۔ اور دعا کرو کہ خدا مجھے اتنی

طاقت دے کہ میں اس مقصد کو جس کے لئے مجھے میری اماں نے
چکی بیس کے پالا تھا۔ نانا نے کاندھے پر سوار کیا تھا۔ باپ نے
سینے پر سلا یا تھا۔ آج اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے خدا مجھے توفیق
دے۔ خدا حافظ بہن! میں جا رہا ہوں:

سکینہ نے عبا کا دامن کھڑا کیا۔

”بابا! آپ وہاں جا رہے ہیں جہاں صبح سے جو گیا ہے واپس نہیں
آیا۔ اگر آپ آج رات کو واپس نہ آئے تو بابا جان! سکینہ کس
کے پاس سوئے گی!“

”بیٹا! تم آج رات سے اپنی اماں کے پاس سوتا۔“

بابا! اماں کے پاس تو چھوٹے بھائی علی اصغر سوتے ہیں۔ میں کیسے سوؤں گی؟
”نہیں۔ میرے لال! آج سے علی اصغر میرے پاس سویا کرے گا۔ تم اپنی اماں کے
پاس سو جا یا کرنا۔ اور دیکھنا بیٹا! ضد نہ کرنا۔ بیمار بھائی کے ہاتھ بندھے ہوں گے
چھو پھیاں مجبور ہوں گی مگر تم آرام سے زمین پر سو جا یا کرنا۔“
”اچھا زینب!“

خدا حافظ۔ میں جا رہا ہوں:

شبیر برآمد ہوئے یوں خیمے کے در سے
جس طرح نکلتا ہے جازہ کسی گھر سے

شہادتِ عظمیٰ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حضراتِ گرامی!

آج کی مجلس کا افتتاح کرنے کے لئے، بھٹے درودِ سلام کے سب حضرات متفق
آواز سے ایک دفعہ کہہ دیں۔ "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ"

میرے محترم سامعین!

آج میرے ذمے یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ میں آپ کے سامنے مقصدِ شہادتِ عظمیٰ
بیان کروں۔ لہذا میں آپ کے سامنے اور خدا اور رسول کے حضور میں اقرار کرتا ہوں
کہ یہ موضوع وہ ہے جسے اللہ یا اللہ کا رسول بیان کر سکتا ہے۔ شہادتِ عظمیٰ بیان کرنا
میرے بس سے باہر کی بات ہے۔ سمندر کو قطرے میں سمونا۔ دریا کو کوزے میں بند کرنا۔
اور کائنات میں پھیلی ہوئی حقیقت کو چند لفظوں کی قید میں لانا میرے امکان کی بات
نہیں ہے۔ بہرِ نزع اُس روایتی بڑھیا کی طرح جو اپنا کانا ہوا سوت لے کر خریداران
یوسف میں شامل ہو گئی تھی۔ میں بھی حسین کے نام لیواؤں میں نام مکھوانے کے لئے
حاضر ہو گیا ہوں۔

میرے بزرگو!

یاد رکھو! جس نظام کا نام اسلام ہے۔ جس ضابطے کا نام اسلام ہے جس میں
کانام اسلام ہے۔ جس قانون کا نام اسلام ہے۔ انسانی زندگی کے جس پروگرام کا نام اسلام

جو ہماری زبان پر ہر وقت رائج ہے۔ جسے ہم ہر وقت اپنے ساتھ وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ اس اسلام نے اقتدارِ اعلیٰ، حاکمیت اور ماکیت اللہ کے لئے مخصوص کر دی ہے۔
گویا۔

اسلامی ضابطے میں مالک ہے "اللہ"

حاکم ہے "اللہ"

سلطنت ہے اللہ کی

حکومت ہے اللہ کی

بادشاہت ہے اللہ کی — گویا۔

اللہ اور صرف اللہ کی حاکمیت کے اقرار کو اسلام کہتے ہیں۔

سامعین! ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء تشریف لائے ان کا اقتدار۔ ان کی طاقت توت ایسی تھی جن کے سامنے ساری دنیا سرنگوں تھی۔ بتائیے موسیٰ کے عصا کے سامنے فرعون کی طاقت کا سر جھک گیا تھا یا نہیں؟

ابراہیم نے آگ کو گلزار بنا کر نزدیکی نحر کو ٹھکت دے دی تھی یا نہیں؟ عیسیٰ نے مرد سے جلا کر اپنے زمانے کے زندہ مخالفوں کے دل کے چراغ بجھا دیئے تھے یا نہیں؟ اور محمد نے معجز سے دکھا کر ابو جہل جلیوں کی جہالت کو لیا میٹ کر دیا تھا یا نہیں؟ ہر نبی نے اپنے اقتدار سے تمام دنیا سے کلمہ پڑھوایا تھا یا نہیں؟ — مگر کسی نبی نے یہ نہیں کہا کہ "میں مالک ہوں" بلکہ ہر ایک یہی کہتا رہا۔ "میں مالک کا نمائندہ ہوں" یہاں تک کہ ختم الانبیاء کے بعد حکومتیں آئیں۔ سب سے پہلے اسلامی حکومتوں نے اپنے حاکم کے لئے لفظ "خلیفہ" تجویز کیا۔ گویا اس سے پہلے لفظ "خلیفہ" انسانی لغت میں تھا ہی نہیں یہ لفظ اسلام نے پیش کیا ہے۔ خلیفہ کے معنی یہ ہیں کہ حاکم کوئی اور ہے یہ صرف نمائندہ ہے۔ مالک کوئی اور ہے۔ یہ شخص صرف مرزا ہے لہذا خلیفہ کو ماکیت حاصل نہیں تھی

اور رسول کا وہ آخری خطبہ جس میں آپ نے فرمایا تھا۔

” آج قیصر و کسریٰ کی حکومتیں میرے پیر کے بیچے ہیں اب ملکیت کا راج ختم ہو گیا ہے۔ اب حاکمیت ختم ہو گئی ہے۔ اب سوائے اللہ کے کوئی مالک نہیں ہے۔“

اس نظریہ سے مسلمان زندہ تھا۔ اسلام زندہ تھا۔

محترم سامعین!

دہو سکتا ہے کہ الفاظ کی کوتاہی میرے اُس مقصد کو واضح نہ کر سکے۔ جہاں کہتا چاہتا ہوں۔ مگر آپ کا علم و ذہن میری کہی ہوئی بات کو خود ٹھیک کر لے گا۔ رسولؐ فرما کر چلے گئے۔ اب رسولؐ کے بعد آنے والوں نے لفظ ”خلیفہ“ سے یہ تبادلیا کرتے والے کوئی اور ہے۔ ہم صرف اُس کے نمائندہ ہیں۔ گویا جب تک خلافت اپنی سربراہی کا اعلان کرتی رہی ”راشدہ“ کہلاتی۔ ہدایت یافتہ کہلاتی۔ اور جب خلافت نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ”ہم بھی کچھ ہیں“ تو وہ خلافت ”راشدہ“ نہ رہی بلکہ ”ملوکیت“ بن گئی۔

حضورؐ والا زمانے کا انقلاب کہو یا دنیا کی گردش کہو کہ شام کے ملک (دشمن) میں ایک ایلا نوجوان تخت شاہی پہ بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے باپ کے تخت پہ قدم رکھا۔ وہ اپنے آپ کو کسی کا احسان مند نہیں سمجھتا۔ تخت کو اپنے باپ کا مال سمجھ کے بیٹھا ہوا ہے۔ جوانی کی عمر۔ شعر و شراب میں پلا ہوا شہزادہ۔ بے شمار سلطنت۔ بے اندازہ دولت کروڑوں انسان حضورؐ سے رکھنے والے خزانہ انشرفیوں سے بھر پور۔ فوج کا جائزہ لیا تو بیٹھا سپاہی۔ اسلحہ کا جائزہ لیا تو بے تعداد اسلحہ۔ اور اپنی رعایا کی مردم شماری کرائی تو اُس زمانے کی بارہ کروڑ آبادی اس کی رعایہ تھی جو اُسے اعلیٰ حضرت اُطل سبجانی، جہاں پناہ، جی حضورؐ، جی سرکار کہنے والے موجود تھے۔

اب بتاؤ! جب بارہ کروڑ انسان اُسے جہاں پناہ، جی حضورؐ، کہہ رہا تھا تو اگر اُس کے

دماغ میں مغزور پیدا ہو بھی جائے تو ممکن ہے اگر کسی اور کو یہ اسباب فراہم ہوتے تو وہ بھی مغزور ہو جاتا۔ گویا یزید بھی مغزور ہو گیا۔

اُس نے کہا "آج بارہ کروڑ انسان مجھے جہاں پناہ مان رہے ہیں۔ میرے پاس دولت ہے۔ خزانہ ہے۔ کوئی ایسا بھی ہے جو مجھے نہیں مانتا۔؟

یزید کو بتایا گیا کہ ایک شخص ہے جو تمہیں اور تمہاری ماکیت کو نہیں مانتا۔!

یزید نے پوچھا، کیا اُس کے پاس مجھ سے زیادہ فوج ہے؟

۔ نہیں۔

۔ مجھ سے زیادہ خزانہ ہے؟۔

۔ نہیں۔

۔ مجھ سے زیادہ اسلحہ ہے؟۔ " نہیں۔

۔ پھر وہ کون ہے؟

۔ ایک مزدور باپ کا مزدور بیٹا۔ چکی پینے والی ماں کا ایک بچہ۔ بیرونوں کا لباس

پینے والا ایک فقیر۔ بریبا پر بیٹھے والا ایک تلمذ۔ نانے کی قبر پر چراغ جلانے والا ایک

مجاور۔ وہ مجھے تسلیم نہیں کرتا۔

یزید نے کہا " نہیں، اس سے ہماری حکومت کی اطاعت قبول کرائی جائے اور

ہماری بیعت لی جائے۔

حضرات! اگر بارہ کروڑ انسان کسی شخص کی بیعت کر لیں اور اُس زمانہ میں بیعت وہی

شے تھی جو اس زمانے میں دوٹ ہے، اگر کسی کو بارہ کروڑ دوٹ مل جائیں اور ایک آدمی کا

دوٹ نہ بھی ملے تو اُسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ مگر بارہ کروڑ دوٹ لینے کے بعد ایک

انسان کے دوٹ پہ صد کر کے یزید نے یہ ناواستہ طور پر بتا دیا کہ بارہ کروڑ ایک طرف

اور یہ اکیلا ایک طرف ہے۔ گویا اس اکیلے میں اتنا وزن ہے کہ اگر اس نے پاؤں نہ کھینے تو

یہ بارہ کروڑ ناکام ہو جائیں گے۔ پوری دنیائے اسلام کا فیصلہ ایک طرف ہے اور اس اکیلے کا فیصلہ ایک طرف ہے۔

محترم سامعین! یزید کا اعلان یہ نہیں تھا "میں خلیفہ ہوں" اگر یہی اعلان ہوتا تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ مگر یزید کا اعلان یہ تھا کہ "میں مالک الملک ہوں"

اب بتائیے۔ رسول کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پلنے والا حسین! جید کرار کی گرد میں پلنے والا حسین! غافلہ کا دودھ پینے والا حسین! جبرئیل کے پروں پر سونے والا حسین! اللہ سے ناز برداری کرنے والا حسین! جنت سے لباس منگوا کر پہننے والا حسین! جنت کے میوے کھا کر پلنے والا حسین!

اللہ کے ہوتے ہوئے کسی اور کا مالک ہونا براشت کرے گا؟ "نہیں" ادھر اللہ کہتا ہے۔ "اللهم مالک الملک" صرف اللہ مالک ہے۔

ادھر یزید مسخرہ کہتا ہے "نہیں، میں مالک ہوں" حضرات! آپ دانشوروں سے پوچھ رہا ہوں۔

اللہ کہتا ہے۔ "میں مالک الملک ہوں" مگر یزید کہتا ہے۔ "نہیں، میں مالک الملک ہوں"۔

اب بتاؤ۔ مقابلہ کس کا ہو گیا؟ اللہ اور یزید کا۔
اگر یزید کہتا

"میں فرزند رسول ہوں۔ میں امام معصوم ہوں" تب تو یزید کا حسین سے مقابلہ تھا۔ مگر یزید براہ راست کہتا ہے "میں مالک الملک ہوں"

— معلوم ہوا کہ یزید کا مقابلہ براہ راست اللہ سے ہے۔ اب اگر اس مقابلے میں یزید جیت جائے تو ہمارے گاکون؟

• اللہ - اور اگر یزید ہار جائے تو جیسے لاکھوں ؛
 • اللہ - گویا مار جیتا ہے اللہ اور یزید کی -
 حسین کا تریزیہ سے مقابلہ ہی نہیں تھا۔
 اللہ نے کہا۔

• یہ روز کا جھگڑا ہے۔ کبھی فرعون مسخرہ میرے سامنے آ بیٹھا ہے۔ کبھی فرعون مسخرہ
 میرے مقابل آ بیٹھا ہے۔ کبھی ایلیس میرے مقابلے میں آ جاتا ہے۔ آج میں اس روز
 روز کے جھگڑے کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔
 اللہ نے کہا۔

سُن یزید! اگر تم مالک الملک ہو تو اپنے مالک ہونے کا ثبوت لے کر کسی میدان
 میں آ جاؤ۔ ادھر میں ثبوت لے کر آؤں گا کہ میں مالک الملک ہوں؟
 گویا یزید اپنے مالک الملک ہونے کا ثبوت لے کر بطور گواہ میدانِ کربلا میں آ گیا۔

• اللہ! دیکھ لے۔ میں مالک ہوں

میری فرج دیکھ۔ میں مالک ہوں

میرا اسلحہ دیکھ۔ میں مالک ہوں

میری سلطنت کی سطوت دیکھ۔ میں مالک ہوں؟

اب جو یزید نے یہ کہا تو اللہ نے آواز دی۔

• ہے کوئی اس بھری دنیا میں جو میرے مالک ہونے کی گواہی دے۔ مگر یہ سوچ لے

کہ مدعی اللہ ہے۔ لہذا گواہ کوئی کم حیثیت کا نہ ہو۔

ادھر اللہ نے اعلان کیا کہ

• ہے کوئی جو میرے مالک الملک ہونے کی گواہی دے؛

ادھر سردارِ جنانِ جنت کو جوش آ گیا۔

حسین نے کہا۔

• خداوند! میں گواہی دوں گا کہ تو مالک الملک ہے۔ میں گواہی دوں گا کہ ملکیت تیری ہے۔ میں دنیا کو تباہن گا کر یزید مسخوہ جو شہوت پرانا ہے:

اللہ نے کہا۔

• حسین! اگر تم واقعتاً گواہی دینا چاہتے ہو تو دیکھو!
میدانِ کربلا عدالت گاہ بن چکا ہے۔ یزید اپنے گواہ لے کر آیا ہے۔
حسین! تم بھی اپنے گواہ لے کر آؤ اور میرے مالک الملک ہونے کی گواہی دو۔

چنانچہ حسین اپنے گواہ لے کر کربلا کے لئے روانہ ہو گیا۔ جنتی دستاویزیں اپنی گواہی کے لئے ضروری تھیں۔ وہ بھی ساتھ لے کر مدینے سے چل پڑا۔

ساحسین!

بتاؤ۔ حسین مدینے سے کربلا کی طرف کیوں چل پڑا۔

لڑنے کے لئے؟۔ "نہیں"۔ مرنے کے لئے؟۔ "نہیں"۔ کسی کو مارنے کے لئے؟۔ "نہیں"۔ کسی کا ملک چھیننے کے لئے؟۔ "نہیں"۔ کسی کی سلطنت چھیننے کے لئے؟۔ "نہیں"۔

پھر بتاؤ۔ کیوں جا رہا تھا؟

حسین! خدا کے مقدسے میں گواہی دینے کے لئے جا رہا تھا۔ بلکہ یوں کہئے: حسین! کربلا میں "شہادت" کے لئے جا رہا تھا۔ چونکہ شہادت کے معانی گواہی دینا ہے لہذا حسین کربلا میں اللہ کے مالک الملک ہونے کی گواہی دینے کے لئے جا رہا تھا۔
حسین! کربلا کیوں جا رہے ہو؟۔

• شہادت کے لئے۔ میری گواہی پر اللہ مالک الملک ہے:

اسی لئے حسین کے جلوس نکلتے ہیں جا کر اللہ کے مالک الملک ہونے کی گواہی تازہ ہوتی رہے۔ جو اس جلوس کو روکے گا۔ گویا اللہ کی مالکیت کو روک رہا ہے۔ بہر فرج حسین اللہ کے مالک الملک ہونے کی گواہی دینے کے لئے جو دستاویزیں گواہی میں ضروری تھیں۔ وہ بھی ساتھ لے کر بلا میں تشریف لا رہے ہیں۔

حسین نے بہن کو آواز دی۔

زینب! تم بھی چلو۔

حسین!

میں عورت زات۔ تم عدالت میں گواہی دینے جا رہے ہو۔ مجھے کیوں ساتھ لے

جا رہے ہو؟

حسین نے کہا۔

”زینب! جب کر بلا میں، میں مقدمہ جیت جاؤں گا۔ اللہ کی مالکیت منوالوں گا۔ اور ریز میڈ مار جائے گا تو تم شام میں جا کر ریز میڈ کی حکومت کے خلاف ڈگری کا اجرا کروا کے اس کی حکومت کو نیلام کروا دینا۔ تم ریز میڈ کی شہنشاہی کو گالی بنا دینا۔“

چنانچہ بہن بھی ساتھ چل پڑی۔ گواہی بھی ساتھ چل پڑے اور اللہ کے مالک الملک ہونے کی شہادت دینے والا کر بلا میں تین محرم کو آکے بیٹھ گیا۔ تین سے لے کر سات تک مثل کا معائنہ کرتا رہا۔ سات سے اتنا مشغول ہوا کہ نہ کھانے کی فرصت نہ پینے کا ہوش دسویں کو مقدمہ پیش ہو گیا۔ حسین نے گواہی دینا شروع کر دی۔ ایک ایک دستاویز گواہی میں پیش کرتا رہا۔

• خدا وندا۔ تیرے مالک الملک ہونے کی گواہی میں میرا کبڑا موجود ہے۔ میرا نام

موجود ہے۔ میرا بھائی عباسؑ موجود ہے۔ میرا نوادہ مہمانؑ موجود ہے۔

یہ سب گواہی دیں گے۔ ان کی شہادت ہوگی۔

سامعین!

جب اکہتر شہادتیں ہو چکیں تو خدا مقدمہ جیت گیا۔

”حسین! میں مقدمہ جیت گیا ہوں۔ تیری ساری گواہیاں قبول ہو چکی ہیں۔ اب

میری حاکمیت مستحکم ہو گئی ہے۔“

حسین نے کہا ”خداوند جیت گیا۔“

”ہاں جیت گیا۔“

”خداوند! تیرے دربار میں شہادت دینے کے لئے اب میں خود آ رہا ہوں؟“

حسین بیت الشرف میں تشریف لائے۔ بہن کو سلام کیا۔

بہن زینب! سلام

زینب نے جواب دیا ”حسین! سلام

زینب! مبارک“

”حسین! خیر مبارک“

بہن! میری تمام گواہیاں قبول ہو گئیں۔ میرا عباس بھی منظور۔ قائم بھی منظور۔

اکبر بھی منظور۔ میرا نووارد مہمان حُر بھی منظور۔ میرے درست بھی منظور۔

بہن! میں تو مقدمہ جیت گیا ہوں۔ اسلام کامیاب ہو گیا ہے۔“

زینب نے پوچھ لیا۔

”حسین! اسلام نے تجھے کیا انعام دیا ہے؟“

حسین نے جواب دیا۔ ”اسلام نے مجھے یہ انعام دیا ہے کہ حسین تو نے اللہ کو مالک

منزاکے اسلام کی عظمت رکھ لی۔ اب اسلام کا تجھ سے یہ وعدہ ہے۔

”حسین! یاد رکھو! اسلام تجھ سے وعدہ کرتا ہے۔“

جس دل میں حسین! تو نہیں ہوگا دہاں میں نہیں ہوں گا۔
 جس گھر میں حسین! تو نہیں ہوگا دہاں میں نہیں ہوں گا۔
 جس علاقے میں حسین! تو نہیں ہوگا۔ دہاں میں نہیں ہوں گا!
 • اسلام نے تو مجھ سے یہ وعدہ کیا ہے

زینب نے پوچھا۔

• حسین! خدا تمہیں کیا انعام دے گا؟

بہن! اپنا انعام لینے کے لئے خدا کے دربار میں میں خود جا رہا ہوں۔

بہن! سجدے کے بل جاؤں گا۔

زینب! اتنے بڑے دربار میں جانا ہے۔ خالی ہاتھ جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔

کوئی تحفہ لے جانا چاہتا ہوں۔

زینب بہن! کوئی تحفہ ہے تیرے پاس۔؟

زینب نے کہا۔ حسین! میرے پاس تو دو لعل تھے وہ ختم ہو گئے!

• قاسم کی ماں! تیرے پاس کوئی تحفہ ہے؟

• حسین! میرے پاس تو ایک ہی زرد تھا جو ختم ہو گیا۔

• اکبر کی ماں! تیرے پاس کوئی تحفہ ہے؟

• حسین! میرے پاس تو ایک ہی شب چراغ تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔

حسین! ابھی پوچھ ہی رہے تھے کہ ایک کونے سے آواز آئی۔

• حسین! میرے پاس کی ایک چھوٹی سی کٹی میرے پاس ہے۔ اگر تحفہ کے لئے کام

آئے تو لے جاؤ۔

چنانچہ حسین نے چھ مہینے والے کو ہاتھ پہ اٹھالیا۔

• خداوند! شہادتیں تو ہر یکیں۔ اب یہ تحفہ لایا ہوں۔

چنانچہ اللہ کے حضور میں حسینؑ نے تحفہ پیش کر دیا۔ - دفن کر کے گھڑائے۔ بہن نے پوچھا۔
 • حسینؑ! تمہارا تحفہ منظور ہوا!
 • ہاں بہن! میرا تحفہ بھی منظور ہو گیا!
 بہن! اب میں خود جا رہا ہوں۔ ذرا مجھے اپنے ہاتھ سے لباس بھی پہنا دے؟
 مامعین!

ایک مفاطلہ ورد العار ہے جسے میں دور کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے ذاکرین اکثر یہ
 پڑھتے ہیں کہ حسینؑ نے زینبؑ سے کہا۔
 • بہن مجھے پرانے کپڑے پہنا دو۔

مالا مکہ غلط ہے۔ خدا کی قسم! میں نے کربلا کی ساری تاریخ پڑھ ڈالی مگر کہیں نہیں
 پڑھا کہ حسینؑ نے پرانے کپڑے پہنے ہوں۔ بلکہ میں نے تو یہ پڑھا ہے کہ حسینؑ نے کہا۔
 ”زینبؑ! آج میں پرانے کپڑے نہیں پہنوں گا۔ آج میں شہنشاہ بن کے جا رہا ہوں
 مجھے آج بہترین لباس پہنا دو۔“

چنانچہ نائما کے معراج والا امام حسینؑ نے سر پہ باندھا۔ اپنی اماں کی چادر سے کمر
 باندھی۔ جعفر طیار کی شہپر کمر سے لگائی۔ حمزہ کی زرہ پہنی۔ حیدر کراڑ کی تلوار لٹکائی اور حن
 جتے کے نعلین پہنے۔ گویا آج حسینؑ نے بزرگوں کا لباس زیب تن فرمایا اور بہن سے کہا۔
 • زینبؑ! خدا حافظ! اب میں جا رہا ہوں۔ - چنانچہ سر سے پیر تک بزرگوں کا لباس
 تھا اس لئے زینبؑ نے جو اس وقت تاریخی فقرے کہے ہیں وہ آج ہمہ فضا میں گونج رہے
 ہیں۔

جب حسینؑ اپنے بزرگوں کا لباس پہن کر چلے تو زینبؑ نے کہا۔

”بی بیو! آؤ۔ دیکھو۔ آج میرے نانا رسول اللہؐ جا رہے ہیں۔ آج میرے بابا

حیدر کراڑ جا رہے ہیں۔ آج میری اماں ماطلہ رخصت ہو رہی ہے۔ آج جانی حسنؑ جا رہے ہیں۔

آج میرے سارے بزرگوں کا مایہ میرے سر سے اٹک رہا ہے؛

بہر نزع! حسین! میدان میں تشریف لائے۔

مولا جس وقت فوج کے سامنے پہنچے ہیں تو اُس بے حیا فوج نے طنز کیا۔

• حسین! اب تو باطل تھا ہے۔ تیرے سارے عزیز بربکھے ہیں۔ اب ہمیں کیوں

تخلیف دیتا ہے۔ گھوڑے سے نیچے اتر آؤ۔ تاکہ جلدی تیرا خاتمہ کر کے جنگ ختم کی جائے۔

اب جو فوج نے یہ طنز کیا تو حیدر کرار کی بیٹی کو جوش آ گیا اور وہیں دروازے

سے آرازدی۔

• حسین! یہ تجھے مجبور سمجھتے ہیں۔ زینب چاہتی ہے، ذرا تھوڑی دیر کے لئے میری

اماں کے دودھ کی طاقت بھی دکھادے؟

حسین نے جواب دیا۔

• اچھا بہن! اگر تیری یہی مرضی ہے تو ایسا ہی ہو گا۔

چنانچہ حسین نے ہم اللہ کہہ کے تلوار نکالی۔ تخلیہ تک فوج کو بھگاتے ہوئے پہنچے

تو فوج کا پچھلا دستہ کوفنے کے بازاروں سے ٹکراتا اور جب حسین گھوڑا دوڑاتے ہوئے

تخلیہ سے واپس کر بلا آئے تو ایک بلند ٹیلے پر چڑھ کے بلند آواز سے کہتے۔

• یا ایھا الناس! انا بن رسول اللہ!

لوگو! میں رسول کا بیٹا ہوں۔

زینب فرما کر جواب میں کہتی ہیں: • مرجا یا بن رسول اللہ!

• شاہا بش۔ اے رسول کے بیٹے۔

بہر نزع! حسین نے اس شان سے تیس حملے کئے اور حملوں کا انداز یہ تھا کہ

آنسو نکل آئے جسے دم توڑتے دیکھا

تلوار نہ ماری جسے منہ موڑتے دیکھا

فرزندِ رسولؐ نے اس طرح جہاد کیا۔ دورانِ جہاد اللہ کی طرف سے غائبی آواز آگئی۔

”حسین! شجاعت دنیائے دیکھ لی۔ اب آجا ہمارے پاس۔“

اے نفسِ مطمئنہ! آجا ہمارے پاس۔“

حسینؑ نے گھوڑے کی باگ اس کے کاندھوں پر رکھ دی اور فرمایا۔

”زوالجناح!“

یہ تیری میری آخری ملاقات ہے۔ اب میں اللہ کے ہاں جا رہا ہوں۔“

آؤ تیرو — آجاؤ

دشمن کی تلوارو — آجاؤ

دشمن کے نیزو — آجاؤ

امام رضا علیہ السلام کا فرمان ہے۔

”میرے جد کے زخم کوئی گن ہی نہیں سکتا۔“

مولاً فرماتے ہیں جتنے قرآن میں حرف ہیں اتنے ہی میرے جد کے بدن پر زخم تھے۔

گویا اتنے زخم کھا کے جب مولاً زمین پر گرنے لگے تو گھوڑے نے پاؤں جھکا دیئے۔

امام زماں زیارتِ ناحیہ میں فرماتے ہیں۔

”میرا سلام ہو اس شہید پر جو زمین پر پھانز زمین پر تھا۔“

لوگوں نے پوچھا ”مولا پھر کہاں تھا۔“

فرمایا ”گھوڑے سے گر گیا تیروں پر رہ گیا۔“

بہر نوح۔ حسینؑ کا بدن کافی دیر تک تیروں پر معلق رہا۔ مولائے زور دیا تو ادھر کے

تیرا ادھر بچل گئے۔ اور

حسینؑ نے سجد سے میں سر رکھ دیا ”سبحان ربی الاعلیٰ“

”خداوند اگواہ رہنا۔ میں تیرے اعلیٰ ہونے کی گواہی دے

رہا ہوں۔ میں تیرے اعلیٰ ہونے کی شہادت دے رہا ہوں۔
تدرت نے براہ کے مزہم لیا۔
حسین!

اب قیامت تک "سماں ربی الاعلیٰ" جو بھی کہے گا تیرے سجدے
کے صدقے میں کہے گا؟

حسین! تیری اس شہادت کا انعام تجھے یہ دیتا ہوں۔

"میں بھی باقی تو بھی باقی - نہ میں ختم ہوں گا نہ تو ختم ہوگا۔"

حسین! میرا ذکر بھی قیامت تک رہے گا۔ تیرا ذکر بھی قیامت تک رہے گا۔
حسین! میری اذان ہوگی تیری نوبت شاہی ہوگی۔

حسین! جہاں جہاں میرا تذکرہ ہوگا۔ وہاں وہاں تیرا تذکرہ بھی ہوگا۔ جتنے میرے گھرے
حسین۔ اتنے ہی تیرے گھر ہوں گے۔"

چنانچہ یزید کے خلاف ڈگری ہوئی اور امام حسین علیہ السلام نے اللہ کی طرف سے
شہادتِ عظمتی کا انعام پایا۔ جس کی یاد آج ہم بازاروں میں جلوس کی شکل میں منا رہے ہیں۔

إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

فلسفہ اخلاق کی اصطلاح میں

عقل کے مطابق نقل و حرکت کرنے کو

"شجاعت"

کہتے ہیں

دخیلیہ لعمری

اصحابِ حسینؑ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خداوندِ عالم کی حمد و ثنا کے بعد حضراتِ محمد و آلِ محمد پر درود و سلام
حضراتِ گرامی!

کر بلا کا واقعہ آج واقعہ ہو چکا ہے۔ لہذا اس وقت کی یہ مجلس پورا واقعہ کر بلا پر
ایک تبصرے کی شکل میں ہونی چاہیے۔ گویا یہ سب سے اہم ترین مجلس ہے اور تمام
جاس کی روح مجلس ہے۔

محترم بزرگو! جس رسول کی ہم امت ہیں اس کے لئے اللہ نے قرآن میں یہ فیصلہ کیا
ہے کہ۔

”اِنَّ الَّذِیْنَ یَبٰیعُوْنَكَ اِنَّمَا یَبٰیعُوْنَ اللّٰهَ“

جو تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں

یٰۤاَللّٰهُ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ فَمَنْ نَكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ

جو اس بیعت کو توڑ دے گا وہ اس کا خود نقصان اٹھائے گا۔

وَمَنْ اَدْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهِ اللّٰهُ فِیْ سُوْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا

اور جو اللہ سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرے گا اللہ اُسے اجرِ عظیم دے گا۔

گویا اُس وقت سے لے کر آج تک ہم رسول کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں۔

ہم نے رسول سے ایک عہد کیا ہے اور وہ عہد یہ ہے ”یا رسول اللہ! ہم مسلمان ہیں۔ ہم

آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں۔ ہمارا آپ سے اور آپ کے واسطے سے خدا سے
خدا سے عہد یہ ہے کہ

ہم اور ہماری ہر شے۔ ہماری جان، ہمارا مال، ہماری اولاد، ہماری ہر عزیز شے آج
سے آپ کی بیعت کرنے کے بعد ہماری نہیں رہی بلکہ اللہ کی ملکیت ہے۔
اب اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس عہد کو کسی بندے نے پورا بھی کیا ہے یا نہیں۔
لہذا اللہ نے اعلان کیا۔ "مے رسول" کے ساتھ عہد کرنے والے۔ میں تمہارا امتحان لوں گا۔
کیا تم اس عہد میں ثابت قدم بھی ہو یا نہیں۔
مگر جس وقت امتحان ہوگا اس وقت تمہاری حالت یہ ہوگی کہ تم پر خوف بھی ہوگا۔
بھوک بھی ہوگی۔ پیاس بھی ہوگی۔ مال و جان کا خطرہ بھی ہوگا۔

سامعین! یہ تو جتنی مختصر سی تہید۔ اب میں پوچھتا ہوں۔ یا اللہ! تو ہی بنا کسی نے
اس امتحان میں کامیابی بھی حاصل کی یا نہیں۔ کوئی ایسی جماعت پیدا ہوئی ہے جس نے پوری
کامیابی کے ساتھ تیرے اس امتحان کو پاس کیا ہو اور تو نے بھی جہنم کے کھردیا ہونٹا باش
تم جیسا کوئی پاس نہیں ہوا!
اللہ جواب میں کہتا ہے۔

"اُن ہی مومنین میں سے ایسے بہادر مرد بھی ہیں جنہوں نے اس عہد کو سچا کر دکھایا:
میرے بھائیو!

اُدھم سب ملی کر ان بہادروں کو ڈھونڈیں جنہوں نے اس عہد کو پورا کر دکھایا ہو جن
کی ہر شے اللہ کی ہے۔ اب جہنم ڈھونڈنے چلے تو دنیا کے کسی خطے میں ہمیں ایسے
آدی نہ ملے۔ آخر ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم کربلا کے پتے ہوئے صحرا میں پہنچے۔ دھوپ سے

ذبحہ ذرہ بے گل تھا۔ عرب کا صحرا تپ رہا تھا۔ آفتاب نصف النہار پر ٹھہرا ہوا تھا کہ ایک بے ضرر تانکہ مرحوم کو کربلا کے صحرا میں چاروں طرف لقمہ و دق جنگل۔ بیچ میں چھوٹی سی نہر۔ اس نہر کے کنارے تانکہ اُترا۔ نیسے لگے۔ خیموں میں عورتیں جا کے بیٹھیں۔ بچے ماؤں کی گود میں بیٹھے۔ مرد خیموں سے باہر بیٹھے۔ گن کے دیکھا تو تھوڑی کا تعداد۔ ان میں بڑے بھی ہیں، جوان بھی ہیں۔ بچے بھی ہیں اور عورتیں بھی ہیں۔

خداوند! یہ تھوڑے سے آدمی یہاں کیوں آئے ہیں؟

اللہ نے جواب دیا۔

”مجھ سے کئے ہوئے عہد کا استمان دینے آئے ہیں“

”خداوند! — ساری دنیا میں یہ تھوڑے سے آدمی ہی پاس ہو سکتے ہیں؟“

اللہ نے کہا۔

”تم انہیں تھوڑا نہ سمجھو۔ یہ گنتی میں تو تھوڑے ہیں مگر ساری دنیا سمٹ کے یہاں

آگئی ہے“

اب جو ہم نے دیکھا تو پتہ چلا کہ تمام دنیائے انسانیت کی نمائندگی اس جماعت

میں ہے۔ ان میں افریقی بھی ہے۔ یورپی بھی ہیں۔ ایشیائی بھی ہیں (ان دنوں میں تین

بڑے عظیم تھے) ان میں گورے بھی ہیں۔ کالے بھی ہیں۔ ان میں عرب بھی ہیں۔ ان میں

غلام بھی ہیں۔ آزاد بھی ہیں۔ ان میں امیر بھی ہیں عزیز بھی ہیں۔ ان میں مالک بھی ہیں۔ جاہل

بھی ہیں۔ ان میں بڑے بھی ہیں جوان بھی ہیں۔ ان میں بچے بھی ہیں۔ عورتیں بھی ہیں۔ مومن

ہر انسانی طبقہ کی نمائندگی یہاں موجود ہے۔ گویا پوری عالم انسانیت اس جماعت میں سمٹ

کے آگئی ہے — اور ان کا تانکہ! سبحان اللہ!

سنا ہے۔ اگر پارس سے لوہا نکلا جائے تو اُسے سونا بنا دیتا ہے۔ مگر ان پہنچنے کا تانکہ

ایسا پارسی ہے کہ اُس نے سونا نہیں بنایا بلکہ جو بھی اس کے ساتھ وابستہ ہو گیا اُسے بھی پارس

بنانا گیا۔ گو یاحسینؑ نے کربلا میں بہتر حسینؑ بنا کے کھڑ کر دیئے جو امتحان دینے کے لئے تیار ہو گئے۔۔۔ لہذا آج کا دن جس میں آپ نے ماتم کیا۔ جلوس نکالا۔ عشرہ منایا۔ آج ایک قوم اپنے عہد کا امتحان دے رہی ہے۔ بڑھے بھی ہیں، جوان بھی ہیں، بچے بھی ہیں، اپنے بھی ہیں، پرانے بھی ہیں۔ غرض سب آج امتحان دینے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔۔۔ بڑھوں میں سب سے پہلے ایک حبشی بڑھے کو پیش کرتا ہوں جن کا نام تھا جُورُن۔ بچکانوے سال کا بڑھا۔ حسینؑ کے بارہوی خانہ میں کام کرنے والا آج اپنے عہد کا امتحان دے رہا ہے۔ جُورُن ٹھکی ہوئی گردن کے ساتھ حسینؑ کے سامنے کھڑا ہوا۔

”حسینؑ!“

میں بھی چاہتا ہوں آج تیرے اُوپر قربان ہو جاؤں۔
 حسینؑ نے سر سے پیر تک بڑھے غلام کر دیکھا اور بڑی شفقت سے فرمایا۔
 ”جُورُن! تو میرے بزرگوں کی یادگار ہے۔ تُو نے میرے بزرگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔
 تو بہت بڑھا ہوا ہو چکا ہے۔ کسی طرف نکل جا۔“
 جب امامؑ نے یہ فرمایا تو بڑھے حبشی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
 ”حسینؑ ٹھیک ہے۔ میں نے اپنی حد سے بڑھ کر بات کہی ہے۔
 ”حسینؑ! کہا میں۔ کہا تیرے اُوپر قربان ہونا۔“

حسینؑ تیرے اُوپر قربان ہو نہ والا تو عباسؑ جیسا لاشمی چاہیے۔ اکبرؑ جیسا زونہال چاہیے۔ حبیبؑ جیسا بنی اسد چاہیے۔ مگر چونکہ میں ایک حبشی غلام ہوں۔ میرا رنگ کالا۔ میرے خون میں بدبو، میرا نسب نامعلوم۔ لہذا مجھے یہ ہمت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مجھ سے گستاخی ہو گئی۔ حسینؑ! میں کسی طرف نکل جاؤں گا۔ مجھے درندے کھالیں گے۔“

اب جو جُورُن نے یہ فقرہ کہا تو حسینؑ نے بڑھ کے جُورُن کا سراپے سینے سے لگایا۔

”چچا جرن، ٹر بڑا مانگیا۔ تو مجھے عباس کی طرح پیارا ہے۔ فکر نہ کر تو بھی اسٹان
دے گا۔ جا۔ اپنے استمان کی تیاری کر۔“

امام کے فرمان کے بعد جرن کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ نہ کوئی اسکو پاس تھا۔ نہ کوئی گھوڑا
پاس تھا۔ سید حامیدان میں جا کے کھڑا ہو گیا۔

”سبے جیا قوم! میں محمد کے بیٹے کی حمایت کے لئے آیا ہوں۔
ادھر سے جرن نے یہ فقرہ کہا ادھر سے پتھر برسے۔ بڑھی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ گرا
آوازی۔“

”حسین! میں گر گیا۔“

امام پہنچے۔ سرگود میں لیا اور رخسارہ پر رخسارہ رکھ دیا۔ اب جو امام نے رخسارہ پر
رخسارہ رکھا تو جرن کو ہنسی آگئی اور ہنس کے کہتا ہے۔

”جیبیٹ! ادھر آؤ۔“

جیبیٹ آئے تو بڑھا حبشی مسکرا کے کہتا ہے۔

”جیبیٹ! تم میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ دیکھتے نہیں ہو کہ محمد کے بیٹے کا رخسارہ میرے

رخسارے پر ہے۔“

جرن نے جان دے دی اور کہ بلا مشک عنبر سے مہکتا رہا۔ یہ اس بڑھے کی

بات تھی۔

اب آپ کو ایک جوان کی بات سنا دوں۔ عبداللہ ابن وہب کہی۔ نیا دڑو لہا

نوجوانی کا عالم۔ کہ بلا کا پہلا شہید میدان میں جا رہا ہے۔ بیوی سے رخصت ہونے لگا۔
کچھ دیر ہو گئی تو ماں نے کہا۔

”بیٹا! بیوی کی باتوں میں تو نہیں آگیا؟“

عبداللہ خیسے سے باہر نکلا تو ماں نے دیکھا کہ بیوی شوہر کا دامن پکڑے یہ کہہ رہی ہے۔

”عبداللہ! خدا حافظ۔ جاؤ مرنے کے لئے۔ شہادت مبارک ہو
مگر ایک وعدہ کرو کہ قیامت میں جب تو رسول کے سلام کو جائے تو
مجھے نہ بھولنا۔“

بہر فرخ۔ نوجوان میدان میں گیا۔ دورانِ جہاد ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئیں۔ تلوار گر گئی۔
تو اس کی بیوی دوڑی اور تلوار اٹھا کے شوہر کو دی۔ چنانچہ عبداللہ نے دوسرے ہاتھ
میں تلوار پکڑ لی اور دانتوں سے بیوی کا دامن پکڑ کر نیچے میں واپس لایا اور مولّا سے عرض کی
”مولّا! اسے زینب کی خدمت میں پہنچا دو۔“

عبداللہ ابن وہب کبھی کے بعد ایک اور بڑھامرت سے ہم کلام ہوا۔ وہ تھے
حضرت جنابہؓ صحابی رسولؐ۔ جب وہ شہید ہو گئے تو امام لاشے پر پہنچے۔ لاشہ اٹھایا
گنچ شہیدیاں ہیں رکھا۔ جب واپس آ رہے تھے تو امام نے دیکھا کہ نیچے کا پردہ اٹھا اور ایک
بچہ نیچے سے دوڑتا ہوا نکلا جیسے ابر میں سے چاند نکلتا ہو۔ امام نے آواز دی۔
”ابلیت! اس بچے کو روکو۔“

بچہ قریب آیا۔ امام نے بڑھ کے گرد میں اٹھایا۔ پوچھا

”بیٹے تم کہاں جا رہے ہو؟“

مولّا! میں مرنے جا رہا ہوں۔

”تم کس کے بیٹے ہو؟“

”مولّا! میں جنابہؓ کا بیٹا ہوں جو ابھی شہید ہوا ہے۔“

حسینؑ نے پوچھا، تیری ماں کہاں ہے؟

”نیچے میں۔“

”بیٹے! تیری ماں تو بربہ ہو گئی۔ جاؤ۔ اپنی ماں کے پاس جا کے بیٹھو۔“

اب جو مولّا نے یہ کہا تو بچے نے اڑیوں پر کھڑے ہو کر عرض کی۔

”مولا! یہ کرتا اماں نے ابھی پہنایا ہے۔ یہ کمر میری اماں نے باندھی ہے۔ یہ تنواری
مجھے اماں نے دی ہے۔ میری ماں نے مجھے مرنے کے لئے بھیجا ہے۔ ابھی پتھر
یہ بائیں کہہ ہی رہا تھا کہ خیمے کے دروازے سے اُداڑاؤں۔“

”حسین! جفاؤہ کی ماں خرش نصیب تھی۔ مگر مجھ بیوہ کے ہر یہ کہ
رو نہ کرو حسین! اسے مرنے دو تاکہ میں بھی اس آسمان میں کامیاب
ہو جاؤں۔“

سامعین! ظہر کا وقت آگیا۔ حضرت سعیدؓ نے برس کا بڑھا صحابی حسینؓ کے سامنے
پہنچا اور عرض کی۔

”مولا! ظہر کا وقت ہے۔ ہم آپ کے ساتھ جماعت کی نماز پڑھنا چاہتے ہیں۔
مولانا نے کہا۔“

”شاباش۔ خدا تمہیں اجر خیر دے۔ اس عالم میں بھی نماز تمہیں یاد ہے۔“
چنانچہ مولانا نے نماز شروع کرادی اور حضرت سعیدؓ کے سامنے کھڑے ہو
گئے تاکہ کوئی تیر فرزند رسولؐ تک آنے نہ پائے۔ اب جو مولانا نے نماز شروع کی تو
دشمن کی طرف سے برابر تیر آنے لگے۔ سعیدؓ نے تیروں کو اپنے سینے پر روکنا شروع کر
دیا۔ بڑھا آدمی۔ بڑھی پللیاں تیروں سے ٹوٹ گئیں۔ ادھر مولانا نے سلام پھیرا ادھر
سعیدؓ کی گود میں آگرا۔ اور گر کے پڑھتا ہے۔

”هَلْ وَفَيْتَ يَا بَنِي سُرَّوَلِ اللَّهِ“

”مولا! میں نے جو عہد کیا تھا وہ پورا کر دیا۔؟“

امامؑ نے جواب میں فرمایا، انت امامی فی الجنة۔ ”سعیدؓ میں جنت میں جاؤں گا
تو تو میرے آگے آگے چلے گا۔“ اب جو مولانا نے یہ فرمایا تو سعیدؓ کہتا ہے۔
”مولا! اگر یہ بات ہے تو میری ایک عرض ہے۔“

امام نے فرمایا "سعید کہو کیا بات ہے؟"

"مولاً! میرے بدن سے تیرا نکانہ میں تیروں سمیت تیرے نانائے پاس جانا چاہتا ہوں۔" اور یہ کہہ کے سعید کہتا ہے۔

"مولاً! کوئی میرے سرخانہ بیٹھا میرا سر دبا رہا ہے۔ مجھے آرام مل رہا ہے۔ مجھے بڑا آرام مل رہا ہے۔"

مولائے فرمایا۔ "سعید سلام کرو۔ یہ میرے نانائے رسول اللہ آئے ہیں؟"

مولاً! کوئی میرے سینے پہ ہاتھ پھیر رہا ہے؟

سعید! یہ میرے ابا حیدر کر آئے ہیں؟

مولاً! کوئی میرے بازو دبا رہا ہے؟

سعید! یہ میرے بھائی حسن آئے ہیں؟

مولاً! کوئی میرے پاؤں کے پاس بھی ہے؟

سعید! پاؤں سمیٹ لو۔ تیرے استقبال کو میری اماں آئی ہے؟

بہر نوح! اصحابِ حسین اپنے گئے ہوئے عہد کو پورا کر رہے ہیں۔ اور جب تمام

اصحاب اپنا اپنا امتحان دے چکے تو اب حسین کا اپنا امتحان ہے۔

"یا اللہ! تیرے حضور میں امتحانِ عشق دینے کے لئے میں خود آ رہا ہوں۔ اپنا

کیا ہوا عہد پورا کرنے کے لئے میں آ رہا ہوں؟"

حسین میدان میں آئے۔ خمیوں میں عورتیں دم بخود ہیں۔ دروازے پہ زینبِ خاتون

کھڑی ہے۔ دورانِ جہاد بے حیا فوج نے تشریح کے لیے میں کہا۔

"حسین! اب تیرا آخری وقت ہے۔ کیوں ہمیں بھی پریشان کرتے ہو؟ کھڑے

سے اتر آؤ۔ تاکہ یہ جنگ جلدی ختم ہو جائے۔"

جب بے حیا فوج کا یہ طنزیہ فقرہ زینب نے سنا تو علی کی بیٹی کو جوش آ گیا۔

دروازے سے آواز آئی۔

حسین! یہ تجھے مجبور سمجھتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے میری آماں کے
دودھ کی طاقت دکھا دے۔ تاکہ یہ دیکھیں کہ حسین مجبور ہے۔“

”اچھا زینب! اگر تیری یہی مرضی ہے تو ایسا ہی ہو گا۔“

حسین نے جب بسم اللہ پڑھ کے تلوار نکالی اور فوج پر حملہ کر دیا۔ تاریخ عالم گواہ ہے
کہ حسین فوج کو نخلیہ تک بھگاتے ہوئے پہنچے تو فوج کا پچھلا دستہ کوفے کے بازاروں سے
ٹکرا گیا۔ اور جب حسین دوڑتے ہوئے نخلیہ سے واپس کر بلا آئے تو بلند ٹیلے پر چڑھ کے
بلند آواز سے کہتے۔ انا ابن رسول اللہ۔ لوگو! میں رسول کا بیٹا ہوں۔
زینب فوراً جواب میں کہتی۔ مہرجا یا ابن رسول اللہ۔ شاباش۔ اسے
رسول کے بیٹے۔“

بہر زرع! حسین نے جب اس شان سے تین حملے کئے تو دوران جہاد اللہ کی طرف
سے غائبی آواز آئی۔

”اے نفس مطمئنہ! دنیا نے تیری شجاعت دیکھ لی۔ اب آجاذ
ہمارے پاس۔“

اے آلِ محمد

اگر محبت میں ہم پورا نہیں مرتے تو انا دعویٰ ضرور ہے
کہ تمہارے دشمنوں سے ہمارا کوئی
واسطو نہیں ہے۔
(خطیب آلِ محمد)

سکینہ بنت الحسین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

خداوند عالم کی حمد و ثنا کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام

میرے سامعین!

اللہ کا یہ فرمان ہے "مَنْ نَعَرَ بِكَ تَكَسَّبَ فِي الْغَنَى"

جس کی عمر زیادہ مہربانے ہم اسے واپس کر دیتے ہیں بچپن کی طرف — میری صورت
یہ ہے کہ دیکھنے میں تو میں بوڑھا ہو گیا ہوں مگر خدا کے اس قانون کے مطابق میں بچہ
ہو گیا — اور یہ جوان خطیب میرے استاد ہیں، میں ان کا شاگرد ہوں
میں ان ہی سے سیکھ کے پڑھنا ہوں جو کچھ یہ پڑھتے ہیں — مجھے ذاتی طور پر کچھ یاد
نہیں رہا۔ جو کچھ سیکھ لیا ہوں، سنا دیتا ہوں۔ اب اس میں میرا کون سا قصور نہیں ہے یہ
سب غر کا قصور ہے — آج آپ کو بطور کہانی ایک بات سنا تا ہوں، اگر آپ
مان، مان کرتے رہے تو کہانی چلتی رہے گی — اگر آپ نے سچ میں اٹھیں ہوں تو کیا تو
کہانی رہ جاتے گی۔ کہانی سنانے کا مقصد یہ ہے کہ کہانی آپ کو یاد بھی رہے گی
— اور — یاد رہے گی تو میں بھی یاد رہوں گا — اگر بھول گئے تو مجھے بھی آپ
بھول جائیں گے — آپ اگر مجلس سنا چاہیں تو کسی نوجوان سے سنیں — اگر
کہانی سنا چاہیں تو مجھ جیسے بوڑھے سے سنیں جس طرح گھسریں بڑے بوڑھوں کا
کام بچوں کو کہانیاں سنانا رہ جاتا ہے۔ —

بزرگان من!

انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ جس سے اُسے عقیدت ہو جائے، اُس کیلئے وہ اپنی اُلفت کے اعتبار سے اچھے سے اچھا لفظ استعمال کرتا ہے۔ جتنا اچھا لفظ اُس کے ذہن میں آئے وہ اپنے ذہن کے مطابق اچھے سے اچھا لفظ استعمال کرتا ہے، چاہے وہ خود حقیقت میں اچھا نہ رہے، مگر چاہتا یہی ہے کہ اچھا لفظ استعمال ہو۔ جس طرح ایک مُرید اپنے پیر کے پاس گیا، "پیر سائیں! ایک تعویذ لکھ دو، تاکہ میرے گھر چوری نہ ہو" پیر نے کہا، "میاں تعویذ بھی لے جا اور ایک گنا بھی پال لے جو تیرے گھر کی حفاظت کرے"۔ مُرید نے عرض کیا، "جناب میرے تو پیر بھی تھی اور گتے بھی تھی"۔ مُرید نے اپنے پیر کی بڑی عزت کی تھی۔ بڑا شرف بڑھایا تھا، اپنی عقل کے مطابق بات کی تھی، مگر خدا ایسے نادان دوستوں سے بچائے جو بظاہر تو تعریف کرتے ہیں۔ بات کچھ اور ہوتی ہے۔ اسی طرح کی یہ ایک کہانی ہے کہ لوگ کچھ بات کرتے ہیں۔ نتیجہ کچھ اور نکلتا ہے۔

میرے محترم سامعین!

انسان کی لکھی ہوئی تاریخ کے مطابق آج سے پینتالیس سو سال پہلے عراق کی سرزمین پر عمر نامی ایک مقدس اللہ نے ایک بچہ پیدا کیا۔ جس کا نام تھا۔ ابراہیم۔ اور یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے بزرگوار حضرت محمد پرالشی کے بڑے قصبے میں جن کا ذکر کیا جاتے تو کہانی طویل ہو جائے گی۔ بہر نوع۔ جہاں ابراہیم پیدا ہوتے یہ وہ جگہ ہے جو شہر بابل کہلاتا ہے۔ جن کے کھنڈرات اب نکالے جا رہے ہیں۔ بابل شہر دُنیا میں سب سے بڑا شہر تھا۔ اُس کا رقبہ تقریباً ڈھائی سو مربع میل میں پھیلا ہوا تھا۔ بابل شہر کے محلوں کے نام یہ تھے۔ غازیہ، نینوا، کر بلا، اہلہ و عینرہ۔ یہ سب بابل کے محلے تھے۔ اِس شہر میں اُس وقت دُنیا میں تیسرے نمبر پر

تھے۔ ہر مذہب کے آدمی آباد تھے۔ ہر مذہب کا پیشوا دامن رہتا تھا۔ ہر مذہب کا عبادت خانہ دامن موجود تھا۔ ان تمام مذاہب میں کچھ لوگ خدا پرست بھی تھے۔ ضلالت پرستی دنیا میں ہمیشہ رہی ہے۔ خواہ کسی شکل میں رہی ہو۔ بہر نوع۔ اظہر پرست بھی تھے وہ۔

عبادت خانے کو باہمی زبان میں "کرب" کہتے ہیں۔ یہ عبادت خانہ فلاں بُت کا، یہ عبادت خانہ فلاں بُت کا۔ جہاں اللہ کا عبادت خانہ تھا اسکو "کرب اللہ" کہتے تھے۔ جسے آج کر بلا کہتے ہیں، یہاں وہ قوم آباد تھی جو اللہ کو پوجتی تھی اور اور باہمی سے۔ لہذا کہہ کر بلا جس جگہ کہتے ہیں یہاں سے لے کر کوڈنک جو اڑتالیس میل کا ٹکڑا ہے۔ یہ سب ایک جھیل تھی پھر ایک زلزلہ آیا۔ زلزلے کا اثر یہ ہوا کہ وہ جھیل خشک ہو گئی اور جھیل کی جگہ دامن ریگستان ہو گیا۔ عربی زبان میں جھیل کو کہتے ہیں "نہ"۔ آپ نے جغرافیہ میں پڑھا ہوگا لفظ "انباتے" لہذا جھیل کہتے ہیں "نہ" کہ اور خشک ہو جانے کو کہتے ہیں "جف"۔ وہ جھیل تھی اور خشک ہو گئی اس لئے اس جگہ کا نام رکھا گیا "نہ جف" جسے آج "نجف" کہتے ہیں۔

بہر نوع۔ آپ یہ کہانی سن رہے ہیں کہ اہل شہر میں حضرت ابراہیم پیدا ہوئے اور جب انکا زمانہ عروج آیا۔ انہوں نے سب سے پہلے دنیا کو علم نجوم کا دماغ کیا۔ دستاروں کے علم، کا تعارف کر دیا۔ ان کی شہرت ہوئی کہ عراق میں ایک ایسا شخص ہے جو دستاروں کا علم بتاتا ہے۔ چنانچہ راجہ جسر تھ نے یہاں سے طلبہ کی جماعت بھیجی۔ ابراہیم سے نجوم کا علم سیکھنے کے لئے۔ انہوں نے جا کے نجوم کا علم سیکھا اور واپسی پر جراتے ہندوستان آنے کے وہ مصر رہ گئے۔ کافی عرصہ تک وہ مصر میں رہے۔ یہاں تک کہ جناب ابراہیم کے انتقال کے ہزار، ڈیڑھ ہزار سال بعد مصر پر حکومت ہو گئی فرعون کی فرعون کی دستاروں کسی کا نام نہیں تھا بلکہ فرعون کہتے ہیں بادشاہ مصر کو تو ان میں سے ایک

فرعون کے جی میں آیا، چلو ہندوستان کی سیر کریں، اور ایسے آدمی چاہتیں جو مجھے ہندوستان کی سیر کرادیں۔۔۔۔۔ ابراہیم کے شاگرد جو نجوم سیکھ کے آتے تھے، وہیں ٹھہر گئے تھے وہ اُس وقت بھی ہندی کہلاتے تھے۔ انہیں ساتھ لے کر وہ بادشاہ ہندوستان میں آیا۔۔۔۔۔ بادشاہ کا نام تھا، ہری، گویا اُس بادشاہ کے ساتھ وہ مصری آتے جنہوں نے حضرت ابراہیم سے علم نجوم سیکھا تھا۔ ہندوستان کی سیر کراتی جب وہ گنگا کے دہانے پر پہنچا وہاں وہ ”ہری“ مر گیا۔ اُسے وہاں دفن کر دیا گیا اور اُس کے دفن کی جگہ کا نام ”ہری ددار“ ہو گیا جسے ”ہر ددار“ کہتے ہیں بہر نوح! آپ کو کہانی سنارٹا ہوں۔۔۔۔۔ حضرت ابراہیم کو اللہ نے حکم دیا خانہ کعبہ جس جگہ ہے وہاں جا کر تم اپنے بچے کو اور اس کی ماں کو آباد کرو۔۔۔۔۔ چنانچہ حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیلؑ اور ہجرہ کو اس جگہ جا کر بسا دیا۔۔۔۔۔ اسماعیل جب جوان چمکتے تو انہوں نے یہ ٹکڑیاں جو آج خانہ کعبہ کہلاتا ہے۔۔۔۔۔ یہاں بنی حبریم نامی ایک قبیلہ آ کے آباد ہو گیا۔ اس قبیلہ بنی حبریم کا جو شیخ تھا اسکی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ صرف ایک لڑکی تھی۔ اُس نے اپنی اکلوتی لڑکی کا عقدہ اسماعیلؑ کے ساتھ کیا۔ گویا اسماعیلؑ اس ”بنی حبریم“ کے داماد ہو گئے۔ اور جب وہ بہت بوڑھا ہوا اُس نے ایک ٹیلے پر کھڑا ہو کر اپنے بنی حبریم کے قبیلے سے کہا۔

”مجھے سردار مانتے ہو“

دسبے کہا، ماں مانتے ہیں

”سنو! جن کا میں سردار ہوں اُس کا آج سے میرا داماد سردار ہے۔۔۔۔۔ چنانچہ سرداری کا اعلان ہو گیا۔ گویا شہر مکہ کی آبادی ”داماد“ کی سرکاری کے اعلان سے قائم ہوئی اور جس جگہ کھڑے ہو کر اُس نے اعلان کیا تھا اُس جگہ یہ عمارت بنائی گئی، جو خانہ کعبہ کہلاتی۔ گویا خانہ کعبہ کی عمارت داماد کی سرداری کے اعلان کی یادگار ہے۔۔۔۔۔

کہ کچاڑوں طرف بنی حرم بھی آباد ہو گئے اور نسل اسماعیل بھی آباد ہو گئی۔ کتبہ کی حکومت آل اسماعیل کے پاس تھی۔ بنی حرم بطور رعایہ رہتی تھی ان کی تعداد زیادہ تھی۔ آل اسماعیل کی تعداد ذرا کم تھی۔ جب رعایہ کی تعداد زیادہ ہو جاتے تو وہ کثرت کے غرور میں آ کر حلیل الفت در سرداروں سے الجھ پڑتی ہے چنانچہ انہوں نے بھی یہی کیا۔ اولاد اسماعیل سے جھگڑا کیا، لڑائی کی اور اولاد اسماعیل تنگ ہو کر مکہ چھوڑ کر ادھر ادھر چلی گئی اور بنی حرم و ان قبا لیں ہو کے بیٹھ گئے۔ دعویوں کا پرستور ہے کہ لڑائی بھی دے دی اور دیران بھی کر دیا ان بے پاروں کو۔ یہ عربوں کی پرانی عادت ہے اولاد ابراہیم دنیا میں منتشر ہو گئی جہاں جہاں جس کے جی میں آیا وہاں جا کے بس گئے چنانچہ اولاد ابراہیم کی ایک شاخ یمن میں جا کے آباد ہو گئی۔ سینکڑوں سال یہ بے پایے اسی طرح منتشر رہے پھر خدا نے جو اولاد ابراہیم جو منتشر تھی، انہیں اکٹھا کیا۔ دوبارہ مکر پر سدک اور قبا لیں ہو گئے۔ اس طرح آل اسماعیل نے اپنی حکومت حاصل کی۔ قریش کے معنی میں بکھرے ہوئے کو اکٹھا کرنا "چوکھو قحیٰ نے یہ عمل کیا تھا اس لئے وہ "تشرش" کہلائے اور انکی اولاد "تشریشی" کہلائے۔ اس طرح آل اسماعیل کی حکومت یمن و ان دونوں قائم ہو گئی۔ یوں تو اسماعیل کی ساری اولاد کو میں آ کر بس گئے تھے مگر جو یمن چلے گئے تھے وہ دوبارہ مکر واپس نہ آئے بلکہ وہیں یمن میں آباد رہے۔ یمن میں انہوں نے بڑی تجارت شروع کر دی۔ بڑا کاروبار شروع کر دیا۔ ان کی دکان بڑی عزت ہو گئی۔ بڑی شان ہو گئی۔

میرے سامعین! اچھو پڑے کہ عیسائی مذہب میں سب سے بڑا مذہب یہی وہ لہلاتا ہے جو راہب ہوتا ہے۔ راہب کے معنی ہیں، جو نیا چھوڑی اور کبھی س جگہ میں جا کے بیٹھ جاتے وہ راہب عیسائی مذہب میں سب سے بڑا گویا مذہب ہوتا ہے۔ یہ خاندان چوکھو عیسائی ہو گیا تھا ان میں جو راہب بنا اس کی دولت تاتی

تجارت کرد "جس کے پاس جتنے پیسے ہیں لے آؤ" کوئی ایک سو کوئی پانچ سو اور کوئی ہزار لے کر آیا۔ پختے کسی کے پاس تھے لے آیا۔ خدیجہ کی دولت سے ملا دیتے اور فرمایا "یہ تم سب کی مشترکہ تجارت ہے جو منافع ہوا کرے گا۔ تم سب میں تقسیم ہو جایا کرے گا"۔ چونکہ وہ سب کی مشترکہ تجارت ہو گئی تھی اس لئے بجائے ٹوٹنے کے سب اس کے محافظ بن گئے۔ سرمایہ مشترک سے تجارت کرنے کا طریقہ سب سے پہلے حضرت ابی طالب نے بتایا ہے اس سے پہلے یہ بات کسی کو معلوم ہی نہیں تھی۔ عربی میں کہنی بنا کے تجارت کرنے کو "ایلاف" کہتے ہیں۔ اسکے معنی میں اُلفت پیدا کرنا۔ اور مشران نے ابی طالب کے اس عمل کو ان لفظوں سے یاد کیا "جو قریش نے کہنی بنا لی ہے۔ اپنے سردی اور گرمی کے تجارتی سفروں کے لئے یہ اصل میں ان پر احسان کیا ہے"۔ ابی طالب کو رب کعبہ مانو۔ یا۔ بہر نوع۔ اس طرح وہ تجارت ہوتی تھی۔ کہانی بڑے مختصر لفظوں میں آپ کو سنار ہوں۔ غویہ کے خاندان کا ایک فرد تھا "امراقیس" جو یمن میں رہتا تھا۔ یہ بھی عیسائی تھا۔ اُسے پڑھتا کہ میرے خاندان کی ایک خاتون "خدیجہ الکبریٰ" کہ جا کر رسول کی حرم بن گئی ہے۔ امراقیس کی شرافت و لطافت اور اخلاق کی داستانیں عرب کی ادبی کتابوں میں مختلف جگہوں پر درج ہیں۔ نہایت شریف النفس اور نیک انسان تھا۔ خدا نے اسکو دو بیٹیاں عطا فرمائیں۔ ایک کا نام سلمیٰ تھا۔ اور ایک کا نام سلمہ تھا۔ جو رشتہ میں بیٹیاں تھیں جناب خدیجہ الکبریٰ کی سلمیٰ جو ان ہو گئی تھی اور سلامہ ابھی چھوٹی سی بچی تھی جب اسکی ماں مر گئی

اُمّ القیس کے دل میں غم اجانے کیا خیال آیا اُس نے ارادہ کیا — مسلمان بننے کا
یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب مدینے میں تیسری حکومت مندر حکومت پر تھی —
اُمّ القیس اپنی دونوں بیٹیوں کو لے کر مدینے آگئی — سو چنے لگا — پہلے تو میں
مسلمان ہو گیا۔ پھر بڑی بیٹی کی شادی کسی شریف زادے سے کر دوں گا
اور چھوٹی بیٹی اپنی بڑی بہن کے ساتھ رہے گی۔ جب یہ بڑی ہوگی تو اس کی
بھی شادی کر دوں گا۔ اس نیت سے وہ دونوں بیٹیوں کو لے کر مدینے آگئی
مدینے میں آکر اُس نے یہ تلاش کیا کہ ”شریف ترین انسان کون ہے جس سے
اپنی لڑکی کی شادی کر دوں“

اب تم باؤ بھائیو!

دُنیا کے اصول کے مطابق معیار شرافت کیا ہے؟ — اگر پیسے
تو بڑا شریف ہے — دُنیا بھر کے محیب ہوں، پیسہ ہے، بڑا شریف ہے۔ جتنا
پسے ہو، وہ غریب ہے، تو بھوکا ہے، کنگال ہے، گویا پیسہ ہی شرافت ہے اور اگر
پیسے کے ساتھ ساتھ حکومت بھی مل جاتے تو شرافت کا بادشاہ بن جاتا ہے۔؟
چنانچہ اُمّ القیس نے آکر مدینے میں دریافت کیا، یہاں کوئی شریف بھی ہے؟
لوگس نے کہا، بھائی شریف تو وہ ہوا گا جس کے پاس دولت ہو، حکومت ہو اور
اگر دونوں مل جائیں — تو سبحان اللہ!

لہذا اتفاق سے یعنی بھی تھا اور صاحبِ حیثیت بھی تھا — اُمّ القیس
اُس کے دربار میں گیا دو چار باتیں کہیں۔ دو چار دن جا کر بیٹھا — جو بہن کو جوہر کا
پتہ چلتا ہے — کہنے لگا نہیں! — یہ اس قابل نہیں کہ میری لڑکی کا رشتہ
اس سے کیا جاتے — چند دن اور ٹھہرا — اس انتظار میں کہ کوئی شریف

ٹ — !

سامعین! — آپ بتائیں کہ یہودیوں کے باغ میں کام کرنے والا مزدور —
 —! بھلا اُس کی طرف اشارہ کون کرے — کسی نے بھی نہ کہا کہ ایک
 شریف ایسا ہے جو صبح سے لے کر شام تک مزدوری کرتا ہے — ایک دن
 وہ اتفاق سے دینے میں کسی اجتماع میں بیٹھا ہوا تھا کہ اُس نے دیکھا کہ بیرون پر
 مزدوری کی گرد پڑی ہوئی ہے۔ کہنیدوں پر پسینے کے چھائے پڑے ہوئے ہیں — پسینے
 شرابور ہے۔ مٹھی میں مزدوری کے پیسے ہیں، ایک شخص سر جھکائے ہوتے چلا آ رہا ہے
 اور کرتا کیا کہنے؟ کہ غریبوں کے قسیم بچے اُسے دوسرے دیکھ کے دوڑے آتے ہیں وہ دوسرے
 بچوں سے نظر بچا کے ایک بچے کو پیسے دیتا ہے — پھر دوسرے کو۔ یہاں تک کہ گھر پہنچنے
 تک کچھ بھی نہیں رہا — یہ منظر اُم القیس نے چار دن متواتر دیکھا (بھلا تو غور سے سنا،
 میری اس کہانی کو یہ ہا سے گھر کی کہانی ہے جو سوائے آنسوؤں کے کچھ بھی نہیں)

اُم القیس چند دن دیکھتا رہا اُس مزدور کو ایک دن وہ ایک قبیلے کے افراد میں بیٹھا ہوا
 تھا کہ اتفاق سے وہی مزدور سامنے آیا۔ سارے آدمی کھڑے ہو گئے اور خستہ آگے گزرتے نکلا۔
 ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مَا اشْرَفَهُ هَذَا الْقَتْلَى“

سامعین! — مسلمانوں کی سب سے بڑی قسم کلمہ ہے۔ اگر مسلمان کلمہ پڑھ کے
 کہہ دے، — کوئی بات، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بات کبھی جھوٹ ہو سکتی ہی
 نہیں۔ دوسرے مسلمان یہ فرض ہے کہ وہ اگر مسلمان ہے تو مان لے درہ اس کا اسلام
 غلط ہو جانے گا۔ اسی لئے ہم اتنا یقین ہے علی کی ولایت کا کہ ہم قسم جلال اٹھا کے کہتے ہیں کہ

إِنَّمَا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ عَلَىٰ دَلِيْلَتِهِ

علی کے دل ہونے کا ہم قسم اٹھا کے اعلان کرتے ہیں۔ اب جو نہیں
 مانے گا تو وہ مسلمان نہیں رہے گا

”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ — پہلے قسم کھاتی پھر کہا، ”ما اشرف هذا“ یہ

عجمان جو آرا ہے پڑا ہی شریف ہے، اب جو ان کے لئے عربی میں "شباب" کا لفظ بھی ہے۔ مگر انہوں نے شباب نہیں کہا۔ فتیٰ کہا ہے۔ فتیٰ اور شباب میں فرق ہے۔ ہر نو جوان شباب ہے۔ مگر ہر جوان فتیٰ نہیں ہے۔ جب ابراہیمؑ مزدک کے بت خانے کے بت توڑ کے آتے تو دریاں کے بت پرستوں نے جب بت توڑے گئے دیکھے تو انہوں نے فوراً کہا۔

يُذَكِّرُهُمْ يَتَالِ لَهُ اِبْرَاهِيمَ

"ایک فتیٰ ہے جو بت شکن ہے اور ابراہیمؑ اس کا نام ہے" معلوم ہوا فتیٰ اس جوان کا نام ہے جو بت شکن ہو فتیٰ ہر جوان نہیں کہلاتا۔ بت شکن فتیٰ کہلاتا ہے۔ اب جتنے مسلمان تھے بتوں سے توبہ کر مغرت تھی، مگر بت شکن سب نہیں تھے اس لئے یہ فقرہ بنانا پڑا۔

لَا فَتَى الْاَعْلَىٰ

کوئی بت شکن نہیں ہے سوائے علیؑ کے۔ اور۔ اس لفظ کی جان میں اتنی طاقت آگئی کہ اگر ساری دُنیا کے مُتلا بھی مل کر کسی کو بے دین بنادیں۔ (اصیبت یہ بن گئی ہے کہ مجھے تو جماعت کا پتر ہی نہیں اس لئے کہ میں اہل جماعت رہا ہی نہیں۔ ایک جماعت ہی "لافتی" کہنا شروع کر دے تو فتح اُسے ضرور ہو جاتی ہے۔

بہر فرغ۔ فتیٰ اسے کہتے ہیں جو بت شکن ہو۔ انہوں نے یہ نہیں کہا "لَا اِلَهَ اِلَّا اللهُ مَا اشْرَفَ هَذَا الشَّبَابُ" یہ جوان کتنا شریف ہے بلکہ کہا۔

مَا اشْرَفَ هَذَا الْفَتَىٰ" لفظ فتیٰ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مخصوص جوان ہے جس نے بت توڑے ہیں، بت پوجے کبھی نہیں اور کہا "اشرف"

شریف نہیں کہا۔ شریف اور چیز ہے۔ اشرف اور چیز ہے۔ مگر خدا شاہد ہے کہ شریف کہنے کی توہین اتنی عادت پڑ گئی ہے کہ جس انسان کو دیکھا اسے شریف کہہ دیا۔ اگر پاکستان و ہندوستان کے شریف گننا شروع کریں تو صبح ہر جاٹنگی شریف ختم نہیں ہو سکے گا۔ مثلاً اجیر شریف۔ سیال شریف۔ تونسہ شریف۔ فلان شریف مصیبت شریف۔

اور آفت شریف۔ ایمان سے میں تو ان شریفوں سے تنگ آ کے کراچی گیا۔ جہاز میں بیٹھا۔ جا آترا لہرے میں سوچا! شریفوں سے تو جان بچی۔ لہرے میں ریل گاڑی میں سوار ہوا اور صبح ہی صبح جو اسٹیشن پر آکھ کھلی تو سامنے لکھا ہوا تھا "بغداد شریف"۔ لو۔ شریف نے یہاں بھی جان نہ چھوڑی شریف یہاں تک بھی آ گیا۔ آھر کار میں نے ایک ٹیکسی کرایہ پر لی اور ٹیکسی ڈرائیور سے کہا "مجھے کسی اچھی جگہ لے چل" وہ لے کے چل دیا۔ ابھی دس میل دور تھی وہ جگہ کہ دوسرے طلاق گنبد نظر آیا۔ طلاق میاں نظر آتے۔ آکھ چپک گئی۔ دل ٹپ گیا۔ رُوح میں روانی آگئی۔ نفیس تیز ہو گئیں۔ کان میں غیبی آواز آئی "ہا ادب بلا ملاحظہ ہوشیار!" یہاں جبریل میں اردی ہے یہاں جنت کی بہاریں ہیں، یہاں انبیاء تعظیم کو کھڑے ہیں، یہاں کوثر لکھا ہے یہاں ایمان بڑھتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ ہے کیا؟"

"یہ نجف ہے۔"

عادت جو بھی مُتہ سے نکل گیا "شریف"

ڈرائیور نے میرے مُتہ پر ہاتھ رکھا اور کہا

"خبردار! شریفوں کی مدختم ہو گئی۔ یہ شریف نہیں ہے۔ یہ ہے

شریف گھ۔ جو اس کا صرف نام ہی لے لے شریف بن جاتا ہے۔ اسے کہنا؟

وہ نجف اشرف"۔ اب اشرف داغ میں بیٹھ گیا۔ اب جو کسی کا نام ٹوں گا تو

شریف نہیں کہوں گا۔ زیارت کی نجف اشرف کی۔ لطف آ گیا۔ سواد آگیا۔

افتریح کے پاس گیا، وہاں جا کر عرض کیا، مولائے کائنات! آواز دے مجھے الے
جبرئیل، طاقت پر واز دے مجھے۔ میں کس کے دیار میں آ گیا ہوں۔

وہاں سے میں نے پھر ٹھیکسی لی اور آگے چل پڑے تقریباً چالیس میل چلے ہونگے کہ
دور سے طلحائی گنبد نظر آئے۔ میں نے پوچھا، یہ کونسی جگہ ہے۔

ٹھیکسی والے نے کہا، یہ ہے کربلا۔

میں نے پوچھا، یہ اشرف ہے۔

دہنیں اشرف نہ کہنا اسے۔ اشرف، وہاں کی بات تھی۔ یہ ہے کربلا معلیٰ۔

بس بھائیو! لفظ معلیٰ معراج کی یادگار ہے۔ دنیا میں صرف دو ہی معلیٰ ہیں،

ایک عرش معلیٰ ایک کربلا معلیٰ۔ نائنے کی معراج نے عرش کو معلیٰ بنا دیا۔

نوا سے کی معراج نے فرش کو معلیٰ بنا دیا۔

بہر فرج! شریف تو ہر ایک کو کہتے ہیں مگر ام القیس نے کہا، ما اشرف الفقیٰ۔

وہ کتنا شریف گھر ہے، قیس نے کہا۔ میں تو شریف کی تلاش میں آیا تھا مگر یہ ایسے انسان کو

اشرف کہہ رہا ہے جس کے پاؤں پر عجا ربڑا تو، پسینے میں تر، پچھے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے

انسان کی یہ امیر العبد، قالین پر بیٹھنے والے، بڑے بڑے رتیں اٹھ کر تعظیم کر رہے

ہیں۔ اشرف کہہ رہے ہیں اور میں انہیں بھی غلط نہیں کہہ سکتا چونکہ یہ کلہ پڑھ کے کہہ رہے

ہیں۔ اسلئے قیس اٹھ کے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اور جب پہنچا گھر کے دروازے پر

تو اس نے دروازے پر لگا ہوا برڈ پڑھا۔ دواں لکھا تھا، انسا مید الی اللہ

قیس گھردا پس آ گیا۔ رات بھر سوچتا رہا، یہ کس انسان کو میں نے دیکھا، قیس ساری

رات بھر بے چین رہا۔ ضبح کو اٹھ کر پھر اسی گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اُدھر صوبہ

کی سپہی کرن اس گھر پہ آئی ادھر یہ جا کر پہنچا۔ دستک دی۔ وہی مزدور باہر آیا

۔ تم کون ہو؟ ناقلہ! میں یمن کا۔" ہاں ہاں! سمجھ گئے۔ ام القیس کہتی

آپ مجھے جانتے ہیں؟“ فرمایا ”ہاں! جانتے ہیں“ آج بھی کتابوں میں دُعا نے یمنی موجود ہے کوئی مشکل پڑے تو اس دُعا کو پڑھ لو، فوراً دور ہو جائے گی“ مولانا نے فرمایا ”تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے؟“ فرمایا ”ہاں! قبیلہ“ اچھا بیٹھ جاؤ“ ابوتراب کا ہمان پر بیٹھ گیا“ قیس! مٹی پر بیٹھنے سے آپ کو کوئی عار تو نہیں“ مولانا! آپ نے مجھے بیٹھنے کو کہہ دیا یہ مٹی اب مجھے مٹی نہیں نظر آتی“ میں اپنے کو یہ محسوس کرتا ہوں کہ کوثر کا کنارہ ہے طوبی کا سایہ ہے، جنت کی بہاریں ہیں، خودی میں میرے چاروں طرف کھڑی ہیں۔۔۔۔۔ اللہ جانے! میں کس جگہ آ گیا ہوں۔۔۔۔۔ عرش سے فرش تک مجھے نور نظر آ رہا ہے“

حضور مسلمان تو میں ہو گیا مگر آج مجھے تو پتہ چلا کہ علم اسلام کا مجھے کہاں سے ملے گا؟ ہر در سے بھیک مانگنے کے بعد اصلی در پر آیا ہوں، حضور! میری دو لڑکیاں ہیں ایک بچی ہے، ایک قابل شادی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ حضور کے شہزادگان محترم اگر میری لڑکی کو قبول فرمائیں تو میری دین دُنیا میں فلاح ہوگی۔“

چنانچہ قیس کی بڑی لڑکی سلامہ کا عقد اسی دن امیر المومنین نے اپنے فرزند اکبر شہزادہ کو نبین حضور امام حسن مجتبیٰ سے کیا۔ اسی خاتون کے بطن طیبہ طاہرہ سے حسن کے گھر وہ بچہ پیدا ہوا جو قاسم ابن حسن کے نام سے آج دنیا میں مشہور ہے۔ امیر المومنین کی شہادت کے بعد۔۔۔۔۔ امام حسن کی بھی شہادت کے بعد خلیفہ اسلام کی چھوٹی بہن جناب سلمیٰ جب جوان ہو گئی تو ان کا عقد حضور سید الشہداء امام حسین علیہ السلام سے ہوا۔۔۔۔۔ اب امرا نقیب کی قسمت جاگ اٹھی۔ اسے اس کی شرافت کا پورا اصل مل گیا۔۔۔۔۔ یاد رکھو! سسرالی رشتہ بڑا مفید ہوتا ہے بشرطیکہ لڑکی صاحب اولاد ہو کسی بڑے آدمی کے گھر لڑکی بیاہی جائے اگر اللہ اس لڑکی کے باپ کو شرف نہ دینا چاہے تو اس لڑکی کے اولاد نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ کیونکہ سسرال رشتہ نواسے، نواسی،

سے ہوتا ہے ناکہ داماد سے رشتہ تو ایک لفظ میں جوڑ دیا — ایک لفظ میں توڑ دیا۔ اصل رشتہ نوانے نواسی کا ہوتا ہے — اللہ کسی کو عزت نہ دینا چاہے تو لڑکی بے شک بڑے گھر چلی جائے۔ نواسہ نواسی نصیب نہیں ہوگا — میں کہتا ہوں سادات کرام! تم قیامت میں منظر دیکھنا، جب حکم ہوگا کہ آتش پرستوں کو جہنم میں بے جاؤ، نو شیرواں بھی آتش پرست تھا — وہ جائیں گے جہنم میں، اگر چلتے وقت اس نے کہہ دیا "ذرا جانے سے پہلے مجھے میرے نواسے زین العابدین سے بلا دو" — چونکہ نواسے ہیں زین العابدین اسی لئے تمام مسلمانوں کا یہ فیصلہ ہے۔ کہ جہنم میں تو وہ جائے گا مگر اُسے ایسا نکھا عطا فرمایا جائے گا کہ جہنم کی آگ اس پر اثر انداز نہیں ہوگی — !

پہرہ نوح! سلام و سلمیٰ حسن و حسین کی زوجیت میں آگئیں — اسی خاندان کی خدیجۃ الکبریٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں آئیں۔ اس خاندان کی سز بنی اور دوسری عزت اس خاندان کی یہ ہوئی کہ سلمیٰ اور سلامۃ امر الفیس کی بیٹیاں، حسن و حسین کی زوجیت میں آئیں — سلمیٰ کے بطن سے نوشزادہ قائم پیدا ہوئے۔

جو دوسری بھینیں امام حسین کی زوجہ محترمہ اس کے گھر سے پہلا بچہ جو ہوا، وہ لڑکا نہیں ہوا، بلکہ لڑکی ہوئی — اس خاندان رسالت نے ہر لڑکی کا نام فاطمہ رکھا — ہر لڑکے کا نام علی رکھا — پہچان کے لئے آگے لگا دیتے تھے، اکبر، اصغر، باقر وغیرہ۔ چنانچہ اس بچی کا نام بھی فاطمہ رکھا — سارے خاندان کو اسی بچی سے پیار تھا خصوصاً اس بچی کا عجیب و غریب چچا شمس الشہداء حضور قمر بنی ہاشم جناب عباس غازی کو اپنی اس بھینچی سے اتنا پیار تھا۔ نام تو فاطمہ تھا مگر وہ پیار سے سکیٹہ کہتے تھے سکیٹہ بڑی پیاری بچی تھی۔ سید الشہداء کو اور دوسرے گھر والوں کو اتنا پیار تھا اپنی اس بچی سے کہ اس کی ماں کو سسرال کی طرف سے رباب کا خطاب دیا۔ نام تو اصلی سلامۃ تھا مگر سسرال

سے رباب کا نام دیا گیا۔ گھر بھری لاٹلی بچی۔ چار سال کی ہو گئی مگر گھردالوں نے پیدل چلنے نہ دیا۔ کبھی حسین کی گود میں۔ کبھی عباس کی گود میں راقم کی خالہ زاد بہنیں رہی تھیں۔ اور چچا زاد بہن بھی کبھی ماں کی گود میں کبھی زینب کی گود میں کبھی کھنڈوم کی گود میں۔ بڑی لاٹلی بچی تھی سکینہؓ۔

۱۶ رجب سنہ ۳۰ھ کو رباب کے بطن طاہرہ سے خدانے ایک فرزند عطا فرمایا سید الشہداء کو۔ جس کا نام علی اصغر مشہور ہوا۔ سکینہ کا سگا بھائی تھا۔ ایک دفعہ پھر کتابوں علی اصغر کا یوم ولادت ۱۶ رجب سنہ ۳۰ھ ہے اور ۲۸ رجب سنہ ۳۰ھ کو جب حسین نے مدینہ سے سفر کیا ہے اس وقت علی اصغر کی عمر صرف ۱۲ دن تھی گویا ساری عمر علی اصغر کی سفر میں گزری، علی اصغر اور سکینہ دونوں بہن بھائی کر بلا سید الشہداء کے ساتھ گئے تھے ۶۴ سال کا سن سکینہ کا تھا اور صرف ۱۲ دن کا اصغر تھا جب گھر سے مولا چلے گئے۔ کہ بلا میں اصغر تقریباً چھ ماہ کا ہو گیا تھا، جس طرح ہر بہن کو بھائی سے محبت ہوتی ہے۔ اسی طرح سکینہ کو بھی اپنے بھائی علی اصغر سے محبت تھی۔ گھر والے سکینہ کو اپنی گود میں اٹھائے رکھتے، سکینہ بھی اپنے بھائی کو ہر وقت بہلاتی رہتی، جب دیکھو اس کا جھوٹا بھلا نہ ہی ہے۔ جب دیکھو اسے کونہ پہننا نہ ہی ہے۔ سب دیکھو اسے سر نہ رگا رہی ہے۔ ہاتھ دیکھو کے، آنکھوں میں آنسو بھر کے کہہ کر تے تھے "سکینہ! اتنا پیار نہ کر۔ ہے تو تیرا بھائی پر اتنا پیار نہ کر، اس کی جدائی کا صدمہ شاید تجھے برداشت نہ ہو" یہ دونوں بہن بھائی کر بلا میں تھے۔ سکینہ بھی اور علی اصغر بھی۔ میرے معزز دھرم سامعین! میں اپنے بیان کو مختصر کرتا ہوں کہ جب دسویں محرم کا دن چڑھا۔ سکینہ بھی پیاسی اور اصغر بھی پیاسا۔ جب سید الشہداء اپنی آخری قربانی، علی اصغر کو سے کے جانے لگے تو اصغر کی ماں رباب نے عرض کی "حضور! میں بڑے کو یہیم باپ کی بیٹی ہوں۔ مگر یہاں میرا باپ کتابی کریم ہی میں سیدانی نہیں ہوں، میری آپ کے گرانے سے کون نسبت نہیں جو عبر زینب و کاظم

کا حصہ ہے وہ مجھے کہاں ملے گا۔ میں اُتتی ہوں قبلہ! میں ذرا اپنے بچے کو سمجھانا چاہتی ہوں۔ چنانچہ علی اصغر اور سکینہ کو لے کر رباب اپنے خیمے میں چلی گئی۔ اچھا لباس پہنایا، کان میں وہ درموتی پہنائے جو چچا نے تحفہ کے طور پر دیئے تھے علی اصغر کو بھی نیا گرتہ پہنایا، بال ٹھیک کئے۔ اُتین بھی چڑھادیں، آنکھوں میں سرسره ڈالا۔ ایک رومال سے کمر باندھی۔ جب رباب خیمے سے باہر آئیں تو ایک ہاتھ سے سکینہ کی انگلی پکڑے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے اصغر کو گود میں لئے ہوئے اور عرض کیا "مولا! میری ایک گزارش ہے" کیا؟ "اپنی بہن کو بلا لو"۔ زینب بھی آگئیں۔ دونوں بہن بھائی سامنے کرسی پر بیٹھو، پھر میں کہوں گی۔" زینب اور حسین سامنے کرسی پر بیٹھ گئے۔ رباب کہتی ہے "فاطمہ کی بیٹی اور فاطمہ کے بیٹے! میں غیر خاندان کی تمہارے خاندان میں آئی ہوں تم نے میری عزت بڑھائی، تم نے میری شان بڑھائی، فاطمہ کی بہو کہلائی۔ تمہاری طرف سے دو تحفے مجھے ملے ہیں۔ ایک لڑکی۔ ایک لڑکا۔ یہ بچے تمہارے ہیں۔ ان سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ آج شام سے پہلے میں بوہ ہو جاؤں گی۔ میرا دنیا میں کوئی سہارا نہیں رہے گا۔ نہ میرا کوئی میکا ہے، نہ میرا کوئی عزیز ہے۔ میں تمہاری اس امانت کی، سکینہ اور اصغر کی حفاظت نہیں کر سکوں گی، میں آپ کی امانت کو سبھا کے لائی ہوں۔ آپ ہی کے سپرد کرتی ہوں" یہ کہہ کے رباب نے کیا کیا؟ کہ سکینہ کو اٹھا کے زینب کی گود میں پھینک دیا اور اصغر کو حسین کی گود میں۔ حسین نے چند منٹ بعد اصغر کو دفن کر دیا اور سکینہ کو سینے سے زینب نے لگا لیا۔ زینب کی مجھ جی سمجھو کر گلے سے تو لگاتے رکھا مگر کانوں کو نہ بچا سکی۔ اس کی کلائیوں کو نہ کھول سکی۔ اس کے گلے کو نہ کھول سکی۔ اسی طرح زینب۔ سکینہ کو بندھے ہوئے ہاتھ اور بندھے ہوئے گلے کے ساتھ لے کر شام آگئی۔

میرے محترم سامعین! قید خانے میں زینب نہ رہیں پر سوئی تو اپنے ساتھ سکینہ کو سلاتی

— بچی سونے سے پہلے پوچھتی "ابا کب آئیں گے؟ بناؤ زینت کیا جواب دیتی —
 بچی کو کہا کہہ کے بہلائی بچی کہتی "میرے چچا کب آئیں گے؟" کبھی کہتی "زمین پر چھ سے
 سو یا نہیں جاننا —" بناؤ اسے کس طرح زینت بھجائے اسے کس طرح تسلی دے؟ اور
 یہ روایت اکثر آپ نے ذاکروں سے سنی ہوگی، مودوسی صاحبان بھی بیان فرماتے ہیں —
 سکیٹہ نے شام کو پرزدوں کو اڑاتے ہوئے دیکھ لیا پوچھا "بھائی زین العابدین! پرند کہاں
 جا رہے تھے — فرمایا — "ہن! دن بھر چرکے، پیٹ بھر کے اپنے گھروں کو جا رہے ہیں"
 بچی پوچھ بیٹھی "بھائی! کبھی ہم بھی اپنے گھر واپس جاتیں گے۔ ہمارا بھی کوئی دنیا میں گھر ہے؟"
 ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک رات جو سوئی تو باپ کو خواب میں دیکھ لیا۔ جیسے
 باپ گود میں لئے بیٹھے ہیں — آنکھ جو کھلی تو ہائے "ابا! باپ کو یاد کر کے رونے لگی —
 روئی تو محلے کے لوگ اکٹھے ہو گئے "کیا بات ہوئی بچی کیوں رو رہی ہے؟" بتایا گیا کہ باپ
 کو یاد کر رہی ہے — انہوں نے یزید لعین کا عمل گھیر لیا "ایک معصوم بچی رو رہی ہے
 ظالم! اس کا تو کچھ خیال کر باپ کو یاد کرتی ہے" یزید نے اور تو کچھ نہ کیا، باپ کا سر دس
 دیا — جب سر قید خانے میں آیا بچی ایک دم گھبرا کے کہنے لگی — اماں! ابا کی
 خوشبو آ رہی ہے — میرے ابا آ گئے ہیں "سر گود میں سے کر بیٹھ گئی — ابا تم
 آ گئے" — سکیٹہ نے ایک ایک بات سنائی ہے باپ کو — ابا میرے کان دیکھ لو
 — ابا مجھے تنہا چھوڑ گئے "ابا! میری اماں کی چادر چھن گئی" یہ کہہ کے سکیٹہ نے باپ
 کے منہ پر منہ رکھا تو اب نہیں اٹھایا — کافی دیر ہو گئی زینت نے کہا "بیٹا!
 زین العابدین! دیکھنا، بات کیا ہے؟" زین العابدین نے دیکھا "اماں! پڑھو سب مل کے"

سامعین!

مسلمانوں کی بستی میں، فاطمہ کی پوتی، اسی کرتے میں دفن ہو گئی جو پناہ ہوا تھا۔ جب قافلہ

آل محمد مدینے رواد ہوا ہے تو ان کے دل پر جو سب سے بڑا صدمہ تھا وہ یہ تھا کہ سکیٹہ ہمیں چھوڑ گئی ہے۔“

زینب نے وعدہ کیا تھا، بیٹی نگر نہ کر، میں بھی یہاں آؤں گی تیرے پاس، اسی شام میں — اور وہیں قبرِ زینب کی بھی! — شام میں۔

یہ ہمارے گھر کی کہانی تھی۔ سکیٹہ کی کہانی — اب دشمنانِ آلِ محمد کچھ ہمارے بھیس میں کچھ دشمنوں کے بھیس میں خدا جانے کیا کیا بلکواس لگاتے ہیں — جب ان کے ہاتھ میں تلواریں نہیں۔ تو آلِ محمد کو تلواروں سے ذبح کیا۔ اب قلم ہے تو قلم سے ذبح کر رہے ہیں — آخر میں میں اپنے نوجوانوں سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اس کہانی کو جہاں تک ممکن ہو سکے پہنچائیں۔ تاکہ میرا کہانی سنانے کا مقصد کامیاب ہو جائے اللہ تمہارے بچوں کو میثم نہ کرے — جی محمد و آلِ محمد

جَبِ آلِ مُحَمَّدٍ

آمریت کی تلواروں سے نہ کٹ سکے تو ان پر ڈر وہ

موتیوں نے اپنے ہر اکو قلم سے آلِ محمد کو قتل کرنا شروع کر دیا

رحلیبہ آلِ مُحَمَّدٍ

م

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خداوند عالم کی حمد و ثنا کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام
حضرات گرامی قدر!

اللہ کا یہ فرمان ہے: **إِلَّا لَهُ الْخَلْقُ وَلَهُ الْأَمْرُ**
لفظی ترجمہ اس آیت کا سببی دانوں کے نزدیک یوں ہے۔

یاد رکھو:

اے قرآن پڑھنے والو۔ قرآن سُننے والو۔ قرآن کو ماننے والو۔ اے
اللہ کی طرف سے آیا ہوا کلام ماننے والو۔ اے محمد کا پہنچایا ہوا برحق پیغام ماننے والو
اس کے ہر زیر ذرہ کو حقیقی تسلیم کرنے والو۔ اس کی ہر حرکت و سکون کو اللہ کی طرف
سے نازل شدہ ماننے والو۔ اس کے ہر زیر ذرہ و ذرہ اور زیر کو زیر سمجھنے والو! اس
کے زیر کو کبھی زیر نہ کرنے والو۔ اور اس کے زیر کو کبھی زیر نہ کرنے والو!
پوری طرح سمجھ لو۔ اس بات کو پوری طرح۔ اپنے ذہن میں بٹھا لو۔ اس
بات کو اپنے دل سے مت نکالنا۔ کہ تمہارا ایک اللہ ہے۔ تمہارا ایک خالق
ہے۔ جس نے تمہیں دینا میں بھیجا ہے۔ وہ تمہارا مالک ہے۔ وہ تمہارا اللہ ہے۔

اور

— اس اللہ کو دو اختیار حاصل ہیں اس کے معنی یہ نہیں کہ اللہ کو اور اختیار نہیں

ہیں۔ اللہ کو اور بھی اختیارات حاصل ہیں۔ — یہ دو
 اختیار تمہارے اللہ کو حاصل ہیں۔ —
 ایک "خلق" کا — ایک "امر" کا —
 یہ دونوں اختیارات مخصوص ہیں صرف اللہ کے لئے "خلق"
 میں بھی اللہ کو اختیار ہے۔ "امر" میں بھی اللہ کو اختیار ہے۔ —
 اللہ کے علاوہ "خلق" میں کسی اور کو اختیار ہے نہ "امر" میں کسی
 اور کو اختیار ہے۔

اگر

اس مجلس میں کوئی عربی دان بزرگ موجود ہو۔ تو ان
 حضرات سے گزارش ہے کہ علم و معانی و بیان کے غنبا
 سے کسی "توخر" کو اگر "مقدم" کر دیا جائے۔ تو اس سے
 "حصر" پیدا ہوتا ہے۔ اور جار و مجرور جو عربی میں
 ہے۔ — وہ بعد میں آیا کرتا ہے۔ —

مگر

اس آیت میں پہلے آیا ہے —
 اللہ نے یہ نہیں کہا۔ المخلق والامر لہ۔ بلکہ
 "الاله المخلق وله الامر فرمایا ہے۔
 "لہ" میں جار و مجرور ہے۔ وہ پہلے آیا ہے۔ —
 اس کا پہلے آنے کے معنی یہ ہیں کہ

سوائے اللہ کے، صرف اللہ کو، محض اللہ کو، فقط اللہ کو اختیار ہے "خلق" کا
 بھی اور "امر" کا بھی۔ — اگر یہ "لہ" بعد میں ہوتا تو پھر اس کے معنی یہ بنتے کہ

اللہ کو بھی اختیار ہے۔ مگر

یہاں ”بھی“ نہیں ہے۔ بلکہ ”اللہ ہی کو اختیار ہے۔“ کسی کو خلق و امر،

کا اختیار نہیں سوائے اللہ کے۔۔۔۔۔ (یہ لفظی ترجمہ ہے اس آیت کا)

اب اس میں جو حضرات علمائے اکرام کی ”علمی مشقائیاں“ ہیں۔ وہ مجھے آتی

نہیں۔ اس لئے آج آپ کے سامنے سیدھی سادھی گفتگو کرنا ہے۔

”خلق، اور امر“ کا اختیار اللہ کو اور صرف اللہ کو ہے۔۔۔۔۔

اگر آپ مناسب سمجھیں تو ایک دفعہ کہہ دیں ”اللہ“

شرم کر رہ بندو!

”اللہ تمہارے منہ سے نکلا ہے۔۔۔۔۔

اب آپ کہیں گے۔

زیدی صاحب!

شرم۔۔۔ تم کرو۔۔۔ یہ اللہ نہیں نکلا ہمارے منہ سے

یہ لفظ ”اللہ“ نکلا ہے۔۔۔ چونکہ ”لفظ اللہ اور ہے۔۔۔۔۔

ذات اللہ اور ہے۔۔۔ یہ لفظ ”اللہ“ ہے جو ہمارے منہ سے

نکلا ہے۔۔۔۔۔

یاد رکھو میرے سامعین!

خدا کرے تمہارے ذہن میں یہ بات آجائے۔ اور میں اسے سمجھا

۔ سکوں۔۔۔۔۔

ہر لفظ جو انسان کے منہ سے نکلتا ہے جس میں صوتی و حرکاتی وجود

کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔۔۔ اسے لفظ کہتے ہیں اور جو لفظ ہوتا ہے۔ اس کا خالق

خود انسان ہے۔۔۔ انسان پیدا کرتا ہے ہر لفظ کو۔۔۔ انسان کے منہ

سے نکلتا ہے لفظ — اور

لفظ بتنا اس طرح ہے — کہ مٹا جاتا ہے — بتا جاتا ہے۔

مثلاً :-

جب آپ کہیں گے لفظ ”پانی“ — یہ لفظ آپ کے منہ سے نکلا ہے۔ آپ ہی اس لفظ کے خالق ہیں — آپ نے یہ ہی یہ لفظ پیدا کیا — مگر کس طرح؟
جب آپ کہہ رہے تھے ”پا“ — اس وقت ”نی“ موجود نہ تھا۔ اور
جب آپ نے کہا ”نی“ — تو ”پا“ ختم ہو چکا تھا — اگر پہلا حرف زبان پر
رگڑ رہے۔ تو دوسرا آ سکتا ہی نہیں۔ بہر حال لفظ کا خالق انسان ہے اور لفظ منہ
سے بتا ہے۔

”اللہ“ بھی ایک لفظ ہے (ذات اللہ نہیں) اللہ بھی ایک لفظ ہے۔ اور
ہر لفظ کے لئے یہ طے شدہ بات ہے کہ — بولنے والے کے منہ سے نکلتا ہے۔
لہذا لفظ ”اللہ“ بھی کسی کے منہ سے نکلا ہوگا — کسی نے یہ لفظ بھی بولا ہوگا۔ جب
ہی تو یہ لفظ آیا دنیا کے سامنے — اگر یہ لفظ اللہ کی ذات کا نام ہے تو اس
وقت کسی نے بولا ہوگا۔ جب اس کی ذات کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ —
معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اللہ نے جو اصلی اللہ ہے۔ جو ذات اللہ ہے —
اس نے جب اس کی ذات ہی ذات تھی — اس وقت کسی کو بنایا — اور بنا کہ
اس سے پوچھا —

بولو! — نہیں کس نے بنایا۔ — ؟

اس نے کہا

میرے بنانے والے! تو ہی بتا مجھے کس نے بنایا —
تو اللہ نے کہہ دیا ھُوَ الَّذِي

لفظ تو ابھی مُنہ سے نکلا ہی نہیں تھا۔ یہ تو انسان کے مُنہ سے نکلتا ہے۔
 اب بنانے والے نے کہا۔ هُوَ لِأَعْرِ اَمْسِي لے بنایا۔
 تو اس بنے ہوئے کے مُنہ سے نکل گیا۔ "اللہ"
 اور اللہ نے جملہ مکمل کر دیا۔ قَدْ هُوَ اللّٰه۔
 یہ اسی انسان کے مُنہ سے نکلا ہے۔ بغیر انسان کے مُنہ سے نکلا ہوا لفظ"
 بننا ہی نہیں۔

اب اللہ جانے۔ جب صرف اللہ کی ذات تھی۔ تو وہ کون انسان تھا۔
 جس کے مُنہ سے نکلا "اللہ"۔ اور اللہ نے اسی لفظ کو اپنی ذات کا نام بنالیا۔
 "میری ذات کا نام ہے اللہ"
 سامعین!

اب جو "اللہ" کہہ دیا اس نے۔ تو اس سے پوچھا۔
 "بتاؤ۔ اللہ کے متعلق اور کیا جانتے ہو۔
 انہوں نے کہا۔
 اور یہ جانتے ہیں۔ وہ احد ہے۔"
 اب جملہ یوں مکمل ہوا۔
 "قَدْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدًا" اللہ احد بھی ہے۔ اور احد کے معنی ہیں۔
 عربی لغت میں لفظ۔ کے کیا معنی ہیں۔ "ایک" یہ غلط ہے
 میرے محترم سامعین!
 "احد" کے معنی "ایک" نہیں ہے۔
 یاد رکھو!
 اللہ ایک نہیں ہے۔

جو کہتا ہے "اللہ ایک ہے" — ود غلط کہتا ہے —

اللہ ایک نہیں ہے — اور اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ ہو تو دوسرے میں پڑھنے والے بچوں سے پوچھ لو۔ یہ ابھی تصدیق کریں گے۔ جنہوں نے ریاضی پڑھی ہے۔

علم حساب میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ — ایک کا ہندسہ دو آدھوں کا مجموعہ ہے —

”دو آدھوں“ کو جوڑ دو۔ تو بن گیا ”ایک“،

اگر ہم کہیں ”اللہ ایک“ — تو اس کے یہ معنی ہیں کہ پہلے اُدھے اُدھے ”دو“ تھے۔ پھر جڑ کے ہو گیا ”ایک“ اور

دوسرے معنی علم ہندسہ میں ”ایک“ کے ہیں،

— ”دو کا آدھا“

اگر اللہ کو ہم ”ایک“ کہیں گے تو اس کے معنی ہیں —

پہلے دو تھے۔ پھر آدھا رہ گیا۔ تو ہو گیا ”ایک“

— اللہ ”ایک“ نہیں ہے — بلکہ

اللہ ”احد“ ہے —

”احد“ کے معنی کیا ہیں؟

— ”ایک کا پیدا کرنے والا“

گویا اللہ نے سب سے پہلے جسے پیدا کیا تھا۔ وہ ایک تھا۔ اللہ اُس کا خالق ہے —

اب ایک کے معنی یہاں لگاؤ —

ایک کہتے ہیں :- دو ہوں۔ انہیں جوڑ دو تو ایک — اور اللہ

کردر تو دو

معلوم ہوا۔

اللہ نے جسے سب سے پہلے پیدا کیا تھا —

وہ ایک بھی تھا۔ اور دو بھی تھے —

گویا سب سے پہلی جو مخلوق تھی۔ وہ دو بھی تھے — ایک بھی تھا۔

اب اس کو حدیث سے آپ سمجھ لیں — حدیث میں یہ ہے

أَنَا عَلِيٌّ مِنْ نُورٍ وَاحِدَةٍ

”میں“ — اور علیؑ،

سامعین!

جہاں لفظ ”اور“ بیچ میں آجائے تو ”و“ ہو جاتے ہیں —

”میں اور علیؑ“ — ہیں نا دو

اب دو بڑھ گئے — تو ہو گئے ”ایک“ —

— دو کے دو بھی ہیں — ایک کا ایک بھی ہے —

چونکہ دو اور ایک، عوام کی سمجھ میں نہیں آتا تھا —

اس لئے سمجھانے کے لئے ایک اور فقرہ کہہ دیا۔

أَدَّلُ مَا خَلَقَ اللَّهُ (القلم)

پہلی شے جو اللہ نے خلق کی — القلم

وہ تھا۔ ”قلم“

سامعین!

اب یہ قلم ”میری عمر والوں کی سمجھ میں تو ضرور آئے گا۔ جو اپنے ہاتھ

سے ”قلم“ بنایا کرتے تھے۔

ایک قلم تراش یا۔ ایک "کانا" یا۔۔۔ پہلے اسے چھیلا قلم بنانے کے لئے۔ اور جب وہ پھیل گیا۔ تو آپ نے قلم بنانے کے لئے اس کے بیچ میں "شگاف" دینا ہے۔ یعنی اسے دو کرنا ہے، جب تک وہ قلم دو نہیں ہوگا۔ لکھے گا نہیں۔ لہذا آپ نے دو کرنا ہے مگر وہ دو آپ نے قلم تراش کی نوک سے کرنا ہے۔ اس طرح دو ہو جائے۔ کہ دو ہونے کے باوجود "حرف" ایک لکھے۔ دو کا دو بھی ہو۔ ایک کا ایک بھی ہو۔۔۔ دو ہوئے بغیر قلم لکھ سکتا ہی نہیں۔ مگر دو ہونے کے باوجود۔ اس میں یہ صفت ہو کہ لکھے "حرف" ایک۔ اور اگر اس قلم کے دونوں حصوں کے بیچ میں ایک ذرا سا تنکا بھی آ جائے تو قلم کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہمارا لکھا بگڑ جائے گا۔ ہمارا ہی تھریر خراب ہو جائے گی۔۔۔ اس طرح دو ہوں۔ کہ دو ہونے کے باوجود "فصل" نہ ہونے پائے اس طرح بنتا ہے۔۔۔ "قلم"

اب آپ کا قلم بن گیا ہے۔۔۔؟

"نہیں"۔۔۔ ابھی اور محنت درکار ہے قلم بنانے میں۔ ابھی لگا:

ہے آپ نے اس میں۔ "قط"

اب قط لگایا۔ آپ نے۔۔۔ سیدھا؟ نہیں"

ذرا سا ٹیڑھا۔۔۔ (قط اگر سیدھا ہو تو لکھا ہی نہیں جاتا)

اب "قط" کا ذرا سا ٹیڑھا ہونے سے یہ فرق ہو گیا۔

۔۔۔ ہیں تو دونوں ایک ہی "قلم" کے حصے۔ مگر ذرا ٹیڑھا "قط" لکھنے سے ایک:

بڑا ہو گیا — ایک ذرا چھوٹا ہو گیا — معلوم ہوا جس لئے سب سے پہلے
 — اللہ "کما تھا — وہ "قلم"
 دو بھی تھے — ایک بھی تھا۔
 قلم لگنے سے ایک ذرا بڑا تھا — ایک ذرا چھوٹا تھا —

سامعین !

تھے ایک ہی "قلم" کے دونوں حصے — ایک کو جدا کر دو تو دوسرا نہ لکھ سکے
 دونوں "قلم" کے ساتھ ساتھ رہیں گے — ایک ذرا بڑا — ایک ذرا چھوٹا — بڑا
 لکھنے کا کام دے گا — چھوٹا بڑے کی مدد کرے گا — ایک مددگار ہو گا — دوسرا لکھے گا
 بات یہاں آکر ختم ہوتی ہے کہ کسی ایسے باپ سے پوچھو — جس کے دو بیٹے ہوں
 ایک بڑا — ایک چھوٹا — دونوں میں سے ضدی کون سا ہوتا ہے —؟

— بڑا ذرا متین، سمجھدار — اور چھوٹا ضدی — وہ باپ سے ضد کرتا ہے
 ناز کرتا ہے — چھوٹا جو ہوا — اور اس کی وجہ یہ بھی ہے — کہ اس کے ناز بردار
 دو ہوتے ہیں — ایک باپ — ایک بڑا بھائی — اس لئے اسے
 زیادہ ضد کرنے کی عادت ہو جاتی ہے —

یہاں بھی دو قلم تھے "نا" قلم" سے — ایک ذرا بڑا — ایک ذرا چھوٹا — اللہ
 نے یہ انتظام کیا — جو بڑا تھا — اسے رسالت دے دی — اب چھوٹا ضد کر گیا
 "ہمیں بھی دو"

چنانچہ اللہ نے یہ کہہ کے پہلا یا چھوٹے کو —

"بڑے کو بنا ہوں آخری نبی" — تجھے بنانا ہوں پہلا امام"

وہ آخری نبی بنے گا — تو پہلا امام بنے گا"

بس بھائیو!

بات یہاں آکر ختم ہوتی ہے۔

اللہ نے بڑے کو "عبد اللہ" کے گھر بھیج دیا — چھوٹے کو "اللہ" کے گھر بھیج دیا اور وہ بڑا جو اول مخلوق تھا — جو عبد اللہ کے گھر آیا تھا۔ اس کو اللہ نے ایک بیٹی عطا فرمائی۔

اب کائنات میں اس سے بڑا کوئی تھا ہی نہیں۔ اتنے بڑے گھر میں بیٹی پیدا ہو گئی — اللہ کو اس کی شادی کی فکر پیدا ہو گئی۔

اب تازہ محمد کی بیٹی بیاہی جائے کسی گھر میں — اور شوہر سے وہ یہ کہہ دے۔

"میں وہ ہوں جو محمد کے گھر پیدا ہوئی۔"

اب شوہر بھی ایسا تلاش کر دے جو مسکرا کے جواب دے دے۔
میرے سامنے کیا کہتی ہے — میں وہ ہوں جو اللہ کے گھر پیدا ہوا۔"

بہر فرس۔ اللہ نے بڑے کو "عبد اللہ" کے گھر پیدا کر دیا۔ اور چھوٹے کو۔

"اللہ" کے گھر پیدا کر دیا۔

اس ضمن میں تھوڑا سا ذکر جناب "سیدہ" بھی آگیا۔ ذکر خدا اور رسول بھی آگیا

امر کی بات اتنا اللہ العزیز کل آپ سے کہوں گا۔ اور کل کا وعدہ سنت رسول ہے رسول نے بھی "نیمبر" میں فرمایا تھا۔

"کل میں علم اُسے دوں گا جو کراہے گا۔" رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

مَرَجُ الْبَحْرَيْنِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

خداوند عالم کی حمد و ثنا کے بعد حضرت محمد و آل محمد پر درود و سلام

مختم سامعین !

میرے ایک حقیقی بھائی مجھے حکم فرماتے ہیں کہ آج اپنی گفتگو شروع کرنے سے پہلے مولوی صاحبان کے دستور کے مطابق چھوٹا ساعزنی کا خطبہ بھی آپکو سنا دوں۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں دو چار جملوں کا ایک خطبہ آپ کو سنانا ہوں

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا

وَالصَّلَاةَ

وَالسَّلَامَ عَلَى مَنْ أَرْسَلَهُ لِلخَلْقِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا

وَعَلَى آلِهِ الَّذِينَ أَذْهَبَ اللَّهُ عَنْهُمْ الرِّجْسَ

وَطَهَّرَهُمْ تَطْهِيرًا

حضرات گرامی !

اگر آپ مجھے حکم دیں تو میں ساری مجلس عزنی میں ہی پڑھ دوں ؟

خدا شاہد ہے میں نے آج تک اس بات کو کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں

بھی عربی جانتا ہوں۔ اس لئے خطبہ بھی کبھی نہیں پڑھا۔ خطبہ کے متعلق حکم صرف اتنا

ہے کہ بسم اللہ پڑھو اور خدا کی حمد کرو۔ مگر اس زبان میں پڑھو جس زبان میں

تمہیں تقریر کرنا ہے۔ لہذا میں اس بات کا ہمیشہ خیال رکھتا ہوں کہ سامعین کی زبان میں ہی گفتگو کی جائے۔

سامعین کرام!

آج میں آپ سے مختصر لفظوں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کلام مجید کے سورہ "رَحْمٰن" میں اللہ نے اپنی جن نعمتوں کا تذکرہ فرمایا ہے ان میں سے ہر نعمت خود اللہ کی نظروں میں اتنی بادتار اور باعزت ہے کہ ہر نعمت کے بعد خدا جیسے عالی ظرف محسن کو یہ کہنا پڑا قِبَا عِزِّي الْاَعْرَابُ تَكُنَّ تَكْذِبُونَ ط چونکہ میں سورہ حسن کی تشریح نہیں کرنا چاہتا اس کے لئے بڑی فرصت چاہیے اس لئے اختصار کے ساتھ یہی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ کی نعمتوں کی نہ ہمیں حد معلوم ہے نہ تعداد معلوم ہے جس کو ہم نہ گن سکتے ہیں اور نہ ہم اعادہ کر سکتے ہیں۔

بقول سعدی: "اگر سعدی جیسی ہوشیار نظر ہو تو ہر سانس کی آمد و شد میں دو نعمتیں موجود ہیں گو یا جو سانس باہر آئے وہ محمد جیٹا ہے۔ اور جو اندر جائے وہ مفرح ذات ہے۔ لہذا جب ایک سانس میں دو دو نعمتیں ہیں تو کس میں دم ہے کہ نعمتیں گن گن کے بتائے"

کیوں پڑھے لکھو! کیوں سمجھ دارو!

دُنیا بھر کے علوم جاننے والو! یونیورسٹی کی ڈگریاں لینے والو! بتاؤ! دُنیا میں آج تک کوئی ایسا حساب ایجاد ہوا ہے جو بے گنتی کے ہو جائے۔ ہرگز نہیں۔

گو یا حساب کی جڑ ہے گنتی۔ حساب کا اصل اصول ہے گنتی۔ لہذا جب کوئی حساب گنتی کے بغیر نہیں ہو سکتا اور خدا کی نعمت کو تو کوئی گن ہی نہیں سکتا تو پھر اس چیز کا جس کی گنتی نہیں، قیامت میں حساب کیسے ہو گا۔ ہ حساب تو ان نعمتوں کا ہو گا جن کی تعداد مقرر ہے اور جن کی تعداد کا اندازہ ہی نہیں ہے ان کا حساب کیسے ہو گا؟ بہر نوع یہ ایک جملہ معترضہ تھا جو میں نے کہہ دیا۔

بزرگانِ من!

اللہ اپنی نعمتوں کے تعارف میں فرماتا ہے۔ "مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ
میں نے جہاں اور نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ ایک یہ نعمت بھی ہے کہ" میں نے دو
بحر جاری کر دیئے۔"

دیکھو نا! اب اگر سمندر ترجمہ کرتا ہوں تو سمندر جاری نہیں ہوتا
کیونکہ سمندر میں تو بہاؤ نہیں ہے۔ وہ تو اپنے علاقے میں ایک ٹھہری ہوئی
چیز ہے۔ لگ رہا ہے بحر چھاٹیں۔ جن میں بہاؤ ہو۔ جو جاری بھی ہوتے ہوں۔
"مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ" دو بحر جاری کر دیئے۔ اور جاری کس شان سے کئے
اُن دو بحر کے جاری ہونے کا طریقہ کیا ہے! "يَلْتَقِيَانِ"

سامعین!

"يَلْتَقِيَانِ" مضارع کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دونوں
بحر جاری ہوتے ہوئے کہیں مل جاتے ہیں اور کہیں جدا ہو جاتے ہیں۔
گویا نہ ہمیشہ جدا رہتے ہیں اور نہ ہمیشہ مل کے رہتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے
کہ جب تک یہ دو بحر جدا رہتے رہے رہتے رہے۔ اور جہاں مل گئے
"يَخْرُجُ مِنْهُمُ الْمَوْءُودُ وَالْمَرْجَانُ"

"جہاں وہ دونوں بحر مل جاتے ہیں وہیں ان میں سے موتی نکل آتے ہیں"
بزرگانِ من!

اہل علم حضرات میں ان بحروں کی بہت تشریحیں کی گئی ہیں۔ بڑی بڑی اس کے
اندر روایاں دکھائی گئی ہیں۔ بڑی بڑی آبدار باتیں کی گئی ہیں۔ علم کے بے شمار
ذریعہ دیئے ہیں۔ ادھر شعراء اٹھے تو اس بحر میں قصیدے کہہ دیئے۔ شاعران
اٹھے تو انہوں نے اس بحر کو نثر کے میدان میں پھیلا دیا۔ فخر الدین رازمی اٹھے تو
بحروں کا ترجمہ کرتے ہوئے چھ صفحے لکھ کر بھی راضی نہ ہوئے اور ایاز کے علماء
نے ان بحروں کا ترجمہ فرات کر دیا۔ ہندوستان کے مولوی ثناء اللہ پانی پتی نے

گنگا اور جہنا کر دیا اور مصر میں پہنچا تو ترجمہ نیل ہو گیا اور بنگال میں پہنچا تو ترجمہ خلیج ہو گیا
غرض جہاں جہاں جیسے لوگ تھے وہ ویسے ویسے ترجمے کرتے رہے اور
کثرتِ ترجمہ اور کثرتِ تاویل سے بحرین کا خواب تعبیروں کی زیادتی سے منتشر
ہو کے رہ گیا اور پتہ بھی نہ چل سکا کہ کیا ہوا۔

محترم و معظّم سامعین !

اگر آپ تیار ہوں میری بات سُننے کے لئے تو میں بھی آپ کو بحرین کی ایک

بات سُنا دوں۔ ۹۔

دیکھو نا! بحرین کی جہاں اور تغیریں اور نا دلیلیں ہوئی ہیں وہاں معدن
النبوت مخزن الرّسالت کی زبان سے بھی کچھ ضرور نکلا ہے کہ بحر کسے کہتے ہیں۔

صادق آل محمد صلوة اللہ وسلامہ علیہ جہاں سے

علم کے سرچشمے پھوٹتے ہیں۔ جہاں سے دنیا کو علم ملا ہے جہاں سے

کائنات نے علم سیکھا ہے۔ وہ بے پڑھے لکھے جنہوں نے دنیا

کو پڑھایا۔ جنہوں نے مکتب کی شکل نہیں دیکھی اور جن کے مکتب نے

دُنیا کے مکتب فکر بلند کر دیئے۔ جن کا درس گاہ وہ مخلصان تھا کہ

علم و ادب کی دھوپ سے تپتے ہوئے انسان جہاں جا کر پناہ لیا کرتے

ہیں۔ ان سے کسی نے پوچھا: "مولا" "بحرین" سے کیا مراد ہے؟

فرمایا: "مجدد الہدایت" یہ ہدایت کے سمندر ہیں۔

سامعین !

اُمّام یہ کہہ کے خاموش ہو گئے۔ یہی اُمّام کے کلام میں لطف ہے کہ ایک تھوڑی سی

بات کہتے ہیں پھر آگے سمجھنے والے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یاد رکھو سامعین! جس چیز کا نام ہدایت ہے جس چیز کا نام ہدایت کا راستہ

دکھانا ہے۔ یہ کام اللہ نے کبھی ایک سے نہیں لیا بلکہ ہمیشہ ہادی بیک وقت دوئے ہے

گردیا ہدایت ہمیشہ ڈاکرتے ہیں۔

دیکھو نا! آنکھ ہادی ہے اس لئے دوڑیں۔ کان ہادی ہیں دوڑیں۔ ہاتھ ہادی ہیں دوڑیں۔ اور زبان! چونکہ کبھی کبھی ہدایت میں جھوٹ بول جاتی ہے اس لئے ہادی نہیں بنایا۔ بلکہ اسے قابو میں رکھنے کے لئے سامنے بتیس دانٹوں کا پہرہ لگا دیا گیا ہے اور ہونٹوں کا پھاٹک لگا کر دہن کے قفل میں بند کر دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ حالانکہ دیکھنے میں تو بڑی نازک ہے مگر بڑی شرم ہے۔ اگر کہیں گھر سے باہر نکل آئے تو فساد و لڑائی کروادیتی ہے بہر نوح اللہ نے ہدایت کا کام اس کے سپرد نہیں کیا ورنہ زبان کو لگام دینا مشکل ہو جاتا۔ اسی طرح دل و دماغ دونوں مل کے ہدایت کا کام کرتے ہیں۔

غور فرمائیں صاحبان! آدم ہادی نہ بنے جب تک شیٹ ساتھ نہ ہوئے
نوح ہادی نہ بنے جب تک سام ساتھ نہ ہوئے۔ ابراہیم ہادی نہ بنے جب تک اسماعیل ساتھ نہ ہوئے۔ موسیٰ ہادی نہ بنے جب تک ہارون ساتھ نہ ہوئے
گویا جب تک دونوں ہوں اللہ ہدایت کا کام سپرد نہیں فرماتا۔ آخر ہدایت کا پیسہ چلتے چلتے جب عیسیٰ تک پہنچا تو وہ اکیلے رہ گئے۔ اللہ نے کہا عیسیٰ! تم اکیلے ہو لہذا میں تم سے ہدایت کا کام نہیں لوں گا۔ بہتر ہے تم غائب ہو جاؤ چنانچہ عیسیٰ غائب ہو گئے۔ آخر میں محمد مصطفیٰ ہادی بنے تو علی ساتھ ہوئے۔ علی ہادی بنے تو حسن ساتھ ہیں۔ حسن ہادی بنے تو حسین ساتھ ہیں۔ یہاں تک کہ گیارواں ہادی ہے۔ بارہواں ساتھ ہے اور جب بارہواں اکیلا رہ گیا تو وہ غائب کر دیا گیا۔

اللہ نے کہا "تم اکیلے ہو اور اکیلے سے ہم ہدایت کا کام نہیں لیا کرتے لہذا تم غائب ہو جاؤ۔"

سامعین! ادھر بارہواں اکیلا رہ گیا وہ غائب کر دیا گیا ادھر عیسیٰ اکیلا رہ گیا وہ غائب کر دیا گیا اور ہم بارہویں والے اور عیسیٰ والے دونوں اڑھے بیٹھے ہیں کہ ہمارے غائب ہیں۔

اب عیسیٰ والے فخر یہ کہتے ہیں کہ ہمارا آسمان پر غائب ہے اور تمہارا زمین پر غائب ہے۔ لہذا ہمارا تمہارا کیا مقابلہ ہے کیونکہ ہمارے اور تمہارے غائبوں میں تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ہم کہتے ہیں۔ "بھئی! تم نے سوچا ہی نہیں۔ اللہ نے دونوں کو غائب کرتے وقت دونوں کی عزت کو عدل کی میزان میں تولتا تھا۔ ایک کا پلہ آسمان پہ پہنچ گیا اور ایک کا زمین پہ۔ چونکہ یہ تو عزت تولی جا رہی تھی لہذا وہ اکیلا وہاں غائب اور یہ اکیلا یہاں غائب۔ جب تک دونوں اکیلے رہیں گے غائب رہیں گے اور جب اللہ ان سے ہدایت کا کام لینا چاہے گا پھر ان دونوں کو ملا کر دو کر دے گا۔ کیونکہ جب تک دو نہ ہوں گے ہدایت کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ اور بات ہے کہ زمین والا جائے گا یا آسمان والا آئے گا۔ یہ بات تو وقت بتائے گا۔ بہر نوع دو ہوں گے تو ہدایت تو گی۔"

سامعین!

لطف آجائے گا جب یہ زمین والا بھی آجائے گا اور آسمان والا بھی آجائے گا۔ تمام دنیا اکٹھی ہو جائے گی۔ خاص طور پر تمام مسلمان اکٹھے ہو جائیں گے اور عرض کریں گے "فرزند رسول! نماز تو پڑھا دیں، متو لا فرما بیٹے گے" اچھا یہ بات ہے۔ پھر صفیں باندھو، چنانچہ ہم صفیں باندھیں گے۔ قطاروں میں کھڑے ہو جائیں گے اور وہ آسمان والا بھی نماز پڑھنے کے لئے زمین والے کے پیچھے کھڑا ہو جائے گا۔

حضور والا! اب اگر معترض یہ کہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ کہ امام آگے ہیں اور نبی پیچھے ہے؟ تو اس کا جواب میں نہیں دیتا۔ بلکہ آپ بن گورنمنٹ کے محکمہ مال سے پوچھلو۔ وہ یہ بتائیں گے کہ۔ مولوی صاحبان! تم کیوں خواہ مخواہ کے لئے الجھ رہے ہو۔ دیکھو نا! یہ مسئلہ تو ہمارے سمجھانے کا ہے۔ نماز چونکہ اس نے پڑھانی ہے جو زمین پہ موجود ہے اور عیسیٰ زمین

چھوڑ کے بے دخل ہو گئے تھے۔ لہذا جو آدمی بے دخل ہو گیا ہو اسے ذخیل کار کے ہوتے ہوئے زمین پر امانت کروانے کا کیا حق حاصل ہے۔

صاحبان!

اگر یہ نکتہ سچے ذہن میں آ گیا ہے کہ دو ہوں تو اللہ ہدایت کا کام لینا ہے۔ اب لفظ "بحرین" پر غور فرمائیں زیادہ دُور سے ڈھونڈنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بحرین کا مرکز منبع حضرت ابراہیم سے جاری ہوا۔ حضرت ابراہیم گویا بحرین کا نکتہ مرکزی ہیں۔ بحرین کا شجرہ میں۔ اور آپ حضرت کو یہ بات معلوم ہے کہ ابراہیم کی پیدائش ملک عراق میں ہوئی اور آپ کا بیٹا اسمعیل بھی عراق ہی میں پیدا ہوئے پھر ابراہیم نے حکم خدا لکھ میں حانہ کعبہ بنایا۔ اور جس راستے سے ابراہیم اپنے بیٹے اسمعیل اور اپنی بیوی باجرہ کو ساتھ لیکر عراق سے مکے آئے تھے۔ وہ راستہ پھر بالکل بند ہو گیا۔ پھر کوئی اور اس راستے پر نہ چل سکا۔ اس کے بعد ساڑھے تین ہزار سال بعد حسین بن علی اسی راستے پر چل کر مکے سے کربلا تک ریف لائے گویا ابراہیم نے جس راستے کی سنگ بنیاد رکھی تھی اس پر حسین چل کر آئے۔ ادھر اس واقعہ کو اقبال نے اپنے اس شعر میں نظم کیا ہے

کتنی پُر سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم

نہایت ہے اسکی حسین ابتداء ہے اسمعیل

بہر ذوق حضرت ابراہیم منبع البحرین ہیں۔ ایک بحر بنی اسرائیل کہلاتی اور ایک بحر بنی اسمعیل کہلاتی۔ ایک اسحق کی اولاد۔ ایک اسمعیل کی اولاد۔ منبع ابراہیمی سے یہ دو بحریں دنیا میں جاری ہوئیں۔ بحر اسحق مصر و شام وغیرہ کی وادیں کو سیراب کرتا رہا اور بحر اسمعیل عرب کے ریگستان کو سیراب کرتا رہا۔ بحر اسحق جو مصر و شام کو سیراب کرتا تھا کہیں اس کی شاخیں بنیں کہیں اکٹھا ہوا۔ یہاں تک کہ اس کی دو شاخیں ہو گئیں۔ ایک موسیٰ کی شاخ ایک شعیب کی شاخ۔ پھر اللہ نے موسیٰ اور شعیب کو ملا کر "یلتقیان"

کر دیا۔ اور ملایا کس شان سے کہ ایک کے گھر لڑکی پیدا کر دی اور ایک کے گھر لڑکا پیدا کر دیا۔

سامعین !

اللہ جب دو کو ملاتا ہے یا یَلْتَقِيَانِ کرتا ہے تو یہ سنت الہی ہے کہ ان دونوں میں سے ایک کے گھر لڑکی پیدا کرتا ہے اور ایک کے گھر لڑکی شادی کر دیتا ہے۔ اور جس شاخ کو روکنا ہو وہاں لڑکی پیدا ہوتی ہے اور جس شاخ کو آگے چلانا ہو وہاں شادی ہو جاتی ہے۔ گویا قدرت کا یہ قانون ہے چنانچہ اللہ نے شاخ شعیب کو روکنا تھا وہاں لڑکی پیدا کر دی اور موسیٰ کی شاخ کو چلانا تھا وہاں شادی کر دی۔ یہ "یَلْتَقِيَانِ" ہو گیا۔

حضور والا! یہ "یَلْتَقِيَانِ" پھر چلتا رہا۔ آگے جا کے پھر جُدا ہو گیا پھر ملا دیا۔ پھر جدا ہو گیا۔ اسی طرح اسحقؑ کی نسل میں چلتا رہا۔ اسمعیل کا سلسلہ اپنی جگہ چلتا رہا اور اسحقؑ کا سلسلہ اپنی جگہ چلتا رہا۔ آخر میں جُدا ہو گیا۔ نسل اسمعیل کی ایک شاخ عبد اللہ کی طرف پہنچی اور ایک شاخ ابی طالب کی طرف پہنچی۔ ابوطالب کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ عبد اللہ کے گھر جو لڑکا پیدا کیا اسے بحر نبوت بنایا اور ایسی بحر بنایا نبوت کی کہ آگے نبوت ختم ہو گئی۔

بزرگان من!

بات سے بات نکلتی ہے۔ اور دائرہ گفتگو بڑھتا جاتا ہے۔ دیکھو نا! اب ایک آم کا درخت ایک شخص کو پسند آ گیا۔ "واہ۔ واہ۔ واہ۔ یہ آم بڑا اچھا ہے۔ پتلا رس ہے۔ صوف بالکل نہیں۔ انتہائی میٹھا ہے۔ سواد آ گیا۔ جی چاہتا ہے آم کبھی ختم نہ ہو" چنانچہ آم کھایا اور گھٹلی زمین میں ڈال دی۔ کچھ عرصہ بعد نیا آم ہو گیا۔ پھر کھایا۔ اور گھٹلی زمین میں ڈال دی اور نیا آم ہو گیا۔ یہاں تک کہ چلتے چلتے ایک وقت ایسا آ جاتا ہے کہ آم کے درخت سے آم آنے بند ہو جاتے ہیں گویا آم بوڑھا ہو گیا۔ بڑا فسوس ہوا۔ درخت بہتر بن تھا۔ میٹھے

آم تھے۔ اب گٹھلی کہاں سے آئے گی۔۔۔۔۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ آم کا وجود اب بھی ہم باقی رکھ سکتے ہیں۔ کیسے؟ کہ اب اس کی گٹھلی کا انتظار نہ کرو بلکہ جو آم "بلا فصل" ہو گیا ہے اسے باقی رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی جنس کا ایک پودا گلے میں اپنے گھر اگاؤ اور جب تمہارے گھر میں آکا ہو آم کا پودا ذرا سا بڑا ہو جائے تو اسے ختم ہونے والے درخت کے نیچے رکھ دو۔ اس کی آب دہوا میں پل کے جب ذرات تازہ ہو جائے تو اسکی ایک شاخ اس کے ساتھ قلم بند کر دو جب قلم بند ہو کے یک جان ہو جائیں۔ تو شاخ درخت سے اتار دینا۔ اب یہ پودا اس شاخ کو لے کر اپنے گھر آ جائے گا۔ لیجئے نیا درخت تیار ہو جائیگا۔

سامعین!

ختم ہونے والے آم کو باقی رکھنے کا یہی طریقہ ہے۔ بس "بحورین" میں بھی اللہ نے ایسا ہی کیا۔ ایک پیدا کر دیا عبد اللہ کے گھر اور ایک پیدا کر دیا ابو طالب کے گھر۔ عبد اللہ کے گھر پیدا کیا محمد کو۔ جو شجرہ نبوت کا آم تھا۔ یہاں آکر سوالا کھ فصلیں دے کر ختم ہو گیا۔

اب اللہ اس درخت کو باقی رکھنا چاہتا ہے۔ اور باقی رکھنے کا طریقہ وہی رکھا جس جنس کا شجرہ نبوت تھا اسی جنس کا ایک پودا اللہ نے اپنے گھر لگایا۔ مگر پودا ذرا زوردار تھا اگتے وقت گلے میں ذرا شکاف آ گیا۔ ہر نوع اللہ نے یہ پودا اپنے گھر اگایا۔ جب پودا ذرا ترقی کر گیا تو ختم ہونے والے شجرہ نبوت کے نیچے رکھ دیا اور اس کی ایک ہری بھری شاخ اس پودے سے قلم بند کر دی۔ قلم بند ہونے کے بعد وہ پودا اپنے گھر آ گیا۔ اس طرح ختم ہونے والا ہمیشہ کے لئے قائم ہو گیا۔ گویا یوں "یَلْتَقِیان" ہوا۔

بزرگوار محترم!

حضور سیدہ طاہرہ سلام اللہ علیہا ہی ختم ہونے والے شجرہ نبوت کی

وہ ہری بھری شاخ ہے کہ اس کی جنس سے قلم بند ہو کر نبوت کے شجرہ کو قیامت تک قائم رکھا۔ اور علیؑ اسی جنس کا پودا ہے گیادونوں کی ایک ہی جنس ہیں۔ اسی بات کو دیکھ کر رسولؐ کہا کرتے تھے، "اگر علیؑ نہ ہوتے تو میری بیٹیؑ کی شادی نہ ہوتی"۔ گویا ہم جنس پودا نہ ہو تو قلم بند ہی نہیں ہوتی اور اگر ہم جنس ہو تو قلم بند ہی ہوتی ہے۔ بہر نوع سیدہ۔ علیؑ کے گھر آگیش۔ نبی شجر تیار ہو گیا۔ اب اس نئے شجر نے نئے انداز سے ہدایت شروع کر دی۔ بحرین کا اجتماع ٹھا ادر اس نئے انداز سے ہدایت ہو رہی تھی۔ مردوں کی ہدایت باہر ہوتی رہی اور عورتوں کی ہدایت اندر ہوتی رہی۔ باہر کی ہدایت سے سلمانؓ و قنبرؓ تیار ہوئے اور اندر کی ہدایت سے فضہؓ تیار ہوتی رہیں۔ ادھر سلمانؓ اتنے تیار ہوئے کہ رسولؐ نے من اهل البيت کہا۔ ادھر قنبرؓ اتنے تیار ہوئے کہ اسے کہا کہ یہ اصدق الناس ہے۔ اور قنبرؓ ایسا تیار ہوا کہ علیؑ نے پیار میں بیٹا کہہ دیا۔ مگر فضہؓ کی تیاری عجیب شان کی تھی۔ گویا بحرین کے منہ سے موتی نکل رہے تھے۔ فضہؓ اس طرح تیار ہوئیں کہ ایک دن رسولؐ پوچھ بیٹھے، "فضہؓ! کہو کیسا حال ہے؟" فضہؓ نے عرض کی، "قبلہ! کیا حال بناؤں۔ میرا حال تو یہ ہے کہ مجھ سے بہتر حال کسی کا نہیں ہے" رسولؐ نے پوچھا۔ "فضہؓ! کیا بہتری دیکھی تو نے؟" عرض کی، "قبلہ! اس سے بہتر بھی کوئی بات ہو سکتی ہے کہ فاطمہؓ مجھے "ہن" کہتی ہیں۔ اور میری خوشی میرے دل سے پوچھو جب میں صبح کو سوتی اٹھتی ہوں تو حسینؓ "امام" کہہ کے سلام کرتے ہیں۔ زینبؓ مجھے ماں کہہ کے سلام کرتی ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کیا عزت چاہیے"

معزز سامعین!

جناب سیدہ طاہرا سلام اللہ علیہا جن کا نام لینے سے پہلے کانوں کی بھی

”خداوہ! میں تجھ سے دنیا کی سب سے بڑی نعمت مانگتا ہوں

کہ تو مجھے بیٹی عطا فرما“

اللہ نے پوچھ لیا ”موسٰی! بیٹی کیوں مانگتا ہے؟“

فرمایا: ”خداوند! اگر میرے پاس بیٹی ہوگی تو میرے جنازے کی رونق ہو

جائے گی۔“

خداوند! بیٹیا بے شک صحن کی رونق سے مگر بیٹی جنازے کی رونق ہے۔

بیٹی کے رونے سے باپ کا جنازہ سچ جاتا ہے۔“

بہ نوع سیدہ خاتون نے اپنے عمل سے دنیا کو بتا دیا کہ باپ کی خدمت یوں

کرو۔ پھر اس سیدہ نے دنیا کو سمجھا دیا کہ شوہر کی اطاعت یوں کرو۔

بھائیو!

آپ کو وہ واقعہ یاد ہوگا کہ جب سیدہ کے نایاب خیر شوہر نے خیر فتح کیا ہے

اس دن خیر میں دو ہزار سال کا یہود یوں کا مال کٹھا تھا۔ گویا خیر دنیا کی مال دار

قوم کا مال مرکز تھا۔ جب تلحہ خیر علیؑ کے ہاتھ سے فتح ہوا تو مسلمانوں نے

اس مال غنیمت کو لوٹا۔ مال غنیمت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا میں کہ علاوہ

پارچہ ست کے، علاوہ جانوروں کے، علاوہ زیورات کے، خالص سونا جو ڈلیوں

کی شکل میں تھا۔ ہر مسلمان کے حصہ میں جو بیس جو بیس سیر آیا۔ جو مسلمان اپنی

عبادتوں کے ساتھ باندھ کر لوٹے۔ اور لاکھ کے وہ گٹھڑیاں اپنے صحن میں ڈال

دیں۔ قرآن کی جو ڈلیوں اور۔ چوں نے اس دن فتح خیر کے دن کی عید منائی

تو دن پڑا۔ زردے پکے کیونکہ عربوں کے گھر سونا آگیا تھا۔ یہ ایک تاریخی

نعرہ ہے کہ فتح خیر کے بعد عربوں کے بچے مدینہ کی گلیوں میں سونے کی ڈلیوں

سے کھینک رہے تھے۔ اور دکاندار بے تھے۔

”نایاب خیر! خدا تیرے بچوں کی خیر کرے۔ تیرے صدقے میں آج

ہمارے گھر دن میں پلاؤ زردے پکے ہیں۔“

سَامِعِينَ!

جب مرسلان خاتون اپنے گھر کے دروازے پہ اپنے شوہر کے استقبال کے لئے کھڑی تھی اور شوہر سونے کی گھڑیاں لارہے تھے۔ تو ماتح خیر کی بیوی بھی رسم عرب کے مطابق بچوں کی انگلیاں پکڑے ہوئے دروازے پہ کھڑی تھی۔ اور بچوں سے کہہ رہی تھی: "تمہارے ابا بھی آتے ہوں گے" تھوڑی دیر بعد بچوں کو دُور سے باپ آتے نظر آئے۔ بچوں نے کہا: "اماں! وہ آبا آگئے" بی بی نے فرمایا: "ہاں" — اتنے میں رسول آگئے۔ رسول نے دروازے پہ کھڑے ہو کر کہا:

فاطمہ بیٹیا مبارک - تیرے شوہر کو اللہ نے فاتحِ جبر بنا دیا ہے۔

سیدہ باپ کے سامنے کیا کتنی بشرہا کے سر جھکا لیا۔

جب باپ آگے بڑھ گئے تو سیدہ نے فوراً اپنا سر سجدے میں رکھ دیا۔

"یا اللہ! تیرا شکر ہے، تو نے مجھے کتنا عظیم شوہر عطا فرمایا۔"

اب جو سیدہ نے سجدے سے سر اٹھایا تو سامنے سے شوہر آتے ہوئے نظر آئے

بچوں نے بڑھ کر باپ کا استقبال کیا۔ سیدہ نے سلام کیا۔ علی مسکرا رہے ہیں۔

گھر میں اندر تشریف لائے۔ علی کے پیروں پہ پڑی ہوئی مٹی سیدہ نے اپنی چادر

سے - ناف کی - اب سیدہ نے دیکھا کہ علی خالی ہاتھ ہیں۔ خیال کیا کہ پیچھے چروغہ

پہ لدا تو اسامان آ رہا ہوگا۔ خاموش رہیں۔ بچے بھی کھڑے علی کا منہ تک رسے

تھے۔ آخر تھوڑی دیر بعد سیدہ نے بڑے ہی متانت سے پوچھا۔

حسین کے ابا! بچے یہ پوچھتے ہیں کہ خیر کے مالِ غنیمت سے آپ کو

کیا ملا۔؟

بس بھائیو! سیدہ کا یہ پوچھنا تھا کہ فاتحِ خیر تھر تھر کانپنے لگا۔

اب بتاؤ! علی کی وہ تصویر زیادہ خوبصورت تھی جب خیر فتح کیا تھا۔

اپنی تصویر زیادہ حسین ہے جو تھر تھر کانپ رہا ہے۔ سر جھکا ہوا ہے۔ رنگ زرد ہو

گیا ہے اور کہہ رہا ہے۔

”محمد کی بیٹی! اپنے باپ کے صدقہ میں مجھے معاف کر۔ حصہ تو مجھے سب سے دو گنا ملا تھا مگر تیرے باپ کی سلامتی کی خاطر راہِ خدا میں سب بانٹ کے خالی ہاتھ گھر آ گیا ہوں۔“

گویا جس دن عرب کے بر گھر میں پلاؤ پکے تھے۔ فاتحِ خیبر کے بچے اس رات بھی نائف سے سوئے تھے اور سیدہ نے وہ ساری رات عبادت میں بسر کی تھی اور ہزاروں مرتبہ اللہ کا شکر ادا کیا۔

”خدا وندا! تیرا شکر ہے تو نے مجھے کتنا عظیم و کریم شوہر عطا فرمایا! بہر ذرا سیدہ نے اپنے عمل سے دنیا کو بتا دیا کہ شوہر کی اطاعت یوں کرنا اور رہ گئی بچوں کی تربیت تو جناب سیدہ کی گود میں پلے ہوئے بچے عالم کے مصلحِ عظیم بن گئے۔ دنیا کے رہبرِ اعظم بن گئے۔“

سَامِعِیْنَ !

ہماری مائیں تو بچوں کو یہ کہہ کر سُنتی ہیں۔

”میرا بچہ بڑا ہو کر افسر بنے گا۔ حاکم بنے گا۔ مگر سیدہ یہ کہہ کر سُلا یا کرتی تھیں ”میرا بچہ اللہ کی راہ میں قربانی دے گا۔ میرا بچہ خدا کی راہ میں سر دے گا۔ گویا سیدہ نے بچوں کو اس شان سے پالا تھا۔ سیدہ کا احسان تمام دنیا پر ہے کہ اس نے باپ کی خدمت بھی سکھا دی، شوہر کی اطاعت بھی سکھا دی۔ اور بچوں کی تربیت بھی سکھا دی۔“

مگر ایک شے ایسی رہ گئی جو ہمیں سیدہ نہ سکھا سکی۔ باپ کی خدمت سکھا دی، شوہر کی اطاعت سکھا دی اور بچوں کی تربیت سکھا دی مگر ایک ایسی شے ہے جو سیدہ ہمیں نہ سکھا سکی اور وہ ہے ”بھائی سے محبت“ اور وہ اس لئے کہ سیدہ کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ چنانچہ سیدہ نے عرض کی۔

”خدا وندا! میں دنیا کو کیسے بتاؤں کہ بھائی سے محبت کس طرح کر دے؟“

اللہ نے کہا "فاطمہ! فکرنہ کر۔ میں تجھے بیٹی عطا کرتا ہوں۔ وہ دنیا کو بتا دے گی کہ بھائی سے محبت کس طرح کی جاتی ہے۔"

چنانچہ سیدہ کے گھر بیٹی پیدا ہوئی اور حسب دستور زمانہ ماں کو بیٹے سے زیادہ پیار ہوتا ہے اور باپ کو بیٹی سے زیادہ پیار ہوتا ہے چنانچہ جب بیٹی پیدا ہوئی تو علیؑ اپنی گود میں اٹھائے رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کی:

"قبلا! خدا نے یہ رحمت مجھے عطا فرمائی ہے۔"

رسولؐ نے بیٹی کا چہرہ دیکھا۔ پھر علیؑ کا چہرہ دیکھا اور دونوں چہرے ملا کے کہا۔

"یا علیؑ! یہ بچی "زین اب" ہے۔"

"اپنے باپ کی زینت ہے۔"

گویا زینب اپنے باپ کے اتنی مشابہ تھی کہ رسولؐ کی بات سن کر علیؑ نے سزا اٹھایا۔ دیکھا کہ رسولؐ کی آنکھوں میں موٹے موٹے دو آنسو تھے۔

علیؑ نے پوچھا "قبلا! رو کیوں رہے ہو؟"

رسولؐ نے فرمایا "یا علیؑ! کوئی بات نہیں۔" ذرا یہ بچی میری گود

میں دو۔"

رسولؐ نے بچی گود میں لے لی اور علیؑ کھڑے دیکھ رہے ہیں کہ رسولؐ نوراً سیدہ بچی کے کبھی بال چومتے ہیں۔ کبھی کلاشیاں چومتے ہیں۔ کبھی بازو چومتے ہیں۔ کبھی سینے سے لگاتے ہیں۔ ہر نوع اس نشان سے شہزادی کی پرورش ہو رہی تھی۔ علیؑ سینے پہ سلاتے تھے۔ جب علیؑ گھر میں آتے تو زینب ڈوڑکے باپ کے گلے سے لپٹ جاتی اور کہتی "آبا جان"۔ علیؑ کو اتنا فخر محسوس ہوتا تھا۔ وہ ابوالحسن کہلانے میں اتنا فخر نہیں کرتے تھے۔ ابوالحسن کہلانے میں اتنا فخر نہیں کرتے تھے۔ جتنا "ابو زینب" کہلانے میں خوش ہوتے تھے۔

اول وقت فجر کے بعد زینب کو اٹھانے اور فرمانے "بیٹی اٹھ کے بیٹھو۔"

بچی پوچھتی، "آبا حضور! کیا حکم ہے؟"
 مولانا فرماتے "بیٹا! گھر کے صحن میں ذرا ٹہلسو تاکہ تمہیں چلنے کی
 عادت پڑ جائے؛
 میرے لعل! بیچین سے پیدل چلنے کی عادت ڈالو شاید کبھی کہیں
 چلنا پڑ جائے؛"

گویا اس شان سے جناب زینبؓ کی تربیت ہو رہی تھی۔ جب نبیؐ جو ان
 ہوئی تو مولانا عبداللہ ابن جعفر طیار سے شادی کر دی۔ عقد میں یہ شرط لگائی کہ
 "عبداللہ! تم میرے اپنے بیٹے ہو۔ سکا بھتیجا بیٹا ہوتا ہے۔ تم میرے
 اپنے بیٹے ہو۔ میں زینبؓ جیسی محترم بیٹی تمہارے عقد میں دے رہا
 ہوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ اگر زینبؓ کسی سفر میں جانا چاہے تو روکنا نہیں"
 عبداللہ نے عرض کی "مولانا! میری کیا مجال جو میں زینبؓ کو روکوں"
 بہر نوع جناب زینبؓ کی عبداللہ سے شادی ہو گئی۔ خدانے پہلی اولاد ایک
 بیٹی عطا فرمائی جن کا نام تھا کثوم۔ پھر خدانے دو بیٹے عطا فرمائے۔ وقت
 آہستہ آہستہ گزرنا لگیا اور شہزادے سیانے ہوتے گئے اور وہ وقت بھی آگیا جو
 شرط علیؑ نے لگائی تھی کہ زینبؓ سفر میں جائے تو روکنا نہیں، چنانچہ زینبؓ کے
 سفر کرنے کا وقت آگیا۔

میرے سامعین!

حسین کے ساتھ زینبؓ مدینہ سے روانہ ہوئیں مکہ میں قیام ہوا۔ بعد میں عبداللہ
 بھی بچوں کو ایک مکہ میں تشریف لائے۔ حج سے ایک دن پہلے حسینؑ مکہ چھوڑنے
 پر مجبور ہو گئے۔ رات کو یہی عبداللہ جو حسین کے بہنوئی تھے اور محمد حنفیہ جو
 بھائی تھے حسین کے پاس بیٹھے کہہ رہے ہیں۔
 "حسین! ہمارا جی کہہ رہا ہے کہ تم نہ جاؤ۔"

امام فرماتے ہیں "بھائیو! رات میں نے اپنے نانا کو خواب میں

دیکھا ہے۔ وہ میرے انتظار میں ہیں۔ میں نے جانا ہے۔
 سب سمجھ گئے کہ حسین اب ضرور جاہیں گے۔ چنانچہ خاموش ہو گئے۔
 ایک روائت میں ہے کہ جب موٹلانے فرمایا کہ "بھائیو! مجھے جانے دو
 تو جناب عبداللہ نے کہا، "حسینے! اگر گستاخی نہ ہوتی تو میں تیری
 پریشانی کے بال کپڑے کے بیٹھے جاتا اور تجھے ملنے نہ دیتا مگر کیا کرو حسین!
 میں مجبور ہوں۔ میں امامت کے اُن رازوں کو نہیں سمجھتا جنہیں تو سمجھ
 رہے۔ اچھا حسین! خدا حافظ۔ جاؤ۔"

دوسرے دن صبح کے وقت حسین ایک ایک کے گلے مل کے روانہ ہوئے
 بے تکے سے تین میل باہر یہ تافلہ پہنچا تو حسین کے کانوں میں ایک آواز آئی
 "حسین! ذرا ٹھہرو۔"

آپ نے گھوڑے کی باگ روک لی جو حکم دیا، "عباس بھائی! دیکھو
 یہ کون ہے؟ قمر بنی ہاشم نے مڑ کے دیکھا۔ عرض کی۔
 "موٹلا! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ آ رہے ہیں۔"

چنانچہ سب گھوڑوں سے اتر آئے۔ اتنے میں عبداللہ آ گئے۔ سخت بخار۔
 ایک ہاتھ محمد کے کندھے پر۔ ایک ہاتھ عیون کے کندھے پر۔ عبداللہ فرماتے ہیں۔
 "عیون و محمد! مجھے حسین کے پاس لے چلو۔"
 چنانچہ عبداللہ حسین کے پاس آئے اور حسین گھوڑے سے اترے اور فرمایا
 "عبداللہ! آپ نے بڑی تکلیف فرمائی۔ میں تو آپ سے مل کے آیا تھا۔ پھر
 آپ نے کیوں زحمت فرمائی؟"

"حسین! جی چاہا ایک بار اور تجھے جی بھر کے دیکھ لوں۔ حسین! تو

جبار ہے۔ اب تجھے کہاں تلاش کروں گا؟"

عبداللہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گلے ملے۔ بڑی دیر تک ملے رہے۔ اسکے

بعد عبداللہ نے اپنی بیٹیوں سے کہا۔

”عون و محمد! مجھے اُس ناتنے کے قریب لے چلو جس ناتنے پہ تمہاری

آناں سوار ہے؟“

عبداللہ پہنچے چوہ محل سے سرنگا کے کھڑے ہو گئے اور کہتے ہیں
”علیٰ کی بیٹی! جا رہی ہو؟“

زینب نے محل سے آواز دی ”یا بن العم“ اے میرے چچا کے بیٹے!
تو شوہر ہے۔ میں تیری محکومہ ہوں۔ اگر حکم دے تو اتراؤں مگر یہ سُن لے
کہ ادھر تو نے اُترنے کا حکم دیا ادھر میری رُوح نکل جائے گی۔ میں زندہ نہیں
رہوں گی؟ عبداللہ نے جواب دیا ”نہیں زینب! میں تمہیں روکنے نہیں آیا۔
ضرور جاؤ۔ بلکہ میں تو یہ کہنے آیا ہوں زینب!“

”حسین جیسی قیمتی شے تمہارے ساتھ ہے — اور پردیس کا
معاملہ ہے۔ ممکن ہے راستے میں کوئی مصیبت پڑ جائے اور حسین
کی جان بچانے کے لئے صدقہ دینا پڑے۔ چونکہ تم خالی ہاتھ جا رہی
ہو لہذا تمہارے لئے صدقے کا انتظام کر کے لایا ہوں۔“

یہ کہہ عبداللہ نے عون کا ہاتھ زینب کے ہاتھ میں دے دیا۔
”زینب! اسے اپنی طرف سے حسین پر صدقہ کر دینا۔ اس کے بعد
محمد کا ہاتھ بھی زینب کے ہاتھ میں دے دیا اور فرمایا۔

”زینب! اسے میری طرف سے حسین پر صدقہ کر دینا۔“
حضور والا! زینب نے دونوں بچوں کو سر سے پیرنگ دیکھا
ساتھ بٹھالیا۔ اگر زینب سفر میں ہے تو یہ بچے بھی ساتھ ہیں۔ زینب نے
کربلا تک اپنے بچوں کو عون و محمد کہہ کے نہیں پکارا۔ بلکہ جب پکارا یہی کہہ
کے پکارا ”میرے حسین کے صدقے کو بلاؤ“

سامعین کرام!

شب عاشور سید الشہداء عبادتِ خداوندی میں مشغول ہیں۔ فضلہ

تشریف لائی عرض کی۔ ”مولا! بہن نے بلایا ہے“
 امام اسی طرح اٹھ کے بیت الشرف میں تشریف لائے۔ صحن میں
 زینب نے استقبال کیا اور حسین نے دیکھا کہ زینب نے عون و محمد
 کو جنگی لباس پہنا رکھا ہے۔ مگر میں تلواریں باندھ رکھی ہیں۔ سر پہ
 عمامے باندھ رکھے ہیں۔ اور زینب نے جنگی لباس کے اوپر بچوں
 کو کفن پہنا رکھا ہے۔

حسین نے کہا ”بہن! فرمائیے۔ میں آگیا ہوں۔ کیا حکم ہے؟“
 حسین! بہن بھائی کی باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ مگر آج میں نے
 تجھے بحیثیت بہن کے نہیں بلایا۔ آج جعفر طیار کی بیوہ نے حیدر کرار
 کے بیٹے کو بلایا ہے۔“

حسین فرماتے ہیں ”کہو زینب! کیا بات ہے؟“
 بی بی فرماتی ہے ”حسین!

”جعفر طیار کی بیوہ حیدر کرار کے بیٹے سے جعفر کے پوتوں کی شہادت
 کی بھیک مانگ رہی ہے۔ لہذا زینب کی خوشی یہ ہے کہ کل
 سب سے پہلے ان کی لاشیں آئیں۔ چونکہ بچے ہیں اس لئے مجھے
 ڈر ہے کہ کہیں ڈرنے جا میں“

امام نے دونوں شہزادوں کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ گویا منظور کر لیا
 یوم عاشور جب ہر شہید کی لاش آتی رہی تو زینب پوچھتی ”عون و محمد

ابھی زندہ ہیں؟“

تھوڑی دیر بعد شہزادے گھر میں آئے۔ ماں کو سلام کیا۔
 ”اماں! سلام“

بی بی نے پوچھا ”بیٹا! ابھی تم زندہ ہو؟“

بچوں نے کہا: ”اماں! ہم مرنے کی اجازت لینے آئے ہیں“

زینب نے فرمایا "شاباش - جادو میرے بچو - خدا حافظ"
 زینب نے دروازے تک شہزادوں کو رخصت کیا - اور ایک فقرہ کہا -
 جس نے حسین جیسے صابر انسان کو ڈلا دیا -
 "بچو! ایسا جہاد کرنا کہ دشمن کی فوج یہ کہہ اُٹھے کہ یہ جعفر طیار کے پوتے ہیں"
 جادو تمہیں جنت مبارک ہو -

بہر نزع شہزادے میدان جنگ میں تشریف لائے - جعفر طیار کے پوتوں
 نے جہاد شروع کر دیا - دس بیس منٹ کے بعد باجے بجنے لگے - لاش آنے
 لگیں - عورتوں نے گھر میں رونا شروع کر دیا - ادھر زینب دروازے پہ کھڑی
 ہیں اور فرماتی ہیں -

جے بیو! "رو نہیں بلکہ خوشی مناؤ - کیونکہ میرے بچوں کی برات آ رہی ہے"
 یہاں ایسے مرحوم کا ایک شعر سناتا ہوں کہ زینب نے ان بی بیوں سے کہا
 ہا جے والوں کی صد اذیرینات آتی ہے
 کیسے لاشے، میرے بچوں کی برات آتی ہے

بہر نزع کھوڑی دیر بعد امام لاشے لے آئے - جیسے کے صحن میں بٹا
 دیئے - بڑے بچے کا دم نکل چکا تھا - چھوٹے میں دم باقی تھا -
 امام نے فرمایا "زینب! ایک دفعہ انہیں سینے سے لگالے"
 صاحبان:

ماں کی ماما بھی تھی اور امام کا فرمان بھی تھا - زینب نے چھوٹے شہزادے
 کو جو سینے سے لگایا تو بچے کے لب ہلے - گویا ماں سے یہ کہہ رہا تھا -
 "اماں! اب تو خوش ہے نا"

بزرگانِ من!
 گیارہ محرم کو اہلبیتِ رسول قید ہو کر کربلا سے شام کے لئے روانہ ہوئے
 ہیں اور راستے میں شہیدوں پر الوداعی ماتم کیا - جناب زینب سیدالشمہا،

کے لاشے پر پہنچی۔ اصغر کی ماں اصغر کی تہمت لاش کر رہی ہے۔ اکبر کی ماں اکبر کی لاش پر بیٹھی ہے قاسم کی ماں قاسم کی لاش پر لڑھکنا ہے۔ غرض ہر خاتون اپنے اپنے وارث کے لاشے پر الوداعی ماتم کر رہی ہے۔

اُس وقت یزید کی فوج کے سپاہیوں نے دیکھا کہ دو لاشیں ایک طرف پڑی ہیں جس پہ کوئی خاتون نہیں رو رہی۔ تو ان سپاہیوں نے امام زین العابدین سے کہا۔

”قبلہ! ہم ہیں تو دشمن مگر آخر انسان ہیں۔ ہمارا دل بھرا آیا۔ کیا ان دونوں

بچوں کا کوئی وارث نہیں ہے۔ کیا انہیں رونے والا کوئی نہیں ہے؟“

امام اٹھے۔ دونوں بھائیوں کو گود میں اٹھالیا۔ اب جو امام زین العابدین نے عون و محمد کے لاشوں کو گود میں اٹھایا تو زینب نے وہیں سے آواز دی

”بیٹا زین العابدین! یہ تم کیا کر رہے ہو؟ — کیا تمہیں

پتہ نہیں کہ صدقہ ہم پر حرام ہے۔ بیٹا! یہ میں نے تیرے باپ

پر صدقہ کر دیئے ہیں۔ لہذا انہیں ہاتھ مت لگاؤ۔“

بسے بھائیو! — آج ہم سب بوڑھے۔ جوان بچے

مل کر ان بچوں کو رو رہے ہیں۔ جن بچوں کی ماں نہ روئی۔ اور

خواتین نے! — تم بھی ایک دفعہ کہ دو

”ہائے زینب“

بی بی زینب! تیرے بچوں کو تیری کنیزیں رو رہی ہیں۔ ہماری

بچیاں روئیں گی۔ ہمارے بچے روئیں گے۔ اور ہم قیامت تک

روتی رہیں گی۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

فَرِيَّتُ رَبِّ الْكَعْبَةِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

خداوند عالم کی حمد ثنا کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود سلام

حضرات محترم!

میرے ایک دوست نے مجھ سے یہ فرمائش کی ہے کہ آج میں آپ کے سامنے احوال پر گفتگو کروں۔ جہاں تک اعمال پر عالمانہ بحث کا تعلق ہے۔ وہ آپ کسی مفتی سے پوچھیں اور چونکہ میں "مفتی نہیں ہوں بلکہ قیامتی" ہوں۔ لہذا جہاں تک مجھ سے ممکن ہو سکا مختصر لفظوں میں آپ کی خواہش کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ کی فرمائش بجالاتا ہوں۔

سامعین کرام!

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ نمازیں پڑھنا، روزے رکھنا اور داڑھی نیرہ رکھنا گویا اس قسم کی چیزوں کا نام اعمال رکھا گیا ہے۔ حالانکہ صرف نماز روزہ وغیرہ ہی اعمال نہیں ہے۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ یہ اعمال نہیں ہیں اعمال تو ہیں۔ مگر ان اعمال کا تعلق ہے دلی لگاؤ سے جسے دوسرے لفظوں میں عشق کہتے ہیں۔ لہذا جب تک "عشق" طبیعت کے اندر نہ ہو تب تک نماز ایک "کھوکھلی" شے ہے اور روزہ ایک "فاقہ" کی چیز ہے۔ اور داڑھی کا "بال" و "بال" ہے۔ جب تک اس کے ساتھ "شع" عشق" روشن نہ ہو۔ گویا عشق ہے اصل شے۔ اور دلی لگاؤ ہے اصل چیز۔ جس طرح اگر کسی شخص کو پتھر سے عشق ہو جائے تو وہ حلال مشکلات

بن جاتا ہے، ”مستجاب الدعوات“ ہو جاتا ہے۔ جو اس پتھر کی تاثیر نہیں بلکہ عشق کے اثرات ہیں۔

اور یہ عشق ایسا نشہ ہے کہ اسے دنیا کی کوئی طاقت سمجھ سکتی ہی نہیں۔ اگر دنیا بھر کے واعظ، لیکچرار اور مصنف کتابوں کی کتابیں لکھ دیں اور ساری عمر تقریر کرتے رہیں یہ سمجھانے کے لئے کہ عشق کیا چیز ہے، وہ سمجھای نہیں سکتے۔ گویا عشق کی دیوانگی جس پہ گذرتی ہے وہی جانتا ہے کہ یہ کیا شے ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور شخص سمجھ سکتا ہی نہیں کہ عشق کیا ہے۔

بزرگانِ من!

ہیں تو کہا نیاں مگر ان کے اندر بڑی باتیں پوشیدہ ہیں۔ آج سے دو ہزار سال قبل بکر مرچیت کے زمانہ کی بات ہے کہ یوپی کے شہر بنارس میں ایک پیڑت نلسی داس گزرا ہے جو ایک برہمن تھا۔ اس نے ”رامائن“ نظم کی ہے۔ یہ ایک بڑا آوارہ مزاج لڑکا تھا۔ آوارگی کے عالم میں کسی مکان کی چھت پر چڑھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے کند ڈال کر مکان پر چڑھنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے اس کے ہاتھ سے کند چھوٹ گئی اور وہ بے خبری کے عالم میں ہی ایک کالے سانپ کو پکڑ کر چڑھنے لگا۔ نہ تو سانپ ہی گرا اور نہ ہی اسے محسوس ہوا کہ یہ سانپ ہے۔ آخر جب وہ چھت تک پہنچ گیا تو تب اسے معلوم ہوا کہ کند کی بجائے اس کے ہاتھ میں سانپ ہے۔

نلسی داس خود اس بات کا راوی ہے کہ جب میں نے سانپ دیکھا بس اسی وقت سے میرے ذہن میں خیال آیا۔ کہ اگر دیوی لگاؤ کسی سے ہو جائے تو کیا مجال کہ سانپ کوئی نقصان پہنچا دے۔ گویا دنیا کا فانی اور ناچیز عشق موزی کا منہ بند کر سکتا ہے۔ ستانے والے کو زد کر سکتا ہے، جانوروں کی فطرت بدل سکتا ہے اور ڈنک مارنے والے

زہریلے کو ساقھی بنا سکتا ہے۔ ”اگر میں بھی کسی حقیقت سے عشتن کروں تو اللہ جانے کیا ہو گا“ بس وہیں سے یہ تلمسی داس تاریخ کی ایک مشہور و معروف شخصیت بن گیا جس کے فلسفہ عشتن نے اسے مشہور کر دیا جو اسے کسی ذات سے ہو گیا تھا۔

بہر نوع اصل شے جو ہے جسے عمل، قول، عفت کی روح کہتے ہیں وہ ہے دلمے لگاؤ۔ بے دلی سے کہی ہوئی بات کا وزن اور ہے اور دل سے نکلی ہوئی بات کی طاقت اور ہے۔ گویا جو زبان سے نکلتی ہے وہ صرف کان تک پہنچتی ہے اور جو دل سے نکلتی ہے۔ وہ دل تک پہنچتی ہے۔ مثلاً نماز پڑھنا ایک فعل ہے سر جھکایا اور خاک پر رکھ دیا۔ اگر اس نماز میں عشتن ہے تو ہماری نماز کے ایک سجدے کا بار زمین اٹھانے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ عشتن کا سجدہ ہو تو زلزلے آجاتے ہیں، آندھیاں آجاتی ہیں اور اگر بے دلی کی باتیں ہوں تو چاہے صبح سے شام تک سجدہ کرتے رہیں۔ ”کنفک الغراب“ جس طرح کو آ زمین پہ پھونگیں مارتا ہے، اس طرح کے سجدے تو دنیا بہت کرتی پھرتی ہے۔ اصل عمل وہ ہے جو دل سے ہوتا ہے۔

سامعین !

اسلامی نقطہ نظر سے عمل ”جس چیز کا نام ہے وہ ہے عبادت خدا“ عبادت نہ کسی رسول کی ہو سکتی ہے، نہ کسی امام کی اور نہ ہی کسی اور کی عبادت ہوتی ہے صرف اللہ کی۔ اللہ کے علاوہ اور کوئی معبود ہو سکتا ہی نہیں۔

سامعین ! ————— ”معبود ہے صرف اللہ۔ عبادت ہے

صرف اللہ کی ————— گویا عبادت کا لفظ جہاں کہیں

بھی آئے اس سے مقصود ہو گا ”اللہ“۔

اب دنیا کے کسی مولوی سے مت پوچھو کہ عبادت کس کی

ہوتی ہے ————— معبود کون ہے ؟

بس بھائیو ! ————— یہ بات اگر ہے اور یقیناً ہے کہ عبادت ہے

صرف اللہ کی _____ تو آج ہم حضرت ابو بکر صدیق کو کہاں سے تلاش کر کے لائیں اور ان سے پوچھیں:-

اے صحابی رسول! _____ جب عبادت کا لفظ مخصوص ہے صرف اللہ کے لئے۔ تو آپ نے دنیا کو کیا فرمایا کہ
 ”میں نے اپنے کانوں سے رسول اللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے“
 کہ ”علیؑ کے چہرے کا دیکھنا عبادت ہے“

سامعین!

رسول ”نواب“ کہہ دیتے تو بڑی خوشی کی بات تھی مگر رسول نے لفظ ”عبادت“ کہا ہے۔ اور لفظ ”عبادت“ مخصوص ہے صرف اللہ کے لئے۔
 ابے بتاؤ! _____ اگر نصیری بگڑ جائیں تو آپ کو بگڑیں گے یا نہیں؟
 کہ آپ نے کیا کہہ دیا کہ علیؑ کے چہرے کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔

بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ چونکہ ساری عمر ہوگی عمل والوں سے ہم بے عملوں کو یہ محنتے سنتے کہ ہم عبادت نہیں کرتے بلکہ علیؑ علیؑ کرتے ہیں اس لئے ہم جہنم میں جائیں گے۔

سامعین!

جب لوگ یہ کہتے ہیں کہ علیؑ علیؑ کرنے والے جہنم میں جائیں گے تو نہ جانے یہ علیؑ علیؑ کرنے والے بُرا کیوں منا جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کا بُرا منانا اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں علیؑ سے عشق نہیں ہے۔ ورنہ خدا شاہد ہے کہ اگر علیؑ سے انہیں عشق ہوتا تو یہ علیؑ علیؑ کرنے والے جہنم میں جانے پر کبھی بُرا نہ مناتے۔

میں کہتا ہوں:- اگر علیؑ علیؑ کرنے سے جہنم ملتا ہے تو ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے۔ خُدا احمے قسم! اگر یا علیؑ کہنے سے جہنم ملتا ہے تو کر دوڑا جنتیں قربان کرتا ہوں۔ مجھے جہنم ہی منظور ہے۔ گو یا یا علیؑ کہنے سے جو کچھ ملتا ہے ہمیں منظور ہے۔ میرا ایمان ہے کہ جب

جہنم میں یا علیؑ کہہ کر چھلانگ لگائی جائے گی تو وہ جہنم فداً
گنوار ہو جائے گا۔ کیا مجال جہنم کی جو علیؑ کا نام شکر شہانہ جائے

بہر نوع میرا عرض کرنے سے مطلب یہ ہے کہ عبادت سے صرف اللہ
کے لئے اگر نمازی کے دل میں یہ آجائے کہ لوگ مجھے نماز پڑھتے دیکھ کر یہ کہیں
یہ بڑا نیک آدمی ہے تو گو یا نماز نماز نہ رہی بلکہ وہ گناہ ہو گیا ہے۔ معلوم ہوا نماز
سچی دقت تک عبادت ہے۔ جب تک صرف اللہ کے لئے ہو اور اللہ نے
رمایا ہے کہ خبردار میری عبادت میں کسی کو شریک نہ کرنا کیونکہ میں وحدہ لا شریک
ہوں۔

سَامِعِينَ! — وَحَدَا لَا شَرِيكَ" کے معنی یہ ہیں کہ معبود ہونے
میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ در نہ موجود ہونے میں ہم سب اس کے شریک ہیں
وہ موجود ہے اور ہم موجود ہوتے ہیں اور جب تک ہم زندہ ہیں۔
ہم اس کے حقی ہونے میں بھی شریک ہیں اور جتنی جتنی کسی میں قدرت ہے
ہم قادر ہونے میں بھی اس کے شریک ہیں اور جتنا جتنا کسی میں علم ہے۔
ہم عالم ہونے میں بھی اس کے شریک ہیں — صرف معبودیت ایسی
چیز ہے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ ہی "وَحَدَا لَا شَرِيكَ" ہے۔
لہذا "وَحَدَا لَا شَرِيكَ" کے معنی یہ ہیں کہ معبود ہونے اور مالک
ہونے میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ یہ دو ایسی چیزیں ہیں جو شرک سے متبرا
ہیں۔ اب اگر نماز ہے خدا کی عبادت تو اس میں کسی کا شریک ہو جانا گویا
شرک ہو جائے گا۔

دیکھو نا! — اب میں آپ کو نماز کا داعظ کر تا ہوں اگر آپ مجھ پر
بیشرط عائد کر دیں۔ کہ نماز میں سوائے خدا کے کوئی نہ آنے پائے ورنہ شرک
ہو جائے گا۔

تَوْسُو حَضَوَاتے! میں عرض کر تا ہوں کہ نمازیوں پڑھا کرو سب سے پہلے

نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہی کہا کرو۔ "اللہ اکبر"

مگر یاد رکھو! — اس کے معنی یہ نہ کرنا کہ "اللہ سب سے بڑا ہے"۔
 درنہ اس کے معنی یہ ہو جائیں گے کہ ایک طرف ہم نے سب کو رکھا اور ایک طرف
 اللہ کو رکھا۔ پھر ہم نے میزان میں مقابلہ کیا تو سب چھوٹے نکلے اور اللہ سب کے
 کے مقابلہ میں بڑا ہوا۔ اور جو مقابل میں آکر بڑا ہو وہ اللہ نہیں ہوتا۔ لہذا
 "اللہ اکبر" کے معنی یہ نہیں ہیں کہ "وہ سب سے بڑا ہے" حالانکہ ہر اردو دان یہی ترجمہ
 کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں اردو آتی ہی نہیں۔

اب آپ پوچھیں گے زیدی صاحب! پھر آپ ہی بتائیں کہ "اللہ اکبر"
 کا ترجمہ کیا ہے؟

نہیں کہتا ہوں۔ دیکھو! "اللہ اکبر" کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ کے سامنے ہم
 کھڑے ہوئے اور اس سے کہا تو اکیلا رحمن والرحیم ہے۔ ساری حمد تیرے ہی لئے
 ہے تو سارے عالمین کا رب ہے۔ تو یوم الدین کا مالک ہے۔ تو ہمیں صراط مستقیم
 پر قائم رکھنا اور صراط ان کی ہوجن پر تیرا انعام ہوگا۔

سامعین!

ہم تو صرف اللہ کی نماز پڑھ رہے تھے۔ مگر یہ انعمت علیہم کا خیال کہاں
 سے کہاں تک پہنچ گیا۔ کون ہیں وہ لوگ جن پر اللہ کا انعام ہو گیا۔
 پھر سوچا۔ ان کا نام آنے سے یہ شریک نماز ہو گئے۔ کیوں نا ان کا نام ہی
 بیچ سے نکال دوں۔ آخر اللہ سے پوچھا۔

"خدا دندا! یہ فقرہ نماز سے نکال دوں؟"

اللہ غصہ سے جواب دیتا ہے۔

"خبردار!"

آخر چپ ہو گیا۔ کہ کوئی تو انعمت علیہم ہو گا۔

بہر نوع میں نے الحمد پڑھ لی پھر کہا سبحان ربی الاعظیم و بجد

اس کے سجدہ میں سر رکھ کر.. سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَىٰ کہا — دوسری رکعت کے دو سجدے ادا کرنے کے بعد آرام سے بیٹھ گیا۔ اور کہا:

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ
خدا نے ہم سے گفتگو کی اور خوش ہوا۔

” بندے! تو نے میری حمد کی۔ مجھے عظیم داعی بھی کہا۔ اب وحدہ لا شریک بھی کہہ رہا ہے۔ مگر یہ بتا کہ تو نے یہ ساری باتیں کہاں سے سیکھی ہیں؟“

میں نے عرض کی ”خدا وندا — مجھے تو خاک بھی پتہ نہیں تھا۔ یہ باتیں تو تیرے ایک بندے نے مجھے بتائی ہیں جس کا نام محمد ہے جو تیرے عبد بھی ہے اور رسول بھی ہے“

أَشْهَدُ أَنْ مُحَمَّدًا عَبْدٌ وَرَسُولُهُ

بس بھائیو! نماز پوری ہو گئی نہیں

دیکھو سامعین! — آپ نے کیا کہہ دیا کہ درود باقی رہ گیا — کیا غضب کر رہے ہو! مولوی صاحبان ماریں گے۔ وہ تو کہتے ہیں کہ سوائے خدا کے کسی کا نام لینا بھی بدعت ہے، گناہ ہے — مگر

اللہ کہتا ہے ”نمازیو! اے جاؤ اپنی نماز۔ مجھے ایسی بے دم درود کی نماز نہیں چاہیے“

اب نماز بے چاری وہیں کھڑی ہے اور کہتی ہے۔

نمازیو! خدا کے لئے مجھے درود کا پاسپورٹ دو۔ تاکہ ملک قبول میں جا سکوں۔

آخر ہم نے نماز کو اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَاٰلِ مُحَمَّدٍ کا پاسپورٹ دیا۔ اور ہماری نماز ملک قبول میں جا پہنچی۔

حضور والا! آل محمد پر درود بھیجنے کا مطلب یہ سرگز نہیں کہ آل محمد

عبادت خدا میں شریک ہو گئے۔ عبادت تو صرف اللہ کی ہوتی ہے۔ مگر عبادت بغیر عشق کے خالی پیکر ہے۔ بے رُوح ہے۔ اس لئے اللہ چاہتا ہے کہ عبادت ہو مگر ساتھ میں عشق بھی شامل ہو۔ چنانچہ ہم اللہ سے کہتے ہیں۔

”خدا وندا! ہم تجھ سے عشق کر لیں؟“

اللہ کہتا ہے ”پاگل نہ بنو۔ تم میرے عاشق نہیں بن سکتے“

پھر ہم نے عرض کی۔

”خدا وندا۔۔۔ تجھ سے عشق ہو نہیں سکتا۔؟ اور تو کہتا ہے کہ مجھ سے عشق کرو۔ پھر تو ہی بتا تجھ سے کس طرح عشق کیا جائے؟“

اللہ نے کہا۔ ”چونکہ براہ راست مجھ سے عشق نہیں ہو سکتا۔ لہذا میں ایسا انتظام نہ کروں کہ ایسے اپنے بناؤں جنہیں عبادت میں شریک کر لوں۔ عشق ان سے ہو اور عبادت میری ہو تاکہ عبادت میں رُوح عشق آجائے اور عبادت، عبادت ہو جائے!“

سامعین!

اگر اللہ کے ان اپنوں کو بیچ سے نکال دیں تو عبادت کھو کھلی رہ جائیگی اور نماز گھر کے ادھر ادھر دیکھے گی کہ اب میں کہاں جاؤں۔

لہذا ان ”اپنوں“ کے عشق کے ساتھ پڑھی ہوئی نماز اتنی قیمتی اور روزنی ہوتی ہے کہ نمازی تین مرتبہ کہتا ہے۔ ”اللہ اکبر“ گو یا رُوح عبادت خدا عشق آل محمد ہے۔ جو نہ دولت خرچ کرنے سے آتا ہے نہ کتابیں پڑھنے سے آتا ہے اور نہ ہی مولوی بننے سے آتا ہے۔

”ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ اللَّهُ“ یہ اللہ کا فضل ہے کہ وہ جس بندے کو چاہے یہ نعمت عطا فرمادے۔

اور یاد رکھو اے عشق آل محمد کی دولت رکھنے والے مغز انسانے! — عشق آل محمد نہایت قیمتی جوہر ہے جو تجھے اللہ نے

دیا ہے۔ لہذا اسے چوروں سے بچائے رکھنا۔ چونکہ جو ہر بڑا قیمتی ہے اسلئے
ڈاکو بھی بڑے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی ڈاکو دوستی کے پردے میں تجھے
نماز روزے کی طرف لگا کے عشق آل محمد کی دولت لوٹ کر لے جائے۔
لہذا اسکی بڑی حفاظت کرنا۔ نماز بھی پڑھنا۔ کیونکہ نماز سپیکر ہے مگر روح
اس کی عشق آل محمد ہے۔

سامعین!

مولوی صاحبان کا یہ متنفقہ فیصلہ ہے (چاہے سستی ہو یا شیعہ) کہ جو
نماز قبول نہیں ہوتی وہ نمازی کے منہ پر مار دی جاتی ہے۔
اے بتاؤ! — نماز کوئی اینٹ ہے یا پتھر ہے جو
اٹھانے کے منہ پر مار دی جاتی ہے؟

اس کا مکمل جواب تو آپ خود ہی سوچیں۔ مگر میں تو ہر نماز پڑھنے
والے کا منہ تکتا رہتا ہوں۔ اگر نماز کے بعد اس کا منہ ٹھیک رہا
تو میں سمجھتا ہوں کہ نماز قبول ہو گئی اور جہاں ذرا منہ پھرا فوراً سمجھ گیا
کہ نماز منہ پر مار دی گئی ہے۔

سامعین!

دیکھو نا ————— کر بلا میں تقریباً ستوا دی یہ شور مچا رہا تھا کہ حسین کو

جلدی قتل کر دو تاکہ نماز عصر قضا نہ ہو جائے؟

گویا نماز کا یہ زور ہو رہا تھا۔ یہ ان ہی لوگوں کی سلکھائی ہوئی بات ہے۔
کبس نماز پر ہی زور دیشے جاؤ چاہے فرزند رسول قتل ہو جائے۔
بناؤ ————— یہ کوئی نماز ہے؟ مغرب کا وقت ہے خیمے جل
رہے ہیں۔ بچوں کے بیٹھنے کی جگہ نہیں اور زینب کے سر پر چادر
نہیں اور سلمان آل محمد کو قتل کر کے اور ان کے خیمے جلا کر مغرب
کی نماز ادا کر رہے ہیں۔ ایمان سے بناؤ، یہ کوئی نماز ہے؟

بہر نوع عشق آل محمد کے بغیر نماز ہو ہی نہیں سکتی۔ نماز سپیکر ہے اور عشق آل محمد اس کی رُوح ہے اور یہ عشق آل محمد نہ عقیدت سے آتا ہے نہ پڑھنے سے آتا ہے اور نہ ہی خرچ کرنے سے آتا ہے یہ وہ ذالک **فَضْلُ اللَّهِ**، اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور یہ اللہ سے لو لگانے سے آتا ہے۔ اسی چیز کے لئے اللہ کہتا ہے "أَعِدُّوْنِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ" تم مجھ سے دُعا کرو کہ یا اللہ ہمیں عشق آل محمد دے دے۔ میں اسے قبول کروں گا۔ ورنہ رزق کا خدانے خود وعدہ کیا ہے۔ لہذا رزق کے لئے دُعا کرنے کی ضرورت نہیں۔ زندگی جتنی ہے اتنی ہی ہوگی۔ اس کے لئے مانگنا مانگنا بے کار ہے جن دعاؤں کے لئے قرآن میں تاکید ہے کہ تم مجھ سے مانگو میں قبول کروں گا؛ وہ دُعا ہی یہ کرو کہ "خدا ہمیں عشق آل محمد عطا فرمائے تاکہ ہماری نماز سچی ہو جائے۔ ہمارا روزہ سچا ہو جائے۔ ہمارا ہر عمل سچا ہو جائے۔ بات سے بات پیدا ہوتی ہے حضور! یہ عشق کی بات ہے کہ نونے سالہ سعید سب کے نصیبے کا رہنے والا کر بلا میں حسین کی فوج میں موجود تھا۔ یوم عاشور ہی سعید امام سے کہتا ہے۔

”مؤلا! ظہر کا وقت ہے“

مؤلانے فرمایا ”سعید! کیا چاہتے ہو؟“

مؤلا! — میں چاہتا ہوں کہ زندگی کی یہ آخری نماز آپ کی جماعت کے ساتھ ادا کروں۔“

بتاؤ مسلمانو!

حسین کے پیچھے نماز پڑھنے کی تمنا کرنا دنیا کی بہترین تمنا ہے یا نہیں؟ اب جو سعید نے یہ کہا تو امام نے جواب میں فرمایا:

”سعید! تو نے اس وقت اللہ کی نسیبہ زیاد کی۔ اللہ تمہیں

اس کا اجر دے گا۔“

دُریائے فرات کے کنارے نمازیوں نے تیسیم کیا۔ نماز شروع ہو گئی اور سعید کے دل کی گہرائی سے جو تمنا نکلی تھی وہ پوری ہو رہی ہے۔ سعید امام کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اقامت کہی۔ اچانک تیرا نماز شروع ہو گئے۔ اب سعید نے جو دیکھا کہ تیرا امام کی طرف آ رہے ہیں تو اس نے نماز کی نیت باندھنے کے بعد نیت توڑ کے صفِ چھوڑ دی اور امام کے سامنے آ کھڑا ہوا اور بولا:

”فرزندِ رسول! آپ نماز پڑھیں۔ میں تیروں کو روکتا ہوں۔“

چنانچہ باقی آدمی امام کی جماعت میں نماز پڑھ رہے ہیں اور جس کی یہ تمنا تھی کہ آخری نماز امام کے ساتھ پڑھوں وہ غریب کھڑا ہوا تیروک رہا ہے۔ جو تیر بھی امام کی طرف آتا ہے۔ سعید اپنی بڈھی پسلیوں پر روک رہا ہے۔ اور تیر بڈھی پسلیوں میں گھس گئے۔ ادھر امام نے سلام پھیرا۔ ادھر سعید امام کی گود میں جاگرا۔ بڈھا آدمی چہرے پر موت کا پسینہ آ گیا۔ اور گرتے ہی امام سے پوچھتا ہے ”هَلْ وَفَيْتُ يَا مَن رَسُولِ اللَّهِ“

”کیوں فرزندِ رسول! آپ مجھ سے خوش ہیں۔“

کیا میری نماز ہو گئی؟

امام جواب میں فرماتے ہیں ”سَعِيدُ اَنْتَ اِمَامِحِي فِي الْجَنَّةِ“

میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ حُبِّ میں حُبِّت میں جاؤں گا تو تو میرے آگے آگے چلے گا“

سعید نے عرض کی ”مؤلا! میرے تیر نہ نکالنا میں تیرے نانا کے پاس ان تیروں کے ساتھ جانا چاہتا ہوں“

اس کے بعد سعید کہتا ہے۔

”مؤلا! کوئی میرا داہنا بازو دبا رہا ہے؟“ امام نے فرمایا

”سعید! سلام کرو۔ یہ میرے نانا رسول اللہ ہیں“

”قبلہ! کوئی میرے بائیں طرف بھی ہے؟“
 ”سعید! یہ مرے بابا حیدر گزار آئے ہیں“
 ”مولانا! کوئی میرا سرد بارہا ہے؟“
 ”سعید! یہ میرے بھائی حسن ہیں“
 آخر میں سعید پوچھتا ہے۔
 ”مولانا! کوئی میرے پاؤں کی طرف بھی ہے؟“
 امام فرماتے ہیں۔

”سعید! پاؤں سمیٹ لو۔ یہ میری اماں فاطمہ ہیں“
 اس منظر کو دیکھ کر مولانا روم اپنی مشنوی میں کہتا ہے۔
 نماز ظاہری ذکر سجدہ دست
 نماز عاشقان ترک وجود دست

یہ ظاہر میں پڑھی ہوئی نماز ذکر سجدہ اور کوع ہے اور عشق کی
 نماز وہ ہے کہ اپنے آپ کو فنا کر دیا۔

یہ ہے وہ عمل جسے عبادت کہتے ہیں اور عبادت اس وقت تک
 کھوکھی ہے جب تک اس میں ”روح عشق آل محمد“ شامل نہیں ہوگا
 اور روح عشق آل محمد بے کار ہے جب تک اس کے لئے ”عملے“ کا پیکر
 ہو۔ گویا روح کے لئے جسم اتنا ضروری ہے جتنا جسم کے لئے روح ضروری ہے

حضور والا!

اگر ہمارا پید اہونے کا مقصد عبادت ہے۔ تو اس مقصد عبادت کو
 اس ظاہری دنیا میں سب سے زیادہ کس شخص نے پورا کیا ہے؟
 حضور امام حسن فرماتے ہیں ”جہاں تک عبادت کا تعلق ہے
 میں اپنے باپ علی کے مقابلہ میں ایک ہزار کی نسبت سے ہوں۔
 گویا علی اتنا بڑا عابد ہے۔“

سَامِعِينَ!

یہ تو آپ نے سن لیا کہ مسلمانوں میں پہلی نماز جس نے پڑھی وہ علی ابن ابی طالب ہیں۔۔۔۔۔ لیجئے ایک قصہ بھی سماعت فرمائیے گا۔

ایران کا ایک تاجر بغرض تجارت مکہ میں ہر سال حج کے موقع پر اپنی دکان لگایا کرتا تھا۔ وہ رادھی کہ ایک سال جو میں گیا تو میرے دوست حضرت عباس (رسول خدا کے چچا) میری دکان پر بیٹھے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اچانک ایک شخص آیا اور ایک طرف کو منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ پھر جھک گیا۔ پھر سجدے میں گیا۔ پھر کھڑا ہو گیا اور ایک معصوم چھوٹا سا بچہ اس کے ساتھ یہ حرکت کر رہا تھا۔ میں نے عباس سے پوچھا ”یہ جوان کون ہے اور یہ بچہ کون ہے؟“ عباس نے جواب دیا ”یہ جوان میرا بھتیجا محمد ہے“

میں نے پوچھا یہ کیا کہہ رہا ہے؟“

عباس بولے ”یہ کہتا ہے کہ میں رسول ہوں اور یہ مجھ خدا اپنی نماز

پڑھ رہا ہے“

”یہ لوط کا کون ہے“

”یہ میرا دوسرا بھتیجا علی ہے“

ایرانی کہتا ہے کہ میں سوچ میں پڑ گیا کہ ایک معصوم جس کی اطاعت کر رہا ہے وہ یقیناً سچا ہوگا۔ ورنہ بچے کو کیا تھا۔ اس کے کھیلنے کے دن ہیں اسے کیا مصیبت تھی کہ یہ بھی ایسا ہی کرتا جیسا یہ جوان کر رہا ہے۔ یہ ضرور کوئی سچا ہوگا۔

حضور والا! ————— علی کی پہلی نماز آپ نے دیکھ لی۔ آئیے

اب ذرا علیؑ کی وہ نماز دیکھیں جو علیؑ نے بستر پر سو کر پڑھی۔ انیس سال کا جوان۔ رات بھر خوب سویا اور کائنات کا عظیم نمازی کہلا یا جس پر اللہ کو یہ آیت نازل کرنا پڑ گئی کہ ”آج تیرا سونا بھی میری مرضی کا مالک ہو گیا“

علیؑ ہیں اور وہی ظہر کی نماز ہے اور مسجد نبی کے دروازے پر ایک سائل کھڑا ہو کے کہتا ہے:-

”مسجد والو! اللہ کے واسطے مجھے کچھ دو“
 کسی نے کچھ نہ دیا۔ کیونکہ جو زکوٰۃ دینے والا تھا وہ سن ہی نہیں رہا تھا۔ آخر اس نے تنگ آ کے کہا:-
 ”یا اللہ! تیرے رسول کی مسجد سے خالی ہاتھ جا رہا ہوں“

سامعین!

سائل نے جب تک نمازیوں سے مانگا۔ مانگتا رہا۔ اور جب اس نے اللہ سے مانگا تو جو اللہ تک پہنچا ہوا تھا اس نے سن لی۔ چنانچہ علیؑ نے حالت بکوع میں سائل کو زکوٰۃ دے دی۔ ہم ادھر حیران کھڑے تک رہے ہیں۔

”یا علیؑ! اس دن تو اتنی محویت کہ پاؤں سے تیر نکال لیا گیا اور پتہ نہ چلا یا آج کے دن اتنی خبر ہے کہ سائل کو زکوٰۃ دے دی“

پہر حال اتنا بڑا نمازی، اتنی محویت سے نماز پڑھنے والا کہ پاؤں میں چُھبے ہوئے تیر کھج جائیں مگر پتہ نہ چلے۔ یہ ہے نماز کی آخری منزل مگر علیؑ کیا فرماتے ہیں کہ میں کہاں اور نماز کہاں؟ اللہ جانے نمازی کے ذہن میں نماز کا تصور کیا ہے۔ اتنی اچھی نماز کو کہتا ہے کہ کوئی بات نہیں۔

ادھر قرآن علیؑ کی عبادت کی تشریح فرماتا ہے کہ اسکی ایک ”ثقلین“ کی عبادت سے افضل ہے۔ اب تو علیؑ بھی بہت اگڑے ہوں گے کہ میری لگائی ہوئی ایک ”ثقلین“ کی عبادت سے بڑھ گئی ہے۔ اور جب ”ثقلین“ کا لفظ رسول نے بولا ہو گا تو سمت سمت کے ساری کائنات دائرہ ثقلین میں آگئی ہوگی۔ خدا جانے عرش اور اس کے اوپر بیٹھ کر اللہ کی عبادت کرنے والے ملک ثقلین کے دامن میں شامل ہو گئے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء ثقلین کے ایک کونے میں سب سے کھڑے ہیں۔ ابراہیمؑ اپنی خلعت لئے کھڑے ہیں۔ موسیٰؑ اپنی ہلیت

لئے کھڑے ہیں اور عیسیٰ اپنی حیاتِ جاوداں میں پسٹی ہوئی عبادت
لئے کھڑے ہیں۔ گویا ساری کائنات اپنی اپنی عبادت میں لئے ہوئے کھڑے ہیں
اور تھر تھر کانپ رہی ہے۔ اور ضربِ علیؑ ان سب پر حاوی ہو چکی ہے۔

ہم کہتے ہیں "یا علیؑ! — مبارک ہو اتنی بڑی عبادت ہے"
علیؑ مسکراتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ "خاکِ مبارک۔ کچھ بھی نہیں ہوا میں نے
کچھ بھی نہیں کیا۔"

ہم حیران ہیں کہ اللہ جانے یہ بندہ چاہتا کیا ہے۔ آخر یہ کہاں جا کے کہے گا
کہ یہ عبادت ہے؟

سامعین!

یہ تو رسولؐ کی زندگی کی باتیں تھیں۔ اب رسولؐ کے بعد علیؑ آ گیا۔ اب تو علیؑ
کو دنیا کے کاموں سے بھی فرصت مل گئی۔ کیونکہ دنیا کے دھندے اوروں
نے سنبھال رکھے ہیں۔ اب گھر ہے اور عبادت ہے۔ ۲۶ سال اسی طرح
گذرے۔ اگر چار سال کے لئے شہنشاہی آ بھی گئی تو ساری عمر کی پڑی ہوئی
عبادت کی عادت کی وجہ سے شہنشاہیت بھی عبادت میں گذر گئی یہاں تک
کہ شخصی جنگ کا وقت آ گیا۔

سامعین!

شخصی جنگ، جہادِ اسلام کا ایک جزوِ اعظم ہے۔ اسلام کا منشا
یہ ہے کہ سربراہِ حکومت فیلڈ مارشل ہو جو میدانِ جنگ میں بھی
آئے۔ یہ نہیں کہ مسجدوں میں ہی بیٹھا خوش خبریاں سناتا رہے۔
یا درکھو! — کسی فیلڈ مارشل کا صدر ہونا ہمیں
بڑائیاں بھی ہوں گی کچھ اچھائیاں بھی ہوں گی۔ سب سے پہلی اچھائی
تو یہ ہوتی ہے کہ فیلڈ مارشل بن رہتا ہے۔ وہ سکرینگ کا
عادی ہوتا ہے۔ اور پبلک کے بنائے ہوؤں کا عیب نکالتا ہے۔

اب اسے لاکھ سمجھاؤ کہ انہیں عوام نے بنایا تھا۔ وہ دوٹ سے بنے تھے۔ اب ان کی حکومت بھی گزر گئی۔ اب تم کیوں مُردے اٹھاؤ تے ہو۔۔۔۔۔ مگر فیڈ مارشل کہتا ہے ”نہیں“ چاہے وہ گزر گئے ہوں چونکہ عوام کے بنائے ہوئے تھے۔ لہذا ان کے عیب نکالو۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ اور بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جو فیڈ مارشل کرتا ہے۔ مثلاً فیڈ مارشل حکومت نے حکم دے دیا کہ ”بکریاں ختم کر دو“

اب بتاؤ۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ بکرے کی نسل کو ختم کر دو۔ آخر کیوں؟ بکرے چارہ کیا بگاڑتا ہے؟ تو فیڈ مارشل کہتا ہے کہ تمہیں پتہ نہیں کہ بکرا باغ کا دشمن ہے۔ اور باغ کے دشمن کی نسل ہی ختم کر دینی چاہیے۔

بہر نوع جب چوتھے مرتبہ یہ ہمارا فیڈ مارشلے حاکم ہوا ہے جسے علی کہتے ہیں۔ اس کے زمانے میں جو جنگیں ہوئیں ہیں جل۔ صفین اور ہزدان وغیرہ ان میں ایسا نہیں ہوا کہ فیڈ مارشل گھر میں ہی بیٹھ کر فوجیں بھجوا رہا ہو بلکہ کہتا ہے۔

”اگر جہاد عبادت ہے تو میں خود اس عبادت سے بہرہ مند

ہوں۔ گویا وہ خود میدان جنگ میں موجود رہا۔

میرے محترم سامعین!

عرب کا یہ دستور ہو گیا تھا کہ اگر کوئی عرب کا بہادر اس فوج کا معمولی سپاہی ہوتا تھا۔ جس فوج نے علیؑ کا مقابلہ کیا ہو تو اس کا خاندان فخریہ کہا کرتا تھا کہ میں اس بہادر فرد کے خاندان سے ہوں جو علیؑ کے مقابل فوج میں تھا۔ اگر علیؑ کے مقابل ہونا اتنے بڑے فخر کی بات ہے تو آپ اس فخر کو کس طرح مٹا سکتے ہیں۔

اگر ایک سید کھڑے ہو کر یہ کہہ دے کہ تمہارے مردوں کو یہ فخر ہو گا۔
 آؤ دیکھو! میں ایک تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر جہاد میں جاتا ہوں
 جہاں بھاگ آنے کی توقع قوی ہو اور بات ہے اور بادانی ڈاچی پر چڑھ
 کر جانا اور بات ہے۔

دیکھو نا۔ جنگ جمل میں تاریخِ حرب و ضرب کے لکھنے والوں کو
 علیؑ نے حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ شہنشاہِ ہند نے خود جنگ
 میں ایک سپاہی کی حیثیت سے ہے۔ علیؑ یہ کہتا ہے کہ چونکہ جہاد ثواب ہے۔
 اس لئے میں اس جہاد سے کیوں محروم رہوں۔ اور آپ حیران ہوں گے
 کہ پوری جنگ جمل میں علیؑ نے چہرے پر نقاب رکھا۔

میں کہتا ہوں۔ خدا گواہ ہے۔ علیؑ شرمائے گئے۔ اب اگلا فقرہ کیا کہوں
 بس علیؑ شرمائے گئے کہ "کون میرے مد مقابل آگیا ہے؟"

سامعین!

جنگ صفین جنگ جمل کا ہی نتیجہ تھا۔ کیونکہ جنگ صفین میں بھی کھلے لوگوں
 کو لگایا تھا کہ اگر علیؑ سے لڑنا گناہ ہوتا تو مسلمانوں کی مائے کیوں مقابلہ کیے
 آجاتی۔ لہذا علیؑ سے لڑنا حق ہے۔ بس علیؑ سے لڑنے کے لئے اسی بات پر
 مسلمان صفین میں اکٹھے ہو گئے اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ آدمی کھڑے علیؑ
 سے مقابلہ میں لڑنے کے لئے اور علیؑ لڑ رہے ہیں۔ چوبیسویں دن لڑائی
 ہوئی تیس سو اسی دن جو تھا اس دن فیصلہ کن جنگ ہو رہی تھی۔ دونوں
 اطراف کی فوجوں نے یہ سوچ لیا تھا کہ شام کو جو جنگ بند کر دی جاتی ہے
 آج مت بند کرو۔ اب جنگ بند اس وقت کریں گے جب تک اس کا مکمل
 فیصلہ نہ ہو جائے۔ گویا فیصلہ کن جنگ ہو رہی تھی۔

حضرت علیؑ کی فوج کا کمانڈر انچیف حضرت مالکؓ سے اشتراک تھے۔
 جن کے لئے علیؑ نے فرمایا ہے کہ "یہ میرے لئے دیسا ہی ہے جیسے میں محمد مصطفیٰؐ

کے لئے، گو یا اس سے بڑھ کر کوئی خطاب کسی کو مل سکتا ہی نہیں۔ ادھر حضرت مالکؓ اشتر بڑے خوش تھے کہ آج فیصلہ کن جنگ ہو گی۔ مالک کے دونوں ہاتھوں میں تلواریں تھیں اور اپنے سپاہیوں سے کہنا تھا۔
 ”سپاہیو! آگے بڑھو۔ کوثر نہارے قریب ہے۔ جنت تمہارے قریب ہے!“

بہر نوع جس وقت جنگ ختم ہوئی ہے اس وقت مالکؓ اشتر معاویہ کے خیر کی طنائیں کاٹ رہا تھا۔ صرف دو ہاتھ ابھی باقی تھے جس وقت امیر المومنین کا پیادہ پہنچا اور کہا، ”مالکؓ! مولانا بلایا ہے“
 مالکؓ نے کہا، ”تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔“

پیادے نے کہا، ”نہیں۔ مولانا کا حکم ہے کہ جنگ بند کر دو۔ مالکؓ مولانا کا حکم سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور امیر المومنین کی خدمت میں پہنچا۔ عرض کی،
 ”یا امیر المومنین! اب تو معاملہ ہی ختم ہو گیا تھا، مولانا فرمایا،
 ”ہاں مالکؓ اشتر! خدا یہی چاہتا ہے کہ معاملہ یہیں ختم ہو۔ اب ہاری
کا پورا جوش یہ ہے کہ تلواریں پھینک کے بیٹھ جاؤ۔ اب تلوار
اٹھا جرم ہو جائے گا۔“

امام کے حکم پر جنگ بند کر دی گئی اور اس ایک رات کی جنگ کو اللہ نے
 ”لیلۃ الحویو“ کہہ کر یاد فرمایا
 سامعین!

”حویو“ کہتے ہیں باریک کپڑے کو۔ اس دن علیؓ نے زندگی میں پہلی دفعہ باریک کپڑا پہنا اور نہ ساری زندگی سوائے موٹے کھدر کے کرتے کے کچھ نہیں پہنا۔ تمام موثر خین اس بات پر متفق ہیں کہ علیؓ کے لباس سے فخر کا لباس زیادہ قیمتی ہوتا تھا۔ علیؓ نے وہ باریک کرتا پہن کر جہاد شروع کیا اور اتفاق سے آپ کے پاس زرہ بھی نہ تھی کیونکہ وہ بیوی کے مہر میں دیدی گئی تھی۔

سامعین! علیؑ جب اپنی زرہ بازار میں بیچنے گئے ہیں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ علیؑ ہمر کے لئے بھی کچھ ہے۔
 فرمایا، قبلہ! ایک تلوار ہے۔ ایک نچر ہے اور ایک میری زرہ۔
 رسول نے فرمایا، "یا علی! ان میں سے خچر بھی ضروری ہے تلوار
 بھی ضروری ہے اور زرہ بیچ دو۔"

جب امیرالمومنین بازار میں زرہ بیچنے گئے تب پتہ چلا کہ زرہ کیسی تھی۔
 سامنے تھوڑا سا لوہا لگا ہوا۔ باقی کپڑا۔ حالانکہ ساری زرہ لوہے کی ہوتی ہے خریدار
 نے کہا، قبلہ! آپ نے اس زرہ کا کیا تکلف فرمایا ہے؟

مولانا فرمایا، "بھی! سامنے سے معلوم ہو کہ ہم بھی زرہ پہنے ہوئے ہیں۔
 خریدار نے عرض کی، "قبلہ! اگر کوئی بیچے سے حملہ کر دے تو پھر؟"
 فرمایا، "ابنی طالب کا بیٹا اس دن مرنا جائے جس دن دشمن کو پیچھے آنے
 کا موقع دے۔ یہ محض فوجی تعظیم کے لئے ہیں زرہ پہن لیتا ہوں ورنہ
 مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

بزرگوار! — یہ تو تھی علیؑ کی زرہ کی حالت اب ذرا علیؑ کے گھوڑے
 کا واقعہ سنئے گا۔ ایک دن کوئی عرب مسخرہ بن کے مولانا سے کہنے لگا۔
 "قبلہ! اپنے خچر کو بیچ کر کوئی اچھا سا گھوڑا خرید لو جو خوب دوڑتا ہو۔"
 مولانا فرمایا، "کسی بھاگتے کے پیچھے میں نے دوڑنا نہیں اور میدان سے
 میں نے بھاگنا نہیں۔ لہذا مجھے یہی خچر چاہیے۔ چاہے سست رفتار
 ہی ہے۔"

سامعین!

اسی لیلۃ الحدریر میں علیؑ بذات خود میدان میں تشریف لائے۔ اور اگر
 سارا قصہ سنو تو لطف آجائے کہ علیؑ نے اپنا لباس اپنے چھوٹے بیٹے عباسؑ
 کو پہنا دیا جس کا گیارہواں سال کا سن تھا۔ عباسؑ کو لباس پہنا کر میدان جنگ میں

بھیج دیا گیا علیؑ نے "لیلۃ الحویر" میں عباسؑ کو زندگی میں پہلی دفعہ میدان جنگ میں بھیجا ہے۔ "جاؤ بیٹا! لڑنے جاؤ"

چنانچہ عباسؑ میدان جنگ میں تشریف لائے اور معاویہ کی ایک لاکھ فوج یہ کہہ کر بھاگ گئی کہ "علیؑ آگئے ہیں" انہیں پتہ ہی نہ چل سکا کہ کوئی اور آیا ہے جب مالکؑ اشتر نے آکر امیر المؤمنینؑ کو رپورٹ دی ہے کہ "مولا! چھوٹے شہزادے نے تو کمال کر دیا۔ کہ تلوار پھینک دی اور دو سواروں کو اٹھاتا۔ ٹکراتا اور پھینک دیتا میں ابھی ابھی گن کے آیا ہوں عباسؑ نے تقریباً پانچ سو چھترس سے ستر لاکھ کر مار دیئے ہیں۔ لہذا میں اب شہزادے کو واپس لایا ہوں" امیر المؤمنینؑ نے فرمایا "مالک! میرے عباسؑ کو تم کیوں واپس لائے ہو؟"

عرض کی "حضور! والا! کافی دیر تک جہاد کرنے کرتے تھک گیا ہوگا۔ چنانچہ امیر المؤمنینؑ نے عباسؑ کو گود میں لیکر فرمایا۔

"بیٹا! تھک گئے؟"

عباسؑ نے عرض کی "نہیں آبا"

علیؑ نے عباسؑ کے بازو چوم لئے۔ پیشانی چومی، سینے سے لگا کر پیار کیا۔ اور فرمایا "عباسؑ بیٹا! بس۔ اب نہ لڑنا۔ دنیا نے تمہاری شجاعت کھلی

بزرگان من!

اس جنگ "لیلۃ الحویر" میں خود حضور امام حسنؑ مجتبیٰ اور حضور سید الشہداء امام حسینؑ علیہ السلام نے جہاد فرمایا۔ اور حضرت محمد حنفیہؑ نے بھی گویا علیؑ کے سادے بیٹے اس جنگ میں لڑ رہے تھے۔ اور جب پلٹ کے آئے تو دیکھا کہ امیر المؤمنینؑ باریک کرتا اپنے نماز پڑھ رہے ہیں اور نماز کا عالم یہ ہے کہ نہ کوئی جلدی ہے اور نہ ہی کوئی گھبراہٹ ہے۔ بڑے اطمینان سے نماز پڑھی ہے۔ حسنینؑ تو خاموش رہے مگر عبداللہ ابن عباسؑ نے عرض کی۔

"مولا! یہ میدان جنگ میں کیا ہو رہا ہے؟" مولا فرماتے ہیں "ہونا کیا ہے۔"

مولانا کی یہ بات سنکر مالک اشتر نے توبہ کی۔ "مولانا! میری توبہ۔ مجھے ایسی بات سوچنا بھی نہیں چاہیے تھی۔ کیونکہ تو تو سوچ بھی جانتا ہے۔ جو دل میں خیال آئے وہ بھی جانتا ہے۔"

مالک اشتر کی یہ بات سنکر علیؑ مسکرا دیئے اور فرمایا: "مالک اشتر! میں نے تجھے بتایا نہیں کہ میں بادشاہ ہوں بدنوں کا اور امام ہوں دلوں کا۔ مجھے پتہ ہے دل میں کیا ہے۔"

خالق کا یہ عظیم نمازی کوذ کی مسجد کے محراب میں کھڑا کہہ رہا تھا: "میرے اللہ! کیا کروں۔ علیؑ کو بخش دے۔ میرے اللہ! علیؑ سے تیری نماز ادا نہ ہو سکی۔ خداوند! میں حق عبادت ادا نہ کر سکا۔ بس جتنی ناقص ادا ہوئی اسے قبول کر لے" دنیا حیران تھی کہ اللہ چاہتا کیا ہے۔ آخر کس نماز پہ جاکے یہ شخص کہے گا کہ ہاں اب نماز ہو گئی۔

سامعین کو رام!

وقت گذر گیا۔ آخر سن چالیس ہجری کا رمضان آ گیا جس میں امیر المومنین کی شہادت ہوئی۔ رمضان کا مہینہ خدا کی نعمتوں کا مہینہ ہے جس میں تقریباً ہر جاہل آدمی بھی نسبتاً زیادہ عبادت کرنے لگتا ہے اور علیؑ نے تو اللہ جانے رمضان میں طرح گزارا ہو گا۔ امیر المومنین ۱۵ رمضان کے خطبہ میں فرماتے ہیں: "مَا عِبَادَتِكَ كَفَقًا عِبَادَتِكَ" پروردگار! جو حق تیری عبادت کا ہے۔ وہ مجھ سے ادا نہیں ہوا حضور والا۔۔۔۔۔! ذرا اس فقرہ کی لطافت پر غور کرو تو لطف

آجائے گا کہ "مجھ سے تیری عبادت کا حق ادا نہیں ہوا"۔ یہ پندرہ رمضان ۱۵ کا واقعہ ہے گویا زندگی کے تین دن باقی ہیں اور اتنا بڑا عابد ہے مگر آج تک اتنی عبادتوں کے باوجود اس کے منہ سے یہ نکل رہا ہے کہ "مجھ سے حق عبادت ادا نہ ہو سکا"۔۔۔۔۔ بہر نوع رمضان کی سولہ گزری۔ سترہ گزری۔ اٹھارہ گزری۔ اٹھارہ تک عابد یہ کہہ رہا ہے کہ "میں تو کچھ بھی نہ کر سکا"۔ اٹھارہ رمضان کی شام

کو جناب زینب سیدہ علیا علی کی بڑی بیٹی کے گھر امیر المومنین کی دعوت تھی۔
 بزرگو! ایمان سے بتاؤ۔ جب بیٹی کے گھر باپ آ جائے تو
 بیٹی کو میسلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ساری دولت و نعمت میرے گھر میں آگئی
 ہے۔ اسی طرح شہزادی عظمیٰ اپنے باپ کی دعوت میں مشغول ہے۔ گھر کی ایک
 ایک دیوار صاف کی ہے۔ تمام گھر جا روپ کشی کر کے صاف کیا ہے۔ بقول مراد پیر
 فرس آنکھوں سے کیا، جھاڑ کے پلوں سے مکان

زینب آج خوش ہے اور دیوار کے پاس جا جا کے ہمسایوں سے کہتی
 ”جے بیو! بچوں کو شور نہ مچانے دینا۔ گھر میں مردوں سے کہنا کہ زرا آہستہ
 لویں۔ کیونکہ آج شام کو میرے آبا آہیں گے۔ ادھر ہمسایہ کی عورتیں کہتی
 ہیں، شہزادی! اگر اجازت ہو تو ہم اپنے مکان سے نور الہی کی ایک جھلک
 زیارت کر لیں۔“ زینب جواب دیتی ہیں ”بی بیو! بابا سے پوچھ کے بتاؤ گی۔
 بہر نوع سارا دن زینب مشغول رہی۔ شام کے قریب زینب حسین سے
 کہتی ہیں ”بھکا لیو! تم بھی آنا۔ عباس بھائی تم ابھی سے میرے ساتھ چلو تاکہ
 بابا کی دعوت کا انتظام کریں۔ شام ہوئی۔ امیر المومنین علی ابن ابی طالب، زینب
 کے گھر تشریف لائے اور فرمایا۔ ”بیٹا زینب! ہم آگئے۔“

”بابا! بسم اللہ آ جاؤ۔“

چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام کرہ کے اندر تشریف لائے۔ زینب نے فوراً
 اپنے سر سے چادر زمین پر بچھادی اور فرمایا۔

”آبا جان! چادر پر بیٹھے۔“

امیر المومنین نے پہلے وضو کیا پھر زینب کی چادر پر بسم اللہ کہنے بیٹھ گئے۔
 سامعین!

غور سے سننا میری اس بات کو۔ یہ ایسا عمل ہے جسے عشق کہتے ہیں۔ اب
 امیر المومنین زینب کی چادر پر بیٹھے۔ روزہ افطار کیا۔ روزہ افطار کرنے کے بعد

امیر المؤمنین فرماتے ہیں۔ بیباک زینب! ہم نماز مغرب آج نہیں پڑھیں گے، زینب نے جواب دیا: ابا حضور بسم اللہ۔ نماز پڑھیے۔ چنانچہ علی نے چادر زینب پر نماز پڑھنا شروع کر دی۔

حضور والا! علی نے اس نماز میں اپنے پاؤں سے کوئی تیر نہ کھنچوایا۔ وہی ایک سادہ نماز ہے۔ پڑھ لی۔ اور وہ عابد جو اتنی عظیم عبادتوں کے بعد کہا کرتا تھا کہ "مجھ سے حق عبادت ادا نہ ہو سکا" انہیں رکعت مغرب کی نماز زینب کی چادر پر پڑھ کر کہتا ہے۔ "فَوُتُّ بِرَبِّ الْكَعْبَةِ"
 "ریت کعبہ کی قسم! آج میں عبادت میں کامیاب ہوا ہوں۔ اب مجھے پتہ چلا کہ میری عبادت مکمل ہو گئی"

گویا زینب کی چادر پر سجدہ کر کے علی کو پتہ چلا کہ آج میں نے حق عبادت ادا کر دیا ہے۔ یہ ہے وہ رُوحِ آلِ مُحَمَّدِ جِوَّاحِ مَکْمَلِ ہُو گیا۔ آج تک اپنی عبادتوں کو حقیر سمجھنے والا زینب کی چادر پر نماز پڑھ کے کہتا ہے "فَوُتُّ بِرَبِّ الْكَعْبَةِ" کعبہ کی قسم! آج میں حق عبادت ادا کر دیا۔ آج میری عبادت اتہسا کو پہنچ گئی۔

سامعین!

زمانے کی گردش کہو یا دنیا کا انقلاب کہو کہ وہی چادر جس پر علی نے نماز ادا کی تو فرمت برت الکعبہ پڑا آج وہی چادر کے متعلق تم سنتے ہو کہ شمر نے زینب کے سر سے کھنچ لی تھی۔ حالانکہ یہ روایت بالکل غلط ہے۔ شمر کے ہاتھ نہ جل جلتے اگر وہ زینب کی طرف بڑھاتا۔

لہذا آج میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر کربلا میں شکر زینب نے زینب کی چادر نہیں چھینی تو آخر وہ چادر کہاں ہے۔

بزرگان من!

زینب گیارہ محرم کو مہمہ چادر حسین کی لاش پر آئی اور دیکھا کہ بھائی کی لاش

فَلَا تَكْفُرُوا

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

خداوند جل جلالہ و عزا سلمہ کی حمد و ثنا کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام

حضرات محترم!

دُنیا میں ہر واقعہ اپنے سابقہ واقعہ سے وابستہ ہے۔ ہم جو کہتے ہیں کہ "فلان واقعہ اتفاقاً ہو گیا" گویا اتفاقاً کے معنی ہیں سبب کا معلوم نہ ہونا۔ ورنہ ہر واقعہ کا پہلے سے کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ وہ واقعہ رونما ہو جاتا ہے گویا جب چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی بغیر سبب کے رونما نہیں ہو سکتا تو اتنا بڑا حادثہ عظیم جس کی مثال دنیائے انسانیت کی تاریخ میں مل ہی نہیں سکتی۔ کیا یہ واقعہ اچانک ہو گیا؟ "نہیں" بلکہ اس واقعہ کا بھی بڑی دُور سے سبب چلا آ رہا تھا جو مخفی تھا۔ اور جب یہ واقعہ ہوا تب دُنیا کو پتہ چلا کہ ہو گیا۔ گویا دُنیا کو اس بات کا علم بھی نہیں تھا کہ سرزمین عرب میں اسی جہالت زار عرب میں ایک ایسا شخص بھی پیدا ہو جائے گا جس کی تمام کائنات کلمہ گو ہو جائے گی۔ مگر قدرت اُس زمانے سے تمہید اٹھا رہی تھی جہاں پہ اسماعیل کو بسایا۔ پھر اُن کی نسل کو آگے بڑھایا۔ اسکے بعد اللہ نے اسی ملک میں ایک شریف خاندان پیدا کر دیا۔ وہ عرب جن کے لئے لوٹ مار اور قتل و غارت باعثِ فخر تھا۔ جو اپنی بچیوں کو زندہ دفن کرنا اپنا کمال سمجھتے تھے۔ جن کی جہالت آج تک ضرب المثل ہے۔ گویا عرب بڑے جاہل تھے۔

سَامِعِينَ!

لفظ "جاہلہ" میں نے یونہی کہہ دیا۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ عرب جاہل نہیں تھے۔ جاہل تو اُسے کہتے ہیں جو جانتا نہ ہو۔

جاہل ہونا کوئی عیب نہیں ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا انسان نہیں ہے جو ہر بات جانتا ہو۔؟

اب یہ بچے بڑی حسرت سے مجھے گھور رہے ہیں۔

زیدی صاحب! شرم کرو۔ منبر پہ بیٹھ کے غلط کہتے ہو۔ دنیا میں ایسے انسان بھی ہیں جو ہر بات جانتے ہیں۔ ہمارے آئمہ کو دیکھ لو جو سب کچھ جانتے ہیں۔

میں کہتا ہوں، ”بچو! تم غلط کہہ رہے ہو۔ ہمارے آئمہ بھی سب کچھ نہیں جانتے تھے۔ چند ایسی چیزیں مجھے معلوم ہیں جو وہ نہیں جانتے تھے مثلاً جھوٹ بولنا وہ نہیں جانتے تھے۔ دھوکا دینا وہ نہیں جانتے تھے۔ فریب دینا وہ نہیں جانتے تھے۔ یہ تمام باتیں تو آئمہ سے زیادہ میں جانتا ہوں“

بہر نوع جاہل ہونا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ جاہل انسان پڑھا اور عالم ہو گیا۔ لہذا عربوں میں جہالت نہیں تھی بلکہ ان میں ”جاہلیت“ تھی۔ وہ زمانہ جاہلیت تھا۔ جہالت چیز اور ہے اور جاہلیت چیز اور ہے۔ جہالت کے معنی نہیں ”نہ جانتا“ اور جاہلیت کے معنی نہیں ”نہ ماننا“ گویا جو جہل رکھتا ہو مگر نہ جانتا ہو اسے جاہل کہتے ہیں۔ اور جو سب کچھ جانتے کے بعد ”نہ ماننا ہو“ اسے

الوجہل کہتے ہیں۔ یہ فرق ہے جاہل میں اور الوجہل میں۔

بہر کیف عرب کے لوگ جاہل نہیں تھے۔ بلکہ الوجہل تھے۔ ورنہ عرب تو اتنے عالم تھے کہ ہر گھاس اور بوٹی کے خواص جانتے تھے۔ ان سے اپنا علاج کر لیتے تھے اور نسوں گھوڑوں کی نسلیں سیکڑوں پشتوں تک معلوم تھیں۔ دوڑنے بڑے پرنسے کو دیکھ کر سمجھ لیتے تھے کہ یہ آشیانہ سے آ رہا ہے۔ یا آشیانہ کو جا رہا ہے؟ نشان قدم سے پتہ چلا لیتے تھے کہ یہ کس کا نشان ہے؟ یہ نکلے ہے یا خوش ہے؟ گویا اہل عرب اتنا علم رکھنے والے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ الوجہل تھے۔ کسی کی بات مانتے نہیں تھے۔ اب خدا نے ان ناماننے والوں کے بیچ میں ایک

ہے جس کا میں بڑا خیال رکھتا ہوں کہ کہیں کھو نہ جائے لہذا مجلس میں یہ
 رومال میں کسی ایسے آدمی کے سپرد کرتا ہوں جو مجھے واپس کر دے؛
 جب دو ڈھائی روپے کا کپڑا سپرد کرتے وقت میں یہ تلاش کرتا
 ہوں کہ آدمی ایسا نادر ہو۔ بے ایمان نہ ہو۔ (کبھی میری تلاش غلط بھی
 ہو جاتی ہے میں نے ایماندار سمجھا مگر وہ بے ایمان نکلا)۔ مگر اللہ جب
 کوئی شے کسی کے سپرد کرتا ہے تو اس کے چناؤ میں غلطی ہو سکتی ہی نہیں اب
 اللہ ابی طالب کو اپنی سب سے قیمتی شے سپرد کرتا ہے کیا اللہ نے
 یہ دیکھ کے سپرد نہیں کیا ہو گا کہ ابی طالب ایماندار ہے؟ ابی طالب
 کو ایماندار سمجھا ہو گا جب ہی اتنی بڑی امانت دے دی۔ اب ایسے
 شخص کو اللہ جیسا معبود ایماندار سمجھتا ہو اسے ایماندار نہ سمجھنا بے ایمانی
 ہے یا نہیں؟۔ اللہ کو تو ابی طالب پر اتنا یقین ہے کہ محمد جیسی امانت
 سپرد کر دی اور تم کہو کہ وہ صاحب ایماندار نہیں تھا۔۔۔ بہر نوع
 ایسی بات کہنا گویا اپنے آپ کو ایمان سے ہٹانا ہے۔

سامعین!

ایک دن میں نے عالم تصور میں حضرت ابی طالب سے عرض کی :-
 'اے امیر العرب! بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ آپ کے پاس
 ایمان نہیں تھا۔؟'

میری یہ بات سنکر ابی طالب ہنس پڑے۔ میں نے عرض کی :-
 'قبل! آپ ہنستے ہیں۔ یہاں ہماری روزانہ لڑائی ہوتی ہے کہ
 آپ ایماندار تھے یا نہیں؟'

ابی طالب نے فرمایا :- 'میں ہنسوں نا تو کیا کروں۔ جس کے پاس
 جو شے ہو وہ دوسرے کو دیتا ہے۔ اللہ کے پاس نبوت رسالت
 امانت عصمت شہادت اور ایمان تھا۔ وہ اس نے میرے سپرد

کر دیا اور تمہارے پاس درود سلام ہیں وہ تم میری اولاد کو دے دیتے ہو۔ اور جن کے پاس ایمان نہیں ہے وہ ایمان مجھے کہاں سے دیں گے؟

سامعین!

میرا مقصد فضائلِ ابی طالب بیان کرنا نہیں ہے ورنہ فضائلِ ابی طالب بیان کرنے کے لئے تو پورا عشرہ چاہیے۔ بہر کیف ابی طالب کے فضائل میں آج اتنا ہی فقرہ کہتا ہوں کہ۔

”ابجے طالبجے اتنی فضیلتوں کا انسان ہے کہ علی کا بھی باپ ہے“

گویا ابی طالب اتنی بڑی فضیلت والا انسان ہے۔ اب اللہ نے محمد کو ابی طالب کے سپرد کر دیا اور ابی طالب، محمد کو اپنے گھر لے آئے اور فرمایا: ”بیٹا! آج سے تم ہمارے گھر رہو گے“

چنانچہ محمد اپنے چچا کے گھر رہنے لگے۔ رات کو محمد جب سوتے اور جب رات کے بارہ بجتے تو اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں اچانک رات میں دشمن کوئی حملہ کر کے اسے نقصان نہ پہنچا دے۔ ابی طالب سوتے ہوئے کو چھپکے سے اٹھاتے اور اپنے کسی بیٹے کے بستر پر سلا دیتے اور اپنے بیٹے کو محمد کے بستر پر سلا دیتے تاکہ اگر اچانک حملہ ہو تو بے شک میرا بیٹا مارا جائے۔ مگر محمد بچ جائے۔ اتنی اہمیت سے جو محمد کی حفاظت کر رہا ہوا ہے ایماندار نہ ماننا گویا اپنے آپ کو ایمان سے ہٹانا ہے یا نہیں؟

ابی طالب نے یہ عمل ایک دو دن نہیں کیا بلکہ برسوں کیا کہ اپنے بیٹے کو محمد کے بستر پر سلا دیتے تاکہ دشمن کے حملے سے میرا بیٹا بے شک مارا جائے مگر محمد کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

اب اگر آپ کہیں ابی طالب کے بیٹے کو محمد کے خطرناک بستر پر سوتا دیکھیں تو سمجھ لیں کہ یہ باپ کی ڈلوائی ہوئی عادت کی تاثیر ہے۔

گو یا ابی طالب نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹوں کو محمد کے خطرناک
بستر پر سونے کی مشق کو داری تھی۔

بہر نوع اس شان سے ابی طالب اپنے بھتیجے کی حفاظت فرما رہے تھے۔
ایک دن محمد نے اہل عرب کو بلایا اور فرمایا:-

”عرب بھائیو! کیا میں صادق ہوں؟“

انہوں نے جواب دیا ”جی ہاں۔ آپ صادق ہیں“

رسول نے پوچھا ”میں نے کبھی جھوٹی بات تو نہیں کہی؟“

لوگوں نے جواب دیا ”بالکل نہیں“

آپ نے فرمایا ”اگر میں یہ کہوں کہ پہاڑی کے پیچھے ایک فوج تم پر حملہ کرنے

آ رہی ہے۔ تو تم مان جاؤ گے؟“

لوگوں نے کہا جی ہاں۔ مان جائیں گے“

رسول پوچھتے ہیں ”کیا تمہیں وہ فوج نظر آ رہی ہے؟“

انہوں نے جواب دیا ”نہیں! ہمیں چاہے نظر آئے یا نہ آئے مگر

آپ جو کہہ رہے ہیں۔ ہم آپ کی بات نہیں جھٹلا سکتے۔ ہمیں نظر نہیں

آتا۔ یہ ہماری آنکھ کا قصور ہے چونکہ آپ جو کہہ رہے ہیں اس لئے

ماننا پڑے گا۔“

اب رسول نے فرمایا ”اگر تم مان لو گے تو میری ایک بات مانو کہ۔۔۔

خدا ایک ہے“

انہوں نے کہا ”جناب! یہ کیا فرمایا آپ نے؟“

رسول نے کہا ”کہو۔ خدا ایک ہے“

”جناب۔۔۔ بات یہ ہے کہ۔۔۔ خدا۔۔۔ اچھا کل بتائیں گے“

اگلے دن پھر آگئے۔ رسول نے پھر ان سے پوچھا۔

”بتاؤ۔ میں صادق ہوں؟“

انہوں نے جواب دیا "جی ہاں۔ آپ صادق بھی ہیں اور امین بھی ہیں
رسول نے فرمایا "پھر کہو کہ خدا ایک ہے"

انہوں نے کہا "جناب بات یہ ہے کہ خدا..... اچھا کل"

(اسے کہتے ہیں ابو جہل — جھگڑا بھی نہیں کرتے اور مانتے بھی نہیں)

بہر نوع۔ جب کئی دن گذر گئے — اللہ نے کہا۔

"محمد! سنتے بھی ہو۔ اس طرح تو برسوں گذر جائیں گے اور یہ نامزد

"ہاں" نہیں کریں گے۔ تم میرے بتائے ہوئے طریقے سے ان سے "ہاں"

کر دو!

خداوند! وہ کیسے؟

اللہ نے کہا "ان سے یہ پوچھو کہ خدا ہے بھی یا نہیں؟ ایک دُوی بات

چھوڑو۔

چنانچہ رسول نے انہیں مٹا کے پوچھا "کیوں بھی؟ خدا ہے؟"

انہوں نے کہا "جی ہاں"

رسول نے فرمایا "جاؤ۔ بس اتنا ہی پوچھنا تھا"

لوگ بڑے خوش ہوئے۔ کہ "محمد اب ایک والی بات نہیں کہتا"

اگلے دن پھر بلایا تو پہلے سے زیادہ تعداد میں لوگ تشریف لائے۔

رسول نے پوچھا "کل کا سبق سناؤ؟"

انہوں نے کہا "خدا ہے"

رسول نے فرمایا "مشابش۔ ٹھیک۔ یہی تمہارا کل کا سبق تھا۔

اچھا یہ بتاؤ "جو خدا ہے وہ" عزت والا ہے یا بے عزت؟

انہوں نے کہا "خدا بڑی عزت والا ہے"

"رسول نے فرمایا "مشابش — جاؤ"

لوگ بہت خوش ہوئے۔ محمد اب ایک والی بات نہیں کہتا تیس دن

پھر بلایا۔ "سبق سناؤ؟"

انہوں نے کہا "خدا ہے — اور عزت والا ہے" رسول نے فرمایا "اچھا۔ یہ بتاؤ کہ خدا کی عزت باپ کے برابر ہے یا نہیں؟ انہوں نے کہا "جی ہاں۔ خدا کی عزت باپ کے برابر ہے" رسول نے فرمایا "جاؤ چھٹی۔ سبق ختم ہو گیا۔ اب وہ بہت خوش ہیں کہ محمد ایک دلی بات نہیں کہتا۔ جو تھے دن پھر بلایا۔ پوچھا "سبق سناؤ؟" حضور! خدا ہے۔ عزت والا ہے اور اس کی عزت باپ کے برابر ہے" رسول نے کہا پھر سناؤ۔

قبل! خدا ہے۔ عزت والا ہے۔ اور اس کی عزت باپ کے برابر ہے" جب پانچ سات دفعہ محمد نے ان سے کہلوا دیا کہ خدا کی عزت باپ کے برابر ہے — تو فرمایا "اچھا یہ بتاؤ باپ ایک ہے یا دو ہیں؟" اب چونکہ وہ باپ کہہ چکے تھے اس لئے سوائے ایک کہنے کے اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ مگر وہ خاموش ہو گئے۔

سامعین!

اب آپ کہیں گے کہ زیدی صاحب نے یہ بات گھڑ کے مجلس میں سنادی۔ میں کہتا ہوں۔ اس شخص سے بڑا آدمی کوئی ہے ہی نہیں جو منبر پر بیٹھ کر جھوٹ بولتا ہے۔ اگر کسی کو یقین نہ آئے تو کسی مولوی سے پوچھو کہ قرآن میں یہ آیت ہے کہ:

(یاد کرو اللہ کو جس طرح یاد کرتے ہو اپنے باپ کو) اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اللہ کو تم قبلہ و کعبہ کہا کرو مدظلہ کہا کرو۔ بلکہ جس طرح تم کبھی پی نہیں ماننے لگے کہ باپ دو ہیں اسی طرح کبھی یہ بھی نہ مانو کہ اللہ دو ہیں۔

"اقرہینے" اب جو وہاں سے لوٹے تو بڑے شرمندہ تھے۔ سوچا

یہ کیا ہوا۔ بات ہی کچھ اور ہو گئی۔ یہ تو قصہ ہی کچھ اور بن گیا لہذا اوصاف وہ دشمنی پہ تیل آئے اور محمد کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ ادھر ابی طالبؓ محمد کی حفاظت کر رہے ہیں۔

سامعین! محمد سے تو سب کو پیار ہے اس لئے کہ وہ صادق بھی ہے اور امین بھی ہے۔ ملک کی عزت بھی ہے۔ مگر ابی طالب سے سب کو عداوت ہے کہ یہ حفاظت کیوں کرتا ہے۔

حضور والا!

ایک مکان میں سونا رکھا ہے، چاندی رکھی ہے جو اہرات رکھے ہیں اور سامنے ایک چوکی دار حفاظت کے لئے کھڑا ہے اب جو ڈاکو آئیں گے وہ سونے، چاندی سے تو محبت کریں گے۔ جب ہی تو اُسے لینے آئیں ہیں مگر قتل کسے کریں گے؟ چوکی دار کو۔ مارا بچاڑا محافظ جائے گا۔

گویا محمد کا کلمہ پڑھیں گے اور محافظ کو قتل کریں گے۔ یہی دنیا میں ہوتا ہے۔ اللہ نے کہا۔

”محمد! میری بات سن۔ عوام سے گفتگو نہ کر۔

”سب پہلے اپنے، اقرابین“ کو سمجھاؤ“

سامعین!

جب یہ آیت نازل ہوئی کہ اپنے ”اقرابین“ کو بلاؤ تو محمد نے اپنے چھوٹے بھائی علیؓ ابن ابی طالب کو حکم دیا: ”یا علی! میرے اقرابین کو میرے گھر آنے کی دعوت دو“ چنانچہ علی نے جا کے عبدالمطلب کی تمام اولاد کو دعوت دے دی۔ کہ چلو آج محمد کے گھر میں تمہاری دعوت ہے۔ چنانچہ سب آگئے تیس تیس بیٹیس تو مرد آئے۔ پانچ سات عورتیں جو اقرابین تھے وہ سب اکٹھے ہو گئے۔ مردوں کی فہرست تو آپ کو یاد ہی ہوگی۔ اس میں حضرت ابولہب

بھی تھے۔ عتبہ بھی تھے، عتبہ بھی تھے، شعبہ بھی تھے۔ آخر سب اقربین تھے۔ کافر ہوں تو کیا ہے۔ اقرب تو تھے ہی۔ یہ اور بات ہے کہ ع سے "عقرب" تھے۔ مگر تھے اقرب — اور قاضیات کے پیچھے مستورات آ بیٹھیں جن کی فہرست تاریخ والوں نے ہم تک پہنچا دی۔ مؤرخین یہ بتاتے ہیں کہ ان خواتین میں ایک تو فاطمہ بنت اسد بیٹھی تھیں۔ ایک صفیہ بنت عبدالمطلب بیٹھی تھیں۔ ایک ام ہانی بنت ابی طالب بیٹھی اور ایک چھ مہینے کی بچی بھی تھی۔ یہ کون ہے؟ یہ محمد کی بیٹی فاطمہ ہے۔

حضورِ والا!

خدا شاہد ہے۔ میں نے عینکیں لگا کے دیکھا۔ ایک ایک لفظ کو ٹول کے پڑھا۔ مگر عورتوں کی فہرست ختم ہو گئی۔ میں حیران پریشان ہو گیا۔ کہ جب "اقرب" بلائے گئے ہیں تو محمد نے چھ مہینے کی بیٹی کو تو بلایا مگر اس کی بڑی بہنوں کو کیوں نہ بلایا۔ سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ گویا وہ آج نہیں ہیں تو آئندہ بھی نہیں ہیں۔

بہر نوع۔ وہ تمام مرد اور عورتیں رسول کے اپنے گھر میں نشتریف لے آئے سنا مہینے! لفظ "اپنے گھر" کو بھی منظور نظر رکھنا۔ رسول نے کسی اور جگہ نہیں بلایا بلکہ اپنے گھر میں بلایا۔ یہ رسول کا اپنا گھر کہاں سے آیا؟ — مؤرخین نے ہمیں بتایا ہے کہ عبداللہ جو رسول کے باپ تھے انہوں نے یہ گھر بنایا تھا۔ چونکہ محمد ان کے بیٹے تھے اس لئے وہ اس گھر کے مالک تھے۔ ہم نے کہا "سبحان اللہ" باپ کا گھر تھا۔ رسول کا اپنا گھر تھا۔ مگر عقل یہاں حیران ہو گئی کہ رسول کو باپ کا گھر مل گیا۔ اپنا گھر بن گیا۔ ادھر ہم نے یہ سنا ہے کہ "رسول نہ وارث ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کا کوئی وارث ہوتا ہے"۔

بہر نوع۔ رسول نے اپنے اقربین کو اپنے گھر بلا کر بٹھالیا اور ان بیٹھے والوں کا حال یہ تھا کہ:

(ایسے چپ بیٹھے تھے کہ جیسے سروں پہ پرند) (قرآن)

سوچ رہے تھے۔ اللہ جانے آج کیوں بلا یا ہے۔ پہلے اُن کے سامنے کھانا رکھا گیا۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو آپ نے فرمایا۔

• میرے اقربینے! میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

انھوں نے کہا۔ فرمائیے۔۔۔ رسول کھڑے ہوئے اور یہ حضور کی سیلکی طور

پر پہلی تقریر تھی۔ فرمایا۔

• اے اولاد عبدالمطلب! تم میرے اقرب ہو۔ تم میرا خاندان ہو، تم میرا خون

ہو۔ تم میرے عزیز ہو۔ تم میرے اپنے ہو۔

سَامِعِينَ!

لفظ، اپنا، مرکز محبت ہوتا ہے۔ جہاں لفظ، اپنا، آجائے خود۔

بخود پیار پیدا ہو جاتا ہے جس طرح اپنا گھر، اپنا وطن، اپنا دیس، اپنا کنبہ

اپنا قبیلہ، اپنا مذہب، اپنا بھائی وغیرہ۔۔۔ گویا لفظ، اپنا،

مرکز محبت ہے۔ جب، اپنا، کہو تو لب سے لب ملتا ہے اور غیر کہو

تو نہیں ملتا۔ اتنی لذت ہے۔ لفظ، اپنا، میں۔

رسول نے کہا، تم میرے اپنے ہو۔ میں تمہیں اپنا سمجھ کے ایک بات کہنا

چاہتا ہوں کہ میں اللہ کی طرف سے ایک ایسا پروگرام لیکر آیا ہوں کہ اگر تم نے اس

پر عمل کر لیا تو دنیا کی خیر بھی تمہیں حاصل ہوگی اور عقبے کی خیر بھی تمہیں حاصل ہوگی۔

میرے پروگرام میں دنیا و عقبے دونوں شامل ہیں۔ میں ایسی شے تمہارے لئے

لیکر آیا ہوں۔۔۔ اور یاد رکھو! میرا پیغام اتنا عجیب ہے کہ اگر تم نے مان

لیا تو قیصر و کسریٰ کے تاج تمہارے قدموں کے نیچے ہوں گے۔ دنیا کی حکومتیں

تمہارے تابع فرمان ہوں گی۔ ساری کائنات تمہارا کلمہ پڑھے گی۔۔۔ رسول

کا یہ فرمان تھا کہ حضرت ابولہب نے عتبہ کی طرف دیکھا اور عتبہ نے شعبہ کی طرف

دیکھا۔ وارٹھیوں پہ ہاتھ پھرنے لگے اور بولے، برخوردار! تمہیں کیا ہو گیا؟

پیسہ پاس نہیں ہے اور کہتے ہو، قیصر و کسریٰ، تابع فرمان ہو جائیں گے۔

کیسی فضول بات ہے۔ تمہاری مدد کر کے خواہ مخواہ کو مصیبت اٹھانی ہے۔
جلو۔ گھر چلیں، چنانچہ وہ اٹھ کے چلے گئے۔

محمدؐ نے اگلے دن اپنے اقربین کو اپنے گھر پھر بلا یا۔ جب تیسرا دن
تھا اور وہ کھانا کھا چکے۔ رسولؐ تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ اب اگر آج بھی کوئی
جواب نہ دیتا تو دنیا یہ کہتی کہ محمدؐ کی تقریر میں اثر نہیں تھا جب ہی تو کسی نے جواب
نہ دیا۔ آج رسولؐ تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔

لوگو! میں ایسی شے لیکر آیا ہوں جو دین و دنیا میں تمہارے فلاح

کی ضامن ہے۔ تم میں سے کون ہے جو اس معاملے میں میری مدد کرے

بس رسولؐ کا یہ کہنا تھا کہ "کوئی ہے جو میری مدد کرے" تو اچانک مجمع میں

پہلے صح گئی۔ لوگوں کے چہرے بدل گئے۔ سامعین کا انداز ہی کچھ اور ہو گیا۔

دوڑ ایک کونے میں سے ایک گیارہ سال کا بچہ اٹھا اور ایڑھیاں اٹھا کے کھڑا

ہو گیا۔ مورخین اس بچے کا حلیہ یوں بیان کیا ہے کہ "کرتے کے بٹن کھلے ہوئے

تھے۔ جیب میں خرے بھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں دکھ رہی تھیں۔ ان میں آشوب

کی وجہ سے سُرخ آئی ہوئی تھی۔ پیٹ میں تلی تھی اور پیروں پہ کھینے کی گرد پڑی

ہوئی تھی"۔ گویا بالکل بچپن کی ادالتھی اور بچپن کی اس ادا سے کھڑے ہو کر

کہتا ہے "نبل! ذرا اب کے فرماؤ۔ آپ نے کیا کہا ہے؟"

رسولؐ نے فرمایا "بیٹا! میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں ایسا پیغام لایا ہوں جو

دین و دنیا، دونوں کی فلاح کا باعث ہو گا۔ کون ہے جو میری مدد کرے؟"

رسولؐ کا یہ کہنا تھا کہ "کون ہے جو میرے مدد کرے" کہ بچے نے تو ایڑھیاں

اٹھائیں اور پروری آواز سے کہا

(میں تیری نصرت کروں گا اے اللہ کے رسول)

سامعین!

"اے محمدؐ نہیں کہا بلکہ "اللہ کا رسول" کہا۔ اگر محمدؐ کہہ کے وعدہ

کرتے تو محمدؐ کی زندگی تنگ وعدہ تھا۔ مگر رسولؐ کہہ کر وعدہ کے معنی یہ ہیں کہ جب تک تیری رسالت رہے گی میری نصرت بھی رہے گی! پھر نوح اس جوش سے بچنے نے یہ فقرہ کہا کہ تیسرا پینتیس آدمیوں کا مجمع جو رسولؐ کی طرف دیکھ رہا تھا اچانک اس بچے کی طرف دیکھنے لگا۔ رسولؐ مسکرانے لگے۔

”قبلہ مسکرتے کیوں ہو؟“

رسولؐ فرماتے ہیں ”میں مسکراتا اس لئے ہوں کہ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ جب مجھ سے نظر پڑے تو اس پر رُکے“

رسولؐ نے کہا ”بیٹا! قریب آؤ“۔ جب برخوردار قریب آ کے کھڑے ہوئے تو آپؐ نے پوچھا۔

”تم نے ہماری بات غور سے سنی؟“

جواب دیا ”ہاں۔ سنی“

”اچھی طرح سوچ لو“

”ہاں سوچ لیا“

”خوب سمجھ لو“

”سمجھ لیا“

”بیٹا! یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے“

”قبلہ! میں نے جان پہ کھیل کے کہا ہے“

”بیٹا! یہ بڑا مشکل کام ہے“

”قبلہ! میں مشکل کٹا ہوں۔ فکر نہ کرو۔ تیرے دشمنوں کے پیٹ پھاڑ دوں گا۔

تیرے دشمنوں کی آنکھیں پھوڑ دوں گا۔ پرواہ نہ کرو۔ آج سے میں تیرا ناصر ہوں جو کہنا چاہتے ہو کہو۔ کیا مجال کسی کی جو تیرے پر دو گرام میں رکاوٹ ڈالے“

بچہ یہ کہہ رہا تھا اور ابی طالبؐ سر جھکاتے ہوئے ”الحمد للہ“ کہہ رہے تھے۔

”یا اللہ! تیرا شکر ہے۔ کیا سپوت بیٹا تو نے مجھے عطا کیا ہے“

بہر ذوق۔ مجمع برخواست ہو گیا۔ اب جو رسول گھر سے باہر نکلے۔ پیچھے پیچھے یہ بچہ جیب میں خرمے بھرے ہوئے محمد کے ساتھ چلا جا رہا ہے۔ ایک خرما کھا لیتا ہے اور گٹھلی دوسری جیب میں ڈال لیتا ہے (یا لکن پھین کی ادا) اب جو رسول مکہ کے بازار میں پہنچے تو بازاری لوگوں نے رسول کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ ادھر بچہ بھی محمد سے نصرت کا وعدہ کر کے آیا تھا۔ اب جو کسی نے ذرا بھی کوئی فقرہ کہا تو بچہ نے اپنی جیب سے فوراً ایک گٹھلی نکالی اور تاک کے اُسے مار دی جو مذاق کر رہا تھا۔ سینے پہ لگی تو کڑوٹ کے نکل گئی۔ بس دونوں کے ساتھ یہ کیا تھا کہ لوگ کان پکڑ گئے، تو بے کر گئے کہ اگر یہ بچہ ساتھ ہوا تو ہم محمد کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہیں۔ گویا اس میں اور محمد میں فصل ہو تو پھر ہم کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔ ورنہ اگر یہ بچہ بغیر فصل کے ساتھ ہوا تو پھر ہم کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

سامعین!

ایک دفعہ یہ بات میں نے مجلس میں کہہ دی۔ سننے والوں نے کہا۔
 ”بالکل جھوٹ۔ تمہیں شرم نہیں آتی، منبر پہ بیٹھے جھوٹ بولتے ہو“
 میں کہتا ہوں ”صاحب! جو منبر پہ بیٹھے جھوٹ بولتا ہے
 اس کے برابر کا کوئی برا ہے ہی نہیں“

پھر انہوں نے کہا ”زیدی صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ گیارہ سالہ بچے کے ہاتھ میں اتنی طاقت آجائے کہ خرمے کی گٹھلی سے کمر ٹوٹ جائے۔ لہذا ہم نہیں مانتے“

میں کہتا ہوں ”بھئی، نہیں مانتے تو نہ مانو۔ زیر دستی تھوڑی ہے؛ تمہارے ناماننے کا کوئی علاج نہیں ہے کہ علیؑ کے ہاتھوں میں اتنی طاقت کیسے آ سکتی ہے۔ مگر قرآن میں یہ لکھا ہوا ہے کہ ”جب خانہ کعبہ کو ڈھانے کے لئے ہاتھی آگئے تو ابابیل نے پنچے میں مسور کے دانے کے برابر کنکر لے کر پھینکے جن سے ہاتھی

ٹوٹ گئے۔

سامعین!

اگر علیؑ والی یہ بات غلط ہے تو ابابیل والی بات میری سمجھ میں نہیں آتی لہذا جو دلیل اس کی ہے وہی دلیل اس کی ہے۔

اب معترض کہتا ہے "جناب - وہ تو بیت اللہ کی حفاظت تھی؟ میں کہتا ہوں "بھئی۔ اگر وہ بیت اللہ کی حفاظت تھی تو یہ رسول اللہ کی حفاظت تھی"

بہر نوع - بنی ہاشم کا خاندان دونوں کام کرتا رہا۔ تبلیغ کا کام بھی اور حفاظت کا کام بھی۔ رسول نے بچے کو بلایا، سینے سے لگایا، پیار کیا۔

"بیٹے! تم نے بڑا وعدہ کیا ہے"

بچے نے جواب دیا "تبدل! میرا وعدہ رہا کہ میں آپ کی نصرت کروں گا، رسول نے کہا "اچھا تو پھر میری بات سن۔ اگر تو اپنے اس وعدہ نصرت میں ثابت قدم رہا تو "انت وصحی" (تو میرا وصی ہوگا) "انت وزیر" (تو میرا وزیر ہوگا اور میرے بعد میرے اس مشن کا انچارج بھی ہوگا)

چنانچہ دونوں اطراف سے وعدے ہو گئے۔ ایک طرف سے گیارہ سالہ بچہ وعدہ کرتا ہے کہ میں نصرت کروں گا اور ایک طرف سے تینتالیس سالہ رسول وعدہ کرتا ہے کہ تو میرا وصی ہے۔ تو میرا وزیر ہے۔ تو میرے مشن کا انچارج ہے گویا فریقین سے معاہدہ ہو گیا۔

سامعین!

اب یہ بتاؤ۔ وعدہ سے پھر جانے کا احتمال کس طرف سے ہے؟ بچے کی طرف ہے۔ اور اگر بچہ اپنے وعدہ پر قائم رہے تو رسول کے متعلق تو پیشکبک بھی نہیں کر سکتے کہ (معاذ اللہ) وہ اپنے کٹے ہوئے وعدہ سے پھر جائے۔ اب اگر علیؑ اپنے وعدہ پر قائم رہے ہیں تو رسول کا بھی تو فرض ہے

کہ اپنا وعدہ وفا کر کے جائیں اور علیؑ کو اپنا وصی بنا کر جائیں۔ اور اگر رسول
بغیر نائے چلے جائیں تو ہم غریب آدمی تو کچھ نہیں کہیں گے۔ مگر اللہ تو کہہ
دے گا کہ "محمد! اگر تو نے یہ کام نہ کیا تو میں یہ سمجھوں گا کہ تو نے رسالت
کا کوئی کام ہی نہیں کیا۔ لہذا وعدہ وفا کر کے جاؤ ورنہ رسالت خطرے میں ہے"

رسول نے کہا "خدا وندا۔ میں وعدہ وفا کر کے جاؤں گا۔
حالانکہ میں نے یہ وعدہ اپنے "اقربین" میں کیا ہے۔ مگر میں
اس وعدے کو دنیا کے سامنے پورا کروں گا۔ تاکہ عالم گواہ ہے
میری اس بات کا کہ میں اپنے وعدے کو پورا کر رہا ہوں"

حضور والا!

وہ وقت بھی آگیا۔ اللہ نے کہا:

"محمد! آج سے بہتر دن نہیں ملے گا۔ آج اپنے وعدے کو
وفا کر کے جاؤ کیونکہ بہترین موقعہ ہے۔ ابھی ابھی لوگ حج کر کے
آئے ہیں، اللہ کا گھر دیکھ کے آئے ہیں۔ خانہ کعبہ کا طواف کر کے
دنیا کے چکر دماغوں سے نکل گئے ہیں۔ صفا و مروا میں دوڑ کے
زمانے کی دوڑ بھاگ کو بھول گئے ہیں۔ عرفات میں بیٹھنے کے معجز
کی منزلیں ملے کر لی ہیں۔ منیٰ میں قربانی دے کر قربان ہونے کا
عذبہ سیکھ لیا ہے۔ شیطان کو کنکریں مار کر بڑوں سے نفرت اور
اچھوں سے محبت بھی سیکھ لی ہے۔ سب کے سر بھی منڈے
ہوئے ہیں کسی میں بال برابر کا فرق نہیں ہے۔ ابھی ابھی اللہ کے
سامنے بلیک کہہ کے آئے ہیں۔ ان حاجیوں سے بہتر جمع اور
کہاں ملے گا لہذا آج اپنا وعدہ وفا کر لو آج وہ بات کہہ دو
جو اُس دن کہی تھی"

رسول نے فرمایا "بہت اچھا"

لاکھوں کی تعداد میں حاجی رسول کی قیادت میں جا رہے ہیں، اونٹ سُرست ہو کے چل رہے ہیں۔ شہد سواروں کے گھوڑے زمین پر قدم نہیں رکھتے۔ ان کے نال پتھروں سے ٹکرا کے چراغاں کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ حاجی خوش ہیں کہ ہم نے رسول کی قیادت میں حج کیا۔

بہر نوع۔ رسول کی قیادت میں حاجیوں کا قافلہ ادھر سے چلا اور جبرئیل کی قیادت میں آیتوں کا قافلہ ادھر سے چلا۔ دونوں قافلے حم پر آ کے ٹکرا گئے۔ ادھر سے آیتوں کا قافلہ ادھر سے حاجیوں کا قافلہ۔ آفتاب نصف النہار پر ٹھہرا ہوا۔ جبرئیل کی آج وضع کچھ اور تھی۔ اس سے پہلے بھی جبرئیل کئی بار محمد کے پاس آیا کرتا تھا اور عرض کرتا۔

يَا أَيُّهَا الْمُرْسَلُ "يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ" "آپ منزل میں۔ آپ مدثر ہیں۔" مگر آج جبرئیل اپنی سرکاری وردی پہنے ہوئے۔ پوری شان و شوکت سے آیا اور آ کے رسول کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ! "آج جبرئیل نے مدثر، منزل کہہ کر نہیں پکارا بلکہ عہدے سے خطاب ہو رہا ہے۔

"يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ!"

"اے رسول۔ دیکھو، اُترو۔"

رسول گھوڑے سے اُترے مگر اُترنے میں فرق تھا۔ کوئی دل میں اُتر گیا اور کوئی دل سے اُتر گیا اور بن کی بن آئی جس میں رسول اُتر گئے، جسک کی قسمت چمک اٹھی جس میں رسول اُتر گئے۔ تمام حاجی اکٹھے ہو گئے۔ عرض کی۔

"قبلہ بات کیا ہے؟"

آپ نے مؤذن کو حکم دیا، آج اذان میں "حَيَّ عَلَى خَيْرِ الْعَمَلِ" کہو۔ باقی عمل تو سارے تمہیں بتا چکا ہوں۔ آج تمہیں "خَيْرِ الْعَمَلِ" بتایا جائے گا۔ (چونکہ یفقہ اسی واقعہ کی یادگار ہے۔ اس لئے جزو اذان بن گیا) آج تمہیں

”خَيْرِ الْعَمَلِ“ بتایا جائے گا۔ چنانچہ تمام حاجی سمٹ سمٹ کے رسول کے گرد اکٹھے ہو گئے، سورج کی شعاعیں تیز ہیں۔ عربوں نے اپنی عبا میں نیچے رکھی ہیں۔ رسول کی بات سننے کے لئے سب تیار ہیں۔

”اللہ جانے رسول کیا کہیں گے؟“

جبریل نے کہا ”محمد! ہمارے سامنے وہ بات کہو تاکہ ہم بھی سنیں“

چنانچہ رسول نے حکم دیا ”منبر بنایا جائے“ حاجیوں نے عرض کی۔

”قبیلہ! گھوڑوں کی زین اکٹھی کر کے جگہ بنا دیں؟“

فرمایا ”نہیں۔“

”لکڑیاں کاٹ کے بنا دیں؟“

فرمایا ”نہیں اونٹوں کے پلانوں کا منبر بنایا جائے“

حاجیوں نے عرض کی۔ قبیلہ! اونٹوں کے پلانوں میں کیا خصوصیت ہے؟

رسول نے فرمایا ”اس لئے کہ شترکینوں سے بات کرنی ہے“

بہر نوع۔ پلان شترکا منبر بن گیا اور رسول اس پہ آ کے کھڑے ہو گئے۔

جمع چاروں طرف سے سمٹ کے قریب آ گیا۔ رسول نے حاجیوں کو دیکھا

پھر وہی خلق عظیم والی لبوں پہ سکواہٹ، چہرے پہ تحیر، نہایت لطافتِ لافسٹ

کے ساتھ حاجیوں کے اس مجمع پر ایک نظر ڈالی۔ بس رسول کی نظر کی یہ تاثیر تھی۔

کہ لوگ تو سرمست ہو گئے۔ ”اللہ جانے۔ رسول آج کیا فرمائیں گے“

یہاں تک کہ تین سو برس کا سٹان کمر پہ ہاتھ رکھ کے کھڑا ہو گیا کہ ”رسول آج

کیا کہے گا؟ اور ابو ذر یہ کہے کہ میں آج تمام صاحب زر کو فنا کر دوں گا۔

”رسول آج کتنا کیا ہے؟“

بہر نوع۔ جب لوگ چاروں طرف سے رسول کے گرد اکٹھے ہو گئے

تو رسول نے کہا۔

”اے عرب والو! اگر واعظ کروں گا تو گھبرا جاؤ گے۔ لہذا آج

میں تم سے سیٹھی میٹھی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ تم پینے کے عادی تھے
میں نے تم سے چھڑوادی۔ مگر آج اگر مناسب سمجھو تو ہم پلائیں گے۔
پیو گے؟

لوگوں نے بلند آواز سے کہا "حضور پیئیں گے"
رسول نے فرمایا "دیکھو۔ سن کے پی نہ جانا"
بس پینے کا اعلان تھا کہ تمام متوالے اکٹھے ہو گئے۔ چاروں طرف
رسول کے متوالوں کا جمع لگ گیا۔ وہاں ہر قسم کا متوالا موجود ہے
سیدھی مت والے بھی اور الٹی مت والے بھی۔

بہر نوع، متوالے اکٹھے ہو گئے اور ساقی نے پلانا شروع کر دیا۔ مٹ خانہ
ارض کا ساقی! کچھ آنکھوں آنکھوں میں پلائی۔ کچھ باتوں باتوں میں پلائی۔ کچھ
ہنس کے پلائی۔ کچھ گفتگو سے پلائی۔ جب لوگوں کا نشہ پورے عروج پہ
پہنچا تو ساقی نے لرز کے "تراہی" ساغراٹھایا۔ لوگوں نے گردنیں بلند کر دیں
(خدا جانے۔ عجیب نقشہ ہو گا اس زمانے اگر کیرہ وغیرہ موجود ہوتا اور اس
منظر کی تصویر لی جاتی تو اتنا لطیف جمع کہیں دیکھنے میں نہ آتا) تراہی ساغرا
ہاتھوں پہ بلند کئے ہوئے رسول لوگوں سے پوچھ رہے ہیں۔

پیو گے؟

لوگوں نے کہا "حضور! ضرور پیئیں گے۔ آپ جو پلا رہے ہیں؟"
"دیکھو! یہ دیسی نہیں ہے۔ یہ تمہاری بنائی ہوئی نہیں ہے
یہ بے ہوش کرنے والی نہیں ہے بلکہ خالص" ولایت "کی شراب ہے"

(مَنْ كُنْتَ مَوْلًا فَلِذَاكَ مَوْلَا)

حضور والا!

اُردو زبان کا کوئی شاعر عالم آرواح میں اس منظر کو دیکھ رہا تھا
اُس نے ساقی کو پلاتے بھی دیکھا اور پینے والوں کو بھی دیکھا۔ وہی

نقشہ کھینچ دیا اپنے شعر میں ۔
 رسول اپنے ہاتھوں پہ تراہی ساغرا مٹھائے کھڑے ہیں اور کہتے ہیں
 ہیں " پیو گے ؟ " _____ لوگ کہتے ہیں " پیو گے " ۔
 اور شاعر نے کہہ دیا ۔

لے کے خود پر مغال ہاتھ میں مینا آیا
 لیکن اسے بادہ کشو تم کونہ پینا آیا

رسول نے کہا " یاد رکھو ! قیامت تک اس کا نشہ نہیں اترے گا ۔
 یہ اس وعدہ کی دفا ہے جو میں نے اعلان رسالت کے وقت کیا تھا "۔
 رسول کی تقریر ختم ہوئی ۔ لوگوں نے جناب امیر کو مبارک بادیں دینا شروع
 کیں ایسے ایسے خلوص سے مبارک بادیں دی جا رہی تھیں کہ خدا جانے
 عشر بھر یا در رہیں گی ۔

بہر نوع ۔ رسول واپس مدینہ تشریف لائے ۔ حکم دیا کہ علیؑ کو امیر مومنین
 کہہ کر سلام کر دو ۔ چنانچہ سب سے پہلے جناب سیدہ طاہرہؑ نے امیر مومنین
 کہہ کر سلام کیا ۔ پھر حسنین نے بڑھ کے امیر المومنین کہہ کر سلام کیا ۔ پھر
 اصحاب رسول نے امیر المومنین کہہ کر سلام کیا ۔ علیؑ کی شان ہی کچھ
 اور ہو گئی محمدؐ کا وعدہ دفا ہو گیا ۔

سامعین !

آج رسول کا وہ وقت آیا ۔ جب اہل مدینہ سے جدا ہو کے جانے
 لگے ۔ اصحابؓ کو بلایا اور فرمایا ۔

" لوگو ! ہم جا رہے ہیں ۔ ہم نے اس دن جو پلائی تھی وہ
 تمہیں یاد ہے نا ؟ ۔ ممکن ہے نشہ اتر جائے ۔ پھر کون پلانے آئیگا ۔
 لہذا ہم چاہتے ہیں کہ تمہیں اس کا نسخہ لکھ دیں ۔ تاکہ میرے بعد
 تم خود بنا کے پی لیا کرو "۔

لوگوں نے کہا "ہاں قبیلہ لکھو دو"
رسول نے فرمایا "بھولے آڑ کا غذا تم دوات"

"قبیلہ بس ویسے ہی بتا دو"
رسول نے فرمایا "بھئی، دیکھو! اگر لکھواتے تو بڑی تفسیر سے لکھتا۔
چونکہ زبانی پوچھتے ہو لہذا محقر بنانا ہوں۔ کہ اس لٹنے کو قائم رکھنے کیلئے
دو دوا میں یاد رکھنا۔ ایک دوا کا نام ہے "کتاب" اور ایک دوا کا نام
ہے "عترت"

"کتاب" ہر کتاب نہیں۔ بلکہ کتاب ہو "اللہ والی" اور "عترت"

ہر عترت نہیں بلکہ عترت ہو "میرے والی" اور دیکھو۔
ترکیب استعمال سے یہ ہے کہ "تینس" تولے "کتاب" لے لو۔
"چوڑا" تولے "عترت" لے لو۔ پھر "ایمان" کی دہلجی میں ڈال
کر "نیک عمل" کا پانی ملا لو۔ پھر "خلوص" کی ہلکی سی آبیخ دیدو۔
تھوڑی سی مودت کی مصری ملا لو۔ جب قوام ٹھیک ہو جائے
تو پیار کے ہاتھوں سے اُتار کر چھان کر۔ روزانہ "پاتخ" مرتبہ
"سترہ" گھونٹ پی لیا کرنا۔ کبھی بھوک نہیں لگے گی۔ اور
اگر چاہو کہ اس کا نشہ اور بڑھے تو یوں کرنا کہ سال میں چند دن
مقرر کر لینا تاکہ اس کے تذکرہ سے اُترا ہو انشہ دوبارہ تازہ ہو
جائے۔

بزرگانِ من!

جنگل میں منگل اُس دن ہو گیا تھا جب رسول نے اعلان کیا تھا۔ آج بھی
رسول کا کنبہ جنگل میں بیٹھا ہے اور دشمن کی فوجیں چلی آ رہی ہیں۔ اُن کے
گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سیدانہوں کے خیموں میں آ رہی ہے۔ بہن بھائی
کو بلا کے کہتی ہے "حسین! یہ فوجیں کس طرف آ رہی ہیں؟"

حسین جواب میں کہتے ہیں، "دشمن کی طرف" زینب نے آسمان کو دیکھا
زمین کو دیکھا اور چُپ ہو گئی۔ آخر نبی بی پُو پھتی ہے۔

حسین! ہمارا کوئی نہیں آئے گا۔ کوئی ایسا نہیں ہے جسے تم بلا لو حسین؟
مولانا نے جواب دیا، "زینب! کون مصیبت میں آئے گا؟"

"حسین! آدمی میں جاتی ہوں۔ بلانا تمہارے زتے ہے"

"ہاں بہن۔ بتاؤ"

"حسین! وہ تمہارے بچپن کا دوست، جو مجھے بہن کہتا تھا اور تمہیں بھائی

کہتا تھا۔ میرے آبانے اس کا نام حبیب رکھا تھا۔ اُسے بلا لو"

چنانچہ حسین نے خط لکھا۔ قاصد کو دیا اور فرمایا، "کوئہ میں جاؤ۔ لال دُھی

والا ایک آدمی ملے گا۔ اس کا نام حبیب ہے۔ یہ خط اُسے دے دو"

قاصد پہنچا۔ حبیب کے محلے میں گیا۔ ایک دُکان پر جا کے ٹھہرا۔

اتفاق سے حبیب اس دُکان میں کھڑے خضاب خرید رہے تھے۔ قاصد

حبیب سے پوچھتا ہے، "شیخ! کیا اس محلے میں کوئی حبیب نامی آدمی

رہتا ہے؟"

حبیب نے پوچھا، "کیوں۔ کیا کام ہے؟"

"تم مجھے حبیب، گھر بتا دو"

حبیب میرا دوست ہے۔ تو بات کر (حبیب خود کہہ رہا ہے)

قاصد علیحدہ ہو کر کہنے لگا، "حبیب! اگر تیرا دوست ہے تو سن! میں

حبیب کے نام حسین کا خط لایا ہوں"۔ بس یہ سننا تھا کہ حبیب

کہ حبیب تو قاصد کے پیروں پر گر گیا۔ "تو حسین کا قاصد ہے۔ تو حسین کا

خط لایا ہے۔ تو نے چلتے وقت حسین کو دیکھا تھا۔ آ میرے ساتھ میں تجھے

حبیب کے گھر لے چلتا ہوں"۔ دونوں چل پڑے۔ دُروازے پر پہنچے۔

حبیب نے کہا، "ایک منٹ ٹھہر۔ میں ابھی آتا ہوں۔ یہ کہہ کر حبیب اپنی

زدوجہ کے پاس گیا اور کہا:-

”سنتی بھی ہو۔ آج قسمت یاد رہو گی۔ نصیب جاگ اٹھے۔ آج

تو ہمارا تیرا قبائل کہیں سے کہیں پہنچ گیا“

بیوی کہتی ہے ”بتاؤ تو سہی۔ بات کیا ہے؟“

حبیب نے کہا ”تم جلدی سے وضو کرو۔ دو رکعت نماز پڑھو۔ پھر

بتاؤں گا کیا ہوا“ جب مومنہ نماز پڑھ چکی تو حبیب نے کہا۔

”آج ہمارے گھرا میرا مومنین علی ابن ابی طالب کے لخت جگر

حسین کا قاصد آیا ہے“

مومنہ جواب دیتی ہے ”حبیب شکر ادا کرو۔ مٹولا کے قاصد کو اندر لے آؤ“

چنانچہ حبیب نے قاصد کو سفید چادر پہ بٹھایا اور جب وہ بیٹھ گیا تو کہنے لگا۔

”میرے مٹولا کے قاصد! میں ہی حبیب ہوں۔ مٹولا کا خط میری نام ہے“

قاصد نے حبیب سے خط نکالا اور حبیب کو دے دیا۔ حبیب نے خط کی تحریر

کو چوما۔ کھولا۔ خاموش پڑھنے لگا۔ مومنہ نے اندر سے آواز دی:-

”حبیب! بلند آواز سے پڑھو تاکہ میں بھی سنوں کہ مٹولانے کیا فرمایا ہے“

حبیب نے خط پڑھا۔ خط کی عبارت یوں تھی۔

”یا اخی حبیب! بھائی حبیب!“

حبیب تو بھائی کا نام سنتے ہی سجدے میں گر گیا۔

”حسین اور مجھے بھائی کہے“

حبیب نے آگے پڑھا تو لکھا تھا:- ”حبیب! میں تمہارے

وطن میں آ گیا ہوں۔ مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ میری مدد

کو آؤ“

اگلا فقرہ جس نے حبیب کے کلیجے کے ٹکڑے کر دیئے یہ تھا،

”حبیب! میں تمہیں کبھی تکلیف نہ دیتا مگر مجبوری تھی کہ میرے

ساتھ زینبؓ بھی ہے۔“

بس زینبؓ کا نام پڑھتے ہی حبیبؓ گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر کہنے لگا۔

”ہائے۔ زینبؓ بھی ساتھ ہے۔“

بہر نوع۔ حبیبؓ کو بلا میں پہنچے۔ حسینؓ نے بڑھ کے استقبال کیا۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے دروازے تک آئے۔ حبیبؓ خیمے سے باہر کھڑے ہو گئے۔ مولانا درتشریف لے گئے۔ زینبؓ! حبیبؓ آگیا۔“

زینبؓ دروازے پہ پہنچیں۔ بیچ میں پردہ۔ بی بی فرماتی ہیں۔

”حبیبؓ! فاطمہؓ کی بیٹی تجھے سلام کرتی ہے۔“

حبیبؓ تو بے ہوش ہو کر گر پڑا اور کانپتے ہونٹوں سے عرض کی:

”شہزادی! اب یہ وقت آگیا کہ ادنیٰ غلاموں کو سلام کر رہی ہو۔“

بس بھائیو! ————— بیان ختم کرتا ہوں۔

زینبؓ نے حبیبؓ کو ہمیشہ بھائی کہا۔ اب آپ خود اندازہ کریں کہ زینبؓ کو حبیبؓ پر کتنا اعتماد تھا کہ عاشور کی شام کو جب سیدہ ائیوں کے خیمے جلنے لگے اور چادریں اترنے لگیں تو زینبؓ نے حسینؓ کو نہیں پکارا۔ عباسؓ کو نہیں پکارا بلکہ گھبرا کر بلند آواز میں کہا۔

”بھائی حبیبؓ! — آؤ۔ دیکھو۔ میں ٹٹ گئی۔“

اللہ ہماری مجلسوں کو قبول و منظور فرمائے اور رہیں مودۃ محمد وآل محمد

عطا فرمائے۔ آل محمد کی مودۃ کے ساتھ زندہ رہیں اور آل محمد ہی کی مودۃ

کے ساتھ دم نکلے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط
اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

خداوند عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام
حضراتِ محترم!

اللہ کا یہ فضل ہے کہ جو چیزیں ذمی حیات کے لئے لازمی تھیں۔ انہیں
انسان کے تصرف میں نہیں دیا بلکہ اپنے قبضہ قدرت میں رکھا۔
اگر لوازماتِ حیات انسان کے بس میں ہوتے تو کبھی کی یہ دنیا ختم ہو جاتی
لہذا اللہ نے دنیا کی بقاء کے لئے ان لوازماتِ حیات کو اپنے قبضہ میں رکھا۔
اور جو چیزیں حیات کے لئے ضروری تو تھیں مگر اتنی اہم نہ تھیں وہ انسان کے
قبضہ میں دے دیں۔ ورنہ جو چیزیں انسانی زندگی کے لئے نہایت لازمی
تھیں۔ انہیں قدرت نے اپنے قبضہ میں رکھا۔ جس طرح انسانی
زندگی کے لئے "ہوا" نہایت لازمی چیز ہے۔ ہوا کے بغیر انسان کا گزارہ
ہی نہیں ہو سکتا۔ لہذا اللہ نے کہا "اگر میں نے انسان کے سپرد کر دی تو انسان
ایک دم سے انسان کو مار دیں گے۔ اسی طرح قدرت نے پانی" اپنے قبضہ
میں رکھا اب اگر انسان کبھی خدا کی ان چیزوں پر قبضہ بھی کر لیتا ہے تو انسان کیلئے
یہ مصیبتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ گویا

نظام قدرت میں انسانی مداخلت جہاں ہوئی وہاں خرابی پیدا ہو گئی
لہذا انسان کو انسان بنانے کے ذرائع بھی اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھے۔ اگر
انسانی ہدایت۔ انسان کے سپرد کر دی جاتی تو پھر وہ تماشہ بنتا کہ خدا کی پناہ۔

”جس طرح ساری دنیا کے چوروں سے کہہ دیا جائے کہ ایک ایسی سوسائٹی بناؤ جو چوری کو روکتی ہو۔ چنانچہ وہ چوری چوری ایسی بنائیں گے جو ”چوری“ چلتی رہے گی۔ اور اگر تمام ڈاکوؤں سے کہہ دیا جائے کہ ڈاکہ زنی کے انصاف کے لئے ایک کمیٹی بنا لو۔ وہ دعویٰ بڑے کرکے تقریباً کریں گے، لیکچر دیں گے کہ ”ڈاکہ بھت بڑی بات ہے“ اور پھر ایسے ڈاکے ڈالیں گے کہ پتہ نہ چل سکے کہ کہاں ڈاکہ بڑ گیا۔“

بہر نوع۔ ہدایت کی ذمہ داری اگر ایسے انسانوں کے سپرد کر دی جاتی تو خدا جانے کیا ہوتا۔۔۔۔۔ لہذا۔ اللہ نے فرمایا۔

”میں جس طرح چاہوں ہدایت کروں۔ آخر تمہارا پیدا کرنے والا ہوں، تم میرے پاس لوٹ کر آؤ گے، تم میرے سامنے جوابدہ ہو۔ میں ہی تمہاری ہدایت کا کام کروں گا۔ تم جو اپنی طرف سے تجویزیں پیش کرو گے وہ کہیں نہ کہیں جا کے ختم ہو جائیں گی۔ لہذا انسانی ہدایت کا کام مجھے کرنے دو۔ میرے کام میں مداخلت نہ کرو۔“

مگر انسان خدا کے ہر کام میں مداخلت کرتا رہتا ہے۔ خدا کی بتائی ہوئی بات کی طرف انسان اس لئے تو جہ نہیں دیتا کہ چونکہ مزاج میں سرکشی و آزادی ہے۔ اور کسی کی بات نہ مانتا انسان اپنی آزادی کے منافی سمجھتا ہے۔ گویا انسان خود کشی اور آزادی کی بنا پر ٹوکنے والے کو پسند نہیں کرتا اور نا ٹوکنے والے سے بڑا خوش رہتا ہے۔۔۔۔۔ اس لئے انسان نے کہا۔

”اللہ ٹوکتا بہت ہے۔ یہ کام نہ کرو۔ وہ کام نہ کرو، یہ نہ کھانا وہ نہ پینا ادھر نہ دیکھنا۔ ادھر نہ جھانکنا۔ لہذا ایسے اللہ کو اللہ نہ مانو جو قدم قدم پر ٹوکتا ہو۔ ٹوکنے والے اللہ کو چھوڑ کر کسی نا ٹوکنے والے کو اللہ بناؤ۔ اور بناؤ بھی ایسا“ بے حسے“ جس میں ٹوکنے کی طاقت ہی نہ ہو اور اگر اس میں حس بھی ہوگی تو چونکہ ہمارا بنایا ہوا ہو گا۔ اس لئے ہمیں ٹوکنے کی جرات نہیں کرے گا۔

بلکہ اسے ڈر رہے گا کہ:-

انہوں نے مجھے بنایا ہے اگر ٹوکوں گا تو یہ بگاڑ بھی دیں گے
چنانچہ ہم اللہ بنانے بیٹھ گئے۔ وہ "اللہ" بھی سمجھتے تھے کہ اگر
ٹوکیں گے تو ہماری آبرو جائے گی لہذا "بت بنے" بیٹھے رہے۔
کیا مجال جو کسی کو ٹوکتے تھے۔ آرام سے بیٹھے رہے۔ لوگوں نے سوچا
"اللہ تو ہم نے بنا لئے اب ان کے لئے کوئی گھر بھی ہونا چاہیے"۔
چنانچہ وہ اپنے بنائے ہوئے "اللہ" کو اصلی اللہ کے گھر میں رکھ کر
مطین ہو گئے کہ دس بیس سال اللہ کے گھر میں رہ کر آدھے تہائی کچھ تو
اللہ ہی جائیں گے۔

سَامِعِیْنَ !

چار سو سال کے بعد ہم نے جو دیکھا تو وہی بت کے بت —
ہم نے پوچھا "السانوں کے بنائے ہوئے اللہ! بیت میں رہ کر
بھی تمہیں ابھی تک اہلیت نہیں آئی"۔

السان کے بنے ہوئے اللہ نے جواب دیا "اگر واقعی تم میں بنانا
بنانا چاہتے ہو تو ایسا کرو کہ اللہ کے گھر میں ذرا سی زمین کھود کر یہیں
گاڑ دو۔ گڑنے کے بعد ہم ٹھیک ہو جائیں گے۔ اور اگر ہم ٹھیک
بھی نہ ہوئے تو کوئی بات نہیں۔ تم یہ تو کہہ سکو گے کہ:-
"ہمارے اللہ وہ ہیں جو خدا کے حرم میں گڑے ہوئے ہیں"

سَامِعِیْنَ !

ایک دن عالم تصور میں، میں اُن گھر والوں سے بائیں کر رہا تھا۔
"اے انسانوں کے بنائے ہوئے اللہ! تم یہاں بیٹھے ہو؟

"ہاں"

اللہ بنے؟

”نہیں — بنے تو نہیں، ہوئے ہیں“

یہ لوگ تمہیں اللہ سمجھتے ہیں؟

”ہاں سمجھتے ہیں“

تم میں کوئی کمال ہے؟

”صاحب! بے کمال بھی کوئی مانتا ہے۔ ہم میں بڑا کمال ہے“

تم میں کیا کمال ہے؟

بتوں نے جواب دیا: ”تم میں بت سمجھتے ہو؟ سمجھا کرو۔ پتھر سمجھتے

ہو؟ سمجھا کر۔۔۔ جو چاہو سمجھو۔۔۔ مگر

ایک کمال ہے ہم میں۔ خود نہیں جاہیں گے۔ کوئی اٹھا کر میدان

جنگ میں لے جائے۔ پھر جتنے تمہاری سائنس کے ایجاد کردہ

اسلحہ ہیں وہ استعمال ہوں۔ ٹینک سے ٹینک ٹکرائیں۔ ہوائی جہاز

سے بم برسیں۔ میدان میں لے جانا تمہارا کام ہے۔ اگر میدانے چھوڑ

کر بھاگیں تو ہمیں پکڑ لو۔ چاہیں ٹکرے ہو جاہیں، چاہے چور چور

ہو جاہیں مگر میدان چھوڑ کر ہم نہیں آئیں گے۔ ہم میں

اتنا کمال ہے۔ ہماری اس ادا پہ دنیا مرتی ہے“

بہر نوع۔ ناٹوکنے والے فدا۔ اللہ کے گھر میں بیٹھ گئے۔ کوئی پونے لے

تو شاہاش نہیں کہتے۔ کوئی توڑ دے تو برا نہیں کہتے۔ ادھر انسان بھی بہت خوش

ہے کہ یہ بچارے ہمارے بنائے ہوئے ہیں لوگ بھی نہیں کہتے۔

محترم سامعین!

جس قوم کی دس بیس نسلیں بنا ٹوکنے والے خدا کی صحبت میں گزر چکی

ہوں وہ اگر آج انہیں چھوڑ بھی دیں اور ٹوکنے والے کو ماننے لگیں

تو یہ ناممکن ہے کہ ایک دم صدیوں پرانی عادت ختم ہو جائے گی۔ بلکہ اس

عادت کو چھوڑنے کے لئے تو کافی مدت چاہیے، بھلا عورتوں کی عادت ختم ہو سکتی ہے

گویا _____ جب ایسی دو چیزیں سامنے آئیں گی۔ جن میں سے ایک ہو بولنے اور لٹوکنے والے اور ایک ہونا بولنے اور نالٹوکنے والی تو نبوت پرستی کی عادت یہ کھلوا دے گی _____ کہ
 "ہمیں نالٹوکنے والی کافی ہے۔"

اللہ کہتا ہے _____ "ہدایت میری طرف سے ہوگی۔ تم مالو نہ مالو۔ تمہیں ماننا پڑے گا اور _____ دیکھو! میں لٹوکتا ہی نہیں بلکہ دو ٹوک بات بھی کرتا ہوں

کیا مجال جو میری بات میں کہیں نقص آجائے۔ میری ہر بات غلطی سے متبرا ہوتی ہے۔ میری کسی بات میں شک و شبہ ہو سکتا ہی نہیں۔

مسلمانو! تم بھی کیا یاد کرو گے کہ تمہاری ہدایت کے لئے میں نے وہ جہاد بھی بھیجا ہے جس کا کمال یہ ہے کہ دنیا کے ہادی بھی اس کے ماتحت ہیں۔ تمہیں اس رسول کے کلمہ پڑھو ادا ہے جس کی امت ہونے میں تمام انبیاء و فرج کرتے ہیں۔ یہ گویا شہنشاہ ہوا اور وہ بادشاہ اس کی رعایا میں تمہیں شاید یاد نہیں۔ ہم نے تمام انبیاء سے میثاق لیا ہے جس طرح ایک ذمہ دار اپنے عہدہ کا چارج سنبھالنے سے پہلے حلف اٹھاتا ہے۔ اسی طرح ہم نے ہر نبی سے حلف اٹھوایا ہے کہ:

"تمہارے بعد ایک نبی آئے گا۔ تم اس پر ایمان لانا اور اسکی

اولاد کی مدد بھی کرنا۔" قرآن

چنانچہ انبیاء کے حلف اٹھانے کے بعد اللہ نے کہا:

"تم مجھے گواہ بناؤ۔ مجھے ضامن بناؤ کہ تم اس حلف سے ٹکر تو نہیں جاؤ گے"

سامعین!

خدا کے فضل و کرم سے ہم سب مسلمان ہیں اور ہر نبی کو مانتے ہیں۔ آدم سے لیکر خاتم تک ہر نبی کی نبوت کے قائل ہیں۔ فرق اتنا ہی ہے کہ اور نبیوں کیلئے

کہتے ہیں " فقہ " اور محمد کے لئے کہتے ہیں " ہے "۔ آج سے لاکھ سال بعد محمد کا ذکر آئے گا جب بھی کہیں گے " ہے " یہاں " فقہ " آتا ہی نہیں۔ یہاں " تھے " کا سوال پیدا ہوتا ہی نہیں۔ لہذا محمد " ہے " اور جو ہے اس سے مدد مانگنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ مدد سے تو وہ روکے جو " فقہ "۔ مگر محمد آج بھی ہے اور ہمیشہ ہے اگر ہم کلمہ پڑھیں گے تو اس کے بھی یہی معنی ہیں۔ " محمد اللہ کے رسول ہیں "..... باقی انبیاء تھے " اور اگر کوئی یہ صد کرے کہ محمد اللہ کے رسول تھے۔ تو اس " تھے " کو روکنے کے لئے اللہ نے " مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ " کا دامن " لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ " سے بھر دیا۔ تاکہ کہیں بیچ میں " تھے " نہ آجائے۔ " لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ " کے معنی بھی یہی ہیں۔ کہ اللہ " وَ اَخَذَ الْاَشْرِيْكَ " ہے۔ اور اگر اللہ واحد لا شریک ہے تو محمد اللہ کا رسول ہے..... اور اگر محمد اللہ کے رسول تھے۔ تو پھر یہ کتنا بڑے گاکہ " اللہ بھی واحد لا شریک تھا "۔..... وہ " ہے " تو یہ بھی " ہے "۔

پیارے سامعین!

" کلمہ طیبہ " چار لفظوں کو جوڑ کر بنا لیا گیا ہے۔

لا — الل — الا — اللہ

پہلا حرفت کہو " لا " جس کے معنی ہیں " کچھ بھی نہیں "۔ لہذا پہلا کچھ بھی نہیں۔ دوسرا جوڑو " لا اللہ "۔ " اللہ نہیں ہے " گو یا کفر ہو گیا۔

تیسرا جوڑو " لا اللہ الا "۔ " اللہ نہیں ہے مگر " یہ معنی ہو گیا۔

پہلا " لا " کچھ بھی نہیں۔ دوسرا " لا اللہ "۔ کفر ہو گیا

تیسرا " لا اللہ الا "۔ معنی ہو گیا۔ جب چوتھا " اللہ " ساتھ جوڑو

گئے۔ تو ایسا نہ ہو جائے گا۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ — اب ایمان ہو گیا

علمائے کرام !

خدا تمہارے علم و فضل میں برکت عطا فرمائے۔ مجھ غریب شہر کی بات

بھی سن لیا کرو۔

اسم جلال کی قسم جو اسلام میں کہلاتی ہے۔ اگر کوئی جھوٹی اٹھالے تو تقریباً گھر ہو جائے۔ اور اگر سچی اٹھالے تو تین روزے رکھے جب وہ درست ہو سکتا ہے۔ اتنی باعزت ہے قسم جلال _____ جس طرح بڑے سے بڑا چور مسلمانوں کی پنجائیت میں اگر کلمہ پڑھ کے کہدے۔

”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ“

”میں نے چوری نہیں کی“

لہذا مسلمان اس چور کو چھوڑ دیں گے۔ قسم جلال اٹھا کر جو کہہ رہا ہے اگر اب

بھی نہیں مانیں گے تو ہم مسلمان نہیں رہیں گے _____ سگویا

جس بات کا پورا یقین ہو جائے (وہ چاہے کلمہ میں داخل ہو یا نہ ہو اس جھگڑے میں نہ پڑو) وہ جب بیان کرو تو کلمہ پڑھ کے بیان کرو قسم جلال اٹھا کر بیان کرو تاکہ سُننے والا اگر نہ مانے تو کافر ہو جائے۔

لہذا ہمیں اتنا یقین ہے علیؑ کی ولایت کا۔ ہم یونہی نہیں کہہ دیتے بلکہ قسم جلال اٹھا کر اعتراف کرتے ہیں۔ مسلمان ہو تو ماننا پڑے گا۔

کعبہ میں کہلو الو۔ مسجد میں کہلو الو۔ منبر پر کہلو الو۔

”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ“ ”عَلِيٌّ وَوَلِيُّ اللَّهِ“

سامعین !

ابراہیم بھی یہی کلمہ پڑھتے تھے۔ موٹے کے زمانے میں بھی یہی کلمہ تھا۔

ورنہ یہ تو محاورے کے طور پر مشہور ہو گیا ہے کہ ابراہیم کے زمانے میں یہ کلمہ تھا۔

”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ (بُورَهِيمِ خَلِيلِ اللَّهِ“ ”يَا مُوسَى كَلِمَةَ اللَّهِ“

”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ ”مُوسَى كَلِمَةَ اللَّهِ“۔ حالانکہ ہر نبی کے زمانے میں کلمہ

تھا جو ہم پڑھ رہے ہیں۔۔۔۔۔ ہر نوع۔ سب انبیاء امتی تھے۔ اور امتی کو اپنا کلمہ پڑھوانے کا حق ہی نہیں ہے۔ لہذا انبیاء وہی کلمہ پڑھتے تھے جو ان کا بھی رسول تھا۔ اگر ان انبیاء پر بھی کوئی مشکل آن پڑتی تھی تو محمد سے کہتے۔

”مشکل آتی ہے۔ ہماری مدد کرو“

لہذا محمد کے پاس جو مددگار تھا۔ وہی ان کی مدد بھی کیا کرتا تھا۔

لطف آجائے گا نیت میں جب اللہ نے عام آواز دے دی۔ محمد کی امت

آجائے

مومن بھائیو! _____ دیکھنا کس شان سے تم وہاں جاؤ گے تم میں سے کسی کا ہاتھ ابراہیم کے ہاتھ میں ہو گا۔ کوئی موٹے سے بانیں کرتا جا رہا ہو گا۔ کوئی یوسف کے گلے میں باہیں ڈالے چل رہا ہو گا۔ اس لئے کہ ہم سب پیر بھائی جو ہوئے۔ ایک ہی نبی کی امت جو ہوئے۔ ایک ہی رسول کے کلمہ کو جو ہوئے۔

سامعین!

اگر آدم کھڑے ہوں رسول کے سامنے تو ان کا اور رسول کا کیا رشتہ ہو گا؟

”مومن“ _____ گویا آدم مومن ہیں۔ نوح مومن ہیں۔ ابراہیم مومن ہیں۔ موسیٰ مومن ہیں۔ عیسیٰ مومن ہیں۔ عرض ہر نبی مومن ہے۔ اور اگر سارے انبیاء اکٹھے ہو جائیں تو مومنین کہلائیں گے۔

بسے بھائیو! _____ یہاں تک تو میں نے کہہ دیا کہ ایک نبی

ہو تو ہے مومن اور اگر سارے انبیاء مل جائیں تو ہیں مومنین۔ اب آپ مجھے سوچ کر بتائیں کہ جس نبی کی امت میں یہ مومنین ہوں تو ان مومنین کا امیر المومنین کون ہو گا۔ جہاں آدم سے لیکر عیسیٰ تک مومنین ہوں گے وہاں امیر المومنین کون ہو گا؟ جسے آدم بھی تسلیم کر لیں۔ نوح بھی تسلیم کر لیں۔ اور ابراہیم بھی مان جائیں کہ ”یہ ہمارا امیر المومنین ہے“

بزرگانِ من !

”امیرالمومنین کا سوال آج نیا نہیں پیدا ہوا بلکہ آئیہ میثاق کے فوراً بعد پیدا ہو گیا تھا کہ جب انبیاء مومنین ہیں تو امیرالمومنین کون ہوگا؟“
رسولِ جواب میں یہی فرماتے۔ ”جس نے انبیاء کو میرا امتی بنا یا ہے اسی سے پوچھ کر بتاؤں گا“ ادھر رسول کے پاس پوچھنے کا ذریعہ جبرئیل تھا۔ ایک دن رسول نے جبرئیل سے کہا:-

”جبرئیل ! اللہ سے یہ پوچھ کر آنا کہ میرے بعد میری امت کا امیرالمومنین کون ہوگا۔“

جبرئیل سدالمنتهی پر پہنچا۔ اللہ نے پوچھا۔

”جبرئیل کیا بات ہے؟“

جبرئیل نے عرض کی ”خداوند! تیرا حبیب پوچھتا ہے کہ میرے بعد امیرالمومنین کون ہوگا؟“

اللہ نے غصہ میں جواب دیا۔ ”جبرئیل ! ان معاملات میں تم دخل نہ دو۔ اپنی حیثیت میں رہو۔“

جبرئیل واپس زمین پر پہنچے۔ عرض کی

”یا رسول اللہ ! اللہ مجھے تو کچھ بتاتا ہی نہیں۔“

آخر رسول نے کہا ”خداوند! جبرئیل کے ذریعے تو بتانا نہیں۔ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ مجھے بتانا پڑتا ہے۔ تو ہی بتا دے کہ امیرالمومنین کون ہوگا؟“

اللہ نے کہا ”محمدؐ سنتے بھی ہو! ایسی باتیں ان ذرائع سے نہیں پہنچائی جاتی۔ اگر پوچھنا ہی چاہتے ہو کہ امیرالمومنین کون ہوگا۔“

تو کسی رات تھوڑا سا دقت نکال کے ہمارے گھر آؤ وہاں تمہیں فرصت میں بتایا جائے گا کہ امیرالمومنین کون ہوگا۔ تم اس کا لہجہ پہچان لینا اس کے ہاتھ پہچان لینا۔ اس کی گفتگو پہچان لینا۔ آؤ نا ہمارے پاس

چنانچہ امیر المومنین پوچھنے کے لئے محمد اللہ کے گھر تشریف لے گئے
گو یا امیر المومنین پوچھنے جانا ہی محمد کی معراج تھی — رسول پوچھ
کر واپس آئے۔ لوگوں نے پوچھا:

”محمد! پوچھ آئے؟“

فرمایا ”ہاں۔ پوچھ آیا“

”جسم سے گئے تھے یا خواب میں گئے تھے؟“

سامعین!

ہم پاکستان میں رہنے والے جاہل لوگ۔ ہمیں کیا معلوم کہ رسول گئے
تھے یا نہیں گئے تھے۔ ہم تو ان ہی لوگوں سے پوچھیں گے جو گرد و پیش تھے
چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں ”مجموعہ جسم گئے تھے۔“ اور
ایک خاتون کہہ رہی ہیں ”نہیں۔ گئے تو تھے مگر خواب میں گئے تھے“
اب وہ بھی صدیق — یہ بھی صدیقہ — ہم کس کی مانیں اور کس کی
مانیں۔ آخر مجبور ہو کر رسول سے ہی پوچھتے ہیں: ”قبلہ! کیسے گئے تھے؟“
رسول نے کہا ”بھگڑے میں کیوں پڑتے ہو۔ تم خود سمجھ لو کہ میں کیسے گیا
تھا؟“

دیکھو نا!

یہ معراج کی بات تو میں پھر بتاؤں گا کہ کیوں گیا تھا۔ اب صرف تمہارے
سمجھانے کو بتانا ہوں کہ نماز جو ہے یہ مومن کی معراج ہے۔
ابے بتاؤ! یہ نماز بری روح سے پڑھتے ہو یا روح و جسم دونوں
ہوتے ہیں؟

اگر نماز ہوتی ہے بری روح سے تو معراج بھی بری روح
کی ہوئی تھی اور اگر روح و جسم دونوں اکٹھے ہوتے ہیں تو معراج
بھی روح و جسم دونوں سے ہوئی ہے۔
لوگوں نے پوچھا۔ ”آپ نے وہاں جا کر کیا کیا؟“

فرمایا: اللہ نے میرے وہاں جانے کی تاریخ لکھ لی جس طرح
 بڑے بڑے واقعات کی تاریخ لکھی جاتی ہے۔ عرش پر میرے
 قدم گئے تو وہاں لکھ دیا گیا کہ "یہ عرش محمد کے قدموں کی بدولت معنی ہو گیا"
 بس بھائیو!

یادگار معراج کو اصطلاح میں "مُعَلّٰی" کہتے ہیں۔ چاہے وہ عرش معنی
 ہو یا زمین پر کوئی معنی ہو۔ محمد کو معراج ہو گی عرش پر، عرش معنی
 ہو گیا۔ اور بیٹے کو معراج ہو گی فرش پر۔ وہ معنی ہو گیا۔
 گویا نانا کے قدموں نے عرش کو عرش معنی بنا دیا اور نواسے کے سجدوں
 نے فرش کو کربلاء معنی بنا دیا۔

ایک روایت میں ہے کہ قیامت کے دن تمام زمین پارہ پارہ ہو جائے گی۔
 لیکن کربلا کی زمین بڑے آرام سے اٹھالی جائے گی۔ اصل مصلحت تو خدا جانتا ہے۔
 یا معصومین جانتے ہیں۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ زخمی کو بڑے آرام سے سٹریچر پر
 لے جایا جاتا ہے تاکہ کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

اللہ نے کہا، "کربلا کے زخمیوں کو تکلیف نہ دو بلکہ آرام سے اٹھا لو"

عزاء دار سید الشہداء!

کربلا میں ایک سے ایک بڑھ کر زخمی ہے۔ میں کس کے زخموں کا ذکر
 کروں؟۔ ماشاء اللہ تم صاحب اولاد ہو۔ خدا جانے تم میری بات
 سن بھی سکو گے یا نہیں۔؟

دیکھو نا! جب آل محمد آمریت کی تلواروں سے نہ

کٹ سکے تو ان کے پروردہ مؤرخین نے اپنے زہر آلود قلم سے

آل محمد کا قتل کرنا شروع کر دیا۔ اور تاریخ میں لکھ دیا گیا کہ:-

اٹھارہ بنی ہاشم کربلا میں شہید کر دیئے گئے۔

بنی ہاشم، کالفظ مسلمانوں نے ہمارے خیال کو ادھر ادھر کرنے

کے لئے لکھ دیا ہے۔ حالانکہ ”بنی ہاشم“ کی اولاد تو وہ بے شک تھے۔ ”بنی ہاشم“ تو بہت وسیع اولاد تھی۔ مگر کربلا میں جو اٹھارہ شہید ہوئے وہ صرف اٹھارہ آلہِ اچھے طالب تھے۔ گویا۔ بنی ہاشم کہہ کے ہمارے خیال کو ابی طالب سے ہٹایا جانا۔ کربلا میں حسین بھی فرماتے تھے۔ ”یہ میرے دادا کی اولاد ہیں“ آج ابی طالب کے اس فرمان کی تعمیل ہو رہی تھی کہ ایک دن بھتیجے محمدؐ کو بہت پریشان دیکھا تو گلے سے لگا کر فرمانے لگے۔

”محمدؐ! فکر نہ کر۔ گھبرا نہیں۔ پریشان نہ ہو۔ جب تجھ پر یا ترے دین پر کوئی خوف آئے گا تو ترے دین کے گرد میری اولاد کی لاشیں پڑی ہوئی ہوں گی“

مسلمانو!

انصاف چاہتا ہوں۔۔۔ بتاؤ۔ اللہ نے ابی طالب سے کتنا بڑا کام لیا ہے۔ یہ عجیب حادثہ ہے کہ دین اللہ کا پھیل گیا۔ کلمہ محمدؐ کا پڑھا گیا۔ اور کنبہ غریب ابی طالب کا کٹ گیا۔ بزرگ ہو! اگر کنبہ کے کٹ جانے پر بات ختم ہو جاتی تو شاید بات ہی ختم ہو جاتی۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ۔

دین بچ گیا اللہ کا۔ کلمہ پڑھا گیا محمدؐ کا اور بہو بیٹیاں قید ہو گئیں غریب ابی طالب کی۔ کتنا بڑا کام لیا ہے اللہ نے ابی طالب سے۔

بہر نوع۔ اٹھارہ آلہ ابی طالب کربلا میں شہید ہوئے۔ کسی کا کلیجہ زخمی ہو گیا کسی کی پیشانی زخمی ہو گئی۔ کسی کے بازو زخمی ہو گئے۔ کسی کا گلہ زخمی ہو گیا۔ مگر ایک زخمی ایسا بھی ہے جس کا پتہ نہیں چلتا کہ اس کو کہاں کہاں زخم آئے۔ تمام شہیدوں میں سب سے زیادہ نازک مزاج شہزادہ ”قاسم“ چونکہ بچپن میں ہی یتیم ہو گئے تھے لہذا یتیم بھتیجے کو حسین نے اتنے لاڈ و پیار سے

پالا تھا کہ دیکھنے میں تیرہواں سال تھا مگر جب کھانا کھانے بیٹھتا تو ماں نوالے کھلایا کرتی تھی۔ بازیک سے بازیک لباس پہناتے تھے۔ تیسرے سال کے بچے کو حسین گود میں اٹھاتے تھے۔ کبھی دھوپ میں نہ نکلنے دیا۔ اکبر و اصغر کی اور بات تھی اور اس یتیم بھتیجے کی اور بات تھی۔ اتنا نازک مزاج شہزادہ میدان کی طرف جا رہا ہے۔ حسین نے گود میں لیکر گھوڑے پہ بٹھایا اور فرمایا:-

”بیٹا قاسم! جاؤ۔ خدا حافظ“

قاسم میدان جنگ کی طرف روانہ ہوئے مساتھ ساتھ قمر بنی ہاشم جناب عباس غازی میدان کے قریب تک چلتے رہے۔ قاسم کا جہاد شروع ہو گیا عباس ریت کے ٹیلے پہ کھڑے ہو کر شہزادے کو ہدایات دیتے رہے:-

”بیٹا! باگ سنبھال کے رکھنا۔“

”شہزادے! تلوار مضبوطی سے پکڑے رکھنا۔“

بہر نوع۔ شہزادہ لڑتا ہوا فوجوں کے بیچ میں چلا گیا۔ اور اس ہنگامہ دار الکر میں گھوڑے سے گرا۔ قاسم کے گرنے کا انداز ہی کچھ اور تھا۔ ہر گرنے والے نے ماتم کو پکاسا ”مؤلا! میں گر گیا“..... مگر قاسم کے بچپن کی ادا یہ تھی کہ جب یہ گرا ہے تو مؤلا کو نہیں پکارا بلکہ گرتے ہی کہا..... ”اماں۔ میں گر گیا“ حسین لاش پہ پہنچے بیٹا قاسم! مجھے معاف کرنا۔ میں ذرا دیر میں پہنچا ہوں۔

”بیٹا! تیری میت تو اٹھانے کے قابل نہیں“

امام دمان زیارت ناحیہ میں فرماتے ہیں:-

”میرا سلام ہو اس شہید پر جسکی دائیں طرف کی پسلیاں ٹوٹ کے بائیں طرف آگئیں اور بائیں طرف کی پسلیاں ٹوٹ کے دائیں طرف آگئیں۔“

گویا اتنا نازک شہزادہ زندگی ہی میں گھوڑوں کے سموں سے پامال ہو گیا۔ اماں نے لاش کے ٹکڑے عباب میں رکھے اور لاکر گنج شہیدوں میں ملی اکبر کی لاش کے ساتھ گھڑی رکھ دی اور دونوں لاشوں کے بیچ میں بیٹھے۔

ایک ہاتھ تاسم کی لاش پر اور ایک ہاتھ علی اکبر کی لاش پر رکھ کر آسمان کی طرف
 رخ کر کے حسین نے بلند آواز میں کہا۔ " وَ غَرِبْنَا "

"یا اللہ! میں غریب ہو گیا۔" ~~میرا اکبر نہ ہا نہ میرا تاسم ہا~~
 سَامِعِينَ!

کربلا معلیٰ میں جہدی نانی ایک ڈاکر تھے۔ وہ روزانہ حرم میں آتے اور
 صبح کی نماز کے بعد مٹولا کی ضرب کے پاس کھڑے ہو کر تھوڑی دیر
 کے لئے مجلس پڑھا کرتے۔ لوگ روتے رہتے۔ یہی گویا نماز کے بعد
 وہاں کا وظیفہ تھا۔ ایک دن مجلس میں انہوں نے یہ مضمون پڑھا
 کہ ————— جب تاسم کی لاش کے ٹکڑے اٹھا کر حسین گنج
 شہیداں میں لائے۔ ایک ہاتھ اکبر کی لاش پر اور ایک ہاتھ تاسم
 کی لاش کے ٹکڑوں پر رکھ کر حسین نے بلند آواز میں فرمایا:

"وَ غَرِبْنَا" "یا اللہ! میں غریب ہو گیا"

کربلا حرم۔ جہدی کا پڑھنا۔ صبح کا وقت۔ بڑا اگر یہ ہوا۔

اس کے بعد لوگ گھر چلے گئے اور جہدی بھی اپنے گھر چلا گیا۔ دوپہر
 کا کھانا کھانیکے بعد سو گیا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک بونقبہ
 پوش خاتون گھر میں آئی اور جہدی سے فرماتی ہیں۔

"شیخ جہدی! تو نے آج جو روایت حرم میں پڑھی ہے نا۔
 پھر دوبارہ کبھی نہ پڑھنا۔"..... جہدی پوچھتا ہے "بی بی! کیا یہ
 روایت غلط ہے؟"

بی بی نے فرمایا "نہیں۔ صحیح ہے۔ مگر جب سے تم نے یہ روایت
 پڑھی ہے اس وقت سے میرا حسین بے ہوش پڑا ہے۔"
 اللہ ہماری مجلسوں کو قبول و منظور فرمائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ
 اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

درد نہ محبت والے کو "کیڑے" معلوم ہی نہیں ہوتا۔ ہر ایک کا اپنا دل ہے۔
 جدھر آگیا۔ آگیا۔ اس میں بھگڑنے کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ کسی کو تخت پر بیٹھنے
 والے سے محبت ہو گئی۔ کسی کو بوریا نشینوں سے محبت ہو گئی۔ کسی کو قید کرنے والوں
 سے محبت ہو گئی اور کسی کو قید ہونے والوں سے محبت ہو گئی۔ گو یا جس کا دل جہاں
 مائل ہو گیا۔ محبت ہو گئی۔ محبت ہو جانے کے بعد محبت کرنے والے کو ہوش تک
 نہیں رہتا۔ چنانچہ عالم بے ہوشی میں ظہور محبت ہوتا ہے۔ مثلاً کپڑے پھٹ گئے۔
 گریبان چاک ہو گیا۔ دیکھنے والے ہنسنے لگے اور کہنے لگے "یہ تو پاگل ہے، دیوانہ
 ہے" گو یاد لیانگی ہی کمال محبت ہے۔

میرے سامعین!

محبت کی قسمت میں دو چیزیں لازمی ہیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ ادھر محبت ہوئی
 ادھر محبت نہ کرنے والوں کو محبت کرنے والے سے خلیق ہو جاتی ہے۔ بلاوجہ کا
 اعتراض شروع ہو جاتا ہے جس طرح محبت کے ساتھ اگر ایک گھوڑا نکل جائے تو ہزاروں
 اعتراض کئے جاتے ہیں اور اگر ریسٹ میں ہزاروں گھوڑے درڑتے ہوں تو کوئی نہیں چٹھا
 سامعینے! اللہ جانے میں نے تو ریس دیکھی نہیں ہے۔

منا ہے کہ دن بیس گھوڑے ایک لائن میں کھڑے کر دیئے جاتے
 ہیں اور ایک آدمی کے ہاتھ میں زرد مال ہوتا ہے اور وہ کہتا ہے،

"ایکے" گھوڑے تبار ہو گئے

"دو" اب انہوں نے پاؤں اٹھائیے

"تین" وہ گھوڑے دوڑ پڑے۔

میں پوچھتا ہوں "بات کیا ہے؟ تم نے کبھی پاتھ کہہ کے نہیں دوڑائے
 چار کہہ کے نہیں دوڑائے۔ جب بھی دوڑاتے ہو "تین" ہی کہہ کر
 دوڑاتے ہو۔ آخر اس عدد کی خصوصیت کیا ہے؟

بہر ذرا۔ محبت پہ اعتراضات ہوتے ہیں۔ اور محبت کرنے والے میدان

محبت میں اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ پرانے زمانے کا قہقہہ ہے جسے قرآن نے بھی
 احسن القصص قرار دیا ہے کہ جناب یوسف سے زینجا کو محبت ہو گئی۔ اب اس
 محبت میں رات بھرا ہیں بھرتی ہے تو زینجا پریشان ہے تو زینجا!۔ مگر مصر کی رہنے
 والی ساری عورتیں کہہ رہی ہیں کہ ”زینجا کو کیا ہو گیا ہے۔ زینجا کو یوسف سے محبت
 کیوں ہے؟“

اب ان سے کوئی پوچھے ”تمہیں کیا تکلیف ہے“

بہر نزع۔ زینجا بھی روز سنتی کہ میری محبت پر اعتراض ہو رہا ہے۔ حاکم وقت
 تھی۔ غصہ تو بڑا آیا مگر اس نے کیا ”غصے سے کام نہیں چلے گا۔ پہلے ان اعتراض
 کرنے والوں کو گھر بلاؤ اور تبرکات ان کے کھانے کا انتظام کرو اور جب وہ سب آجائیں
 تو پہلے انہیں کھلاؤ، پلاؤ۔ پھر ان سے کہو ”آپ کو کیا اعتراض ہے؟ اب وہ اپنا
 اعتراض بیان کریں گی۔ پھر جس سے آپ کو محبت ہے جن اداؤں کو آپ پسند کرتے
 ہیں۔ انہیں بھی دکھاؤ۔ پھر دیکھنا وہ محبت میں تمہارے ساتھ شامل ہوتی ہیں یا نہیں؟
 چنانچہ زینجا نے یہی طریقہ اختیار کیا۔ گھر میں دعوت کا انتظام کیا اور تمام اعتراض کرنے
 والی مصر کی عورتوں کو اکٹھا کر لیا۔ ان کو کھلایا پلایا۔ آخر ضروری تھیں۔ میٹھی میٹھی باتیں کر رہی
 تھیں۔ جب وہ سب کھانا کھا چکیں تو زینجا نے انہیں ایک ایک لیموں دے دیا اور
 ایک ایک چھری بھی ہاتھ میں پکڑا دی اور کہا۔

”دیکھو۔ اس چھری سے لیموں کو اس وقت کاٹنا جب تک یوسف تمہارے
 سامنے نہ آجائے“

اب وہ تمام عورتیں اس انتظار میں بیٹھی ہیں کہ یوسف کب آتے ہیں۔ تھوڑی دیر
 بعد زینجا نے ادھر سے اشارہ کیا اور ادھر مگرے کا پردہ اٹھا۔ یوسف باہر نکلے۔ ایک دم
 بجلی چمکی اور چھریاں چل گئیں۔ یوسف کو دیکھتی رہ گئیں اور بے ساختہ
 ان کے منہ سے نکلا ”ہم غلطی پر تھیں۔ یوسف واقعی محبت کرنے کے قابل ہے۔“
 بہر نزع۔ یوسف واپس چلے گئے۔ اور وہ عورتیں بھی اپنے اپنے گھروں میں

چلی گئیں۔ جب وہ گھر پہنچیں جب پتہ چلا کہ ہماری تو انگلیاں کٹ چکی ہیں۔
 ہم نے پوچھا "عورتو! وہاں تمہیں کیوں نہ پتہ چلا کہ تمہاری انگلیاں کٹ چکی ہیں؟"
 وہ جواب میں کہتی ہیں "محبت کے لگائے ہوئے زخموں کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ یہ زخم
 نہ کسی ڈاکٹر کے محتاج ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی طبیب کے محتاج ہوتے ہیں۔"
 میں کہتا ہوں "مصر کی عورتو! تم خوش نصیب ہو۔ نہ ہو ا ہمارے زمانے
 کا کوئی مفتی! در نہ فتویٰ لگا دیتا کہ اپنے جسم کو زخمی کرنا حرام ہے۔"
 مگر یہ پتہ نہیں کہ جمال محبت میں محو ہو کر اپنے بدن کو زخمی کر لینا ہی احسن القصص
 ہے۔ اللہ کی نظروں میں حسین ترین قصہ ہے۔
سَامِعِينَ!

اپنے اپنے یوسف کا اقبال ہے۔ کسی یوسف کا احسن اس حد کا ہے کہ وہ بذات
 خود سامنے آئے تو چند عورتوں کی انگلیاں کٹ جائیں اور کوئی یوسف اتنا حسین
 ہے کہ صرف اس کے تذکرے سے کروڑ ہا انسان اپنا جسم چھلنی کر دیتے ہیں۔ بہر نوع۔
 پہ اپنا اپنا اقبال ہے۔

دوسری خاصیت یہ ہے کہ آپ کو جس سے محبت ہو جائے کبھی ایسا ہو سکتا
 ہی نہیں کہ آپ کو تو اس سے محبت ہو مگر اسے آپ سے محبت نہ ہو۔ اسے بھی لازماً
 آپ سے محبت ہوگی۔ محبت ہمیشہ طریقین سے ہوتی ہے۔ غریب کو امیر سے محبت ہو
 جائے تو اسے بھی اتنی ہی محبت ہوگی۔ رعایا کو بادشاہ سے محبت ہو جائے تو اسے
 بھی اتنی ہی محبت ہوگی۔ ایک لگا کو قیصر سے محبت ہو جائے تو اسے بھی اتنی ہی محبت
 ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ اظہار نہ ہو سکتا ہو۔ مگر محبت ہوتی ہے۔ محبت کرنے والا۔
 آپ کی کسی زحمت کو بھی برداشت نہیں کرے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ
 ہو واقعی اور حقیقی محبت!

سَامِعِينَ! مصیبت یہ بن گئی ہے کہ جس دنیا میں ہم ہیں
 اس میں بغیر کسی لالچ، طمع یا غرض کے کوئی محبت ہے ہی نہیں۔ ایسی

محبت تو صرف اظہار محبت ہے۔ مثلاً ہم کسی ٹیکسی میں بیٹھے۔ ڈرائیور
 "جی حضور، کہہ کر استقیال کرے گا۔ ہم آپ کے لئے کھڑے ہیں۔ ہم
 آپ کے نوکر ہیں۔ پانچ روپیہ لینا ہیں"
 ہم نے کہا "بھئی، دو روپے لے لے"
 ڈرائیور کے تیور فوراً بدل جائیں گے۔ "آگے بڑھو میاں۔ کبھی ٹیکسی
 میں بیٹھا بھی ہے" اور اگر ہم نے حسبِ منشاء پیسے دے دیئے تو کہے گا
 "آپ حضور ہیں۔ آپ سرکار ہیں"
 بہر نوع۔ ایسی محبت لالچ اور غرض کی محبت ہے جسے ہم غلطی سے محبت
 سمجھ بیٹھے۔

ایک ہوتی ہے "ڈر کی محبت" جس طرح ایک رعایا کو اپنے حاکم سے محبت
 ہوتی ہے۔ "جناب آپ جیسا حاکم تو کوئی آیا نہیں۔ آپ تو بڑے عادل ہیں۔
 ہم لوگ آپ کے بڑے اطاعت گزار ہیں۔" اور جب بدل گیا تو فوراً
 "کہہ دیا" اچھا ہوا۔ نامراد دفع ہو گیا۔ بڑا راشی تھا۔ ایسی محبت ڈر کی محبت ہے
 قیسری محبت ہے وقتی اور فوری محبت! جس طرح ریل کے ڈبے میں مسافروں
 کی آپس میں محبت ہو جاتی ہے۔ اور جب اپنا اپنا اسٹیشن آتا ہے تو ہر مسافر
 محبت کو ساتھ لیکر اترتا جاتا ہے۔ بعد میں یاد ہی نہیں رہتا کہ وہ کون تھا۔ گویا دو دن
 سفر کی محبت بالکل غیر معتبر ہوتی ہے۔

لہذا ایسی محبتوں کا میں ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ واقعی اور سچی محبت ہو تو
 کبھی ایسا ہو سکتا ہی نہیں کہ دوسرے کو بھی آپ سے محبت نہ ہو جائے۔ گویا محبوب
 جتنا ہی شریف ہو گا۔ اتنا ہی آپ کے چاہنے کی قدر کرے گا۔

میرے سامعین!

اگر واقعاً آلِ محمد سے ہیں محبت ہے تو آلِ محمد کو بھی ہم سے زیادہ
 ہم سے محبت ہے۔ ہم تو اتنی محبت کر ہی نہیں سکتے جتنی وہم سے کرتے ہیں۔ وہ

فرماتے ہیں، "ہمارے چاہنے والو! ہمیں تم سے بڑی محبت ہے: گو یا دنیا کے پیر و مشرک کی بات اور ہے اور ہمارے ان محبوب پیشواؤں کی بات اور ہے۔ دنیا آج چاہے تو آزما کے دیکھ لے بے پیر تو دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔ ہر ایک لاکوئی تہ کوئی پیر و مشرک ضرور ہے۔ جس طرح ایک شخص پیر صاحب کی بیعت کرتا ہے، پیر صاحب آج سے آپ میرے پیر ہیں اور میں آپ کا مرید ہوں: فرمائیے، میرے ذمہ کیا کام ہے؟"

پیر صاحب فرماتے ہیں، "تیرے ذمہ کام یہ ہے کہ جب تنخواہ ملا کرے تو اس کا اتنا حصہ مجھے دیا کرنا۔ جب میرے سلام کو آیا کرے تو اتنا نذرانہ لایا کرنا۔ مرید پوچھتا ہے، "پیر صاحب! کبھی میرے گھر میں تشریف لاؤ گے؟" "ہاں آؤں گا۔ جب تیرے بیٹے کی شادی ہوگی یا تیرے گھر کوئی خوشی ہوگی۔ اور دیکھو! ایک کام تمہارے ذمہ اور ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب میلانام لیا کرے تو "رحمۃ اللہ عنہ" کہد یا کرنا تاکہ اللہ مجھ سے راضی ہو جائے۔"

اب مرید بیچارہ سوچتا ہے کہ پیر میں نے اس لئے بنایا تھا کہ اس کی ہزاروں خدمتیں کروں گا جس کی بدولت اللہ مجھ سے راضی ہوگا مگر مصیبت یہ بن گئی ہے کہ اپنے پیر سے اللہ کو راضی کرنا بھی مرید کے ذمہ پڑ گیا۔ بہر نوع۔ پیر صاحب نے کہد یا کہ میں جب آؤں گا جب تیرے گھر کوئی خوشی کی تقریب ہوگی۔ مگر میرے محبوب مشرکوں کو دیکھو! وہ ہر وقت اپنے چاہنے والوں کو نہیں بھولتے وہ تو یہ فرماتے ہیں، "ہمارے چاہنے والو! گھرانہ جانا ہم ہر وقت تمہارا لحاظ رکھتے ہیں۔ ادھر ہم عرض کرتے ہیں:-

"مولا! ہم آپ کے چاہنے والے ہیں۔ ہمیں محبت کا تو پورا دعویٰ نہیں ہے مگر اتنا دعویٰ ضرور ہے کہ آپ کے دشمنوں سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں۔ یہ امتحان آپ جب چاہیں ہم سے لے سکتے ہیں۔ لہذا ہم بھی چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے گھر تشریف لائیں!"

چنانچہ آل محمد فرماتے ہیں، "ہمارے چاہنے والے! ہم ضرور آئیں گے۔"

جب تیرے گلے نشی ہوگی جب بھی چاہے بلا لینا اور جب تجھ پر کوئی مشکل آپڑے تو جب بھی ہمیں بلا لینا۔ اور دیکھو! اگر تجھ میں بلا نے کی طاقت نہیں رہے گی۔ تیرا نزع کا وقت ہوگا جو سخت مشکل ہوگا وہاں تیرے بن بلائے ہم آجائیں گے تیرے سرہانے آجائیں گے۔ نکل نہ کر۔ گھبراتیں ہم ہر منزل پہ تیرا ساتھ دیں گے۔ کسی فرشتہ کی طاقت نہیں کہ ہمارے ہوتے ہوئے تجھ سے کچھ پوچھ جائے۔ یہ بات میرے مولانا کو ذکے منبر پہ بیٹھ کر فرمائی تھی کہ:

”اُس وقت تک کوئی مر ہی نہیں سکتا جب تک میں سرہانے نہ آ جاؤں“

سامعین!

مولانا جب یہ فرما چکے تو ہمدان کے رہنے والے حارث نانی آدی نے سوال کیا

”سؤالا! وہ مرنے والا چاہے مومن ہو یا کافر؟“

فرمایا ”ہاں۔ میں ہر مرنے والے کے سرہانے آتا ہوں اور آ کے کہتا ہوں۔ سَلَامٌ عَلَیْکُمْ۔ میں آ گیا۔ تو نے ساری زندگی تکلیفیں اٹھائیں۔ لوگوں کے طعنے سنے۔ تجارت میں۔ ملازمت میں۔ ہر جگہ نقصان اٹھایا۔ مگر میرا دامن نہ چھوڑا میں بے دانا نہیں ہوں۔ اب میں آ گیا ہوں۔ اب تو میرے ساتھ ہے اور میں تیرے ساتھ ہوں۔ چنانچہ میری اس بات سے مومن اتنا خوش ہوتا ہے کہ وہ اپنی جان بطور نذرانہ مجھے پیش کر دیتا ہے۔ لہذا میں مومن کو مرنے نہیں دیتا بلکہ اسے کہتا ہوں۔ ”میرے چاہنے والے! میں نے تجھے حیاتِ جاہد بخش دی۔ اب تو میرے ساتھ رہے گا۔ اور جب میں منافق کے سرہانے آتا ہوں کہتا ہوں۔ ”مجھے پہچانا۔ میں آیا ہوں۔ وہ نہیں آئے۔ ساری عمر مجھ سے باغی رہنے والے! اب بول کہاں جائے گا؟ بس میرا اتنا کہنا کہ وہ مر جاتا ہے۔“

پھر اُس حارث ہمدانی نے پوچھا ”سؤالا! کیا مومن نہیں مرتا؟“
فرمایا ”نہیں۔ تم قبرستان میں جا کر دیکھو۔ جب میرے والا مرتا ہے تو اُسے قبر میں لٹا کر کہا جاتا ہے۔ ”سن اور سمجھ“

یہ کہیں مردوں سے کہا جاتا ہے ؟ بلکہ یہ تو ان سے کہا جاتا ہے جو زندہ ہوں ۔
حضور والا !

لطف یہ ہے کہ ساری زندگی تو عربی کا ایک حرف نہ سیکھا مگر مرتے ہی ایسے
علاصہ ہو گئے کہ عربی میں بات ہو رہی ہے ۔
”سن اور سمجھ“ اس لئے کہ مرتے دم اس کے سر ہانے علم کے شہر کا درگھل گیا تھا
بہر نوع ۔ ہمارے پیشوا ہر مشکل میں ہمارا الحافز رکھتے ہیں ۔

سنا معین ! _____ بعض اوقات ہمیں غصہ بھی آ جاتا ہے
چونکہ ہمارے طرف تھوڑے ہیں اس لئے مولیٰ سے کہہ بیٹھے ہیں ۔
”مولیٰ ! اپنے دشمنوں کے پکارنے پر نہ آیا کرو ۔ یہ نامراد ساری
زندگی تو ہمیں تنگ کرتے ہیں مگر جب مصیبت پڑتی ہے تو آپ کو
پکارتے ہیں ۔ لہذا آپ نہ آیا کریں“

مولیٰ جواب میں فرماتے ہیں ”بیٹھا ۔ صبر کرو ۔ دیکھو نا ! ہم نے کب
اعلان کیا ہے کہ ہم ”عیش کشا“ ہیں ؟ ہم نے کب کہا ہے کہ ہم
”راحت کشا“ ہیں ؟ ۔ راحت و عیش میں وہ جسے چاہیں بلا لیں ۔
ہمارا تو اعلان ہی یہی ہے کہ ہم ”مشکل کشا“ ہیں گویا جس پر مشکل پڑ جائے
وہ ہمیں پکار لیا کرے ۔ ذرا انہیں بھی بلانے دو ۔ وہ بھی کیا یاد کریں گے
کہ کسی کو بلایا تھا ۔“

محترم سنا معین !

امیر المؤمنین کا فرمان تو آپ نے سن لیا ۔ اب ”مناقب شعرا“ کی ایک
روایت سماعت فرمائیے گا ۔

روایت میں ہے کہ جناب سیدہ طاہرہ فرماتی ہیں کہ امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب
ہر مرنے والے کے سر ہانے اس لئے آتے ہیں کہ بحیثیت ”ولی اللہ“ ان کا یہ
دلائل میں شامل ہے ۔ لہذا وہ اپنے عہدے کے اعتبار سے تشریف

ہیں۔ "اسے مرنے والے کو سنگھا دو" گویا اس کی رُوح خوشبو بن کے اُس پھول میں سما جاتی ہے۔

اب سیدہ فرماتی ہیں "ملک الموت اے جاؤ اس پھول کو اور قیامت کے دن اسے میرے سامنے پیش کرنا کیونکہ میرے بیٹے کا عزا دار تھا۔"

بہر نوع ہر مشکل میں محمد وآل محمد تشریف لاتے ہیں اور ہماری نفرت فرماتے ہیں۔
حضرات گرامی!

قیامت کے روز ساری دنیا اکٹھی ہوگی۔ جہاں تک روایتوں میں موجود ہے کہ حکم ہوگا "قیامت والو! سر جھکا کے آنکھیں بند کر لو" چنانچہ سب آنکھیں بند کر لیں گے سر جھکالیں گے۔ سانس تک رُک جائے گی۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھیں گے "کیا بات ہے؟" فرشتے جواب دیں گے "خاموش رہو۔ خاتونِ قیامت تشریف

لا رہی ہیں، چنانچہ سیدہ طاہرہ کی سواری گزرے گی۔ انبیاء اولیاء سب سر جھکائے خاموشی سے کھڑے رہیں گے۔ بنی بنی عرش الہی پر پہنچ کر فرمائیں گی۔ "خداوند! آج تیری عدالت کا دن ہے۔ میں زندگی میں دوسری دفعہ

عدالت میں آئی ہوں۔ ایک دفعہ دنیا کی عدالت میں گئی تھی۔ آج تیری عدالت میں آئی ہوں۔ میرے اللہ! آج تجھ سے فریاد کرنے آئی ہوں کہ اے

میرے گھر میں ایک دن میں بہتر قتل ہو گئے۔ میں نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ آج پہلی دفعہ میرا استغاثہ ہے، میری فریاد ہے۔"

ادھر سیدہ طاہرہ نے فریاد کی ادھر زلزلہ قیامت آگیا۔ روایت میں ہے کہ ابراہیم جیسا جلیل القدر پیغمبر قیامت کے خوف سے گھٹنوں کے بل کھڑا ہو جائیگا اتنی ہولناکی ہوگی۔ آخر تمام انبیاء درزتے ہوئے خاتم انبیاء کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔

"محمد! خدا کے لئے ہماری خبر لیجئے۔ سیدہ نے شکایت کر دی ہے۔ اللہ کو جلال آگیا، چنانچہ رحمت اللعالمین اپنی زریت کے ساتھ تشریف لائیں گے۔"

اور سیدہ کے سر پہ ہاتھ پھیریں گے۔ سیدہ فرمائیں گی "ابا حضورؐ ٹھہرو آج مجھے خدا سے فریاد کرنے دو"

سامعین !

یہاں تک تو آپ کی روایتیں ہیں۔ مگر جو میں اپنے تصور کی بات کہہ رہا تھا۔ وہ یہ ہے کہ ممکن ہے عدالت الہی سے یہ حکم ہو جائے کہ:

سیدہ ! تمہارا مقدمہ بجا ہے جس کا فیصلہ آج ہم سنائیں گے۔ مگر مثل کو مکمل کرنے کے لئے ہم چاہتے ہیں کہ کسی چشم دید گواہ کا بیان قلمبند کیا جائے۔ ہے کوئی تمہارے اس مقدمے کا چشم دید گواہ۔

بی بی فرمائیں گی "خدا وندا۔ اگر میرے بہتر شہیدوں کا آئینی گواہ چاہتا ہے تو چشم دید گواہ ہے میری بیٹی زینب۔ چنانچہ عدالت الہی سے تمام حورانِ جنت کو حکم ہو گا کہ شام میں زینب کے پاس جاؤ اور کہو کہ اماں نے عدالت میں مقدمہ کیا ہے اور تجھے گواہ کر کے بلایا ہے" چنانچہ حوریں جا میں گی۔ اور زینب اسی طرح عدالت الہی میں تشریف لائیں گے جس طرح کوفہ و شام کے بازار میں آئی تھیں۔ سر کھلا ہوا۔ ہاتھ بندھے ہوئے اور زین العابدینؑ ہمارے کپڑے ہونے قیامت میں منادی ہوگی۔

"لوگو! ہسٹ جاؤ۔ زینب آ رہی ہے" ادھر ہم سب دھڑکھڑے ہو کر آوازیں

"ہائے حسین، زینب اپنی سواری روک لے گی اور بھائی عباس کو حکم دے گی۔

"عباس بھائی! یہ سیر حسین کے ماتم دار ہیں۔ ان سب کو میرے سامنے لاؤ۔ میں انکی زیارت کرنا

چاہتی ہوں۔ چنانچہ ہم بی بی کے قریب ایک حلقہ میں کھڑے ہو جائیں گے۔ جناب عباس غازی اپنے علم کا پھر یہ کھول دیں گے "ہائے حسین، ہائے حسین" کی آوازیں بلند ہو جائیں گی۔ ماتم شبیر شروع ہو جائے گا۔ پھر چانک ایک غیبی آواز آئے گی۔ بس۔ قیامت ہو گی۔

ماتم داروں کو ایک طرف کر دو اور تماشا میوں کو ایک طرف کر دو۔

اللہم! مودۃ محمد و آل محمد عطا فرمائے

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

حَسْبِنَا اِسْلَامٌ



خداوند عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام
سامعین کرام!

تم ایک ایسے دین کے ماننے والے ہو، تم ایک ایسے طریقے پہ چلنے والے ہو، تم
ایک ایسے ضابطے کے پابند ہو۔ تمہارا ایک ایسا آئین ہے، تمہارا ایک ایسا دستور ہے
تمہارا ایک ایسا نظام ہے۔ تم ایک ایسے آئین میں رہتے ہو کہ دنیا بھر کے آئین جو
آئینہ دکھا کے شرمناک جاتے ہیں۔ دنیا بھر کے دستور جس کے سامنے حسب دستور
خاموش ہو جاتے ہیں۔ دنیا بھر کے ضابطے جہاں آ کے ضبط ہو جاتے ہیں اور
دنیا بھر کے عقل مندوں کو جہاں آ کے ضبط ہو جاتا ہے۔ تم ایسے دین کے ماننے
والے ہو۔

تمہارا دین! اللہ کا پہنچا یا ہوا آخری دین۔ خدا کا کیا ہوا آخری کلام
اللہ کا بھیجا ہوا آخری پیغام۔ خدا کی کی ہوئی آخری گفتگو۔ اللہ کی دی
ہوئی آخری کتاب۔ اللہ کا کیا ہوا آخری خطاب

لہذا تمہارا دین وہ دین ہے کہ اس کے بعد اللہ خاموش ہو گیا۔ کلام
کر کے جس کے بعد کلام ختم کر دیا۔ ایسے اچھے دین کے تم ماننے والے ہو
تمہارے دین کا نام ہے اسلام۔ تمہارا کام ہے دنیا کا انتظام۔ تمہاری
ہستی ہے عالم کا انتظام۔ تم ہوساری کائنات کے امام۔ دنیا کی سر
ہے تمہاری غلام۔ تمہارا ایسا عجیب و غریب بے مثل و عزیز دین ہے
اسلام۔

مخترم سامعین !

اگرچہ اسلام کی زندگی بڑی طویل ہے۔ آدم علیہ السلام نہ تھے اسلام تھا۔ کائنات کے ذرے نہ تھے اسلام تھا۔ گویا اسلام کی زندگی بڑی طویل ہے مگر ہمارے سامنے اس آفتاب کے ساتھ یہ اسلام عرب کی سرزمین سے آیا۔ مطلع عرب سے ایک آفتاب طلوع ہوا اور اپنی کرنیں عالم میں پہنچا میں اسکی شعاعوں نے قریب کی گھاٹیاں جھلکا میں ہندستان کے گنگا اور جہنا کو سیراب کیا۔ اس نے ریگستانوں کو سرسبز کیا۔ اس نے نجدوں کو آباد کیا۔ اس نے انسان کے بچھے ہوئے دل میں ایک نخلستان تازہ کیا۔ گویا عرب کی سرزمین سے ایک آفتاب ابھرا۔ ایسا آفتاب کہ بے پڑھے لکھے جسے بے پڑھا کہتے ہیں۔ ان پڑھ جسے ان پڑھ کہتے ہیں اور اللہ جسے اُمی کہتا ہے۔ آج ہم اس آفتاب کا کلمہ پڑھتے ہیں اُسکے ہم غلام ہیں۔ اس کے نام کی بدولت ہم زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے اور محمد رسول اللہ اس کا نام ہے۔ بہ نزع۔ تم ایک دین کے ماننے والے ہو۔ اور وہ دین ہے اسلام جس میں سلامتی ہی سلامتی ہے۔ دنیا کی ہر شے اس میں موجود ہے گویا وہ تمہاری اپنی پسند ہے

دیکھو نا! بڈھا، جوان، بچہ، کوئی ایسا ہے جسے پھول پسند نہ ہو۔ پھول ایسی چیز ہے ناجس کو سب پسند کرتے ہیں۔ کیوں بچھو! پھول پسند ہے؟ جو انو! پھول پسند ہے؟ جو انوں اور بچوں کے بعد میں سفید داڑھی والے بابا سے پوچھتا ہوں "بابا! پھول پسند ہے؟" — ادھر بابا ہے کہ پھولا نہیں سماتا۔ گویا ہر ایک کو پھول پسند ہے۔ اب ہر ایک سے پوچھو کہ کونسا پھول پسند ہے؟ جتنے نوجوان ہیں وہ کہیں گے "جناب۔ میں تو دو پھول پسند ہیں۔ یا تو موتیا کا پھول جس کی خوشبو شباب میں لطف پیدا کرتی ہے یا زنگس کا پھول جس کو دیکھنے میں جوانی کا سوا آتا ہے۔ یہ تو نوجوان کی پسند ہے۔ اب ذرا بابا سے پوچھو "بابا! تمہیں کون سا پھول پسند ہے؟"

بابا جواب میں کہے گا "مجھے گلاب کا پھول پسند ہے۔ کیونکہ میں اس کا گلقد

بناتا ہوں۔ لہذا مجھے پسند ہے۔ اس کے بعد میں نے ایک بیچارے بھوکے سے پوچھا، "بھئی تجھے کون سا پھول پسند ہے؟"

بولتا، "بھئی، مجھے تو گوجھی کا پھول پسند ہے۔ پیٹ بھر جاتا ہے۔"

بہر نوع۔ ہر ایک کی اپنی اپنی پسند ہے۔ اس میں جھگڑنے کی کیا بات ہے۔ جسے آپ چاہیں پسند کریں۔ جسے میں چاہوں پسند کروں۔ کوئی جھگڑنے کی بات تو نہیں۔ جسے انبیاء چاہیں انبیاء پسند کر لیں۔ جسے اولیاء چاہیں اولیاء پسند کر لیں۔ اور جسے مومنین چاہیں مومنین پسند کر لیں۔ جسے بندے چاہیں۔ بندے پسند کر لیں اور جسے اللہ چاہے اللہ پسند کر لے۔ اس میں جھگڑنے کی کیا بات ہے۔ جو جس کو پسند آ جائے سبحان اللہ۔ بہر کیف ہمارا دین اسلام ہے جس میں دنیا کی ہر شے، ہر پسند موجود ہے۔ اس دین کا تعارف کروانے کے لئے اللہ نے محمدؐ کا انتخاب فرمایا۔ اور ہادی اعظم نے ہمیں ہدایت کی۔ ہم بت پرست تھے۔ خدا پرست ہو گئے۔ ہم جاہل تھے۔ عالم ہو گئے۔ ہم گڑبے تھے، پاسبان بن گئے۔ ہم بے ایمان تھے، صاحب ایمان بن گئے۔ ہمیں کچھ نہ آتا تھا، ہم سب کچھ جاننے لگے۔ ہم شاگرد بھی نہ تھے استاد بن گئے۔ گویا ہم نے عالم کی زمام اپنے ہاتھ میں سنبھال لی۔ دنیا کی حکومتوں کو الٹ پلٹ کیا۔ فیصلہ کسریٰ کے محل ہم نے پیروں تلے روند دیئے۔ ایران کے دجلہ و فرات میں ہم نے ٹھوڑے دوڑا دیئے۔ بحر ظلمات ہم سے کانپنے لگے۔ زمین و آسمان ہم سے ڈرنے لگے۔ فرشتے ہمیں سجدہ کرنے لگے۔ اور یہ اٹھی کے بتائے ہوئے علوم کی طاقت ہے کہ آج کا انسان چاند پر کند پھینک رہا ہے یہ کچھ اسی کی بتائی ہوئی باتیں ہیں۔ اب اٹھی بتانے والے نے ہمیں یہ بھی بتا دیا کہ دین اسلام ہے۔

اب اسلام کے بتانے والے نے اسلام کو پالنا شروع کیا۔ اللہ نے اس کے ذمہ یہ لگا دیا کہ دو چیزوں کو ساتھ ساتھ پالو۔ ایک دین ہے جسے اسلام کہتے ہیں ایک دین پناہ ہے جسے حسین کہتے ہیں۔ "دین کو بھی پالنا اور دین پناہ کو بھی پالنا"

چنانچہ محمدؐ نے پانا شروع کیا اور پالنے کا انداز یہ تھا کہ دین محمدؐ کے سینے میں پل رہا تھا اور دین پناہ محمدؐ کے سینے پہ پل رہا تھا۔ محمدؐ کے منہ سے الفاظ نکلتے تو وہ دین کی خوراک بنتے اور زبان محمدؐ سے جو دودھ نکلتا وہ دین پناہ کی خوراک بنتا۔ گویا دین اور دین پناہ ایک ہی گھر میں پیدا ہوئے۔ ایک ہی باپ نے انہیں پرورش کیا۔ ایک ہی خاندان میں پلے اور جب جوان ہوئے تو دین کا نام ہو گیا اسلام اور دین پناہ کا نام ہو گیا حسینؑ گویا حسینؑ اور اسلام ایک گھر میں پیدا ہوئے۔ ایک ساتھ پلے۔ ایک ساتھ بڑھے۔ ایک ساتھ پروان چڑھے اور ایک ساتھ کھیلے۔

سامعین!

حسینؑ اور اسلام کے کھیلنے کا تمہیں ایک قصہ سنا دوں۔

ایک دن رسولؐ کی مسجد میں اسلام تھا اور رسولؐ کے ساتھ کھیل رہا تھا رسولؐ نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ اسلام کا کھیل تھا۔ رسولؐ سجدے میں گئے اسلام بھی سجدے میں تھا۔ اتنے میں اسلام نے دور سے اپنے بچپن کے ساتھی کو آتے دیکھا دیکھ کر اسلام مچل گیا "آؤ حسینؑ! کھیلیں" چنانچہ حسینؑ آ کے رسولؐ کی کمر پہ بیٹھ گیا اب دونوں ساتھیوں نے کھیلنا شروع کر دیا۔ حسینؑ اور اسلام سجدے میں ہیں۔ دونوں اپنے اپنے کام میں مشغول ہیں۔ ادھر کھیل ختم ہوا ادھر حسینؑ اٹھ کر گھر چلے گئے۔

"امان سلام"

"بیٹا! کہاں گئے تھے؟"

"امان! مسجد میں گیا تھا۔ وہاں اسلام اور میرے نانا تھے"

"حسینؑ! پھر تم نے کیا کیا؟"

"امان! میں اسلام کے ساتھ مل کے نانا سے کھیلتا رہا۔ نانا میری ناز برداری

کرتے رہے"

"بیٹا! وہ کیسے؟"

"امان! نانا سجدے بھی کرتے رہے اور مجھے بھی کمر پہ بٹھائے رکھا"

”بیٹا! آئندہ ایسا کھیل نہ کھیلنا تمہارا سے نانا کو تکلیف ہوئی ہوگی!“
 بس۔ یہ سنکر حسینؑ کو جو سش آگیا اور پورے بچپن کے لہجہ میں فرماتا ہے۔
 ”اتاقے!..... میری بات سن۔ اگر میرے کمر پہ بیٹھنے سے نانا کو
 تکلیف ہوئی ہے تو میں تیرے دُودھ کی قسم کھاتا ہوں کہ اگر سجدہ کا
 بدلہ نہ اتار دوں تو دُودھ نہ بخشے گا۔ اور آقا سے سن! نانا نے سجدے
 سے سراطھا تو لوبیا تھا چاہے دیر سے اٹھا تھا۔ مگر میں تجھ سے وعدہ کرتا
 ہوں کہ جب میں نے سجدے میں سر رکھ دیا۔ تو خود نہیں اٹھاؤں گا۔
 قاتل اٹھا کر لے جائے تو لے جائے۔ میں نہیں اٹھاؤں گا“

بزرگانِ من!

جناب رسالتؐ کی رحلت کے بعد حسینؑ بھی یتیم۔ اسلام بھی یتیم۔
 رسول کے گھر والے اسلام کو پال رہے تھے اور حسینؑ کو بھی پال رہے تھے۔ کچھ عرصہ بعد
 اتفاق ایسا بنا کہ اسلام مدینہ سے چل کر شام میں پہنچا اور شام کے راجہ نے اسلام کو
 جھوٹے فتوے، جھوٹی حدیثیں اور ملوکیت کی زہر پلا دی۔ اسلام کا سارا بدن زخمی
 ہو گیا اور حیب بالکل زخمی ہو کے مرنے لگا تو اسلام نے آواز دی۔

”مددگار! میں مر رہا ہوں۔ کوئی ہے جو مجھے بچالے؟“

اسلام کی یہ آواز مدینہ میں پہنچی اور حسینؑ نے سن لی۔ فرمایا:

”یہ کون ہمیں مدد کے لئے پکار رہا ہے؟“

اسلام نے عرض کی ”حسینؑ! مجھے بچالو۔ میں مر رہا ہوں مجھے زبردستی نانی
 بیماری چٹ گئی ہے“۔ حسینؑ نے کہا ”اسلام! فکر نہ کر۔ پردہ نہ کر
 میں تیرا علاج کروں گا۔“ حسینؑ اٹھے۔ سیدھے گھر میں گئے۔ بہن کو دیکھا اور فرمایا۔

”زینب! سنستی بھی ہو۔ آج اسلام نے ہمیں مدد کے لئے پکارا ہے۔ ہم اس کا
 علاج کرنا چاہتے ہیں۔ زینب! تم میرے ساتھ چلو۔ ہم دونوں بہن بھائی مل کے
 علاج کریں گے!“

اور بہن کو دیکھو! ————— اگر اسلام کو خون کی ضرورت پڑی تو میں ہتیا کر دنگا۔
 اور اگر پٹی باندھنے کی ضرورت پڑی تو تمہاری چادر کام آئے گی۔ چلو دونوں بہن بھائی مل کے
 اسلام کا علاج کریں!
 حضور والا!

دونوں بہن بھائی پہل پڑے۔ جتنی مناسب دوا میں تھیں حسین نے سب ساتھ
 لے لیں۔ اور کربلا کے جنگل میں جاتے ہی دیکھا کہ اسلام کو ہزاروں کیرٹے چٹے ہوئے
 ہیں۔ بس طبیب اعظم نے وہیں ڈیرے لگا دیئے۔ دو محرم سے لیکر ساتویں تک اپنی
 دواؤں کو ٹھیک کرتا رہا۔ ساتویں سے اتنا مشغول ہوا کہ نہ کھانے کی فرصت رہی نہ پینے
 کا ہوش رہا۔ آخر دسویں کی رات کو اندھیرا کر کے اپنے سامنے جو ناقص دوا میں تھیں
 وہ نکال دیں۔ اور جو قابل تھیں وہ رہنے دیں۔ صبح کو اسلام کا علاج شروع ہو گیا
 حسین نے کہا ”بہن! یوں کرو تم گھر میں بیٹھو، میں باہر بیٹھتا ہوں۔ میں باہر سے
 آواز دوں گا۔ اور تم مجھے وہ دوا بھیجی رہنا، چنانچہ بہن جیسے کے اندر بیٹھ گئی اور
 بھائی جیسے سے باہر تھوڑی دیر بعد حسین نے آواز دی۔

”زینب! مجھے اکبر چاہیے، زینب نے سجا کر باہر بھیج دیا۔ تھوڑی دیر
 پھر آواز آئی۔

”بہن! مجھے قاسم چاہیے“ زینب نے سجا کے بھیج دیا۔ گویا یہ دوا کی شیشی
 تھیں جو حسین استعمال کر رہا تھا۔ دوا اسلام کو پلا دینا تھا اور خالی شیشی جا کے اٹھلاتا
 تھا۔ حسین نے جب ستر دوا میں اسلام کو پلا دیں تو اسلام بالکل تندرست ہو گیا۔
 اسلام تروتازہ ہو گیا۔ حسین گھر آئے۔

”بہن! مبارک“

”حسین! خیر مبارک“

”بہن میری ساری دوا میں کام آگئیں۔ اسلام بالکل ٹھیک ہو گیا، مگر مجھے
 یہ ڈر ہے کہ اسلام کو کل کوئی اور نہ مار دے لہذا میں اب اسلام کو تھوڑا

سآپ حیات نہ پلا دوں تاکہ وہ کبھی مرنے نہ پائے ؟
 زینب نے کہا " حسین ! میرے پاس تو دوسری زمرہ تھے جو ختم ہو گئے "
 قاسم کی ماں تمہارے پاس ؟

" مولا ! حیرے پاس تو ایک ہی لعل تھا۔ ختم ہو گیا "
 اکبر کی ماں تمہارے پاس ؟

" حسین ! میرے پاس تو ایک ہی شب چراغ تھا۔ ختم ہو گیا "
 چنانچہ جب کہیں سے آپ حیات کی آواز نہ آئی تو کہنے میں سے ایک آواز
 آئی۔ " حسین ! آپ حیات کی ایک چھوٹی سی شیشی میرے پاس ہے۔
 حسین ! تیرے اسلام کے کام آئے تو لے جاؤ۔ "
 چنانچہ حسین آپ حیات کی شیشی کے قریب پہنچے۔ گود میں لیا۔ دو قدم چلے
 سامنے رباب آگئی۔

" حسین ! یہ بچہ مجھے واپس کرو۔ "
 رباب اپنے بچہ کو لیکر خیمے میں آگئی۔ تھوڑی دیر بعد اصغر کو گود میں اٹھا
 سکیٹہ کی انگلی پکڑے رباب خیمے سے باہر نکلی اور عرض کی
 " حسین ! کرسی پہ بیٹھو۔ زینب ! تم بھی سامنے کرسی پہ بیٹھو۔ " جب دونوں
 بہن بھائی کرسیوں پہ بیٹھ گئے تو رباب سامنے آکھڑی ہوئیں اور عرض کی۔

" فاطمہ کے بیٹے اور فاطمہ کی بیٹی ! میں فیروز خاندان کی ہوں۔ تمہارے خاندان نے
 مجھے یہ شرن بخشا اور خدا نے مجھے یہ تحفے دیئے۔ ایک سکیٹہ۔ ایک اصغر۔
 مجھے پتہ ہے کہ تھوڑی دیر میں بیوہ ہو جاؤں گی۔ اور تمہاری امانت کی حفاظت
 نہیں کر سکوں گی۔ لہذا میں ابھی تمہاری امانت تمہارے سپرد کرتی ہوں۔
 رباب نے یہ کہہ کے سکیٹہ زینب کی گود میں بٹھادی اور اصغر حسین کی گود میں
 اور اتنا فرمایا۔

" بیٹی سکیٹہ ! تو جانے اور زینب جانے۔ بیٹا اصغر ! تو جانے اور حسین جانے "

سَيِّدُ السَّاجِدِينَ

دمشق کا راجہ ظلم و استبداد اور ملوکیت کے تخت پر شراب کے نشے میں چور بیٹھا تھا۔ ہزاروں لاکھوں ذمہ دارانِ مذہب اُسے جی حضور اہی سرکار کہہ رہے ہیں۔ ہزاروں مقربین دین اپنی ریش سے وہاں جاڑوب کٹی کر رہے ہیں۔ لاکھوں محدثین و مقررین حکومت کی چوکھٹ کے پائے پکڑے ہوئے ہیں اور علی ابن الحسین ہاتھوں میں تھکڑی، پاؤں میں بٹری اور گلے میں خار دار طوق پہنے سامنے کھڑا ہے۔ بچے دم بخود ہیں۔ محمد کی بیٹیاں اور علیؑ کی بہوئیں عالم سکت میں ہیں کہ اچانک تخت یزیدیت پہ بیٹھنے والا ایک سفیر (حسین کی چھوٹی بچی کی طرف اشارہ کر کے) یزید سے یہ کہتا ہے:

”یزید! جنگ میں فید ہو کر جو یہ لڑکیاں آئی ہیں ان میں سے اس بچی کو مجھے کنیزی میں دے دے“

اُدھر شافی کی یہ بات سن کر یزید نے بچی کی طرف دیکھا، ادھر بچی نے ”ہائے“ کہہ کر بھائی کی طرف دیکھا اور کہا۔

”بھائی جان! یہ کیا ہونے لگا؟“

”اما ابھی خاموش ہی تھے کہ علیؑ کی بیٹی آگے بڑھی اور فرمایا۔

”یزید! خردار۔ ایسی بہودہ بات نہ کر۔ ہم کنیز نہیں ہو سکتے“

یزید نے کہا۔ ”قی زئی! مجھے اختیار ہے۔ میں بادشاہ ہوں۔ میں اگر اس بچی کو دے دوں تو تم کیا کرو گے؟“ بس یزید کا یہ کہنا تھا کہ امام آگے بڑھے اور فرمایا۔

”یزید! ہمیں جلال نہ دلوا۔ خردار! میری بچھو بچی کے سامنے سخت بات نہ کرنا“

اب جو یہ رد و قدرح ہونے لگی تو شافی آگے بڑھا اور کہتا ہے۔

”قی دیو! تہیو مہولی سی بات پر غصہ آگیا“

امام نے فرمایا، "شامی! تجھے پتہ نہیں کہ ہم کون ہیں اور جس رطلی کو تو کیزی میں مانگ رہا ہے یہ کون ہے؟"

شامی پوچھتا ہے "قیدی! تم ہی بتاؤ کہ تم کون ہو؟"
 امام نے فرمایا "شامی! جس بچی کو تو مانگ رہا ہے یہ فاطمہ کی پوتی ہے" جس وقت امام نے فرمایا کہ یہ "فاطمہ کی پوتی ہے" تو شامی گھبرا کر نیند سے پوچھنے لگا۔
 "کیوں نیند! کیا واقعی فاطمہ کی پوتی ہے؟"

نیند خاموش رہا۔ شامی دو قدم پیچھے ہٹا۔ اپنی کمر سے خنجر نکال کر اپنا ہاتھ کاٹا جس ہاتھ سے اشارہ کیا تھا۔ پھر کٹا ہوا ہاتھ اپنے دوسرے ہاتھ میں لیا اور کہا۔
 "سیدہ کی پوتی! میں نے اس ہاتھ سے تیری طرف اشارہ کیا تھا لہذا میں نے اس ہاتھ کو کاٹ دیا۔"

شہزادی! آپ کو اپنے جد کی قسم مجھے معاف کر دیجئے۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ تم کون ہو؟

یسنکر نیند کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا، "اللہ یَعْلَمُ حَيْثُ مِنْ يَشَارُ رِسَالَةَ" اور امام قبلہ کی طرف منکر کے سجدہ میں گر گیا۔

"سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى - يَا لَللَّهِ! تيرا شکر ہے کہ محمد کے گھرانے کی عزت بچی۔"

شہر دمشق میں زلزلہ آیا اور شامی خود راوی ہے کہ ہم نے ایک آواز سنی کہ کوئی کہہ رہا تھا "ارفع رَسْلَكَ اَنْتَ سَيِّدُ السَّاجِدِينَ"
 پس اپنا سر اٹھالے اس عالم میں سجدہ کرنے والے! تو سارے سجدوں سے بڑھ گیا۔

نجات



خداوند عز و جلال کی حمد و ثنا کے بعد حضرت محمدؐ و آل محمدؐ پر درود و سلام

حضراتِ محترم!

مجھ سے پہلے میرے ایک عزیز دوست لفظ نجات سے ”پر دعا عطا فرما رہے تھے لہذا میں بھی چاہتا ہوں کہ نجات ہی کے موضوع پر تھوڑی سی گفتگو ہو جائے۔
 سامعین کو! ————— یہ جتنی چیزیں ہیں نا۔ نماز۔ روزہ۔ دین و
 ان چیزوں کا بدلہ خدا کی طرف سے جو تیرے جسم کی پرورش کے لئے خدا نے عطا فرمائی
 ہیں، ان کو تو نے اللہ کی ہزاروں من روٹی کھائی، ہزاروں من پانی پی لیا۔ بے اتہا اللہ کی ہوا
 تو نے استعمال کی لہذا نماز پڑھ۔ روزہ رکھ۔ کیونکہ نماز روزہ کا بدلہ تجھے یہیں ملتا جا رہا
 ہے۔ وہ گئی نجات! اس کا تعلق اس چیز سے ہے جو تیری رُوح کے ساتھ وابستہ
 اور رُوح کیساتھ پس ایک شے وابستہ رہتی ہے جسے کہتے ہیں محبت گویا نجات
 صرف محبت میں ہے۔ اب اگر محبت سمٹ کر ایک مرکز پر اکٹھی ہو جائے تو وہ عشق
 کہلاتا ہے۔ عشق ہے دنیا میں دولت کا اگر عشق میں کوئی مادی غرض شامل ہے تو
 وہ ”جسوس“ کہلاتی ہے اور اگر صرف زندگی کے تصور سے عشق ہو گیا ہے تو ایسے عشق
 کو دنیا میں ”ولایت“ کہتے ہیں جو مادی اغراض سے میرا ہونٹا ہے اور یہی ”تو لا“
 ہے جو ولایت کہلاتی ہے۔ یہی شے ہے جو عاقبت میں نجات دینے والی ہے۔

سامعین!

یاد رکھو! نجات کا جو تعلق ہے وہ عشق میں ہے، نہ محبت میں ہے۔ نہ نماز
 روزے میں ہے۔ گویا ادائے فرض میں برات ہے۔ مگر نجات کا تعلق صرف ولایت

سے ہے اسی لئے ہم نمازیں پہلوئے نجات پیدا کرنے کے لئے "اذان" میں
 "ولی اللہ" بھی کہہ لیتے ہیں۔ اپنے کلمے کو ذریعہ نجات بنانے کے لئے اقرار و لاپیٹن
 بھی کر لیتے ہیں۔ بہر نوع۔ اگر کسی شے سے نجات ہے تو وہ ولایت ہے۔

صاحبانے! ————— ولایت زبان نداد۔ لباس نداد۔ مکان نداد۔

پوزیشن نداد۔ گویا جو صاحب ولایت ہو جائے اس کے لئے کسی خاص زبان کی
 ضرورت نہیں۔ وہ اردو بھی اتنا ہی سمجھتا ہے جتنا پنجابی۔ اسے پنجابی میں بھی وہی
 لطف آتا ہے جو انگریزی میں۔ صرف ضابطے کو پورا کرنے کے لئے قانون کو نبھانے
 کے لئے نماز میں آپ کو سرکاری زبان عربی استعمال کرنی پڑے گی مگر قانون ولایت
 کو پورا کرنے کے لئے جو زبان آتی ہوگی ٹھیک ہے۔ پنجابی بولو گے تب وہی لطف ہے
 اردو بولو گے تب وہی سواد ہے۔ نظم میں بولو گے تب وہی لطف ہے۔ نثر میں بولو
 گے تب وہی لطف ہے۔ گویا دیوانگانِ ولایت زبان کے پابند نہیں ہوتے۔ جس
 انداز میں ولایت نظر آجائے بس وہ ولایت ہے۔ کیونکہ ولایت کی معرفت کو دنیا جانتی
 ہی نہیں۔ جہاں سرست گانِ ولایت کو دیکھا اور یہ قانون کی حکم بند یوں میں گھری ہوئی
 دنیا اور قانون کو ناقص طور پر سمجھ کے قانون سمجھنے والی دنیا ہم دیوانگانِ ولایت
 کے خلاف فتوے بازی شروع کر رہی ہے۔ انہیں اندازہ ہی نہیں کہ ولایت کی سرستی
 کیا ہے۔ انہیں پتہ ہی نہیں چلنا کہ سرستانِ ولایت کے دل میں جو کوئی ہے اسکے
 ساتھ ان نعلق کیا ہے۔

دیکھو نا! آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ اگر یہاں سمجھ نہ آئے تو گھر جا
 کر نتیجہ نکال لیتا۔

کو ذمہ میں ایک شخص رہتا تھا جس کا "مٹیم" نام تھا۔ مغرب آدمی۔ شام کو ایک
 ٹوکری لے کر کونے کے باغ میں جاتا اور ناقص کھجوریں ستے داموں بازار میں لاکر
 بیچ کر جو دو چار پیسے ملتے اس کی روٹی کھا لیتا۔ یہی گویا اس کی دنیاوی وجاہت تھی۔
 اتفاق سے اس مغرب آدمی کے دل میں شمعِ ولایت روشن ہو گئی اور اس وقت

فرماتے ہیں، ”مثیم بھائی! میں آگیا۔ اب تم گھر جاؤ۔ چنانچہ مثیم نے اپنی کھجوریں سپرد
کیں اور خود روٹی کھانے گھر چلا گیا۔

مثیم گھر چلا گیا اور شہنشاہ اعظم وہاں بیٹھا اس کی کھجوریں بیچ رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد
مثیم واپس لوٹا۔ پوچھا، ”میاں کتنی بیچیں۔ پیسوں کا حساب دو، شہنشاہ عالم اسے کھجوروں
کا حساب دے رہا ہے اور مثیم اس سے بھگڑا کر رہا ہے، ”واہ تو نے آدھرا پاؤ کھجور
زیادہ کیوں دے دیں؟ اور وہ کہہ رہا ہے، ”بھئی غلطی ہو گئی، اور دنیا یہ تماشادیکھ
رہی ہے۔

حضور والا!

یہ تھا قانونِ دلالت۔ اب آج ذہنی مثیم، حضرت مثیمؑ تار ہے۔ دنیا کے اعلیٰ حروف
کے نام مٹ گئے مگر اس چھا بڑی فروش کا نام ذہنوں سے نہیں مٹ سکتا۔ اور اسے
سلکھا کیا دیا شہنشاہِ دلالت نے۔ کہ

”سن مثیم! تو بھی کیا یاد کرے گا۔ سنے تجھے ایک بات بتاتا ہوں۔“

چنانچہ اسے علمِ البلد یا دانیا سلکھا دیا۔ اس علم کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص
کو دیکھ کر وہ یہ سمجھ جاتا تھا کہ اس شخص کی موت کب۔ کہاں اور کس طرح واقع ہوگی،
بتاؤ! یہ کتنا بڑا علم ہے کہ ہر انسان کو دیکھ کر وہ یہ بتا دیتا تھا کہ اس شخص
کی موت کب۔ کہاں اور کس طرح واقع ہوگی۔؟

سامعین!

بات سے بات نکلتی ہے۔ اب میں کس سے جا کے پوچھوں کہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ موت
کب آئے گی۔ کہاں آئے گی اور کس طرح آئے گی۔ اس کا علم صرف خدا کو ہے۔ یہ تو ہے
قانون کی بات۔ اور یہ ہے دلالت کی بات کہ مثیم کو بھی ان باتوں کا علم ہے۔ جب کہ
اس کا علم صرف خدا کو ہے۔

اب ہے کوئی دنیا کا ذی عقل آدمی! جہان چیزوں کو ملا کر مجھے سمجھائے کہ کیسے
پوری ہوتی ہیں۔ جس چیز کو قرآن کہتا ہے کہ صرف خدا کو علم ہے اور مثیم کہتا ہے

کہ مجھے اس کا علم ہے — کیا منیم نے قانون توڑ دیا۔ کیا اس نے قانون ختم کر دیا۔؟ ہرگز نہیں۔

منیم خواب دیتا ہے، اگر میری ولایت کا خدا تک جا ملے تو جو چیز خدا کیلئے علم خاص تھا وہ منیم تک پہنچ سکتا ہے، گویا یہ ہے مرتبہ ولایت جو منیم شمار کو حاصل ہو گیا۔ اب اگر آج کا دعویٰ دار ولایت یہ کہے، مجھے بھی ولایت ہے، تو وہ ذرا منیم کے سامنے تو آکر دیکھے کہ ولایت ہے یا نہیں،

میرے محترم بھائیو!

ایک دن منیم شمار کو فونے کے بازار میں کھڑے تھے سامنے سے حبیب ابن مفلح آگئے۔ دونوں آمنے سامنے ہو گئے۔ منیم کے دل میں خیال تھا کہ یہ علم البیایا والسنایا مجھے آتا ہے۔ مولانا مرتن مجھے بتایا ہے۔ چنانچہ وہ حبیب کو دیکھ کر کہنے لگا۔

”حبیب! مجھے نظر آ رہا ہے کہ ایسا خوب رجوان جس کی داڑھی نلاں تاریخ کو فلاں وقت اس کے خون سے رنگین ہوگی ایسے شہید ہوگا۔ منیم بیکر مسکرائے کہ گویا حبیب پہ رعب ہوگا کہ مجھے یہ بات آتی ہے اور میں نے بتادی۔ ادھر منیم کی بات سنکر حبیب نے پلٹ کے کہا۔

”منیم! مجھے بھی نظر آ رہا ہے کہ ایسا بوڑھا جو مجرم ولایت امیر المومنین فلاں درخت پر پھانسی دیا جائے گا۔“

منیم حیران ہو کر پوچھتا ہے، ”حبیب! تجھے کس نے بتایا ہے؟“
 حبیب مسکرا کے پوچھتا ہے، ”منیم! پہلے تم بتاؤ۔ تمہیں کس نے بتایا ہے؟“
 منیم نے کہا، ”مجھے امیر المومنین نے بتایا ہے۔“

ادھر حبیب مسکرا کے کہتا ہے، ”منیم! تیرے پاس باپ کی دی ہوئی بات ہے۔ میرے پاس بیٹے کی دی ہوئی بات ہے۔ تو باپ کی ولایت میں سرشار ہے۔ میں بیٹے کی ولایت میں سرشار ہوں۔ تجھے علیؑ نے بتا دیا، مجھے حسینؑ نے بتا دیا۔ اب منیم پوچھتا ہے، ”حبیب! تو نے کب پوچھا تھا؟“

حبیب پوچھتا ہے " تو نے کب پوچھا تھا؟ " مشیم نے کہا " امیر المومنین جب کوفے میں بادشاہ تھے۔ میں نے چار سال خدمت کر کے جب سیکھا تھا۔ "

حبیب نے کہا " میں جب اپنے آقا کے سلام کے لئے مدینہ گیا تھا۔ ایک رات خدمت میں رہ کے جب سیکھا تھا۔ "

اب مشیم گھبرا کے کہتا ہے " حبیب! کیا ایک رات میں اتنا علم؟ " حبیب نے جواب دیا " ہاں۔ ہاں۔ جو میرا استاد ہے نا۔ اس کے شمشیر ہدایت پر پانچویں سے۔ اس کے ولی بنانے کے انداز اور ہیں۔ وہاں وقفہ لگتا تھا۔ یہاں وقفہ نہیں لگتا۔ انہوں نے زندگی میں ایک دو ولی بنائے۔ مگر _____ حسین جس دن ولی بنائے بیٹھ گیا تو چراغ گلی کر کے پانچ منٹ میں بہتر ولی بنائے گا۔ اتنے ولی نہ اس سے پہلے کبھی کسی نے بنائے اور نہ اس سے بعد کوئی بنا سکے گا، محترم بزرگو!

یاد رکھو! آدم سے لیکر حسین تک کی تاریخ پڑھو اور حسین سے لیکر آج تک کی تاریخ کے اوراق پلٹ ڈالو اور تم دیکھو گے کہ آدم سے حسین تک اور حسین سے آج تک کسی اللہ والے کو نصیب نہیں ہوئے۔ یہ سب سے بڑی تعداد تھی اللہ والوں کی جو حسین کو ملی۔ تم کیوں کہتے ہو حسین کو " شاہ کم سپاہ " کیا حسین کی فوج تھوڑی تھی۔ کیا وہ بیس تھا؟

میرے بھائیو! ایسے الفاظ نہ کہا کرو۔ اتنی فوج تو کسی کو نصیب ہی نہیں ہوئی۔ اتنے مددگار تو کسی کو نصیب ہی نہیں ہوئے۔ اتنے معاون تو کسی کو ملے ہی نہیں جتنے حسین کے ساتھ تھے۔

آدم کے یاس دو بیٹے تھے (ہابیل و قابیل)۔ دو میں سے ایک فیل ہو گیا نوح کی کشتی میں سات سو سے زیادہ آدمی نہ آسکے۔

ابراہیم (اول مسلم) کی خدمت بن سلولہ سے زیادہ آدمی نہ آسکے۔ اور موسیٰ

طور پر چالیس آدمی لے گئے۔ سب فیمل ہو گئے اور علیؑ کے ساتھ بارہ حواری تھے مگر جب علیؑ کو سولی دی گئی بارہ کے بارہ منکر ہو گئے اور محمدؐ کے پاس ہزاروں آدمی تھے مگر احد و بدر میں ہونے والے آزمائش کے دیکھ لیا۔ اور علیؑ کے پاس صفین میں ایک لاکھ فوج تھی۔ جب حاکمین کی نوبت آئی تو چھ سات آدمی رہ گئے تھے اور حسن مجتبیٰ کے ساتھ صرف ایک ہارون لگی رہ گیا تھا۔ جب آپ صلح فرما رہے تھے۔ اور یہ صرف حسین کا اتنا تھا کہ اس کے ساتھ پورے بہتر انسان تھے۔ ایسے آدمی کو سیکس کہنا اس کی توہین ہے۔ بتاؤ! جس کے پاس بہتر جانثار ہوں کیا وہ بے کس ہے؟۔ ہرگز نہیں

حضور والا!

یا درکھو! .. الهدایت فصل الحجاب والولایت رفع الحجاب
جب ہدایت کا زمانہ ہو پڑے پڑ جاتے ہیں (پتہ نہیں چلتا کہ اپنا کون ہے اور غیر کون ہے) اور..... جب ولایت میدان میں آجاتی ہے تو پردے اٹھ جاتے ہیں۔
پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کون ہے اور وہ کون ہے) مکویا ولایت رفع حجاب ہے۔

سامعین! دنیا میں سب سے پہلی دفعہ میدان کربلا میں ولایت بے نقاب ہو کر کھڑی ہوئی ہے۔ اس سے پہلے بھی پردوں میں رہی اس کے بعد بھی پردوں میں رہی۔ اور ولایت نے اس دنیا کو بتا دیا کہ ادھر کون ہے اور ادھر کون ہے درد خدا شاہد ہے۔ پردے پڑے ہوئے تھے۔ اور پتہ نہیں چلتا تھا کہ اپنا کون ہے اور غیر کون ہے پس حسین نے بہتر جن کے دکھا دیئے۔

اب بتاؤ۔ اگر بہتر آدمی کہیں اکٹھے ہو جائیں تو یہ فوج کہلاتے ہیں، ہرگز نہیں اب اگر بہتر آدمی کسی حکومت کے باغی ہو جائیں تو ان کی گرفتاری کے لئے فوج بلائی جاتی ہے؟۔ ادھر حسین کا اندازہ کیا ہے کہ وہ ان بہتر کی بھی چھانٹی کرنا چاہتا ہے۔
شام کو حسین کے کیمپ میں بہتر آدمی ہیں حسین کہتے ہیں کہ یہ بہتر بھی بہت ہیں کچھ چھنٹ جائیں تو اچھا ہے کیونکہ جوں جوں جو ہر چھنٹا جائیگا توں توں طاقت بڑھتی جائے گی۔

حضور والا۔۔۔۔۔ دینا نے یہ منظر دیکھا کہ شب عاشور رات کے بارہ بجے کا وقت چاند دھند لایا ہوا اور حسین اکہتر جانثاروں کے ساتھ ایک خیمے میں تشریف فرما ہیں۔ اور ابو تراب کا بیٹا زمین پر سندا لگا کے بیٹھ گیا۔ گویا آج دنیا کا بے مثل فیڈ مارشل اپنی فوج کو ایک انوکھی بات کہہ رہا ہے جو آج تک کسی نے کہی نہ سنی۔ امام فرماتے ہیں۔

”عباس بھائی! دیکھو سب آگے کوئی رہ تو نہیں گیا۔“

قرنبری ہاشم اٹھے۔ گن کے بتایا، ”مولانا پورے اکہتر آدمی ہیں،“

امام نے فرمایا، ”نہیں بہتر ہونے چاہئیں۔“

عباس نے پھر گنا، ”عرض کی، ”قبلہ! اکہتر ہیں،“ امام نے فرمایا، ”بہتر ہونے چاہئیں“

اب جو امام نے یہ فرمایا تو خیمے کی پشت کا پردہ اٹھا اور اماں فصد بردار ہو گیا۔

سفید رومال میں لپیٹی ہوئی ایک شے سامنے رکھی۔ ”مولانا پوچھا۔“

”اماں فصد! کیا لائی ہو؟“ فصد نے عرض کی، ”حسین! یہ تیرا بہتر واں سپاہی ہے“

اب گن کے دیکھو۔ بہتر ہوتے ہیں یا نہیں؟“ امام نے فرمایا، ”ہاں۔ اب بہتر ہو گئے،“

اب حسین اپنے سپاہیوں سے فرماتے ہیں، ”میرے دوستو! میرے عزیزو!

میری جان سے پیارے رفیقو! میرے بیٹو! بھتیجو! بھائیو! پھر امام نے نام ایسے

کے بکارا، ”بھائی حبیب! بھائی زبیر! اور جو بزرگ تھے جیسے مسلم عوٹو وغیرہ

انہیں امام نے، ”چچا! کہہ کے خطاب کیا، ”میرے باپ اور نانا کے صحابو! دیکھو!

زمانے کا حال کیا ہے۔ یہ فوج جو مجھے گھرے ہوئے ہے اسے صرف میری ذات

سے واسطہ ہے۔ تم سے کوئی عداوت نہیں۔ اس وقت رات کا وقت ہے میں

تمہیں خوشی سے کہہ رہا ہوں کہ تم سے جو جانا چاہے جا سکتا ہے۔“

جب تین چار دفعہ مولانا نے یہ فرمایا کہ جو جانا چاہے جا سکتا ہے تو بہتر سپاہی

عالم سکتے ہیں بت بنے بیٹھے ہیں۔ آخر مولانا نے فرمایا۔

”دیکھو! شاہد تمہیں جانتے ہوئے یہ خیال آتا ہے کہ وہ ثواب جو تمہیں

یہاں شہید ہونے میں ملے گا۔ اس ثواب کے محروم رہ جاؤ گے لہذا میں محبتِ خدا، امامِ زمانہ
ولی مطلق، میں حسین تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر سوقت تم چلے جاؤ تو جو شہادت کا ثواب ہے وہ تمہیں
ضرور دلاؤں گا۔ چنانچہ ثواب کا لالچ بھی ختم ہو گیا۔ اب مٹلانے فرمایا۔

”تمہیں غیرت محسوس ہوتی ہے کہ لوگ تمہیں طعنے دیں گے کہ اپنے سردار کو چھوڑ کر گئے
لہذا اس غیرت کا علاج یہ ہے کہ میرے ساتھ تمہارے نبی کی بیٹیاں آئی ہوئی
ہیں تم انہیں ساتھ لے جاؤ اور انہیں نانا کی قبر پر بٹھا دینا۔ پھر جہاں جس کا جی چاہے
چلے جانا۔ اگر کوئی طلعت دے تو کہہ دینا کہ ”زینب کا پردہ بچانے چلے آئے تھے۔
نبی کی بیٹیوں کو نرنے سے نکال کے لے آئے تھے۔ لوگ خاموش ہو جائیں گے“

لوگ پھر بھی خاموش رہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا۔

”دیکھو! میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ آنکھ میں شرم ہے۔ اس شرم کی
وجہ سے تم نہیں جانتے۔ اکبر بیٹا! ذرا چراغ گل کر دو“

چنانچہ چراغ گل کر دیا گیا۔ پھر امام نے فرمایا۔

”اب اندھیرا ہے۔ میں تمہیں نہیں دیکھ سکتا۔ تم جاسکتے ہو“

سَامِعِینَ !

اندھیرے میں آوازیں تو آرہی ہیں۔ مگر پتہ نہیں چل رہا کہ کیا ہو رہا ہے جب دُشمن
گڈنے آپ تے حکم دیا، ”چراغ دوبارہ روشن کیا جاٹے“۔ اب جو چراغ دوبارہ
روشن ہوا تو امام نے دیکھا کہ اتنے میں یہ فرق آ گیا تھا کہ جو انڈوں نے اپنی تلواروں کے نیام
گھٹنے لگا کے توڑ دیئے اور بڑھوں نے اپنی پگڑیاں اتار کر اپنی کمر پر باندھیں کہ
جھکی ہوئی کمر ذرا سیدھی ہو جاٹے۔ اور جو بچے ہیں وہ ایڑھی اٹھاکے کھڑے
ہو گئے کہ جوان نظر آنے لگیں۔ اور چھ مہینے والا سپاہی بدل تو سکتا نہیں تھا۔
آنکھوں آنکھوں میں کہہ رہا تھا مٹلا! مسکرتہ کہ میں بھی شیر خدا کا پوتہ ہوں کل
وہ جہاد کروں گا کہ دنیا یاد رکھے گی“

اب جو امام نے یہ نظر دیکھا تو سینہ فخر سے تن گیا اور بے ساختہ منہ نکل گیا

”خداوند! تو گواہ ہے کہ اتنے اچھے جانثار تو میرے نانا محمد کو نہ ملے۔ اتنے اچھے ساتھی تو میرے باپ علی کو نہ ملے۔ اتنے اچھے رفیق تو آدم سے لیکر آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوئے۔“

اب جو مولانا فرمایا تو جانثاروں کا بیجا نہ صبر بھی بھریز ہو گیا۔ سب پہلے مسلم عورتوں جی اٹھے، بڑھا آدمی۔ رسول کو دیکھ چکے تھے۔ علی کے ساتھ رہ چکے تھے۔ تلوار ٹیک کر کھڑے ہوئے۔ بدن میں تھوڑا سا لرزہ بھی تھا۔ کہنے لگے

”حسین! میں نے تیرے نانا کو دیکھا ہے میں تیرے باپ کے ساتھ رہا ہوں تیرے منہ سے یہی سہتا ہے جو تو کہہ رہا ہے۔ تیری یہی شان ہے جو تو کہہ رہا ہے حسین! یہ سچ ہے کہ تجھے ہماری ضرورت بالکل نہیں۔ مگر میں تیری ضرورت ہے۔ تو ہمارا محتاج نہیں حسین! ہم تیرے محتاج ہیں۔ حسین! اگر تو ٹھوکریں مار مار کے بھی اس میدان سے نکال دے پھر یہیں پلٹ کے آئیں گے کیونکہ ہم تیرے بغیر نہیں رہ سکتے۔“

بڑھا آدمی۔ جوش میں نقرے کیے۔ بدن میں لرزہ پیدا ہوا وہیں گر گیا گرتے ہی حضرت برید ہمدانی کھڑے ہو گئے۔ یہ بڑے فیصح البیان انسان تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کے فرمایا:-

”حسین! میں جانے کو کہتے ہو۔ ہم چلے جاتے ہیں مگر اپنے گھر سے اچھا گھر بناؤ جہاں ہم چلے جائیں۔ اپنے دربار سے اچھا دربار بناؤ جہاں ہم جا کے بیٹھ جائیں۔ یہ نقرے کہہ کے وہ بھی ہوش ہو کر گر گئے۔“

اس کے بعد حسین کے بچپن کا دوست حبیب اٹھا۔ حبیب نے اسی طرح بات کی ہے۔ جس طرح بچپن کا دوست بات کرتا ہے۔

”حسین! میں تیرے ساتھ بچپن میں کھیلا ہوں۔ میں تجھے چھوڑ کے چلا جاؤں مگر ایک بات بنا دے کہ قیامت کے دن اگر تیری اماں نے پوچھ لیا۔“ حبیب نے کہا۔ ”میرے حسین کو کہاں چھوڑ آیا تو کیا جواب دوں گا۔“

یہ کہہ کے حبیبؑ بھی بیٹھ گئے۔ اسی طرح حیب تمام اصحاب بائیں کر کے بیٹھ گئے تو اب مزیزیوں کی باری آئی۔ مزیزیوں کی نمائندگی حضورِ قمر بنی ہاشم جناب عباسؑ غازی نے فرمائی

صاحبانِ ذوق! ذرا توجہ سے سنا عباس کی تقریر۔

پورا بدن لرز رہا ہے زلوار کا قبضہ ہاتھ میں ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا "مولانا!"

خاموش ہو گئے۔ دوسری مرتبہ اور بلند آواز سے کہا "یا ابن رسول اللہ"

پھر خاموش ہو گئے۔ پھر تیسری مرتبہ کہا "میرے سردار" پھر خاموش

ہو گئے۔ اور خاموش ہو کے ایک دم نجف کی طرف مڑ گئے اور بجائے

حسین سے کچھ کہتے رہ کر فرمایا "یا علیؑ صلا! یا بابا۔ حسین جانے

کو کہہ رہے ہیں کیا جواب دوں؟"

امام کو عباسؑ کی اس آواز پر آگیا۔ اٹھ کے ایک ایک کے گلے ملے۔ ایک ایک

کی پیشانی چوٹی۔

"میں تمہارا بڑا احسان مند ہوں۔ میں تمہارا بڑا شکر گزار ہوں۔ جہاد

کلی کے مرنے کی تیاری کرو"

اور امام نے اپنے جانثاروں کو سلام کیا وہی سلام جو آج تک زیارت

گنج شہداء میں پڑھا جاتا ہے "اَسْئَلُكُمْ عَلَیْكُمْ یَا اَوْلِیَاءِ اللّٰهِ" اے اولیاء اللہ

میرا تم پر سلام ہو، گویا دسل منٹ کے اندر حسین نے بہتر گواہی عطا کر دیا۔

یہ ہے ولایت کی معرفت۔

سامعین!

یوم عاشور بہتر کے علاوہ شہید ہونے والوں میں کبھی ہے اگر یہ رات

والے اولیاء اللہ بن گئے تو حُرّ تو ولی بننے سے رہ گیا ہوگا۔ لہذا حسین نے

اسے ولی بنانے کے لئے انکے دفن کروا دیا کہ سب کے ساتھ دفن ہوتا تو اولیاء اللہ

پر زیارت پڑھی جائے گی تو لوگوں کو یقین ہوگا کہ وہ تھے اولیاء اللہ جو رات کو تھے صبح والا

نہیں تھا۔ لہذا حُرّ کو انکے دفن کر کے ہمیں حکم ہوا کہ وہاں اولیاء اللہ جموعاً کہا کرو اور

یہاں حُر کی قبر پر کھڑے ہو کر کہا کرو "اسلام وعلیک یا ولی اللہ" اے حُر! تو بھی ولی اللہ ہے۔ یوں ولایت اس گھر سے تقسیم ہوتی ہے۔

میرے بھائیو! مصیبت و پریشانی کے اس عالم میں حبیب یقین ہو جائے کہ کل جنگ واقعا ہوگی اپنی فوج سے فیڈر مارشل کا یہ کہنا کہ تم چلے جاؤ یہ وہ بات ہے جس پر عقل حیران ہوتی ہے۔ حالانکہ ایسے عالم میں تو سربراہ فوج اپنی فوج کو قابو میں رکھتا ہے مگر حسین ہے کہ اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا ہے کہ تم میں سے جو جانا چاہے جا سکتا ہے۔ گویا حسین نے دنیا کو یہ دیکھا دیا کہ یہ ولایت کی شان ہے کہ اگر بھوک پیاس سے تنگ آ کر کوئی سپاہی مجھے چھوڑ کر چلا جائے یہ حق ہے یا کوئی دنیاوی عیش و آرام چھوڑ کر بھوک پیاس کی طرف آجائے یہ حق ہے۔ یہ ہے شان ولایت۔

بہر نوع۔ حقوڑی دیر بعد حسین نے دربار برخواست کر دیا اور بیت الشرف میں تشریف لائے۔ پردہ اٹھا کر خیمے میں قدم رکھا ہی ہے کہ دیکھا سامنے بہن کھڑی ہے۔

حسین! میں قنات کے پیچھے تیرے ساتھیوں کی گفتگو سنتی رہی میں وعدہ کرتی ہوں حسین! ہر ایک شہید کی قبر پر کھڑی ہو کر سفید بال کھول کر ان کا ماتم کروں گی۔ مگر..... اتنا بتا کہ ان میں سے کوئی چلا تو نہیں جائے گا؟

بس بھائیو! زینب کا یہ پوچھنا تھا کہ پردے کے بالکل پیچھے دار کے طور پر حضرت بربرہؓ کو کھڑے تھے۔ انہوں نے سن لیا۔ رات کا وقت ایک دم گھبرا کے پکارا۔

اب جو انہوں نے آواز دی تو سب دوڑنے ہوئے آگے۔

زینب نے پوچھا۔ "بربرہ! خبریت تو ہے؟"

بربرہ نے کہا "زینب! خبریت بالکل نہیں۔ ابھی زینب کو ہماری دغا کا یقین نہیں آیا۔ خیمے میں بعد میں جانا پہلے زینب کو یقین دلا کے جاؤ۔ چنانچہ سب

تلواریں نیاموں سے نکلیں اور خیمے کے صحن میں آکے گریں اور گڑکاڑا کر جاننا اردن
عرض کی۔

”علیٰ کی بیٹی! اپنے ہاتھ سے ان سروں کو کاٹ دے۔ ہم تیری چوڑھٹ
سے ملنے والے نہیں“

اور اتنا اعتماد تھا زینب کو اصحاب کی دغا پر کہ عاشور کی شام کو جب خیمے جلنے
لگے تو زینب نے حسین کو نہیں پکارا۔ عباس کو نہیں پکارا بلکہ وہاں بھی کھڑے ہو کر
زینب نے ہی آواز دی۔

”بھائی حبیب! آؤ نا۔ دیکھو ہم پہ کیا گزری ہے“

سامعین! یوں ولایت اس گھر سے تقسیم ہوئی۔ یوں بہتر دلی بنے
ایک وقت میں اتنے اولیاء کا اجتماع ایک جگہ نہ تاریخ عالم میں اس سے
پہلے ہوا اور نہ اس کے بعد اور ان اولیاء کی ایک جگہ قبریں بن گئیں۔ انماریک
دلی کی قبر اجمیر۔ پاکپن۔ اور قولنہ کو شریف بنا سکتی ہے تو جہاں بہتر اولیاء
کا جھڑمٹ اکٹھا ہو جائے اس کی شرافت کے لئے لغت عالم میں ہمیں سوائے
معلیٰ کے اور کوئی لفظ ہی نہیں ملتا۔

بزرگانِ حق! حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن ہر زمین شق ہو

جائے گی اور ہر قبر سے مردہ اٹھ کے آئے گا۔ مگر — کر بلا کی زمین

یو نہی رہے گی اور یہاں کی قبروں میں سونے والوں کو آدم سے اٹھایا جائیگا۔

اسکے علی دلائل علماء کرام کے پاس موجود ہیں مگر مجھ دیوانے نے یہی سمجھا ہے کہ

اللہ کو پتہ ہے کہ یہ بڑے زخمی ہیں لہذا ان زخموں کو تکلیف نہ دی جائے انہیں

اسی طرح اٹھایا جائے گا جس طرح زخمی کو ستر پھر پہ لایا جاتا ہے اور یہی اولیاء

کے مجمع کی برکت ہے۔ یہی بات ہے کہ دنیا کی کتابیں پڑھ ڈالو جن میں زیارات لکھی

ہوئی ہیں کہ پندرہ شبان کو کر بلا معلیٰ میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و کرام اور

آئمہ طاہرین ہر ملائکہ کے تشریف لاتے ہیں۔ بحف میں مدینہ میں، کاظمی میں سامری

میں، مشہد میں۔ کہیں یہ نہیں لکھا ہوا کہ کسی جگہ حسین تشریف لائے گا۔ بلکہ سارے بزرگ

حسین کے پاس تشریف لاتے ہیں۔ غالباً سبے ملکر فیصلہ کیا ہوگا کہ حسین کے یہاں چلے چلو کیونکہ یہ بڑا زخمی ہے لہذا اسے تکلیف نہ دو۔ چنانچہ سب کمر بلا غصے میں تشریف لاتے ہیں اور حسین کا دربار کائنات کے شہنشاہوں کی آمد سے متوجہ جاتا ہے۔ اور سمجھنے کا انداز یہ ہوتا ہے کہ _____ بنظام قدرت سجا یا گیا جنتِ اعلیٰ کے بنے ہوئے مرمی پتھر فرش کی جگہ بچھائے گئے۔ علمِ آدم کے زمر میں تخت بچھائے گئے۔ حلِ نوح کی آبشاریں چلا دی گئیں۔ ابراہیم کی خلعت کے پرے ٹکنا دیئے گئے۔ ہیبت موٹے کوچہ بار بار دیا گیا۔ زہد عیسیٰ کے نقش و نگار کر دیئے گئے۔ حسن یوسف کی گلکاری ہو گئی اور پورے حرم کو سجا دیا گیا اور تخت شاہی پہ جو اسٹیج بنی اس پر شہنشاہ کر بلا اپنے بہتر ساتھیوں کے ساتھ آکر رونق افروز ہو گئے۔ شہنشاہ کے پیچھے کرسیوں پر اٹھارہ بنی ہاشم اور ان کے پیچھے ہلالی شکل میں کرسیوں پر شہدائے کربلا اور باقاعدہ قرینے سے دو طرفہ کرسیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ہر کرسی پر بیٹھنے والے نبی کا لکھا ہوا ہے اور حضورِ قمر بنی ہاشم عباسؑ غازی فیلیڈ مارشل کی دردی پہنچے ہوئے دروازے پر کھڑے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے فیلیڈ مارشل سے آگے کہا کہ آدم سلام کیلئے حاضر ہوتے ہیں۔ اجازت ہے؟ _____ فیلیڈ مارشل نے وہیں سے آواز دی۔ "سرکارِ حسین میں آدم کا سلام قبول ہو" سرکار کی طرف سے حکم ہوگا۔ آنے دو" چنانچہ آدم آئے اور اپنی کرسی پہ بیٹھ گئے۔ اس کے بعد نوح آئے اسی طرح جب سارے انبیاء آکر قرینے سے اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو قمر بنی ہاشم نے سر جھکا کے عرض کی۔ "سرکارِ حسین میں حضور سرکارِ عالمین تشریف لارہے ہیں" حضور سرکارِ عالمین کا نام سننے ہی سید الشہداء اپنے تخت سے اترے۔ آگے بڑھ کر نانا کا استقبال کیا۔ اپنے برابر کی کرسی پہ بٹھایا۔ اور اس کرسی کے پیچھے شہزادہ علیؑ کو کھڑا کر دیا۔ تاکہ ہم شکلِ محمدؐ، محمدؐ کے ساتھ ہی بیٹھ جائے اس کے بعد آئمہؑ مظاہرین تشریف لائے اور اپنی اپنی کرسیوں پر قرینے سے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد حکم ہوا اور اہل دربار! اپنی آنکھیں بند کر لو۔ میری اماں آ رہی ہیں"۔ حضور سیدہ طاہرہ آگے بیٹھ گئیں۔ چنانچہ جب سب اپنے اپنے

قرینے سے بیٹھ گئے اور دربار شروع ہوا تو اچانک ایک آواز آئی۔

”بھیا! کیا میں بھی آسکتی ہوں؟“

بس اس آواز کا سننا تھا کہ قرینہ ہاشتم نے سر سے عمامہ اتار کے پھینک دیا۔ شہزادہ علی اکبر ننگے سر ننگے پاؤں دوڑے اور حسین نے کرسی چھوڑ دی۔ محمد تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ سیڑھ نے چادر پھیلا دی۔ آمنہ طاہرین جھک کے سلام کرنے لگی۔ انبیاء ہاتھوں پہ ہاتھ رکھ کے کھڑے ہو گئے اور زینب جھجکتی ہوئی اڑتی ہوئی کہے گی۔

”حسین! آج تیرے دربار میں زینب آ رہی ہے۔ حسین! اجازت

ہے، میں آ جاؤں؟“

محترم بزرگو!

حضور امام زین العابدین علیہ السلام آگے بڑھیں گے اور پھوپھی کو سلام کر کے پھوپھی کا بازو پکڑ کر فرمائیں گے۔

”پھوپھی اماں! آؤ ساتھ چلیں“

اور حسین کے دربار میں پھوپھی بھینچے آگے بیٹھ جائیں گے۔ گویا اس شان سے زینب کی آمد ہوگی۔

حسین پوچھیں گے۔ ”زینب! کچھ کہنا چاہتی ہو؟“

زینب فرمائیں گی۔ ”حسین! ایک بات کہہ کے مجھے واپس جانا ہے

اللہ تیرے دربار کو آباد رکھے۔ حسین! میں نے بڑی محنت سے تیرا دربار

آباد کیا۔ حسین! اطراف عالم میں دنیا کے لوگ تیرے ماتم دار ہیں۔ میں

ہر ایک کے گھر جاتی ہوں۔ حسین! آج میں تیرے دربار میں ان کی سفارش

لے کے آئی ہوں۔“

حسین فرمائیں گے۔ ”زینب! فکر نہ کرو جو تو فرمائے گی وہی ہوگا“

حسین! میں چاہتی ہوں کہ کربلا کے شہر میں میری سواری کا جلوس گزرا دو۔ میں

تیرے سارے شہر کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ حسین! یہ وہی جنگل ہے نا۔ جہاں میرے

جہاں میرے سر سے چادر اُتری تھی۔ حسین یہ وہی جگہ ہے نا جہاں میں
کھڑی ہوئی دیکھ رہی تھی اور تو زنج ہو رہا تھا»

اللہ ہمارے دلوں میں دلائے آل محمد اور مودۃ آل محمد عطا
فرمائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط
اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ ط

اے آل محمد!

اپنے غلاموں کو اپنا کہنا تو ہر آقا

کا کلام ہے۔ مگر

تمہاری شان تو یہی ہے۔

ہم جیسے گناہ گاروں

کو

اپنا کہو

(تخطیاً آل محمد)

ختم نبوة

خداوند عزت اسما و جلال کی حمد و ثناء کے بعد حضرات
محمد و آل محمد پر درود و سلام

حضرات علمائے کرام و سامعین عظام !

آپ حضرات کے واجباً اتباعِ حکم کی تعمیل میں آج میں یہاں حاضر ہوا ہوں۔
جب میں یہاں پہنچا تو بڑی روشنی تھی جس کی وجہ سے میں نے اتنے ہی جگہ پہچان
لی کہ یہ تو ہمارا پرانا نا اڈلا ہے۔ یہاں تو ہم کئی بار آچکے ہیں۔ پھر مجھے مولانا مرحوم
مدرسے لے گئے۔ جو میرے لئے بہت بہتر تھا۔ کیونکہ مدرسے کی ہوا لگنے سے مجھ میں
اتنی طاقت آگئی کہ میں آپ سے خطاب کر سکوں۔ بہر نوع میں یہاں پہنچا اور یہاں
آکر میں نے دیکھا کہ ہر مکتب منکر۔ ہر عمر۔ ہر سن کا مسلمان یہاں موجود ہے۔ گو یا یہاں
مکاتب فقہہ بھی ہیں اور مکاتب منکر بھی ہیں۔ یہاں انگریزی مدرسوں کے طالب علم
بھی ہیں۔ اور عربی مدرسوں کے طالب علم بھی ہیں۔ لہذا جب اتنی جماعتیں مل کے
بیٹھ جائیں تو ان کا لال بیٹھنا ہی بہت بڑی خوشی کی بات ہے۔ چنانچہ اس خوشی کے
موقعہ کو دیکھ کر کسی کے دل سے یہ دعا نکلی کہ

خوشی کا وقت ہے گل کر دو ان چراغوں کو

خوشی کے وقت سے کیا کام جھلنے والوں کا

حضور والا! اسی اجتماع کی خوشی میں ہم نے کہہ دیا۔ خداوند! ہمیں بجلی

نہیں چاہیے۔ بجلی وہاں گڑ جہاں اسے گرنا چاہیے اس لئے کہ بجلی کی روشنی

انسانوں کی بنائی ہوئی روشنی سے۔ درہم تو یہاں اکٹھے ہی اس لئے ہوئے ہیں

کر انسانوں کی بنائی ہوئی، مصنوعی روشنیوں، کو بجھا دیں۔

بزرگانِ من!

بوجہ حالات تقریباً دو ماہ تک مجھے ہسپتال میں داخل رہنا پڑا۔ اخبار میں پڑھ سکتا نہیں تھا۔ یوں ہی بیٹے بیٹے پوچھ لیا کرتا تھا۔

• بچو! بنا دو ملک کی کیا حالت ہے۔ سیاسی حالات کیا ہیں۔ مذہبی حالات

کیا ہیں۔ ابھی ابھی ہمارے ملک میں دنیا بھر کے اسلامی سربراہوں کی کانفرنس ہوئی

ہے لہذا عالم اسلام کا کیا حال ہے۔ وہاں مسلمانوں کی کیا کیفیت ہے؟۔ چنانچہ بچے

چڑھ چڑھ کر مجھے سناتے اور میں بہت شوش ہوتا کہ مسلمانوں کا بڑا اچھا حال ہے

ہمارا کاروان بڑی اچھی طرح چل رہا ہے۔ ہمارا قائد بڑی شان سے رماں دواں ہے

ایک دن اسی دوران میں نے سنا کہ ہمارا کاروان جب بڑی شان سے چل رہا تھا

تو کسی بد نظر نے ہماری "چلتی گاڑی" کو روکنا چاہا کیونکہ وہ چاہتا نہیں تھا کہ

مسلمانوں کی گاڑی چلتی رہے۔ میرے پاس اور تو کچھ تھا نہیں۔ یوں ہی بیٹے ہوئے دُعا

کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔

• خدا دندا۔ وہ لوگ جو ہماری چلتی گاڑی کو روکنا چاہیں۔ اُن سے "دُوب"!

وَاکَا "نہ پڑے۔ اُن سے ہمارا کبھی واسطہ نہ ہو۔ اُن سے ہمارا کبھی تعلق نہ ہو۔

بہر نوع۔ یہ واقعہ کبھی سنا اور اس کے بعد اور خبر میں بھی سنتا رہا۔

محترم سامعین!

مجھے آج اس مختصر سے وقت میں نہ کسی کی نبوت پر تنقید کرنی ہے اور نہ ہی کسی

کی شخصیت پر تنقید کرنی ہے۔ اگر کوئی مجھ سے یہ کہے۔

• زیدی صاحب!

• فلاں شخص نبی بن گئے۔

میں کہتا ہوں! بن گئے تو میں کیا کروں۔ میں نے دُنیا کے سارے پالکوں کی فہرست تو نہیں بنا لی کہ جتنی غولٹھے میں اس پر ترقیب کرتا رہوں۔ میں نے تو آج اپنا عقیدہ بیان کرنا ہے۔ دینِ اسلام کی بات کہنی ہے :

یاد رکھو!

اللہ کا ہم پر یہ سب بڑا فضل دکر ہم سے کماؤں نے ہمیں انسان بنایا ہے۔ اور انسان بنا کر ہمیں اس دُنیا میں بھیج دیا۔ ہم چلے آئے۔

کیوں بھائیو!..... کوئی ہے ایسا انسان جو اپنی مرضی سے آیا ہو؟
ہرگز نہیں۔

دیکھو نا! اگر ہم اپنی خوشی سے آتے تو آتے ہی ہستے۔ مگر ہم تو آتے ہی روٹے تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں آنے کو بھاری نہیں چاہتا تھا۔ اللہ نے ہمیں زبردستی بھیج دیا۔ ہم آئے اور جب تک یہاں رکھے گا ہمیں رہنا پڑے گا۔ اور جس دن بلائے گا چاہے مڑ جائیں ہیں جانا پڑے گا۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے پیروں سے چل کر نہیں جائیں گے تو چار بندے اٹھا کر لے جائیں گے۔ مگر جانا ضرور پڑے گا۔ کتنا بے بس و مجبور ہے انسان کہ نہ آنے میں بس ہے اور نہ جانے میں بس ہے اور نہ ہی یہاں رہنے میں بس ہے۔ اللہ جانے ہم یہاں آکر کیا جرم کر بیٹھے ہیں کہ اس دُنیا میں آکر چاہے ہم ایک سانس لیں چاہے ہزاروں لاکھوں سانس لیں مگر یہاں ہمارا آنا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی سزا موت ہے۔ کیا مجال جو کوئی شخص سزا نے موت سے بچ جائے۔ آخر ہم ہی پوچھتے ہیں۔

پسیدہ کرنے والے!

تو ہی بتا۔ خود آتے تو کبھی نہ پوچھتے۔ چو کہ تو نے بھیجا ہے۔ اس لئے پوچھتے

ہیں کہ جب تو نے بھیجیں تو یہاں بھیجا ہے تو یہاں سے آنے کا مقصد کیا ہے؟

حضورِ والا!

خدا گواہ ہے۔ بھیجا بھی بڑی شان و شوکت سے۔ دماغ کے خانوس میں عقل کی شمع روشن کر کے بھیجا۔ واناموں کے کپڑے میں زبان کو بونے کی طاقت میں پابند کر کے بھیجا۔ آنکھوں میں نور کے چراغ روشن کر کے بھیجا سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دیکے بھیجا۔ زمین پھیل جائیں تو جال بن جائیں اور چاند پر پہنچ جائیں تو کندیں بن جائیں۔ ستارے ہمارے تابع۔ سورج ہمارے تابع۔ چاند ہمارے تابع۔ آسمان ہمارے تابع۔ زمین ہمارے تابع۔ اور آج ہم زمین سے فارغ ہو کر آسمان پہ جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اور فرشتوں میں لمپل مچھلی ہے کہ جنت سے نکالا ہوا۔ پھر واپس آ رہا ہے۔ گویا خدا نے اس شان سے ہمیں بھیجا۔ ہماری طاقت کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ ہماری قوت کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔

بچو!

سینکڑوں دفعہ یہ بات تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہ ہماری طاقت کی حد ہے کہ ہم یہاں بیٹھ کر امریکہ، روس اور لندن کی باتیں سننے ہیں اور سننے کا اندازہ یہ ہوتا ہے کہ سننے ایک صندوق رکھ لیا۔ ہم سننے بیٹھ گئے اور صندوق سے کہا: "سنو کوئی نئی سی بات، اور پھر ٹھٹھ یہ ہے کہ اس کے سامنے ہاتھ نہیں جوڑتے بلکہ بڑے آرام سے اس کے کان مردھتے ہیں۔ اور وہ ہمارے سامنے باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔"

ابے بتاؤ! جب ہم یہاں بیٹھ کر پوری دنیا کی باتیں سن سکتے ہیں۔ اب اگر ہم اس کا نام "وحی" رکھ دیں تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ بس اگر نام ہی رکھنا ہے تو آپ اسے "ریڈیو" کہیں اور میں اسے "ٹی وی" یعنی فرشتہ کہہ دوں گا۔ بیٹھے بڑی آسانی سے میں بھی بن گیا۔

سارے عین! - اگر آپ میرے ساتھ تعاون کریں تو آج میں نبوت کا

دعویٰ تاکردوں!۔۔۔۔۔ بچو! کیا ارادہ ہے!

دیکھو نا! اگر تم تھوڑی دیر کے لئے میری ہاں میں ہاں ملا دو تو میں بھی باسانی
نبی بن سکتا ہوں، کیونکہ نبی کی جو شرطیں ہیں وہ تقریباً پھری ہیں۔

مثلاً آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ آنکھوں کے لئے سینک چاہیے۔ دانت مصنوعی
ہیں۔ چھڑی کے بغیر چل نہیں سکتا۔ بغیر سہارے کے کام نہیں ہوتا۔ دوسرے کی عقل
سے سوچتا ہوں۔ گویا جب اپنے حواس ختم ہو جائیں، اپنی عقل ختم ہو جائے تو اس کے
بعد نبی بن جاؤ۔ جھگڑا کس بات کا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ ہزاروں بیماریاں لگ
جائیں مگر نام ”مسیحی“ ہو گا۔

بچو! تم نے پھر ”مرزیت“ ”مردہ باد“ کا نمروہ بلند کیا۔

میں کہتا ہوں ”مردہ باد“ نہ کہا کرو۔ اس لئے کہ ”مردہ باد“
ہوتا ہے جو پہلے ”زندہ“ ہو اور جو پہلے ہی سے زندہ نہ ہو وہ
”مردہ باد“ کیسے کہلائے گا۔

بہر فرسٹ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ نے انسان کو بہت سی طاقتیں دے کر بھیجا
ہے۔ آخر ہم نے عرض کی ”خداوند! تو نے اتنی طاقتیں دے کر ہمیں بھیجا ہے۔ آخر
ہمارا آنے کا مقصد کیا ہے؟

اللہ جواب میں فرماتا ہے:

”دیکھو نا! ہم نے تمہیں دنیا میں کھانے پینے کے لئے نہیں بھیجا۔ بلکہ
تمہارے ”بھیسے“ میں عقل ہے تو ہمارے بھیجے کا مقصد سمجھو اور وہ ہے کہ
ہم نے تمہیں ”عبادت“ کے لئے بھیجا ہے۔

صاحبان!

منبر کے تزیینے بیٹھے ہوئے یہ نوجوان بچے جھٹھے گھور رہے ہیں کہ:

• دیدی صاحب! کہہ دی نا آخر مولویوں والی بات
 میں کہتے ہوں، ”بچھڑو! آخر مولویوں والی بات سے چھٹکارا لگاتے ہیں بل
 سکتا۔ حقیقی بات تو یہی ہے کہ اللہ نے انسان کو عبادت کے لئے پیدا
 کیا ہے۔ خواہ تم اسے صحیح سمجھو یا غلط جانو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے
 کہ عبادت کیا ہے؟

سنا مَعین!

حضرات علمائے کرام بیان پر تشریف فرما ہیں۔ یہ حضرات مجھ جاہل آدمی کی اس بات
 کی تصدیق کریں گے کہ ”عبادت“ کا مفہوم اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ
عبادت ہر اس عمل کو کہتے ہیں جس سے اللہ خوش ہو جائے
 گویا جس کام سے اللہ خوش ہو جائے وہ عبادت ہے۔ اگر اللہ غامذ پڑھنے سے
 خوش ہے تو یقیناً غامذ عبادت ہے۔ اگر خدا روزہ رکھنے سے خوش ہے تو روزہ عبادت
 ہے۔ روزہ بذاتِ خود عبادت نہیں ہے۔ کہ اللہ خوش ہے اس لئے عبادت ہے اور
 غامذ بھی اس لئے عبادت کہ اللہ خوش ہے۔ گویا ہر وہ عمل جس سے اللہ خوش ہو جائے
 وہ عبادت ہے۔

پڑھے لکھے لو جو اللہ کو

اب یہ بتاؤ کہ جب عبادت کرنی ہے میں نے اور خوش کرنا ہے اللہ کو تو اب
 مجھے کیسے پتہ چلے کہ میرے اس عمل سے اللہ خوش بھی ہے یا نہیں؟ ہو سکتا ہے میں
 یہ سمجھوں کہ اللہ مجھ کو خوش ہے اور وہ نالامعن بیٹھا ہو۔ آخر کیسے پتہ چلے کہ اللہ خوش بھی ہے
 یا نہیں؟ تم اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ تم خود اللہ سے پوچھ آؤ کہ تو خوش بھی ہے
 یا نہیں؟

اب بتاؤ! تم میں سے کون اللہ کے گھر جانے کو تیار ہے؟

دیکھو نا! کسی کو تیرا دوستی بھیج دیں تو وہ واپس نہیں آتا اور جو کہتے ہیں کہ اللہ خوش ہے تو انہوں نے ابھی تک اللہ سے ملاقات ہی نہیں کی۔ آٹھ کس سے جا کر پھیں کہ اللہ ہمارے اعمال سے خوش ہے یا نہیں؟ کیونکہ جس کی پسند کا کام کرنا ہے وہ پردہ نشین ہے اور جنہوں نے کام کرنا ہے وہ نامحرم ہیں۔ نامحرم وہاں تک جا نہیں سکتا اور پردہ نشین ہم تک آ نہیں سکتا۔ لہذا اب پتہ کیسے چلے کہ ہمارے عمل سے وہ پردہ نشین محمود و خوش بھی ہے یا نہیں؟

حضور والا!

یہ کوئی فلسفے کی بات نہیں۔ کوئی الجھا ہوا مسئلہ نہیں۔ سیدھی سادھی بات ہے کہ پردہ نشین کی پسند معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح ایک نوجوان نے شادی کی۔ نوجوان کا عالم، نئی نئی شادی اور سیکم صاحبہ گھر آئیں۔ اور آتے ہی دو لباسے فرمائش کر دی کہ میرے لئے سونے کا ایک ہار بنا دو۔ چنانچہ دو لباسے اپنی بہتی کے شمار کو گھر بلا یا اور کہا۔

”میری سیکم کے لئے ایک ہار بنا دو۔“

شمار نے کہا: ”حضور! کیسا ہار بناؤں؟“

نوجوان بولا: ”ایسا ہار بناؤ جو میری سیکم کو پسند آجائے۔“

شمار نے کہا: ”جناب میں سیکم سے اُن کی پسند پوچھ سکتا ہوں؟“

نوجوان بولا: ”خیر راز میری سیکم پردہ نشین ہے، نہ ظم وہاں جا سکتے ہو۔“

اور نہ ہی وہ باہر آ کر بنا سکتی ہے۔“

آخر ایک عقل مند نے سمجھا یا کہ یہ بات تو آسان ہے۔ اگر تم سیکم کی پسند کا ہار

بنانا چاہتے ہو تو اس سے کہو کہ وہ اپنی پسند کا ہار بنوانے کے لئے کوئی نمونہ دے

چنانچہ سیکم نے ایک نمونہ دے دیا۔ اور شمار اسے لیکر گھر آ گیا۔ اب شمار پر یہ فرض ہے کہ

وہ اپنی عقل کو دخل دے۔ بلکہ جو نمونہ اس گھر سے آیا ہے بالکل اس کے مطابق عمل کرنے میں گویا جو نمونہ اُدھر سے آیا ہے اسے دیکھتے نہ ہوا اور عمل کرنے نہ ہونا کہ اپنا کوئی نمونہ کھڑ لینا۔

دیکھو نا! اگر اللہ کو خوش کرنے کے لئے عبادت کرنی ہے تو صرف اسی نمونے کے مطابق کرنا جو اُدھر سے آیا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہاری صند و فنی میں کوئی بڑا خوبصورت نمونہ ہو مگر وہ تمہارا اپنا بنایا ہوا ہے۔ جو اسے پسند آئے لہذا تم اس نمونہ پر عمل کرنا جو اُدھر سے آیا ہے نہ کہ اُدھر سے آیا ہو۔

محترم سامعین!

اللہ نے جیسی انتظام فرمایا کہ ہمیں سمجھانے کے لئے اس صنفِ علمی کو لکھنے کیلئے اپنی عبادت کو داسے کے لئے ہمارے ایمان کو مستحکم کرنے کے لئے ہمیں جو سن بنا سنے کے لئے۔ اللہ نے ایک نمونہ بھیجا اور نمونے کے ساتھ ساتھ اس کے لئے لکھنے کیلئے بھی بھیج دی اور کہا۔

دیکھو! یہ کتاب ہے اور یہ اس کتاب کو لیکر آیا ہے۔ کتاب کو پڑھو سا اور کتاب داسے کو دیکھنا۔ دونوں مل کے تمہیں بتائیں گے کہ یہ نمونہ ہے اور دیکھو! یہ وہ کتاب ہے جو **کازیمیب فیما ہے**۔ جس میں کوئی شبہ ہی نہیں ہے۔ جس کا نکتہ سہمی۔ جس کا زبرد زبر صحیح۔ جس کا لفظ سہمی۔ جس کا سکون سہمی جسکی حرکت سہمی جسکی حیثیت سہمی۔ جس کا انداز سہمی۔ جو سہمی سے پرتک صحیح ہی صحیح ہے جسے حق نے اتارا ہے۔ جس پر اتارا ہے۔ حق اس کے مضامین میں۔ حق اس کے مطابق ہیں۔ حق اس کی تعلیمات میں۔ حق اس کے بیانات میں۔ حق اس کا خلاصہ ہے۔ حق اس کا پہنچانے والا ہے۔ حق اس پر عمل کرنے والا ہے۔ حق اسے لانے والا ہے۔ لہذا کسی کو حق نہیں ہے کہ اسے ناحق کہے۔

گویا یہ کتاب "لا ریب فیہ" ہے۔ جو میں تمہیں بھیج رہا ہوں اور اس "لا ریب فیہ" کتاب کو لانے والا بھی "لا ریب فیہ" ہے۔ کتاب میں ریب نہیں اور پہچانے والے میں عیب نہیں۔ لہذا کسی "عیب دار" کی مجال نہیں کہ اس کتاب کو "لا ریب فیہ" کتاب کے مالک ہونے کا دعویٰ کرے۔ اور سن لو! ابھی ہرج سے کہ اس کتاب کا مصنف میں خود ہوں۔ یہ کتاب میری اپنی تصنیف کردہ ہے۔ میں نے ہی تصنیف کرنے کے بعد اس کتاب کے شائع کرنے کا بھی انتظام کیا تاکہ یہ کتاب چھپ کر دنیا کے سامنے آجائے۔

سَامِعِينَ كَوَامًا!

سب سے پہلا پریس جس میں اس کتاب کو خدائے پھپھوا، چاہا اس پریس کا نام تھا آڈم پرنٹنگ پریس۔ خدائے چاہا کہ اپنی کتاب کو یہاں چھپوا دے۔ لہذا جب آڈم پریس میں کتاب چھپنے کی نوبت آئی تو کسی آتش مزاج سے جھگڑا اٹھ گیا۔ اللہ نے کہا ہم اپنی کتاب یہاں نہیں چھپوا کرے۔

چنانچہ کچھ دنوں بعد "نوح پرنٹنگ پریس" قائم ہوا۔ اللہ نے اپنی کتاب یہاں چھپنے کے لئے دی مگر ابھی کتاب کے چھپنے کا ارادہ ہی تھا کہ نوح پریس سیلاب کی زد میں آ گیا۔ چنانچہ کسی اور پریس کی تلاش شروع ہو گئی۔ بالآخر ابراہیم پریس بنا۔ خدائے چاہا کہ اپنی کتاب یہاں چھپوا لیں۔ چنانچہ پریس کے پروپرائٹرز سے پورا معاہدہ بھی ہو گیا۔ حق اشاعت بھی ملے ہو گئے۔ مصنف نے پریس والے کو اپنا "خلیل" بھی بنا لیا۔ جب سارے مرحلے طے ہو گئے مگر جب چھپنے کا وقت آیا تو اللہ جانے پریس والے کی آنکھوں پہ کیا ٹی بندھ گئی کہ اعلیٰ حضرت نے اپنی کتاب رکوادی کر یہاں نہیں چھپے گی۔

اس کے بعد "موسلی پریس" قائم ہوا۔ کتابت بھی ہو چکی تھی۔ کتاب

منقریب چھپنے والی تھی کہ جب پتھر پر چڑھی تو پتھر جل گیا۔ بہر نوع کتاب یہاں بھی نہ چھپ سکی۔

اس کے بعد جب ”عینے پریس“ میں کتاب گئی تو پریس والا پریس چھوڑ کر آسمانوں پہ چلا گیا۔ گویا اعلیٰ حضرت کی کتاب یہاں بھی نہ چھپ سکی۔
 آخر کار صنعت نے کتاب کو اپنے پاس محفوظ رکھا۔ کچھ دن بعد عرب کی خشک آب و ہوا میں ”محمدی پریس“ قائم ہوا۔ اللہ نے پریس کے پروپرائٹر سے کہا۔

”محمد! سنتے بھی ہو۔ ہماری کتاب چھپواؤ گے؟“

محمد نے جواب دیا۔ ”ہاں۔ ضرور چھپوایں گے۔“

اللہ نے پوچھا ”محمد! چھپائی کی اجرت کیا ہوگی؟“

محمد نے کہا۔ ”خداوند! اجرت یہی ہے کہ میرے ساتھ وعدہ کرو کہ اس کتاب کا حق عبادت میرے پاس محفوظ رہے گا۔ تاکہ میرے بعد کوئی آکر یہ نہ کہے کہ میرے پاس بھی کتاب آئی ہے۔“

اللہ نے کہا ”محمد! میں تو کسی اور کو اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ اگر تیرے

ہی ”غلاصوں“ میں سے کوئی بک دے تو میں کیا کروں۔“

بہر نوع! یہ کتاب محمدی پریس میں چھپی اور پھینکنے کے بعد پریس کے

دروازہ پر وحی کا پرہ بٹھا دیا گیا۔ ”وَعَايِنِطْنُ عَنْ الْوَلِيِّ الْم“ تاکہ باہر کی بات آنے

نہ پائے۔ اور اپنی بات باہر جانے نہ پائے۔ الغرض کتاب چھپ کر سنائے آگئی

اور یہیں حکم ہوا کہ تم اس کتاب کو پڑھو۔ لہذا ہم نے کتاب کو پڑھنا شروع کیا۔

کتاب کے شروع ہونے کا تھا۔ ”الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ“

محمد! تم ان لوگوں کو یاد دلاؤ جن

کیوں نہیں بتایا۔ آج ہم صرف تیرے دکھنے کی وجہ سے نہیں مان رہے۔ اگر تو "من بعد" لکھ دیتا تو ہمیں کیا اعتراض تھا۔

بزرگانِ من!

اصولِ دین تین ہیں۔ توحید۔ نبوت اور قیامت

توحید و نبوت پر ہمارا "ایمان" ہے اور قیامت پر ہمارا "یقین" ہے۔

اور یقین و ایمان میں فرق ہے۔

دیکھو نا! اگر بڑے زور کی بارش ہو رہی ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج بارش

کیا ہوئی، قیامت ہے۔ اسی طرح کوڑھ میں جب زلزلہ آیا تو ہم نے کہہ دیا۔ قیامت

آگئی، حالانکہ قیامت نہیں آئی تھی مگر ہم نے استعارہ کے طور پر قیامت کہہ دیا۔

قیامت کا لفظ ہم استعارہ کے طور پر تشبیہ کے طور پر شاعری کے طور پر استعمال

کر سکتے ہیں جس طرح اگر یہاں مولانا استہشام الحق تھا الذی تقریر کرتے ہیں۔ (جیسا

کہ انہوں نے یہاں پڑھنا تھا جو کسی وجہ سے نہ آسکے)۔ ہر نوع وہ اگر آجائے اور یہاں

تقریر کرنے تو سامعین بہت لطف اندوز ہوتے۔ اب مولانا موصوف کی تقریریں

کیا ہم استعارہ کے طور پر تشبیہ کے طور پر شاعری کے طور پر یہ کہہ سکتے تھے۔ کہ

مولانا موصوف کی تقریر کیا ہے بس "نبوت" ہے؟ ہرگز نہیں۔

معلوم ہوا کہ توحید و نبوت اتنی مستحکم چیز ہے کہ جس کا نام تشبیہ و استعارہ کے

طور پر بھی نہیں لیا جاسکتا۔ مگر یقین وہاں ہے جہاں شاعری کے طور پر لیا جاسکتا

سکتا ہے۔

ہر نوع! اللہ نے کہہ دیا کہ ایمان لاؤ محمد پر اور ان چیزوں پر جو اس پر نازل

کی گئی ہیں۔ اور ان چیزوں پر جو اس سے قبل نازل کی گئی ہیں۔ وہ کیا محمد کے بعد؟

یہاں تمہاری مرضی۔ ہم تو کچھ نہیں کہیں گے۔ تم جانو اور تمہاری مرضی۔

معزز سامعین!

محمدؐ کتاب لے کر آگئے۔ اور فرمایا کہ اسے پڑھو۔ اسے سمجھو۔ اور کتاب نے بھی اعلان کر دیا کہ دُنیا کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو اس کتاب میں نہ ہو اور دیکھو! اس کتاب کے پہنچانے والے نے کہہ دیا کہ دُنیا کا کوئی ایسا علم نہیں ہے جو میں تمہیں سمجھا نہ سکوں اور یہ اعلان وہ انسان کر رہا ہے جو اُتی تھا۔ جس نے پڑھا ہی کچھ نہیں۔

کیوں بچو!

تمہارے رسولؐ نے کسی درس میں پڑھا تھا؛ ہرگز نہیں دیکھو! جمہوریت کا زمانہ ہے۔ ڈر لگتا ہے کہ اگر مذہب کا معاملہ بھی ہو تو پھر بھی جمہور سے پوچھنا پڑتا ہے اگرچہ یہ غلط ہے۔

سامعین!

میں آج ہی لاہور سے آیا ہوں۔ تاکہ یہاں آپ کے سامنے کچھ بیان کروں۔ اب اگر میں اسٹیج پہ کھڑے ہو کر بجائے تقریر کرنے کے۔ اپنی جیب سے ایک کتاب نکال لوں اور پڑھنا شروع کر دوں۔ ادھر لوگ کہتے ہیں۔

”مولانا! تقریر شروع کریں“

میں کہتا ہوں ”ابھی ٹھہرو“

تھوڑی دیر بعد پھر آواز آئی۔ ”زید می صاحب! شروع کرو!“

میں نے کہا ”ٹھہر دھبی“

جب دس پندرہ منٹ اسی طرح گذر گئے تو تمام مجمع اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور

کہنے لگا۔

”زید می صاحب! اگر یہاں آکر ہی پڑھنا تھا تو تکبیر کیوں فرمائی نہیں تو

ایسا مولوی چاہیے جو گھر سے پڑھ کر آیا ہو۔

صاحبان!

جب آپ ایسے مولوی کو برداشت نہیں کر سکتے جو یہاں آکر پڑھے تو ایسے نبی کو کون برداشت کرے گا جو یہاں آکر پڑھا ہو۔ لہذا ہم تو ایسے نبی کو مانتے ہیں جو یہاں آئے نہ پڑھے، آئی، کہلوائے مگر کائنات کا کوئی علم ایسا نہ ہو جس پر اسے عبور نہ ہو۔ بہر نوع ہمارا بے پڑھا نبی آگیا۔ اور اس نے کہا۔

”دیکھو! میں پڑھا نہیں مگر سب کو پڑھاؤں گا۔ کوئی ایسا علم نہیں جو میرے علم سے باہر ہو۔ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جسے میں نہ جانتا ہوں۔ کوئی ایسی شے نہیں جو مجھے معلوم نہ ہو۔ میں تمہارا ہادی بن کر آیا ہوں۔ تمہیں دین بھی سکھاؤں گا اور تمہیں دنیا بھی سکھاؤں گا۔ کوئی ایسی شے نہیں جو تمہیں بتانے سے رہ جائے لہذا تمہیں ہر شے سکھائی جائے گی۔“

چنانچہ محمد نے ہمیں ہر شے سکھا کے، ہر شے پڑھا کے۔ بھینچنے والے کی زبان سے کہلوا دیا۔ ”الْیَوْمَ مَأْكُلَتْ“ آج کمال ہو گیا۔ آج وہ نبوت جو میری نعمت تھی وہ ”تمام“ ہو گئی۔

بھائیو! ”نعمت“ کے ”تمام“ ہونے کا لفظ بتاتا ہے کہ ”نعمت“ والی نبوت جو تھی وہ تمام ہو گئی اب اگر کوئی ”بے نعمت“ والی نبوت آجائے تو میں کیا کروں۔ بلکہ کيف بے پڑھے نے ہمیں سب کچھ پڑھا دیا لہذا اسکے بعد ہمیں کسی اور نبوت کی مرکز ضرورت نہیں

بچو!

اگر تم ہنسو گے نہیں تو ایک بات سناؤں؟

دیکھو نا! جب میں نے شروع شروع میں مجالس پڑھنا شروع کیں تو ایک دن کسی نے مجھے کہا ”قبل زیدی صاحب“

میں نے کہا "توبہ کرو۔ میں کیسے قبلہ بن سکتا ہوں۔ قبلہ تو علماء ہوتے ہیں لہذا مجھے قبلہ مت کہو"

چند دن بعد کسی نے پھر کہا۔ اور میں نے پھر منع کیا۔ چنانچہ تین چار مہینے شروع شروع میں منع کرتا رہا کہ میں قبلہ نہیں ہوں۔ جب پچاس آدمی مجھے قبلہ کہنے لگے تو میں چیپ ہو گیا۔ اور جب سو دو سو آدمی کہنے لگے تو میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ میں قبلہ ہی ہوں"

اب مجھے بھی یقین ہو گیا۔ کچھ دن بعد تو یہ حالت بھی ہو گئی کہ اب اگر کوئی قبلہ نہیں کہتا تو بڑا لکڑا ہے۔

حضور والا!

اس طرح بن جاتا ہے بننے والا اور نہ یہ مشہور تاریخی شخصیتیں جنہیں "فرعون" و "نمرود" کہتے ہیں۔ کیا وہ پاگل تھے۔ کیا انہیں پتہ نہیں تھا کہ ہم خدا نہیں ہیں؟ حالانکہ ان مسخروں کو پتہ تھا کہ ہم خدا نہیں ہیں مگر پاس بیٹھنے والے بیوقوف اسحق جو کہہ رہے تھے کہ تم خدا ہو۔ لہذا انہوں نے سوچا کہ کیوں نا ان احمقوں سے نائدہ اٹھائیں اور خدا بن جائیں کیونکہ مفت میں بن رہے تھے۔ لہذا فرعون و نمرود خدا بن کے بیٹھ گئے۔ اور یاد رکھو! لفظ فرعون و نمرود اس بات کی علامت ہے کہ ایسا شخص جو ایسی بات کا دعویٰ کرے۔ جو اس میں نہیں ہے تو وہ فرعون و نمرود ہو گا۔ چاہے وہ زید ہو یا بکر ہو۔

اگر اپنی فرعونیت کو مستحکم کرنے کے لئے فرعون نے بھی اپنے وزیر "ہامان" کو حکم دیا کہ میرے لئے ایک "مینار" تو بنا دو۔

گویا فرعون کی یہ پہچان ہے کہ جب کوئی فرعون بنتا ہے تو اپنے لئے ایک "مینار" بھی بنواتا ہے تاکہ اس کی پہچان ہو سکے۔ بہر نوع یوں بن جاتے ہیں اپنے والے

اب ان سے کوئی پوچھے کیوں بنتے ہو؟۔ تو وہ جواب میں کہیں گے، "لوگ جو بنا رہے ہیں اس لئے ہمیں بننا پڑے گا"۔ ہم نے پوچھا، "تہیں معلوم نہیں کہ اس کی سزا کیا ہے؟"

وہ جواب میں کہتے ہیں، "ہمیں اپنا انجام معلوم ہے کہ دنیا میں تو عیش کریں گے اور آخرت میں زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ جہنم میں چلے جا بیٹھیں گے"

سامعین کرام!

آج ہم خدا کے فضل و کرم سے اکٹھے بیٹھے ہیں۔ ایک ہی نبی کا کلمہ پڑھنے میں۔ اور ہمارا کلمہ پڑھنے کا مطلب یہی ہے کہ لاَ إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، جس طرح خدا کے بعد نہ کوئی اور خدا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح، مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللَّهِ کے معنی یہی ہیں کہ محمد کے رسول ہونے کے بعد نہ تو ابوبکر نبی ہو سکتا ہے اور نہ ہی

یاد رکھو!..... محمد کے بعد نہ تو ابوبکر نبی ہو سکتا ہے اور نہ ہی علی نبی ہو سکتے ہیں۔ نہ ہی حسن نبی ہو سکتے ہیں اور نہ ہی حسین نبی ہو سکتے ہیں۔ ان تمام حضرات کی عزت اسی بات میں ہے کہ وہ ختم نبوت کی حفاظت میں مڑ گئے۔ ان کی شان اسی بات میں ہے کہ وہ ختم نبوت کی حفاظت کرتے رہے

صاحبانِ فکر!

تاریخ عالم گواہ ہے کہ حضرت ابوبکر کے زمانہ میں جب "مسلمہ کذاب" کو قتل کیا گیا تھا تو اتنا اتحاد مسلمانوں میں کبھی ہوا ہی نہیں جتنا اس سخرے کے قتل کے وقت ہوا تھا۔ حالانکہ مسلمہ کذاب اہلیت کا ماننے والا تھا، اصحاب کا ماننے والا تھا۔ اور وہ کلمہ بھی یہی پڑھتا تھا لاَ إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ محمد رسول الله اس کی اذان بھی یہی تھی "أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ - أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللَّهِ" اور ساتھ یہ بھی کہہ دیتا تھا کہ محمد بھی نبی ہیں۔ مگر چھوٹا سا میں بھی

نبی ہوں!

بچو! ایک بات بتا دوں کہ منکر وہ ہوتا ہے جو کسی بات سے انکار کرنے اور منکر وہ ہوتا ہے جو کسی بات میں شریک ہو جائے۔ لہذا شرک اور چیز سے انکار کرنے والا منکر کہلاتا ہے جس طرح مسیہ کذاب نے شریک باری تعالیٰ ہونے کے ساتھ ساتھ ختم نبوت سے انکار بھی کیا جس کا جواب اس کے قتل کی شکل میں اہلبیت رسول و اصحاب رسول نے دیا۔

سامعین!

یاد رکھو! اگر کسی کو یہ گمان بھی ہوتا کہ محمد کے بعد کوئی اور نبی آسکتا ہے تو محمد کی اتنی مخالفت نہ ہوتی جتنی ہو رہی ہے۔ محمد کی مخالفت جو ان کی اولاد تک جاری رہی اس کا اصل نکتہ یہی ہے کہ اب نبی کوئی نہیں آئے گا۔

علمائے کرام!

آج میں آپ صاحبان کے سامنے حلفیہ کہتا ہوں کہ اگر یہ نیکو یہ پتہ ہوتا کہ محمد کے بعد کوئی نبی آسکتا ہے تو وہ اتنے بڑے سانچہ عظیم کا ذمہ دار نہ بنتا۔ بلکہ خاموش ہو جاتا کہ چلو کوئی بات نہیں پانچ پچھ سال بعد نبوت کا دعویٰ کروں گا۔ مگر یہ پتہ جانتا تھا کہ یہ دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس نے کہا کہ اہلبیت رسول کو قتل کر دو۔

سامعین!

یہ میرے بیان کے آخری فقرے ہیں کہ آل محمد نے اور اصحاب محمد نے ختم نبوت کی حفاظت کے لئے کہیں منکر ختم نبوت کو قتل کر کے ختم نبوت کو بچایا اور کہیں اپنے آپ کو قتل کر دے کہ ختم نبوت کو بچایا۔ اور پھر

حسبین کے یہ آخری فقرے آج بھی فضا میں گونج رہے ہیں۔ یوم عاشور

ریت کے ٹیلے پر کھڑے ہو کر حسین مسلمانوں کے جمع سے کہہ رہا ہے۔
 "مسلمانو!..... بسُن لو۔ زمین و آسمان سُن لے۔ اللہ کے فرشتے سُن لیں
 فضا و ہوا سُن لے۔ خلا سُن لے۔ پانی کے قطرے سُن لیں۔ ہوا کے ذرے سُن لیں۔ شجر و درخت
 سُن لیں۔ دُنیا کی ہر شے سُن لے۔ پوری کائنات سُن لے کہ میں کہہ رہا ہوں۔
 "ان ابن رسول اللہ" میں بیٹا ہوں رسول کا لہذا ابذلتک نبی کا
 بیٹا پیدا نہیں ہو گا۔ کیونکہ نہ نبی ہو گا اور
 نہ ہی نبی کا بیٹا ہو گا۔

"ان ابن بنت رسول اللہ" میں محمد رسول اللہ کی بیٹی کا بیٹا ہوں۔
 کیونکہ قیامت تک رسول کی بیٹی کا بیٹا
 نہیں آئے گا۔ نہ رسول ہو گا نہ اسکی
 بیٹی ہوگی اور نہ اس کا بیٹا ہو گا۔

یہ کہہ کر حسین نے بلند آواز سے کہا "هل من فاصو"

کوئی ہے جو ختم نبوت کے بچانے میں بھی مدد کرنے؟
 بہر فرغ یہ فقرہ آج بھی فضا میں گونج رہا ہے اور ہم حسین سے وعدہ کرتے ہیں
حسین!

ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تیرے نانا کی ختم نبوت کو محفوظ رکھنے کے لئے ہر وہ قربانی جو
 ہم دے سکتے ہوں۔ دیں گے۔ مگر ختم نبوت پر آغوش نہیں آنے دیں گے۔ یہ کبھی ہمہی نہیں
 سکتا کہ

ہو سیہ خانوں کی رونق اور آئینہ خانے میں

شمع گل ہونے سے پہلے کیوں نہ پڑنے میں

لہذا آج ہم عہد کرتے ہیں کہ ہم پر دانے موجود ہیں اور شمع محمدی پر جلنا ہمارا

فرض ہے۔

محترم بزرگو!

آج مجھ سے پوچھا جا رہا ہے کہ ختم نبوت پر ایمان نہ رکھنے والے مسلمان ہیں یا نہیں؟
تو عرض ہے کہ ان کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے سے پہلے مجھے یہ ڈر کھائے جا رہا ہے کہ میں
اپنے لئے کیا فیصلہ کروں کہ آیا میں بھی مسلمان ہوں یا نہیں؟ اور وہ اس لئے کہ میں نے
اخباروں میں پڑھا ہے اور اپنے کانوں سے سنا ہے۔ کہ اس ملک کے بانی تائیدِ مظلوم
کے جنازے پر کھڑے ہو کر یہ کہا گیا تھا کہ ”میں ایک مسلمان حکومت کا کافر ملازم ہوں یا
ایک کافر حکومت کا مسلمان ملازم ہوں۔“

بہر ذریعہ جو شخص یہ کہہ رہا تھا کہ اگر تم مسلمان ہو تو میں کافر ہوں اور اگر میں مسلمان
ہوں تو تم کافر ہو۔

لہذا آج میں اس شخص کے فیصلہ کے مطابق اپنے لئے فیصلہ کرتا ہوں کہ اگر
میں مسلمان ہوں تو بقول اس کے وہ خود بخود کافر ہو گیا۔ ورنہ میں کافر ہونے کا فیصلہ
کروں گا۔ مجھے تو اپنے بارے میں فیصلہ کرنا ہے۔

اور یاد رکھو!

حکومتیں کوئی فیصلہ نہیں کیا کرتیں۔ یہ فیصلہ ہمیں کرنا ہے۔

دیکھو نا! نبوت سے قومیں بنتی ہیں اور ان میں اشتراک پیدا ہوتا ہے اور
قومیں ادھر ادھر ہوتی ہیں۔ اب آج اگر کوئی صاحبِ نبوت لیکر آئے
ہیں تو وہ الگ، اُمت ہو گئے اور ہم الگ اُمت ہو گئے۔ اب جب ہم الگ الگ
اُمت ہو گئے تو ہمیں کون مجبور کر سکتا ہے کہ ہم ایک ہو جائیں بلکہ وہ تو عینِ امت بزرگ
ہم سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔ لہذا ہم علیحدہ ہیں اور وہ علیحدہ ہیں۔ بس اسی علیحدگی
کا نام تم نے ”بائیکاٹ“ رکھ لیا حالانکہ ”بائیکاٹ“ کوئی انوکھی چیز نہیں ہے

بائیکاٹ کا تو صرف مطلب ہی یہی ہے کہ تم اور ہو۔ اور ہم اور ہیں، ہم کسی کو مارنے نہیں۔ ہم کسی کو ستاتے نہیں۔ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ تم اور ہو۔ ہم اور ہیں۔ تم نے خود ہی نئی نبوت بنا کے اپنے کو علیحدہ کر لیا لہذا تم اور ہو۔ ہم اور ہیں۔ ہمارا تمہارا کوئی میل نہیں۔ ہمارا تمہارا کوئی رشتہ نہیں۔ ہمارا تمہارا کوئی ناظم نہیں لہذا تمہارا یہ کہنا کہ ہمارا بائیکاٹ کیوں کرتے ہو؟ اگر ہم نے کوئی نئی نبوت بنائی ہے تو تمہیں کیا اعتراض ہے۔ شیعہ سنی بھی تو آپس میں لڑتے ہیں؟

سامعین!

ہم کب کہتے ہیں کہ ہم شیعہ سنی آپس میں نہیں لڑتے۔ ہم لڑتے ہیں اور انشاء اللہ قیامت تک لڑتے رہیں گے۔ مگر

یاد رکھو!.... اگر کوئی سنی مجھے قتل بھی کر دے گا تو میرا جنازہ بھی وہی پڑھے گا۔ مجھے دفن بھی وہی کرے گا۔ رہ گئی ہماری لڑائی تو وہ صرف یہی ہے کہ شیعہ سنی دونوں ہم بھائی ہیں اور ہم دونوں بھائی اس بات پر جھگڑ رہے ہیں کہ محمد ہم دونوں کے باپ ہیں۔ شیعہ کہتا ہے کہ میں اپنے باپ کو زیادہ پیارا ہوں اور سنی کہتا ہے "میں باپ کو زیادہ پیارا ہوں گو یا شیعہ سنی کا تو اس بات پر جھگڑا ہے کہ باپ کو پیارا کون ہے؟ اور جس کی مالِ خصم ہی اور کر لیا ہو اس کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ ہمارے ذاتی معاملات میں دخل دے۔"

حضرات!

اگر منطق کی رو سے۔ کسی فلسفے کی رو سے کسی استدلال کی رو سے آج میں یہ کہوں کہ میں نبی ہوں اور میرے نبی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ شیعہ سنی آپس میں لڑتے ہیں تو آپ کہیں گے کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ پاگل ہو گیا ہے، کیونکہ شیعہ سنی کا جھگڑا اور چیز ہے اور نبوت کی دلیل اور چیز ہے۔ اگر ہم شیعہ سنی لڑتے ہیں

توڑنے دو۔ ہماری لڑائی کا ذکر پھیلنے کا مقصد یہ ہے کہ ان احمقوں کے پاس اپنی نبرد کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یونہی خواہ مخواہ کے لئے ہماری لڑائی کی بات چھیڑ دیتے ہیں۔ شیعہ سنی کی لڑائی ہمارے گھر کی بات ہے۔ ہمارا اپنا قصہ ہے۔ کسی کو ہمارے گھر بلو معاملات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

سامعین!

پاکستان بننے سے پہلے میں تاریمان (ہندوستان) میں تقریر کر رہا تھا اور میرے سامنے ایک تختہ سیاہ لٹکا دیا گیا جس پر لکھ دیا گیا۔ ”آپ کا مذہب شیعہ ہے؟“ میں نے کہا۔ ”جی ہاں۔ فرمائیے کیا بات ہے؟“

”زیدی صاحب! یہ بتائیں کہ شیعہ صاحبان کا خلفائے ثلاثہ کے بارے میں کیا عقیدہ ہے؟“

میں نے کہا، ”آپ کو کیا تکلیف ہے۔ آپ کون ہیں پوچھنے والے؟“

”زیدی صاحب! ہم تو یونہی پوچھ رہے تھے۔“

میں نے کہا میری بات سنو! ہر شیعہ کا یہ عقیدہ ہے کہ خلفاء ثلاثہ کا گھوٹا جس جگہ پر پیشاب کرنا تھا۔ اس کے قطرے کے برابر بھی ”نبیاً نبی“ نہیں ہو سکتا۔ ہمارا تو یہ عقیدہ ہے۔ تم اپنی منکر کرو۔ تمہیں ہمارے جھگڑے سے کوئی واسطہ نہیں۔

دیکھو نا!

یہ ایسی شریڈیا ہوئی کہ آج ہم بھائی بھائی ملے بیٹھے ہیں گھر جا میں گئے آپس میں تقسیم پر لڑیں گے۔ شریک جو ہوئے۔ بہر لوزع آج ہم دشمن کے سامنے اٹھے بیٹھے ہیں اور انشاء اللہ اگھے مل کر دشمن کے سوال کا منہ توڑ جواب دیں گے۔

صاحبان! جب ہم ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے

تھے تو راستے میں "غیر مسلم" ہمارے قافلوں پہ حملے کو روکے تھے تو بتاؤ!
اس وقت ہمیں قتل کرتے وقت وہ پوچھا کرتے تھے کہ تم سنی یا شیعہ ہو؟
ہرگز نہیں۔

لہذا جب ہم قتل ہونے کے لئے ایک تھے تو زندہ رہنے کے لئے کیوں نا ایک ہیں
بہر نوع یہ فضول باتیں آج نہیں چلیں گی۔ آج فیصلہ ہو کے رہے گا۔ دودھ کا دودھ
اور پانی کا پانی ہو کر رہے گا۔ یا ہم مسلم ہیں یا تم کافر ہو۔ یا میرا گریبان چاک یا اپنا
گریبان چاک۔ یہ فیصلہ ضرور ہوگا۔ دیر میں ہو۔ جب ہو میرے یہ فیصلہ ہو کے رہے گا
اور رہ گیا۔ "امن" تو سنو ہمیں امن کی تلفیق کرنے والو!

ہم سے بہتر پُر "امن" نہ کوئی ہے اور نہ ہی ہوگا۔ ہم تو بالکل پُر امن ہیں۔
دیکھو نا! ہم ہیں "مومن" اور مومن کا لفظ "ایمان" سے بنا ہے اور ایمان
ہے افعال کے وزن پر اس کا مادہ ہے امن۔ لہذا امن نہ ہو تو ایمان نہیں ہوتا۔
بہر نوع مومن تو ہوتا ہی پُر امن ہے۔ آج تم ہمیں امن کی تلفیق کرتے ہو جھاڑ
پیلے اپنے کو پُر امن بناؤ۔

اب معترض کہتا ہے "زیدی صاحب! ایمنوں نے دودھ پلا دیا تھا" اور
ساتھ ہی مثال یہ دیتے ہیں کہ علیؑ نے بھی اپنے قاتل کو شربت پلایا تھا۔
میں کہتا ہوں "اگر میرے دادا علیؑ نے اپنے قاتل کو شربت پلایا تھا تو اگر فرشتے
پڑی تو میں بھی اپنے قاتل کو شربت پلا دوں گا مگر تمہارے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے
کہ علیؑ نے "ختم نبوت" کے منکر کو شربت پلایا ہو۔

بہر نوع بائیکاٹ کا مطلب یہ ہے کہ تم اور ہو، ہم اور ہیں، ہمارا ہتھار کوئی دستہ
نہیں۔ ہمارا ہتھار کوئی تعلق نہیں۔ اس میں نہ کوئی جھگڑا ہے اور نہ ہی کوئی ٹرانی ہے
بھوکھ کیف! ہم بڑے پُر امن ہیں اور پُر امن رہیں گے۔ انشاء اللہ۔ اور

عہد کرتے ہیں کہ ہم اپنے ایمان کے زور سے ہر بے ایمان کو منائیں گے
کہ یا تو اسے "مومن" ہونا پڑے گا یا پھر ہم سے علیحدہ رہنا پڑے گا۔

بزرگانِ من!

خدا شاہد ہے۔ اس میں تو بہت فائدہ ہے کہ اگر کوئی "غیر مسلم" اقلیت ہو جائے
کیونکہ غیر مسلم اقلیت ہونے سے وہ ہماری حفاظت میں آجائیں گے۔ وہ ہماری ذمی
بن جائے گی اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہونے لگیں گے۔ فرق صرف یہ ہے
کہ وہ ذمی ہماری حصہ دار نہیں رہے گی۔ شریک نہیں رہے گی بلکہ ہماری "رعایا"
بن کے ہماری حفاظت میں آجائے گی۔

سامعین!

میں اپنے بیان کو یہاں آ کر ختم کرتا ہوں کہ میں نے اپنی پورے تقریر میں نہ تو
کسی صاحب کا نام لیا اور نہ ہی کسی پر فرزنداً فقرہ انتقید کی ہے۔ صرف حقیقت بیان
کی ہے یا اپنا عقیدہ بیان کیا ہے۔

عزیز بچو!

دکھ تو اس بات کا ہے کہ مجھے کسی کا نام آنا ہی نہیں۔ میرے ہم وطن یو۔ پی۔ ایلوں کو
یاد ہو گا اور مجھے بھی یاد ہے کہ جب میں بچہ تھا تو میری ماں سردیوں میں میرے لئے
کپڑے میں روٹی سی کر مجھے پہنایا کرتی تھی جسے یو۔ پی کی زبان میں "سوزائی"
کہتے ہیں۔ اب پاکستان میں آ کر ہم نے وہ بھی پہننا چھوڑ دی اور اس کے عوض
"سوئیٹر" پہن لیا۔ لہذا مجھے کسی کا نام یاد ہی نہیں رہا۔ بہر حال ہمارا تو آخری
فیصلہ یہی ہے کہ محمد کے بنی اور اس کے اعلان کے بعد حتمی۔ نقلی۔ برہمنی۔
چھوٹا بڑا۔ مذا تھا۔ شاعرانہ طور پر بھی کوئی اور بنی ہو سکتا ہی نہیں۔ اگر وہ
روئے زمین کے سارے مردوں کو زندہ کر دے۔ جب بھی نہیں۔ اگر اس کی

ساری پیشین گوئیاں صحیح ہو جائیں۔ جب بھی نہیں۔ وہ کچھ بھی کر دے جب بھی نہیں۔

لہذا جب ایک بات طے شدہ ہے کہ نہیں، تو نہیں ہی نہیں ہے۔ گویا محمد کے بعد کوئی نبی ہو سکتا ہی نہیں۔

پیارے بچو! ایک دن مجھے کسی شخص نے کہا۔

”زیدی صاحب! آج فلاں فرقے کا جلسہ ہو رہا ہے۔ وہاں تم بھی

چل کے شرکت کرو۔ کیونکہ وہاں وہ اپنی نبوت کے دلائل پیش کریں گے۔“

میں نے کہا نہیں بھئی! آج مجھے فرصت نہیں ہے۔ کل آؤں گا۔ آج میں

کسی اور جلسہ میں جا رہا ہوں۔

اس نے پوچھا کون سا جلسہ؟

میں نے کہا، ”سنا ہے۔ اللہ میاں ٹرکے ہیں اور آج اس کی تعزیت

ہی جلسہ ہو رہا ہے۔ لہذا میں بھی اسی جلسہ میں شرکت کرنے جا رہا ہوں۔“

اس نے کہا، ”زیدی صاحب! شرم کرو۔ اوشش میں ہو۔ کہیں اللہ بھی

مرکتا ہے؟“

بس بھلا بیو! جس طرح اللہ نہیں مر سکتا اسی طرح محمد کے بعد کوئی

نبی نہیں آ سکتا۔ جی طرح وہ ناممکن ہے اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے۔

بچو!

سنا ہے کہ بھیر کے بچے نے ماں سے کہا کہ۔

”اماں! خور کیا شے ہوتی ہے؟“

بھیر نے جواب دیا۔

”بیٹا! چڑیا رہو۔ لوگوں کا مجھ پر ہی سہیہ ہے۔“

بس بھائیو! اسی طرح کسی نے کسی پاگل سے پوچھ لیا کہ۔
 "قبدا! نبی کے کہتے ہیں؟"
 تو اس نے جواب دیا۔

"چپ رہو۔ لوگوں کا مجھ پر ہی شبہ ہے"

بہر نوع اس طرح بننے والا بن جاتا ہے۔ اور بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ کیا ہو گیا۔
 لہذا ہمارے لیدجوان بچے اپنے ذہنوں میں یہ بات بٹھالیں کہ محمد کے بعد اور
 کوئی نبی ہو سکتا ہی نہیں۔ وہ خاتم الانبیاء ہیں اور وہی سید الانبیاء ہیں۔ یہی
 ہمارا ایمان ہے اور یہی ہمارا اعتقاد ہے۔

خداوند عالم! تمہارے ایمان کی حفاظت فرمائے۔ تمہارے ایمان
 کو مستحکم فرمائے اور تمہیں توفیق استقامت عطا فرمائے۔ تاکہ تم کہیں ڈرکمانہ
 جاؤ۔ گھبرانہ جاؤ۔ چاروں طرف سے دشمن کی یلغار ہے اور عشق محمد حبیبی
 شے تمہارے پاس ہے کہیں کوئی چور یا ڈاکو تم سے یہ قیمتی ہیرا چھین نہ لے۔
 اللہ تمہاری ناسید فرمائے گا۔ تم حق پر ہو اور حق کی اللہ ضرور مدد فرماتا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

عقیدہ سید

خداوند عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر
درود و سلام

حضرات گرامی قدر!

مجھ سے پہلے سرکار علامہ السید نذاحسین قبلہ مدظلہ العالی یہاں وعظ فرماتے تھے جس میں انہوں نے فرمایا کہ حضور سیدہ طاہرا سلام اللہ علیہا کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ وہ حسن و حسین جیلے الاعالیٰ مقام کی ماں ہیں۔ لہذا آج میں بھی علامہ موصوف سے معذرت چاہتے ہوئے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے بجا فرمایا کہ حسین کی ماں ہونا بہت بڑی سعادت ہے مگر میں یہ کہتا ہوں کہ سیدہ کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ وہ زینب کی ماں ہے۔

بہر نوع ماں کا رشتہ اتنا مقدس اور قابلِ فخر ہے

حضور والا!

ایک دن حضور رسالت مآب مسجد نبوی میں منبر پر بیٹھے وعظ فرما رہے تھے کہ اچانک جناب سیدہ طاہرہ سلام اللہ علیہا نے سب سے پہلے تشریف لایا اور رسول نے جیتے دیکھا تو خطبہ چھوڑ کر تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ پاس بیٹھے والوں میں سے کسی نے پوچھ لیا۔

”حضور! یہ سچی کون ہے جس کی اتنی تعظیم کی جاتا ہے؟“

رسول نے فرمایا: ”یہ سچی اپنے باپ کی ماں ہے۔“

سامعین! اگر رسول کہہ دیتے کہ یہ سچی میری بیٹی ہے تو کیا غلط تھا؟

ہرگز نہیں۔

مگر رسوں نے یہ کہہ کر کہ بیچھی اپنے باپ کی ماں ہے۔ ہمیں یہ بتا دیا کہ اگر مجھے رسالت ملی ہے تو اسی بچی کے صدقے میں، اگر نبوت ملی ہے تو اسی بچی کے صدقے میں۔ یہ گویا میری نبوت در رسالت کی ماں ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ماں کسے کہتے ہیں؟

نوجوانو۔ عزیزو۔ بچو!

یاد رکھو! ماں اسے کہتے ہیں جو کسی شے کی تربیت اور دنیا میں آنے کا باعث بنے۔ جیسے بھارت مانا۔ مادر وطن وغیرہ وغیرہ۔ مادر وطن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم وطن کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں بلکہ یہ وہ سرزمین ہے جو اس دنیا میں ہمارے آنے کا باعث بنی۔

جس نے ہماری غذا اور خوراک دی۔ ہماری ضروریات کی جو کفیل ہوئی۔ اس لئے یہ مادر وطن ہے اور جس ذریعے سے ہم اپنے مطلب کو دوسرے تک پہنچا سکیں۔ اسے ہم مادری زبان کہتے ہیں خواہ باپ بھی یہی زبان بولتا ہو۔ مگر مادری زبان کہلائے گی ناکہ پدری زبان کہلائے گی۔

بہر ذریعہ لفظ "ماں" کے اندر جو لطافتیں اور وسعتیں ہیں ان کا شمار اور بیان ناممکن ہے۔

صاحبانِ ذوق!

ہو سکتا ہے۔ لفظ "ماں" "پلید عرش الہی پیکر خدا سے یہ شکایت کرے کہ۔

خداوند! تو نے مجھے بڑا محبوب بنایا تھا مگر کیا کروں اس لفظ میں کچھ ایسے بھی شریک ہو چکے ہیں کہ جن کی وجہ سے مجھے ماں

کہلاتے ہوئے شرم آنے لگتی ہے۔ ورنہ ماں کجا اور بھگڑنا کجا۔
 بہر ذریعہ رسول نے کہہ دیا، "بی بی! اپنے باپ کی ماں ہے"
 یاد رکھو! اس کے معنی اسی یہی ہیں کہ یہ ہے "معدن عصمت" اور
 "خزانہ عصمت" اگر "عصمت کا خزانہ دنیا میں نہ ہوتا تو کوئی نبوت نبوت
 نہ بنتی اور نہ کوئی امامت۔ امامت بنتی۔ گو یا نبوت و امامت اسی عصمت کے
 صدقے میں باقی رہ گئی۔

حضور والا!

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ عصمت رسول کو کس شان سے ملی؟
 دیکھو نا! اہل بیت رسول کی طرف سے ایک مشہور و معروف حدیث
 ہے کہ جب رسول معراج میں تشریف لے گئے اور مقام جنت میں پہنچے۔

سامعین!

محمد مصطفیٰ کی جنت وہ جنت نہیں ہے جس سے آدم نکالے گئے
 تھے اور جہاں آدم و حوا کے سلسلے قائم ہیں۔ گو یا محمد کی جو جنت
 ہے وہ جنت آل محمد ہے جہاں ہمارا تصور بھی نہیں جاسکتا۔
 جہاں ہمارا وہم و خیال بھی نہیں جاسکتا کیونکہ جب محمد کے غلین
 تک کسی نبی کا گذر نہیں ہو سکتا تو محمد کی جنت تک کون پہنچ سکتا

بہر ذریعہ رسول دوران معراج اپنی جنت کا معائنہ فرما رہے تھے اور جب رسول
 نے اعلیٰ سے اعلیٰ شجر دیکھے تو سب سے اعلیٰ شجر پر آپ کی نگاہیں رک گئیں۔ جی میں آیا
 کہ اس شجر کا ثمر مجھے ملے۔ اب محمد کے دل کی خواہش تھی کہ وہ ثمر خدمت حضور
 رسالت مآب میں پہنچا۔ اور حضور نے عالم معراج میں اسے تناول فرمایا۔

سامعین! حدیث میں بھی یہی فقرہ ملتا ہے کہ حضور نے عالم معراج

میں وہ شمر "تناول" فرمایا اور۔

ادھر مولوی صاحبان یہ فرماتے ہیں کہ "روحیں تو کچھ کھاتی بیٹی ہی نہیں مگر یہاں لکھا ہے کہ "تناول فرمایا" اور پھر لطف یہ ہے کہ "تناول فرمانے" کا فقرہ ہی بتاتا ہے کہ رسول کو جسم کے ساتھ معراج ہوا تھا۔

بہر کیف رسول نے وہ شمر تناول فرمایا اور اس شمر کی عجیب و غریب خوشبو رسول کے دماغ میں بس گئی۔ بڑی لطف آیا۔ بڑی سواد آیا۔ اب جو وہ شمر کھانے کے بعد رسول اپنے میزبان سے ہکلام ہوئے اور میزبان نے ایسے لب و لہجہ میں گفتگو کی کہ سواد اور بھی زیادہ ہو گیا۔ گویا عالم معراج میں انداز کلام بھی دماغ میں بس گیا اور خوشبو شے طعام بھی دماغ میں بس گئی۔ اسی طرح رسول معراج سے واپس آئے تو بچے اور اب رسول کے پاس معراج کی دکو یاد گاریں تھیں۔ ایک میزبان نے اب و لہجہ کی لطافت اور ایک اس شمر کی خوشبو۔

صاحبانِ ذوق!

یہی وجہ تھی کہ رسول جب میزبان کے لیے کے مشتاق ہوتے تو اپنے بھائی کو دیکھ کر فرماتے۔

یا علی! ادھر آؤ۔ ہم سے کوئی بات کرو۔

چنانچہ بھائی سے باتیں شروع ہو جاتیں۔ اور لہجہ معراج کا لطف بھی آجاتا۔ اور جب اس شمر کا سواد لینا چاہتے جو جنت آلِ عسجد میں مام معراج میں تناول فرمایا تھا تو اپنی بیٹی سیدہ سے کہتے "بلیا! ذرا میرے پاس بیٹھو، مجھ سے گفتگو کرو۔ تم سے اس شمر کی خوشبو آتی ہے"

حضور والا!

واقعہ معراج کے سال بعد خدیجہ الکبریٰ کے لطنِ طیب و طاہر سے اللہ نے رسول

کو ایک دختر عطا فرمائی۔ رسول نے بیٹی گود میں اٹھائی۔ گھبرا کے کبھی ادھر دیکھتے اور کبھی اُدھر دیکھتے ہیں۔ کبھی ادھر دیکھتے ہیں اور کبھی بیٹے دیکھتے ہیں۔ رسول کی اس گھبراہٹ کو دیکھ کر خدیجہ پوچھتی ہیں، "قبلہ! کیا بات ہے؟" رسول نے فرمایا:-

خدیجہ! یہ تو بالکل اسی ثمر کی خوشبو ہے جو میں نے عالم معراج میں جنت میں کھایا تھا!

گویا رسول کو معراج کے کارنامے کا آج نثر ملا۔

سامعین!

آج نور رسول کو بھی نطفہ آگیا کہ اگر طعام کے شائق ہوں تو بیٹی کے پاس بیٹھ جاؤں اور اگر کلام کے شائق ہوں تو بھائی کے پاس بیٹھ جاؤں۔ گویا آدھی معراج کا لطف علی کے پاس آجائے اور آدھی معراج کا سواد سیدہ کے پاس آجائے۔ یاد رکھو! اب اگر رسول ان دونوں کے گھر تشریف لاتے تھے تو ان پر احسان تصور ہی کرتے تھے۔ بلکہ وہ تو اپنی معراج کسے آیا کرتے تھے۔

بزرگان من!

محمد کے گھر میں بچی پیدا ہوگی۔ اعلیٰ پرورش کے سارے سامان فراہم کئے گئے۔ مگر معراج کی بات تو روحانی بات تھی، مگر دنیاوی نقطہ نظر سے بھی جو اہرات کا چھوڑنا اس کے منہ میں تھا۔ سینکڑوں کنیزیں تیس تیس تو لے سونے کی بیٹی کر رہا ہونے اس بچی کی خدمت میں کھڑی تھیں اور جو اہرات ملے ہوئے خالص سونے کے گہوارے میں سے لٹایا گیا تھا۔ آخر ملکہ عرب کی بیٹی تھی، عرب کی سرفراز شریف زادیاں اس بچی کے گہوارے کی ڈوریاں ہلانا باعث فخر سمجھتی تھیں۔ گویا روحانی عظمتیں محمد کی بدولت اور دنیاوی راحتیں ماں کی بدولت اس بچی کو حاصل

تھیں۔ اس طرح شہزادی کی بڑے ناز و نعم کے ساتھ پرورش کی جا رہی تھی۔

سکامعین !

زمانے کا انقلاب ہو یا وقت کی گردش کہو کہ ابھی بیچے تین سال کی تھی کہ باپ پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے کہ وہی لوگ جو محمد کے پاس بیٹھتے تھے، انہیں پاس نہ رہا۔ جن سے خون کا رشتہ تھا وہ لہو کے پیاسے ہو گئے۔ جو گلے ملتے تھے۔ انہیں گھلا پیدا ہو گیا۔ جن سے پیار تھا وہ دور ہٹنے لگے۔ جن کے دل موم کی طرح نرم تھے۔ وہ سنگدل ہو کے پتھر مارنے لگے۔ جو بھول کی طرح کھلتے تھے وہ کانٹے بچھانے لگے۔ جن کے ساتھ دوستی تھی، وہ دشمنی کے ساتھ پیش آنے لگے۔ جینکے منہ مسکراتے تھے وہ منہ بنانے لگے جن کی عزت بنا دی تھی وہ ذلیل کرنے کے دُپے ہو گئے۔ جو اپنے تھے، وہ غیر بن گئے۔ غرض تمام کامنات ایک انسان کے مقابلے میں اکٹھی ہو گئی۔ اور محمد ایک طرف اکیلے کا اکیلا نمائندہ۔ اور اتنا بے بس نمائندہ؛ نہ سر پہ باپ کا سایہ، نہ استناد کا سایہ، نہ مزنی کا سایہ، نہ خاندان کا سایہ، نہ کسی محافظ کا سایہ اور حد یہ کہ نہ اپنا سایہ۔ اتنا بے سایہ انسان ایک طرف ہے اور پوری دُنیا اس کی مخالفت کر رہی ہے۔

اب بتاؤ! جب ایسے انسان پر جس پر اتنے زیادہ مصائب ہوں تو اس کی پوزیشن کیا ہوگی۔ اسی دوران کسی نے سیدہ سے کہا کہ خانہ کعبہ کے سامنے والے صحن میں دشمنوں نے تیرے باپ کو گھیر رکھا ہے۔ وہ سجدے میں ہیں اور انکی کمر پہ دُنیا بھر کے بوجھ لاکے رکھ دیئے گئے ہیں۔

یہ سنکر بچی دوڑتی ہوئی گھر سے باہر نکلی۔ تین برس کا سن۔ جب مشرکین نے بچی کو آتے دیکھا تو چلائے۔

ہٹ جاؤ۔ خدیجہ کی بیٹی آ رہی ہے،

گویا مشرکین کے دل میں بھی خدیجہؓ کی اتنی عظمت تھی۔ اب ان مشرکین سے کون پوچھے کہ جب خدیجہؓ کی تین سال کی بیٹی کا نوانسا احترام کیا جا رہا ہے مگر اس کی جوان بیٹیوں کو عناق دے کر گھر سے کیوں نکال دیا۔ کیا اس وقت احترام خدیجہؓ یاد نہ تھا؟ بہر نوع اس شان شوکت سے حضور سیدہ طاہرا سلام اللہ علیہا کی پرورش ہوئی رہی۔ جب آٹھ نو سال کا سن ہوا تو حضور کو مکہ سے ہجرت کرنا پڑی۔ چنانچہ حضور اپنے عزیزوں کو چھوڑ کر مدینہ تشریف لائے۔

حضور والا!

آپ لوگ جذبات و عقیدت کی رُو سے ہجرت کے فتعات سنتے ہیں کبھی ان واقعات کو دنیا داری اور عام معاملات کی رُو سے بھی سن لیا کریں کہ اتنا بڑا خطرناک ماحول۔ دشمنوں کا اتنا بڑا غلبہ کہ محمدؐ کا رہنا بھاری ہے۔ اتنے بڑے خطرناک ماحول میں محمدؐ اپنی جان بچا کے تو چلے گئے مگر بیٹی کو اور اپنے ناموس کو دشمنوں میں ہی چھوڑ دیا۔ اب بناؤ! اپنی بیٹی اور ناموس کو دشمنوں میں اکیلے چھوڑ کر اپنی جان بچا کر چلے آنا۔ یہ کوئی شریفوں کا شیوہ ہے؛ آخر محمدؐ نے اپنی بیٹی اور ناموس کی حفاظت کا کوئی پکا انتظام کیا ہو گا۔ کہ رسولؐ کو اپنے ناموس چھوڑتے پر کوئی خطرہ ہی نہیں محسوس ہوا ورنہ اپنی جان بچا کر اتنے بڑے خطرناک ماحول میں چھوڑ کر چلے جانا ناممکن بات تھی۔ اللہ جانے ایک نوجوان نے رسولؐ کے گھر میں رہ کر کتنی چیزوں سے رسولؐ کو مطمئن کر دیا۔ نہ ناموس کا خطرہ باقی رہنے دیا اور نہ ہی رسولؐ کی زندگی کا خطرہ باقی رہنے دیا۔

صاحبان!

دنیاوی نقطہ نظر سے کبھی کبھی یہ بھی سوچ لیا کرو کہ وہی پھرے ہوئے عرب اور بگڑے ہوئے مشرک جو رات کو قتل رسولؐ کے لئے آئے تھے۔ آج

رسول کے گم ہو جانے پر ان کا غصہ ایک دم بڑھ گیا ہوگا یا نہیں؟ بہت ہی بگڑے ہوں گے۔ بڑا ہی غصہ آیا ہوگا۔ اپنے ہی ہاتھوں کو کاٹتے ہوں گے کہ ہم سے کیا غلطی ہو گئی۔ ہم نے آٹے ہوٹے شکار کو کیوں جانے دیا۔ اور سب سے زیادہ غصہ تو اس نوجوان پر آیا ہوگا کہ جس نے ان کی ساری سکیم کو بستر پر سوکے ضائع کر دیا۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ اور ابو جہل صاحب جو تمام قبائل کے تجربہ کار بہادر تھے۔ اس بچے کی اس حرکت کو دیکھ کر بہت پریشان ہوئے اور کہنے لگے۔

اس بچے نے تو ہمارا تمام پروگرام خاک میں ملا دیا۔ اس بچے سے تو وہ بڑھا اچھا تھا جو رور کے اشارے دیتا رہا۔ اللہ جانے اس بچے نے کیا کر دیا۔ ابی طالب کا یہ لڑکا تو بڑا ہی عجیب نکلا۔

میں کہتا ہوں، بزرگو!

تم فکر مند کیوں ہو گئے۔ اگر واقعی اس بچے نے تمہارا منصوبہ خاک میں ملا دیا ہے تو بہتر ہے کہ تم اسی سے ہی سارا بدلہ اتار لو۔ اور پھر یہ بچہ بھی بڑی نازک پوزیشن میں ہے، کیونکہ اس کے ساتھ پردہ دار خواتین بھی ہیں۔

سامعین!

تاریخ عالم گواہ ہے کہ حیب یہ عرب سردار اس نوجوان کے پاس آئے اور پوچھا کہ محمد کہاں ہیں۔ تو تمام مذاہب نکر کی تاریخ پڑھ ڈالو تمہیں یہی فقرہ ملے گا۔ کہ اس نوجوان نے جواب میں صرف یہی کہا، کیا تم محمد کو ہمارے سپرد کر گئے تھے۔ جاؤ میرے گھر سے نکل جاؤ!

تاریخ عالم گواہ ہے کہ بچے کا فقرہ سن کر تمام اہل مکہ خاموش ہو گئے۔ اللہ جانے

اس نوجوان کا ان لوگوں پر کتنا رعب تھا کہ صبح کو وہی اُن سے کہہ رہا ہے کہ مجھے چار اونٹ کرائے پر چاہئیں۔ لطف یہ ہے کہ اونٹ ان ہی سے مانگ رہا ہے جو رات کو گھر گھرے کھڑے تھے اور بڑی شان و تمکنت سے کہہ رہا ہے "دیکھو! آج ہم جا رہے ہیں۔ کسی میں ہمت ہو تو روک کے دیکھو" اب بناؤ! قدرت کے بہائے ہوئے سمندر کے دھارے کو کون روک سکتا ہے اور اللہ کی چمکائی ہوئی بجلی کی لہر کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے بہر نزع علیٰ بڑے آرام سے اونٹوں پر غلبیں بندھو اگے۔ پردے کا انتظام کر کے مستورات کو سوار کر کے خود پیدل چل پڑے اور اہل مکہ سے کہہ رہے ہیں۔

"مکہ والو! ہم جا رہے ہیں۔ کسی میں ہمت ہے تو روک کے دیکھو" بھائیو! ایک بات بناؤ کہ اگر وہ اہل مکہ محمد کے اہل و عیال کو یہ خیال کر لیتے تو محمد واپس آنے پر مجبور ہو جاتے یا نہیں؟ مگر کسی کو ہمت ہی نہیں تھی کہ انہیں روک سکتا۔ تاریخ عالم کی ان اداؤں پہ دُنیا پر ترقی ہے کہ اس بچے میں کیا کمال تھا کہ اتنے بڑے دشمنوں کے نرغے سے ناموس رسول کو نکال کر لے آیا۔ بہر نزع قافلہ چل پڑا اور سب اہل مکہ اپنے گھروں کے پیچھے۔ مکانوں کی پھتوں پر منڈیروں کی آڑ میں بیٹھے بیٹھے یہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ جانے! محمد کا یہ بھائی کتنا زبردست ہے۔

سَامِعِينَ كَرَامًا!

یکم ربیع الاول کو محمد نے مکہ سے ہجرت کی اور جب قافلہ ناموس محمد مدینے پہنچا تو اس دن آٹھویں ربیع الاول تھی اور جب رسول اپنے ناموس دستورات کے ساتھ مدینہ وارد ہوئے تو نو ربیع الاول تھی۔ بہر کیف! ربیع الاول گذرا۔ ربیع الثانی گذرا۔ جمادی الاول گذرا۔ جمادی الثانی گذرا۔

حتیٰ کہ جب ذیقعد کا آخری ہفتہ تھا تو کچھ صنادید عرب نے بقول مسلمانوں کے جو آسمان اسلام کے شمس و قمر کہلاتے ہیں، انہوں نے آپس میں صلاح مشورے کئے اور سر جھکائے رسول کی خدمت میں آ بیٹھے۔

رسول نے پوچھا: "کیوں بھئی۔ خیریت تو ہے۔ آج بڑے اُداس دکھائی دیتے ہو۔"

چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی سے کہا: "بڑے بھائی! تم کہو نا۔ رسول نے پھر فرمایا: "کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟" چنانچہ دونوں نے جو آسمان اسلام کے شمس و قمر کہلاتے ہیں۔ بڑے لجاجت آمیز لہجے میں عرض کی۔

"سرکار! ہم حضور کے غلام ہیں۔ حضور کے نوکر ہیں۔ حضور کے ہاتھوں پہی مسلمان ہوئے۔ رسول نے فرمایا:

"ہاں ہاں ٹھیک ہے مگر تم پتہ کیا ہو؟"

"قبلہ! عرض یہ ہے کہ ہم ————— اگر ————— حضور ہیں اپنی فرزندگی میں قبول کر لیں۔"

بس بھائیو!

تاریخ عالم گواہ ہے کہ اتنا فقرہ منہ سے نکلنا تھا کہ رحمت اللعالمین کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور پورے غصے میں فرمایا۔

خبردار! اگر کسی نے میری بیچی کا نام اپنی زبان پہ لیا۔ نکل جاؤ

یہاں سے۔"

سامعین! اب بتاؤ! کوئی ہے جو رسولوں سے یہ پوچھے کہ

حضور! یہ تو بیچارے آسمانِ اسلام کے شمس و قمر ہیں جنہیں آپ نے
 جھڑک دیا۔ مگر یہ نہ دیکھا کہ اس بچی کی بڑی بہنوں کو مشرکوں کے حوالے کر دیا یا
 تو وہ بیٹیاں ہی نہیں تھیں یا پھر یہ بچی ان سے مختلف ہے۔
 بہر نوع دونوں بزرگ حالتِ پریشانی میں اٹھ کر چل پڑے اور آپس
 میں کہنے لگے۔

”اگر محمد نے ہمیں ٹھکرا دیا ہے تو پھر اس کا رشتہ اللہ ہی کے ہاں سے
 آئے گا۔“ رسول نے بھی یہ گفتگو سن لی۔ دل میں سوچا۔
 ”میرا بھی نام محمد ہے۔ میری بیٹی کا رشتہ اللہ ہی کے ہاں سے
 آئے گا۔“

بزرگان من!

جس طرح ہم مولویوں کی دوڑ مسجدِ ننگ ہی ہوتی ہے اسی طرح رسول
 کی دوڑ بھی اللہ ننگ ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ محمد نے وہیں مصلیٰ بچھا یا اور
 دعائمانگی۔

”خدا ارندا۔ یہ لوگ مجھے طعنے دے رہے ہیں۔ تو نے ہی میری
 بچی کو جنتِ محمدی کا ثرینا یا فقہا۔ تو نے ہی اس کو سیدہ نساء
 بنایا فقہا۔ تو نے ہی اس کو خزینہ عصمت بنایا فقہا۔
 تو کہتا ہے کہ جب ننگ جوڑ برابر کا نہ ہو رشتہ نہ ہو۔ اب مجھے
 نہیں معلوم کہ اس کا رشتہ کہاں ہو گا۔ لہذا تو ہی بنا کہ یہ رشتہ
 کہاں ہو گا۔“

رسول یہ دعافرا رہے تھے اور قدرت کی طرف سے سکراہٹ کے
 گلدستے نذر کئے جا رہے تھے۔

محمد! گھراؤ نہیں۔ تمہاری بیٹی کا رشتہ ہمارے گھر میں ہو گا۔
 "بلو! ہمارے گھر رشتہ کرنے پر راضی ہو؟"
 محمد نے سر جھکا کے اپنے محبوب سے فرمایا۔
 "خداوند! رشتہ تو منظور ہے مگر باضابطہ طور پر منظوری کی رسم
 بھی ہونی چاہیے۔ لہذا تو باقاعدہ میری طرف پیغام بھیجنا کہ میں
 بھی غور کروں۔"

اعلیٰ حضرت نے کہا۔

"محمد! آج ہی کی رات تمہیں پیغام بھیجیں گے مگر یاد رکھنا
 ہمیں بھول نہ جانا۔"

اے حضور والا!

اعلیٰ حضرت نے اب رشتہ کی تیاریاں شروع کر دیں کہ رشتہ ہم کو یہی گے
 رشتہ ہماری طرف سے ہو گا۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت نے آج کی رات رشتہ
 یوں طے کیا۔

اپنی قدرت کی بے پناہ وسعتوں کو سمیٹ کے رشتہ کرنے کا ارادہ کیا
 اور اپنی تمام طاقتوں کو ایک مرکز پر جمع کیا۔ کائنات میں پھیلی ہوئی صفات ثبوتیہ
 اور سلبیہ کو ایک جگہ لاکے اکٹھا کیا اور جب اللہ صبح معنوں میں اللہ بن کے مسند
 عزوجل پر بیٹھ گیا تو کہا۔

"آج محمد کے گھر رشتہ ہو گا۔"

چنانچہ چاروں طرف کہکشاں کی سڑکیں بنا دیں اور نصری و شیری کے صوفے
 بچھا دیئے۔ سنبلا کے گلدستے سجادیئے اور قوس قزح کی تنائیں لگا دیں دل بادل
 کے سائبان لگا دیئے۔ اور شفق کے پردے لٹکا دیئے اور تمام مخلوق سجادہ

اپنے اپنے ترینے سے آکے بیٹھ گئی سوا لاکھ انبیاء بھی اپنی کرسیوں پر آکے بیٹھ گئے۔ اور ملائکہ انتظام میں کھڑے ہو گئے۔ اور حوروں نے جنت کے درپے کھول کر اس محفل کا منظر دیکھنا شروع کیا۔ چنانچہ جب ساری محفل ہم گئی تو اعلیٰ حضرت نے پوری جلال و جبروت کی آواز کے ساتھ خطبہ پڑھا۔

”اے آسمان کے رہنے والو!

اے فرشتو!

قلعہ معلیٰ شاہی میں پیدا ہونے والے سعادت مند فرزند کا رشتہ آج ہم رحمت اللعالمین کی دُختر نیک اختر سے کرنا چاہتے ہیں گویا آج قدرت و رحمت کا جوڑ ہو گا۔“

اعلیٰ حضرت کی یہ بات سن کر تمام مخلوق سمدی نے کہا:

”خداوند! مبارک ہو۔ اس سے بہتر کیا جوڑ ہو سکتا ہے۔ مگر ہمارا انعام

ہمیں دیا جائے۔“

اعلیٰ حضرت نے فرمایا:

”ہاں ہاں ہنہارا انعام تمہیں ضرور ملے گا۔ مگر جب ملے گا جب بارات

لڑکی کے گھر پہنچے گی۔ اور دیکھو! پہلے تم ایسا انتظام کرو کہ تم میں سے کوئی

صاحب ہمارے طرف سے لڑکی والے کے گھر جائیں اور ہماری طرف سے یہ

پیغام دیں کہ ماہ دولت یہ رشتہ چاہتے ہیں۔

اور دیکھو! ہم آج ہی اپنے علم کی تمہیں چاہتے ہیں۔ محفل سیرگان بھری پڑی

لہذا بتاؤ تم میں سے کون جائے گا؟

جبرئیل نے بڑھ کے عرض کی ”خداوند! میں حاضر ہوں۔“

اعلیٰ حضرت نے فرمایا ”جبرئیل! دیکھو۔ ہر بات میں دخل نہ دیا کرو۔“

اپنی حیثیت میں رہو۔ آج تمہارا جانا مناسب نہیں۔ لوگ یہی کہیں گے کہ جبریل پہلے بھی آیا کرتا تھا۔ اگر آج آگیا تو کیا ہوا۔ لہذا تم بیٹھ جاؤ۔ خیر سے جب بچے ہوں گے تو انہیں بہلانے چلے جانا۔ ان کا بھولا بھولانے چلے جانا۔

محترم سہامعین !

محفل سیارگان میں سے آفتاب نے عرض کی۔

”خداوند! چونکہ میں سید بخوم ہوں لہذا اجازت ہو تو میں چلا جاؤں اور شاعروں کا سہرا پیش کر کے منگنی کی رسم پوری کر دوں؟“
قدرت نے جواب دیا۔

”آفتاب! تمہاری عرضی تو قابل قبول ہے مگر یہ خوشی کی تقریب ہے

اور خوشی کی تقریب میں ”جلنے والے“ اچھے معلوم نہیں ہوتے لہذا تم بیٹھ جاؤ۔

چنانچہ سورج بھی بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت نے چاند سے پوچھا۔

”کیوں میرے چاند! جاؤ گے؟“

چاند نے عرض کی۔

”خداوند! جانے میں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر جہاں تو مجھے بھیج رہا

ہے۔ وہ تیرے محبوب کا کوچہ ہے۔ وہاں مجھ غریب پر انگلیاں اٹھتی ہیں اور

میں کٹ جاتا ہوں لہذا مجھے وہاں جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔“

صاحبانِ ذوق!

اعلیٰ حضرت کی نگاہ انتخاب آخر ”ستارہ زہرہ“ پر آ کے رُکی۔

”زہرہ! ہماری طرف سے رشتہ کا پیغام لیکر جاؤ گے؟“

زہرہ نے عرض کی ”خداوند! اس سے بڑھ کے اور سعادت مجھے

کیا چاہیے۔ چنانچہ زہرانے گلدستہ پیغام لیکر زمین کی طرف روانگی کا ارادہ

کیا۔ اور زہرہ کو آتے جو دیکھا تو مرکز عالم و عالمیان نے کہا، "اللہ اکبر" جب زہرہ
 "بیت النبوی" میں پھڑکتی تو کہا، "الحمد للہ" اور جب پیغام مسرت لیکر
 واپس جاتے دیکھا تو کہا، "سبحان اللہ"

بس بھائیو!

یہ فقرے تسبیح جناب سیدہ، مومنوں کو بارات کی خوشی میں انعام کے طور پر
 ملے تاکہ قیامت تک آنے والا ہر مومن اس بارات کی زیارت سے فیض یاب
 ہوتا رہے۔

اور یاد رکھو! تسبیح سیدہ تو بن گئی۔ مگر اس وقت تک مکمل نہیں ہوگی جب تک
 نماز کے بعد جن کے لئے سیدہ نے "دُعا" کا وعدہ کیا ہے۔ ان کے لئے
 "دُعا" اور جن کے لئے "سید دُعا" کو کہا ہے۔ ان کے لئے بددُعا کر دے
 تب جا کے تسبیح سیدہ مکمل ہوتی ہے۔

سامعین کرام!

اعلیٰ حضرت کی طرف سے جب رشتہ مکمل ہو گیا تو محمدؐ نے فرمایا:

"یا علی! ہم اپنی لڑکی کا عقد تمہارے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔"

علیؑ نے شرم سے سر جھکا دیا۔ اور رسولؐ نے پوچھا۔

"یا علی! میری بیٹی کا جبر کیا ہو گا؟"

علیؑ خاموش ہیں۔ سمجھ نہیں آتی کہ اتنے بڑے گھر کی بیٹی کو کیا ہر پستی

کروں۔ آخر عرض کی۔

"قبیلہ! میرے پاس جو سامان ہے وہ حضورؐ کو معلوم ہے۔ میرے پاس

صرف ایک گھوڑا، ایک تلوار اور ایک ذرہ ہے۔"

رسولؐ سنس کے فرماتے ہیں، "یا علی! ان میں سے غیر ضروری شے تمہارے

پاس صرف ذرہ ہے لہذا اسے بیچ دو۔

بزرگو!

انصاف چاہتا ہوں۔ بناؤ! کیا اب طالب کے بیٹے کی جان اتنی سستی تھی۔ خواہ دوسرے اصحاب چھ چھ ذریں پہن کر میدان جنگ میں جائیں مگر غریب ابی طالب کے بیٹے کے پاس ایک ہی ٹوٹی پھوٹی ذرہ تھی وہ بھی بلوادی۔ رسول جواب میں فرماتے ہیں:

”دیکھو نا۔ دوسروں کو ذرہ کی ضرورت ہوگی مگر میرا بھائی ذرہ وغیرہ کا محتاج نہیں ہے۔ یہ تو صرف رسمی طور پر جنگی لباس پہن لینا ہے۔ ورنہ علی کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

حضرات!

آپ کو تاریخ کے پسند حملے سنانا جاؤں جو علی کی ذرہ کی تعریف میں لکھے گئے ہیں۔ تاریخ میں تو یوں ہے کہ علی کی ذرہ کپڑے کی بنی ہوئی تھی اور اگلی طرف تھوڑا سا لوہا لگا ہوا تھا۔ ایک دن کسی نے پوچھ لیا:

”یا علی! کپڑے کی ذرہ کیوں پہنتے ہو؟“

حضور نے فرمایا: ”تاکہ سپاہی کی باضا بطلہ و ردی بکلی ہو جائے؟“

پھر پوچھا گیا:

”یا علی! ذرہ کے سامنے کی طرف لوہا کیوں لگا لیا ہے؟“

فرمایا: تاکہ سامنے سے لڑنے والا آئے تو لوہا دیکھ لے۔“

”یا علی! اگر کسی نے ذرہ کے پیچھے سے وار کر دیا تو؟“

علی نے فرمایا: ”ابی طالب کا بیٹا اس دن زندہ ہی نہیں رہے گا جس دن دشمن کو

پشت پر آنے کا موقعہ دے۔

بہر نوح علیؑ کی یہ ذرہ تھی جس کے لئے رسولؐ نے فرمایا کہ اسے بیچ دو چنانچہ امیر المؤمنین نے ایک سو سات روپیہ میں وہ ذرہ فروخت کر دی اور پیسے لاکر حضور رسالت مآب کے سامنے رکھ دیئے۔ حضور نے ان پیسوں میں سے کچھ تو ہندی منگوائی۔ ایک جوڑا کپڑا منگوا لیا اور باقی کچھ اور سامان۔ اس کے بعد شہنشاہ ارض و سماء اپنے گھر میں جا کر اپنی بیٹی کے جہیز کا سامان تیار کرنے لگے۔ اور شام تک جہیز تیار ہو گیا۔ جب سب کچھ تیار ہو گیا تو مسجد میں بیٹھ کر رسولؐ نے نکاح پڑھا اور کچھ دیر بعد سیدہ کو رخصت کرنے کی نیاری ہونے لگی۔

ادھر علیؑ نے اپنے کمرے کے فرش کو اس طرح سجایا کہ ایک بکری کی کھال بچھائی۔ جس پر دُہن کو لاکے بٹھانا تھا۔ ایک طرف ایک اور بوریا بچھا دیا تاکہ کوئی ملنے والا آئے تو یہاں بیٹھ جائے۔ اس کے بعد امیر المؤمنین نے اپنا تولیہ ایک کھوٹی پر لٹکا دیا اور دوسری کھوٹی پہ آٹا بچھانے والی بچھانٹی لٹکا دی۔ اور جب مشکل کشاء عالمین کی محل سراء تیار ہو گئی تو شہنشاہ ارض و سماء کی اکلوتی بیٹی کا جہیز نکلنے لگا۔ ادھر دنیا تماشائی کھڑی ہے کہ اللہ جانے۔ سید الانبیاء اپنی اکلوتی بیٹی کو جہیز میں کیا کیا دیں گے۔ مگر دنیا نے دیکھا کہ جب جہیز کا سامان برآمد ہوا تو سونے کیلئے ایک بوریا تھا اور ڈھنے کے لئے ایک چادر تھی۔ پانی پینے کے لئے لکڑی کا ایک گلاس تھا۔ آٹا پینے کے لئے ایک چکی تھی۔ چھ چاندی کی جوڑیاں تھیں اور دقتانہ کی دیگیں تھیں اور ایک مشکیزہ تھا۔ یہ گویا اس کی بیٹی کا جہیز تھا جس نے عرب کی لاکھوں بیٹیوں کی لاکھوں روپے دے کر شادی کر وادی تھی۔

بہر نوح شہنشاہ ارض و سماء کی اکلوتی بیٹی کا جہیز سروں پر اٹھائے احباب چلے۔ ادھر حضور نے ایک ناتنے کے اوپر حمل لگا کر سیدہ کو

اس میں بٹھا دیا اور تمام اہانت المؤمنین کو حکم دیا کہ میری بیٹی کے جلوس کے پیچھے پیچھے مدحیہ اشعار پڑھتی چلو۔ چنانچہ ہر ام المؤمنین مدرح کے اشعار پڑھتی ہوئی چلی جا رہی تھی اور رسول زار زار رو رہے تھے۔ ہائے آج خدیجہؓ زندہ ہوتی۔ ہائے آج چچا ابی طالبؓ زندہ ہوتے؟

بہر نوع ہاشم کی تیادت میں سیدہ کی شادی کا جلوس گزرنے لگا تو اچانک حضور رسالت مآبؐ نے تمام مسلمانوں میں سے سلمان فارسیؓ کو آواز دی۔

”سلمان! اردھراؤ۔“

جب وہ پیچھے تو حضور نے ناتے کی عمارت سلمان کے ہاتھ میں ڈیرتی

حضور والا!

یہ ہے اپنے اپنے انبال کی بات۔ اتنا فقہ و زمان ہے یہ مسلمان
 کہ اگر کوئی ان سے محبت کرے تو یہ اس کا جملہ غم و غم دہانت ہے
 میں۔

بہر کیفیت۔ شادی کا یہ جلوس رسول کے گھر سے روانہ ہو کر علیؓ
 کے گھر میں آگیا۔ اور سیدہ طاہرہؓ سلام اللہ علیہا کی آج شادی
 ہو گئی۔

آج ہم نے اسی شادی کی یادگار کے سلسلے میں ایک منہج تنظیم الشان
 جلسہ منعقد کیا ہے۔ جہاں کیا ہے۔ آج ہمارا یوم عید ہے۔ آج ہم ان طعنہ
 دینے والوں کو توجیہ کہتے ہیں کہ شیورہ دیتے ہیں۔ انہیں یہ دکھانا چاہیے ہیں
 کہ ہم جیسا منس بھی کوئی نہیں سکتا آج آپ لوگ براقی بن جائیں اور میں
 اس دربار کا بھانڈ بن جاؤں اور آج ہم مولائے فریاد کرتے ہیں۔

افشاء شکریہ

معزز سامعین کو رام!

اللہ کی طرف سے انسان کے اندر ودیعت کردہ طاقتوں اور صلاحیتوں کو موقع کے مطابق عمل میں لانے کا نام "اسلام" ہے۔ گویا اسلام انسان کی کسی طاقت کو معطل نہیں کرتا بلکہ انسانی طاقتوں اور صلاحیتوں کو صحیح طریقے سے استعمال میں لانے کا نام ہی اسلام ہے۔

دیکھو نا! علم لغت یعنی زبان کے اعتبار سے عربی زبان میں طاقت کے کمال کو "ملکہ" کہتے ہیں۔ اب اگر آپ لفظ "ملکہ" کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ سوچیں کہ جب اللہ نے انسان کو پیدا کیا تو تمام ملائکہ کو حکم دیا کہ اس کے تابع ہو جاؤ، گویا دنیا کی جتنی قوتیں اور طاقتیں تھیں، ان سب کو حکم ہوا کہ "تم انسان کے تابع ہو جاؤ" لہذا تمام طاقتیں انسان کے تابع ہو گئیں۔ صرف ایک نفس انسانی کی طاقت تھی جو "شیطان" بن کے باغی ہو گئی۔ اور یاد رکھو! ان تمام طاقتوں پر غالب آنے والا "غالب" کہلاتا ہے۔ اور جو اپنے نفس کی طاقت پر غالب ہو جائے وہ "مُکَلِّمُ غَالِب" کہلاتا ہے۔ بہر ذلک انسان تمام طاقتوں کا منبع اور مرکز ہے اور ان تمام طاقتوں کو صحیح استعمال کرنا ہی اسلام ہے

بزرگان من اس تشبید کے بعد میں آپ سے آسان

لفظوں میں گفتگو کرتا ہوں۔ جہاں ہزاروں طاقتیں انسان میں ہیں وہاں انسان میں یہ بھی ایک طاقت ہے کہ وہ کسی حد پر جا کر رکنا پسند نہیں کرتا۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ انسان چاند پر جا کر ٹوک جائے گا۔ بلکہ چاند پر پہنچ کر بھی کہیں اور جانے کی کوشش کرے گا۔ گویا کسی حد پر نہ رکنا یہ بھی انسان کی ایک طاقت ہے جو انسان کے اندر موجود ہے۔

محترم سامعین!

مثال کے طور پر سمجھانا ہوں کہ ایک بچہ مجھے کہتا ہے۔

”زیدی صاحب! مجھے نوکر کر دو۔“

میں نے پوچھا۔ ”برخوردار! کتنی تنخواہ چاہیے؟“

نوجوان بولا۔ ”تقریباً بیس روپے مل جائیں گزارہ ہو جائے گا“

اتفاق سے ہم نے سو روپیہ ماہوار کی نوکری دلوادی۔ اب جو چند دنوں بعد

ہم نے اس نوجوان سے پوچھا۔

”برخوردار! حال کیسا ہے؟ تو کتنے لگا۔“

”زیدی صاحب! سو روپیہ میں گزارہ مشکل ہے۔“

بہر نوع! ہم نے کسی طرح سے اس کی دو سو روپیہ ماہوار کروادی۔ گلاب

پھر چند دنوں بعد پوچھا تو یہی جواب ملے گا کہ ”گزارہ مشکل ہے۔“ آخر ہم نے

ہزار روپیہ کر دیا مگر پھر یہی شکایت کہ گزارہ مشکل ہے۔ کیا مجال جو کسی جگہ پر انسان

رکنا ہو۔ آخر ہم نے مشورہ کر کے اسے پورا ضلع دے دیا تاکہ اس کا گزارا ہو جائے۔

لیکن چند دنوں بعد پوچھا کہ بس! وہ بولا ”نہیں“ پھر ہم نے اسے ایک کٹنری

دے دی۔ پھر پوچھا۔ بس! مگر اس نے پھر اسی نفی میں سر ہلا دیا۔ آخر ہم نے

مجبوراً پورا ملک دے دیا۔ لیکن اس کی ”نہیں“ بدستور قائم رہی۔ اب

آپ چاہے اسے پوری دنیا دے دیں۔ مگر جب بھی پوچھیں گے وہ یہی کہے گا
 "ابھی اور"۔ کیا مجال جو اس کی "ابھی اور" ختم ہو جائے۔ لہذا اس "اور" کے
 جذبے نے انسان کو بڑھا بڑھا کے "خدا" بنا دیا۔ مگر ادھر انسان ہے کہ خدا
 بننے کے بعد بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اب کیا بنوں؟ کہ اسے "موت" آگئی تو گیا
 موت نہ آتی تو انسان کچھ اور بن جاتا۔

سامعین!

آپ یقین فرمائیں کہ فرعون و نمرود پاگل تھے، یہ کوئی احمق نہیں تھے انہیں
 پتہ تھا کہ ہم خدا نہیں مگر یہ "اور" کا جذبہ تھا جو انہیں خدا بنوا رہا تھا۔

یاد رکھو! دو چیزیں انسان کا دماغ خراب کر دیتی ہیں ایک "جذبہ" اور
 اور دوسرا "پاس بیٹھنے والا"۔ اس لئے کہ اگر بننے والے نے ناجائز بات بھی کہی
 تو پاس بیٹھنے والے کہہ دیتے ہیں۔

حضور! بالکل درست ہے۔ حضور! بالکل مجاہد ہے۔

اور بننے والا یہ سمجھتا ہے کہ میں واقعی "بالکل درست ہوں" کیونکہ اتنے
 آدمی ہمیری بات کو درست اور بجا کہہ رہے ہیں

دیکھو نا! بیچارے نمرود و فرعون نے ہزاروں بار لوگوں سے کہا کہ
 ہم خدا نہیں بن سکتے۔ مگر پاس بیٹھنے والوں نے کہا "نہیں۔ نہیں بننا پڑیچھ"
 آخر وہ بن گئے کیونکہ ان میں "اور" کا جذبہ تو بیٹھے ہی سے تھا اس لئے وہ لوگوں
 کے بننے سے فوراً بن گئے۔ بہر کیف یہ انسانوں کی ایک عادت ہے جو کثرتِ استعمال
 سے "فطرت" بن جاتی ہے۔ اور انسان کے اندر "ہوس" کا جو مرکز ہے
 وہ انسان کا "دماغ" ہے اور دماغ کی شکل ایلٹے پیالے جیسی ہے جس میں
 چاہے تم سمندر بھر دو مگر خالی ہی رہے گا۔ اس لئے انسان "اور" کی رٹ لگاتا

ہے۔ اور جب قبر میں جائے گا۔ کپڑے کھا جائیں گے گویا جب الٹا پیالہ سیدھا ہو جائے گا تب اگر اور تڑکے در زبیاں تو کتنا ہی رہے گا۔ جینک یہ الٹا پیالہ موجود ہے۔

بزرگوار! یاد رکھو، جتنی جنگیں لڑائیاں مقدسے اور فسادات دنیا میں ہوئے ہیں ان سب کے پس پردہ صرف اور صرف "جذبہ اور مرن" جذبہ اور مرن ہے جو انسان کو لٹا پٹا بھگڑوں اور فسادات پر آمادہ کرتا ہے۔

محترم سامعین!

اللہ نے ایک طرف تو ہمیں فتنہ و فساد سے منع کیا ہے اور دوسری طرف ہم میں "اور" کا جذبہ و رعیت کر دیا ہے گویا سمندر میں پھینک کر کہہ دیا کہ "دامنہ نرسہ ہونے پائے" بناؤ! ہمارا سخت امتحان سے یا نہیں؟ آخر ہم خدا ہی سے پوچھتے ہیں "خدا وندا۔ تو ہی کوئی تذبذب ہے کہ ہمارا "اور" کا جذبہ بھی پورا ہوتا ہے اور دنیا میں فساد و لڑائی بھی نہ ہو۔ اللہ جواب میں فرماتا ہے۔

"سنو! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ لائن نشکرتمہ لاذیبہ تکمہ۔ اگر ایک نعمت کے ملنے پر تم شکر ادا کرو گے تو میں اللہ تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس میں اور اضافہ کر دوں گا۔ چونکہ اضافہ میرے ذمہ ہے لہذا میری عطا لا محدود ہے۔ تمہارا "اور" تھک جائے گا مگر میری "عطا" نہیں تھکے گی۔

صاحبان! اس شکر کے معنی یہ نہیں ہیں کہ شام کو پیٹ بھر کے روٹی کھالی اور لیٹ گئے پیٹ پہ ہاتھ رکھ کے اور کہا "یا اللہ! تیرا شکر ادا کرتا ہوں لہذا صبح کو گوشت عطا فرمائیے گا۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ خدا کی نعمت کا سطح شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اگر تم واقعی خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہتے

ہو تو یوں کرو۔ کہ خدا نے یہ دو آنکھیں تمہیں نعمت دی ہیں۔ لہذا خدا کی دی ہوئی اس نعمت کا شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی ان آنکھوں کو اللہ کی مرضی کے مطابق عمل میں لاؤ۔ یہ گویا اللہ کی نعمت کا شکر یہ ادا کرنا ہے۔ اسی طرح پیروں سے چلو گے اور دھڑ چلو جب اللہ چلانا چاہتا ہے۔ اسی طرح ہاتھوں سے ضرور کام لو۔ انہیں معطل نہ کرو کیونکہ یہ خدا کی نعمت ہے۔ لہذا اسے "باندھ کے رکھنا" گویا کفرانِ نعمت ہے۔ اب ان ہاتھوں سے کام لو۔ مگر یہ خیال رکھنا کہ جو کام بھی لو اسے پہلے دیکھ لو کہ کیا اسے اللہ بھی پسند کرتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح اللہ نے انسان کو زبان جیسی شے عطا فرمائی ہے۔ لہذا اس نعمت کا شکر ادا کرنے کے لئے ایسے کلمات نکالو جن سے اللہ راضی ہو جائے۔ یہی حالت دانتوں کی بھی ہے کہ حلال کھاؤ اور حرام سے بچو۔

حضورِ والا! قرآن مجید کی یہ آیت ہے کہ شکر کرو گے تو نعمت میں

اضافہ ہوگا۔ کس پر نازل ہوئی ہے؟ رسول پر

اب بتاؤ! اس آیت کی تعمیل رسول نے بھی کی یا نہیں؟ یقیناً رسول نے بھی شکر ادا کیا ہوگا۔ اور اللہ نے اپنے وعدے کے مطابق اضافہ بھی کیا ہوگا۔ چنانچہ رسول نے چاروں طرف نظر ڈالی اور دیکھا جتنی نعمتیں تھیں وہ مجھے پہلے ہی مل گئی ہیں اور ان میں اب اضافے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔ لہذا رسول سوچتا ہے کہ اللہ کا شکر ادا کرنے کے کس شے میں اضافہ کراؤں۔

نہیں بھائیو! رسول کے پاس ایک ایسی نعمت تھی جس کا شکر ادا کر کے وہ اس میں اضافہ کر سکتے تھے اور وہ تھی "عصمت" چنانچہ رسول نے اس نعمت کا شکر یہ ادا کیا مگر زبان سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے۔ گویا رسول نے عصمت کو اس شان سے برتنا کہ ابھی اعلانِ رسالت بھی نہیں ہوا۔ مگر دشمن بھی مان گئے کہ تو صادق بھی ہے

اور امین بھی ہے کیوں کہ قول میں عصمت ہو تو صادق ہے اور فعل میں عصمت ہو تو امین ہے۔ لہذا قول و فعل کی عصمت کو صداقت و امانت کہتے ہیں۔

سَامِعِین!

چالیس سال مسلسل نعمتِ عصمت کا شکر یہ اس انداز سے ادا کیا کہ کائنات مان گئی دشمن مان گئے کہ تو صادق بھی ہے اور امین بھی ہے۔ گویا جس نے نعمتِ عصمت کا اتنا شکر یہ ادا کیا ہو تو اللہ کو بھی حسبِ وعدہ چاہیے کہ اس میں افتادہ کرے۔ اللہ نے کہا۔

”محمد! سن۔ میں اپنے اٹھانے کے وعدہ کو پورا کرتا ہوں لہذا تجھے ایک عصمت عطا کرتا ہوں۔ جس کا نام ہے ”فاطمہ“ گویا سیدہ طاہرہ رسول کو شکر یہ عصمت کے اٹھانے میں ملی ہیں۔ لہذا سیدہ کی عصمت کی شان اور ہے اور محمد کی عصمت کی شان اور ہے۔

صاحبانے! اب آپ کہیں گے کہ عورتوں میں مہریم بھی معصوم ہیں۔ میں کہتا ہوں۔ ”مہریم معصوم ضرور ہے۔ مگر مہریم کی عصمت کسی شکر یہ میں نہیں ملی تھی۔ وہ تو عطیہ الہی تھا اور اس میں عصمت کی اتنی ہی مقدار تھی کہ ایک پشت چل کر عیلتے تک ختم ہو گئی۔ مگر محمد کے شکر یہ عصمت میں ملی ہوئی عصمت بار آں پشت چل کر آج تک باقی ہے۔ اور قیامت تک باقی رہے گی۔ کیا مجال جو کہیں ختم ہو جائے اور پھر لطف یہ ہے کہ یہ شرف اللہ نے اس شکر یہ عصمت کو عطا کیا تھا کہ اس کی قیامت تک پیدا ہونے والی نسل معصوم تو نہیں ہوگی۔ مگر بے حکومت کے۔ ”شاہ“ کہلائے گی۔ بغیر سرداری کے سید کہلائے گی۔ دنیا ان کے پیروں کو چھونا باعثِ فخر سمجھے گی۔ اور اگر پیسے پاس ہوں گے تو امیر کہلائیں گے اور اگر کچھ نہیں

ہوگا تو تغیر کہلائیں گے اور اگر مر جائیں گے تو پیر کہلائیں گے یہ گویا ثمرت ملا ہے شکرِ عصمت کو جو عصمت کے شکر یہ کے طور پر عملی ہے۔

سامعین!

اب رسول چاہتا ہے کہ میں اس نعمت کا شکر یہ ادا کر دوں تاکہ اللہ اور اضافہ کرے۔ چنانچہ رسول نے سیدہ کی عصمت کا یوں شکر یہ ادا کیا کہ ایک دن رسول مسجد نبوی میں منبر پر نشہ لیتے فرمائے خطبہ فرما رہے ہیں کہ دیکھا کہ بیٹی چلی آ رہی ہے سیدہ کو دیکھ کر رسول تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے گویا رسول کا اٹھنا ہی اس نعمت کا شکر یہ ادا کرنا تھا اور قدرت نے رسول کی اس ادا کو دیکھ کر فرمایا۔

محمد! تم نے نعمتِ عصمت کا شکر یہ ادا کیا ہے لہذا ہم اس نعمت میں اور اضافہ کرتے ہیں۔

چنانچہ اللہ نے ایک نعمتِ حسن کی شکل میں دے دی۔ گویا فاطمہؑ والے شکر یہی اضافہ ہو کر حسن والی نعمت ملی۔ اب رسول نے اس نعمت کا بھی شکر یہ ادا کر دیا۔ اور وہ اس طرح کہ ایک روز رسول عید کی نماز پڑھنے جا رہے تھے اور حسن کو لاندھے پر بٹھا رکھا تھا اور اپنی زلفیں حسن کے ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھیں اور کہہ رہے تھے۔ خداوند! دیکھ لے تیری نعمتِ حسن کا شکر یہ ادا کر رہا ہوں۔

گویا شکر یہ نعمتِ حسن جو رسولِ جمع عام میں ادا کر رہے تھے۔ اس کو جب اللہ نے دیکھا تو قدرت کو محمدؐ کی یہ ادا پسند آگئی۔

محمد! تو نے حسن کی نعمت کا خوب شکر یہ ادا کیا ہے۔ لہذا آج ہم

اس میں اضافہ کر کے تمہیں حسین دیتے ہیں

صاحبانِ ذوق!

رسول نے فاطمہؑ کی نعمت کا شکر یہ محض تعظیم کر کے اللہ سے حاصل کیا اور

اور حسن کی نعمت کا شکر یہ یہ تھا کہ نماز کو جاننے وقت کندھے پر بٹھالیا، مگر جب حسینؑ
 نانی نعمت ملی تو شکر یہ کا انداز ہی کچھ اور تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ
 رسول نماز پڑھ رہے ہیں، سجدہ میں سر سے اور پشت پر حسین کو بٹھا
 لیا، چونکہ اس شکر یہ میں عبادت اور سجدہ دونوں شامل ہیں لہذا اب
 جو اضافہ ہوگا اس میں سجدہ بھی ہوگا اور عبادت بھی ہوگی۔ گویا
 حسین نعمت کے شکر یہ میں جو ملا وہ "سید الساجدین" بھی تھا
 اور "ذین العابدین" بھی تھا۔

بزرگان من!

رسول کو جب سید الساجدین اور زین العابدین والی دونوں نعمتیں مل گئیں۔
 تو رسول نے اس نعمت کا بھی شکر یہ ادا کر دیا۔
 اللہ نے کہا، "محمد! سنتے بھی ہو، اگر چاہو تو اس شکر یہ کے عوض تم تمہیں
 محمد نادمے دیں"

چنانچہ محمد کے شکر یہ میں محمد مل گیا جس کو ہم محمد باقر کہتے ہیں۔ اس کے بعد
 رسول نے پھر کہا یا
 "یا اللہ! نیزا شکر ہے کہ تو نے مجھے باقر جیسا فرزند عطا فرمایا ہے۔
 اللہ نے کہا:

محمد! ہم جانتے ہیں تم نے یہ شکر یہ لسانِ صدق سے ادا کیا ہے لہذا
 ہم تمہیں "صادق" دیتے ہیں۔

چنانچہ اللہ نے حضور جعفر صادق دے دیا۔ اس طرح رسول کا شکر یہ چلتا
 جا رہا تھا۔ اور اللہ کا اضافہ بھی چلتا جا رہا تھا۔ آخر چلتے چلتے رسول جب
 گیا رہو بی پہنچے تو اللہ نے اپنے خزانے کا جائزہ لیا۔ دیکھا اور فرمایا:

محمد! سنتے بھی۔ گیارہویں تک تو ہم دیتے رہے مگر آج سے لقطع
سودا کر لو۔

محمد نے پوچھا۔ "خداوندا۔ وہ کیسے؟"
اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

محمد! آج سے یہ فیصلہ ہو جائے کہ ہمارا "عظیہ" "قائم" ہوگا
اور تمہارا شکریہ "ذائیم" ہوگا۔

سامعین!

ایک شخص حضور امام علی نقی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی
"فوز ندر رسولے!..... وہ امام جو آخری امام ہوگا اور جو "ذائیم و
قائم" ہوگا۔ ذرا اس کی صفت تو بیان فرمائیے! چنانچہ حضور امام علی نقی علیہ السلام
فرماتے ہیں۔

"اپنے امام کی شان کیا پوچھتے ہو" صاحب الدعوة النبویہ
وصول الحیدرید "تمہارا امام اسی طرح دین کی دعوت
دیتا ہے جس طرح اس کا جبر رسول دعوت دیتا تھا" وصولت
الحیدرید "اس کا اقبال حیدر کرار جیسا ہے" عصمت
الفاطمیہ "اس کی عصمت فاطمہ جیسی ہے" والحلم الحسینیہ
حسن جیسا اس کا علم ہے" والشجاعت الحسینیہ "در حسین
جیسی اس کی شجاعت ہے۔

بہر نوع صفت بیان کرتے کرتے جب گیارہویں تک پہنچے تو کہنا۔
"والہیبة العسکریہ" اور حسن عسکری جیسی اسکی ہیبت ہے
تو یہاں آگے آپ ڈک گئے اور فرمایا۔

”سنو! تم اس کی غیبت پوچھتے ہو؟.... والغیبة

اللہ جیسی اُس کی غیبت ہے۔

اب بتاؤ! اللہ کسی جزیرے یا نار میں غائب ہے یا کسی مکان میں غائب

ہے؟۔ ہرگز نہیں۔

اللہ تو ہر جگہ ہے اور غائب ہے۔ اسی طرح ہمارا امام خدا کے فضل سے

ہر جگہ ہے اور غائب ہے۔ لہذا ہم یہ مجالس صحت اپنے امام کو پُرسہ دینے کی غرض

سے کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ہر جگہ موجود ہے اور ہم ان کے ادنیٰ رعایہ اُن کے

سامنے اُن کے بزرگوں کے فضائل بیان کرتے ہیں۔

سَامِعِین!

خدا گواہ ہے۔ ہماری ان مجالس کے اصل سامع آلِ محمد ہیں جن کے تصور

کی وجہ سے میں نے عمر بھر کبھی بیٹھ کے نہیں پڑھا۔ میرا ایمان ہے کہ میرا مولا موجود

ہے اس لئے کھڑے ہو کر پڑھتا ہوں یہ ادبیات ہے کہ حادثہ کی وجہ سے پہلے دونوں

پاؤں پکھڑا ہونے پڑھتا تھا۔ اب ایک پاؤں پہ کھڑے ہو کر پڑھتا ہوں۔

بہر ذبح تصور آلِ محمد اپنی مجلسوں میں ملحوظ خاطر رکھتا ہوں۔

بزرگانِ منہ!

ایک دن کربلا معلیٰ میں ایک عالم بیان فرما رہے تھے کہ جب تم مجلس منعقد کرتے

ہو تو اس میں امام العز و الزماں تشریف لاتے ہیں لہذا ہمارے خطیبوں و اذکاروں

اور ذاکروں کو چاہیے کہ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ اصل واقعات بیان فرمائیں۔

اور جب تم امام کے سامنے مصائب پڑھو تو بیشک حسین کی شہادت پڑھ دینا

علی اکبر کی شہادت پڑھ دینا۔ علی اصغر کی شہادت پڑھ دینا۔ عباس کی شہادت

پڑھ دینا۔ عون و محمد کی شہادتیں پڑھ دینا یا امیر قاسم کی شہادت پڑھ دینا

مگر ایک بات کی احتیاط کرنا کیونکہ امام موجود ہونا ہے لہذا ان کی موجودگی میں انکی ذاتی زینت کی قید نہ پڑھنا۔ کیونکہ بی بی کی قید سنا امام کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو آپ کو بے ہوش کر دیتی ہے۔ پھر فرشتے آکر پیر ملتے ہیں۔ لہذا ہمیں بڑی احتیاط سے زینت کی قید کا تذکرہ بیان کرنا چاہئے۔

سَمَاعِینِ!

میں خود قید ہوا تھا۔ ۲۹ جنوری ۱۹۶۲ء دو بجے رات کا وقت تھا اور تقریباً پانچ شو پولیس کے آدمی مجھے گرفتار کرنے آ گئے۔ سارے محلے کا محاصرہ تھا۔ چھتوں پر پولیس تھی اور سارا محلہ سہما ہوا تھا کہ اللہ جانے کیا بات ہے بھرنوع مجھے گرفتار کر کے جب ایک کار میں بٹھا دیا گیا تو کسی کی آواز آئی۔! "ایس پی صاحب! ہتھکڑی لگا دوں؟"

ایس پی نے کہا۔

"خبردار! کیوں شریف آدمی کو پریشان کر رہے ہو۔"

بس بھائیو!

ایس پی کا یہ کہنا تھا کہ میں نے کہہ دیا۔

ایس پی صاحب! کاش تم کربلا میں موجود ہوتے اور بجائے یہاں

کے وہاں کہہ دیتے کہ "کیوں شریف آدمیوں کو پریشان کر رہے ہو؟"

حضرات!

آج سے ایک عرصہ پہلے میرا اپنا خیال تھا کہ محذرتہ عسرت و طہارت کے

ہاتھ باندھنے والی روایت ہم لوگوں نے صرف رونے کے لئے بنائی ہے۔ مگر

جب میں نے انام زمان کی زیارت ناحیہ پڑھی تو اس میں ہاتھ باندھنے کا

ذکر تھا۔ چنانچہ میں نے کہا "ٹھیک ہے ضرور بندھے ہوں گے" پھر یہ

تشویش کوئی کہ کس طرح بندھے تھے؟ اس کے متعلق بھی امام زمانؑ زیارت
- ناحیہ میں فرماتے ہیں:-

و میرا سلام ہو میری دادی زینبؑ پر جس کے دونوں ہاتھ اُس کی
گردن کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔

بزرگانِ من!

دنیا میں کوئی ایسی مصیبت نہیں ہے جو زینبؑ پر نہ گذری ہو۔ اسی لئے
زینبؑ کو اُم المصائب بھی کہا جاتا ہے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا فرمان ہے کہ میری دادی پر وہ مصائب گذر گئے
کہ جنہیں نہ کوئی سوچ سکتا ہے اور نہ ہی سمجھ سکتا ہے۔

سأعین!

زمانے کا انقلاب دیکھو کہ حیدرآباد کی بیٹی یزید کے دربار میں کھڑی ہے۔
ادریزید اپنے نشہ فوج میں اتنا مشغول ہے کہ قیدیوں سے بات نہیں کرتا۔ اظہر
کھڑے ہوئے قیدیوں میں معصوم بچوں کے پاؤں میں درم آگئے تھے اور زمانے
کا امام بالکل خاموش کھڑا ہے۔ سیدائینوں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور علیؑ کی
بہویں، والدہ علیؑ اصغر اور والدہ شہزادہ قاسم سر جھکائے خاموش کھڑی ہیں
فقوڑی دیر بعد زینبؑ نے امام زین العابدینؑ سے کہا۔

بہیٹا! میری بھاؤ جیں کھڑی ہوئی ہیں اور ان کے میلے کے لوگ
کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہوں گے کہ ہماری لڑکیاں کس خاندان سے یہاں
گئیں ہیں۔ بیٹا! مجھے شرم کھا رہی ہے۔

اس کے بعد زینبؑ کا وہ تاریخی فقرہ آج بھی فضا میں گونج رہا ہے
کہ جب سیدائینوں کو دربار یزید میں کافی دیر کھڑے رہنا پڑا تو زینبؑ کے

منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَكْرَمَنَا.

»خدا یا ! ہم تیرا شکر ادا کرتے ہیں
جس نے ہمیں یہ عزت عطا کی«

سَامِعِينَ!

کوئی اور ہوتا تو کہتا:

»واہ اللہ ! ہم کس طرح تیرا شکر ادا کریں۔ کیونکہ تیرے نام پر ہم
مڑ گئے اور تو نے ہماری خبر بھی نہ لی۔ ہمارے بچوں کو زنج ہوتے دیکھنا
رہا مگر کچھ مدد نہ کی«۔

مگر

وہاں زینب نے اللہ کا شکر ادا کر کے دنیا کو یہ منوادیا کہ:

»خدا ہے«

اور یہ خدا کا بڑا احسان ہے کہ آج دنیا خدا کو مان رہی ہے۔ اب اگر
خدا کا یہ وعدہ ہے کہ:

»اگر تم شکر ادا کر گے تو امانتوں کو دنگلا«

توبتاً و!

زینب کے اس شکر پر

قدرت کیا اصناف

فرماتی ہے۔؟

قَالَونِ عَدْلٍ

حضرات گرامی قدر!

اللہ تعالیٰ کا منشا یہی ہے، اللہ کی مشیت یہی ہے اور اللہ چاہتا ہی ہے کہ انسان ہر حالت میں قالونِ عدل پر قائم رہے اور عدل سے منحرف نہ ہونے پائے دوسرے لفظوں میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ انسان کو وہی کرنا چاہیے۔ جو کہنا چاہیے گویا کوئی بات اللہ کی "چاہیے" کے خلاف نہیں ہونا چاہیے۔ یہی اللہ کا منشاء ہے اور یہی اس کی مرضی ہے۔ اگر انسان قالونِ عدل پر قائم نہ رہے تو اللہ کا کچھ بگڑنا نہیں۔ اور اگر دنیا کے تمام انسان قالونِ عدل پر قائم ہو جائیں تو اللہ کو کچھ ملنا نہیں۔ اللہ بہ نوح اللہ ہے۔ چاہے ساری دنیا اللہ اللہ کرے۔ تب اللہ ہے اور اگر ساری دنیا اللہ سے منکر ہو جائے۔ اللہ پھر بھی اللہ ہے۔

سامعین!

ابھی تک تو کوئی انسان دنیا میں ایسا پیدا ہوا ہی نہیں جو اللہ کے وجود کا منکر ہو۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ "ہم اللہ کو نہیں مانتے" ان کا یہ کہنا "ہم اللہ کو نہیں مانتے" سے مراد یہ ہے کہ کوئی اللہ ہے جس کے وجود سے وہ منکر ہیں۔ ورنہ اگر اللہ نہ ہوتا تو "نہ ماننا" کبھی سامنے نہ آتا۔ بہر کیف کوئی انسان اللہ کے وجود سے منکر نہیں ہے۔ بلکہ ہر انسان کسی نہ کسی طرح سے اللہ کے وجود کا اقرار کرتا ہے اور اگر کوئی نہ مانے تو اس سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا بلکہ وہ

تو یہ کہتا ہے کہ :-

النساؤ! تالونِ عدلٍ پر قائم رہو،

بزرگاریٰ من!

سب سے پہلی عدالت، اللہ ہم سے یہ چاہتا ہے کہ :-

النساؤ! میں نے تمہیں انسان پیدا کیا ہے۔ لہذا پہلا عدل یہ ہے کہ تم انسان

بن کے رہو۔

حضراتے! اگر اللہ میں انسان کی بجائے کچھ اور بنا دیتا تو ہماری کوئی

زبردستی تھی؟۔ یہ تو اللہ کا ہم پر بڑا فضل و کرم ہے کہ اس نے ہمیں انسان پیدا کیا ہے

بچو! اب تم پوچھو گے کہ انسان کچھ اور کیا بن سکتا ہے؟

میں کہتا ہوں۔ ” زیادہ دُور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھو نا! انسان

کے دائیں طرف ایک فرشتہ ہے اور بائیں طرف ایک حیوان۔ اب اگر انسان چاہے

تو حیوان بن جائے اور چاہے تو فرشتہ بن جائے۔

گویا فرشتہ بننا بھی کوئی مشکل نہیں اور حیوان بننا بھی کوئی مشکل نہیں۔ بلکہ انسان کا

انسان بننا بڑا مشکل کام ہے۔

سامعین!

حیوان بننے میں کیا مشکل ہے۔ طریقہ میں بتائے دیتا ہوں۔

دیکھو نا!

انسان کو بھی بھوک لگتی ہے اور حیوان کو بھی بھوک لگتی ہے۔ انسان کو بھی خوراک

چاہیے اور حیوان کو بھی خوراک چاہیے۔ لہذا دونوں اپنی بھوک میں خوراک مانگتے

ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ حیوان کو جب بھوک لگتی ہے۔ رستہ توڑ دیا اور گھر سے چلا۔

رستے میں جو شے کھانے کی نظر آئی۔ کھالی مگر یہ نہ دیکھا کہ اپنی ہے یا پرانی ہے۔

اس کا کھانا مناسب ہے یا نامناسب ہے۔ اس کا کھانا جائز ہے یا ناجائز؟
بہر نوع اپنا پیٹ بھر لیا۔

گو یا جو پیٹ بھرنے میں "جائز و ناجائز" کی پرواہ نہ کرے۔ اُسے
"جیوانے" کہتے ہیں اور جو یہ سوچ لے کہ یہ مناسب ہے یا نہیں؟ جائز ہے
یا نہیں؟ اسے کھانا چاہیے یا نہیں؟ اگر پرانی ہے تو بھوکا رہنا بہتر ہے۔ ایسے
جائز و ناجائز کی سمجھ رکھنے والے کو "السنانے" کہتے ہیں۔

اُب بناؤ! حیوان بنا آسان ہے یا انسان بنا مشکل ہے؟
بہر نوع آپ اگر حیوان بنا چاہیں تو بن سکتے ہیں اور اگر فرشتہ بنا چاہیں تو
اس کے لئے بھی کوئی دشواری نہیں ہے۔

دیکھو نا!۔ اگر آپ چاہیں تو ابھی فرشتہ بن سکتے ہیں کیونکہ فرشتہ بن
ہیں جو نہ کاتے ہیں اور نہ ہی محنت کرتے ہیں۔ جو نہ مزدوری کرتے ہیں اور نہ ہی
کسی کی پرواہ کرتے ہیں۔ لہذا آپ بھی یہی کام شروع کر دیں کہ ایک لمبا سا کرتا پیئیں۔
نوہ سے کا ایک چٹا ہاتھ میں لے لیں۔ سال بھر حجامت نہ بنوائیں۔ عین سال غسل نہ
فرمائیں، ناخن بڑے ہو جائیں۔ بال بے ہو جائیں۔ کرتا میلا ہو جائے۔ رات کو
سونے کی جگہ ہو۔ کمانا بالکل چھوڑ دیں۔ کھانے کی فکر نہ ہے۔ لہذا سب دیکھنے والے
یہی کہیں گے "بندہ کیا ہے، نوشتہ ہے"

میں پوچھتا ہوں "بھئی! تمہیں کیسے پتہ چلا کہ یہ پاگل فرشتہ بن گیا؟"
"زیدی صاحب! تمہیں کیا معلوم ہے، تم کبھی فرشتہ بنو تو پتہ چلے"

ادھر زیدی صاحب نے کبھی فرشتہ بنیں گے اور نہ ہی پتہ چلے گا۔ ادھر فرشتہ
صاحب ہیں کہ سارا دن سڑکوں پہ مارے مارے پھرتے ہیں اور رات کو کسی دکان کے
تھڑے پر لیٹ گئے۔ سردی کا موسم۔ رات بھر محلے والوں کو جگایا اور جب کسی کو چھا

کہ کیا بد تمیزی ہے تو لوگوں نے کہا، "عبادت کو رہا ہے"۔ بہ نروع اسے فرشتہ کہتے ہیں۔ اب اگر تم میں سے کوئی بننا چاہے تو بے شک بن جائیے۔

بچو!

مجھے بھی لوگ اکثر یہی کہہ دیتے ہیں "زیدی صاحب! سبحان اللہ۔ آپ تو فرشتہ ہیں"۔ ادھر زیدی صاحب بھی اکر جاتے ہیں کہ میں فرشتہ بن گیا ہوں حالانکہ لوگوں کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زیدی صاحب فرشتہ تو میں گلان میں انسانیت نہیں ہے۔ یاد رکھو! حیوان بننا بھی بڑا آسان ہے اور فرشتہ بننا بھی بڑا آسان ہے مگر یہ دونوں باتیں انسان کو قانونِ عدل سے ہٹا دیتی ہیں۔ لہذا قانونِ عدل کا تقاضا یہی ہے کہ تم انسان ہو اس لئے انسان بن کے رہو۔ کیا مجال جو تمہاری انسانیت میں فرق آجائے۔ تمہارا ہر قول و فعل قانونِ عدل پر قائم رہنا چاہیے۔ برادری کے معاملات میں بھی اور اللہ کے معاملات میں بھی تم قانونِ عدل پر قائم رہو۔ جس طرح اللہ کہتا ہے "نساؤ پڑھو"۔ لہذا تم بھی نماز پڑھو۔ اللہ کہتا ہے "روزہ رکھو"۔ لہذا تم بھی روزہ رکھو۔ اللہ کہتا ہے "کسی کا مال نہ کھاؤ"۔ لہذا تم بھی غاصب نہ بنو۔ اللہ کہتا ہے "کسی پریشان نہ کرو کیونکہ یہ معاشرتی عدل ہے"۔ لہذا تم اس پر بھی قائم رہو۔ گویا یہی قانونِ عدل ہے کہ انسان انسان بن کے رہے۔ چاہے وہ ذاتی معاملہ ہو۔ یا معاشرتی معاملہ ہو۔ چاہے بندوں کا معاملہ ہو یا اللہ تک پہنچنے کا معاملہ ہو۔ بہ نروع تمہیں ہر حالت میں قانونِ عدل پر قائم رہنا چاہیے۔

سامعینے!

اللہ کے معاملہ میں انسان بڑا ظالم واقع ہوا ہے۔ کیونکہ اگر انسان، انسانوں پر ظلم کرے تو یہ ڈر رہتا ہے کہ انسان جواب دے گا۔ مگر اللہ کے بارے میں انسان جانتا ہے کہ یہ کیمریم و کریم ہے لہذا معاف کر دے گا۔ بہر کیف اللہ کے معاملہ میں انسان بہت

ظالم واقع ہوا ہے۔ انسان کو جہاں بھی موقع ملتا رہا، ظلم کرتا رہا، کہیں کہیں اللہ در
ہیں۔ کہیں کہیں اللہ نہیں ہے۔ بہ ندرت اللہ کے معاملے میں انسان بڑا ظالم واقع
ہوا ہے۔

بچو!

اگر میری بات پختہ نہ آئے تو ہمسایہ ملک (ہندوستان) میں جا کے دیکھ لو۔
وہاں تقریباً ساٹھ کروڑ پوجتے دلے ہیں اور دوا رب اللہ نہیں۔ گویا ایک ایک بندے
کے حصے میں تین تین "اللہ" آتے ہیں مثلاً "پاپلے... اللہ" ہے "گائے اللہ
ہے۔ گنگا اللہ ہے۔ دیگرہ وغیرہ۔

بچو! تم تو ایسی بچے ہو۔ ان بزرگوں سے پوچھو جو ہندوستان سے آئے
ہیں۔ وہ بتائیں گے کہ ساٹھ کروڑ عوام گنگا کو "گنگا ماتا" کہتا ہے۔ ادھر گنگا
ہے کہ پھولی نہیں سماتی "کیونکہ لاکھوں کروڑوں انسان جو "امات" کہہ
رہا ہے۔

یاد رکھو! ایسی مائیں بہت اگڑتی ہیں جو بیچ وچ "مائیں" نہ ہوں۔
بہ ندرت دنیا نے گنگا کو جب "مات" کہہ دیا تو گنگا کے ہواس اڑ گئے۔ آپے
میں نہ رہی۔ ادھر گنگا ہے کہ پھولی نہیں سماتی کہ غیر بچے ہنسنے "مات" بن بیٹھی ہوں
اس سے بہتر اور کیا چاہیے۔ لہذا سال دو سال تو خیریت سے اپنے ہی کناروں کے لاند
موز میں بہتی رہی اور جب تیسرے سال غصہ جو آیا تو کناروں سے باہر نکل پڑی اور
سیلاب آگیا۔ اب بچے لاکھ کہہ رہے ہیں۔

اماں! دیکھو۔ ہم تیسرے ہی بچے ہیں۔ ہمیں کیوں ڈبو رہی ہو؟

مگر اماں ہے کہ کسی کی سنتی ہی نہیں۔ اور ادھر بچے ہیں کہ کان پکڑ

رہے ہیں "امات" غصہ جانے بھی دو۔ ہم بے چاروں پہ

رحم کر دے مگر ماں کسی کی سنتی ہی نہیں کیونکہ کناروں کے اندر رہے
تو رحم کرے۔

بزرگو!

انگریز قوم بڑی ہوشیار تھی۔ انہوں نے سوچا کہ، اہمات سے بن کے بے کار
بھی ہے اور یہ بے کاری کا مشغلہ ہے کہ چلو اور نہیں تو کناروں سے ہی باہر نکل پڑو
لہذا اماں کو مصروف رکھنے کے لئے انہوں نے جگہ جگہ سے نہریں نکال دیں اور
چلیاں لگا دیں۔ اب جو اماں کو چلی پیستا پڑی۔ تو بگڑا اہماد ماخ ٹھیک ہو گیا۔
بہر نوع انسان نے ہزاروں اللہ بنا کے بٹھا دیئے۔ اب اگر میں آج تمام
اللہوں کی فہرست بیان کرنا شروع کر دوں تو پورا عشرہ گزر جائے گا۔ مگر اللہ
ختم نہیں ہوں گے۔

سَامِعِیْنِ!

ہم نے حجادہ عقل و علم کے مطابق فیصلہ کیا کہ بالکل غلط، ہزاروں دوزخوں
کو کھٹکھٹانے سے تو بہتر ہے کہ ایک ہی باب کہیم پہ بیٹھ جاویں۔ یہی میں شرافت
ہے اور یہی تقاضائے انسانیت ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور ہمارے کلمہ میں پہلی چیز ہی
یہی ہے کہ "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ" .. اللہ کیلئے ہے۔

دیکھنے میں تو یہ دو لفظ ہیں "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ"
مگر اتنے قیمتی ہیں کہ بڑے سے بڑا دشمن بھی ان میں نہ نکندہ، نہیں لگا سکتا
اور پھر ان میں جو لفظ تین اور دس تین ہیں ان کا کوئی شمار ہی نہیں کر سکتا۔
کلمہ میں طاقتیں اتنی ہیں کہ ابھی جہنمی تھا۔ پڑھ دیا تو جنتی ہو گیا۔ نجس تھا۔ پاک ہو
گیا۔ غیر تھا۔ اپنا ہو گیا۔ دُور تھا۔ قریب ہو گیا۔ گویا یہ کلمہ اتنی طاقتور شے ہے۔
بزرگو! تمہاری عمر گزر گئی یہ سنتے سنتے کہ دنیا میں اگر کوئی طاقتور شے ہے

تو وہ "ذوالفقارِ حیدر کوار" ہے۔ اور جب تلوار اتنی طاقتور ہے تو پھر تلوار
 دالے کی طاقت کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا۔ گویا علیؑ تو ہے ہی مرکز طاقت
 علیؑ کے کام میں طاقت ہے۔ علیؑ کے نام میں طاقت ہے۔ انسان ذرا سا گھبرا جائے
 اور علیؑ کا نام لے لے تو بدن میں طاقت آجائے گی۔ گویا علیؑ بہترین نسخہ ہے۔
 علیؑ بہترین کیسیا ہے۔ علیؑ بہترین اکیر ہے۔ بیرلوع علیؑ کے نام میں بڑی قوت
 ہے۔

دیکھو نا!

جب مغربی پاکستان میں ۱۹۶۵ء میں جنگ ہوئی تھی، ان دنوں میں لاہور
 میں تھا۔ اور لاہور کوڑھنگ تھا۔ ایک رات ۱۲ بجے کے قریب تمام شہر اور محلہ بھر سے
 دکانوں اور مکانات کی چنتوں سے "یا علیؑ۔ یا علیؑ" کی آوازیں آنے لگیں۔ میں حیران
 و پریشان تھا کہ آخر بات کیا ہے۔ آج "یا علیؑ۔ یا علیؑ" کیوں ہو رہا ہے؟
 چنانچہ گھر سے نکلا اور دیکھا کہ بڑے بڑے بزرگان دین جو دن کی روشنی میں "یا علیؑ"
 کہنے کو بدعت کہہ رہے تھے۔ آج پوری آواز سے "یا علیؑ" کہہ رہے ہیں۔ میں حیران
 و پریشان کہ آج یا علیؑ کا دور دورہ کیوں ہو گیا۔ آخر کاری سوجتا ہوا گھرا یا اور سو گیا۔
 مگر نیند کس کو آئے ادھر بلیک آڈٹ اور ہوائی جہاز بم برسارے ہیں اور ادھر "یا علیؑ"
 "یا علیؑ" کہنے والوں نے پریشان کر رکھا ہے۔ بالآخر سوچا کہ دن چڑھے پوچھوں گا کہ
 کیا بات ہے۔

بچو!

میں نے ایک طوطا پال رکھا تھا جسے چھ مہینے سے محنت کر کے پیکھا یا تھا
 "نبی جی چوری بھیجو"۔ بس اور کچھ نہیں جانتا تھا سوائے اس کے کہ:-
 "نبی جی چوری بھیجو"۔ ادھر میں رات کو اسی سوچ میں لیٹا ہوا تھا کہ خدا دندا!

آج "یا علی" یا علی، کیوں ہو رہا ہے کہ اسی اثنا میں طوطے نے بھی بولنا شروع کر دیا۔ مگر۔ "نئی جی چوری بھیج نہیں۔ بلکہ "ٹپیں، ٹپیں" کہنا شروع کر دیا۔ وہی اپنی اصلی بولی بولنا شروع کر دی۔ میں نے بسز پر لٹے ہوئے پوچھا:

طوطے میاں! آج سکھائی ہوئی بات بھول گیا اور اصلی بات کہنا شروع کر دی۔ آخر کیوں؟

یہ کہہ کر جو میں نے دیکھا کہ بتی نے طوطے کے پنجرے پہ حملہ کیا ہوا ہے۔ اب پتہ چلا کہ امن و امان ہو تو سکھائی ہوئی باتیں کہی جاتی ہیں اور حملہ ہو جائے تو اصلی بات خود بخود منہ سے نکل جاتی ہے۔

بہر نوع "یا علی" کہنے میں بڑی طاقت ہے۔ علی بڑی طاقت والی شے ہے، علی بڑی قوت والی شے ہے۔ علی کے نام میں طاقت ہے۔ علی کے کام میں طاقت ہے اور پھر علی کی تلوار تو ہے ہی مرکزِ طاقت۔

کیوں سامعین!

اگر علی کی تلوار پوری طاقت سے چل پڑے تو بتاؤ! اخیر کے در سے رکتی ہے؟۔ مرحب کے سر سے رکتی ہے؟۔ خیر و مرحب کو چھوڑو بلکہ یہ بتاؤ! جبرئیل کے پر سے رکتی ہے؟۔ "نہیں"۔ گویا علی کی تلوار اتنی طاقت ور شے ہے۔

اب بتاؤ۔ جن تلوار کی طاقت کو کوئی شے نہیں روک سکتی تھی اس کی طاقت کو لا الہ الا اللہ روک دینا تھا یا نہیں؟۔ ادھر سے علی کی تلوار چلی ادھر سے منہ سے کلمہ نکلا لا الہ الا اللہ، تلوار فوراً رُک جاتی تھی۔ گویا علی کی تلوار کو جو شے روک لے وہ ہے لا الہ الا اللہ۔

یاد رکھو! چاہے بے دلی سے ہو۔ چاہے صحت زبان سے ہو۔ اگر سامعین

والے نے کہدیا، "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، تو علیؑ کی تلوار ٹک جاتی تھی۔

بہر ذریعہ علیؑ کی تلوار اتنی طاقت ور ہونے کے باوجود کلمہ کے سامنے ٹک جاتی تھی: "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ" ہمارا کلمہ ہے اور یہی تائیدِ عدل ہے کہ "اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ"

صاحبان!

مسلمانوں کی سب سے بڑی قسم اگر کوئی شے ہے تو وہ کلمہ طیبہ ہے۔ اگر کلمہ پڑھ کے کوئی مسلمان بات کہدے تو دوسرے مسلمانوں کو ماننا پڑتی ہے۔ گویا اتنی بڑی مقدس قسم ہے "قسم جلالہ"

بچو! ہمارے پنجاب میں تو یہ طریقہ ہے کہ اگر کسی چور کو چوری کے جرم میں پکڑ لیا جائے اور وہ کلمہ پڑھ کے کہدے کہ میں نے چوری نہیں کی تو لوگ اُسے چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ آدمی کلمہ پڑھ کے جو کہہ رہا ہے۔ اب اگر اس کی بات نہیں مانیں گے تو ہم مسلمان نہیں رہیں گے۔ گویا کلمہ اتنی طاقتور شے ہے کہ اگر کلمہ پڑھ کے کوئی بات کہ دی جائے تو مسلمانوں کو ماننا پڑے گی اور اگر نہیں مانو گے تو تم مسلمان نہیں رہو گے۔

یہی بات ہے حضور والا!

ہمارا بچہ ہو یا بوڑھا۔ جوان ہو یا بڈھا۔ جاہل ہو یا عالم۔ امیر ہو یا غریب۔ رئیس ہو یا تاجر۔ گویا ہم میں سے ہر ایک سے گھر میں۔ بازار میں مسجد میں کعبہ میں۔ جہاں چاہو کہلوالو، "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ" ہم کلمہ پڑھ کے کہتے ہیں۔ مسلمان ہو تو ماننا پڑے گا۔ مومن ہو تو یقین کرنا پڑے گا کہ "علیٌّ وَوَلِيُّ اللَّهِ"

سامعین!

ہم پر تو خواہ مخواہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ ہم نے "علیٌّ وَوَلِيُّ اللَّهِ" کو جزو کلمہ

بنایا ہے حالانکہ ہم تو کلمہ پڑھ کے اعلان کرتے ہیں۔ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ"۔
مسلمان ہو تو ماننا پڑے گا مومن ہو تو یقین کرنا پڑے گا کہ "علی ولی اللہ"۔ اب اگر
تم نہیں مانو گے تو تمہارا اسلام خطرہ میں پڑ جائے گا۔ کیونکہ کلمہ سے بہتر اور کوئی
شہادت ہو سکتی ہی نہیں۔ اس سے زیادہ اعلان کی کوئی اور شان ہو سکتی ہی نہیں
اب تم اس جھگڑے میں مت پڑو۔ کہ "علی ولی اللہ" جزد کلمہ ہے یا نہیں؟
میں کہتا ہوں کہ جزد کلمہ تو کیا شے ہے بلکہ علی ولی اللہ تو روح کلمہ ہے۔
اب اگر چاہو تو روح کو کلمہ سے نکال دو۔

مگر یاد رکھو! تمہیں اس بات کا اختیار نہیں ہے۔ کیونکہ روح
کے بغیر تم بھی مسلمان نہیں رہ سکتے۔ لہذا اپنی خیریت چاہتے ہو تو کلمہ اور روح
دونوں کو ہمیشہ یاد رکھو۔ اس لئے کہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

بزرگان من!

قانون عدل پر قائم رہنے کے لئے سب سے پہلے میں خدا کے بارے میں قانون
عدل پر قائم رہنا پڑے گا کہ وہ "وحدہ لا شریک" ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں
کسی کی طاقت ہی نہیں کہ اس کا کوئی شریک ہو جائے۔ کسی کی مجال ہی نہیں کہ اس کا
کوئی شریک ہو جائے۔ ایسا ہو سکتا ہی نہیں کہ اس کا کوئی شریک ہو جائے۔
اور یہ عین عدل ہے اللہ کے ساتھ کہ اللہ وحدہ لا شریک ہے۔

اور یاد رکھو! خود اللہ اس بات کا گواہ ہے کہ وہ وحدہ لا شریک ہے
اور وہ صاحبان علم اللہ کے وحدہ لا شریک ہونے کے گواہ ہیں جو "قائم
بلقسط، عدل پر قائم ہیں"

سامعینے! اللہ نے یہ نہیں کہا کہ جو عدل کرتے ہیں بلکہ فرمایا
"قائم بلقسط، جو عدل پر قائم ہیں"

اور یاد رکھو! "عدلے پر قائم" ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ان کا کوئی قول و فعل و عمل عدل کے خلاف ہو سکتا ہی نہیں "ہوتا نہیں" نہیں ہے بلکہ "ہو سکتا ہی نہیں" گویا جس کرم اصطلاح میں "معصوم" کہتے ہیں اسکو قرآن "قائم بلبقسط" کہتا ہے۔ ہر نذرع ان معصومین کا کوئی قول و فعل و عمل عدل کے خلاف ہو سکتا ہی نہیں۔

بچو! یہ بتاؤ۔ معصومین کتنے ہیں؟ "چودھا"

دیکھو! ان چودھ کے علاوہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء بھی معصوم ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ چودھ اور شان کے معصوم ہیں اور انبیاء اور شان کے معصوم ہیں یہ چودھ بھی جو کرتے ہیں ٹھیک ہوتا ہے اور یہ انبیاء بھی جو کرتے ہیں ٹھیک ہوتا ہے۔ باقی فرق یہ ہے کہ انبیاء معصوم دی کرتے ہیں جو ٹھیک ہوتا ہے گو پہلے وہ دیکھ لیتے ہیں کہ ٹھیک ہے۔ پھر کرتے ہیں لیکن یہ چودھ جو کر دیں ٹھیک ہوتا ہے گویا یہ چودھ پہلے "ٹھیک" تلاش نہیں کرتے بلکہ جو کر دیں وہ ٹھیک ہوتا ہے ان کے منہ سے جو بات نکل جائے وہ پوری ہو جاتی ہے۔ جو ان کا عمل ہو جائے وہ پورا ہو جاتا ہے۔ گویا "ٹھیک" ان "چودھا" کے تابع ہے اور انبیاء "ٹھیک" کے تابع ہیں۔ ان "چودھ" کو ضرورت نہیں کہ پہلے "ٹھیک" تلاش کریں بلکہ جو کر لیا وہ ٹھیک ہے۔

کیونکہ

انہوں نے اپنی مرضی اور خواہش اس طرح خدا کے سپرد کر دی ہے کہ یہ وہی چاہتے ہیں جو خدا چاہتا ہو۔ یہ وہی کرتے ہیں جو خدا چاہتا ہو اور جب ان کا قول و فعل مشیت الہی ہے تو پھر ان کے کسی حرکت و سکون میں غلطی ہو سکتی ہی نہیں۔

کیوں علمائے کرام!

بتاؤ۔ آل محمد نے کبھی کوئی ایسا عمل کیا ہے جو خدا کی مرضی کے خلاف ہو۔؟
ہرگز نہیں۔

مولانا! اعتقاد اذہ کہو بلکہ تاریخ کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے کہو۔ میر جانب دارِ مہر کی حیثیت سے کہو کہ کیا آل محمد کے بڑے سے بڑے دشمن نے بھی یہ بنایا ہے کہ ان کا فلاں قول و فعل خدا کی مرضی کے خلاف تھا؟
ہرگز نہیں۔

نسبے بھائیو!

اسی لئے ہم دعا کرتے ہیں، "خداوند!۔ قیامت کے دن آل محمد سے ہمارا واسطہ ہو جائے کیونکہ دنیا میں محمد و آل محمد نے وہی کچھ کیا جو اللہ نے چاہا۔ لہذا قانونِ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ جب دنیا میں محمد و آل محمد نے وہی کیا جو اللہ نے چاہا تو قیامت میں اللہ بھی وہی کرے گا جو محمد و آل محمد چاہیں گے۔ گویا جیسے محمد و آل محمد چاہیں گے۔ وہ جنت میں جائیں گے اور جیسے محمد و آل محمد نہیں چاہیں گے وہ جہنم میں جائیں گے۔"

سامعینے!

وعدہ کر دو کہ قیامت کے دن مجھے پہچان لو گے۔ دیکھو! ایمان کا رشتہ ایسا رشتہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو پہچان لیں گے۔ اور پھر قیامت کے دن تو لطف بھی بڑا ہی آئے گا۔ تم بھی حیران ہو جاؤ گے کہ جب قیامت کے دن تمام دنیا اکٹھی ہو جائے گی۔ وہاں مسلمان بھی ہوں گے۔ یہودی بھی ہوں گے۔ ہندو بھی ہوں گے۔ عیسائی بھی ہوں گے۔ غرض ہر فرقہ اپنی اپنی ٹولی میں خوش کھڑا ہو گا کہ اچانک ایک

آداز آئے گی۔

”مسلمانو! جاؤ، جنت میں“

ادھر مسلمان بھی جب خوشی میں جنت کی طرف بھاگنا شروع کریں گے تو سامنے جنت کا دروازہ دکھائی دے گا۔ اب جو مسلمان وہاں پہنچیں گے تو بقول شاہ ولی اللہ دہلوی کہ جنت کے صدر دروازے پر جہاں سے تمام مسلمان جنت کے اندر جائیں گے وہاں لکھا ہوگا۔

”محمد۔ علیؑ۔ فاطمہ۔ حسن۔ حسین“

اب جو بڑے بڑے بزرگان دین اور محافظ اسلام اپنی ریش مبارک سیٹے ہوئے ان ناموں کو دیکھیں گے تو فوراً رُک جائیں گے۔

ہم پوچھیں گے ”حضرات! بات کیا ہے۔ اندر کیوں نہیں جاتے؟“
وہ کہیں گے ”نہیے جاتے“
”آخر کیوں؟“

اب وہ بڑے ہی غصہ میں فرمائیں گے۔ ”دیکھتے نہیں ہو کہ یہ امام باڑا ہے۔“ بہر نوع ہم خوش کھڑے رہیں گے اور حضرات سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوں گے کہ یہ تو امام باڑا ہے اور جنہیں امام باڑا میں جانے کی عادت ہے انہیں فرشتے لاکھ روکتے رہیں گے مگر وہ یہی کہیں گے کہ ”ابھی ٹھہرو۔ ہم مجلس من کے ابھی آتے ہیں؟ انشاء اللہ ہم اسی شان سے جنت میں جائیں گے۔ جس طرح امام باڑوں میں آتے ہیں۔“

بہر کیف محمد وآل محمد ہی تانوں عدل پر قائم تھے اور تقاضائے عدل ہی یہی ہے کہ وہ جس طرح چاہیں گے۔ قدرت کی طرف سے بھی یہی ہو گا۔ جو ان کی منشا و مرضی ہوگی۔

محترم سامعین!

یوں تو انسان ہر حالت میں قانونِ عدل پر قائم رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر تین مواقع ایسے ہیں جہاں انسان قانونِ عدل سے ہٹ جاتا ہے اور وہ یہ ہیں محبتِ طیش اور عیش۔ گویا ان تین مواقع پر انسان قانونِ عدل سے ہٹ جاتا ہے۔ ایک تو محبت کی انتہا میں۔ ایک طیش کی انتہا میں اور ایک عیش کی انتہا میں۔ کیونکہ محبت بھلا دیتی ہے اچھے و بُرے کو۔ طیش بھلا دیتا ہے نیک و بد کو اور عیش بھلا دیتا ہے اپنے و پرانے کو۔ ہر نذیع انسان وہ ہے جو محبت میں بھی۔ طیش میں بھی اور عیش میں بھی قانونِ عدل پر قائم رہے۔ لہذا آج "محبت کے بارے میں آپ گفتگو کروں گا۔"

بزرگانِ من!

اگر تم اپنے جذبات پر قابو رکھو تو معلوم ہو گا کہ جذبہ محبت قانونِ عدل سے ہٹا دیتا ہے۔ دیکھو نا!

مجھ سے محبت ہے۔ اے نیالاہ کبے کہ ایسا نہیں ہو سکتا تو یہ قانونِ عدل کے خلاف ہے۔ بھلا ایسی بات پر توجہ دی جا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ یاد رکھو! جہاں محبت آجائے وہاں لفظ "اپنا" خود بخود آجاتا ہے جس طرح اپنا گھر۔ اپنا دیس۔ اپنا علاقہ۔ اپنا ملک۔ اپنا مذہب۔ اپنا خاندان۔ اپنا قبیلہ۔ اپنا باپ۔ اپنا بیٹا یا اپنا بھائی وغیرہ وغیرہ۔ گویا جہاں لفظ "اپنا" آتا گیا وہاں محبت ہوتی گئی اور جہاں محبت ہوتی گئی وہاں قانونِ عدل سے انحراف ہوتا گیا۔

بچو!

تمہیں ایک بات سناؤں کہ ہمارے پنجاب میں ضلع جھنگ کے ایک

دیہات میں دو آدمی بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا کہ "میرے دادا جو تھے اللہ انہیں مغفرت کرے وہ بڑے ہی "چنگے" لوگ تھے مرحوم چوری کرتے تھے مگر بڑے ہی شریف تھے۔ چنانچہ ایک دن وہ حضرت چوری کرنے گئے مگر وہ گھر والے "بے ایمانے" جاگ رہے تھے۔"

سامعین !

آپ نے سن لیا مگر میری زندگی کا محور ہی یہی بات ہے کہ دادا اپنا تھا۔ اور باوجود چور ہونے کے خدا اس کی مغفرت کرے۔ مگر وہ گھر والے جو جاگ رہے تھے وہ بے ایمان بن گئے۔ یوں ہوتا ہے۔ اپنے پرانے کافرق۔ اگر گھر والے جاگ رہے ہیں کہ ہمارے گھر چوری نہ ہو تو وہ بے ایمان بن گئے اور چور چونکہ اپنا ہے اسلئے خدا اس کی مغفرت کرے۔ بہر نوع یوں تانوں عدل سے دنیا ہٹ جاتی ہے۔ محبت تانوں عدل سے ہٹا دیتی ہے اور اپنا مثبت تانوں عدل سے دور رکھتی ہے اب اگر آپ کو کسی سے محبت ہے تو اس میں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ دیکھو نا ! ایک دفعہ کسی مولوی صاحب نے مجھوں سے کہا۔ "مجھوں میںاں ! خلافت کا جھگڑا ہے۔ کسے بنا دیں ؟" مجھوں نے جواب دیا۔

"میری نیلی ہی کو بنا دو۔ کیونکہ مجھے تو نیلی سے بہتر کوئی دکھائی دیتا ہی

نہیں۔"

بہر نوع جس کو جس سے محبت ہو جائے۔ وہ محبت تانوں عدل پر قائم نہیں رہنے دیتی۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ ہم فیقروں سے مشکوہ نہ کیا کرو کہ فلاں کو فلاں سے محبت کیوں ہو گئی ہے یہ تو اپنے ذوق و شوق کی بات ہے کہ کسی کو شہنشاہ سے محبت ہو گئی اور کسی کو ایک گڈ بیٹے سے محبت ہو گئی۔ کسی کو قید

کرنے والوں سے محبت ہو گئی اور کسی کو قید ہو نبوالوں سے محبت ہو گی۔ الغرض
دیوارِ محبت و عشق ہمارے کسی ضابطے کا پابند نہیں ہے۔
سامعین سے یاد رکھو!

اگر انسان کے لئے سب سے پیاری شے کوئی ہے تو اس کی اپنی ذات ہے
گویا ہر انسان یہی چاہتا ہے کہ میں سب سے بڑا ہو کر رہوں۔ میری بات بلند ہے
میری عزت سب سے زیادہ ہو۔ میرا گھر سب سے اچھا ہو، میرا لباس سب سے
اچھا ہو۔ ہر نوع ہر انسان کو اپنی ذات سے سب سے زیادہ محبت ہوتی ہے اور
اپنی ذات سے بھی زیادہ اگر کوئی شے ایسی ہے جس سے انسان زیادہ محبت
چاہتا ہے تو وہ "بلیٹا" ہے گویا ایک انسان کی سب سے زیادہ محبت والی
شے اگر کوئی ہے تو وہ اس کی "اولاد" ہے۔ خود پھٹا پڑا ناکپڑا پنہن لیا مگر
بیٹے کو نیا خرید کے دیا۔ خود رات جاگ کے گزار دی۔ مگر بیٹے کو آرام سے
سلا یا۔ گویا ہر باپ یہ نہیں چاہتا کہ مجھ سے کوئی بڑھ جائے مگر بیٹے کے لئے یہی
چاہتا ہے کہ مجھ سے بڑھ جائے۔ خود میٹرک ہے مگر چاہتا یہی ہے کہ بیٹا بی اے
ہو جائے۔ خود بی۔ اے ہے تو چاہتا یہی ہے کہ بیٹا پی۔ ایچ ڈی ہو جائے
اور خود لندن سے ہو کر آیا ہے تو بیٹے کے بارے میں یہی چاہے گا کہ وہ جینز میں
چلا جائے۔ ہر نوع ہر باپ اپنے سے زیادہ اپنے بیٹے کو دیکھنا چاہتا ہے۔
ادھر اللہ بھی جب کسی کا امتحان لینا چاہتا ہے کہ آیا یہ قانونِ عدل پر قائم بھی ہے
یا نہیں تو بیٹے سے امتحان لیتا ہے تاکہ دیکھ سکے کہ یہ انسان قانونِ عدل پر قائم ہے
کہ نہیں یا قانونِ عدل سے ہٹتے تو نہیں گیا۔

لہذا۔ اس کی سب سے بڑی مشہور و معروف مثال حضرت ابراہیمؑ
کی مثال ہے۔ اللہ نے کہا۔

ابراہیم!

تم میرے خلیل ہو، میرے دوست ہو اور تمہارا بیٹا بھی ماشاء اللہ میرا
خلیل ہے۔ لہذا میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کہیں تم بیٹے کی محبت میں قانون
عدل سے ہٹ تو نہیں گئے؟

ابراہیم نے جواب دیا۔

خداوند!۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہم تیرے قانونِ عدل سے منحرف
ہو جائیں؟

اللہ نے کہا۔

”ابراہیم! ہم تو جب جانیں گے جب تم ہماری محبت کا موازنہ اپنے
بیٹے کی محبت سے کرو گے تاکہ ہمیں پتہ چل سکے کہ تم واقعی قانونِ عدل
پر قائم ہو۔“

ابراہیم نے پوچھا۔

”خداوند! وہ کیسے؟“

اللہ نے فرمایا۔

ابراہیم! اپنے بیٹے کو ہماری خاطر ذبح کر دو۔

سامعین!

بتاؤ۔ قانونِ عدل پر قائم رہنے کے لئے اپنے بیٹے کو ذبح کرنا ایک بہت

بڑا امتحان ہے کہ نہیں؟

دیکھو نا، ابراہیم نے تو خواب میں دیکھا تھا کہ بیٹا ذبح کر دیا ہوں اور

پتہ ہے کہ نبی کا خواب یقیناً وحی ہوتا ہے۔ لہذا کیوں نا اسٹیل کی بے خبری میں کر دیا

جائے۔ مگر ابراہیم جانتا تھا کہ اگر میں نے یہ کام اسٹیل کی بے خبری میں کر دیا تو اسکا

اجراستغیل کو نہیں ملے گا۔ لہذا استغیل کو جگایا

• بیٹا استغیلے! اٹھو

چنانچہ جوان بیٹا اٹھ کے بیٹھ گیا اور عرض کی۔

• بابا! کیا حکم ہے؟

ابراہیم نے فرمایا "بیٹا! خداوند عز و جل جلالہ کی طرف سے ہمیں حکم

ہوا ہے کہ ہم تمہیں ذبح کر دیں۔ بیٹا! تمہاری کیا رائے ہے؟

ادھر "قائم بلیقسط" کے مصداق نے بغیر سوچے سمجھے جواب دے دیا۔

"بابا جانے! پھر دیر کس بات کی ہے؟۔ حکم خدا کی ابھی تعمیل

کرد۔ انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے، انشاء اللہ ہم باپ بیٹا

دونوں قانؤن عدل پر قائم رہیں گے؟

بہر نوع دونوں میں مشورہ ہو گیا اور ساتھ یہ صلاح ہوئی کہ استغیل کی ماں کو

اس کا پتہ نہ چلے۔ کیوں کہ جوان بیٹے کی ماں ہے کہیں گھبرانہ جائے۔ لہذا ابراہیم نے

استغیل کی ماں کو یہ کہا کہ اسے دوست سے گلے سے جا رہا ہوں۔ چنانچہ ہاجرہ

نے بیٹے کو ہٹلا دھلا کے نئے کپڑے پہنائے اور دروازے تک چھوڑنے آئیں اور

جب ابراہیم بیٹے کو لیکر چل پڑے تو ایک بزرگ ہاجرہ کے پاس تشریف لائے

اور کہا۔

"ہاجرہ! سنتی بھی ہو۔ باہر آؤ اور اپنے بیٹے کو پکڑ کر واپس لاؤ کیونکہ

ابراہیم اسے ذبح کرنا چاہتے ہیں"

ہاجرہ نے کہا۔

• تم پاگل تو نہیں ہو؟ بھلا باپ بھی بیٹے کو ذبح کرتا ہے"

بزرگ نے کہا۔ "ہاجرہ! وہ کہتا ہے کہ مجھے "وحی" ہوئی ہے"

ہاجرہ نے کہا:-

”ماشاء اللہ۔ اگر وحی ہوئی ہے تو بیشک ذبح کر ڈالے“

اب وہ بزرگ بدلا، ”ہاجرہ! میں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ دیکھو نا! یونہی گھر میں نہ بیٹھی رہو۔ باہر نکلو اور بیٹے کو کپڑا کروا پس لاؤ کوئی وحی وغیرہ نہیں آئی کیونکہ ابراہیم بڑھا ہو چکا ہے اس لئے دماغ کام نہیں کرتا ہے“

ہاجرہ یسٹنک غصے میں کہتی ہے، ”الْحَوْلُ وَالْقُوَّةُ الْإِلَهِ اللَّهُ“
یسٹنک وہ بزرگ بھاگ کھڑے ہوئے اور بھاگتے ہوئے مڑ کر پوچھا،
”هَجْرَةٌ! تو نے مجھے کیسے پہچان لیا کہ میں لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ“؟
ہاجرہ نے جواب دیا:-

”نامراد۔ تو نے خود ہی تو پہچنوا دیا۔ کیونکہ تو نبی کی بیوی کو گھر سے باہر نکلنے اور اسمعیل کو واپس لانے کی ترغیب جو دے رہا ہے اور جو نبی کی بیوی کو گھر سے باہر نکلنے کی ترغیب دے وہ شیطان ہی تو ہے“

پھر ذبح ابراہیم اپنے بیٹے کو لیکر اس جگہ پہنچے جہاں اسے ذبح کرنا مقصود تھا۔ ابراہیم نے وہاں پہنچتے ہی زمین کو صاف کیا پھر اپنی عبا بچھا کر اس پر بیٹھے گھوٹا دیا۔ اور پوچھا:-

”بیٹا! بھوک تو نہیں لگ رہی۔ کوئی پیاس تو نہیں لگ رہی
کوئی کسکر تو نہیں چبھ رہی؟
اسمعیل نے جواب دیا:-

”بابا جانے!“ نہیں“

”بیٹا! اب میں حکم خدا کی تہ“

”ہاں بِسْمِ اللّٰهِ“
 ابراہیم نے پوچھا ”بیٹا! کوئی قریش ہے؟“
 اسمعیل نے جواب دیا۔

”ہاں بابا جان! آپ میرے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیں
 تاکہ میں زیادہ ترپنے نہ پاؤں۔ اور اپنے کپڑے بھی سمیٹ لیں تاکہ
 میرے خون کی کوئی پھینٹ آپ کے دامن پہ نہ پڑ جائے۔ جسے
 میری اماں نہ دیکھے،“

چنانچہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد ابراہیم نے اسمعیل کو لٹایا۔ ہاتھ میں چھری
 پکڑی اور جب ذبح کرنے کو گلے پہ چھری سلھی تھی کہ ابراہیم نے اپنی اور اسمعیل کی آنکھوں کے درمیان
 ڈال دیا تاکہ بیٹا بھی چھری نہ دیکھے اور ابراہیم بھی چھری نہ دیکھے اس کے بعد ابراہیم
 نے ”اللہ اکبر“ کہہ کر اسمعیل کے گلے پہ چھری چلا دی۔ اور کچھ دیر بعد ابراہیم نے جو
 اپنی آنکھوں سے پٹی ہٹائی تو دیکھا کہ بیٹا صیح و سالم کھڑا مسکرا رہا ہے اور ذنبہ ذبح
 ہو چکا ہے۔ ابراہیم نے آسمان کی طرف منہ کر کے بلند آواز میں کہا۔

”خداوند! کیا تو مجھ سے ناراض ہو گیا؟ کیا میں قاتلِ عدل سے ہٹ
 گیا؟ کیا تو نے میرے بیٹے باندھنے کو محسوس کر لیا؟“

قدرت کی طرف سے جواب آیا۔

”ابراہیم! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے کب کہا تھا کہ ذبح ہو جائے
 گا؟ ہم نے تو یہ کہا تھا کہ ”ذبح کر ڈالو“ لہذا تم نے اپنی بات پوری
 کر دی۔ بس تمہارا اتنا ہی امتحان تھا۔ انشاء اللہ ہم یہ قربانی تم پر عرض
 رکھتے ہیں۔ کوئی سپوت بیٹا پیدا ہو گا جو تمہارے قرضے کو ادا کر دے گا

بزرگو! یاد رکھو۔ بیٹے کے معاملے میں امتحان دینا اور قاتلِ عدل پہ قائم رہنا

بنی نوزاد آدم پر قرض ہے اور کائنات دیکھ رہی ہے کہ کون ایسا سپوت بیٹا آئے گا جو اس قرض کو ادا کرے گا۔

بس بھائیو!

اس قرض کو ادا کرنے کے لئے اپنے عزیزوں و جانثاروں کے ساتھ حسین ابن علیؑ آج کربلا میں تشریف فرما ہیں اور کائنات منتظر ہے کہ ابراہیم کا یہ سپوت بیٹا دادا کے قرضے کو کس شان سے ادا کرے گا۔

حضور والا!

کربلا کا بھیانگ بن ہے اور لاکھوں خونخواروں کے درمیان بہتر کا فائدہ ہے۔ بیچ میں بہتر کا سردار کھڑے اور صبح سے کان میں آواز آرہی ہے۔

”مولا! میرے گویا“ ”میرے آقا! میں گر گیا“

”میرے بادشاہ! مجھے اٹھا لو“

جب مولا اور آقا کی آوازیں آنی بند ہو گئیں اور باقی صرف اولاد ابی طالب رہ گئے تو حسین نے کسی کا انتظار کئے بغیر حکم دیا۔

”علی اکبر! بیٹا۔ میں حکم دیتا ہوں کہ تم میدان شہادت میں جاؤ

کہیں ایسا نہ ہو کہ بہن کے بچے ذبح ہو جائیں۔ بھائی کا بیٹا تمل ہو

جائے اور دنیا یہ کہے کہ اپنے بیٹے کو روک لیا تھا“

بہر نزع ادھر امام کا حکم ہوا ادھر علی اکبر میدان کی طرف چل پڑا۔ ابھی چپ

قدم چلا ہی تھا کہ حسین نے آواز دی۔

”علی اکبر! بیٹا۔ ذرا ٹھہرو“

اکبر ٹھہر گئے۔ پھر فرمایا۔

”بیٹا! گھوڑے سے اترو۔ چنانچہ علی اکبر گھوڑے سے نیچے اتر آئے

اور عرض کی۔

بابا جانے! کیا علم ہے؟

امام نے فرمایا۔

بیٹا! بیت الشرف میں جاؤ اور ماں کو سلام کرو۔ پھو پھی کر سلام کرو

بہنوں سے رخصت ہو۔

چنانچہ علیؑ اکبرؑ گھر میں تشریف لائے اور حسینؑ بھی ساتھ ساتھ چلتے آئے

غیر میں اکبرؑ نے زینبؑ سے کہا۔

”زینبؑ! اکبرؑ آ رہا ہے۔ آج میں سننا چاہتا ہوں کہ پھو پھی

بھتیجے میں کیا بات ہوتی ہے“

چنانچہ علیؑ اکبرؑ نے تشریف لائے اور سیلیٰ کو سلام کیا۔

”امات! سلام“

ماں جواب میں کہتی ہے۔

”اکبرؑ بیٹا! تم ابھی تک زندہ ہو۔ میرے لعل! میں صبح سے

مصلے بچھائے بیٹھی ہوں۔ تاکہ تیری میت آئے تو شکر یہ کی نماز

پڑھوں۔“

علیؑ اکبرؑ نے کہا۔

”امات! میرے جا رہا ہوں“

”بیٹا! خدا حافظ۔“

علیؑ اکبرؑ ماں سے رخصت ہو کر پھو پھی کے پاس آئے اور آتے ہی زینبؑ

کی گود میں سر رکھ دیا۔ اور لیٹ گئے اور عرض کی۔

”پھو پھی اماں! دیکھو۔ میں تمہارا اکبرؑ ہوں۔ مجھے پیار کرو۔“

ادھر حسین کھڑے ہوئے دیکھ رہے ہیں کہ آج پھو بھی بھتیجے میں کیا باتیں ہونگی
نھوڑی دیر بعد اکبر نے عرض کی۔

”اماں! آپ ہی اس بات کی گواہ ہیں کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا
ہے۔ جو بات بھی پوچھی ہے آپ ہی سے پوچھی ہے اور جو کچھ بھی مانگا ہے
آپ ہی سے مانگا ہے۔ گویا سوائے آپ سے میں نے کسی سے واسطہ ہی نہیں
رکھا۔ اماں! آج بھی آپ سے ایک مسئلہ پوچھتا ہوں۔“
زینب نے کہا۔

”بیٹا! آج کوئی مسئلہ پوچھنے کا موقع ہے۔“
”علی اکبر نے عرض کی، ”اماں! آج ایک مسئلہ بتا دو۔“
”اچھا میرے لعل! پوچھو، کیا پوچھتے ہو۔“
علی اکبر نے عرض کی۔

”اماں! میری دادی فاطمہ کا مرتبہ زیادہ ہے یا آپ کا؟“
زینب ایک دم گھبرا کے فرماتی ہیں۔

”بیٹا! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کجا فاطمہ کی شان، کجا میں
میں تو فاطمہ کی ادنیٰ کینز ہوں۔“

اب جو زینب نے کہا کہ میں تو فاطمہ کی ادنیٰ کینز ہوں تو علی اکبر یا تو
بیٹے تھے۔ یا اٹھ کے بیٹھ گئے اور فرمایا۔

”اماں! اگر تم واقعی فاطمہ کی کینز ہو تو پھر ایک کام کرو۔ کہ آج فاطمہ
کے بیٹے پر اپنے بیٹے کو قربان تو کر دو۔“

بس بھائیو!

علی اکبر کا یہ کہنا تھا کہ ادھر سے حسین نے آواز دی۔

”زینبؓے! میں تاکتا تھا کہ آج میں سنا چاہتا ہوں کہ چھو بھی بھتیجے
میں کیا بات ہوتی ہے۔“

بہر نوح دونوں بہن بھائی نے مل کر اکبرؓ کو آخری لباس پہنایا۔ زینبؓ نے
عبا پہنائی اور حسینؓ نے عامرہ باندھا۔ مگر اس طرح باندھا گیا کہ کفن باندھ دیا۔
اکبرؓ روانہ ہوئے کبھی کسی بہن نے آکے عبا کا دامن پکڑ لیا۔ کبھی کسی بچی نے روک
لیا۔ کبھی چھو بھی نے ٹھہرا لیا۔ جب بڑی دیر ہو گئی تو امامؓ نے فرمایا۔
”بیسیو! مسافر کا رستہ نہ روکو۔“

چنانچہ امامؓ کے کہنے سے سب خاموش ہو گئے۔ علیؓ اکبرؓ جب سب سے
رخصت ہو کر خیمے سے باہر نکلے اور ابھی دروازہ کے قریب ہی تھے کہ ایک درد
بھری آواز آئی۔ جس کو حسینؓ جیسا صابر انسان شکر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ گیا
اکبرؓ ابھی دروازہ کے قریب ہی تھے کہ پیچھے سے آواز آئی۔
”اکبرؓ! ہم سے بھی ملتے جاؤ۔“

علیؓ اکبرؓ لپٹ کے دیکھتے کیا ہیں کہ بیمار بھائی چلا آ رہا ہے۔ دونوں بھائیوں
نے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے اور حسینؓ جیسا صابر آنسو ٹپو نہجتا ہوا باہر نکل آیا۔
اللہ جانے بھائیوں میں کیا راز و نیاز کی گفتگو ہوئی۔ بہر نوح اکبرؓ خیمے سے باہر
آئے اور حسینؓ نے رکاب پکڑ کے سوار کر دیا اور فرمایا۔

”بیٹا! جاؤ۔ خدا حافظ۔“

اکبرؓ میدان کو چلے۔ حسینؓ بھی پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ تھوڑی دور جا کر
اکبرؓ نے باگ روک لی۔ اور عرض کی۔

”با بایا جانے! میں اتر آؤں؟“

حسینؓ نے فرمایا ”نہایت بیٹا۔ جاؤ۔“

• بابا جانے! پھر آپ تکلیف کیوں کر رہے ہیں؟
حسین نے فرمایا۔

• بیٹا اکبر! تمہارا کوئی جوان بیٹا نہیں۔ تمہیں اندازہ ہی
نہیں کہ ہمارے دل پہ کیا گزر رہا ہے۔
اچھا بیٹا! ہم بیٹھ گئے۔ تم جاؤ۔
عزاد ار سید الشہدا!

یہ کہہ کر حسین ایک ٹیلے پہ بیٹھ گئے اور علی اکبر میدان میں آگئے۔ اور جہاد
شروع ہو گیا۔ علی اکبر کی نظر فوجوں پر۔ حسین کی نظر علی اکبر پر۔ دروازہ میں کھڑی
ہوئی زینب کی نظر حسین پر اور مصطفیٰ پر بیٹھی ہوئی لیلیٰ کی نظر زینب پر جمی ہوئی
ہے۔ گویا یہاں سے وہاں تک نظر کا تار مل گیا۔

بسے بھائیو! کوئی دس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ اکبر گھوڑے سے گرا
حسین ٹیلے سے گرے۔ زینب دروازے میں گری اور لیلیٰ سجدے میں گری۔
• یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ میری نیک کلائی نیک راہ میں کام آئی۔
بزد رگو!

علی اکبر نے گھوڑے سے گرتے ہی آواز دی «یا ائی اذر کئی»
• بابا جانے! میں گر گیا»

حسین چلے اور جب اکبر کی لاش نو دس قدم پر پہنچی تو فرمایا۔
«اکبر بیٹا! ایک دفعہ پھر پکارو۔ بیٹا! ہمیں رستہ نظر نہیں آتا۔
ہماری بینائی کام نہیں کر رہی۔ لہذا تم ہمیں آواز دو تاکہ ہم تمہاری آواز کے
کے سہارے آئیں»

چنانچہ علی اکبر نے پھر آواز دی «یا ائبت ائی ائی» • بابا جان!

میں یہاں ہوں۔“

حسین آواز کے سہارے میت پر چپخے۔ دیکھا کہ
اکبر ایک پاؤں سیدھا ہے اور ایک پاؤں پھیلتا ہے۔ حسین میت کے پاس
بیٹھ گئے۔ گود میں اکبر کا سر لے لیا اور فرمایا۔

”بیٹا علی اکبر! ہم آگے۔“

اکبر نے عرض کی ”بابا جان! آپ نے بڑی تکلیف فرمائی ہے“
حسین نے فرمایا۔

”بیٹا! کہو۔ کچھ کہنا چاہتے ہو؟“

اکبر نے عرض کی ”بابا جان! آج اکبر آپ سے دو چیزیں مانگتا
ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو دو گھونٹ پانی دے دو“
گویا جوان بیٹے کا زندگی میں باپ سے پہلا سوال ہی یہی تھا کہ ”دو گھونٹ
پانی دے دو“

حسین نے فرمایا ”اکبر بیٹا! گھبراؤ نہیں تمہارے دادا ابھی تمہیں
سیراب کریں گے“
اکبر نے فرمایا۔

”بابا جان! دوسری فرمائش کرتا ہوں کہ ابھی میں زندہ ہوں لہذا
مجھے گھر لے چلو تاکہ میں پھو پھی اور اماں سے آخری بار مل سکوں۔“
حسین نے کہا۔

”ہاں بیٹا! تمہاری یہ فرمائش ہم ضرور پوری کریں گے۔“
یہ کہہ کر حسین نے ایک ہاتھ اکبر کی گردن کے نیچے لکھا اور ایک ہاتھ پیروں کے
نیچے رکھا اور ”یا علی مدد“ کہہ کے میت اٹھانا چاہی۔ جوان میت بڑھا

آدمی۔ ہاتھ تھرائے۔ زمین پر رکھ دی۔ تھوڑی دیر بعد پھر ارادہ کیا۔ اب کے سینے تک اٹھائی۔ مگر ہاتھ پھر بھی تھرائے میت زمین پر لٹادی۔ اور حسین نے فرمایا۔

اب کبھی بیٹا! ایک کام کرو کہ ادھر سے ہم اٹھاتے ہیں اور کھرتم دونوں ہاتھ ہمارے گلے میں ڈال دو۔ کچھ تم سہارا کرو۔ کچھ ہم سہارا کریں گے۔
چنانچہ اکبر نے ایک ہاتھ باپ کے گلے میں ڈال دیا۔ حسین نے کہا۔
بیٹا! دوسرا ہاتھ بھی ڈال دو۔

اکبر نے عرض کی۔ بابا جان! دوسرا ہاتھ میں سینے سے اٹھانا نہیں چاہتا۔
کیوں بیٹا! کیا بات ہے؟
بابا جان! میں اپنا سینہ آپ کو دکھانا نہیں چاہتا۔
حسین نے فرمایا۔

بیٹا! کوئی بات نہیں۔ میں بھی دکھاؤ۔ ہم دیکھیں گے۔
اب جو اکبر نے سینے سے ہاتھ اٹھایا تو حسین نے دیکھا کہ برہمی کا پھل ٹوٹ کے اکبر کے سینے میں رہ گیا ہے اور اکبر کا دل اس میں پھنسا ہوا ہے۔ حسین نے دیکھ کے فرمایا۔

بیٹا! یہ بات تھی۔ گھبراؤ نہیں۔

یہ کہہ کے حسین نے بیٹے کی میت کو زمین پر لٹایا۔ خود دو زانو بیٹھے۔ ایک ہاتھ بیٹے کے سینے پر رکھا۔ ایک ہاتھ میں برہمی پکڑی اور کھینچنے کا ارادہ کیا اور بلند آواز سے آسمان کی طرف منہ کر کے کہا۔

فانا رسول اللہ! دادا ابراہیم کو سبک کر بلا میں آؤ اور دیکھو میری آنکھوں پر دو مال نہیں ہے۔ میری آنکھوں پر پٹی نہیں ہے۔ میرا

ہاتھ نہیں لرز رہا۔ میرا بدن نہیں کانپ رہا۔

خداوند!

دیکھ۔ آج میں داد ابراہیم کا قرض چکا رہا ہوں:

بزرگانِ منے!

حسین نے بر بھی کو ہلایا۔ بر بھی ہلی تو اکبر کا بندھا ہوا دل ہلا۔ دل ہلا تو
سارا بدن تھرا یا۔ بدن کا تھرانا تھا کہ بلا میں زلزلہ آیا۔ کہ بلا میں زلزلہ آیا تو حسین
کے خمیوں میں زلزلہ آیا اور خمیوں پر زلزلہ آنا تھا کہ پردہ اٹھا اور زینب نے آواز
دی۔

حسینے! مجھے آنے دو۔ اکیلے یہ کام نہ کرتا۔ دونوں بہن بھائی

ہل کے یہ کام کریں گے۔

زینب کا یہ کہنا تھا کہ حسین نے وہیں سے آواز دی۔

زینب! باہر نہ آتا۔ تیرے پردے پہ اکبر کو قربان کرتا ہوں

عزاد ار سید الشہداء!

آج سے چند سال قبل کہ بلا مقل میں حرم سید الشہداء میں فریح اقدس
کے پاس کھڑے ہو کر۔ نماز صبح کے بعد شیخ مہدی نامی ایک شخص ٹھوڑی دیر مہصا
سید الشہداء پڑھا کرنے تھے۔ یہی گویا صبح کا ایک وظیفہ تھا۔ ایک روز انہوں نے
علی اکبر کی شہادت پڑھ دی۔ بڑا گریہ ہوا۔ واپس گھر گئے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے
بعد جب سو گئے۔ تو خواب میں دیکھا کہ سیاہ برقعہ والی ایک خاتون آئی میں اور
فرمائی ہیں۔

شیخ مہدی! شیخ کتاسے کہ میں خواب میں ہی اٹھ کے بیٹھ گیا اور

مرض کی۔

قانونِ عدل

خداوند عز و جلال کی حمد و ثناء کے بعد حضرات
محمد و آلِ محمد پر درود و سلام

حضرات گرامی قدر!

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ چاہتا ہی ہے کہ انسان اپنے ہر قول و فعل و عمل سے قانونِ عدل پر قائم رہے۔ عدل سے تجاوز نہ کرے بلکہ ہر معاملہ میں قانونِ عدل پر قائم رہے۔ یہی اللہ کا منشاء ہے اور یہی وہ انسان سے چاہتا ہے۔ اب اللہ کے چاہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر انسان عدل پر قائم رہے گا تو اللہ کو کوئی نایدہ پہنچے گا اور اگر عدل کو چھوڑ دے گا تو اللہ کو کوئی نقصان ہوگا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اللہ ہر نوع اللہ ہے۔ اللہ کا کسی حالت میں کچھ نہیں بگڑتا۔ اگر ساری دنیا عدل کے اللہ کا نام لے تو سبحان اللہ اور اگر ساری دنیا اس کا نام لینا چھوڑ دے تو مآشاء اللہ۔ اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ تو صاف کہتا ہے کہ۔

اگر تم مجھے یاد رکھتے ہو تو شاباش اور اگر بھول جاتے ہو تو جاؤ جہنم میں۔
لہذا اللہ جو کچھ بھی چاہتا ہے۔ اس کی جو کچھ بھی منشاء ہے وہ اس لئے ہے کہ ہمارے اندر یہ خوبی ہو۔ ہمارے اندر یہ کمال ہو اور صرف اس لئے کہ دنیا میں عدل حقیقی قائم رہے۔ لہذا اللہ نے عدل حقیقی کے ایک لاکھ چوبیس ہزار نمونے انسان کو دکھائے اور سمجھائے۔ یہاں تک کہ جب ہمیں سارے نمونے دکھا چکا تو عدل کو ہمارے دل میں راسخ کرنے کے لئے اس نے عدل حقیقی کو "قائم" کر دیا تاکہ کسی طرح انسان عدل پر قائم ہو جائے۔

صَاحِبَانِ ذوقِ!

اللہ نے پہلا نمونہ عدل جو ہمیں دکھایا وہ تھے ہم سب کے باوا آدم۔ اور جب آدم بن کے تیار ہوئے تو اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ "اسکی طرف رُخ کر کے سجدہ کرو" یہ نہیں کہا کہ "اسے کو سجدہ کرو" بلکہ یہ فرمایا کہ سجدہ اللہ کو کرو۔ مگر آدم کو "قبلہ" بنا کے کرو۔ اور فرشتے بیچارے بھولے بھالے۔ سیدھی سادھی مخلوق۔ سوائے حکم کی تعمیل کے کچھ جانتے نہیں تھے۔ انہیں جب حکم ملا کہ "سجدہ کرو تو فوراً حکم کی تعمیل میں انھوں نے اپنے سر جھکا دیئے پھر اعلیٰ حضرت کی طرف سے حکم ملا "ابھی ٹھہرو" چنانچہ فرشتے ٹھہر گئے اور عرض کی۔

"قبلہ! آپ ہی نے تو حکم دیا ہے۔ اب روکتے کیوں ہو"۔
اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

"فرشتو! بیشک اس کی طرف سجدہ کرو۔ کیونکہ یہ ہمارا بنایا ہوا ہے۔ مگر ذرا ٹھہرو۔ کیونکہ جب اس میں "روح" آجائے گی تو پھر اسے سجدہ کرنا؛

چنانچہ فرشتوں نے آدم کو جب سجدہ کیا جب اس میں روح آگئی۔

سامعین!

یاد رکھو۔ تخلیق آدم کے ساتھ اللہ نے ہمیں یہ قانونِ عدل سکھا دیا کہ میں "قبلہ" ضرور بناتا ہوں مگر اس وقت تک وہ قبلہ نہیں بن سکتا جب تک اس میں میری روح نہ آجائے۔ چاہے وہ علیل بنائے یا خود اپنے ہاتھوں سے جلیل بنائے۔ وہ قبلہ جب بنے گا جب اس میں میری روح آجائے گی۔
حضور والا! یہی نکتہ تھا کہ آج سے پانچ ہزار سال قبل اللہ کے

ایک خلیل بندے نے مکہ میں اللہ کا ایک گھر بنایا۔ زمین میں تصور یہ تھا کہ اللہ جانے یہ گھر کیسا ہوگا۔ کیونکہ میں نے گورنمنٹ ہاؤس دیکھا تھا۔ اس وقت میں نے اندازہ لگایا تھا کہ جب گورنر اور نوابوں کی حویلیاں کئی میلوں تک پھیلی ہوئی ہیں تو اللہ جانے "خدا ہاؤس" کتنا بڑا ہوگا۔ دنیا کے سب سے بڑے شاہ کا مکان اللہ جانے کتنا وسیع ہوگا۔ اور اللہ کا گھر بناتے وقت بھی یہی تصور غالباً حضرت ابراہیم کا بھی ہوگا۔

"خداوند! تیرا گھر بنا ہے۔ ذرا اس گھر کا نقشہ تو بھیج دے تاکہ تیرا گھر بناؤں۔ اللہ نے جواب دیا۔

"ابراہیم! سنتے بھی ہو۔ گھر تو میرا ہی ہوگا۔ مگر زیادہ ناپ توں کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اتنا کمرہ بنا دو کہ بوقت ضرورت ایک عورت آرام سے لیٹ سکے کیونکہ میں نے نہ خود آسکے رہنا ہے اور نہ ہی کرائے پر دینا ہے۔ بلکہ یونہی نکالی پڑا رہے گا چاہے اس پر بت قبضہ کر لیں۔ چاہے بت پرست قبضہ کر لیں مگر گھر میرا ہے۔ میں ہی اس گھر کا مالک ہوں۔"

ہم پوچھتے ہیں۔

"خداوند! تو قادر مطلق ہو کر اتنی بڑی طاقت والا ہو کر اپنے گھر پر کیوں ان نامراد بتوں کا قبضہ ہونے دیا؟ اللہ جواب میں فرماتا ہے۔

"دیکھو نا! تم ابھی نادان ہو۔ کسی بات کو اچھی طرح سمجھتے نہیں ہو۔ اگر بت میرے برابر کے ہوتے تو میں ان سے لڑتا اور جن بتوں کو درجن نے بنا کے بٹھایا ہوں ان سے لڑتا میری تو بہن ہے۔ اگر ان پر میں نے فتح بھی پالی تو بات کیا ہوئی۔ لہذا اگر یہ نامراد بت بیٹھے ہیں تو بیٹھنے دو۔ جب وقت آئے گا خود ہی نکل جائیں گے۔"

سامعین!

ادھر تبت ہیں کہ خدا کر بیٹھے کہ ہم نہیں نکلتے کیونکہ خدا کا گھر ہے اور ہم لوگوں کے بنائے ہوئے خدا ہیں!

لہذا مجبوراً اللہ کو ایسا آدمی بھیجنا پڑا کہ جس نے آتے ہی بتوں سے یہی کہا: "نیک جاؤ میرے گھر سے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ میرا زچہ خانہ ہے" بہر نوع ابراہیم نے اللہ کا گھر بنایا جس کو عرب ہا مسلمان قبیلہ سمجھ کر سجدہ کرتے ہیں۔ اور گھر بنانے کی شان یہ تھی کہ ابراہیم مہار اور اسمعیل مزدور بن گئے۔ حیرت لیا کے معادن بن گئے۔ اور اعلیٰ حضرت خور انجینئر بن گئے اور اپنی موجودگی میں دیکھ لیا کہ کے بنوار ہے تھے۔ ادھر ابراہیم دیوار کا ایک ردالگاتے اور نہ رد ہونے والی دُعا مانگ لیا کرتے۔

خدا وندا! اتنا گھر بن گیا۔ اب مجھے یہ مل جائے۔ اب میری اولاد کو یہ مل جائے " اور اللہ دیتا رہا اور گھر بنتا رہا۔ اور جب پورا گھر بن گیا تو اللہ نے اس گھر کا نام "بیت اللہ" رکھ دیا۔

بسے بھائیو! یہاں تک تو میں نے کہہ دیا کہ اس گھر کا نام اللہ نے "بیت اللہ" رکھ دیا۔ اب آپ خود ہی بتائیں کہ اگر کوئی اس گھر میں بسے لگ جائے تو وہ کیا کہلاوے گا۔ "اہلییتے" گویا بسنے اہلیت بن گئے، ہرگز نہیں۔ کیونکہ گھر میں رہنا اور بات ہے اور اہلیت ہونا اور بات ہے بہر نوع بیت اللہ بن گیا اور ابراہیم نے عرض کی۔

خدا وندا۔ تیرا گھر بن گیا۔ اب معاشہ کے دیکھو لے۔

چنانچہ اعلیٰ حضرت نے معاشہ کیا اور فرمایا۔

"ابراہیم! شاہاش۔ بہت اچھا گھر بنا ہے مگر تم دونوں باپیتا

مل کر ایک کام کرو۔

”میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے پاک کر دو۔“

سامعین!

اللہ نے صرف ابراہیم اکیلے کو حکم نہیں دیا بلکہ فرمایا کہ تم دونوں مل کے میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے پاک کر دو۔

چنانچہ دونوں باپ بیٹے نے مل کے گھر کو پاک کرنا شروع کیا اور پاک کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ کعبہ کی دیوار میں لگی ہوئی اینٹوں میں سے ایک ایک اینٹ پہ ہاتھ رکھا اور کہا، ”سُبْحَانَ اللَّهِ“ دوسری پہ ہاتھ رکھا اور کہا، ”سُبْحَانَ اللَّهِ“ تیسری پہ ہاتھ رکھا اور کہا، ”سُبْحَانَ اللَّهِ“ جب ساری اینٹوں پہ ہاتھ رکھ کے سبحان اللہ کہہ دیا تو اللہ نے کہا، ”پاک ہو گیا۔“ گویا ابراہیم نے بحکم خدا کعبے کی تمام اینٹوں پہ سبحان اللہ کہہ کے تمام دیوار کعبہ کو تسبیح کے دانے بنا دیا۔ اب جب دیوار کعبہ تسبیح کے دانے بن گئی تو ”امام، کو خود ہی راستہ مل جائے گا۔“ پھر نزع خدا کا گھر پاک ہو گیا اور پاک کیا بھی ابراہیم واسمعیل دونوں نے مل کر

سامعین!

باد رکھو! اللہ کہتا ہے کہ میرا تالونِ عدل ہی یہی ہے کہ میں جب بھی کوئی کام لیتا ہوں تو ایک سے نہیں لیتا بلکہ دو سے لیتا ہوں۔ کیونکہ دو کے بغیر میرا کام چل سکتا ہی نہیں۔ دو ہوں تو کام کرو ورنہ رہنے دو۔“

دیکھو فنا! دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ قریب سے ہی دیکھ لو کہ ابراہیم کے ساتھ ہم نے اسمعیل کو لگا دیا۔ موسے کے ساتھ ہارون کو لگا دیا۔ اسی طرح ہر ایک کے ساتھ دوسرا لگانے رہے اور جب بیٹے اکیلے رہ گئے کوئی دوسرا معصوم نہیں تھا۔ تو اللہ نے کہا۔

”عیشے! تم اکیلے ہو اور اکیلے سے ہم کوئی کام نہیں لیا کرتے لہذا

تم غائب ہو جاؤ۔“ چنانچہ عیشے غائب ہو گئے۔

بہر نوع ہدایت کا یہ سلسلہ چلتے چلتے جب محمد تک پہنچا تو اللہ نے محمد کے ساتھ علیؑ کو لگایا۔ علیؑ کے ساتھ حسینؑ کو لگا دیا۔ یہاں تک کہ گیارہویں کے ساتھ بارہویں کو لگا دیا اور جب بارہواں اکیلا رہ گیا تو خدا نے اپنے قانونِ عدل کے مطابق اُسے بھی غائب کر دیا۔ ادھر عیشیؑ اکیلا رہ گیا اُسے غائب کر دیا گیا۔ ادھر باہواں اکیلا رہ گیا اُسے بھی غائب کر دیا گیا۔ جب تک دونوں اکیلے رہیں گے غائب رہیں گے اور جب اللہ اُن سے ہدایت کا کام لینا چاہے گا تو پھر انہیں ملا دے گا۔ اب یہ دونوں کہاں ایک دوسرے سے ملیں گے۔ یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ کیونکہ ایک غائب زمین پر اور ایک غائب ہے آسمان پر۔ لہذا دونوں کے غائب ہونے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ادھر عیسیٰؑ ہے کہ وہ اگڑے کہتا ہے۔

”مسلمانو! تمہارے والا زمین پر غائب ہے اور ہمارے والا

آسمان پر غائب ہے۔“

بھائیو!

اب ان عیسیائیوں کو کون سمجھائے کہ اللہ نے دونوں کو غائب کرتے وقت قانونِ عدل کی میزان میں تولتا تو ایک اتنا کم وزن نکلا کہ آسمان پہ پہنچ گیا اور ایک اتنا وزن والا تھا کہ زمین پر رہ گیا۔ اور رہ گیا ان دونوں کے ملنے کا طریقہ کہ یہ کہاں ملیں گے تو یہ بات وقت بتائے گا کہ آسمان والا آئے گا یا زمین والا جائے گا۔ بہر نوع دوہوں گے تو ہدایت کا کام شروع ہو گا۔

حضور والا!

قیامت کے دن جب مسلمان اور عیسیائی آپس میں جھگڑیں گے کہ امام کون ہے

تو اتفاق سے ایک پٹواری صاحب اگر آجائیں تو یہ مسئلہ بہت جلد حل ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ آگریہی کہے گا۔

مولوی صاحبانے! تم کیوں خواہ مخواہ کے لئے جھگڑ رہے ہو۔ یہ مسئلہ ہمارے سمجھانے کا ہے کہ چونکہ بیٹے زمین چھوڑ کر بے دخل ہو گئے تھے اور یہ آج تک اپنی زمین پر قابض ہے۔ اور قابض و دخیل کار کے ہوتے ہوئے بے دخل کو زمین پر امانت کر دانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

بہر نوع زمین والا ہمیں نماز پڑھانے کا اور ہم نماز پڑھیں گے تو دکھیں گے کہ نصیری اور نصاریٰ میں لڑائی ہو رہی ہوگی۔ کیونکہ نصاریٰ کے خدا کا بیٹا پیچھے ہو گا اور نصیری کے خدا کا بیٹا آگے ہو گا۔ اس دن نصیری کہے گا کہ ہم ناکتے تھے کہ۔۔ ہمارے خدا کا بیٹا آگیا ہے»

بہر کیف خدا کے قانونِ عدل کے مطابق دوہوں کے تو کام ہو گا۔ اسی طرح خدا نے ابراہیم اور اسمعیل دونوں سے کعبہ کو پاک کر دانے کا کام کروایا اور جب کعبہ میں بتوں نے گھر بنا لیا اور اسے پاک کر دیا تو اس وقت بھی تنہا محمد نہیں تھے بلکہ علیؑ بھی ساتھ ہی تھے۔ دونوں نے مل کے خدا کے گھر کو پاک کیا۔

چنانچہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

”محمد! اسے قبلہ بناؤ“

خدا و خدا۔ کیسے؟

اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ جب اسمیں میری رُوح آجائے گی تو قبیلہ بن جائے گا»

ادھر دنیا انتظار میں تھی کہ اعلیٰ حضرت کی رُوح کب آئے گی۔ کہا جسے آئے گی اور کس طرح قبلہ بنے گا۔ یہاں تک کہ خدا کے آخری رسول بھی آگئے

ٹیجی ہیں۔ ادھر رسول کو دینی پہنچی کہ۔

”محمد! سنتے سنتے بھی ہو۔ جسے تم نے میرے گھر سے مانگا تھا وہ آ گیا ہے
لذا اسے جا کر لے آؤ۔ چنانچہ رسول تشریف لائے۔ چچی کو سلام کیا۔

”امات! سلام“

ناطہ بنت اسد نے کہا ”محمد بیٹا! وعلیک سلام“

”امات! میرے بھائی کو میری گود میں دو“

چنانچہ رسول قریب گئے۔ آخر درجے کی رسالت ٹھکی اور اول درجے کی

ادست ہوئی۔ نور کا ایک ٹکڑا دوسرے نور سے منصل ہوا۔ بھائی بھائی کے سینے
سے چمٹ گیا۔ تھوڑی تھوڑی لبوں پہ مسکراہٹ آئی۔

ہم پوچھتے ہیں ”قبلہ! ہنستے کیوں ہو؟“

وہ فرماتے ہیں۔

”ہنسنے کی تو بات ہے۔ یہ صاحب عالم ازل سے مجھے چھوڑ کر

آگے تھے۔ آج ہم بچپن کے ساتھی ایک دوسرے سے پھر ملیں ہیں

لہذا ہنستا ہوں کہ ہم آگے نا“

بچے کو محمد نے سینے سے لگایا۔ بوسہ لیا اور فرمایا۔

”امات! مبارک ہو۔ ماشاء اللہ بڑا خوبصورت ہے“

ماں نے کہا۔

محمد! خاک مبارک ہو۔ اس میں زندہ رہنے کی کوئی آثار نہیں ہی نہیں

دیکھو نا! تین دن ہو گئے اسے کعبہ میں آئے ہوئے۔ نہ اس نے آنکھ

کھولی۔ نہ اس نے دودھ پیا اور نہ ہی یہ رویا۔ ایسے بچے کا زندہ رہنا مشکل ہے“

محمد نے کہا ”امات! گھراؤ نہیں“۔ یہ کہہ کر حضور نے بچے کو ہاتھوں

پر لٹایا۔ اور پوچھا۔

برخوردار! ہم نے تمہاری تمام شکایتیں سن لی ہیں۔ بتاؤ۔ تم نے آنکھ کیوں نہیں کھولی؟ بچے نے عرض کی۔۔

قبلہ! اگر آنکھ کھولتا تو کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں سے نظر لڑ جاتی اور جب نظر لڑ جاتی تو توڑتے ہوئے مردت نا آ جاتی۔ اب حضور سگئے ہیں۔ لیجئے۔
آنکھ کھول دی!

یہ کہہ کر بچے نے آنکھ کھولی اور پہلی نظر حیرہ رسول پر پڑی۔
بچو! آپ چاہے "یا علی" کا نعرہ لگائیں یا کچھ کریں۔ بیخ بات تو یہ ہے کہ آپ کے علی نے سمجھا تھا کہ مجھ سے بہادر کوئی نہیں مگر کعبہ میں جب محمد کو دیکھا تو "آنکھ کھل گئی"۔

بہر ذرا بچے نے آنکھ کھول دی۔ اب محمد پوچھتے ہیں۔
"برخوردار! تم روئے نہیں؟"

فرمایا "نہایت"

"کیوں؟"

قبلہ! بات یہ ہے کہ میرا دل تو رونے کو بہت چاہا مگر میں رونے کو ضبط کرتا رہا۔ کیونکہ کعبہ میں میری ماں اکیلی تھی اور میں اس کا ساتھی تھا۔ اس لئے ساتھی ہو کے رونا مجھے پسند نہ آیا

اب محمد مسکراتے ہوئے پوچھتے ہیں۔

"برخوردار! تم نے دودھ کیوں نہیں پیا؟"

فرمایا "حضور! بھوک لگ رہی تھی مگر معاف کرنا۔ اگر اور بچوں کی طرح پیذا ہوتا تو ضرور اپنی ماں کا دودھ پیتا۔ مگر آپ نے رسالت کا دعویٰ کیا ہے۔ آپ کو

گواہ کی ضرورت ہے لہذا آپ نے اللہ سے دعا کی کہ اپنے گھر سے گواہ دے چنانچہ میں آپ کے طلب کرنے پر بطور گواہ آیا ہوں اور جب آپ کے طلب کرنے پر بطور گواہ آیا ہوں تو اپنی ماں کا دودھ کیوں پیوں کیوں کہ گواہ کا خراج خوراک تدعی کے ذمہ ہونا ہے اس لئے آپ خود میری خوراک کا انتظام فرمائیں۔

بچے کی یہ باتیں سن کر رسول نے اپنی انگشت مبارک دہن میں داخل کی۔ دودھ جاری ہوا۔ ایک دو گھنٹہ پی کر بچے نے منہ پھر لیا۔ رسول سمجھ گئے کہ گواہ ذرا ترماں چاہتا ہے۔ رسول نے اب جو زبان اقدس دہن میں داخل کی تو زبان سے دودھ جاری ہوا۔ اور خوب پیٹ بھر کے پیا۔ اور جب پی چکے تو ننھے ننھے ہونٹوں سے زبان رسول مضبوط پکڑ لی۔ ادھر رسول اشاعے سے فرماتے ہیں ”چھوڑو بھی“ ادھر بچہ اشاعے میں خواب دیتا ہے ”ٹھہرو بھی“

چنانچہ رسول اسی طرح اپنی زبان بچے کے دہن میں ڈالے ہوئے گھرتنگ آئے۔ گھر کے بھنے بڈھے تھے وہ محمد کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ ادھر بچے نے جو دیکھا کہ رسول کی زبان دہن میں ہے تو مسکرایا اور آنکھوں آنکھوں میں خاندان کے بزرگوں سے کہہ رہا تھا۔

”خاندان کے بزرگو! گواہ رہنا۔ پیدا ہوتے ہی محمد مجھے زبان دے

چکے ہیں“

رسول نے بچے کو گہوارے میں لٹا دیا۔ اوپر ایک چادر اوڑھادی مبارکباد دینے والے لوگ آئے گئے اور پوچھنے لگے۔

”محمد! ماشاء اللہ۔ شکل کیسی ہے؟“

رسول فرماتے ہیں۔

”کیا بتاؤں کہ شکل کیسی ہے۔ کیونکہ بچے اموا اسی کی شکل ہوتے ہیں جسکے

گھر پیدا ہوں۔ اور یہ بچہ ایسے گھر میں پیدا ہوا ہے جسکی کوئی شکل ہی نہیں۔ لہذا میں تمہیں کون سی شکل بتاؤں؟
ادھر سے اعلیٰ حضرت نے کہا۔

”محمد! واہ۔ بڑی مشکل سے تو ہمارے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا اور تم اس کی شکل بتاتے ہوئے گھبراتے ہو۔ کہہ دو کہ اس بچے کی آنکھیں عین اللہ ہیں۔ چہرہ ”وَجْهًا لِلَّهِ“ ہے۔ ہاتھ ”يَدَا لِلَّهِ“ ہیں اور زبان ”لِسَانًا لِلَّهِ“ ہے۔

چنانچہ رسول نے بھی کہہ دیا کہ آنکھیں عین اللہ ہیں۔ چہرہ وجہ اللہ ہے۔ ہاتھ ید اللہ ہیں اور زبان لسان اللہ ہے۔ جب رسول سب کچھ کہہ چکا تو خیال آیا کہ یہ کیا ہو گیا۔ کیونکہ اللہ سے دعائیں مانگ مانگ کے میں نے تو اپنا مددگار مانگا تھا مگر اللہ نے ایک ایک کر کے پھر واپس لے لیا۔ اب میرے پاس کیا رہ گیا۔ لہذا اب تک جو اللہ نے نہیں کہا تھا وہ رسول نے جلدی جلدی کہہ دیا۔

”يَا عَلِيُّ لَهْمُكَ لَهْمِي - دَمُكَ دَهْمِي“

”یا علی! تیرا میرا گوشت ایک۔ تیرا میرا خون ایک“

سَامِعِينَ!

ہاتھ اور آنکھیں وغیرہ اللہ نے دے دیں اور گوشت خون رسول نے دے دیا۔ اور ادھر ہم گوارے کی طرف دیکھتے ہیں تو بچہ ہنسنے جا رہا ہے۔ ہم نے عرض کی۔
”یا علی! ہنسنے کیوں ہو؟“

بچہ جواب میں کہتا ہے۔ ”آج لطف آگیا“

قبلہ! کیا لطف آگیا؟“

”دیکھو نا! آج ہم تقسیم ہو گئے۔ آج ہم بٹ گئے۔ آدھے اللہ کے

حصے میں آگئے اور آدھے رسول کے حصے میں آگئے۔ ہمارے پاس تو کچھ رہا ہی نہیں۔ اب اگر کوئی مجھ سے محبت کرے گا تو آدھی اللہ سے کرے گا اور آدھی رسول سے کرے گا۔ اور اگر کوئی مجھ سے عداوت کرے گا تو آدھی اللہ سے کرے گا اور آدھی رسول سے کرے گا۔

بچو!

تمہیں ایک واقعہ سناؤں کہ جب ہمارے رسول اس بچے کو لیکر گھر پہنچے ہیں تو قحط پڑی دیر بعد حضرت ابو جہل تشریف لائے۔ ان کا ذریعہ معاش ہی یہ تھا کہ مکہ میں جو بچہ پیدا ہوتا وہ اس کی آنکھوں میں کسی بڑے بت کے پاؤں کی مٹی بطور رسم لگاتے اور سوار و پیہ ہدیہ لیکر گھر جاتے چنانچہ وہ آج بھی تشریف لائے کہ بڑے گھر میں بچہ پیدا ہوا ہے بہت انعام ملے گا۔ ابو جہل نے آتے ہی محمد سے کہا۔

”محمد! مبارک ہو۔ خدانے بھائی عطا کیا ہے۔ اگر اجازت ہو تو میں اپنا کام کروں؟“

رسول ہنسی روک کر فرماتے ہیں۔ ”بچے سے پوچھ لو“

ابو جہل آگے بڑھا۔ ایک ہاتھ میں سلانی پکڑی۔ ایک ہاتھ سے بچے کی آنکھ کھولی اور ابھی سلانی آنکھ کے قریب ہی تھی کہ بچے نے زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔ گویا ابو ادھر رہ گیا اور جہل ادھر رہ گیا۔ اور وہ یہ کہتا ہوا وہاں سے بھاگ پڑا کہ ”یہ خاندان بڑا عبادت گاہ ہے“

منبر گو!

اب تعزین یہ کہتا ہے کہ

ذیہی صاحب! شرم کرد۔ منبر پہ بیٹھ کر جھوٹ بولتے ہو۔

بھلا تین دن کے بچے میں اتنی طاقت آسکتی ہے کہ وہ طمانچہ مارے
میں کہتا ہوں۔ بھائیو!

اس شخص کے برابر کا تو کوئی بُرا ہے ہی نہیں جو منبر پہ بیٹھ کے جھوٹ
بولتا ہو۔ دیکھو نا! یہ تو سیدھی سادھی بات ہے کہ اگر تین گھنٹے
کا بچہ، عینے، بات کر سکتے تو تین دن کا بچہ طمانچہ بھی مار سکتا
ہے، اس میں جھگڑے کی کیا بات ہے،
اب معترض کہتا ہے۔

زیدی صاحب! بات کرنا اور چیز ہے اور طمانچہ مارنا اور
چیز ہے!

میں کہتا ہوں۔ مولوی صاحبان!

جھگڑے میں نہ پڑو۔ دیکھو نا! بقول تمہارے عینے "کلمۃ اللہ تھا
لہذا اس نے بات کر لی۔ اور یہ بچہ" بید اللہ تھا لہذا اس نے طمانچہ
مار دیا۔ اور اگر اب بھی سمجھ نہ آئے تو ہمارے پنجاب کا یہ محاورہ بھی
سن لو۔ کہ "کنز در کے باتے" چلے۔ اور "طاقتور کا ہاتھ" چلے۔

حضور والا!

آج کعبہ کی قسمت ہی پلٹ گئی۔ آج کعبہ کی شان ہی بدل گئی۔ آج کعبہ کا انداز
ہی بدل گیا۔ ادھر بچے رسول کے سینے پہ پلتا رہا۔ زبان رسول جو جس کے پرورش پاتا
رہا اور جتنا اس نے پینا تھا پی لیا اور جو علیؑ سے باقی بچا وہ علیؑ کے بچوں نے
باپ کا مال سمجھ کے پینا شروع کر دیا۔ بہر کعبہ علیؑ رسول کے سینے پہ پلتا رہا۔
یہاں تک کہ جوں جوں اس بچے کا سن بڑھتا رہا توں توں رسول کا دل بڑھتا رہا۔
رسول کی طاقت بڑھتی رہی۔ رسول کی شان بڑھتی رہی اور جب دس گیارہ سال

کا ہوا تو اللہ کو بھی جوش آگیا۔

محمد! سنتے بھی ہو۔ بس اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں۔ لہذا

اب اعلان کر دو۔ کہ ہم رسول آل ہیں کیونکہ تیرے دردگار کو ماشاء اللہ اب کافی طاقت آگئی ہے۔ مگر عوام سے بات نہ کرنا بلکہ پہلے اپنے گھروالوں سے بات کرو۔

چنانچہ رسول نے گھروالے بلائیے۔ تقریباً چالیس بنی ہاشم کا دستیکہ لگا کے بیٹھ

گئے۔ ان میں حضرت ابولہب بھی ہیں۔ حضرت عقبہ میں۔ حضرت غنیمہ میں۔ حضرت

شعبہ میں۔ آخر اقرب تو ہیں نا۔ یہ اور بات ہے کہ "ع" سے عقرب ہیں مگر میں

تو "اقرب"۔ بہر نوع سب حضرات تشریف فرما ہیں اور ایک کونے میں حضرت

ابی طالبؑ بھی تشریف فرما ہیں۔ اور ادھر ایک طرف دس گیارہ سالہ بچہ بیٹھا ہوا

کھیل رہا ہے۔ ہر کیف جب سب اکٹھے ہو گئے تو رسول تقرر کرنے کے لئے کھڑے

ہوئے یہ "لسان اللہ" کی پہلی تقریر ہے۔ جو کبھی نہیں بولا اس کا پہلا خطبہ ہے۔

مالین کے رسول کی پہلی تقریر ہے۔

سامعین!

آپ کو معلوم ہے کہ کسی حاکم کی پہلی تقریر اس کی پوری حکومت کی پالیسی ہوتی ہے

لہذا آج رسول کی پہلی تقریر اس کی ساری زندگی کا خلاصہ ہو گا۔ ادھر رسول تقرر

کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ ادھر ساری کاٹنات رسول کی تقریر سننے کیلئے

موجود ہوئی۔ درخت کا ایک ایک پتہ سننے کے لئے کان بن گیا۔ ذرے گوش

ہوا پ سننے کے لئے سوار ہو گئے۔ زمین پہ لہٹی ہوئی نازک سیلیں سننے کے لئے

درختوں پہ چڑھ گئیں۔ زمین و آسمان کی فضا سننے کے لئے ٹھہرائی اور چلتی ہوئی

ہوا میں سننے کے لئے روک گئیں۔ اور رسول نے تقریر شروع کر دی۔

لوگو! میں تمہارے لئے دنیا و آخرت کی خوبی لیکر آیا ہوں۔

اگر میری بات مان لے گے تو دنیا کی خوبی بھی تمہیں ملے گی اور آخرت کی خوبی بھی تمہیں ملے گی۔ گویا قیصر دکرئی کے تابع تمہارے قدموں کے نیچے ہوں گے۔

بولو! تم میں سے کون ہے جو میری مدد کرے؟

رسول کی یہ بات سُنکر تمام لوگوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اشارے کئے خاموش ہو گئے۔ دوسری دفعہ رسول نے پھر فرمایا، "کون ہے جو میری مدد کرے؟" مگر جب کہیں سے جواب نہ آیا۔ تو دُنیا نے دیکھا کہ ایک دم زمین و آسمان میں زلزلہ پیدا ہوا۔ کائنات لرز اُٹھی اور حتم فلک نے ستاروں کی عینک لگا کے اس منظر کو دیکھا۔ جبریل نے سد رہ سے سر پہ تاج چڑھا کے دیکھا۔ حور و ن نے جنت کے درتچے کھول دیئے۔ کوثر کے مزے میں پانی بھرا آیا۔ سبیل نے سبیل نکال کے بات سن لی کہ گیارہ سال کا بچہ کونے سے اٹھا اور عرض کی۔ حضور! پھر فرمائیے کیا حکم ہے؟ رسول نے فرمایا۔

"بیٹا! ہم یہ کہہ رہے تھے کہ کون ہے جو ہماری مدد کرے؟" یہ سُنکرتے نے ایڑیاں اٹھالیں اور کہا، "إِنَّا ناصِرُونَ يَا رَسُولَ اللَّهِ" یا رسول اللہ! میں تیرا ناصر و مددگار ہوں۔

سَامِعِينَ!

یا محمد! نہیں کہا بلکہ یا رسول اللہ! کہا۔ اگر یا محمد کہتے تو محمد کی زندگی تک ساتھ ہوتا مگر یا رسول اللہ! کے معنی یہ ہیں کہ جب تک تیری رسالت ہے جب تک میری نصرت تیرے ساتھ ہے۔

بچے کی یہ ادا دیکھ کے رسول مسکرائے اور فرمایا، "بیٹا! سوچ لو"

بچے نے عرض کی۔

حضور! سوتح لیا۔

• بیٹا! غور کر لو۔

• حضور! کر لیا۔

• بیٹا! یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔

• حضور! میں جان پر کھیل کے کہہ رہا ہوں۔

• بیٹا! یہ بڑا مشکل مرحلہ ہے۔

• حضور! گھبراؤ نہیں۔ میں بھی مشکل کشا ہوں۔ نکر نہ کرو تمہارے دشمنوں کی

آنکھیں نکال دوں گا۔ تمہارے دشمنوں کے سپیٹ پھاڑ دوں گا۔ تم بے شک جو کہنا چاہو

کہو۔ اور جو کرنا چاہو۔ کرو۔ کیا مجال کسی کی جو تمہارے پروگرام میں رکاوٹ ڈالے جب تک

تیری رسالت ہے میں ساتھ دوں گا۔

بزرگانِ من!

علیؑ یہ کہہ رہے تھے اور ابی طالبؓ مرٹھکانے محمدؐ کی تسبیح پڑھ رہے تھے۔

اور یاد رکھو! علیؑ نے رسولؐ سے اتنا پکا وعدہ کیا ہے کہ اس سے زیادہ پکا وعدہ کوئی

ہو سکتا ہی نہیں تھا۔

دیکھو نا! دیوار کی دیکھو طرف حکومت بٹ رہی تھی مگر رسولؐ کا ساتھ دینے کا پکا وعدہ

کرنے والا رسولؐ کی میت لے بیٹھا رہا۔ گو یا اس سے بہتر ساتھ تو کسی نے دیا ہی نہیں۔

توہبہ ہے نا صاحبان!

علیؑ نے رسولؐ سے کہہ دیا۔ "میں ساتھ دوں گا" اور میرے بچے انشا اللہ آپ کا

ساتھ دیں گے۔ میری پوری نسل آپؐ کا ساتھ دے گی۔ آپؐ گھبراہٹ میں نہیں آپؐ نکر نہ کریں انشا اللہ

قیامت تک میری مدد آپؐ کے ساتھ رہے گی۔ اور محمدؐ یاد رکھو! میں اس طرح ساتھ

دوں لاکہ دین پھیلے گا اللہ کا۔ کلہ پڑھا جائے گا محمد کا اور کنبہ کٹ جائے گا علی کا۔

میرے عزیز بچو!

اگر کنبہ کٹ جائے تک ہی بات ختم ہو جاتی تو غنیمت تھا۔ مگر کنبہ کٹ جانے تک بات ختم نہیں ہوئی بلکہ یوں کہیے کہ علیؑ نے رسول سے یہ کہا کہ "قبلے! دین اللہ کا پھیلے گا۔ کلہ تیرا پڑھا جائے گا اور بہو بیٹیاں میری قید ہو جائیں گی۔" کیونکہ نوجوانوں کا کٹ کرنا اور بات ہے اور بہو بیٹیوں کا قید ہونا اور بات ہے۔ اور محمدؐ دیکھو! میری بیٹیاں ہی نہیں بلکہ میری بہو بیٹیاں جو غیر خاندان سے آئی ہیں وہ بھی تیرے دین کی خاطر میری بیٹیوں سے بڑھ کر قربانی دیں گی۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں:

نوجوانو! مجھے معاف کرنا۔ میری کہانی ہی کچھ ایسی ہے۔ میں مجبور ہوں ورنہ میرا جی نہیں چاہتا کہ تم رو پڑو۔

دیکھو نا! زینب کی قربانی ہو تو وہ علیؑ کی بیٹی ہے۔ لہذا اس کی شان اور کٹھنم کی قربانی کا انداز اور ہے مگر جو علیؑ کے گھر میں غیر خاندان کی آئی تھیں۔ ذرا ان کی قربانی کی شان دیکھو۔

محترم سامعین!

مجھے آپ ڈھنڈے دل سے سوتج کر بتائیں کہ اگر ایک خاتون بیوہ ہو جائے اور اسکی گود میں ایک بچہ ہو تو اس کے تمام جذبات کا مرکز و محور وہی بیٹا ہوتا ہے۔ وہ بیوہ اپنی ماں کی زندگی اس بچے کے سہانے گزار دیتی ہے کہ یہ جوان ہوگا۔ اس کی شادی کروں گی۔ اس کے مہرا باندھوں گی۔ اس کا گھر لے گا اور میں دوبارہ آباد ہوں گی۔ گویا ایک بیوہ کی توجہ کا مرکز اس کا بیٹا ہوتا ہے۔

حضور والا!

رسولؐ میں جسٹن کی شہادت ہوئی۔ بوقت شہادت حسنؑ کی بیوہ اپنے شوہر کے سامنے

کھڑی ہے۔ گو دس سال کا بچہ ہے اور اپنے شوہر سے کہہ رہی ہے۔

”میرے سوتاج! میرے لئے کیا حکم ہے؟“

حضور حسنہ مجتبیٰ نے ارشاد فرمایا: قاسم کے مات! تو اپنی ساری

زندگی اس بچے کے ساتھ گزار دے۔ یہ بچہ قیامت تک تیرے نام کو قائم

دبائی رکھے گا،

برکیت امام حسن مجتبیٰ کی رحلت ہو گئی اور قاسم کی ماں قاسم کو گود میں اٹھا کر بیٹا

کے پاس روزانہ آتی اور فرماتی۔

”مجھے بس! میں تو غیر خاندان کی ہوں۔ اُمّتی ہوں۔ آپ سادات ہیں اور بیچہ

آپ کا ہے۔ اب اتنے سال کا ہو گیا میں نے اس کے لئے یہ لباس تیار کیا ہے۔ بی بی!

دیر نہ کرنا۔ جب چودہ سال کا ہو جائے تو اس کی شادی کر دینا۔ بی بی! مجھے اپنی زندگی

لاکوئی بھروسہ نہیں۔ میں ایک دفعہ قاسم کے چہرہ پر ہراد لکھنا چاہتی ہوں“

بس بھائیو! قاسم کو تیرھواں سال ہوا تو حسین کے ساتھ کر بلا میں آ گیا۔

اور قاسم کی ماں نے قاسم کی شادی کے سارے کپڑے اپنے ساتھ اٹھائے تاکہ ہو سکتا ہے

راستے میں ضرورت پڑ جائے۔

مَحْتَرَمَ سَامِعِينَ!

کر بلا میں دن گذرتے گئے۔ حتیٰ کہ عاشورہ کی شب آگئی اور امام خیمے سے واپس

ہو کر جب مہلے پہ جا کے بیٹھے تو قاسم ماں کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی۔

”امّات! ہزلی بی نے مولا سے اپنے بیٹے کے لئے کل کی اجازت مانگی ہے۔“

لہذا میں بھی اپنے لئے اجازت مانگ لوں؟“

قاسم کی ماں نے کہا: ”ہاں بیٹا! جاؤ حسین سے تم بھی اجازت مانگو“

برکیت قاسم وہاں تشریف لائے جہاں امام مہلے پہ بیٹھے معبود حقیقی کے ساتھ راز و نیاز کی

باتیں کر رہے تھے۔ قاسم نے آتے ہی سلام کیا۔ ”چچا جانتے سلام“

امام نے سر اٹھاتے ہی دیکھا اور فرمایا۔

”قاسم بیٹا! تم رات کو کیوں گھر سے باہر آئے۔ جاؤ میرے لعلے!
اپنی اماں کے پاس جا کر آرام کرو۔“ امام نے جو یہ کہا تو دل بھرا آیا۔ چنانچہ قاسم کو گود میں
بٹھا کر بھائی حسن کو یاد کیا۔

”قاسم بیٹا! تجھ سے بھائی حسن کی خوشبو آ رہی ہے۔ ہائے بھائی حسن!

آج حسین اکیلا رہ گیا۔“ تھوڑی دیر بعد حسین نے آسو پونچھنے ہوئے فرمایا۔

”قاسم بیٹا! جاؤ۔ گھر میں جا کر آرام کرو۔“

قاسم نے کہا۔ ”مولا! ایک بات پوچھنا ہوں۔“

امام نے فرمایا۔ ”ہاں بیٹا! پوچھو۔ کیا بات ہے؟“

قاسم نے عرض کی۔ ”مولا! کل کے شبید ہونے والوں میں میرا نام ہے؟“

امام نے سمجھا کہ بارہ سال کا بچہ ہے۔ اللہ جانے سن کے دل پہ کیا اثر ہے۔ چنانچہ پہلے

ہوئے یہ فرمایا۔

”قاسم بیٹا! تم تو بڑے ہو۔ تمہارے چھوٹے بھائی اصغر کا نام بھی ہے۔“

بس سے بھاٹیو! اب جو مولانا اصغر کا نام لیا تو قاسم یا بیٹھا تھا یا کھڑا ہو گیا
اور انگریزی بول تو عبا کے بند ٹوٹ گئے اور بھرائی آواز میں فرمایا۔

”مولا! ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ کیا یہ بے حیا فوج اصغر کے گہوئے

تک پہنچ جائے گی؟“

قاسم کی اس ادا پہ امام کو پیار آ گیا۔ گود میں اٹھایا۔ پیار کیا۔

”قاسم بیٹا! کس کی مجال ہے کہ تمہاری زندگی میں کوئی خیموں تک آجائے۔“

پھر فوج قاسم اٹھے۔ ماں کے پاس آئے اور کہا۔

امانت! میرا یہ لباس اتار دو اور فقیروں والا لباس مجھے پہنا دو۔ میں ابھی بات کے اندھیرے میں اپنے دادا کی قبر پہ جانا چاہتا ہوں اور وہاں بیٹھ کے کہوں گا۔

» ڈاڈا اجانتے! مجھے حسین نے مرنے کی اجازت نہیں دی»

قاسم کی بیوہ ماں نے جویر سنا تو کہا۔

» بیٹا! گھراؤ نہیں۔ میں تمہیں اجازت دلاتی ہوں» چنانچہ ایک ہاتھ میں ٹاٹھ لیا اور ایک ہاتھ میں قاسم کا بازو پکڑا اور حسین کی پشت کی طرف اگر کھڑی ہو گئی اور عرض کی:» حسینے! اگر آج حسن زندہ ہوتے تو میں نہ آتی۔ تیری بیوہ بھادر جہ آج تجھ سے قاسم کی موت کی بھیک مانگنے آئی ہوں»

امام نے جواب میں فرمایا۔

» بھابی جان! آپ نے کیوں تکلیف فرمائی۔ میں خود ہی حاضر ہو جاتا۔

کہو کیا بات ہے؟»

قاسم کی ماں نے عرض کی۔

حسینے! میں تیرے یتیم بھتیجے قاسم کو لائی ہوں اسے بتا دو کہ کل کے شہید ہونے والوں میں اس کا نام بھی ہے۔ حسینے! دیکھو میں سیدانی نہیں ہوں۔ غیر خاندان کی ہوں۔ کل کے مرنے والوں میں اگر قاسم نہ ہوتا تو میرا دودھ بدنام ہو گا۔ لہذا مجھے بتا دو کہ یہ بھی شہید ہو گا»

چنانچہ حسین نے قاسم کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ گویا اجازت مل گئی۔ ادھر قاسم کی ماں خوشی خوشی خیمے میں واپس آئی اور زینب سے کہا۔

» بی بی زینب! مجھے مبارک دور۔ کل کے مرنے والوں میں قاسم کا نام بھی ہے»

سامعینے!

رات کا پچھلا پہر تھا اور حسن کی بیوہ نے اپنے ساتھ آئے ہوئے صندوق کھولے۔

قاسم کی شادی کے جتنے جوڑے بنائے تھے ایک ایک کر کے پہنائے اور اسی عالم میں صبح ہو گئی۔ اور صبح کو جب میدان شہادت گرم ہو گیا اور جب قاسم کی باری آئی تو حسین اپنے چھوٹے بھائی عباس غازی سے پوچھتے ہیں "عباس بھائی! ابھی چھوٹے تیم بھتیجے کی باری نہیں آئی؟"

عباس نے عرض کی "مولا! قاسم کے بدن پر کوئی ذرہ پوری نہیں آئی۔"
عباس کا یہ کہنا تھا کہ خیمے سے قاسم کی ماں نے آواز دی۔

"عباس بھائی! ذرہ وہ پہنتے ہیں جو لڑتے جائیں۔ چونکہ میں اسے مرنے بھی رہی ہوں اس لئے اسے بغیر ذرہ ہی کے بھیج دو۔"

اس کے بعد قاسم کی ماں نے قاسم کو بلا کر سبز کرتا پہنایا اور حسین نے بھائی حسن والا سرخ امامہ باندھا اور امام نے گود میں لیکر گھوڑے پر بٹھایا اور قاسم میدان میں آگئے۔

عزادار سید الشہداء!

میں اپنی گفتگو کو یہاں آ کر ختم کرنا ہوں کہ تھوڑی دیر بعد میدان سے آواز آئی اب تک جتنے شہید گرے تھے چاہے اپنے تھے یا غیر سب نے گرتے وقت حسین کو پکارا تھا مگر قاسم اتنا کم تھا کہ اس نے گرتے وقت حسین کو نہیں پکارا بلکہ ایک دم گھبرا کے آواز دی۔

"امات! میں گر گیا"

گویا قاسم کی معصومیت کی بات تھی کہ اس نے گرتے وقت ماں کو پکارا۔ بہر حال قاسم کی آواز پر حسین چلے۔ میدان میں پہنچے۔ قاسم کی میت دیکھی اور فرمایا۔

"قاسم بیٹا! مجھے معاف کرنا۔ میں ذرا دیر سے پہنچا ہوں" یہ کہہ کر حسین نے اپنی عباس مبارک کندھے سے اتاری اور زمین پر پھادی اور میت کا ایک ایک

ٹکڑا اٹھا کر عبا میں رکھا۔ گویا بنی ہاشم کا نازک ترین شہزادہ اپنی زندگی ہی میں پا مال ہو گیا حسین
 قاسم کی لاش کے ٹکڑوں کی گھڑی اٹھا کے خیمے میں لے آئے۔ ادھر ماں یہ سمجھی کہ حسین لاش
 نہیں لائے۔ فرمایا۔

”حسین! قاسم کی لاش نہیں لائے۔ میں بیوہ ہوں۔ کسے بھیجوں؟“
 حسین نے فرمایا۔

”بھابی! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں قاسم کی لاش لایا ہوں۔ مگر شاید
 آپ دیکھ نہ سکیں گی،“

قاسم کی ماں نے کہا۔

”حسین! مجھے دکھاؤ قاسم کی لاش۔ آخر بات کیا ہے“

یہ سنا کہ قاسم نے گھڑی قاسم کی ماں کے سامنے رکھ دی۔ اب جو قاسم کی ماں
 نے بیٹے کی لاش کے ٹکڑے دیکھے تو بلند آواز سے فرمایا۔

”زینب! ادھر آؤ۔“

”کلثوم! ادھر آؤ۔“

”بی بیو! ادھر آؤ۔“

مجھے مبارک باد دو کہ میری قربانی سب سے زیادہ قبول ہوئی ہے۔ آج
 میرے بچے کی شادی ہوئی ہے۔“

ادھر حسین نے اس خیال سے کہ کہیں ماں نہ مڑ جائے، قاسم کی لاش کو اٹھایا
 اور میدان میں لے گئے اور اکبر کے لاشے کے ساتھ رکھ دیا اور دونوں لاشوں کے
 بیچ میں بیٹھ کر ایک ہاتھ قاسم کی لاش پر اور ایک ہاتھ اکبر کی لاش پر رکھ کر آسمان
 کی طرف رُخ کر کے بلند آواز میں فرمایا۔

”وَاخْرِبْتَا“ ”یا اللہ! میں غریب ہو گیا۔“

محاسن

خداوند عز و جلال کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آل محمد
پر دُرد و سلام

حضرات گرامی قدر!

قرآن مجید کی ہر چھوٹی آیت میں زندگی کا کوئی نہ کوئی اہم اصول بیان کیا گیا ہے مثلاً ایک آیت ہے ”هل جزأ الاحسان الى الاحسان“ اللہ نے اس آیت کریمہ میں لفظ ”احسان“ کو دو بار ادا کیا ہے۔ اور اس آیت کا ترجمہ مختصر وقت میں یہی ادا ہو سکتا ہے کہ ”احسان کا کچھ بھی بدلہ نہیں سوائے احسان کے“ اگر تمہارے ساتھ کسی نے خُن سلوک کیا ہے یا کوئی اچھی طرح پیش آیا ہے۔ اگر کسی نے تمہارے ساتھ کوئی بھلائی کی ہے یا کوئی نیکی کی ہے تو اس کا بدلہ ضرور دو مگر نیکی کا بدلہ نیکی سے بھلائی کا بدلہ بھلائی سے شرافت کا بدلہ شرافت سے ہونا چاہیے۔ گویا یہ ایک اصول ہے جو اللہ نے اس آیت کریمہ میں بیان کر دیا ہے۔

بزرگانِ من!

اگر ہم اپنی ساری زندگی میں اس اصول کو پلے باندھ لیں اور اس پر عمل کرتے رہیں تو دنیا کے تقریباً نوے فیصدی جھگڑے ہی ختم ہو جائیں۔ تمام فسادات ہی تقریباً ختم ہو جائیں یہ گویا ایک اصولی بات ہے۔ لہذا اس اصول کو ذہن میں رکھتے ہوئے آج آپ سے عرض کرتا ہوں کہ۔

سامعینِ مکرام! بتاؤ۔ تمہارا سب سے بڑا محن کون ہے جس کا تم پر سب سے

زیادہ احسان ہے؟

حاضرین مجلس!

تم جتنا چاہو، سوچ لو، آخرا سی محور پر آ جاؤ گے کہ تمہارا سب سے بڑا محسن اگر کوئی ہے، جسکے تم احسان کا بدلہ ادا کر سکتے ہو تو وہ محسن یہ ہے جس نے تمہیں عدم سے وجود دیا اور ناپید سے پیدا کیا۔ بناؤ وہ محسن اعظم ہے یا نہیں؟۔ یقیناً وہ محسن اعظم ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ دیکھو نا! ایک وقت وہ تھا کہ ہم نہیں تھے مگر آج ہم ہیں اور ایک وقت وہ ہو گا جب ہم نہیں ہوں گے۔ گویا ہمارے ادھر بھی ”نہیں“ ہے۔ ہمارے ادھر بھی ”نہیں“ ہے۔ اور بیچ میں ہماری ”ہے“

یاد رکھو! جب ہمارے محسن نے چاہا کہ جب ہم دنیا میں آئیں تو ہمیں آنا پڑا اور جب وہ کہے گا کہ ”واپس جاؤ“ تو چاہے ہم مزہ جائیں۔ ہمیں جانا پڑے گا۔ یہ اور بات کہ سنی خوشی اپنے پیروں سے چل کر نہیں جائیں گے تو چار بندے ہی اٹھا کر لے جائیں گے مگر جانا ضرور پڑے گا۔ اور جب تک وہ یہاں رکھے گا ہمیں رہنا پڑے گا۔ اگر خود جانے کی کوشش کریں گے تو حکومت خود کشی کے جرم میں سزا دے گی۔ یا اللہ حرام موت میں پکڑے گا۔ بہر ذریعہ اللہ ہمیں جب تک رکھے گا۔ ہمیں رہنا پڑے گا اور جب بلائے گا۔ ہمیں جانا پڑے گا۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ ہم سے پوچھے بغیر ہی جب چاہا جہاں چاہا۔ جسے چاہا بلا لیا۔ اور جس گھر میں چاہا بھیج دیا۔ چاہے ابر کے گھر میں۔ چاہے غریب کے گھر میں چاہے کسی کافر کے گھر میں۔ چاہے کسی مسلمان کے گھر میں۔ بہر ذریعہ وہ کسی سے مشورہ نہیں لیتا وہ بندے کو بھی دیکھتا ہے اور گھر کو بھی دیکھتا ہے۔ جس کو جس گھر کے قابل سمجھتا ہے وہاں بھیج دیتا ہے۔ جسے دیکھتا ہے کہ یہ بندوں کے گھر کے قابل ہے اُسے بندے کے گھر بھیج دیا۔ اور جسے دیکھتا ہے کہ یہ اللہ کے گھر کے قابل ہے اُسے اللہ کے گھر بھیج دیا۔ بہر کیف ہمارا سب سے بڑا محسن ہمارا ”اللہ“ ہے۔ اس کے بعد دوسرا محسن وہ ہے جس نے ہمیں اللہ سے متعارف کروایا۔ ورنہ ہم کیا جانتے تھے کہ اللہ ہے

بھی یا نہیں؟۔ ہم تو اپنی نادانی سے کئی لاکھوں چیزوں کو اللہ سمجھے بیٹھے تھے۔ لہذا آج ہم اس محنِ اعظم کا شکر یہ ادا کرتے ہیں جس نے ہمیں لاکھوں دروازوں سے ہٹا کر ایک باپِ کریم کے دروازے پر بٹھا دیا۔ گویا ہم میں اتنی بے غیرتی اور بے حیائی تھی کہ دروازے جائے بھیک مانگتے تھے۔ مگر اس محنِ اعظم نے کہا، "نہیں، دروازے پر بٹھکنے سے بہتر ہے کہ ایک باپِ کریم پر بیٹھ جاؤ"۔ لہذا آج ہم اس محنِ اعظم کا شکر یہ ادا کرتے ہیں جس نے ہمارا لغاتِ اللہ سے کروا دیا۔

سامعین!

بہت سے کم حضرات ہماری تقاریر سن کے کہتے ہیں کہ شیعوں "غلو" کہتے ہیں کیونکہ یہ محمد و آلِ محمد کو اللہ سے ملا دیتے ہیں۔
 میں کہتا ہوں۔ "نادالوا! ہم محمد و آلِ محمد کو اللہ سے کب ملاتے بلکہ محمد و آلِ محمد نے ہیں اللہ سے ملا دیا ہے۔ ورنہ ہم تو اللہ کے واقف ہی نہیں تھے اگر وہ درمیان میں نہ ہوتے۔"

حضور والا! ایمان سے بناؤ۔ اگر محمد و آلِ محمد یہ کہہ دیتے کہ "ہم اللہ ہیں" تو کوئی طاقت اس کی تردید نہیں کر سکتی تھی۔ یہ تو ان کی عالی ظرفی ہے کہ انہوں نے اللہ کو اللہ رہنے دیا۔ ورنہ ان کے اللہ بننے کی کوئی تردید نہیں کر سکتا تھا۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ باوجود ان کے انکار کرنے کے لوگ انہیں "اللہ" کہتے رہتے اور حبیبِ گمراہ انہیں اللہ کہتے تھے تو وہ خوش نہیں ہوتے تھے بلکہ انہیں قتل کرتے تھے کہ "ہمیں اللہ مت کہو"۔

بزرگانِ من!

اگر کوئی بڑا مانے تو مانے مگر اصل بات منہ سے نکلی ہی پڑتی ہے کہ اے آلِ محمد! تم کتنے عالی ظرف ہو کہ تم اللہ بنا بھی اپنی توہین سمجھتے ہو؟ بہ نفع جو عالی ظرف انسان

لوگوں کے بنانے سے اللہ نہ بنتا ہو۔ وہ لوگوں کے بنانے سے حاکم یا خلیفہ کیا بنے گا۔ گویا محمد مصطفیٰ ہمارے محنِ اعظم ہیں جنہوں نے ہمیں اللہ کا تعارف کر دیا۔ ان کے بعد زمانے میں ایسا انقلاب آیا کہ اللہ کا نام تو تھا یا نہیں بلکہ محمد کا نام بھی دینا سے ٹنکا۔ اب بتاؤ! وہ ہمارا محنِ اعظم ہے کہ نہیں جس نے خود مر کے محمد کا نام ڈھٹنے دیا۔ جس نے خود مر کر محمد کا نام روشن کر دیا۔ وہ یقیناً ہمارا محنِ اعظم ہے۔

لہذا بھائیو! تقاضائے فطرت یہی ہے۔ اور شرافت یہی ہے کہ جس نے احسان کیا ہو تو اس کے احسان کا بدلہ احسان میں اتار دے۔ چاہے دُنیا کچھ کہے مگر اپنے محن کے احسان کو نہ بھولنا۔ یہی شرافت ہے اور یہی انسانیت ہے کہ حسین نے کربلا میں کھڑے ہو کر اللہ کے نام کو اور محمد کے نام کو زندہ کر دیا۔ خدا کے نام کو حیاتِ ابدی دے دی اور محمد کے نام کو حیاتِ جاوید دے دی۔

خود ذبح ہو گیا مگر اپنے ان محسنوں کے نام کو زندہ رکھا۔ بہر نفع حسین ہمارا محنِ اعظم ہے جس نے ہم سب مسلمانوں پر احسان فرمایا ہے۔ لہذا یہ بات شرافت کے خلاف ہوگی اور انسانیت کے منافی ہوگی کہ اگر حسین جیسے محن کو بھلا دیا جائے۔ گویا حسین کو بھلا دینا انسانیت کی توہین ہے۔

عزیزو!

مذہب کی الجھنوں اور بالادستی سے بالاتر ہو کر حسین جیسے محن کے نام کو یاد رکھنا ہی عین شرافت ہے۔ حسین کے لئے کوئی مذہبِ دلت کی قید نہیں ہے۔ اگر مسلمان حسین کو امام کہتے ہیں تو لاکھوں ہندو بھی "ہائے حسین" کہتے ہیں۔ گویا حسین عالمِ انسانیت کا محن ہے۔ لہذا اللہ کا کوئی نام نہ لیتا اگر محمد نہ ہوتے اور محمد کا کوئی نام نہ لیتا اگر حسین نہ ہوتے۔ اور بات یہاں اگر ختم نہیں ہوتی بلکہ حسین کا کوئی نام نہ لیتا اگر کوفہ و شام کے بازاروں میں زینبِ خطبات نہ پڑھتی۔

یاد رکھو!

ایک دیرانے میں لٹ جانے والے قاضی کو کون جان سکتا تھا۔ اگر زینب نہ ہوتی اس وقت نہ تو کوئی ریڈیو دیکھتے اور نہ ہی کوئی اور ذرا لُح تھے مگر یہ صرت زینب کا احسان ہے کہ اس نے حسین کو متعارف کر دیا۔ حالانکہ حکومت کا ذریعہ اشاعت نہ تھا اس لئے کہ حکومت تو خود قاتل تھی۔ اب کون آکر بتاتا کہ فلاں جنگل میں شہر کے کنارے ایک بے ضرر قافلہ لٹ گیا ہے اگر کوہ و شام کے بازاروں میں ادنیٰ کے منبر پر بیٹھ کر ہاتھ گردن کے ساتھ بندھوا کر ننگے سر زینب خطبات نہ پڑھتی۔ لہذا زینب کا احسان ہے جس کی وجہ سے ہم حسین سے متعارف ہو گئے۔ زینب نے حسین کو ایک ایک گھر پہنچایا ہے۔ ہر فرخ حسین کا ہم ننگ پہنچا زینب کا احسان ہے۔ اور دنیا میں جتنی بھی مجالس عزاداری ہو رہی ہیں ان تمام مجالس کی بانی زینب ہے۔

سامعین!

ایک دن بہن بھائی کے درمیان جھگڑا ہو گئی۔ اور زینب نے کہہ دیا۔
 ”حسین! جس باپ کا تو بیٹا ہے۔ اسی باپ کی میں بیٹی ہوں۔ جس ماں کا دودھ تو نے پیسا ہے اسی ماں کا دودھ میں نے پیسا ہے۔ جو تیرا نانا ہے وہی میرا نانا ہے اور جو تیرا دادا ہے وہی میرا دادا ہے۔“

حسین! تیرے سر پر آبا کا عامہ ہے مگر
 دیکھو حسین! میرے سر پر اماں کی چادر ہے۔
 لہذا حسین! آج تیرا میرا مقابلہ ہے۔ اب بتا تو چاہتا کیا ہے؟
 حسین نے فرمایا۔

”زینب! آج میں اسلام کو بچانا چاہتا ہوں۔ آج میں مر کر نانا
 کے دین کو بچانا چاہتا ہوں۔“
 زینب نے کہا۔

.. حسین ! میں تجھے روکتی نہیں۔ جو تیرا ارادہ ہے پورا کر لیں حسین!

میرا تیرا بھی مقابلہ ہے۔ بے شک تو مر جاؤ گے
یاد رکھو حسین ! میں زینبؓ تجھ سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں بھی تیرے
نام کو قیامت تک مرنے نہیں دوں گی۔ اگر سستی سستی رملہ حملہ گاؤں گاؤں
جا کر حسین حسین نہ کھلا دیا تو فاطمہؓ کی بیٹی نہ کہنا۔

بس بھائیو! زینبؓ کا احسان ہے کہ آج ہم اپنے تمام کاروبار چھوڑ کر
محمدؐ کو حسینؑ کا پڑوسہ دے رہے ہیں اور زینبؓ کا شکر یہ ادا کرتے ہیں۔

بے بے زینبؓ!

تیرا احسان ہے کہ تو نے حسینؑ جیسی قیمتی شے سے ہمیں متعارف کروا دیا۔ حسینؑ نے
بھی کربلا میں بیٹے شہید کروائے اور تو نے بھی اپنے بیٹے شہید کروا دیئے۔

جی جی ! میں معلوم ہے کہ دو بیٹے قربان کروا کے بھی حسینؑ کی نسل قیامت تک
باقی رہے گی مگر واہ رے زینبؓ ! تو نے حسینؑ کی حفاظت میں اپنی پوری نسل ختم
کرادی۔

جی جی ! ہم تیرے ہر احسان کو سرائیوں پر رکھتے ہیں اور تیرا شکر یہ ادا کرتے ہیں
کہ تو نے آج حسینؑ جیسی قیمتی شے ہم تک پہنچا دی۔

میرے بھائیو!

زینبؓ نے پہلی مجلس گیارہ محرم ۱۱ھ کو حسینؑ کے لاشے پر پڑھی۔ پھر کوفہ
کے بازاروں میں پڑھی۔ درباروں میں پڑھی۔ جب کوفہ کے ایک ایک محلہ میں پڑھ
نی تو راستے کے شہروں اور قصبوں میں پڑھتی رہی۔ پھر شام کے ملک میں حسینؑ کی مجلسیں
پڑھیں۔ یزید کے دربار میں پڑھیں۔ اور جب یزید نے کہا۔

زینبؓ ! تم مدینہ جاسکتی ہو۔

تو زینبؓ نے ایک مکان خالی کروا کے تین دن حسینؑ کی مجلس پڑھی۔ اور وہاں سے

جب مدینہ کے لئے روانہ ہوئی تو راستے میں پڑھتی رہی۔ اور جب مدینہ پہنچی تو پہلا کام یہ کیا کہ حسین کی مجلس پڑھی۔

سامعین!

گذشتہ سال میں بھی مدینہ کی زیارت سے فیض یاب ہوا ہوں۔ جب مکہ سے مدینہ کے لئے چلا تو خدا جانے میرے ذہن میں کیا کیا تصورات منڈلا رہے تھے۔ اور جب ہماری گاڑی مدینہ کے قریب پہنچی تو ڈرائیور نے کہا۔

”مَدِیْنَه آگیا ہے“

میں نے دیکھا کہ دُنیا خوشی منا رہی تھی اور لوگ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ مگر میں گاڑی سے نیچے اُترا اور مدینہ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا اور کہا۔

”مَدِیْنَه! تو ہی وہ مدینہ ہے نا جہاں حسین رہتا تھا۔

اے مدینہ کی گلیو!

تم گواہ ہونا کہ تم میں حسین کھیلا کرتا تھا۔

اے مدینہ کے درو دیوار! تمہیں یاد ہے نا کہ یہاں حسین اپنے نانا کے کدے

پر بیٹھ کر چلا کرتا تھا“

بہر فرغ زینب نے مدینہ میں حسین کی پہلی مجلس پڑھی اور جب اہل مدینہ کو پتہ چلا کہ مدینہ سے باہر حسین کی بہن آئی ہے تو شہر کے سارے زن و مرد زینب کے استقبال کے لئے آگئے اور ان لوگوں کی قیادت حضرت ام البنین فرما رہی تھیں۔

سامعین!

علامہ کفایت حسین مرحوم و مغفور اپنی مجلس میں ایک فقرہ کہا کرتے تھے کہ جب ام البنینؓ اہلبیت کے قافلے کے قریب آئی ہیں تو پہلا شخص جو قافلہ زینب میں سے جناب ام البنین سے ملا وہ تھے حضور امام زین العابدینؓ علیہ السلام۔

بائیس سال کا سن تھا۔ ایک سال کی قید بھگت کے آئے تھے۔ ام البنین نے

امام کو جو آتے دیکھا تو پہچانا نہیں۔ چنانچہ امام زین العابدینؓ نے آگے بڑھ کر سلام

کیا۔ "دادی اماں! سلام"

ام البنین نے پوچھا "کون؟"

اماں نے جواب دیا۔

"اماں! مجھے پہچانو۔ میں زین العابدین ہوں۔"

حافظ صاحب کہا کرتے تھے کہ امام کی یہ بات سن کر ام البنین کے منہ سے مسافت

نکلا۔ "بیٹا زین العابدین! جوانی کی اس عمر میں تم اتنے بوڑھے ہو گئے"

"بیٹا! تمہاری داڑھی کیوں سفید ہو گئی؟"

بیٹا! زینب کہاں ہے۔"

زینب نے قریب سے آواز دی۔

"اماں! میں یہاں کھڑی ہوں۔"

ام البنین آگے بڑھی۔ زینب کو سینے سے لگا لیا۔ اور کہا۔

زینب بیٹا! کوئی ناراضگی ہے؟"

زینب نے جواب دیا۔

"مجھے ملتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ میں تیرے بچوں کو

چھوڑ گئے آگئی ہوں۔ میں تیری اولاد کو ختم کر کے آگئی ہوں۔"

صاحبان!

ایک چھوٹے بچے نے ام البنین کے پاؤں پکڑ لیے۔"

ام البنین پوچھتی ہیں۔

بیٹا! تم کون ہو؟"

بچہ جواب میں کہتا ہے۔

"اماں! میں تیرے عباس کا یتیم بیٹا ہوں۔"

عزادار سید الشہداء!

جب ساری گفتگو ہو چکی تو ام البنین پوچھتی ہیں۔

زینب! سناؤ۔ کہ بلا میں کیا گزری؟

چنانچہ زینب فرماتی رہی۔ اماں! کیا سنتی ہو۔ میں دیکھتی رہی اور میرے
بھائی بھتیجے۔ بیٹے اور اصحاب ذبح ہوتے رہے اور جب سنانے سنانے یہاں
پہنچی کہ حسین گھوڑے سے گر گئے تو ام البنین گھبرا کے کہتی ہے۔

وہا میں۔ پھر کیا ہوا؟

زینب نے جواب دیا۔

اماں! پھر مجھے حسین کی کوئی اطلاع نہ مل سکی۔ میں دروازہ پر بے چین
کھڑی رہی مگر کوئی بتانے والا نہیں تھا کہ میرا بھائی کہاں ہے۔
ام البنین نے پوچھا۔

زینب! پھر کس نے اطلاع دی؟

فرمایا۔

اماں! کوئی آدمی تو زندہ نہیں رہا تھا۔

زینب نے فرمایا۔ اماں! مجھ پر احسان ہے حسین کے گھوڑے کا جس

نے مجھے آکر بتایا کہ زینب! تو یہاں کھڑی ہے اور حسین گر گئے۔

سما معین! بتاؤ۔ حسین کا گھوڑا ہمارا معن ہے کہ نہیں؟

آج ہم اس معن کی شبیہ کے قدموں پر سر رکھنا یا معن سعادت سمجھتے ہیں اسکو
سلام کرنا یا معن عزت سمجھتے ہیں کیونکہ یہ ہمارے معن اعظم گھوڑے کی شبیہ ہے

خداوند عالم بعدتہ محمد وآل محمد ہماری

مجلسوں کو قبول و منظور فرمائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ
اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
 اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰى
 سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ

اَدائے حق

اِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

اللہ کا پسندیدہ دین اسلام ہے۔

خداوند عز و جلال کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد وآل محمد

پر درود و سلام

حضرات گرامی قدر!

اللہ کا یہ فرمان ہے "اِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ"

یاد رکھو! دین اور مذہب میں فرق ہے

دین کے معنی میں "منزل مقصود" کو یا وہ نقطہ مرکزی جہاں ہم پہنچنا چاہتے

ہیں، دین کہلاتا ہے۔ اور نقطہ مرکزی تک پہنچنے کے راستے کو مذہب

کہتے ہیں۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ نقطہ مرکزی ایک ہو مگر اس تک پہنچنے کے

راستے مختلف ہوں۔ لہذا مختلف رستوں سے نقطہ مرکزی تک پہنچنے والے

ایک دوسرے سے اس بات پر نہیں لڑ سکتے کہ تم اس رستہ سے کیوں آئے

ہو کیونکہ جس کو جو رستہ پسند تھا وہ اس رستہ کے ذریعہ منزل مقصود تک

پہنچ گیا مگر نقطہ مرکزی تو ایک ہی ہے۔ گویا شخص قدرتی طور پر اپنی منزل تک

پہنچنے کے لئے وہ رستہ اختیار کرتا ہے جسے وہ اپنے خیال میں قریب تر اور آسان تر

سمجھتا ہے۔ یا پھر رستے کا واقف بھی ہوتا ہے لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ

کا واقف بھی رستہ پونجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جب چلتے چلتے رستہ میں چوڑا جہ

آجاتا ہے۔ چنانچہ اسے مجبوراً وہاں ٹھہرنا پڑتا ہے اور فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ان چچاروں راستوں میں سے کسی ایک سے کو اختیار کیا جائے۔ لہذا ایسے بھٹکنے والوں کے لئے حکومت کی طرف سے جو انتظام ہوتا ہے اسے "ٹریفک" کہتے ہیں۔ اور اللہ کی طرف سے جو انتظام ہوتا ہے اسے "عقل" کہتے ہیں۔

بزرگان من!

اب تم خود سوچو کہ منزل مقصود کی طرف کون سا راستہ جائے گا کیونکہ صرف راستہ ہی وجہ اختلاف نہیں ہونا چاہیے بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ ہماری منزل مقصود کیا ہے۔ ہاں مگر ہر راہرو کو راستہ میں کمبات کا خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ میرا بھائی جو اسی منزل کی طرف جا رہا ہے جہاں میں جانا چاہتا ہوں ایسا تو نہیں کہ اس کا رخ اصل منزل سے بالکل اٹھ ہو۔ مثلاً میرے بھائی کو لاہور کی طرف جانا ہے مگر وہ بدقسمتی سے گواچی کی سڑک پر چل پڑے اور دوڑنا شروع کر دے۔ گویا وہ اپنے راستے پہ جتنا ہی تیز دوڑے گا اتنا ہی اپنی منزل سے دُور ہوتا جائے گا۔ اپنی اس ناسمجھی سے نہ تو کسی سے کلا کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی سے شکوہ کر سکتے ہو۔ نری محنت یا تکلیف اٹھانے سے کام نہیں چلے گا۔ بہر نوع صرف راستہ ہی وجہ اختلاف نہیں ہونا چاہیے بلکہ دیکھنا یہ ہو گا کہ ہماری "منزل مقصود" کیا ہے۔

یاد رکھو!

ہمارا مقصود ہے "دین" اور ہمارا دین ہے "اسلام" گویا ہم چاہتے ہیں کہ دنیا میں ہم دیندار بن کے رہیں۔ ایماندار بن کے رہیں کیونکہ وہ آدمی دنیا میں بڑا ذلیل ہے جو "بے دین" ہو۔ بہت بڑا ہے وہ انسان جو "بے ایمان" ہو۔ اگر کسی کافر کو کافر کہہ دو تو کوئی بڑی بات نہیں نہرو کہہ دو کہہ دو تو وہ بڑا نہیں منائے گا۔ اور اگر کسی عیسائی کو عیسائی کہہ دو تو

وہ یہی کہے گا کہ اس میں شک کی کیا بات ہے۔ میں عیسائی ہی ہوں۔ حالانکہ
ہندو۔ یہودی اور عیسائی آپ کے خیال میں مومن تو نہیں ہیں
ایمان سے ان کا کوئی واسطہ تو نہیں ہے مگر ذرا کسی کو ”بے ایمان“ تو کہہ دو
فوراً بگڑ جائے گا۔ معلوم ہوا کہ ایمان کوئی ایسی پیاری شے ہے کہ اس سے کوئی
علیحدہ ہونا برداشت نہیں کر سکتا اسی طرح ”بے دین“ کہہ دو تو فوراً بگڑ جائے
گے۔ معلوم ہوا کہ دین بھی کوئی ایسی چیز ہے جس سے الگ ہونا کوئی بھی پسند نہیں کرتا

بچو!

اگر تم ضد میں آ کر کسی ”بے دین“ کو بے دین کہہ دو تو پتہ چلے گا کہ بے دین
تمہیں کیا جواب دیتے ہے۔ اسی طرح کسی ”بے ایمان“ کو بے ایمان تو کہہ دو۔ پھر
پتہ چلے گا کہ وہ بے ایمان تمہارے ایمان کی کیا گت بناتا ہے۔ معلوم ہوا کہ کوئی شخص
نہ تو دین سے جدا ہونا برداشت کرتا ہے اور نہ ہی مذہب سے جدا ہونا
برداشت کرتا ہے۔ گویا دین و ایمان دونوں اتنی پیاری چیزیں ہیں۔

بزرگان من!

جب دین و ایمان دونوں اتنی پیاری چیزیں ہیں تو ہمیں دیکھنا یہ ہے
کہ ہمارے بزرگوں نے ہمیں ان کا تعارف کیسے کروایا ہے تاکہ نہ ہم دین
کو چھوڑنے پائیں اور نہ ہی اسلام کو چھوڑنے پائیں۔ چنانچہ ہمارے ہادی
اعظم نے ہمیں ہزاروں باتیں بنانے کے بعد مجمع عام میں ہمیں ”کل ایمان“
کا تعارف بھی کروادیا اور یہ بنا دیا کہ اس سے علیحدہ نہ ہونا ”بے ایمان“
کہلاؤ گے۔ بہر نوع ہادی اعظم نے ہمیں ایمان کا تعارف کروایا اور ہم صاحب ایمان
ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ہماری نسل ہندوستان میں سبھی ہم نے ایمان کو مضبوطی
سے پکڑے رکھا مگر یہاں کے لوگ ہمیں بے دین کہنے لگے۔ آخر ہم نے گھرا

کے پوچھا۔

”خداوند! تو ہی بتا کہ دین کیا شے ہے جو ہمارے دلوں میں نہیں ہے۔“

چنانچہ اللہ نے میں ایک رہبر دے دیا جنہوں نے ہمیں بتا دیا کہ اگر دین پوچھنا چاہتے ہو تو ۷

”دین است حسین“

گویا رسول نے باپ کو ایمان بنا دیا اور خواجہ معین الدین نے بیٹے کو دین بنا دیا۔ لہذا اب اگر کوئی باپ کو چھوڑ دے گا تو بے ایمان کہلائے گا۔ اور اگر کوئی بیٹے کو چھوڑ دے گا تو بے دین کہلائے گا۔ بہر نوع یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اصل گفتگو تو یہی ہے کہ وہ دین جس کا تعارف اللہ نے ہمیں ہادی اعظم کی زبان سے کروایا ہے ”اسلام“ ہے۔

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ

”اللہ کو جو دین سے پسند ہے وہ اسلام ہے“

سامعین!

اگرچہ مجھے اللہ کی پسند میں شک ہے کیونکہ پسند کا تعلق دل و دماغ سے ہے اور جس کے دل و دماغ ہی نہ ہوں وہ پسند کیا کرے گا۔ اور نہ پسند کیا کرے گا۔ یہ تو ہمیں سمجھانے کے لئے کہ دیا جاتا ہے کہ اللہ کو فلاں شے پسند ہے حالانکہ اللہ جانے۔ اللہ کے پاس کون ایسے لوگ ہیں جن کا دل و دماغ ایسی چیزیں پسند کرتا ہے۔ ورنہ اللہ تو براہ راست اپنے دل و دماغ سے کوئی کام لیتا ہی نہیں بہر کیف اللہ نے فرمایا کہ میرا پسندیدہ دین ہے ”اسلام“ ادھر ہم نے اسلام کا دامن مضبوطی سے پکڑا اور جب اسلام کے معنی دیکھے تو پتہ چلا کہ اسلام کا

مطلب ہے "سر جھکا دینا" یا کسی بات کو "مان لینا" گریا مسلم اسے کہتے ہیں جو کسی بات کو مان لے۔ اب اگر کوئی شخص کسی بُت کو مان لے تو وہ بت کا مُسلم کہلائے گا۔ اور اگر کوئی سورج یا چاند وغیرہ کے آگے برتر تسلیم کرے تو وہ انکا مسلم کہلائے گا غرض جو جسے مان لے وہ اس کا مسلم کہلائے گا۔

نوجوانو!

میرے دیکھ رہا ہوں کہ تم مجھے گھور رہے ہو۔ گویا تمہارا مطلب یہ ہے کہ۔

"زیدی صاحب! ہوشے کے باتے کوو۔ منبر پہ بیٹھ کر بے ہوشے" کی باتیں کرنا گویا منبر کے توہینے ہے۔ چونکہ سامعینے میرے تمام تہا جیسے سفید ریشے بوڑھے ہی تو نہ ہیں ہیں کچھ سسجھدار "نوجوان" بھی ہوتے ہیں لہذا ان جوانوں کا بھی خیال رکھا کرو۔ اور سوچ سجدہ کے باتے کیا کرو؟

میں کہتا ہوں "نوجوانو! اگر میرے بے ہوشے کے باتے کروں تو اس میں میرا کیا تصور ہے۔ تم نے خود ہی ایک بڈھے کو منبر پہ بٹھا دیا اور ساتھ یہ بھی توقع رکھتے ہو کہ "ہوشے" کے باتے کروں۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

نوجوان جواب میں کہتے ہیں۔ "زیدی صاحب! بھلا یہ

کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک انسانِ بحیثیت انسان کے ، بحیثیت آدم کا بیٹا ہونے کے جو شکلہ و صورت میں بھی انسان ہو۔ دل و دماغ میں بھی ٹھیک ہو۔ اسکے باوجود کسی پتھر کو خدا مانتا ہو۔ انسان سے اتنی حماقت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

میں کہتا ہوں ، ”نوجوانوں! تمہیں کیا معلوم کہ انسان جہاں چشم فلک کے پلکوں کو چھونا چاہتا ہے وہاں اس میں یہ پستی بھی موجود ہے کہ وہ پتھر کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھا ہے۔

دیکھو نا!

اگر تمہیں میری اس بات کا یقین نہ آئے تو ہمسایہ ملک (بھارت) میں جا کر دیکھ لو جہاں پچاس کروڑ پوجنے والوں کے پاس پھلتے کروڑ خدا ہیں۔ گویا ایک بندے کے حمتہ میں ڈیڑھ خدا آتا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ ہر انسان نے اپنا الگ خدا بنایا ہوا ہے۔ غیر کے خدا کی پوجا کرنا تو ہمیں سمجھتے ہیں۔ اپنے خدا کو روزانہ آشنائی کراتے ہیں۔ اسے پہ بہیٹے چڑھاتے ہیں

مگر خدا صاحب ہے کہ بڑے آرام سے بستے
بنے بیٹھے ہیں کیا مجال جو سردی گرمی کا
ان پہ کوئی اثر ہو جائے۔

بچو!

ہندوستان میں ایک ہندو خاندان آباد ہے
چونکہ "خاندان مغلیہ" کے تمام "نہری" نظام
کا انتظام اس خاندان کے سپرد تھا اس لئے
شاہانِ مغلیہ کے طرف سے اس خاندان
کو "نہرو" کا خطاب دیا گیا۔ ہندوستان کے
خاندانوں میں یہ خاندان اپنی قابلیت
کے بنا پر نہایت قابل ترین خاندان ہے
تقریباً تیس سال سے یہ خاندان ہندوستان
پر حکومت کر رہا ہے ہندوستان کے موجودہ
حکمران (انڈرا) اسی خاندان کے ایک فرد
ہیں لاکھ طعنے دیئے مگر زناخیز وہ کھیل
کھیل رہے ہیں کہ ساٹھ کروڑ عوام پر حکومت
کر رہے ہیں گویا ہندوستان تاریخ میں نہرو
خاندان اکثر اوقات مسند حکومت پر رہا ہے
اس خاندان کے عورتیں بھوں مردوں کے
شانہ نشانہ حکومتے کرتے رہے ہیں بھارت
میں تو اس خاندان کے یہ حالت ہے مگر

غیر محالکے میں یہ پیشینہ ہے کہ جب کبھی ریڈیو پہ تقریر کرے تو دنیا بھر کے انسان اپنے ریڈیو گھول کر ان کے تقریر سننا شروع کر دیتے ہیں اخبار کے رپورٹرز اسے پہ لوٹے لکھتے ہیں۔ چاہے بے عقلی کے بات کہیں لیکن پھر بھی دنیا ان کے تقریر محفوظ کرنے کی فکر میں ہے اور ان کے منہ سے نکلے ہوئے لفظ قوموں کیلئے "افعال زریعہ" بن جاتے ہیں۔ گویا نہرو خاندان اتنا عقلمند خاندان مانا جاتا ہے اور اسمبلیوں میں ان کے عقل کے پرچم لہرائے جاتے ہیں۔ لیکن جب گھر میں شریف لائے ہیں تو پتھر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یا تو عقل کی اتنی بلندی کہ ان کے منہ سے نکلے ہوئے فقرے کو سنہری لفظوں میں آویزاں کیا جا رہا ہے یا پھر عقل کی اتنی پستی کہ انسان ہوتے ہوئے پتھر نامراد کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے ہیں۔

آئرم پوچھتے ہیں "پنڈت جی! اسمبلی میں تو اتنی عقلمندی کی باتیں مگر گھر میں اتنی ناسمجھی کہ پتھر کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے ہو اور اسے خدا سمجھتے ہو۔"

پنڈت جی کہتے ہیں نادانو! ہماری عقل تو ٹھیک ہے مگر تمہاری سمجھ پر پردہ

پڑا ہوا ہے۔ جو خواہ مخواہ ہم پہ اعتراض کر رہے ہو
ہم نے کہا پنڈت جی!

اعتراض ہی کی تو بات ہے۔ تم اتنے قابل ہو کر پتھر نامزد
کو خدا سمجھتے ہو۔ بھلا پتھر بھی پوجنے کے قابل ہوتا
ہے۔“

پنڈت جی کہتے ہیں۔ تمہیں کس مسخرے نے بھکا دیا ہے کہ ہم
پتھر کو پوجتے ہیں؟
ہم نے کہا ”پنڈت جی!

اس میں بھکانے کی کیا بات ہے۔ یہ تو سامنے کی بات
ہے۔ میں خود دیکھ رہا ہوں کہ تم باہوش و حواس
پتھر کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے ہو۔ آخر کیوں؟
پنڈت جی کہتے ہیں۔ دیکھو! سرات میں داخل نہ دیا کرو کون
کہتا ہے کہ ہم اس پتھر کو پوجتے ہیں“

ہم نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا:

پنڈت جی! شرم کرو۔ دن دھاڑے مگر رہے ہو۔
ہاتھ جوڑے سو جھکاٹے پتھر کے سامنے کیا ہو رہا ہے؟

پنڈت جی کہتے ہیں۔ بر خور دار!

میں اس پتھر کو نہیں پوج رہا ہوں۔ بلکہ میں تو اپنے سرکش ایسا
(قادر المطلق) کو پوجتا ہوں۔ پراونت کشور (خالق الملک) کو پوجتا
ہوں۔ پراونت السار (کو پوجتا ہوں)۔ اوم
(وحدہ لاشریک) کو پوجتا ہوں۔ ہم تو انہیں پوج کبے ہیں پھر

کیوں خامخواہ ہم پہ پتھر کا الزام لگایا جا رہا ہے۔
 ہم نے پوچھا، "پنڈت جی! اگر یہ پوچھا نہیں ہے تو پتھر کیا ہے؟
 پنڈت جی کہتے ہیں، "جیسے ہم پڑج رہے تھے وہ ہمارا مالک سے آ
 چونکہ مالک کے سامنے گناہ گار ہو کر جاتے ہوئے کچھ شرم سی
 محسوس ہوتی ہے۔ لہذا ہم نے اس پتھر کو اپنے اور مالک کے درمیان
 وسیلہ بنا کر رکھا ہوا ہے"

ہم نے پوچھا، "پنڈت جی!

دُنیا میں اور بہت سی ایسی چیزیں تھیں جنکو وسیلہ
 بنایا جا سکتا تھا۔ آخرا اس "پتھر" میں کیا خصوصیت
 ہے۔؟"

پنڈت جی کہتے ہیں، "برخوردار!"

تمہاری نظر میں یہ پتھر سی مگر ہمارے نزدیک یہ بے گناہ ہے
 اس لئے اسے وسیلہ بنایا ہے"

سامعین!

پنڈت جی کی یہ بات سن کر میں بھی تامل ہو گیا کہ گناہ گار کو وسیلہ
 بنانے سے تو پتھر کو ہی پوچھنا بہتر ہے۔ کم از کم اس میں کوئی
 عقل و شعور کی بات تو ہے"

بچو! ایک مثال سناتا ہوں۔ اگر پسند آئے
 تو یاد رکھنا۔

ضلع جھنگ کے ایک گاؤں کا ایک دس نمبر می
 بد معاش تنہا نے میں بلوایا گیا۔ جو اپنے ساتھ ایک

سفارشی بھی لے آیا جو اتفاق سے وہ صاحب کسی
فوجداری مقدمے میں مطلوب تھے۔ چنانچہ
جب وہ سفارشی تھانے میں تشریف لائے تو
سفارشی کرنے سے پہلے پولیس نے ان کی پٹائی
شروع کر دی۔ ساتھی نے پوچھا۔

”تھانیدار صاحب! کیوں اس بیچارے کی
پٹائی کر رہے ہو؟“
تھانیدار نے کہا۔

”تمہیں معلوم نہیں کہ یہ حضرت منواتر چالیس
بوس نک ڈاکہ ڈالتے رہے ہیں۔ بھلا ایسے
سفارشی کو تم کیوں سا تھلائے جو پہلے ہی
کئی مقدموں میں مطلوب تھا۔“

بہر نوع سفارشی کا بے عیب ہونا ضروری ہے۔ خواہ پتھرا ہی
کیوں نہ ہو۔

سامعین مگرام!

خدا کا ہم پر بہت بڑا فضل و کرم ہے کہ ہم سب مسلمان ہیں۔ دوسری باتوں کے
علاوہ ہم اپنے خوراک و لباس کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں ہلال کھاتے ہیں اور
حرام سے بچتے ہیں۔ یوں تو مسلمانوں کی اور بہت سی خوراک ہے۔ مگر سب سے
پسندیدہ خوراک گوشت ہے۔ چاہے بکرے کا ہو۔ چاہے گائے کا
ہو۔ چاہے کسی اور بلا کا ہو۔ مگر کھانے گوشت ہی ہیں۔ چنانچہ پاکستان
کے ہر شہر میں روزانہ تقریباً ہزاروں کی تعداد میں بکرے وغیرہ ذبح کئے جاتے

ہیں۔ تاکہ ہماری خوراک کا تقاضہ پورا ہو۔ لہذا ہم روزانہ قصائی کے پاس جاتے ہیں۔ اس کی پسند کی قسم اسے دی جاتی ہے اور اپنی پسند کا گوشت حاصل کیا جاتا ہے (اگرچہ آج کل گوشت بھی قصائی ہی کی پسند کا ملتا ہے)

بہر نوع گوشت خریدنا جاتا ہے اور کبھی بھی قصائی سے یہ نہ پوچھا کہ جس بکرے کا گوشت تو مجھے دے رہا ہے اس کا سینگ ٹھیک تھا یا نہیں۔ کان ٹھیک تھے یا نہیں۔ کہیں اندھا تو نہیں تھا۔ کہیں لنگڑا تو نہیں تھا؟ ہرگز نہیں اگر بکرہ اندھا یا لنگڑا تھا تو ہمیں کیا واسطہ۔ ہمیں تو گوشت سے سروکار ہے۔ گویا ہم

نہیں سوچو سٹھ دن تک تو عیب دار بکرے کھالتے ہیں مگر جب تین سو پینسٹھواں (عیدالضحیٰ) آتا ہے تو بڑا خیال رکھا جاتا ہے کہ کہیں بکرہ عیب دار نہ ہو۔ سینگ ٹوٹا ہوا نہ ہو۔ اندھا نہ ہو۔ لنگڑا نہ ہو گو یا بکرے میں کسی قسم کا کوئی عیب نہ ہو۔ آخر ہم اپنے محلہ کے مولوی صاحب سے پوچھتے ہیں

مولانا! کیا اس سے پہلے سال بھر آپ عیب دار بکرے کا گوشت نہیں کھاتے رہے جو آج اتنی احتیاط برقی جا رہی ہے؟

مولانا فرماتے ہیں۔

» بروخور دار! تین سو چونسٹھ دن میں زبح ہونے والے بکودا کی اور بات ہے اور آج (عیدالضحیٰ) کے دن ذبح ہونے والے بکرے کی اور شان ہے۔

ہم نے پوچھا۔ مولانا! آج کے بکرے میں کیا خصوصیت ہے؟
مولانا فرماتے ہیں۔

برخور دار! چونکہ آج کے دن کا بکرہ ہم گناہگاروں

کا وسیلہ بن کر ذبح ہو گا۔ اس لئے احتیاط اس بات
کی کی جاتی ہے کہ وسیلہ بے عیب ہو
صاحبانِ ذوق!

یہاں تو میں بھی قائل ہو گیا کہ اگر بکرے کو بھی وسیلہ بنا لیا
جائے تو بے عیب ہونا چاہیے۔ کیونکہ جب تک وسیلہ بے عیب
نہیں ہو گا۔ اس وقت تک کسی گناہ گار کی بخشش نہیں ہو سکتی۔

عزیز بچو! اس دفعہ تو میں بھی عیب کشکس میں مبتلا ہو گیا۔ بچیت
مولوی ہونے کے میں بھی سال میں ایک بکرا ذبح کر بیٹھتا ہوں حالانکہ بقول مولوی
صاحب یہ بدعت ہے مگر کیا کروں اس کے بغیر گزارا بھی نہیں ہوتا۔ گذشتہ
سال کی طرح اس سال بھی محلے والوں کی شرم کی وجہ سے مجھے بھی بکرا ذبح کرنا پڑا
حالانکہ بکروں کا عالم یہ تھا کہ جس بکرے کو دیکھتا وہی منہ بنا کر کھڑا ہو جاتا۔ گویا
انہی مہنگائی تھی۔ بالآخر مجبوراً ایک عمدہ سا بکرا خریدنا پڑا جس کے سینک بہترین
کان بہترین۔ خوب موٹا تازہ پلاٹوا پہلے تو اسے پورے محلے میں گھمایا تاکہ پڑوسی بھی
دیکھ لیں کہ مولوی صاحب نے بکرا خرید کیا ہے۔ رات کو گھر سے باہر باندھا۔

چارہ قریب تک نہ آنے دیا کیونکہ بھوکا رہنے سے رات بھر بولے گا تو وہ پڑوسی
جو دن کو نہ دیکھ سکے ہوں رات کو اس کی آواز سن لیں تاکہ میری قربانی کا
ان پر بھی رعب پڑ جائے۔ بہر نوع دن چڑھے قربانی کا وقت آ گیا۔
جب قصائی بکرا ذبح کرنے کے لئے اپنی آستین چڑھانے لگا تو اچانک وہ
حسرت نثر لین لائے جن سے بکرا خرید گیا تھا۔ وہ آتے ہی چلانے لگے۔

”زیدی صاحب! غضب ہو گیا۔ خدا را اس بکرے کو ذبح نہ کیجئے گا،
میں نے پوچھا ”کیوں۔ کیا بات ہے؟“

اس نے کہا۔ زیدی صاحب ! یہ بکر ہے تو بہت ہی عمدہ بظاہر
اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔ گھر کا پلا ہوا ہے۔ مگر جس دن یہ میرے گھر
میں پیدا ہوا تھا اس کی ماں مر گئی تھی لہذا میں نے اپنی کُنیا کا دودھ
پلا کر اسے پروان چڑھا یا ہے؟

سامعین!

بکرے والے کی یہ بات سن کر میرے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا اور
پورا بدن غصہ سے کانپنے لگا اور گہرا کر مسلمانوں کے ہر مکتب
فکر کے مولوی سے جا کر پوچھا مگر ہر ایک نے یہی جواب دیا کہ اس
بکرے کا ذبح کرنا حرام ہے کیونکہ یہ تو بہت ہی عیب دار ہے۔
میں نے عرض کی "مولانا! عیب دار ہو گا مگر اب تو بہترین
عمدہ اور اچھا تندرست ہے"

میری یہ بات سُن کر مذاہبِ اسلام کے تمام مولوی صاحبان کا متفقہ
فیصلہ یہ ہوا کہ ہم آج کے بے عیب ہونے کو کیا کریں اسکی
تو ابتداء ہی بااست میں گزری ہے۔ لہذا جس کی ابتداء
مجاست میں گزری ہو اسے وسیلہ نہیں بنایا جا
سکتا چاہے بکرا ہی کیوں نہ ہو۔

بزرگانِ منے!

میں عرض کر رہا تھا کہ ہر انسان اپنے معبود کا مسلم ہوتا ہے اور ہر بچنے والا
اپنی پوجا کا مسلم ہوتا ہے۔ ہر انسان کی اپنی مرضی ہے کہ وہ جس کو چاہے مان لے۔
چاہے وہ اللہ ہو یا قادر مطلق ہو۔ پیدا کرنے والا ہو یا مارنے
والا ہو۔ حتیٰ کہ سانپ ہو یا بچھو ہو گاٹے ہو یا گنکا ہو۔

غرض انسان اپنی عقل کے مطابق کسی نہ کسی شے کا مسلم ضرور ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انسان جس کو مان رہا ہے وہ بھی اسے مانتا ہے یا نہیں بہر حال ہر انسان کسی نہ کسی کا مسلم ضرور ہوتا ہے۔

کیوں تو جوانوں! میں ٹھیک کو رہا ہوں؟

دیکھو!

تم سے اس لئے پوچھتا ہوں کہ تم میرے پاس بیٹھے ہوئے ہو اور صحابیوں کو اپنی ہر بات کا راوی رکھنا چاہیے۔

یاد رکھو!

پتھر کو پوجنے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انسان کو ٹوکنے والے سے نفرت ہوتی ہے اور نہ ٹوکنے والے سے محبت ہوتی ہے۔ گویا انسان فطری طور پر ٹوکنے والے کو ناپسند کرتا ہے اور نہ ٹوکنے والے کو پسند کرتا ہے لہذا انسان نے سوچا کہ اگر اللہ کو مان لیا جائے تو وہ ہر قدم پر ٹوکتا ہے۔ کہ تم جھوٹ کیوں بولتے ہو۔ کسی کو ستاتے کیوں ہو۔ کسی کا مال کھانے کیوں ہو۔ گویا اللہ رات دن ٹوک ٹوک کر انسان کا نا طقہ بند کر دیتا ہے۔ لہذا انسان نے چاہا کہ ٹوکنے والے اللہ کو چھوڑ دے اور خود ایسے اللہ بنا دے جو ٹوکتے نہ ہوں۔ پونج لو تو واکہ واکہ نہیں کہتے اور توڑ دو تو بڑا نہیں مانتے اور چونکہ انہیں پتہ ہے کہ ہم انسان کے بناٹے ہوئے ہیں۔ لہذا اگر انسان کی مرضی کے خلاف کچھ کہیں گے تو یہ ہمیں توڑ بھی دے گا۔ اس لئے یہ بہت شریفانہ بھلے مانس بنے ہوئے بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر انہیں گھوڑی میں رکھ دو تو خاموش بیٹھے رہیں گے بازار میں لے آؤ تو چپ رہیں گے۔ مسجد میں رکھ دو تو بت بنے بیٹھے رہیں گے اور اگر اللہ کے گھوڑی میں لاکے رکھ دو تو

پھرائی نظروں سے ایک دوسرے کو تکتے فردر میں گے کہ اللہ جانے اسکے
بعد کیا حشر ہو گا مگر منہ سے کچھ نہیں کہیں گے۔ بہر نوع انسان نے ایسے
خاموش اور بے حس و حرکت اللہ بنا لئے۔

بچو!

ایک دن عالم تصور میں میں انسان کے بنائے ہوئے ان خداؤں
سے پوچھ رہا تھا جو اللہ کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”انسان کے بنائے ہوئے خداؤ، بتاؤ۔ کیا تم خدا بن
گئے ہو؟“

توں نے جواب دیا۔ مولانا!

ہم خود ہی تلوڑے آئے ہیں۔ انسان نے ہمیں بٹھا
دیا۔ ہم بیٹھ گئے اور جس دن نکال دے گا، چلے جائیں
گے۔ ہماری ضد تلوڑی ہے۔ یہ تو بنانے والے کی

مرضی پہ منحصر ہے۔ کہ بنا دے یا توڑ دے!

بہر نوع انسان نے اپنی نظری تقاضے کے تحت نہ ٹوکنے والے کو خدا
بنالیا اور ٹوکنے والے سے دور رہنے لگا۔

نو جو انو! یا در کھو!!

جس انسان کی دس بیس نیلیں نہ ٹوکنے والے خدا کی صحبت میں گذر
چکی ہوں تو اس کے رگ و ریشہ میں یہ بات سراٹھ کر جاتی ہے کہ وہ ات
ٹوکنے والے کو پسند کرتا ہے اور ٹوکنے والے کو ناپسند کرتا ہے گویا
بت پرستی کی عادت یہ کھلوا دیتی ہے کہ۔

”ہمیں نہ ٹوکنے والی کافی ہے“

بہترین انسانی فطرت ہے کہ وہ نہ ٹوکنے والی چیز کو پسند کرتا ہے اور
ٹوکنے والی شے سے نفرت کرتا ہے۔

اور یاد رکھو!

آج بھی ایسا ہی ہو رہا ہے کہ انسان ہر ٹوکنے والی شے کو نہیں چاہتا اور
نہ ٹوکنے والی شے کو چاہتا ہے۔ جس طرح ہماری اسمبلی میں چند دن پیشتر
ایک صاحب یہ کہہ رہے تھے کہ ہم جو کتے تھے کہ ہماری حکومت عوام
پر ڈر ہے غریبوں پہ رحم کو نبیوالی ہے۔ مگر ہم نے غریبوں کو بیت
ستیا یا ہوا ہے کہ ٹریفک کا ایک سپاہی جو ہماری طرح کا ایک انسان
ہے۔ ہماری طرح کا گوشت پوست کا بنا ہوا ہے جسے ہماری حکومت
صرف سو ڈیڑھ سو روپیہ دیتی ہے۔ وہ بے چارہ گری سردی
اور برسات میں چوراہے پہ کھڑا ہے۔ اشارے کر کے اس کے ہاتھ
تھک جاتے ہیں۔ کبھی دائیں گھوم رہا ہے۔ کبھی بائیں۔ گھوم رہا ہے اور
تین چار گھنٹے منواتر اسے اس عالم میں کھڑا رہنا پڑتا ہے، سپیکر
پوچھا آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

میر نے عرض کی۔ حضور! میرا مطلب یہ ہے کہ
اس سپاہی کو چوراہے سے ہٹا دیا جائے اور اسکی
جگہ پتھر کی ایک میز رکھ دی جائے اور اس میز پر ٹریفک
کے قوانین کی ایک کتاب رکھ دی جائے تاکہ ہر
گزرنے والا خود ہی کتاب پڑھ لیا کرے۔
میں خواہ مخواہ کیلئے سپاہی بے چارے کو
کھڑا کر دیا جاتا ہے گزرنے والے خود ہی اس

کتاب کو پڑھ لیا کریں گے۔ کیوں کہ صرف کتاب
 ہی تو کافی ہے،
 سامعین!

ممبر کا یہ کہنا تھا کہ "کتاب کافی ہے" کہ ساری اسمبلی اس کے
 پیچھے پڑ گئی کہ یہ حضرت جو سپاہی کو ہٹا کر کتاب لانا چاہتے ہیں، خود
 ان کی نیت کوئی جرم کرنے کی ہے۔ بھلا آج کل کی تیز رفتاری
 کے دور میں چلنے والے کو کہاں فرصت ہے کہ وہ چوراہے پہ ٹھہر کر
 پہلے ٹریفک کی کتاب پڑھ لے، پھر آگے چلے۔ اور اگر کوئی ٹھہر کر
 کتاب پڑھ بھی لے گا تو اس کے "معنی" اپنے مقصد کے مطابق ڈھال
 لے گا۔ چنانچہ جہاں پر سائیکل والا چاہتا ہے سو کہ پہلے میں چلا جاؤں۔
 تانکے والا چاہتا ہو کہ پہلے میں چلا جاؤں اور گاڑی والا چاہتا ہو کہ پہلے
 میں چلا جاؤں گو یا جہاں سے ایک پھلا بنا چاہتا ہو وہاں کتاب
 غریب کو کون پوچھے گا۔

بھروسے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہر ایک اپنے اپنے قیاس کی بنا پر
 مسلم ہوتا ہے اور ہر ایک اپنے اپنے خیال میں اپنا اپنا سنہ اختیار کئے ہوئے
 ہے۔ اس میں کوئی جھگڑے کی بات ہے نہ ہی کوئی لڑائی کی بات ہے منزل
 مقصود تو ایک ہی ہے۔ صرف وہاں تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں۔
 اصطلاحی معنوں میں ان راستوں کو مذہب کہتے ہیں اور منزل مقصود
 کو "دین اسلام" کہتے ہیں

بزرگانِ من!

دین اسلام میں چند باتوں کا اظہار زبان سے کیا جاتا ہے اور

کچھ عمل سے کیا جاتا ہے۔ صرف زبان سے کہے تب بھی اسلام پورا نہیں ہوتا اور صرف بغیر زبان سے کہے، تب بھی اسلام پورا نہیں ہوتا۔ لہذا کچھ کہنا پڑتا ہے اور کچھ کونا پڑتا ہے۔
دیکھو نا!

چاہے تم جتنی ہی ایسی بات کہو۔ مگر یہ اسلام کا انبال ہے۔
 کہ تمہاری اتنی ہی جوڑی گفتگو، "کلمہ" ہی کہلانے کی جسے ہر شخص پڑھ کر مسلمان بنتا ہے۔ اور وہ کلمہ یہ ہے۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ - مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللَّهِ

یہ گویا دین اسلام کا کلمہ ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ کلمہ اتنی روانی سے پڑھا جاتا ہے کہ کہیں بھی کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوتی گویا "نکتہ" تک کی رکاوٹ اس کلمہ میں نہیں ہے۔

یاد رکھو!

کلمہ طیبہ کے چار اجزاء ہیں۔ لا۔ الہ۔ الا۔ اللہ۔ پہلا لفظ کہو "لا" جس کے معنی ہیں "کچھ بھی نہیں" دوسرا جوڑو۔ "لا الہ" جس کے معنی ہیں "اللہ نہیں ہے" گویا

گُفْر ہو گیا۔

تیسرا جوڑو۔ "لا الہ الا" جس کے معنی ہیں "اللہ نہیں ہے مگر" گویا قیام ہو گیا اور چوتھا "اللہ" جوڑو تو ایمان ہو گیا۔ بیچے اب کلمہ مکمل ہو گیا۔ بہر نوع ہمیں کہنا پڑا کہ اللہ وحدہ لا شریک ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ یہ کہہ کر ہم مسلمان بن گئے۔ ہم صاحب ایمان ہو گئے۔ ہمارے دل میں شیعہ ایمانی روشن ہو گئی۔

اور ہم دائرہ اسلام میں آگئے۔

بزرگانِ من!

چودہ سو سال سے ہم تو یہی سمجھتے ہوئے تھے کہ لا الہ الا
انہ محمدٌ رسول اللہ کے کہنے سے ہمارا کلمہ مکمل ہو جاتا ہے
مگر ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں پتہ
چلا کہ یہ کلمہ پڑھنے کے باوجود اگر اپنے ہاتھ سے بنائے ہوؤں
کو مان لیا جائے تو پھر بھی ہم غیر مسلم ہو سکتے ہیں۔ بہر نوع اسلام میں
ایک کلمہ ہے جسے پڑھنے سے ہم مسلمان ہو سکتے ہیں اس کے علاوہ اسلام
میں ایک عمل ہے جسے ادا کرنے کا حق کہا جاتا ہے۔

یاد رکھو!

ادائے حق کے معنی صرف یہی ہیں کہ تم پر اللہ کی طرف سے جو
فرائض و حقوق واجب ہیں ان کا حق ادا کرو۔ مثلاً
اگر ماں باپ ہو تو اولاد کا حق ادا کرو۔ اولاد ہو تو والدین
کا حق ادا کرو۔ بھائی ہو تو بھائی کا حق ادا کرو۔ بہنوں کا
حق ادا کرو۔ ماتحت ہو تو افسوس کا حق ادا کرو۔ اور بندے
ہو تو اللہ کا حق ادا کرو۔ گویا ادا کرنے کا حق کو عمل کہتے ہیں
اللہ کا حق یہ ہے کہ اس کی عبادت کرو۔ اور بندے کا حق یہ ہے کہ
اگر کہیں لڑکر بندے کا حق ادا کرنا پڑتا ہے تو لڑکر کرو۔ اور اگر
کہیں صلح سے حق ادا کرنا پڑتا ہے تو صلح سے کرو۔ گویا کہیں
ادائے حق کے لئے لڑنا پڑتا ہے اور کہیں ادا کرنے کے لئے
صلح کرنی پڑتی ہے۔

بہر لوزخ ہر صورت میں جو تم پر فرض ہے۔ وہ حق ادا کرو۔ گویا کہیں جہاد کو کے حق ادا کیا جا رہا ہے اور کہیں تلوار روک کے حق ادا کیا جا رہا ہے۔ کہیں تلوار چلا کے حق ادا کیا جا رہا ہے۔ اور کہیں تلوار کھانے کے حق ادا کیا جا رہا ہے۔ لہذا انسان پر لازم ہے کہ جس طرح بھی حق ادا ہوتا ہو، ادا کرے۔ بس اسی ادائے حق کو عمل کہتے ہیں۔

سامعین!

مذہب کی بات ہے نہ عقیدت کی بات ہے بلکہ ایک غیر جانبدار تاریخی مطالعہ کی بات ہے کہ کائنات میں اسلامی حق ادا کرنے کے لئے نہیں دو مکاتب فکر ملیں گے اور وہ ہیں علیؑ اور حسینؑ۔ لہذا علیؑ کی تعلیم کو ضرب کہتے ہیں اور حسینؑ کی تعلیم کو سجدہ کہتے ہیں۔ بس یہی دو مکتب فکر ہیں جن سے اسلام میں ادائے حق کی تعلیم ملتی ہے۔ گویا کہیں سربہ ضرب لگا کے حق ادا کیا جا رہا ہے اور کہیں سربہ ضرب کھانے کے حق ادا کیا جا رہا ہے۔ ان کے علاوہ کسی تیسرے مکتب سے ایسی تعلیم کا ملنا ناممکن ہے۔

زوجوانو! یاد رکھو!!

یا علیؑ کہنا ہمارا ایمان ہے۔ ہمارا دین ہے۔ ہماری پہچان ہے۔ ہماری علامت ہے۔ جو ہمیں زبردستی فیروں کے ساتھ وابستہ کرنا چاہی وہ تو کہتے ہیں کہ یا علیؑ مدد کہنا ضروری نہیں ہے۔ حالانکہ یا علیؑ مدد کہنا تو ہماری دوسروں سے امتیازی نشان ہے۔ مگر یا علیؑ کہتے کہتے بھی سوزج دیا کرز

کہ علیؑ نے اداے حق میں کیا کیا۔ کھا تلوار چلا کے حق ادا کیا اور کھا
 تلوار کھا کے حق ادا کیا۔ کہیں تو علیؑ کی تلوار نجیب کی چولہیں
 ہلا رہی ہے اور کہیں خندق کو فتح کر رہی ہے۔ کہیں
 علیؑ کی تلوار اُحد و بدر میں معرکے دکھا رہی ہے اور
 کہیں علیؑ کی تلوار پیام میں رکھی ہوئی ہے۔ اور اسی تلوار
 کا مانک خاموشی سے سر جھکائے گردن بند ہوائے چلا آ
 رہا ہے۔ گویا نجیب کے دروازے کو گرانے والا خود اپنے
 دروازے کو خاموشی سے گوتا ہوا دیکھ رہا ہے۔ یہ ہے
 علیؑ کی وہ ادا جس پہ کائنات مرتقی ہے۔ دوسروں کے
 بچوں اور عورتوں پہ رحم کرنے والا جب اپنی عورتوں
 اور بچوں کو رخصی دیکھتا ہے تو خاموش کھڑا رہتا ہے۔

یاد رکھو!

علیؑ کے علاوہ کسی اور سے ان اخلاقی صابطوں کا ملنا ناممکن
 ہے۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ علیؑ نے کتنی جدوجہد کے بعد نجیب جیسے
 عظیم قلعہ کا دروازہ توڑ کر اسے فتح کیا ہے۔ حالانکہ علیؑ کو پتہ ہے
 کہ نجیب کے اندر جس کا میں فاتح ہوں، کروڑوں عربوں روپے کی دولت
 موجود ہے۔ مگر وہ غیور فاتح نجیب فتح کرنے کے بعد قلعہ کے اندر نہیں
 جاتا بلکہ خاموش سر جھکائے نجیب کے دروازے پہ کھڑا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں
 کی فوج اندر گئی۔ لوٹ چلائی اور جی بھر کے مال غنیمت لوٹا۔ چند بزرگوں
 نے پوچھا۔

”یا علیؑ! تم اندر کیوں نہیں جاتے حالانکہ تم نے

ہی خبیروں کو فتح کیا ہے؟

علیٰ فرماتے ہیں۔

بھئی! اس خیال سے اندر نہیں گیا کہ قلعہ کے اندر
خیبر والوں کی عورتیں تھیں لہذا مجھے ایسے
گھر میں جاتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے جہاں
کسی کا ناموس ہو۔

بزرگانِ من!

اخلاقی تعلیم کی یہ انتہا ہے کہ خبیروں کا فاتح خبیروں کے اندر جاتے ہوئے
اچکچا رہا ہے کہ کہیں ان کا کوئی ناموس نہ ہو۔

بناؤ!

خیبر کا دروازہ کھڑ لینے سے زیادہ یہ ادا شاد ہے یا نہیں کہ خبیروں کا فاتح
سر جھکائے دروازے پہ کھڑا ہے اور دوسرے مسلمان ہاں غنیمت لوٹ رہے
ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں، "یا علیٰ! جانے سے ڈرتے ہو؟"

علیٰ مسکرا کر فرماتے ہیں، "دیکھو! جان کی مجھے کوئی فکر

نہیں ہے۔ کیونکہ جان تو اللہ کی دی ہوئی ہے۔ جب چاہے

گالے لگا۔ مگر آنا پہ حرج نہیں آنے دینا تاکہ کوئی یہ نہ کہے

کہ محمد کا بھائی، محمد کی زبان چوس کر پلنے والا

محمد کے سینے پہ کھیلنے والا دوسرے کے زنانے

گھر میں چلا گیا"

حضورِ والا!

علیٰ کی یہ اخلاقی ضرب ہے جو اس نے خیبر میں لگائی تھی اور علیٰ

کی شجاعت کی یہ ادا اس کے بچوں کو ورثہ میں مل گئی مگر بچوں نے
بھی آن پر جان قربان کر دی۔

بتاؤ!

آن پر جان دینے کی اس سے عمدہ مثال کاٹنات میں کہاں مل سکتی ہے
کہ ماتے نے اپنے بیٹیوں کا بازو پکڑا ہوا ہے۔ دروازے پہ کھڑی ہے
اور سامنے دشمن کی فوجوں کا ٹھاٹھیں مارتا شکر ہے اور ماں اپنے بچوں سے
کہہ رہی ہے۔

”بچو! میدانِ جہاد میں جاؤ۔ شہادت مبارک
ہو مگر یاد رکھو! دشمن کی فوجوں کا جھوٹ
دیکھ کر ڈگمگانہ جانا بلکہ ثابت نڈر رہنا۔ تم
اپنی زبان سے کچھ نہ کہنا۔ میں تو جب دُور
بخشوں گی جب فوجیں چلا اٹھیں گے تم علی کے
نواسے ہو۔ جعفر طیار کے پوتے ہو۔“

یہ سن کر بچوں نے ماں کے قدم چوم کر قسم کھائی
”امام! ہم وعدہ کرتے ہیں کہ انشاء اللہ
ہم ثابت کر دیں گے کہ ہم نے زینب کا دُورہ
پیا ہے“

تاریخ عالم نے یہ منتظر دیکھا کہ تھوڑی دیر بعد پچاس ہزار فوج
ان دُورہ معصوم بچوں کو گرا کر خوشیاں منا رہی ہے۔ گو یا انسانی بے حیائی
کی یہ حد ہے کہ تین دن کے بھوکے پیاسے بچوں کو گھوڑے سے
گرا کر پچاس ہزار فوج خوشیوں کے بلے بجار رہی ہے۔ باجوں

کی آواز سن کر خیموں میں کھڑی مستورات سمجھ گئیں کہ زینبؓ کے بچے گم گئے۔
بے ساختہ مستورات کے منہ سے نکلا۔

”ہائے! زینب کے بچے گم گئے“

زینبؓ فرماتی ہیں: ”بیسیو! ہائے نہ کہو۔ خدا را
کسی کی آنکھ سے آنسو نہ نکلنے پائے۔ دیکھتی نہیں
ہو کہ باجوں کے ساتھ میرے بچوں کی بارات
آ رہی ہے“

تھوڑی دیر بعد بچوں کے لاشے بیت الشرف میں لائے
گئے۔ زینبؓ دروازے میں کھڑی لاشوں کو تلکتی رہی۔ آخر
امام نے فرمایا۔

زینبؓ: ”دیکھو۔ تمہارے بیٹوں کے لاشے ہیں
ذرا ان کے پاس آ جاؤ۔ یہ تم سے کچھ کہنا چاہتے
ہیں“

زینبؓ آگے بڑھی۔ بچوں کے قریب آئی۔ آخر ماں تھی، دل بھرا آیا بڑا
بچہ تو ختم ہو چکا تھا۔ چھوٹے میں ذرا دم تھا۔ ماں نے بیٹے کے منہ کے قریب
کان لگا دیئے۔ کانپتے ہونٹوں سے ایڑیاں رگڑتے ہوئے بچہ یہ کہہ رہا تھا
”اماں! اب تو مطمئن ہونا۔ ہم نے آپ کے دودھ
کی آبرور کھ لی“

زینبؓ جواب میں فرماتی ہیں۔

”بیٹو! مجھے گان نہیں تھا کہ تم اتنے باعزت ہو۔
میرے لعل! اگر جھڑکا ہوتا مجھے معاف کر دینا“

عزاء دارسید الشہداء !

یہ تو زینبؑ کی قربانی ہے جو علیؑ کی بیٹی ہے۔ جس نے فاطمہؑ کا دودھ پیا ہے۔ مگر غیر خاندان کو دیکھو جو سیدانی نہیں ہے بلکہ اُمتی ہے جس کا جوان بیٹا ہے۔ اب ذرا اٹھا رلا سالہ بیٹے کی ماں کے دل سے پوچھو کہ اس کے جذبات کیا ہوتے ہیں۔ جوان بیٹے کی لاش خیمے میں آئی ہوئی ہے۔ تمام سیدائیاں اکبرؑ کے لاشے پہ کھڑی رو رہی ہیں مگر بیٹے اپنے خیمے میں ہے۔

اکبرؑ پوچھا۔

”بابا جان ! میرا آخری وقت ہے میں اپنی

ماں سے ملنا چاہتا ہوں“

اکبرؑ کی یہ بات سنکر زینبؑ خیمے میں آئی دیکھا کہ لیلیٰؑ کبھی دہنی قنات کے ساتھ سہارا لیتی ہے اور کبھی بائیں قنات کے ساتھ اسی سالم گھبراہٹ میں خیمے میں پھر رہی ہے۔ بھاوجہ کی یہ کیفیت دیکھ کر زینبؑ فرماتی ہیں۔

”لیلیٰ ! ادھر آؤ۔ اکبرؑ یاد کو رہا ہے“

لیلیٰؑ جواب میں فرماتی ہیں : ”فاطمہؑ کی بیٹی !

میری بینائی ختم ہو چکی ہے اور مجھے خیمے کا

پردہ نظر نہیں آتا“

زینبؑ نے لیلیٰؑ کا ہاتھ پکڑا۔ اکبرؑ کے لاش پہ لائی۔ لیلیٰ نے اکبرؑ کے سینے پہ ہاتھ رکھا خون میں تر ہو گیا اور لیلیٰ نے وہی خون آلود ہاتھ اپنے سر کے سفید بالوں پہ مل لیا اور فرمایا۔

”اکبرؑ بیٹا ! یہ خون آلود بال تیری دادی کے

سا منے لے جاؤں گی۔ میرے لعل! یہ میرا تحفہ
 ہے جو میں ناطقہ کی خدمت میں پیش کر دگی
 سامعین کرام! یاد رکھو!

جادۂ عقل و علم کے مطابق ضابطۂ اخلاق
 کی معراج بھی ہے کہ کہیں ضرب لگا کر حق ادا
 کیا جائے اور کہیں ضرب کھا کر حق ادا کیا
 جائے۔ کہیں خاموش رہ کر حق ادا کیا جائے
 اور کہیں نیزہ پہ سوار قرآن پڑھ کر حق ادا کیا جائے
 کہیں جوان بیٹے کے پیسے ہوئے کلیجے سے نیزہ کھینچتے
 ہوئے مسکرا کر حق ادا کیا جائے کہیں بڈھے ہاتوں
 پہ ششمائے کالا شہ اٹھا کر حق ادا کیا جائے۔

غرض ہر موقع و محل کے مطابق ادائے حق کو
 ضابطۂ اخلاق کی معراج میں عمل کہتے ہیں
 جس کی تعلیم صرف علیٰ وحسین کے مکاتب
 فکر سے ہمیں مل سکتی ہے۔ چاہے وہ
 ضرب بد اللہی ہو یا سجدۂ شہیہ ہو

بزرگو!

سانحہ کو بلا کو گذرے آج گیارہ دن ہو چکے
 ہیں۔ اللہ جانے اہلبیت رسول آج کس عالم
 میں ہوں گے۔ آج کس بازار سے گذر رہے
 ہوں گے۔ آج کس کچھری میں کھڑے ہونگے

خدا معلوم! بے کس و مجبور قیدیوں کی گردنوں
سے بندھے ہوئے ہاتھ بلی کسی نے کھولیں ہیں
یا نہیں۔

خدا جانے! محمد کی بیٹیاں آج کس بازار ہیں
پھرائی جا رہی ہوں گی۔ اللہ جانے! علی کی بیٹیوں
پہ آج کیا گذر رہی ہو گی۔

خداوند عالم بصدقہ محمد و آل محمد ہماری مجلسوں
کو قبول و منظور فرمائے اور عزاداری سید الشہداء کی ^{ظلت} عفت
فرمائے اور اس عزاداری کو عزت و احترام کے ساتھ باقی رکھے۔

دُنیا وَاٰلِوَا

ہم تم سے منسنے کا حق نہیں مانگتے بلکہ ہم صرف
رونے کا حق چاہتے ہیں۔ دُنیا کی تمام خوشیاں
تمہیں نصیب ہوں، مگر ہمارا رونا ہمیں دے دو
خدا را! ہمارے آنسوؤں پہ پابندی نہ لگاؤ

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ



اَنَا نَاصِرٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ

خداوند عز و جل جلالہ کی حمد و ثناء کے بعد حضرت محمدؐ آل محمدؐ پر درود و سلام

حضراتے گواہی قدر!

اللہ نے اپنے رسولؐ کو جب اعلان رسالت کا حکم دیا تو فرمایا کہ عوام کو منہ نہ لگاؤ اور نہ ہی پہلک سے ابھی گفتگو کرو۔ بلکہ سب سے پہلے اپنے "اقربین" سے بات کرو۔ گویا رسولؐ کے گرد پہلا اجتماع جو ہوا وہ "اقربین" تھے۔

سامعین کو ام!

علم تاریخ کے عام مفروضوں، مبصروں اور محققین سے آج میں یہ پوچھنا ہوں کہ بناؤ اس آیت کی تعبیل میں رسولؐ نے جو "اقربین" اکٹھے کئے تھے ان کی فہرست کیا ہے۔؟ چنانچہ مورخین نے ہم تک جو فہرست پہنچائی ہے ان میں صرف اولاد عبدالمطلب کے مرد اور خواتین جمع تھے۔ ان کے علاوہ نہ ہی خدیجہ الکبریٰ ہیں اور نہ ہی ان کا کوئی عزیز یا اس دعوت میں موجود تھا۔ گویا خدیجہ الکبریٰ کا نہ ہونا اور اولاد عبدالمطلب کا ہونا ہی یہ واضح کر گیا کہ رسولؐ کے اقرب کون ہیں۔ خدیجہ جتنی ہی محترم بیوی تھی مگر اقربین میں سے نہیں ہیں۔

یاد رکھو!

اب اگر ہم "اقربین" کی سوڈت فرض کریں گے تو بیوی کے رشتے کو

سامنے نہیں لانا ہو گا۔ گویا آج ہی سمجھ لو کہ اقربین کون ہیں۔

بہر نوع ! اتر بہن جمع تھے جن میں خواتین بھی تھیں اور مرد بھی تھے مڑوں میں حضرت ابو لہب بھی تھے، حضرت ابو جہل بھی تھے، حضرت عتیبہ بھی تھے، حضرت شعبہ بھی تھے۔ آخر اتر ب تھے۔ یہ اور بات ہے کہ "ع" سے "عقرب" تھے مگر سب اتر ب تھے۔ ادھر نقات کے پیچھے خواتین بھی بیٹھی تھیں جن میں حضرت صفیہ بنت عبد اللہ، فاطمہ بنت اسد۔ امّ ہانی بنت ابی طالب اور چھو مینے کی سچی ناطمہ بنت محمد بھی تھیں۔

خدا گواہ ہے۔

میں نے خوب غور سے دیکھا۔ ایک ایک لفظ کو طوطی طوطی کے پڑھا۔ عینیں لگا لگا کے دیکھا مگر یہی دیکھا کہ اتر بہن کی اس دعوت میں محمد کی چھ ہینے والی بیٹی تو ہے مگر اس کی بڑی بہنوں کا نام کہیں نہیں ملا۔ گویا آج نہیں ہیں تو آئندہ بھی نہیں ہیں۔ بہر نوع ان اتر بہن سے رسول نے خطاب کیا۔

"اے میرے اتر بہن! تم میں سے کون میرا ساتھ دینا چاہتا ہے۔ دیکھو! میں غیر کا احسان نہیں اٹھانا چاہتا اس لئے اپنوں سے گفتگو کر رہا ہوں"

صاحبانے ذوق سے!

جب رسول نے یہ فرمایا کہ کون ہے جو میرا ساتھ دے گا تو بڑے بڑے بزرگ خاموش ہو گئے اور ایک کونے سے دس گیارہ سال کا بچہ اڑھیدوں پر کھڑا ہو گیا اور بلند آواز میں کہنے لگا۔

"أَنَا صِرُّ يَا رَسُولَ اللَّهِ"

"اے اللہ کے رسول! میں آپ کا ساتھ دوں گا"

بیاد رکھو!

اگر بچہ اس وقت یہ کہہ دیتا، "اے محمد! میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ تو یہ ساتھ صرف محمدؐ کی زندگی تک کا تھا۔ مگر بچے نے یا رسول اللہؐ کو اس بات کا عہد کر لیا کہ جب تک تیری رسالت ہے اس وقت تک میری نصرت میرے ساتھ ہے!"

بہر نزع! بچے نے ساتھ دینے کا وعدہ کیا تو رسولؐ نے بڑھ کر سینے سے لگا لیا۔ پیار کیا اور فرمایا "بیٹا! تو نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ لہذا

أَنْتَ وَصِيٌّ "تو میرا وصی ہے"

أَنْتَ وَزِيرٌ "تو میرا وزیر ہے۔ اور

أَنْتَ خَلِيفَةٌ مِنْ بَعْدِي "میرے بعد میرے مشن کا انچارج

بھی تو ہی ہے"

رسولؐ نے یہ وعدہ فرمایا اور بچہ مشن کے خاموش ہو گیا۔ گویا معائدہ ہو گیا اور

اس معائدہ کے دو فریق ہیں۔ ایک طرف گیا "۱۰ سالہ بچہ ہے اور ایک طرف

تنتالیس سالہ رسولؐ ہے۔

سامعینے!

اب بناؤ۔ معائدہ سے پھر جانے کا احتمال کس طرف سے ہے؟

ممکن ہے کہ بچہ اپنی بات کو بھول جائے۔ اور اگر بچہ اپنے کئے ہوئے وعدہ

کو ہمیشہ نبھاتا رہے تو رسولؐ کی طرف سے تو (معاذ اللہ) وعدہ خلافی ہو ہی نہیں سکتی

اب اگر رسولؐ اپنے وعدہ کے خلاف اسے جان شین بنائے بغیر چلا جائے تو ہم

تو ادب سے کچھ نہیں کہیں گے مگر اللہؐ خاموش نہیں رہے گا بلکہ صاف طور پر

کہہ دے گا۔

محمد! تم نے اس دن وعدہ کیا تھا لہذا
اگر جانشین بنائے بغیر چلے گئے تو ہم یہی سمجھیں
گے کہ تم نے رسالت کا کوئی کام ہی نہیں کیا
صاحبانِ ذوق!

بتاؤ! آج اس بچے کو جانشین بنائے بغیر چلے جانے سے رسول
کی پوری رسالت خطرے میں ہے یا نہیں؟
بہر کیف بچے نے نصرت کا وعدہ کر لیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وقت آنے
پر وہ بچہ اپنے اس وعدہ پر کس طرح قائم رہتا ہے۔

دیکھو نا!

جب اس بچے نے نصرت کا وعدہ کیا تھا۔ اس وقت گیارہ سال کا سن
تھا۔ پیروں پر گرد پڑی ہوئی تھی۔ جیب میں خوہے کی گٹھلیاں پڑی ہوئی
تھیں۔ آنکھوں میں آشوب تھا۔ کرتے کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ گویا بالکل
بچپن کی اداسی۔ ادھر رسول محفل برخواست کر کے چلے ادھر یہ بچہ رسول
کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ جب رسول مکے کے بازار سے گزرے تو کسی بازاری
نے رسول کی طرف انگلی اٹھا کے کہا، یہ ہے وہ رسول جو ہمارے خداؤں
کو بُرا کہتا ہے۔

بسے بہا بیو!

تاریخ عالم گواہ ہے کہ ادھر اس آدمی نے یہ فقرہ کہا کہ یہی وہ رسول جو
ہمارے خداؤں کو بُرا کہتا ہے، کہ ادھر سے اس بچے نے جیب سے ایک
گٹھلی نکالی اور تاک کے اسے مار دی۔ سینے پر لگی تو کڑکڑ کر باہر نکل گئی۔ اب

لوگوں نے توبہ کر لی۔ کان پکڑ لیے کہ اگر یہ بچہ محمد کے ساتھ ہوا تو ہم محمد کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

سامعینے!

ایک دفعہ میں نے یہ بات مجلس میں کہدی تو معترض کہنے لگا۔
 ”ذیدی صاحب! یہ تو حُسنِ اعتقاد ہے ورنہ
 بچے کے پھینکی ہوئی گٹھلی سے کمر ٹوٹ سکتی ہے!
 میں کہتا ہوں۔ اب تمہیں کون سمجھائے کہ اگر ابابیلے کے بچے کی پھینکی
 ہوئی مسور کے دانے کے برابر والی کنکر سے پورا ہاتھی ٹوٹ سکتا ہے
 تو بچے کے ہاتھ سے پھینکی ہوئی گٹھلی سے آدمی کا سینہ کیوں نہیں ٹوٹ
 سکتا؟“

اب معترض کہتا ہے ”ذیدی صاحب! چھوڑو۔ وہ ادر
 بات تھی“

میں نے پوچھا ”کیا بات تھی؟“
 کہنے لگا ”ذیدی صاحب! وہ تو بیت اللہ کی حفاظت
 تھی“

میں کہتا ہوں ”بھئی! اگر وہ بیت اللہ کے حفاظت تھی تو یہ رسول اللہ
 کی حفاظت تو وہاں بھی اللہ تھا۔ یہاں بھی اللہ ہے جو اس کی
 دلیل ہے وہی اس کی دلیل ہے۔“

حضور وُالا!

بچہ رسول کے ساتھ رہا۔ ابھی موقع نہیں کہ یہ دیکھا جائے کہ یہ بچہ کہاں
 تک ساتھ دے گا۔ بہر نوع اسی طرح چند سال اور گزر گئے۔ ایک دن ایسا

آیا کہ رسول کو مکہ چھوڑنا پڑا۔ گویا مکہ میں رہنا ناممکن ہو گیا۔ لہذا مکہ چھوڑ کر جانا پڑا۔ اور جانا بھی رات کے وقت ہے تاکہ کوئی دیکھنے نہ پائے چنانچہ ماہ صفر کی آخری رات ہے صبح کو رجب الاول کا چاند نکلنے والا ہے اور رسول ہجرت کی تیاری فرما رہے ہیں۔

بتاؤ! صفر کی آخری رات کتنی اندھیری ہے۔ آج اس اندھیری رات میں جانا ہے کیونکہ کوئی دیکھنے نہ پائے۔ اِدھر دشمنوں نے گھر گھرا ہوا ہے اور جانا بھی ضروری ہے۔

سَامِعِیْنَ !

ہماری اماں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب میں دن کے وقت اپنے گھر میں اپنی سوئی کھودیا کرتی تھی اور سورج کی روشنی میں وہ سوئی نہیں مل سکتی تھی مگر رات کو جب رسول گھر تشریف لانے تھے اور ابھی صحن میں ہی ہونے تھے تو مجھ سے عین اتنی روشنی ہوتی تھی کہ دن کی کھوئی ہوئی سوئی رسول کے چہرے کے نور کی روشنی میں مجھے نظر آجایا کرتی تھی۔

اب بتاؤ! (معاذ اللہ) ام المومنین کی کئی ہوئی بات غلط ہو سکتی ہے؛ ہرگز نہیں۔ گویا جس رسول کا چہرہ سورج کی شعاعوں سے بھی زیادہ روشن ہو تو ایسے روشن چہرے والا آدمی جس گھر میں سوئے گا تو وہ پورا گھر رات کے وقت دن کی طرح روشن ہو گا یا نہیں؛ اور رجب گھر سے باہر چلا جائے گا؛ تو گھر میں اندھیرہ ہو جائے گا۔ اور جو لوگ گھر گھیرے کھڑے تھے وہ اندھا دیکھنے ہی سمجھ جائیں گے کہ رسول گھر سے باہر چلے گئے ہیں۔

لہذا اب رسول کو اس بات کی ضرورت ہے کہ جانے سے پہلے ایسا انتظام کرے کہ اس کے بعد روشنی میں کمی نہ آنے پائے۔ گویا گھر اسی طرح

روشن رہے جس طرح رسول کی موجودگی میں روشن رہتا تھا۔

بہر نوع رسول نے ایسا انتظام فرما دیا کہ اس کے بعد بھی گھر روشن رہا۔ اب میں اس تفصیل میں کہاں پڑوں کہ کس طرح انتظام فرمایا۔ بہر نوع رسول نے جو مناسب سمجھا کر دیا۔ لیجئے اس روشنی کا دوسرا پہلو ملاحظہ فرمائیے

دیکھو نا !

میں اپنے گھر سے چھوٹ کر باہر جانا چاہتا ہوں تاکہ کوئی مجھے دیکھنے نہ پائے اور ہاتھ میں جلتا ہوا ایک گیس پکڑ لوں تو بناؤ وہ گیس کی روشنی مجھے بچھپنے دے گی ؟ ہرگز نہیں۔ میں چاہے جتنا ہی چھپ کر جاؤں مگر وہ روشنی بتا دے گی کہ میں جا رہا ہوں۔

حضور والا !

سمجھ نہیں آتا کہ رسول نے اپنے گھر میں روشنی کا انتظام تو کر لیا ہوگا مگر خود جس گلی سے گزرے گا تو رسول کے چہرے کی روشنی ہی بنائے گی کہ وہ جا رہا ہے۔ لہذا رسول کو ایسا انتظام بھی کرنا چاہیے کہ چہرے کے نور کی روشنی چھپی چلی جائے۔ بہر نوع رسول نے جہاں اپنے گھر میں روشنی کا انتظام فرمایا وہاں اپنے ساتھ ساتھ اندھیرے کا انتظام بھی کر لیا ہوگا۔ تاکہ نور کسی کو نظر نہ آئے اور ظلمات کے سائے میں چھپا رہے

بہر نوع رات کا وقت ہے رسول نے گھر سے جانا ہے اور دشمنوں نے گھر گھر رکھا ہے مگر جانا بھی ضرور ہے۔

بچو ! اب تم ہنسو گے مگر میں کہہ رہا ہوں جو میں نے کہنا ہے۔

دیکھو نا !

میں لاہور سے کوچی پہنچا اور آپ کے گھر میں
ٹھہر گیا۔ آپ نے میرے لئے بہترین کھانا پکوا
بہترین بستری چھوایا۔ کھانا کھا کر سونے کیلئے
رات کو بستر پہ لیٹ گیا۔ آدھی رات کے قریب
گھر کا مالک گھبرا یا ہوا میرے پاس آیا اور کہنے
لگا۔ "زیدی صاحب! غضب ہو گیا۔ دشمنوں
نے میرا گھر گھیر رکھا ہے،"

میں نے پوچھا "بھئی۔ خیریت تو ہے۔ بڑے پریشا
ہو" وہ بولا "زیدی صاحب! خیریت بالکل نہیں
دشمنوں نے مساجح ہو کر میرا گھر گھیر رکھا ہے
لہذا خطرہ ہے۔"

ابے بناؤ!

جب گھر کا مالک اتنا خطرہ محسوس کر رہا ہو تو مجھ جہان پر کیا گذری
ہوگی؟ یقیناً میں اس سے زیادہ ڈر جاؤں گا۔ لہذا میں بھی اٹھ کے
بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"اگر اتنا خطرہ ہے تو میں کیا کروں؟"

وہ بولا۔ "زیدی صاحب! خطرہ بہت زیادہ ہے، دشمنوں نے
گھر گھیر رکھا ہے"

میں نے پوچھا "پھر میں کیا کروں؟"

وہ بولا "میں جا رہا ہوں۔ کیونکہ خطرہ ہے"

میں نے گھبرا کے پوچھا، ”ہیں؟“
 وہ بولا، ”تم یہیں رہو۔ کیونکہ خطرہ ہے“
 سامعین!

بتاؤ۔ اگر میں انکار کر دوں کہ ”ہیں تو اس خطرے
 میں نہیں رہنا چاہتا“ تو میرا یہ کہنا اخلاقاً تا کوئی
 بُرا ہوگا؟ ہرگز نہیں۔

بس بھائیو!

اب ساری کاٹینات کی نظریں علیؑ پہ لگی ہوئی ہیں کہ جواب میں کیا
 کہتا ہے۔ کیونکہ گھر کے مالک، جس کا چار آدمی لحاظ کرتے ہیں، وہ تو
 گھر چھوڑ کر جا رہا ہے کیونکہ خطرہ ہے اور دوسرے کو یہ کہتا ہے کہ تم
 یہیں رہو۔ کیونکہ خطرہ ہے۔

گو کیا جو جا رہا ہے۔ اس کی عمر تریپن سال کی ہے اور جسے گھر چھوڑ
 رہا ہے اس کی عمر انیس سال کی ہے۔ جس کے جینے کے دن ہیں۔ زندہ رہنے
 کا زمانہ ہے۔ اُسے کہا یہ جا رہا ہے۔

”برخوردار! تم یہیں رہو کیونکہ خطرہ ہے“

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ بچہ جواب میں کہتا کیا ہے؟

مگر کاٹینات نے دیکھا اور چشم فلک نے ستاروں کی عینک لگا کر دیکھا
 کہ وہ بچہ جو نصرتے کا وعدہ کر چکا ہے۔ رسول کے کہنے پر کہ ”تم یہیں رہو
 کیونکہ خطرہ ہے“ یہ شکر۔ مسکرا کر جواب دیتا ہے۔

”محمد! گھبراؤ نہیں۔ میں یہاں ہوں۔ تم جا

سکتے ہو“

بس صاحبانے!

بچے کا یہ کہنا تھا کہ کائنات سے "واہ واہ" کی آوازیں آنے لگیں
اور چشم فلک نے ستاروں کی عینک لگا کر یہ منظر دیکھا۔ دنیا بھر نے
سبحان اللہ کہا بہ نوح بچہ یہ کہہ کر لپٹنے لگا کہ رسول نے فرمایا۔

"بیٹا! ابھی ٹھہرو۔ دیکھو نا! تمہارے بستر پہ

کوئی خطرہ نہیں۔ اصل خطرہ تو ہمارے بستر پہ ہے لہذا ہمارے

بستر پہ لیٹ جاؤ"

چنانچہ وہ بچے رسول کے بستر پہ لیٹ گیا اور فرمایا۔

"قبلہ! میں لیٹ گیا ہوں۔ اب آپ جا سکتے

ہیں۔"

رسول نے فرمایا "تمہیں۔ صرف لیٹنا ہی ضروری نہیں

ہے۔ کیونکہ تم "تتم" ہو کے لیٹے تو پھر کوئی

خطرہ نہیں لہذا تم ہمارے بستر پہ "ہم"

بن کر لیٹو کیونکہ خطرہ ہے"

اور دیکھو!

تم سے اچھی طرح سے "ہم" نہیں بنا جائیگا

لہذا ہم خود تمہیں "ہم" بناتے ہیں،

یہ کہہ کر رسول نے بچے کو پیش کرنا اپنا عمامہ اس کے سر پہ رکھ دیا

اور اپنی چادر اوپر اوڑھادی اور غور سے دیکھا اور فرمایا۔

"کیوں بیٹا! بن گئے ہم"

بچے نے عرض کی "قبلہ! ہاں۔ بن گئے ہم"

دھرم نے عرض کی: "یا رسول اللہ! یہ کیا بنا رہے ہو؟
 رسول نے فرمایا "میں اسے ہم" بنا رہا ہوں"
 ہم نے عرض کی "قبلہ! کیا یہ ہم بن گیا؟"
 رسول نے فرمایا "نہیں۔ میں نے اسے "ہم" کی شبیہ بنایا ہے"
 گویا یہ بچہ محمد نہیں بنا بلکہ محمد کی شبیہ بنا ہے"
 ہم نے عرض کی "قبلہ! شبیہ کس طرح بنائی؟"
 رسول نے فرمایا "عمامہ رکھ کے، چادر ڈال کے شبیہ بنائی"
 گویا عمامہ رکھ کے، چادر ڈال کے شبیہ بنا ناسنت
 رسول ہے۔

سَامَعِینَ !

یہ کہہ کر رسول چلے گئے اور سونے والا بستر رسول پر سو گیا۔ اور بستر کی
 سلوٹ گواہ ہے کہ صبح تک سونے والے نے کروٹ ہی نہ بدلی اور ادھر کبھی نہ
 سونے والے نے سونے والے کو دیکھا۔ سونا پر کھا بالکل کھرا سونا
 بڑا اجواب سونا۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت نے کہا۔

"محمد! سنتے بھی ہو۔ ایسا سونا روز روز نہیں ملتا لہذا آج اسے ہمنا
 خرید لیں"

رسول نے عرض کی "خدا وندا! اگر تو خریدنا چاہتا

تو خرید لے"

اعلیٰ حضرت نے کہا "محمد! سونے والے سے ہماری

بات کو وادو"

چنانچہ محمد نے وہیں سے آواز دی "سونے والے!"

سونے والے نے عرض کی "قبلہ! کیا حکم ہے؟"
 رسول نے فرمایا "سونے والے! سونا بیچتے ہو؟"
 سونے والے نے عرض کی "جی ہاں۔ بیچتے ہیں"
 رسول نے پوچھا "کیا لوگے؟"

سونے والے نے پوچھا "خریدار کون ہے؟"
 رسول نے فرمایا "اللہ"

سونے والے نے پوچھا "وہ کیا دے گا؟"
 رسول نے فرمایا تم کیا لوگے؟

سونے والے نے کہا "قبلہ! تم بتاؤ۔ وہ کیا دے گا؟"
 آخر جب بڑی دیر ہو گئی تو سونے والے نے یہ کہہ کر فیصلہ کیا کہ۔
 "جب سونے کا اللہ خریدار ہے تو اس سے جھگڑا کیا کرنا ہے۔
 جو اس کی "مرضی" ہو وہ دے دے دے"
 بہر نزع "خدا کی مرضی" سونے کی قیمت ہو گئی۔ سونے والے
 نے عرض کی۔

"خدا وندا! یہیں ہماری قیمت دو"
 خدا نے فرمایا "یوں نہیں۔ آج ہم تمہیں قیمت نہیں دے
 سکتے۔ یہ ہم پر اُدھا رہی۔ انشاء اللہ قیامت
 کے دن ادا کر دیں گے"

سونے والے نے عرض کی۔ "خدا وندا! سو دا پکا کوئے
 کے لئے کچھ بیانہ چاہئے"
 خدا نے کہا "ٹھیک ہے۔ قیمت تو قیامت میں ملے گی"

مگر بطور بیان ہم تمہیں "جنت" دیتے ہیں۔

لہذا آج سے تم اسے اپنے قبضہ میں کو دو

چنانچہ رات کو جنت قبضہ میں آگئی۔ اب جو صبح کو اٹھے تو مالکِ جنت اُتھے۔ سال بعد جو بڑے گھر کی بیٹی سے شادی ہوئی تو اپنی ڈہن کو منہ دکھائی میں وہی رات والی جنت دے دی۔ گویا شوہر نے حاصل کی اور بیوی خاتونِ جنت کہلائی۔ ادھر بیوی نے یہ کیا کہ شوہر والی جنت کو بچوں کے نام منتقل کر دیا اور رسول نے انتقال کی تصدیق فرمادی۔

«الحسن والحسين سيد اهل الشباب جنة»

گویا خدا کی دی ہوئی جنت باپ نے خریدی مائِ خاتونِ جنت بنی اور بیٹے مالکِ جنت بنے۔ اب یہ جنت ان مالکوں کی ہے۔ لہذا ان سے نشانہ رہنا۔ ان سے واقف رہنا۔ ان سے متعلق رہنا کیونکہ جنت میں جانے کے لئے ان کی واقفیت کام آئے گی۔

سَامِعِينَ !

اب ہم پوچھتے ہیں «خداوند! جنت دے گا؟»
اللہ جواب میں فرماتا ہے «کیوں خواصخواہ کے لئے میوا سرکھاتے ہو۔ جاؤ۔ اس سے بات کرو جس نے خریدی ہے۔ جنت جانے اور اس کی مرضی جانے کیونکہ میں تو مرضی کے عوض جنت بیچ چکا ہوں»

حضور والا !

مکہ سے ہجرت فرما کر رسول مدینے تشریف لائے اور جہاں جہاں بھی رسول کو نصرت کی ضرورت پڑتی رہی وہاں وہاں نصرت کا وعدہ کرنے والا رسول

کی نفرت کرتا رہا۔ گویا جب رسول نے نفرت کے لئے پکارا نفرت کرنے والا
نفرت کے لئے پہنچا رہا۔

بہر نوع۔ اللہ نے نفرت کرنے والے کو حسن و حسین جیسے دو بیٹے عطا
فرمادیئے۔ ادھر علیؑ دیکھ دیکھ کے بڑے خوش ہوتے اور فرماتے۔

”یا اللہ انبیاء شکر ہے کہ تو نے مجھے حسن و حسین جیسے
فرزند عطا فرمائے ہیں لہذا میں نے جو نصرت
رسول کا وعدہ کیا تھا، میرے بعد میرے بیٹے
اس وعدہ کو پورا کریں گے“

صحابائے!

ادھر علیؑ خوشی کر ہی رہے تھے کہ رسول پر آیہ مبارکہ نازل ہوئی
”اے رسول! جب کل عیسائیوں کے مقابلے میں جاؤ۔ تو

”أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ“ اپنے بیٹوں کو لے کر جانا

”فَسَاءَكُمْ“ اپنی نساء کو لیکر جانا۔ اور

”أَنْفُسَكُمْ“ اپنی جان کو لیکر جانا“

حضور والا!

اب جو یہ آیت رسول پر نازل ہوئی تو تمام کائنات نے سنی کہ

رسول کل اپنے ساتھ اپنے بیٹے، نساء اور جان کو لیکر جائیں گے“

لوگوں کو رسول کی جان کی تو پہلے ہی جان پہچان تھی کہ جان بگو

کون جائے گا۔ اور نساء کے متعلق بھی اطمینان تھا کہ چشم بد دور نو

بیویاں موجود ہیں۔ بیٹی بھی موجود ہے مگر اب نساء کے متعلق ہر جگہ تذکرے

ہو رہے تھے۔ کیونکہ اچھے شاگرد اپنے استاد کے بیٹے ہوتے

ہیں۔ اور اچھے مَرُید اپنے پیار کے بیٹے ہوتے ہیں۔
لہذا لوگوں نے سوچا ”آخر ہم رسول کی اُمت ہیں۔ کل کو ہم
میں سے ہی کوئی بیٹا بنے گا“

چنانچہ ساری رات مدینے کے بازار کھلے رہے۔ دکانوں پر چھانٹیں
بنتی رہیں۔ غسل ہوتے رہے۔ کپڑے بدلے گئے۔ عطر لگائے گئے۔
رات بھر تیاریاں ہوتی رہیں کہ کل کو رسول کا بیٹا بن کے جائیں گے۔
گویا رات بھر بستر پر کزوٹیں بدلتے رہے اور صبح کی نماز کے وقت مسلمانوں
سے مسجد نبوی چھلک اٹھی۔ رسول نے نماز پڑھائی۔ نماز پڑھنے کے بعد مڑ کے
دیکھا اور یہ آیت پڑھی ”وَقُلْ نَدْعُوا بِنَاثِنَا وَأَبْنَاثِنَا... الخ“

رسول کی آواز سنکر ہر صف سے آواز آئی ”قبلا! میں بھی ہوں“
تھوڑی دیر بعد رسول نے فرمایا ”حسین بیٹا! ادھر آؤ“
حسن تشریف لائے۔ پھر فرمایا ”حسین بیٹا! تم بھی آؤ“
حسین بھی تشریف لائے۔ جب دونوں شہزادے آگئے تو رسول نے
ایک شہزادے کو دائیں طرف بٹھایا اور دوسرے شہزادے کو بائیں طرف بٹھایا
اور سامعین کی طرف مسکرا کر فرمایا۔

”مسلمانو! دیکھو۔ یہ میرے ”ابناء“ ہیں۔ مسلمانوں میں سے کسی نے
عرض کی ”قبلا! ہم؟“

رسول نے فرمایا ”تم۔ اب نہ آنا“
پھر نوح رسول نے کہہ دیا کہ یہ ہیں میرے ”ابناء“۔
اور یاعلیٰ! دیکھو۔ تم میری جان بن کر چلو“
سامعین! رہ گیا نسا نسا ”اس ضمن میں عرض یہ ہے کہ

عزنی کی لغت میں نساء کے تین معنی ہیں " ماں " بیوی " یا " بیٹی "۔
اب اگر ماں " تصور کریں تو وہ اس آیت کے نزول سے پہلے ہی فوت
ہو چکی تھی۔ معلوم ہوا کہ نساء سے مراد یا تو بیوی ہے یا بیٹی " اور رسول
نے سوچا کہ اگر بیوی کو لے جاؤں تو بیٹی بڑا مان جائے گی اور اگر بیٹی کو
لے جاؤں تو بیوی بڑا مان جائے گی۔ چنانچہ رسول نے فرمایا:-

" یا علی! تم میرے ساتھ میری جان " بنکر چلو۔
حسنین بیٹا! تم میرے ساتھ میرے بیٹے بن کے
چلو۔ اور سیّد! تم ہمارے ساتھ نساء
بن کے چلو۔ تاکہ ساتھ جانے والوں میں سے کسی
کی بیٹی بن جاؤ۔ کسی کی ماں " بن جاؤ اور کسی کی

" بیوی " بن جاؤ۔ "

بہر کیف رسول اپنی " جان " بیٹوں اور نساء کو لیکر میدان
مباہلہ سے کامیاب ہو کر گھر کو جو لوٹے تو علیؑ و سیّدؑ بڑے خوش تھے
حسنین بھی خوش خوش کھیلتے ہوئے گھر آ گئے۔ اب جو حسنین کو آتے دیکھا
تو علیؑ و فاطمہؑ دونوں تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔

بچوں نے عرض کی " بابا جان! یہ کیا ہو رہا ہے؟ "

علیؑ و سیّدؑ نے عرض کی " شہزادو! اس آیت سے پہلے تم ہمارے
بیٹے تھے۔ مگر اس آیت سے پہلے تم دونوں کو محمدؐ کا بیٹا
بنا دیا ہے۔ لہذا اب تم فرزند رسول ہو۔ اب قیامت تک منہاری زیارت
یہ کہہ کر پڑھی جائے گی۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ يَا بِنَّ رَسُولِ اللّٰهِ " لہذا اب
ہم تمہیں اپنا بیٹا نہیں کہہ سکتے بلکہ دونوں آج سے رسول کے بیٹے ہو

اس لئے تمہاری تعظیم ہم پر فرض ہے۔

سامعین!

دن گذر گیا۔ رات آئی۔ رات کو دونوں شوہر بیوی۔ علیؑ و فاطمہؑ
دھو کر کے مٹھے بچھا کر بیٹھ گئے اور خداوند عز و جل کی خدمت
میں عرض کرنے لگے۔

”خداوند! ہم تو خوش تھے کہ تو نے ہمیں حسن و حسین جیسے فرزند
عطا کئے ہیں مگر آج آیہ مبالغہ کے بعد حسین محمدؑ کے بیٹے ہو گئے۔“

علیؑ نے کہا، ”خداوند! میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ جب حسن و حسین
محمدؑ کے بیٹے ہیں تو ایک بیٹا مجھے بھی عطا کر دے جو دنیا میں میرا بیٹا ہو سکے
رہے۔ چونکہ میں نے محمدؑ کی نصرت کا وعدہ کیا ہے۔ لہذا ایسا بیٹا عطا فرما
جو میرے بعد محمدؑ کے بیٹوں کی نصرت کے وعدے کو پورا کرے۔“

ادھر سیدہ نے دعا کی۔ ”خداوند! علیؑ کو ایسا بیٹا دینا جو علیؑ
کا وارث بنے۔ مگر مجھے بھی ایک بیٹا دے دے جو میری وارث
بن کے رہے۔“

خدا نے کہا۔ ”علیؑ تمہاری دعا بھی قبول ہوگی اور سیدہ
تمہاری دعا بھی منظور ہوگی۔ تم دونوں کو ایسے
بیٹے دیں گا جو قیامت تک تمہارے نام کو زندہ رکھیں
گے۔“

سامعین کو ام!

میں اپنی گفتگو کو یہاں آ کر ختم کرتا ہوں کہ ایک دن حضور امیر علیہ السلام
نے اپنے بڑے بھائی جناب عقیلؑ کو بلوا بھیجا اور حجب عقیلؑ نثرین لائے

تعرض کی۔

”عقیل بھائی! تم میرے بڑے بھائی ہو اور بڑا
بھائی دُنیا میں باپ کے برابر ہوتا ہے۔ آج میں
آپ کو تکلیف دیتا ہوں کہ آپ عرب کے تمام قبیلوں
سے واقف ہیں لہذا آپ میری شادی کسی ایسے
قبیلے میں کروادیں جو عرب بھر میں شجاعت میں
مُسْتَم ہو تاکہ بہادر قبیلہ کی خاتون سے جو میرا
بیٹا پیدا ہو وہ میری ”بھادری کا وارث“ کہلائے
غفیل نے جواب دیا۔

”یا علی! عرب میں بہادر ترین قبیلہ ”بنی کلاب“ ہے لہذا میں
آج ہی ان کے پاس جا کر تمہاری خواستگاری پیش کرتا ہوں
سأمعین!

قبیلہ بنی کلاب بڑا ہی بہادر قبیلہ تھا اور عرب کے مشہور بہادر اپنی تلواروں
پر اس قبیلہ کے بہادروں کے نام کندہ کروایا کرتے تھے۔ گویا بہادر قبیلہ تھا
انفاق سے ان دنوں مدینہ کے قریب ہی بنی کلاب ٹھہرا ہوا تھا۔ چنانچہ
صبح کو عقیل وہاں پہنچے اور ایک نخلستان میں جاکے بیٹھ گئے اور سردار قبیلہ
کو اطلاع کر دی۔ شیخ قبیلہ اپنے جوانوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔ جب اس
دیکھا کہ غفیل ابن ابی طالب ہیں تو فوراً پاؤں پر گر گیا اور عرض کی۔

”ابن ابی طالب کے شہزادے! بیضتہ البد کے بیٹے!
امام العرب کے بیٹے! سید القوم کے فرزند!
آپ ہمارے قبیلے کے پاس آئے ہیں۔ ہماری

عزت بڑھی۔ غلاموں کے خیمے موجود ہیں لہذا

ہمارے خیموں میں فروکش ہوں۔

چنانچہ عقیل شیخ قبیلہ کے خیمے میں تشریف لائے اور تین دن کی مہمانی کے بعد شیخ قبیلہ دست بستہ سامنے کھڑے ہو کر عرض کرنے لگا۔

حضور! بے تو گستاخی مگر پوچھ سکتا ہوں کہ حضور نے کیوں تکلیف فرمائی؟

عقیل نے کہا: "شیخ! تم علی ابن ابی طالب کو جانتے ہو؟

شیخ نے عرض کی: "سبحان اللہ۔ علی کو کون نہیں جانتا۔ کوئی بے جان ہی ہو گا جو علی کو نہ جانتا ہو۔"

عقیل نے کہا: "شیخ! تمہارے خاندان میں علی کی شادی کونا چاہتا ہوں۔"

شیخ قبیلہ حیران ہو کے پوچھتا ہے۔

"قبیلہ! علی کی شادی ہمارے خاندان میں چاہتے

ہیں؟ ہمارے خاندان کی اتنی عزت کہ علی ہمارا

دعا ہاد بنے؟ حضور! میری ایک ہی لڑکی ہے اسے

اپنی غلامی میں قبول فرمائیے گا۔"

یہ کہہ کر شیخ قبیلہ گھر آیا اور بیوی سے کہنے لگا۔

"سنتی بھی ہو۔ بیٹی کا رشتہ آیا ہے۔ مبارک ہو"

بیوی نے پوچھا: "کہاں سے آیا ہے؟"

شیخ نے کہا: "پہلے دو رکعت نماز شکرانہ پڑھو۔ پھر بتاؤں گا"

چنانچہ جب خاتون نے دو رکعت نماز پڑھ لی تو شیخ کہتا ہے۔

علیٰ کا رشتہ آیا ہے۔

بیوی پوچھتی ہے ”کون علیٰ؟“

شیخ کہتا ہے ”علیٰ ابن ابی طالب“

یہ شکر بیوی حیران ہو کر پوچھتی ہے۔

”شیخ ! وہی علیٰ جو محمد کا داماد ہے؟“ وہی

ہمارا داماد بنے گا۔ سبحان اللہ اس رشتے سے

بہتر تو کوئی رشتہ ہے ہی نہیں۔“

چنانچہ رطلی سے جب پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا۔

”میں اتنا جانتی ہوں کہ رات خواب میں ایک

خاتون میرے پاس آئی تھی جس نے مجھے دلہن

بنایا اور فرمایا تھا۔

مبارک ہو۔ تو میرے بیٹے کی ماں بنے گی۔“

بہر نوع رشتہ منظور ہو گیا۔ نکاح ہوا اور ام البنین کو بنی ہاشم

اپنے جھڑٹ میں لیکر علیٰ کے گھر لائے۔ ڈیوڑھی کے سامنے ناتھ

بٹھایا گیا۔ ام البنین محل سے اُتریں۔ چوکھٹ کو چومو اور چوکھٹ پہ جا کے

بیٹھ گئی۔ بنی ہاشم نے کہا۔ ”بی بی ! اندر چلیئے۔“

ام البنین نے فرمایا ”نہیں۔ اس گھر کی مالکہ فاطمہ ہے۔ میں تو فاطمہ

کی ادنیٰ اسی کینز ہوں۔

زینب آگے بڑھی اور عرض کی ”اماں آؤ نا“

ام البنین نے کہا ”بی بی ! مجھے اماں نہ کہو۔ میں تمہاری کینز ہوں۔

تمہارے باورچی خانے میں خدمت کرنے آئی ہوں۔

بہر کیف اُم البنین علیؑ کے گھر میں آگئیں اور ایک سال بعد خدا نے بطن اُم البنین سے علیؑ کو ایک بیٹا عطا فرمایا۔ علیؑ مسجد میں تھے کہ ایک خاتون نے عرض کی۔

”یا علیؑ! مبارک ہو۔ خدا نے بیٹا عطا فرمایا ہے۔“
چنانچہ علیؑ گھر میں پہنچے۔ اُم البنین کی گود میں بیٹا دیکھ کر فرمایا۔
”ماشاء اللہ۔ وہی ہے جس کی مجھے تمنا تھی“
اُم البنین نے عرض کی۔

”یا علیؑ! بچہ تو بڑا حسین مگر اس نے ابھی تک آنکھ نہیں کھولی۔“

علیؑ نے فرمایا۔ ”آنکھ کس طرح کھولتا۔ آخر میرا بیٹا جو ہوا۔“

یہ کہہ کر علیؑ نے نَفَس سے فرمایا۔

”فَضَّةُ! ذرا میرے حسین کو تو بلاؤ۔“

حسینؑ تشریف لائے۔ علیؑ نے فرمایا۔

”حسینؑ! بھائی مبارک ہو۔“

حسینؑ نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ پھیلائے۔ اور فرمایا۔

”اُمّات! میرے بھائی کو میری گود میں دو۔“

اُم البنین نے بچے کو آگے پھیلا دیا۔ ادھر بچے نے آنکھیں کھولنے

سے پہلے اپنے دونوں ہاتھ حسینؑ کی طرف پھیلا دیئے۔ گویا بچہ یہ کہہ رہا تھا

”مولا! آنکھیں تو بعد میں کھلتی رہیں گی پہلے میرے

دونوں ہاتھوں کا نذرانہ قبول فرمائیے گا۔“

حسینؑ نے بچے کو گود میں لیا اور بچے نے آنکھیں کھول دیں۔ ادھر

علیٰ دیکھتے رہے اور آنسو پونچھتے رہے۔ اور بچہ حسین سے اس طرح چمٹ گیا جیسے پُرانا واقف ہو۔

بہر کیف حسین کی گود سے علیٰ نے اٹھایا۔ ایک کان میں اذان کی اور ایک کان میں اتقامت کہی۔ جب اذان و اتقامت کہہ چکے تو بی بی زینب نے عرض کی۔

”یا باجان! یہ بچہ مجھے دو“

چنانچہ بھائی کو زینب نے گود میں لے لیا اور بچے کے کان میں بڑی دیر تک بات کرتی رہی۔

علیٰ نے پوچھا: ”زینب! تم نے کیا بات کی؟“
زینب نے عرض کی۔

”بابا جان! میں نے اماں کی وصیت پوری کی ہے کہ وہ مرنے وقت کہے گی تھی کہ ”اُم البنین“ کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوگا جس کا نام عباس ہوگا۔ جب وہ پیدا ہونے لگا تو اسے میرا سلام کہنا۔ لہذا میں نے کہا ہے۔“

”عباس بھائی! اماں سلام کہتی تھی۔“

عباس بھائی! تو ہی میری چادر کا نگہبان ہوگا۔
بہر کیف بچہ پنتارہا۔ جب تین چار سال کا ہوا تو ام البنین نے بچے کو سمجھایا کہ۔

”بیٹا! جب تم زینب کے سلام کو جابجا کرو تو نظری

پاؤں سے اوپر نہ ہرنے پائیں۔“

دیکھو! وہ شہزادی ہے اور تو کنیز زادہ ہے۔ بیٹا!

کہیں حسین کے برابر نہ بیٹھا جانا

عزادار سید الشہداء!

منظر العجائب باب کا منظر العجائب بیٹا، حسین سرکار کا اسی طرح محافظ تھا جس طرح رسول کے دربار کا علی محافظ تھا۔ اگر حسین کہیں خط لکھتے تو کاتب عباس ہوتے۔ اگر حسین کہیں جہاد میں جاتے تو سپہ سالار عباس ہوتے۔ اگر حسین گھر میں بیٹھتے تو گھر کا منظم عباس۔ حسین کے بچوں کا پہلا والا عباس۔ حسین کی مستورات کو نسل دینے والا عباس۔ غرض حسین سرکار کے تمام کام اس نوجوان کے سپرد تھے۔ گویا منظر العجائب کا منظر العجائب بیٹھا تھا۔ آج ہم بھی اسے منظر العجائب مانتے ہیں۔

خدا شاہد ہے۔ جو لطف "یا علی" کہنے میں آتا ہے

وہی لطف "یا عباس" کہنے میں آتا ہے۔ گویا عباس اسی طرح

تمشکل کشا ہے۔ جس طرح "علی" مشکل کشا ہے۔

بزرگانِ منے!

جو صاحبان کو بلا کی زیارت کر چکے ہیں وہ ذرا اپنے تصور میں گمراہی کے شہر کو لائیں تو پتہ چلے گا کہ عباس غازی کو بلا میں کس شان سے ہیں۔ گویا کر بلا کا شہر دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح مشرقی بادشاہوں کے شہر ہوں۔ سارا شہر چاروں طرف ہے اور درمیان میں شہنشاہ کا محل ہے جسے بڑا محرم کہتے ہیں۔ اگر شہنشاہ کے محل میں داخل ہوں تو سامنے شہنشاہ کے پورا بیویٹ سیکرٹری حبیب کا روزہ ہے اندر جاؤ تو شہنشاہ کی آرام گاہ ہے۔ اور ساتھ ہی باڈی گارڈ کا رسالہ ہے جسے گنج شہیداں کہتے ہیں۔ تفریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر

حسینی سرکار کی زنا نہ محل سوا ہے جسے خیمہ گاہ کہتے ہیں شہر سے
باہر کھلے میدان میں حسینی سرکار کا مہمان خانہ ہے جس میں حُر
مہمان ٹھہرا ہوا ہے اور نہر کے کنارے حسینی سرکار کے کمانڈر انچیف
کا بنگلہ ہے جس پر آج بھی حسینی سرکار کا پریم لہرا رہا ہے۔

بہر نوع وہ بڑے حضور کی درگاہ ہے۔ اور یہ چھوٹے حضور
کا حرم ہے

سامعین!

میں ایک دن سید الشہداء کے حرم میں گیا۔ فریح پکڑ کر عرض کی۔
مولا! تو نے کتنا شاندار شہر بسایا ہے۔ دُنیا بھر کے زائرین تیرے
سلام کو آتے ہیں۔ سامنے چھوٹے بھائی کا روزہ ہے۔ خیمہ گاہ بھی
ہے۔ گویا ہر شے اپنی جگہ پر مناسب ہے۔ مگر

مولا! ایک کسر رہ گئی۔ اگر وہ بھی پوری ہو جاتی تو تیرے شہر جیسا
شہر کوئی نہیں تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر دونوں ”بھائیوں“ کی قبروں کے
بیچ میں زینب کا روزہ بھی ہوتا تو کیا شان تھی!

مولا! کمال ہو جانا کہ زینب کے روزہ پہ بیٹھ کر تجھے بھی رو لیتے اور
عباس کو بھی رو لیتے۔

حضور والا!

میں ابھی یہ سوز ہی رہا تھا کہ فوراً خیال آیا کہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ
دونوں بھائیوں نے کو بلا فتح کیا تھا۔ لہذا یہ دونوں اپنے مفتوحہ علاقے
میں ہیں اور زینب نے چونکہ مشام فتح کیا ہے۔ اس لئے وہ اپنے مفتوحہ
علاقے میں ہے گویا سید الشہداء اور عباس غازی اپنی بہن زینب

کی زیارت کو شام جاتے ہیں اور بی بی کر بلا میں تشریف لاتی ہیں۔
اور یاد رکھو!

عباس غازی حسینی فوج کا کمانڈر انچیف ہے اس لئے ہم نے
لحاظ رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ سید الشہداء اور دوسرے
آئمہ طاہرین کی نذر میں دی ہوئی چیز کو ہم "نیاز" کہتے ہیں
اور جناب عباس غازی کی نذر میں دی ہوئی چیز کو ہم "حاضری"
کہتے ہیں۔ لفظ "حاضری" اصطلاحی لفظ ہے کیونکہ اگر بادشاہ کی
خدمت میں جائیں تو اسے نیاز کہتے ہیں اور اگر سپہ سالار کی خدمت
میں جانا ہو تو اسے حاضری کہتے ہیں۔

عزادار سید الشہداء!

بی بی زینب کو عباس غازی پر اتنا اعتماد تھا کہ شب عاشور زینب
نے تمام عورتوں کو اپنے جیسے میں بلا کر کہا۔

"بی بیو! گھبراؤ نہیں۔ تمہارے پودے کی میں

زماہ دار ہوں کیونکہ عباس جیسا میرا بھائی موجود

ہے۔"

زینب کی یہ بات سُن کر تمام خواتین خاموش ہو گئیں۔ وقت گزرتا گیا
صبح عاشور آگئی اور میدان شہادت گرم ہو گیا۔ جب تمام عزیز واقارب
جام شہادت پی چکے تو عباس علیہ السلام حسینؑ کے سامنے کھڑے ہو کر عرض
کرنے لگے۔

"مؤلا! میری تمام فوج ختم ہو گئی لہذا میں بھی

مرنا چاہتا ہوں۔ مؤلا! مجھے اجازت دو

کیونکہ کوثر پہ میرے سپاھی میرا انتظار کر
رہے ہیں۔

حسین نے جواب دیا۔

”عباس! تم میرے علمبردار ہو“

عباس نے عرض کی۔

”مولا! وہ فوج اب کہاں ہے جس کا میں علمبردار ہوں“

عباس کا یہ فقرہ سنکر امام نے سوچا کہ اگر عباس کو روک لیا تو وہ غم سے ختم ہو

جائے گا۔ چنانچہ حکم تو دے دیا کہ ”تم جا سکتے ہو“ مگر لڑائی سے روکنے

کے لئے یہ بھی کہہ دیا کہ ”عباس بھائی! اگر ہو سکے تو بچوں کی

مشک پانی سے بھرو“

سامعین!

میں نے آج تک مقلد کی کسی کتاب میں یہ نہیں پڑھا کہ مولا نے عباس سے

یہ کہا ہو کہ ”مشک میں پانی ملا دو“ بلکہ یہی فرمایا کہ ”مشک میں پانی بھرو“

کیونکہ اگر پانی سے آدھ کا حکم ہوتا تو پانی لازماً آتا۔ مگر یہاں صرف مشک

بھرنے کا حکم تھا۔ چنانچہ عباس خیمے میں آئے اور سکینہ کا مشکیزہ اٹھا کر

نہرو کی طرف چل پڑے اور سکینہ نے تمام بچوں سے کہہ دیا۔

”بچو! کھبراؤ نہیں۔ میرا چچا ستفان بن کے جا رہا

ہے۔ پانی ضرور ملے گا“

چنانچہ سب بچے خالی کوزے لیکر سکینہ کے گرد کھڑے ہو گئے اور

عباس نے روانگی پر بی بی زینب کو سلام کیا۔ حسین کو سلام کیا اور جب

اپنی زوجہ کے خیمہ میں پہنچے تو دیکھا کہ فضلؑ پاس بیٹھا ہے اور زوجہ

یہ کہہ کر ہی ہے۔

سرتاج! تم نے بڑی دیر کو دی،

عباس نے کہا۔

فضل کی ماں! میرے لئے بیوہ ہو جائے گی،

حضور والا!

ایک شاعر عالم ارواح میں اس منظر کو دیکھ رہا تھا کہ جب عباس نے کہا کہ فضل کی ماں! تو بیوہ ہو جائے گی، تو بی بی جواب میں فرماتی ہیں

کچھ غم نہ کریں آپ یہ پروان چڑھیں گے

میں قبر کو جھاڑوں کی یہ قرآن پڑھیں گے

بہر نوع عباس گھوڑے پہ سوار ہوئے۔ میدان میں بیٹھے اور علم کا بچہ برابر خیمے کے ضس میں نظر آ رہا ہے۔ زینت کی نظر علم کے بچے پر جمی ہوئی ہے۔ خیمے اپنے ہاتھوں میں خالی کوزے لئے خیموں سے باہر نکل کر عباس کے علم پر نظریں جمائے کھڑے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد علمدار حشینی نہر کے اندر پہنچ گیا۔

صحابتہ ذوق!

بتاؤ۔ ایک آدمی تین دن کا پیاسہ ہوا گرمی کا موسم ہو۔

اور بیس ہزار آدمیوں کو لڑ کر جب نہر میں پہنچا ہوا تو اس کی پیاس

اپنے پورے شباب پر ہوگی یا نہیں، یقیناً پانی کو دیکھ کر

پیاس کی شدت بڑھ چکی ہوگی۔ مگر دنیا نے منظر

دیکھا کہ عباس نے جھک کے مشک بھری۔ تسمہ باندھا اور اپنے

ہاتھوں کو دیکھا تو بھیگ چکے لہذا ہاتھوں کو لہسے کی زرہ

سے صاف کیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کے دعا کی۔
 خداوند! میری انگلیاں حسین کے بغیر بھیگ گئی
 ہیں جو وفا کے خلاف ہے۔ لہذا اب جو میرا اور
 حسین کا سامنا ہو تو یہ ہاتھ میرے ساتھ نہ ہوں
 بزرگان من!

عباس کی یاد دیکھ کر کائنات مجھوم اٹھی اور چشم ملک نے سناروں کی سینک
 لگا کر اس منظر کو دیکھا۔ چاروں طرف سے ”سبحان اللہ، سبحان اللہ“ کی
 صدائیں بلند ہونے لگیں کیونکہ ساری دنیا کی تاریخ ایک طرف ہے اور یہ واقعہ
 ایک طرف ہے۔ لہذا آج میں جناب امیر کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔
 ”یا علی! خبیبر کا اکھاڑنا، ایک طرف ہے، ”مرحب“ کا
 پچھاڑنا ایک طرف ہے، ”بستر رسول“ پہ سونا ایک طرف
 ہے۔ مگر

”اپنی پیاس میں دریا سے پیاسہ نکل آنا اور بات ہے“

بھائیو!

یہ مثال کہیں اور ملتی ہو تو بتاؤ؟۔ بہر نوع عباس غازی پیاسے نہر سے
 نکل آئے اور خیموں کی طرف بڑھنے لگے اور ہر تکیے پر چاکو آتے جو دیکھا
 تو بلند آواز میں کہا۔

”بچو! وہ دیکھو میرے چچا پانی بیکو آ رہے ہیں
 چنانچہ بچے اڑھیاں اُبھار اُبھار کر علم کو دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد
 زینب نے دیکھا کہ علم کبھی دُائیں جھکتا ہے۔ اور کبھی بائیں جھکتا ہے۔ اب
 جو علم کو اس طرح ڈگمگانے دیکھا تو زینب نے آواز دی۔

۔ حسین ! علم کو کیا ہو گیا؟

حسین نے وہیں سے آواز دی۔

”زینب ! دیکھ تو میں بھی رہا ہوں مگر میری کو

ٹوٹ گئی۔ مجھ میں اب اتنی طاقت نہیں ہے کہ

میں وہاں جا سکوں“

عزاء دار سید الشہداء !

تھوڑی دیر بعد حسین لاشے پہ پہنچے۔ اور خالی علم لیکر گھر واپس آگئے

ادھر بچوں نے جو خالی علم دیکھا تو ان کے ہاتھوں سے خالی کوزے گر پڑے
سکینہ نے کہا۔

”بچو ! مجھے معاف کرنا۔ میں نے جس بھروسہ پہ کہا تھا وہ ختم

ہو گیا۔“

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاٰجِعُوْنَ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَاٰلِ مُحَمَّدٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شجرِ لطیبہ

خداوند عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر
دُرود و سلام

محترم سامعین!

اللہ نے انسان کے اندر بہت سی طاقتیں ودیعت کی ہیں۔ یہ تمام خلائق اور فضائی طاقتیں انسان کے تابع فرمان ہیں۔ گویا انسان اتنا طاقتور ہے کہ اور بے طاقت اتنا ہے کہ ذرا سا ٹمپیر بچر بڑھ جائے تو بے کار ہو گیا۔ اگر معمولی سا سر میں درد ہو گیا تو معطل ہو گیا۔ نڈر اتنا کہ نا ڈرنے پہ آٹے تو چاند پہ پہنچ جائے اور ڈر لوک اتنا کہ سانپ کے قریب سے گزرے تو چیخ نکلی جائے۔ گویا نہ ہی اس کے ڈر لوک ہونے کی کوئی حد ہے۔ ہر نوع انسان جیسی طاقتور شے نے کس طرح گوارا کر لیا کہ وہ پتھر کو پوجنا شروع کر دے۔ اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کے بیٹھا رہے۔

فوجوالو! زمانہ جاہلیت کی بات نہیں ہے بلکہ آج کل کے پڑھے لکھے دور میں بھی ایسا ہو رہا ہے۔ آج کے تہذیب و تعلیم اور ترقی کے زمانہ میں کہ ڈر ہا انسان ایسے ہیں جو پتھر کے سامنے ہاتھ جوڑ کے بیٹھے ہیں۔

سامعین!

اگر تم میری اس بات کی دلیل چاہتے ہو تو اپنے ہمسایہ ملک (بھارت) میں جا کے دیکھ لو کہ وہ لوگ اگر اسمبلی میں تقریر کریں تو دنیا بھر کو حیران کر دیں

سیاسی باتیں کریں تو دُنیا کا مزاج چکڑا دیں اور اگر گھر جا بیٹیں تو پتھر کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے رہیں۔

ہم پوچھتے ہیں۔ پنڈت جی! کیوں اس پنہارنا مراد کو پوج رہے ہو؟

پنڈت جی پورے فلیسا نہ انداز میں جواب دیتے ہیں کہ:-
مسلمانو! تم نے سمجھا ہی نہیں۔ کون کتنا ہے کہ ہم پتھر کو پوجتے ہیں
ہم نے عرض کی:

پنڈت جی! ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم پوج رہے ہو
اس میں کلغے کی کیا بات ہے۔ اور اگر ہم نہیں سمجھتے تو
آپ ہی سمجھا دیں۔
پنڈت جی کہتے ہیں۔

”اصل بات یہ ہے کہ میں گناہ گار ہوں اور میرا اللہ جو ہے وہ پرغما
ہے۔ پراکشور ہے۔ اور یہ بت میرا اللہ نہیں ہے اور چونکہ میں
ایک گناہ گار ہونے کی حیثیت سے اللہ کے حضور میں جانے سے
شرمانا ہوں اس لئے اس بے گناہ کو میں نے اپنے اور اللہ کے درمیان
”وسیلہ“ بنایا ہے۔

ہم نے پوچھا ”پنڈت جی! اس پتھر کو کیوں وسیلہ بنایا ہے؟“
پنڈت جی نے کہا۔

”دیکھو نا۔ خواہ میں کتنا ہی بڑا گناہ گار ہوں مگر یہ پتھر بے گناہ ہے“
سامعین!

پنڈت کی بات سن کر میں بھی قائل ہو گیا کہ گناہ گار کو وسیلہ بنانے

سے پتھر پوجنا ہی بہتر ہے۔ کم از کم اس میں شعور کی بات تو ہے
عقل کی بات تو ہے۔

بہر نوع انسان پتھر کو پوجنے لگا جو انسان کے بے عقل ہونے کی آخری
منزل ہے۔

اب بناؤ! یہ قانونِ عدل کی تو ہمیں ہے یا نہیں
کہ پتھر اللہ کی جگہ پر پہنچ گیا اور انسان پتھر کا بندہ ہو گیا۔ یہ انتہائی
ظلم ہے یا نہیں کہ حقیقی معبود کو چھوڑ کر پتھر کو خدا بنا لیا۔ یہ قانونِ عدل کے
انتہائی خلاف ہے یا نہیں کہ انسان پتھر کا بندہ بن گیا؟

صاحبانے!

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان نے پتھر کو خدا کیوں بنا لیا؟
اس کا جواب یہی ہے کہ انسان فطرتاً "ٹوکنے والے" سے بھاگتا ہے
اور "نا ٹوکنے والے" سے محبت کرتا ہے۔ ادھر اللہ چونکہ ٹوکتا بہت ہے کہ
نماز کیوں نہیں پڑھی، روزہ کیوں نہیں رکھا، فلاں کا حق کیوں غضب کیا، فلاں
سے فریب کیوں کیا؟ اس لئے انسان نے سوچا کہ "ٹوکنے والے" اللہ کو
چھوڑ کر اسی "نا ٹوکنے والے" پتھر کو پوجو جو ٹوکتا ہی نہ ہو۔ تو رُود
تو بڑا نہیں کہتے۔ اور پوج لو تو شائباش نہیں کہتے۔ جہاں بٹھاؤ وہیں بیٹھ
جا بیٹھ گئے۔ کعبہ میں بٹھاؤ بیٹھ جا بیٹھ گئے اور مندر میں بٹھاؤ بیٹھ جا بیٹھ گئے
عرض نہ ہی ان خداؤں کو اپنی حیثیت کا علم ہے اور نہ ہی اپنی جگہوں کا پتہ
ہے کہ ہمیں یہاں بیٹھنا چاہیے یا نہیں۔ ہر حالت میں لوگوں کے محتاج ہیں
کہ انہوں نے جہاں چاہا انہیں بیٹھا دیا۔

سامعین! ایک دن عالمِ تصور میں ایمان "نا ٹوکنے والے" خداؤں

سے گفتگو کر رہا تھا۔

”انساف دے کے بنائے ہوئے خداؤ! کعبہ میں کیوں بیٹھ گئے۔ یہاں تمہاری جگہ تقوڑی ہے؟“
بتوں نے جواب دیا:-

حضور! ہم خود تقوڑا ہی آئے ہیں۔ لوگوں نے بٹھایا۔ ہم بیٹھ گئے۔ تم بھی کیوں خواہ مخواہ کے لئے بھڑک رہے ہو؟
ہم نے پوچھا:-

”پھر نکلتے کیوں نہیں ہو؟“
بتوں نے کہا:-

صاحب! نہ خود آئے ہیں اور نہ ہی خود جائیں گے۔ لوگوں نے بٹھایا ہے۔ بیٹھ گئے اور جب کوئی نکال دے گا اچلے جائیں گے۔
ہم نے کہا:-

”بتو! تم جو یہاں بیٹھے ہو۔ تم میں کوئی کمال بھی ہے؟“
انہوں نے جواب دیا:-

”صاحب! ویسے ہم میں پتھر مگر ایک کمال ہے ہم میں کہ اگر جنگ ہو رہی ہو۔ ہم سے ہم برس رہے ہوں۔ ٹینک سے ٹینک ٹکرا رہے ہوں اور دنیا پہ تباہی آ رہی ہو تو تم ہمیں پتھر کے بتوں کو میدان جنگ میں لے جاؤ اور جا کے رکھ دو تو ہم چور چور اہو جائیں گے پس جہاں گئے تباہ ہو جائیں گے مگر میدان چھوڑ کر واپس نہیں آئیں گے۔ ہماری اس ادا پہ دنیا مرنے ہے“

بہر نفع انسان کے بنائے ہوئے یہ خدا نہ تو کسی کو ٹوکتے ہیں اور نہ ہی

کسی نہ ظلم کرتے ہیں۔ مگر انسان نے سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ خدا کی جگہ پتھر کو پوجا اور یہ اس لئے کہ خدا ٹوٹتا ہے اور پتھر ٹوٹتا نہیں۔ اور نظرًا انسان مانوس ہوتا ہے "ناٹوکنے والے" سے اور بچتا ہے "ٹوکنے والے" سے تو یاد رکھو! انسان کی جب دس بیس پشتیں "ناٹوکنے" والے خدا کو پوجتی رہیں تو جب دو ایسی چیزیں اس کے سامنے آئیں گی۔ ایک ہو "ٹوکنے والی" اور ایک ہو "ناٹوکنے والی" تو بت پرستی کی عادت یہ کھلا دے گی کہ ہمیں ناٹوکنے والی، کافی ہے۔

محترم بزرگو!

انسان نے یہ خلافتِ عدلِ حاکمیت کی کہ خدا کو چھوڑ کر بتوں کو پوجا اور یہ صرف اس لئے کہ اس کے مزاج میں یہ بات بیٹھ گئی کہ وہ ناٹوکنے والے کو پسند کرتا ہے اور "ٹوکنے والے" کو ناپسند کرتا ہے ورنہ کوئی احمق ایسا نہیں ہے جو بسلامتی، ہوش و حواس، انسان ہوتے ہوئے پتھر کو کہے کہ "تو خدا ہے"

ایک چیز اور ہے جس کی انسان نے ضد کی ہے کہ یہ جو شے بنا تہے اسکی قدر بہت کرتا ہے۔ اپنے ہی ہاتھوں سے بُت تراشا اور پھر اس کی عزت اتنی کی کہ دنیا سے پوجا دیا۔ گویا ہر بنانے والے کو اس کی عزت کا بڑا خیال ہوتا ہے۔ جو جسکو بنا تہے وہ چاہتا ہے اس کی عزت بنے۔ جس شے کو بندے بنا پیش۔ وہ چاہتے ہیں اس کی عزت بنے۔ اور جسے اللہ بنائے وہ چاہتا ہے اس کی عزت بنے۔ بہر ذمہ ہر بنانے والے کو اپنے بنائے ہوئے کی عزت کا پاس ہوتا ہے ورنہ اگر انسان میں ذرا سا عقل شعور ہو تو وہ فوراً سمجھ جاتا ہے کہ فلاں چیز کہاں ہونی چاہیے۔ پتھر کہاں

ہونا چاہیے۔ حیوان کہاں ہونا چاہیے اور انسان کہاں ہونا چاہیے۔ گویا
 «چاہیے» اسی کا نبھانا عین عدل ہے اور یہی اصل عقل ہے۔

سامعین!

ایک حدیث سنو کہ کون سی شے کہاں ہوتی چاہیے۔

ایک روز حضور سرور کائنات مسجد میں تشریف فرما ہیں اور
 اصحاب کبار کا مجمع سامنے ہے اور کئی بے متبرک وہ محفل جس میں ذکر ہو
 رسول اور سامعین ہوں اصحاب رسول۔ اور کتنی نورانی ہیں وہ آنکھیں جنہوں
 نے نور جمال سے رسول کو دیکھا اور کتنے معتبر ہیں وہ ہاتھ جنہوں نے
 خلوص و ایمان کے ساتھ رسول کے ہاتھ پر بیعت کی اور کتنے مبارک ہیں وہ
 پاؤں جو سلامتی ایمان کے ساتھ چل کر رسول کے پاس آئے۔ بہر نوع اصحاب
 رسول سامعین ہیں اور رسول واعظ ہیں اور اسی وعظ کے دوران رسول فرماتے ہیں

اللہ نے ایک شجرہ طیبہ پیدا کیا ہے جس کی مثال

کلمہ طیبہ جیسی ہے اور وہ شجرہ ایسا ہے کہ

اس کی جڑ تو زمین میں گڑی ہوئی ہے اور اس کی

شاخ آسمان میں پہنچی ہوئی ہے»

بزرگانِ منہ!

رسول کی یہ بات سنکر تمام سامعین سوچنے لگے کہ ایسا شجرہ طیبہ

کہاں ہے جس کی جڑ تو زمین میں ہو اور شاخ آسمان میں پہنچی ہوئی ہو۔

سب نے کہا:-

«حضور! ذرا اس درخت کی تشریح فرما دیجئے»

رسول نے فرمایا:-

”شریع میں بتاتا ہوں مگر اپنی عقل کے مطابق
اسے یاد رکھنا تمہارا ذمہ ہے۔
دیکھو!

وہ ”شجرہ طیبہ“ جسکی جڑ زمین میں ہے۔ اور
شاخ آسمان میں ہے۔ وہ شجرہ طیبہ ہم میں
ہیں اس شجرہ

طیبہ کی جڑ ہوں اور علیؑ اس کی شاخ ہیں“
اصحاب نے عرض کی۔

”حضور! ہمارا بھی اس شجرہ طیبہ سے کوئی تعلق ہے؟“
رسول نے فرمایا:-

”ہاں۔ میرے ماننے والے اس شجرہ طیبہ کے پتے ہیں۔

سامعین!

چشم بدور۔ آپ حضرات اس شجرہ طیبہ کے ”پتے“ میں بشرطیکہ ماننے
والے ہوں تاکہ ”پتے باز“ ہوں۔ بہر نزع آپ حضرات اس شجرہ طیبہ
کے پتے ہیں۔

اب ذرا قانونِ عدل کے مطابق سوچو کہ اس درخت کی ”جڑ“
کہاں ہونی چاہیے۔ ”شاخ“ کہاں ہونی چاہیے۔ اور ”پتے“ کہاں ہونے
چاہئیں۔

دیکھو نا!

کسی درخت کو آپ نے دیکھا ہے کہ اس کے پتے، جڑ سے چٹے ہوئے
ہوں؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ پتے ہمیشہ شاخ کا دامن پکڑے رہتے ہیں۔ حالانکہ

حالانکہ پتے زندہ ہی جڑ کی بدولت ہیں۔ انہیں خوراک ہی جڑ کی بدولت پہنچتی ہے۔ اگر پتوں کا تعلق جڑ سے منقطع ہو جائے تو ختم ہو جائیں کیونکہ پتوں کا جڑ سے تعلق اسی وقت تک قائم رہتا ہے جب تک "شاخ" کو مضبوطی سے پکڑے رکھیں اور شاخ کے توسط سے جڑ سے فیض پہنچے گا۔ گویا پتوں کے لئے یہ قانونِ عدل ہے کہ شاخ کا دامن نہ چھوڑنے پائیں۔

سامعین!

اب اگر کوئی مغرور و تکبریت "دل میں یہ خیال کرے کہ جب جڑ موجود ہے تو جڑ کے ہوتے ہوئے شاخ کا احسان کیوں اٹھایا جائے لہذا شاخ کو چھوڑ کر جڑ کی گود میں آ بیٹھے۔ گھنٹہ دو گھنٹے تو خیریت سے گذر جائیں گے۔ پھر کیا ہو گا رنگ زرد ہو جائے گا، ارگیں بھول جائیں گی، حیات رخصت ہو جائے گی، زندگی و بال ہو جائے گی، موت طاری ہو جائے گی، شکل بے شکل ہو جائے گی اور ہوا کے جھونکے اور ہیرے اُدھر اڑتے جائیں گے۔ اور اگر ایک دو دن ضد کر کے جڑ کے پاس ہی بیٹھے رہے تو کوئی "تنور" والا آئے گا اور ان تمام پتوں کو جو شاخ کا دامن چھوڑ کر جڑ کے پاس بیٹھے رہے انہیں اٹھا کر لے جائے گا۔ اور آگ میں ڈال دے گا۔ گویا ہر اس پتے کو جو شاخ کا دامن چھوڑ دے گا، انجام میں آگ میں جلنا پڑے گا۔ اگر شاخ کا دامن مضبوطی سے پکڑ کر رکھتا تو کیا مجال تھی کہ اس کا پیرا انجام ہوتا۔ پوری آب و تاب کے ساتھ حیات بھی تیز رہتی اور ہوا کے جھونکے کے ساتھ شاخ کے ساتھ جھولتا بھی رہتا۔ بہر نوع پتے کے لئے قانونِ عدل یہی ہے کہ وہ شاخ کے ساتھ وابستہ رہے اور پھر شجرہٴ طیبہ کی شاخیں! سبحان اللہ۔ اگر کسی کو ان سے

وابستگی ہو جائے تو اس سے بہتر کوئی ہے ہی نہیں۔ لکننا خوش نصیب ہوگا، وہ انسان جس کا تعلق آلِ رسول سے ہو جائے اور یہی قانونِ عدل ہے

محترم بزرگو!

تاریخ عالم گواہ ہے کہ حضور سرورِ کائنات سے بہتر قانونِ عدل کو کوئی جانتا ہی نہیں تھا۔ حضور بہتر جانتے تھے کہ کس کے ساتھ کیسا سلوک ہونا چاہیے۔ کس کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہیے۔ لہذا رسول نے ہر اچھے آدمی کا احترام کیا، ہر اچھے آدمی کی عزت کی بر شریفِ آدمی کا وقار ملحوظ رکھا مگر کسی کتاب میں، کسی تاریخ میں، کسی حدیث میں یہ نہیں ہے کہ حضور سیدہ طاہرا سلام اللہ علیہا کے علاوہ رسول کسی کی تعظیم کو اٹھے ہوں، بخاری شریف میں تو یہ ہے کہ "جب سیدہ شریف لاتی تھیں تو رسول فوراً تعظیم کو بھی اٹھتے تھے اور جہاں خود بیٹھتے تھے وہاں سیدہ کو بھی بٹھاتے تھے اور خود سامنے بیٹھ جاتے تھے۔"

اب بناؤ!

رسول نے اتنا احترام کسی اور کا کیا ہوگا، ہرگز نہیں۔

معلوم ہوا کہ قانونِ عدل کے مطابق سیدہ اس احترام کی مستحق تھیں تو رسول نے بھی اتنا احترام کیا۔ ورنہ رسول سے بہتر قانونِ عدل کو کون جانتا ہے۔

اب بناؤ! جس خاتون کی زندگی بھر یہ عادت ہو گئی ہو کہ جس کے احترام کو رسول اٹھنا ہو تو کیا اس کی فطرت میں یہ داخل نہیں ہو گیا کہ وہ جہاں جائے اس کی تعظیم کی جائے۔ اور کیا وہ خاتون یہ برداشت کر سکتی ہے جس کی تعظیم محسوس کرتے ہوں کہ آج اسے کوئی یہ کہدے کہ تم "خلط

کہہ رہی ہو؟

محترم سامعین!

سیدہ طاہرا سلام اللہ علیہا ہی کے صدقہ میں قیامت کے دن ہماری شفاعت و نجات ہوگی۔ ہو سکتا ہے نجات کے وقت ہماری نماز و روزہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا عوض بن جائے اور بخشش کے لئے کوئی شے باقی نہ رہے۔ لہذا سوائے نظرِ کرم حضور سیدہ طاہرا ہماری شفاعت ناممکن ہے۔

حضور والا!

رسالت مآب نے فرمایا ہے کہ قیامت کے میدان میں ساری روئے زمین کا انسان موجود ہوگا۔ ان میں انبیاء، اولیاء، اصفیاء غرض ہر قسم کا انسان موجود ہوگا۔ اور ہر شخص اپنے اعمال کے اچھا یا بُرا ہونے میں مبتلا ہوگا۔ اس وقت ایک غیبی آواز آئے گی۔

”قیامت والو! جہاں جہاں کھڑے ہو آنکھیں

بند کر لو۔ سو جھلکا لو“

لہذا تمام انبیاء و اولیاء سمیت ہر انسان اپنی آنکھیں بند کرے گا اور سڑھکا لیں گے۔ اور چپکے چپکے ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔

”بات کیا ہے۔ سو کیوں جھکا یا گیا؟“

چنانچہ تمام انبیاء کا سردار آدمؑ انہیں بتائے گا کہ آنکھیں اس لئے بند کروائی گئی ہیں اور سراسر لئے جھکائے گئے ہیں کہ محمدؐ کی بیٹی سیدہ کی سواری گذر رہی ہے۔

اس شان سے سیدہ کی سواری آئے گی۔ قیامت میں درودِ دو سلام

کے نعرے بلند ہو جائیں گے۔ سب سر جھکائے ہوئے کھڑے ہو جائیں گے اور سیدہ کی سواری اس نشان سے میدانِ قیامت سے گذرے گی اور حیب عرض الہی تک پہنچے گی تو وہاں سیدہ فرمائے گی۔

”خداوند! میں نے آج تک صبر کیا۔ آج قیامت کا دن

ہے۔ آج میں تیری عدالت میں اپنا دعوٰی پیش کرنے آئی ہوں۔

خداوند! اگر کسی کے گھر قتل ہو جائے تو اس قتل کی مدعا

حکومت بن جاتی ہے۔ آج میں تیری حکومت سے فریاد کرنے آئی

ہوں۔ کہ میرے گھر میں ایک دن میں بہتر قتل ہو گئے جنکی فریاد

کرنے آئی ہوں“

سامعین!

جب سیدہ اپنا مقدمہ پیش کر دے گی کہ میرے گھر میں ایک دن میں بہتر

قتل ہو گئے تو عدالت الہی سے پر جوش خطاب ہوگا۔

سیدہ! ہمیں پتہ ہے، اسم آئینی گواہ ہیں مگر مثل کو مکمل کرنے کے لئے

تمہارے پاس کوئی آئینی گواہ موجود ہے تاکہ اسے عدالت میں بلایا جائے،

سیدہ طاہرا فرمائیں گی۔

”خداوند! اگر چشم دید گواہ چاہیے تو میری بیٹی زینب

موجود ہے“

بس بھائیو! قدرت کی طرف سے حورانِ جنت کو حکم ہوگا

کہ زینب کو بڑے احترام کے ساتھ عدالت الہی میں لایا جائے تاکہ وہ

اپنی ماں کے مقدمہ میں گواہی دے سکے، چنانچہ حورانِ جنت شام

جائیں گی اور تھوڑی دیر بعد واپس آکر عرض کریں گی۔

”خدا و ندا! زینب کے حضور گئے تھے مگر انھوں نے فرمایا کہ میں اسی طرح قیامت میں آنا چاہتی ہوں جس طرح کوفہ و شام کے بازار میں گئی تھی“

بہر نوع زینب کی قیامت میں آمد ہوگی۔ زین العابدین مہار پڑے ہوئے زینب ننگے سراونٹ پہ سوار اور قدرت کی طرف سے ارشاد ہوگا۔

”زینب! بناؤ۔ کربلا میں کیا گذری کیونکہ تم چشم دید گواہ ہو“

زینب ماں سے کہے گی:-

”اماں! تو نے مرتے دم مجھ سے وصیت کی تھی کہ بھائیوں کا خیال رکھنا۔“

اماں! میں نے تیری اولاد پر اس وقت تک حرف نہیں آنے دیا جب تک اپنی نسل ختم نہیں کروادی۔“

اماں! تیرا حسین بھی کربلا میں تھا۔ میں بھی کربلا میں

تھی۔ لہذا میں نے سارے کام حسین کے ساتھ بانٹ

رکھے تھے۔ آدھا کام حسین کرتے تھے اور آدھا کام میں

کرتی تھی مگر فرق یہ تھا، وہ مرد تھے۔ میں خاتون تھی۔

مردوں کے کام حسین کے سپرد تھے اور خواتین کے

کام میرے سپرد تھے۔ اماں! میں نے حسین سے

تقسیم کر رکھی تھی کہ:-

حسین! گھر سے باہر کے کام تیرے سپرد اور
گھر سے اندر کے کام میرے سپرد، باہر سے لاشہ
لانا تیری سپرد اور اس لاش پہ بیٹھ کے رونا
میرے حصہ میں۔

شہیدوں کی سرداری حسین! تم کرنا اور اسیروں کی
گریبازاری میں کروں گی۔

حسین! کفن نہ ملنا تمہارا حصہ اور چادر نہ
ملنا میرا حصہ۔

حسین! قبر نہ ملنا تمہارا حصہ اور در بدر پھرنا
میرا حصہ۔

حسین! تم مرد ہو، میں خاتون ہوں۔ جتنے کربلا میں لڑکے
ہیں وہ تمہاری سپرد اور جتنی لڑکیاں ہیں وہ میری سپرد۔
حسین! علیٰ اصغر لڑکا ہے وہ تیری سپرد اور سکینہ لڑکی
ہے وہ میری سپرد

حسین! اصغر کے گلے سے خون بہے گا تو تیری گود میں اور
سکینہ کے کان زخمی ہوں گے تو میری گود میں
حسین! تو ایک بھائی قربان کرے عباس جیسا، مگر
دیکھ حسین! میں دو بھائی قربان کروں گی ایک حسین جیسا
اور ایک عباس جیسا۔

حسین! تو ایک بھتیجا قربان کرے گا قاسم جیسا اور میں تین
بھتیجے قربان کروں گی ایک اکبر جیسا، ایک اصغر جیسا اور ایک قاسم جیسا۔

حسین! تو دو بیٹے قربان کرے گا۔ ایک اکبر جیسا اور ایک
اصغر جیسا۔ مگر

دیکھ حسین! میں بھی دو بیٹے قربان کروں گی مگر میرے
بیٹوں اور نیرے بیٹوں میں بڑا فرق ہے۔ کیونکہ میرے بیٹے
کنیز زادے ہیں اور تیرے بیٹے شہزادے ہیں۔

مگوسن حسین! تیرے دو بیٹے قربان ہونے کے بعد بھی تیری
نسل قیامت تک باقی رہے گی اور میں اپنے دو بیٹے عوٰن
و محمد قربان کر کے اپنی پوری نسل قربان کر دوں گی۔
اب تیرا ہی کوئی بیٹا مجھے اماں کہہ دے تو کہہ دے ورنہ میرا
کوئی بیٹا نہیں رہے گا۔

سامعین!

یہ کہہ کر زینب ماں سے لپٹ گئی اور درد بھری آوازیں
فرمانے لگی۔

”اماں! میں نے تیری اولاد پہ اپنی پوری نسل
ختم کر دی۔ اماں! خدا گواہ ہے۔ اکبر کی میت
پہ بال سفید ہو گئے مگر عوٰن و محمد کے لاشوں
پہ نہیں روٹی۔“

اماں! حسین سے پوچھ لو، میں نے عوٰن و محمد
تیرے بیٹے پہ صدقہ کو دینے تیلے۔

اللہ ہماری مجلسوں کو قبول و منظور فرمائے
رَبَّنَا قَبَلْ مَنَّا اِنْ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط اللَّهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِ مُحَمَّدٍ

تصویر آل محمد

خداوند عالم کی حمد و ثناء کے بعد حضرت محمد و آل محمد پر درود و سلام
معزز سامعین!

آج میں اپنے ایک عزیز کے عقد کے سلسلہ میں حاضر ہوا ہوں۔ لہذا
آج کی یہ مجلس بغرض حصول برکت و سعادت منعقد کی جا رہی ہے۔ کیونکہ یہ
نکاح سادات کے دو خاندانوں کے درمیان میں ہے اور دنیا کی یہ رسم ہے
کہ وہ اپنی تقریب کو زیادہ سے زیادہ باعزت اور بااحترام بنانے کے لیے
بڑے سے بڑے آدمیوں کو بلاتے ہیں جنہیں وہ بلا سکتے ہوں تاکہ یہ یادگار
رہے کہ فلاں تقریب میں فلاں بزرگ تشریف لائے تھے۔ بہر نوع ہر آدمی کا یہ
جی چاہتا ہے کہ کوئی بڑی ہستی تقریب میں شریک ہو۔

لہذا سادات کا دل بھی چاہتا ہے کہ ہم بھی اپنی تقریب میں بڑی سے بڑی
ہستیوں کو بلا میں چنانچہ یہ سیدہ زادے تمام کائنات پر نظر ڈالتے ہیں کہ بڑی
سے بڑی ہستی کون ہے جسے ہم بلا میں۔ جب چاروں طرف نظر میں اٹھتی ہیں تو
سادات کو اپنے سے بڑی ہستی نظر ہی نہیں آتی۔ لہذا اب ہم سوچتے ہیں کہ
اپنے ہی بزرگوں میں سے کسی کو بلا میں ناکر ہماری یہ تقریب بابرکت ہو جائے
مگر اتفاق سے ادھر ان کو بزرگ ایسے مل گئے کہ یہ تو ان کی اولاد ہوئے۔ مگر
وہ تو خدا کے گھر بھی بن بلائے نہیں جانے بلکہ بلانے سے جاننا تو اور بات ہے
قرآن میں تو یہ ہے کہ "سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ" "پاک ہے وہ ذات

جو اپنے بندے کو آکر لے گئی۔

گویا اتنے نازک مزاج اور اعلیٰ قدر بزرگ ہیں جو خدا کے پاس بھی بن بلائے نہیں جاتے بلکہ خدا کی ذات خود آکر انہیں لے جاتی ہے۔

بہر نوع سید زادے پر سوچ رہے ہیں کہ ہم انہیں کیسے تکلیف دیں تاکہ وہ ہماری محفل میں شریک ہوں۔ آخر ہم مولوی صاحبان کے پاس پہنچے اور عرض کی

”مولانا! ہم اپنے بزرگوں کو خوشی کی تقریب میں بلانا چاہتے ہیں۔ بتائیے! کس طرح بلائیں۔“

مولوی صاحبان فرماتے ہیں:

”نہما را خیال غلط ہے۔ اگر دس بیس جگہ شادی ہوئی اور سب سیدوں نے بلایا تو وہ بیچارے کہاں کہاں جائیں گے۔ کیوں خواہ مخواہ کے لئے بزرگوں کو تکلیف دینے ہو لہذا یہ ارادہ ہی مت کرو“

میں کہتا ہوں۔

”مولانا! دس بیس جگہ کی بات کیا ہے۔ اگر دس کوڑ جگہ بھی بیک وقت انہیں بلایا جائے تو وہ ہر جگہ جائیں گے۔ کیونکہ جگہ اور مکان ان کے لئے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی۔ مکانوں کی قید میں وہ جسم رہتے ہیں جو ہمیشہ مکان تک ہی محدود رہے ہوں۔ اور جو انسان لامکان کی سیر کر آئے ہوں، انہیں مکان کی قید نہیں رہتی لہذا وہ ہر جگہ بیک وقت تشریف لاتے ہیں۔“

سامعین!

بات سے بات نکلتی ہے۔ دیکھو نا! ہم یہاں امام باڑہ میں بیٹھے ہوئے

ہیں۔ سورج سر پر آگیا۔ دھوپ لگنے لگی۔ ہم یہاں سے اٹھ کر کسی دوسرے امام بارگاہ میں پہنچے مگر وہاں بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ سورج سر پر آگیا۔ اس کے بعد کسی اور جگہ پہنچے تو وہاں بھی یہی کہا جا رہا ہے کہ سورج سر پر آگیا۔ ایک ہی سورج ہے اور کروڑوں انسان بیک وقت کہہ رہے ہیں کہ ہمارے سر پر آگیا حالانکہ سورج وہیں ہے جہاں ہے۔

گویا جب معمولی سی نور کی کرنوں کو پہنچانے والا نور بیک وقت کروڑوں جگہ ہونے کے باوجود اپنی جگہ رہتا ہے تو اس نور کو نور عطا کرنے والے "نوروں" کے لئے کوئی بے نور آنکھ ہی ہوگی جو کہ دے گی کہ یہاں کیسے اور وہاں کیسے؟

بہر نوع وہ مجسمہ نور بیک وقت ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں جگہ تشریف لاسکتے ہیں۔ اگر انہیں تصور کرو تو وہ دل میں خیال بن کے آجاتے ہیں۔ اور اگر ان کے مصائب سنو تو قلب میں حلال بن کے آجاتے اور اگر ان کی حالت غضب دیکھو تو انسان کے چہرے پر جلال بن کے آجاتے ہیں اور کہیں محمد کو پکارو تو وہ اس کے ساتھ اس کی آلے بن کے آجاتے ہیں۔ غرض وہ ہر وقت آنے کے لئے تیار ہیں مگر ذرا کوئی انہیں بلا کے تو دیکھیے۔ وہ ضرور تشریف لاتے ہیں۔ مگر ان کے بلانے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک دن ایک عقیدت مند حضور امام زین العابدین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی۔

۱۔ فوزند رسول! حضور کے غلام مرزا دے کی شادی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ حضور بھی اس میں تشریف لائیں۔ تاکہ میری یہ تقریب بابرکت ہو جائے۔

امام نے فرمایا۔

”بھائی! انکار کرتے ہوئے شرم آتی ہے کیونکہ تو بڑی محبت سے آیا ہے مگر میں کیا بناؤں کہ میں نے ساخہ کر بلا کے بعد خوشی کی تقریبوں میں شرکت بند کر دی ہے“

یہ سنکر وہ عقیدت مند بولا۔

”حضور! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے حضور کو

دعوت دے کر اذیت پہنچائی ہے“

امام نے فرمایا:

”کوئی بات نہیں۔ خدا تیرے بچے کو پروا نہ چڑھائے

اللہ تیری نسل کو بڑھائے

وہ شخص خاموش ہو گیا۔ اور جب جانے لگا تو امام نے فرمایا۔

”بھائی خوب اٹھ جا۔ دل تھوڑا نہ کر۔ میں تیری تقریب

میں ضرور آؤں گا۔ مگر ایسا کر کہ تھوڑی دیر کے لئے میرے بابا

کی مجلس بھی کرے۔ میں مجلس میں آ جاؤں گا اور تیرے ہاں شرکت

بھی ہو جائے گی۔“

بزرگانِ من!

امام زین العابدین کے اس فرمان کی روشنی میں ہر سیدہ زادہ اپنی

خوشی کی تقریب میں اس لئے مجلس عزا منعقد کرنا ہے تاکہ محمد و آل محمد

ان موقعوں پر تشریف لائیں اور یہ تقریب بابرکت ہو جائے۔ لہذا

آج ہم پورے فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ آج ہماری اس تقریب میں

وہ آئے ہیں جن کے گھر قرآن آیا ہے۔ جن کے گھر نبوت آئی ہے جنکے

گھرامانت آئی ہے۔ جن کے گھر شہادت آئی ہے۔ جن کے گھر عصمت
آئی ہے۔ جن کے گھر صداقت آئی ہے۔ جن کے گھرامانت آئی ہے
جن کے گھر ہدایت آئی ہے۔ جن کے گھر فرشتے خادم بن کے آئے ہیں
گو یا آج ہم اعلان کرتے ہیں کہ

”جبرائیل بہ ملائک درباں شداست“

آج ہمارا دروازہ معمولی نہیں ہے بلکہ جبرائیل
تمام فرشتوں کے ساتھ آج ہمارے گھر کی درباری
کوزے ہیں۔

برکیت آج ہماری اس تقرب میں حضرات محمد و آل محمد تشریف
فرمایا۔ وہ یہاں آکر ہمارے عشق کا امتحان لیتے ہیں کہ تم نے تو ہمیں بلا
لیا۔ اور ہم اللہ جانے کہاں سے چل کر آئے ہیں۔ (یہ غلط بات ہے کہ
محمد و آل محمد جنت سے آئے ہیں)۔

دیکھو نا!

ایک دفعہ میں نے منبر پر دو بانیں کہہ دیں تھی جس کی مجھے جواب دی
کرئی پڑی۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ کسی نے پوچھا۔

”زیدی صاحب! حسین نماز پڑھتے تھے؟“
میں نے کہا۔

”جھوٹ کہتے ہو۔ حسین کو نماز پڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔
چونکہ حسین کے صدقے میں نماز باقی رہ گئی۔ لہذا حسین
نماز نہیں پڑھتے تھے۔ بلکہ نماز حسین کو پڑھنی تھی۔“

دوسری بات یہ تھی کہ کیا ”آل محمد جنت میں رہیں گے؟“

میں نے کہا۔

”توبہ کو رو۔“ آلِ مُحَمَّدؐ کیوں جنت میں جائیں کیونکہ جنت تو ان کے اَدنیٰ غلاموں کے لئے بنی ہے۔ لہذا گورنمنٹ ہاؤس گُجا اور سونٹ کو ارٹوز گُجا۔ یہ تو سونٹ کو ارٹوز ہیں جن کا نام جنت ہے۔ خدا نہ کرے کہ آلِ مُحَمَّدؐ جنت میں جائیں کیونکہ جنت تو آلِ مُحَمَّدؐ کے غلاموں کے رہنے کی جگہ ہے اور آلِ مُحَمَّدؐ کے رہنے کی جگہ وہاں ہے جس جگہ کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

دیکھو نا!

جب ہمارا یہ ایمان ہے کہ آلِ مُحَمَّدؐ دُنیا کی ہر شے سے پہلے پیدا ہوئے تھے۔ تو وہ جنت سے پہلے بھی پیدا ہوئے تھے۔ لہذا جب جنت نہیں تھی تو وہ کہاں رہتے تھے۔ بس جہاں رہتے تھے وہیں رہتے تھے۔ خدا نہ کرے کہ آلِ مُحَمَّدؐ جنت میں رہیں۔ جنت تو ہمارے لئے بنی ہے۔ جنت تو آلِ مُحَمَّدؐ کے غلاموں کے (SERVANT QUARTERS) ہیں۔ جو ان کے محل کے قریب ہیں۔ ان شاء اللہ ہم ان کو ارٹوز میں جائیں گے اور ہمارے کو ارٹوز کی صفائی اور درستی کے لئے اللہ نے حوریں مقرر کی ہوئی ہیں جن کا کام صرف اتنا ہے کہ ہمارے جانے سے پہلے وہ ہمارے مکالوں کو صاف ستھرا رکھیں اور جب ہم چلے جائیں گے تو ہم انہیں جُٹھی دے دیں گے۔

گویا وہ حوریں ہمارے بھی (SERVANT QUARTERS) میں رہیں گی۔

تمہاری یاد سے غافل نہیں ہوتے۔ ہمارا
 رونا بھی تمہارے لئے ہے اور ہمارا
 "ہنسنا" بھی تمہارے لئے ہے۔

اے رب العزت!

ہم بڑے کمزور اور نالائق گناہ گار ہیں اور دینِ محمد کی امانت
 ہمارے پاس ہے۔ اس کی تو حفاظت فرما۔ ہمارے وارث کے
 ظہور میں تحلیل فرما کیونکہ دنیا نے ہمیں یتیم اور لاوارث سمجھ لیا
 ہے۔ لہذا ہم دنیا کو دکھا سکیں کہ ہم تنہا نہیں ہیں بلکہ ہمارا وارث
 بھی موجود ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ
 اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ



اسیر بغداد

عزاد ارسید الشهدا!

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام عرصہ چودہ سال سے بنی عباسیہ کے حبیب تاجدار ہارون رشید کے دور ملوکیت میں تنگے تاریک قید خانہ میں بند ہیں۔ اگر مؤلا کھڑے ہوتے ہیں تو قید خانہ کی چھت نیچی ہے اور اگر بیٹھے ہیں تو پاؤں نہیں پھیلتے۔ گویا اسی تنگ و تاریک کونٹھری میں فوزند رسول قید ہیں۔ ادھر ہارون رشید چاہتا یہ ہے کہ امام شہید کر دیئے جائیں اور میرے ذمہ خون بھی بظاہر نہ ہو لہذا اس نے بہت سی تدبیر اختیار کیں۔ یہاں تک کہ افریقہ کے جنگلوں سے کچھ جنگلی آدمی جو یہ جانتے ہی نہ تھے کہ انسانیت کیا شے ہے، جانوروں کی طرح انہیں وہاں سے گرفتار کروا کے بغداد منگوا لیا گیا۔ انہیں شراب پلائی گئی اور جب وہ بالکل وحشی بن جاتے تو انہیں ایک ایک تلوار دے دی جاتی اور کہا جاتا کہ سامنے والی چار پائی پر پڑی ہوئی چادر کے نیچے والی لکڑی پر زور سے تلواریں مارو۔ گویا وہ اس طرح مشق کرتے رہے۔

جب چالیس دن گذر گئے تو ان کا محرک جو مشق کروا رہا تھا انہیں لیکر قید خانے میں پہنچ گیا۔ ادھر امام چادر اوڑھے ہوئے بیٹھے ہوئے تھے ان وحشیوں کو شراب پلا کر تلواریں دی گئی تھیں۔ کیونکہ لکڑی پر تلواریں

مارنے کی انھیں عادت تو پہلے ہی سے تھی لہذا امام کی طرف اشارہ کر کے کہا گیا کہ ان کے جسم پر تلواریں مارو۔ چنانچہ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق تلواریں کھینچی اور ادھر امام نے اپنے منہ سے کپڑا اٹھایا۔ اب جو وحشیوں نے چہرہ امام دیکھا تو تلواریں پھینک کے امام کے قدموں پہ گر گئے۔ اب جو رنگ ماسٹر نے یہ منظر دیکھا تو فوراً ہارون کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔

”ہارون! غضب ہو گیا۔ وہ وحشی بجائے قتل کرنے کے امام کے قدموں پہ گر گئے ہیں۔“ چنانچہ ہارون نے انہیں بلوایا اور جب پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ

”ہم نے اُسے پہچان لیا ہے۔“

ہارون پوچھتا ہے ”وہ کون ہے؟“

انہوں نے کہا ”جب ہمارے جنگلوں میں بارش نہیں ہوتی تھی تو یہ انسان وہاں پہنچ کر بارش برساتا تھا۔“

سامعین!

یہ ہے شانِ امامت۔ اگر دُنیا اس کو گھٹانا چاہے تو اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے جو کسی کے گھٹانے سے نہیں کھٹائی جاتی۔ یہ اور بات ہے کہ دُنیا والے آل محمد کو قید خانوں میں مقید کر سکتے ہیں مگر آل محمد وہی کریں گے جو اللہ چاہتا ہو۔ خدا کی مرضی و مشیت کے بغیر ان کا کوئی قول و فعل ان سے سرزد نہیں ہو سکتا۔

بہر نوع امام موسیٰ کاظمؑ اس قید خانہ میں قید ہیں اور اس قید خانے

کا دروغہ ابن شادروک جو شتر سے بھی بدتر تھا۔ اس کے ذریعہ سے
 موٹا کو ۲۳ رجب کو زہر دیا گیا۔ جب موٹا کی حالت بہت خراب
 ہو گئی تو ہارون نے اس ڈر سے کہ کہیں لوگوں کو زہر کا پتہ نہ چل جائے :
 ایک عیسائی طبیب کو بلوایا اور کہا کہ موٹا کا معائنہ کرے اور یہ کہے کہ موت
 طبعی ہوگی۔ بہر کیف وہ طبیب آیا اب ابن شادروک موٹا سے کہتا ہے
 ”دیکھو! طبیب آرہا ہے۔ خبردار جو تم نے اس

سے کھا کہ جھلے زہر دیا گیا ہے“

یہ کہہ کر وہ لعین وہیں بٹھ گیا۔ طبیب پہنچا۔ موٹا کا معائنہ کیا۔ موٹا نے
 زبان سے کچھ نہ کہا البتہ اپنی تھیلیاں طبیب کے سامنے کر دیں۔ اب جو
 طبیب نے دیکھا تو بیخ ماری ”بھائے۔ اس قیدی کو تو زہر دیا گیا ہے“
 رادھر محافظ نے سمجھا کہ امام نے خود بنا دیا ہے۔ چنانچہ قیدی امام سے
 ایسا سلوک کیا کہ دنیا کا یہ پہلا قیدی تھکڑی میں بندھے ہوئے ہاتھوں
 اور پاؤں میں پڑی ہوئی بیڑیوں کے ساتھ قید حیات سے آزاد ہو گیا۔
 جب امام کی موت کی خبر ہارون کو پہنچی تو وہ ظالم کہتا ہے کہ چار مزدور
 لے جاؤ اور امام کی لاش کو دفن نہ کرو بلکہ دجلہ کے پل پر رکھ دو۔ تاکہ رات
 کے وقت خنجر گدھے اور گھوڑوں کے گزرنے سے لاش پامال ہو جائے گا
 تاکہ صبح ہم کہہ سکیں کہ قید سے فرار ہو گیا تھا اور راستے میں مارا گیا۔ چنانچہ ایسا
 ہی کیا گیا۔ تقریباً آدھی رات گزرنے کے بعد بیویوں کا ایک قافلہ گزرا
 تو ان کے جتنے ہی جانور تھے جب پل کے قریب پہنچے تو روک گئے۔ لوگ بڑے
 حیران تھے کہ یہ جانور آگے کیوں نہیں چلتے۔ آخر انھوں نے دیکھا کہ پل پر
 ایک قیدی کی لاش پڑی ہوئی ہے۔

حضور والا !

بغداد میں ایک لوہار رہتا تھا۔ رات کو جب وہ سویا تو کسی نے اس کے دروازے کی "کنڈی کھڑکائی" لوہار اپنے بستر سے اٹھا دروازہ کھولا اور دیکھا کہ ایک برقعہ پوش خاتون سامنے کھڑی ہے جو اس سے یہ کہہ رہی ہے "تو نے گذشتہ سال ایک سنت مانی تھی کہ اگر خدا نے بیٹا عطا فرمایا تو میں فاطمہ کے کسی بیٹے کی خدمت کروں گا"

لوہار نے عرض کی۔

"ہاں بی بی ! مجھے یاد ہے مگر تجھے کیسے پتہ چلا؟ برقعہ پوش خاتون نے فرمایا۔

"میں ہی وہاں بنا نصیب فاطمہ ہوں۔"

بہر حال لوہار سر جھکائے ہوئے خاتون علیا کے ساتھ ساتھ چل پڑا اور جب پل پر پہنچا تو بی بی نے عرض کی۔

"یہ ہے میرا بیٹا۔ اس کی ہتکڑی اور بیڑی اتار دو"

لوہار نے بسم اللہ پڑھ کے امام مظلوم کی ہتکڑی اور بیڑی اتار دیں اور بعد میں ایک تانے نے غریبوں کے قبرستان میں امام مظلوم کو دفن کر دیا۔

بزرگان من !

دنیا کی ستم ظریفی دیکھو کہ اگر یہاں کوئی پرہیزی مرجائے تو چنڈہ کر کے لوگ اس کا کفن خریدیں گے اور نہایت شان سے اسے دفن کریں گے مگر آل محمد کی بد نصیبی دیکھو کہ آج بغیر کفن کے غریبوں اور لاداروں

کے قبرستان میں فرزندِ رسولِ دفن کر دیا گیا۔

یاد رکھو !

اسے کہتے ہیں تصرفِ امامت۔ ہارون و مامون کی قبر تک کے نشانات کہیں نہیں ملتے اور نہ ہی کوئی نشان بتانے والا ہے کہ کہاں دفن کئے گئے ہیں اس لئے کہ زمین ہے "البتواب" کی مالکیت خدا جانے کہاں ہیں مگر ذرا وہاں جا کر دیکھو جہاں دُنیا کے بڑے بڑے شہنشاہ اپنے تاج ہاتھوں میں لئے، سر جھکائے ہوئے کھڑے ہیں۔ جہاں طوبیٰ کا سایہ ہے جہاں حوریں دست بستہ کھڑی ہیں۔ جہاں کوثر کا کنارہ ہے۔ جہاں جنت کی بہاریں ہیں۔ جہاں ایمان ملتا ہے اور جہاں اسلام کا تعارف ہوتا ہے۔

آج ہم اس مظلوم امام کی شہادت کا دن منا رہے ہیں اور دُنیا بیٹھی رو رہی ہے۔

”بی بی! تو لوہار کو بلانے گئی تھی اس سے یہیں اندازہ ہوتا ہے کہ تمہیں اس بیٹے کا بڑا درد تھا لہذا آج ہم نے تیری سنت کو پورا کرنے کے لئے تیرے غلاموں کو بلایا ہے جو بغداد کے غریب کا ماتم کریں گے اور اسے روئیں گے

عزاء دارِ سید الشہداء!

میرا ایمان ہے کہ جب سیدہ طاہرا سلام اللہ علیہا اپنے اس مظلوم بیٹے کی صفِ ماتم بچھا لیتی ہیں تو جناب زینبِ تشریف لاتی ہیں اور فرماتی ہیں۔

”اماں! تم آرام کرو۔ میں آگئی ہوں۔ میں اپنے چاند کی صفِ ماتم بچھاتی ہوں“

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

وَفَاتِ سَيِّدَةٍ

حضراتِ محترم!

اللہ کا یہ فرمان ہے "ایمان والو! حیب تم پر کوئی مصیبت پڑے تو اپنے اللہ کو یاد کرو ان لفظوں۔

"إِنَّا إِلَهُهُ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ"

سَامِعِيثُ!

کائنات کی سب سے بڑی ہستی حضور سیدہ طاہرہ آج اس دُنیا سے رخصت فرما چکی ہیں۔ اور آپ کی صاحبِ توفیق اولاد مومنین کی زیارت کیلئے آج جنازے کی شبیہ برآمد کرنے لگی تاکہ مومنین اپنے توکل کو بیدار کر کے حضور رسالت مآب، حیدر کماؤر اور سیدہ طاہرہ کے بچوں کو سیدہ کا پر سہ دیں سکیں۔

بزرگانِ محترم!

۲۸ صفر کو رسالت مآب کی رحلت ہوئی اور آج ۳ جمادی الثانی کو تقریباً پچانوے دن بعد جناب سیدہ طاہرہ کی رحلت ہوئی۔ گویا تین مہینے سیدہ نے اس دُنیا میں اس طرح گزارے ہیں کہ باپ کے زمانے کی زندگی بھی ان کے سامنے تھی اور باپ کی رحلت کے بعد کی زندگی بھی سامنے تھی۔ باپ کے سامنے کی زندگی کا یہ عالم تھا کہ مولانا روم نے اپنی مثنوی میں لکھا ہے کہ۔

جب آبیہ جہنم زائل ہوئی تو اپنی اُمت کے درد سے رسالت مآب نے رونا شروع کیا۔ اتنا روئے کہ کسی طرح حضور کارونا رکتا نہیں تھا۔ جیسا صحابہ نے یہ منظر دیکھا تو عرض کی۔

یا رسول اللہ! ہم اپنے سارے نیک اعمال اگر اُمت کو دے دیں تو کیا گناہ گار بیچ جائیں گے؟ حضور نے فرمایا ”نہیں“

بہر لُزَع جب کسی طرح رونا بند نہ ہوا تو سلمان فارسی جناب سیدہ کے پاس پہنچے۔ دروازے کی گنڈی ہلائی۔ بی بی نے پوچھا۔

”کون؟“

سلمان نے عرض کی۔

”شہزادی عالم! میں سلمان ہوں“

”سلمان! خیریت ہے؟“

سلمان نے عرض کی۔

”شہزادی! آج خیریت نہیں“ صبح سے تمہارے والد بزرگوار

روزے ہیں۔ حضور کارونا کسی طرح رکتا نہیں۔

سیدہ نے فوراً برقعہ پہنا۔ پیروں میں موزے پہنیں۔ اور مسجد میں

تشریف لائیں۔ سیدہ کو آتے دیکھ کر رسول اپنے آنسو پونچھتے ہوئے

تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ چند قدم بڑھ کر استقبال کیا اور پوچھا۔

”بی بی! تو نے کیوں زحمت فرمائی ہے؟“

سیدہ نے فرمایا۔ ”بابا جان! میں نے سنا ہے آپ صبح سے

رو رہے ہیں۔

ہاں بیٹا۔ آج ایسی بات تھی۔ رسول نے سیدہ کو اپنی جگہ بٹھایا اور خود سیدہ کے سامنے بیٹھ گئے اور پوچھا۔

”ہاں بیٹا۔ اب بتاؤ۔“

”بابا جان! آپ رو کیوں رہے ہیں؟“

رسول نے جواب دیا۔

”بیٹی! بات یہ ہے کہ آج آئیہ جہنم نازل ہوئی ہے

جس میں بتایا گیا ہے کہ میری امت کے گناہ گار انسان جہنم میں جا بیٹھ گئے ہیں۔ اس وجہ سے روئے لگا ہوں۔“

سیدہ نے فرمایا۔

”بابا جان! آپ بالکل نہ گھبراہٹ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تیری سچی

امت کے جو گناہ گار ہوں گے انہیں میں بخشاؤں گی۔“

”بیٹا! تو کیسے بخشائے گی؟“

رسول نے جب یہ پوچھا تو سیدہ قبلہ روح ہو گئیں اور دعا کے لئے

ہاتھ اٹھالئے۔

”خداوند! میرے باپ بڑے پریشان ہیں ان کی

امت کو بخش دے۔“

یہاں مولانا روم لکھتے ہیں۔

پس نکاہ آمد ز حاجت رسول

من دعائے فاطمہ کوردم قبول

اللہ نے اسی وقت وحی کی ”محمد! فاطمہ کی دعا

ہم نے قبول کر لی ہے۔
 اور باپ کی رحلت کے بعد کے حالات کچھ اس طرح تھے۔ کہ
 باپ کے انتقال کو تین دن گزرے ہیں سیّدہ
 کو رونے سے ہوش بھی نہیں آیا ہے۔ ابھی
 پُرسہ دینے والی عورتیں چاروں طرف بیٹھی
 ہیں۔ محمد کی یتیم بھی ابھی زمین پر ہی بیٹھی
 ہے کہ آپ کو معلوم ہوا کہ میرے باپ نے ہمارے
 گزارے کیلئے جو زمین دی تھی وہ حکومت نے ضبط
 کر لی ہے۔

یہ سن کر سیّدہ نے یہ سوچا کہ شاید حکومت کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔
 لہذا میں خود جا کر حاکم وقت سے کہتی ہوں تاکہ حکومتِ وقت کی غلط فہمی دور
 ہو جائے۔

چنانچہ سیّدہ مسجد نبوی کے دروازے پہنچتی ہے۔
 لادیں۔ سامنے چادر پکڑے عورتیں کھڑی ہو گئیں
 اور چادر کے پیچھے سے سیّدہ بڑے آرام سے فرماتی
 ہیں۔

”میرے باپ کی مسجد میں بیٹھنے والو! تمہیں
 میرے باپ کی عزت و عظمت یاد ہو گی۔
 میں فاطمہ انتم سے اپنے باپ کے لہجے
 میں کھ رہی ہوں کہ میرا گزارا بھلے واپس
 کر دو۔“

سَامِعِينَ !

جب سیدہ نے یہ فرمایا کہ :-

”میرا گذارا مجھے واپس کو دو“ _____ تو
ساکم وقت نے ایسا جواب دیا ہے کہ :-

”فاطمہ اپنے دونوں ہاتھوں سے دلے پکڑ کے

گھرو واپس آ گئی۔“

زینب نے پوچھا :-

”امات ! کیا جواب ملا ؟“

سیدہ نے فرمایا :-

”بڈی زینب ! اُمّت کے آج میں نے طور طریق

ایسے دیکھے ہیں جن سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ

تیرے چادر کے خیریت نہیں۔“

اس کے بعد بی بی کو اتنا صدمہ ہوا کہ آپ دوبارہ اُٹھ نہ سکیں۔ ہر وقت

رونے میں گذرتا۔ امیر المومنین تسلی دیتے۔ گھر میں خوانین تسلی دیتیں۔

سَامِعِينَ !

آہستہ آہستہ وقت گذرنا گیا۔ جب ۲ جمادی الثانی آئی تو جناب

سیدہ کی طبیعت اتنی زیادہ خراب ہو گئی کہ جناب امیر المومنین کو یقین ہو گیا

کہ بیماری حد تک پہنچ گئی ہے۔

بہر نوع رات گذری۔ ۳ جمادی الثانی کا دن چڑھا۔ امیر المومنین نے

دیکھا کہ سیدہ اٹھیں غسل فرمایا۔ لباس بدلا۔ بچوں کے کپڑے دھوئے پھر

بہٹی کا سردھویا حسین کو نہلایا۔ بچوں کے کپڑے بدے۔ گھر میں صفائی کی

دو تین دن کا کھانا پکا کے رکھا۔ امیر المؤمنین نے سیدہ کو جب اس طرح گھر کا کام کرنے دیکھا تو مسکرا کے فرمایا: "مَا شَاءَ اللَّهُ" رسول کی بیٹی! آج طبیعت ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔"

بی بی نے فرمایا:-

"یا علیٰ فکر نہ کرو۔ آج عصر تک طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

علیٰ نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

سیدہ نے فرمایا:-

میں نے رات اپنے باپ کو خواب میں دیکھا ہے۔ وہ مجھے فرماتے تھے "نا طمئناہ! نہیں تیرے استقبال کو آیا ہوں"

لہذا آج میں اپنے باپ کی خدمت میں جا رہی ہوں۔ میں نے اسلئے

بچوں کو نہ لایا ہے تاکہ میرے صدمے میں پریشان ہو کر کہیں بچے رول نہ جائیں

اور ان کی پیر سے یہ نہ بن پائے کہ یہ بن ماں کے ہو گئے ہیں۔ میں نے زمینب

کے بال اس لئے ڈھلا دیئے ہیں کہ معصوم بچی اپنے بال دھرنہ سکے گی۔ میں نے

حسین کو لباس اس لئے پہنا دیا ہے تاکہ میں انہیں بھی رشک نہ دیکھوں

اور میں نے دو دن کا کھانا بھی پکا کے رکھ دیا ہے کہ میں اپنے بچے فاتح سے

نہ دیکھ سکوں۔"

سیدہ کے یہ الفاظ شکر علیٰ کا دل ٹوٹ گیا۔ مسجد میں تشریف لائے

و غامیٹ پڑھنا شروع کیا۔

سَامِعِينَ!

جب آج کا دن ڈھلا تو سیدہ طاہرہ نے عاصم اور فضہ کو بلایا اور

فرمایا:-

وتم دونوں خواتین میرے بچوں کو ذرا باہر بلاؤ۔ میں اپنے حجرے میں جا رہی ہوں؟ تم بچوں کو اندر نہ آنے دینا۔

چنانچہ یہ دونوں خواتین شہزادوں کو باہر لے کر بیٹھ گئیں۔ سیدہ حجرے میں چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد چھوٹے شہزادے نے کہا۔

”امام! فضلہ! میں اپنی ماں کے پاس جانا چاہتا ہوں“

اب فضلہ کی کیا مجال کہ شہزادے کو روکے۔ اُدھر سیدہ کہہ رہی ہیں کہ ”بچو کو آنے نہ دینا“ اُدھر حسین کی یہ ضد کہ ”میں جانا چاہتا ہوں“۔

پھر نوح حسین حجرے کا دروازہ کھول کر اندر تشریف لائے۔ دیکھا کہ سیدہ کا سر سجدے میں ہے اور بڑی خفیف آواز میں کہہ رہی ہیں۔

”سبحان ربی لا علی“

ایک منٹ تو حسین نے دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کے ماں کا سر گود میں لے لیا اور کہا۔

”امام! میں حسین ہوں۔ مجھ سے بات کرو“

ماں نے آنکھیں کھول کے بیٹے کو دیکھا اور فرمایا ”حسین بیٹا! صبر کرو“

بس یہ آخری فقرہ تھا جو ماں بیٹے سے کہہ چکی۔ حسین نے ماں کا سر سجدے میں رکھ دیا۔

سَمَاعِینَ!

پچاس سالہ بعد تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا۔ آج حسین نے ناظر کا سر سجدے سے اٹھا کے اپنے گود میں لیا اور ناظر نے کہا ”حسین بیٹا! صبر کرو“ — اور پچاس سال

بعد کر بلائیں حسینؑ کا سر سجدے سے اٹھا کے فاطمہؑ نے گود میں لیا اور
 حسینؑ نے کہا۔ " اقات! صبر کرو"
 بہر نوح حسینؑ باہر تشریف لائے۔ تھوڑی دیر بعد فضہؑ اندر گئیں اور
 سیڑھ کو دیکھ کر باہر نکلی اور سیدھی مسجد میں گئی۔

"یا علیؑ! قالوا انار الله وانا اليه راجعون"

"یا علیؑ! ہمارے کائنات لٹے گئے"

"یا علیؑ! دُنیا ہمارے لئے تاریک ہو گئی"

"یا علیؑ! آج ایمان یتیم ہو گیا"

"یا علیؑ! آج قرآن بے قاری ہو گیا"

"یا علیؑ! آج محمدؐ کا دین ویران ہو گیا"

"یا علیؑ! آج سیدہ اپنے باپ کے پاس چلی گئی"

علیؑ بغیر نعلین کے بغیر عامہ کے مسجد سے اُٹھے اور گھر میں آئے اور
 دیکھا کہ سیدہ کی رحلت ہو چکی ہے۔ اس وقت علیؑ نے ایک مرثیہ پڑھا ہے
 جس کا مطلب یہ تھا۔

"اے رسولؐ کے بیٹے! اسے بھری دنیا میں تم مجھے

تنہا چھوڑ گئیں۔ اب میں بالکل تنہا رہ گیا۔ اب تیرے

بچوں کے نگہبان کون کرے گا۔ اور مجھے تسلی کون دے گا؟

اس کے بعد امیر المؤمنین نے فرمایا "اُمّ فضہؑ عاصمہؑ غسل کفن کا

تعمام کرو"

سَامِعِينَ!

اتنے میں رات ہو گئی۔ جب کفن پہنا چکے اور جنازہ تیار ہو گیا تو

امیر المؤمنین نے فرمایا۔

”فاطمہ کے بچوتے کو بلاؤ“

چنانچہ بچے تشریف لائے۔ علیؑ نے سب سے پہلے حضور حسنؑ مجتبیٰ سے

فرمایا۔

”حسن بیٹا! تمہاری ماں کے وصینے تھی کہ جنازہ رات کو اٹھایا جائے“

لہذا آج رات تھوڑی دیر بعد جنازہ اٹھایا جائے گا۔ تو اپنے ماں کا آخری دیدار کر لے۔“

چنانچہ حسن آگے بڑھے۔ ماں کا منہ دیکھا۔ بدن میں لرز اُپیدا ہوا۔ اور بے ہوش ہو کر گر پڑے اس کے بعد امیر المؤمنین نے فرمایا

”حسینے بیٹا! آؤ۔ تم بھی ماں کا منہ دیکھ لو۔ حسینے جواب میں فرماتے ہیں:-

”بابا جانے! کیا میری ماں کے عزتے مریم سے کم ہے؟ علیؑ نے فرمایا۔

”نہیں بیٹا۔ بلکہ زیادہ۔“

”بابا جانے! اگر مریم نے جنازے میں علیؑ سے باتے کی

تھی تو کیا میری ماں مجھ سے باتے نہیں کر سکتی۔ میں اس

شرط سے ماں کے پاس جاؤں گا کہ وہ خود مجھے پکارتے

حسینے نے یہ کہہ کے سیدہ سے خطاب کیا:-

”امات! مجھے آواز دے۔“

بی بی نے کوئی آواز نہ دی۔ پھر حسین بولا ”امات! مجھے پکارو“

پھر بھی جواب نہ ملا۔ آخر حسین نے پورے جوش سے کہا:-
 امانات! تجھے میری قسم، مجھے آواز دو۔
 اب جو حسین نے یہ کہا تو سیدہ کا جنازہ ٹرپ اٹھا اور
 ”سیدہ نے“ ہائے“ کہہ کے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور
 حسینے مات کی میت کے سینے پہ جا کے لیٹے گئے اور سیدہ
 نے دونوں ہاتھ حسینے کے سر پر رکھ دیئے۔ تمام شہر مدینہ
 میں زلزلہ آنے لگا۔ علیؑ نے بڑھ کر حسینے کو گود میں اٹھا لیا
 ”حسینے بیٹا! اگر تم تھوڑی دیر اور مات سے لیٹے رہے
 تو قیامت آجاتے گی۔“
 امیر المومنین پوچھتے ہیں:-

”بیٹا! مات سے کیا باتیں ہو رہی تھیں؟“
 حسین جواب میں فرماتے ہیں:-

”با با جانے! میں امانت سے وعدہ لے رہا تھا کہ
 امانت اسے وقتے تو تم جارہی ہو مگر جب میرا آخری وقت
 ہو گا تو آٹے کی نا۔“

بہر ذبح جب جناب امیر المومنین نے حکم دیا کہ سیدہ کا جنازہ اٹھاؤ۔
 رخصتہ نے عرض کی:-

”سؤالا! اگر آپ اجازت دیں تو میں بنی ہاشم کی عورتوں کو
 بلاؤں۔“

آپ نے فرمایا ”کسی کو نہ بلاؤ۔ ہمارے جنازے اس طرح نہیں اٹھیں گے
 سماعینے! رسول کا جنازہ نہ بنا علیؑ نے دفن کیا۔ علیؑ کا جنازہ

حسین نے دفن کیا۔ حسن کے جنازے پر تیر برس گئے اور حسین کے جنازے پر جو گزری وہ دنیا کو معلوم ہے۔ اور آج سیدہ کا جنازہ اس طرح اٹھا کر ایک طرف تو خود اٹھا ہوا تھا اور دوسری طرف سے علی نے اٹھایا ہوا تھا اور دو بچے جنازے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ حسین نے پوچھا۔

”بابا جان! آپ نے آنکھیں کیوں بند کی ہوئی ہیں؟“

امیر المؤمنین نے جواب دیا۔

”شہزادو! تمہارے نانا نے جنازہ اٹھایا ہوا ہے اور میری شرم سے آنکھیں

بند ہیں کہ کہیں رسولِ محمد سے یہ نہ پوچھ بیٹھیں۔“

”علی! میرے بعد تو نے میری بیٹی کی کیا حفاظت کی؟“ تو میں کیا

جواب دوں گا۔ اس لئے میں نے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں۔“

اب جو علی نے یہ کہا تو حسین فرماتے ہیں۔

بابا جان! کیا ہم اتنے غریب ہو گئے ہیں کہ ہمارا جنازہ بھی چار

آدمی نہیں اٹھا سکتے۔“

علی نے فرمایا حسین بیٹا! منکر نہ کرو۔ آج تم پر غربت ہے کہ

تمہاری ماں کے جنازے میں کوئی شریک بھی نہیں ہوا۔ مگر تمہاری نسل آتی

تک تمہاری ماں کا جنازہ اٹھاتی رہے گی اور اتنا ماتم ہو گا کہ دنیا کے کسی جنازہ پر

نہ ہوا ہو گا۔“

سہ ماہ عینے!

علی کے اس فرمان کے مطابق آج فاطمہ کے بیٹے سیدہ زادے اور

سیدائیاں سیدہ کا جنازہ اٹھائے کہہ رہے ہیں۔

مؤلا! اگر اس وقت ہم موجود ہوتے تو فاطمہؑ کا جنازہ ہم اسی شان، عظمت اور وقار سے اٹھاتے جس طرح ہم آج اٹھا رہے ہیں۔

جنازے کے ساتھ سید بھی ہیں۔ سیدائیاں بھی ہیں اور میں سیدائیاں سے التجا کرتا ہوں کہ جب جنازہ زنان خانے میں جائے گا تو ننگے سراس جنازہ کو اٹھائیں اور زینب کو سیدہ کا پُرسہ دیں

» بنی زینب! تیرے آماں کا جنازہ تیرے کنیزوں نے اٹھایا ہوا ہے
سیدہ کے بیٹو!

یہ اس غریب کا جنازہ ہے جس کا جنازہ اٹھانے والا کوئی نہیں ہے۔ آج ہمارے لئے قیامت کی رات ہے۔ آج رسولِ قبر سے باہر تشریف لائے ہیں۔ آج علیؑ کے سر پر عامہ نہیں ہے۔ آج زینب کے سر پر چادر نہیں ہے۔ آج حسینؑ یتیم ہو چکے ہیں۔ آج زینب کے بال کھلے ہوئے ہیں حوریں ماتم کر رہی ہیں اور علیؑ آواز دے رہے ہیں۔

» کہاتے ہو میرے پیارے سید زادو!
آڈ اپنی دادی کے جنازے کو کندھا دو»

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ



پروردگارا آغوش رسالت

خداوند عالم کی حمد و ثنا کے بعد حضرات محمد و آل محمد پر درود و سلام
سَامَعینے کو امر!

خداوند عالم نے اپنے خاص فضل و کرم سے دُنیا ئے انسانیت کو انسان کے اپنے
قائم کردہ اصول و ضوابط سے نجات دلا کر ایک ایسا ہمہ گیر اور عالم گیر نظام حیات
عطا فرمایا ہے کہ جس پر عمل کرنے سے ایک انسان دوسرے انسان کی غلامی سے
ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جائے اور کوئی انسان اپنی مادی طاقت کے بل بوتے
پر کسی دوسرے انسان پر حکومت نہ کر سکے۔ گویا اس عدل اور مساوات انسانی
پر قائم نظام کا نام اسلام ہے۔

اسلام ہی وہ دین ہے، اسلام ہی وہ طریقہ حیات ہے جس نے تمام
انسانوں کو اخوت و برادری کے مضبوط رشتہ میں منسلک کر دیا ہے اور بتا
دیا ہے کہ انسان دوسرے انسانوں پر فوقیت صرف اس صورت میں رکھتا ہے
کہ وہ جتنا زیادہ متقی ہوگا۔ اچھے اخلاق سے آراستہ ہوگا، اپنے خدا سے تڑپا
ہوگا۔ اتنا ہی زیادہ باعزت ہوگا۔

حضور والا!

یہی وہ نظام تھا جس کو قبول کرنے کے لئے وہ طبعیتیں آسانی سے
تیار نہ تھیں جنکی نسلیں محض مادی برتری کی بنا پر لوگوں پر حکومت کرنے

گذریں یا جھنڈوں نے دوسروں کی کائی پر عیش کئے اور جو صرف مادی طاقت کے بھروسے پر دوسرے لوگوں پر بلا وجہ تسلط رہے نتیجہ یہ نکلا کہ بانی اسلام کی رحلت کے کچھ ہی دن بعد وہ جاہلی نظام، وہی انسان پر انسان کی حکومت وہی توقف و برتری کا جذبہ، وہی انسانی زہی غلامی، گویا یہ سب چیزیں زہیہ و ملکیت کی شکل میں دنیا کے سامنے آگئیں۔ اس کا سب سے بڑا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ ایک طرف بزہیہ و ملکیت کی بہترین شکل کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنے کو خلیفۃ المسلمین، رسول کا نمائندہ اور اللہ کا نائب بھی قرار دینا تھا اور دوسری طرف مسائل شرعیہ اور فرمان خدا اور رسول خدا کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ گویا زہیہ کی اس ظالمانہ اور جاہلانہ حکومت کو تسلیم کے معنی یہ تھے کہ یہ مان لیا گیا ہے کہ خدائی نظام یہی ہے اور اسلام کی تعلیم یہی ہے۔

سامعینے!

زہیہ کی اس ظالمانہ روش کو چاہے ساری دنیا تسلیم کرے یا نہ کرے مگر پروردہ آغوش رسالت فاطمہ کے دودھ سے پلا ہوا انسان جس کے رنگ ریشہ میں صحیح اسلامی روح سرایت کیے ہوئے تھی جو اسلام کی جنتی جاگتی، ایک تصویر تھا جس نے بانی اسلام کے سینے اور گاندھوں پر پھیل کر پرورش پائی تھی۔ جس نے پیدا ہوتے ہی زبان رسالت چوس کر پہلی غذا حاصل کی تھی جس کو رسول نے جو انان جنت کا سردار کہا تھا۔ باغیرت باپ کا باغیرت بیٹا اور دنیا کے سب سے عظیم انسان کا عظیم لڑائش! کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ ایک جاہر و ظالم حکمران اپنی حکمرانی کے ٹرور میں اسلامی اصول کو پاؤں کر کے دنیا کے سامنے یہ ثابت کرے کہ انسان کی ذہنی غلامی ہی اسلام کی تعلیم تھی۔ لہذا وہ محمدؐ نظم اس اصول کو ختم کرنے کے لئے اور اس اصول کی اطاعت نہ کرنے

کے لئے اور ہر قسم کی مصیبتوں اور آفتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے میدانِ عمل میں
اُتر آیا۔

یا در کھو!

حسین علیہ السلام ہی ان تمام خوبیوں کا منظر ہیں جن کے نام کے اندر تمام
اخلاقِ حسد منفر ہے۔ آج دینائے انسانیت کا عظیم ترین ہیرو اور مسلمانوں کا مایہ ناز انسان
اور دُنیا کے اسلام پر حکومت کرنے والا شہید یعنی حسین ابن علیؑ محض اس لئے اپنے
خوبصورت بچوں اور اہل و عیال، دل کے ٹکڑوں اور اپنے جگر گوشوں کو لیکر میدانِ
عمل میں اُتر آیا کہ میرے نانانے اور ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء نے جس ماد لاند
نظام کی بنیاد رکھی تھی وہ ایک شخص کے ہاتھوں مسٹ رہا ہے جسے میں مٹانے چاہتا
نہیں دیکھ سکتا۔ لہذا میں اس کے خلاف جہاد کروں گا، گو یا حسین کی یہ جنگ
نہ تھی بلکہ اصول کی خاطر ایک جہاد تھا۔

عزادار سید الشہداء

خدا نے اس عظیم جہاد کے لئے یومِ عاشوراءؑ کی تاریخ مقرر فرمائی
تھی۔ کربلا کا چٹیل میدان، ریگزار اور بیابان جنگلی جس میں انسان گذرتے ہوئے
ڈرتے تھے۔ مگر قدرت اپنی حکمت سے اس جنگل کو اس خیر و شر کے معرکہ کے بعد
عرشِ معلیٰ کا ہمسایا بنا چاہتی تھی۔ لہذا آج حسین اپنے عزیز ترین متاع کو لئے
ہوئے اس بیابان میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک طرف دشمن کی مادی طاقت کی
پوری یلغار حکومت کی منظم فوجوں کی یورش، خزانوں کے منہ کھلے ہوئے بے شمار
تلواریں کی جھنکار ہے انتہائیوں کی جھلک اور ہزاروں کانوں کا کھینچنا اور دوسری
طرف بہتر بھوکے پیاسے جن میں بوڑھے بچے اور کمزور عورتیں ہیں کولنے ہوئے
دُنیا کا سب سے بڑا اخلاقی طاقت کا منظر انسان، انسانی مساوات کا سب سے

بڑا علمبردار اور رسولِ اسلام کے کندھوں پر کھیل کر جو ان ہونے والا انسان اپنی
بظاہر کمزور فوج کو بیکرو دنیا کی سب سے بڑی طاقت سے نبرد آزما ہونے کے لئے
کر بلا میں موجود ہے۔

بزرگانِ منہ!

چشمِ نلک نے ستاروں کی عینک لگا کر دیکھا کہ شامِ عاشور فوجِ یزید اپنی ظاہری
فتح کا جشن منا رہی تھی۔ "ہاتے ہو" اور شور و شہ سے کر بلا کا میدان گونج رہا تھا
اور ایک طرف خمیوں کی جلی ہوئی راگھ اور گرم ریت پر شریف ترین انسانوں کے
بے گور و کفن لاشے ہیں اور کچھ بے کس و بے سہارا عورتیں عالمِ قید میں ریت کے
ٹیلوں کی اوٹ میں خاموش بیٹھی ہیں۔ دنیا تو یہ سمجھی تھی کہ حق کو شکست ہو گئی ہے
اور باطل نے اپنی فتح کے شادیاں بجالائے، مگر آج کا بے داغ مؤرخ اس وقت بھی
لکھ رہا تھا اور آج بھی لکھ رہا ہے کہ حق شکست کے لئے پیدا نہیں ہوا۔ حق
کبھی نہیں ہارتا۔ آج دنیائے دیکھ لیا کہ حسین کو فتح ہوئی ہے اور یزید کو ٹبری
طرح شکست ہوئی ہے۔ گویا دنیا کے سب سے بڑے آمر (DECTATOR) کا
نام آج گالی بن گیا ہے۔ لہذا کوئی شخص یزید یا اولادِ یزید بننا اپنے لئے گوارا نہیں
کرتا۔ مگر و طرہا انسان حسین کی غلامی پر آج بھی فخر محسوس کرتے ہیں۔ گویا حسین
قیودِ مذہب و ملت اور جغرافیائی حدود سے آزاد ہو کر دنیائے عالم کے تمام
انسانوں کے دلوں پر حکومت کر رہا ہے اور آج کرہ ارض پر کر و طرہا انسان حسین
کی اس عظیم قربانی کی یاد منار ہے ہیں اور تمام زمین و فضا آج "ہائے حسین"
اور "واہ حسین" کے نعروں سے گونج رہی ہے۔ "آج حسینیتے!
زندہ باد" کی ابدی صدا ہر انسان کے کان میں آ رہی ہے۔ گویا یہ وہ فتح
عظیم ہے جو حسین کی شہادتِ منظمی نے حاصل کی۔

لوجواؤ ذلے !

خوب یاد رکھو! حسین نے ہمیں بتا دیا ہے کہ انسانی غلامی ایک آری ہے ایک ذلت ہے اور اس ذلت کی زندگی سے مر جانا اسی بہتر ہے اور اللہ کے "وعدہ" لاشربیل کے دروازے پر سر جھکانے والا انسان کبھی کسی طاغوتی طاقت کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا۔ اس کا سرکٹ تو سکتا ہے مگر جھک نہیں سکتا۔ اس کا سر لوک نیزے پر بلند تو ہو سکتا ہے مگر یزیدیت کی اطاعت قبول نہیں کر سکتا۔ اس کی ہنسی اور بیٹیاں قید تو ہو سکتی ہیں مگر نظام و سرکٹ کے دربار میں اعلان حق کی طاقت سے ملو کیت کے درباروں کی جھلپیں ہلا سکتی ہیں۔

سَامعینے !

حسین نے اپنے جوانوں، بیٹیوں اور بچوں کا خون دیکر اسلام کو اتنا تڑی بنا دیا ہے کہ قیامت تک اسلام کی جڑوں کو کوئی طاغوتی طاقت کھو کھلا نہیں بنا سکتی بے شک ظلم و استبداد کہیں کہیں آج بھی زندہ ہے مگر

یاد رکھو !

اس ظلم کے خلاف آج بھی حسین کی آواز بلند ہو رہی ہے اور قیامت تک دتی رہے گی۔ لہذا آج ہم حسین کا شکر یہ ادا کرتے ہیں۔

حسینے ! تو نے دنیا میں ایک ایسا باغ لگا دیا ہے جس کے

پھل انسانیت کو ہمیشہ ملنے رہیں گے اور جس کے درختوں کے

ذیر سایہ ستانی ہوئی انسانیت ہمیشہ پناہ لیتی رہے گی۔

حسینے ! تیرا نام انسانے کو پناہ دینے کا ضامن ہے۔

حسینے ! تیرا ذکر انسانیت کی سر بلندی کا ذریعہ ہے۔

حسینے ! تیرے ماتم کی صدا دنیا کے انسانیت کو سکون بخشتی ہے

حسینے ! تیری یاد انسان کو کھو یا ہوا انتقام دلا سکتی ہے۔

حسینے ! تیری محبت ہم گناہ گاروں کا ذریعہ شفاعت ہے۔